ادب نامۂ ایران

یعنی

ادبیاتِ ایران کی مختصر تاریخ

دورِ ہخامنش سے دورِ قاچار تک

از مقبول بیگ بد

[illegible]

صدر شعبۂ فارسی گورنمنٹ کالج۔ لاہور

یونیورسٹی بک ایجنسی۔ لاہور ٥

تقدیم

خدمت

عالیجناب ڈاکٹر ایس اے رحمٰن صاحب

جج سپریم کورٹ (مغربی پاکستان)

تعارف

آج سے کم و بیش نصف صدی پہلے گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر مولانا محمد حسین آزاد مرحوم نے فارسی ادبیات کے موضوع پر "سخندان پارس" اور "نگارستان فارس" دو کتابیں لکھیں۔ ان کتابوں کو اگرچہ تاریخ کا مرتبہ حاصل نہیں لیکن فارسی دانوں کے لئے بہرحال یہ چراغِ راہ کا کام دیتی ہیں۔ مولانا آزاد کے بعد ہمارے ہاں بعض ایسے پروفیسر فارسی کی تعلیم و تدریس پر مامور ہوئے جو ادبیاتِ ایران کی باقاعدہ تاریخ لکھنے کے اہل تھے لیکن شاید اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے وہ اس اہم کام کی طرف متوجہ نہ ہو سکے۔ کالج کے علاوہ جب ہم بیرونی دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو فارسی ادبیات پر شبلی نعمانی ایسے عالم کا زندۂ جاوید کارنامہ "شعر العجم" کی صورت میں نظر آتا ہے "شعر العجم" نے علمی دنیا کو جو فائدہ پہنچایا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں لیکن علامہ شبلی نے محض شعر و شاعری کو اپنا موضوع بنایا تو گویا کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ ادبیات ایران کی کمی اردو دان طبقہ میں محسوس کی جاتی رہی ہے۔ یہ کام بہرحال ہونا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ اس کام کو میرے سٹاف کے ایک ممبر پروفیسر مرزا مقبول بیگ بدخشانی نے شروع کیا ہے۔

اس کتاب پر تنقید کرنا میرا منصب نہیں لیکن اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ مصنف نے فارسی کا شوق رکھنے والوں کے لئے راہیں ہموار کر دی ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہخامنشیوں کی زبان "قدیم فارسی" اور ساسانیوں کی زبان پہلوی کا مطالعہ کٹھن ہے لیکن مصنف "ادب نامۂ ایران" نے اسے کافی سہل اور دلچسپ بنا دیا ہے ایک نمایاں بات مجھے یہ بھی نظر آتی ہے کہ مصنف نے ایران کے ہر عہد حکومت کا مختصر سا سیاسی پس منظر پیش کیا ہے جس سے اس عہد کی لسانی اور ادبی تحریکوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس سلسلے میں مصنف نے ان رجحانات کی بھی نشان دہی کی ہے جو فارسی نظم و نثر میں برابر پیدا ہوتے رہے ہیں اور جن کا جاننا فارسی کے طالب علم کیلئے ضروری ہے۔

کتاب کی زبان سادہ اور سہل ہے، شاید مصنف نے کوشش کی ہے کہ قارئین کی نظریں زبان اور بیان کی دلچسپیوں پر رکے بغیر اصل مضمون کی طرف رجوع ہو جائیں۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب دلچسپی سے پڑھی جائے گی اور ایک اہم ضرورت پوری کرے گی۔

سراج الدین

(پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور)

پیش لفظ

فارسی زبان کی تمدنی روایات صدیوں پرانی ہیں۔ اس تمدنی قدامت کے اعتبار سے دنیا کی بہت کم زبانیں فارسی زبان کی ہم پلہ کہلا سکتی ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ سینکڑوں سال گزرنے پر بھی ان روایات میں کہنگی یا افسردگی کے آثار پیدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ اس کے برعکس ہر مرحلے پر ان میں شگفتگی اور تازگی آتی رہی اور اس کے ساتھ ساتھ زبان کے خدوخال بھی سنورتے گئے۔

گذشتہ صدیوں میں سرزمین ایران میں کئی انقلابات آئے۔ یونانیوں کے حملے اور سکندر کے فاتحانہ اقدامات نے ہخامنشی دور کا خاتمہ کر دیا۔ اشکانیوں کی شان و شوکت ساسانی عظمت کے آگے جھک گئی۔ عربوں کی پیش قدمی نے ساسانی اقتدار کو پامال کر ڈالا۔ خود اسلامی دورِ حکومت میں تاتاریوں اور ترکوں کی یلغار نے ہزارہا تہذیبی نقوش مٹا دیئے لیکن ان تمام حادثات کے باوجود ایران نے اپنے تمدنی ذخائر کو محفوظ رکھا۔ ایرانی تمدن کی بنیاد اتنی محکم اور استوار تھی کہ شدید سے شدید انقلاب بھی اسے متزلزل نہ کر سکا۔ سکندر بجائے اس کے کہ ایران کو یونان بنا دیتا خود ایرانی بن کر رہ گیا۔

ایرانیوں نے عربوں کو لبیک کہا انہوں نے فقط اسلام ہی کو قبول نہیں کیا بلکہ عربی زبان اس کے رسم الخط اس کے قواعد صرف و نحو اور علم بیان و عروض کو بھی اپنا لیا۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن ایرانی تمدن کے تسلسل میں فرق نہ آیا بلکہ ہر مرحلے پر اس کی تنومندی اور

بھی بڑھ گئی، ایرانی افکار ایک نئی قوت کے ساتھ ابھرے اور اپنے اثر و نفوذ سے تمام دنیائے اسلام پر چھا گئے۔ تاریخ میں ایسی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ خود خلفائے عباسی کا دربار، ان کا نظامِ سلطنت، یہاں تک کہ ان کی بیشتر تمدنی روایات دورِ ساسانی کا ہی نقشِ ثانی تھیں۔ عرب تمدن کے مقابلے میں اس دور کے تمدن کو ایرانی کہنا موزوں ہوگا۔

ایرانی تمدن کی تنومندی کے زیرِ اثر، فارسی زبان، فارسی ادبیات اور ایرانی علوم و ہنر ہمہ گیر قوتیں پیدا ہوئیں۔ ازمنۂ وسطیٰ میں فارسی زبان وسطِ ایشیا کی تجارتی اور تمدنی زبان تھی اور اس کے اثرات ایک طرف بخارا سے پیکن اور دوسری طرف تبریز سے لیکر بنگال اور دکن اور پھر بغداد سے لیکر ایشیائے کوچک تک نمایاں تھے۔ ہند و پاکستان کے برصغیر میں تو فارسی زبان و ادب یہاں کے تمدن کا بنیادی جزو تھے۔ تیموری شہنشاہوں کا دورِ حکومت فارسی ادبیات کے عروج کا دور ہے۔ تیموری عہد کی ادبی روایات، فنِ تعمیر، نقاشی و مصوری بیشتر ایران کی ہی مرہونِ منت ہے اور ان احسان مندیوں کے نقوش ابھی تک ماند نہیں پڑے۔ یہ نقوش صرف یہیں کی سرزمین تک محدود نہیں بلکہ دنیا کے مختلف گوشوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔

فارسی زبان، آریائی السنہ کے خاندان سے متعلق ہے اور اس اعتبار سے یہ زبان یورپ کی ان تمام زبانوں سے وابستہ ہے جن کا رشتہ اس نسل اور خاندان سے جا ملتا ہے۔ اس طرح فارسی زبان ہندوستان، افغانستان، وسطِ ایشیا اور یورپین ممالک کے درمیان ایک مستحکم رابطہ و اتحاد کا کام کرتی ہے۔

لسانی روابط کے علاوہ فارسی ادبیات کی ہمہ گیری نے دنیا کے ہر متمدن ملک و قوم کو متاثر کیا ہے۔ فارسی ادب و شعر میں ایرانی افکار، ایرانی فلسفہ، حکمت، اخلاق و تصوف کی اثر انگیزی جگہ جگہ کارفرما نظر آتی ہے۔ خیام، سعدی اور حافظ کے اشعار نہ صرف ممالک اسلامیہ میں مقبول ہیں بلکہ یورپ میں بھی ان کا چرچا ہے۔ دنیا کے ادبی اور علمی حلقوں میں ان کے نغمے اسی طرح گونجتے سنائی دیتے ہیں۔ جس طرح شیراز، اصفہان اور تہران

فہرس

چوتھا باب

پانچواں باب

چھٹا باب

ساتواں باب

آٹھواں باب

دسواں باب

گیارھواں باب

بارھواں باب

فہرس

چوتھا باب

پانچواں باب

چھٹا باب

ساتواں باب

آٹھواں باب

نواں باب

دسواں باب

گیارھواں باب

بارھواں باب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا باب

ایران قدیم کے حکمران اور زبانِ فارسی

ایرانِ قدیم کے باشندے ایران کے قدیم باشندے آریائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ تقریباً چار ہزار قبل مسیح میں جنوبی روس سے چراگاہوں کی تلاش میں کارواں در کارواں چل کر سرزمین ایران میں وارد ہوئے۔ یہاں جو لوگ آباد تھے، وہ ان نوواردوں کے ہاتھوں مارے گئے، یا پہاڑوں میں ادھر ادھر کہیں منتشر ہو گئے۔ نوواردوں کا ایک گروہ شمالی ایران کے علاقے میڈیا میں آباد ہو گیا۔ یہ لوگ اس علاقے کی نسبت سے "ماد" کہلائے۔ آریاؤں کا ایک دوسرا گروہ مشرقی ایران سے ہوتا ہوا جنوبی ایران کے علاقہ پارس میں آ بسا اور اسی نسبت سے انھیں اہلِ پارس یا "پارسی" کہا گیا۔

آلِ ماد ۷۱۵ تا ۵۵۰ قبل مسیح قوم ماد کا مورثِ اعلیٰ دیاکو تھا۔ اس نے اکباتانہ کو اپنا دارالسلطنت بنایا، جسے آج کل ہمدان کہتے ہیں۔ ماد اور پارسی اگرچہ ایک ہی نسل سے تھے، لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ یہ ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کے لیے آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے۔ ماد زیادہ طاقتور تھے، اس لیے آلِ ماد کے مطیع و منقاد رہے، لیکن آخر ان کی قسمت نے یاوری کی۔ ان میں سے ایک طاقتور شخص اٹھا، جو تاریخ ایران میں کوروش اعظم[1] (CYRUS THE GREAT) کے نام سے مشہور ہوا۔ کوروش اعظم

۱؎ ۵۵۰ تا ۵۲۹ ق م

نے اہلِ پارس کو منظم کیا۔ ان کے سینوں میں قومی روح بیدار کی اور آلِ ماد کے آخری تاجدار استیاجیس کو شکست دے کر، ان کی حکومت ہمیشہ کے لیے ختم کر دی۔

دورِ ہخامنشی ۵۵۰ تا ۳۳۰ ق م

ایران کی باقاعدہ تاریخ کوروش اعظم سے شروع ہوتی ہے۔ کوروش اعظم ہخامنشی دور کا پہلا اور نامور بادشاہ تھا۔ یہ کمبوجیہ کا بیٹا اور چائیش پیش کا پوتا ہے۔ اس کے پردادا کا نام ہخامنش ہے، جس کے نام سے اس عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھی گئی۔

کوروشِ اعظم کا سلسلۂ نسب[1]

۱۔ ہخامنش ACHAEMENES پیدائش تقریباً ۶۵۰ ق م

۲۔ چائیش پیش THEISPES

- ۳۔ کوروش CYRUS
  - ۴۔ کمبوجیہ اوّل CAMBYSES
    - ۷۔ کوروش اعظم ۵۵۰ تا ۵۲۹ ق م
      - ۸۔ کمبوجیہ
- اریارامنا ARIARAMNES
  - ارشامہ ARSAMES
    - وشتاسپا HYSTASPES
      - داریوش اعظم DARIUS ۵۲۱ تا ۴۸۵ ق م
        - خشیارشا XERXES ۴۸۵ تا ۴۶۵ ق م
          - ارتخشتر (اردشیر) اوّل ۴۶۵ تا ۴۲۴ ق م
          - داریوش دوم ۴۲۴ تا ۴۰۵ ق م
          - ارتخشتر دوم ۴۰۴ تا ۳۵۸ ق م
          - ارتخشتر سوم ۳۵۸ تا ۳۳۸ ق م
          - داریوش سوم ۳۳۶ تا ۳۳۰ ق م

---

[1] ہسٹری آف پرشیا مولفہ سر پرسی سائیکس جلد اوّل ص ۱۴۳، صرف کوروش اعظم سے داریوش اعظم تک۔

کوروشس اعظم کا تسلط

کورش اعظم نے جب اپنی آبائی ریاست الوشان کی باگ ڈور سنبھالی، تو اُس وقت شمالی ایران میں استاجیس حکمران تھا۔ الوشان کے حکمران استاجیس کو خراج ادا کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بابل اور نینوا کے حکمرانوں کا بھی اس ریاست میں بہت عمل دخل تھا۔

کوروش اعظم نے اہل پارس کو منظم کر کے پہلے میڈیا کا رُخ کیا اور ۵۵۰ ق م میں استاجیس پر فتح حاصل کر کے آل ماد کی حکومت کا خاتمہ کیا۔ پھر بابل اور نینوا کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ وہ حکومتیں تھیں، جن کے نام کے ڈنکے اطراف عالم میں بجتے تھے۔ کوروش اعظم نے ان حکومتوں کو بھی زیر کیا۔ ان مہموں سے فراغت پا کر اس نے اپنے مورثِ اعلیٰ ہخامنش کے نام کی نسبت سے دورِ ہخامنشی کی بنیاد رکھی۔ کوروش اعظم نے ۵۵۰ تا ۵۲۹ ق م بڑے جاہ و جلال سے حکومت کی۔ اس کی سلطنت جنوب میں خلیج فارس سے لے کر شمال میں کوہ ارارات تک پھیلی ہوئی تھی۔ کوروش اعظم نے ایک زندہ جاوید تمدن اپنی یادگار چھوڑا۔ اس کے بعد ہخامنشی دور کے بائیس اور حکمران تخت نشیں ہوئے جن کی کوششوں سے ہخامنشی تمدن کو اور بھی چار چاند لگے۔

داریوش یا دارائے اعظم اسی عہد کا ایک جلیل القدر بادشاہ تھا، اس کا عرصہ حکومت ۵۲۱ تا ۴۸۵ قبل مسیح ہے۔ یہ وہ بادشاہ ہے، جس کے دبدبے کا شہرہ شرق و غرب میں تھا۔ اس کے عہد میں کچھ بغاوتیں تو ہوئیں۔ لیکن دارائے اعظم نے بڑی خوبی سے انھیں فرو کیا۔ بغاوتوں سے فارغ ہو کر اس نے متعدد علاقے فتح کر کے اپنی سلطنت کو وسعت دی۔ ایران کا یہ سنہرا دور کئی نئی باتوں کے لیے مشہور ہے جنھیں " اولیات داریوش اعظم " کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مثلاً (۱) فتح سندھ کے بعد سندھ[۱] سے لے کر سویز تک کا پہلا بحری سفر (۲) بحیرۂ قلزم کو دریائے نیل سے ملایا گیا (۳) ہندوستان میں شاہی نائب کا قیام (۴) تھریس اور مقدونیہ کی فتح

---

[۱] ہسٹری آف پرشیا مولفہ سرپرسی سائیکس جلد اول ۱۶۳-۱۶۴

(۵) سڑکوں کی تعمیر، محکمہ ڈاک اور سراغ رسانی کا قیام۔

سکندرِ اعظم کا حملہ اور دورِ ہخامنشی کا خاتمہ

آخر جب دارائے اعظم کی نسل سے دارائے سوم تخت نشین ہوا، تو اس وقت حکومت ایران پر ضعف و زوال کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ ادھر یونان کی حریف سلطنت روز بروز بگڑتی جاتی تھی۔ ایران کا بادشاہ دارائے سوم اگرچہ اپنے وسیع تجربے، ذہانت اور شجاعت کی وجہ سے مشہور تھا۔ ایشیائے کوچک کے لاکھوں پیشہ ور سپاہی جنھوں نے دارائے اول کے زمانے میں مقدونیہ کے خلاف ایران کا ساتھ دیا تھا، اب بھی دارائے سوم پر جان نثار کرنے کو تیار تھے ایران کے بحری بیڑے کو بھی بہت فوقیت حاصل تھی لیکن سرزمین یونان سے ایک ایسا طوفان اٹھنے والا تھا جس کا روکنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ یہ طوفان سکندر یونانی کی شکل میں نمودار ہوا جس نے تیس ہزار پیادہ فوج اور پانچ ہزار سواروں کے ساتھ ایشیائے کوچک کا رخ کیا۔ ۳۳۴ ق م میں اس نے فوجی اہمیت کے بڑے بڑے شہر فتح کر لیے۔ ایشیائے کوچک کی سرزمین کو جب سکندری گھوڑوں کی ٹاپیں روند چکیں، تو ۳۳۱ ق م میں سکندر فرات کے پل کو عبور کر کے حدودِ ایران میں داخل ہوا۔ ایرانی اپنے تمدن و ملک و قوم کی حفاظت کے لیے قدم قدم پر لڑے، لیکن یہ سیلاب کہیں رک نہ سکا۔ شوش، پرسی پولس (اصطخر) ہمدان، غرض کہ سکندر نے ایران کے ایک ایک شہر کو زیرنگیں کیا۔ دارائے سوم آخر ۳۳۱ ق م میں شکست کھا کر مارا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس عظیم بالشان ہخامنشی خاندان کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی آخر ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔

ایران کے قدیمی نام

جیسا کا ذکر آ چکا ہے، ایران کے جنوبی حصے کا نام پارس یا فارس تھا۔ لیکن کوروش اعظم نے اہلِ پارس کو ایسی طاقتور قوم بنا دیا اور قومی تمدن میں اتنی تابناکی اور ہمہ گیری پیدا کر دی کہ ایران کے طول و عرض کو اس تمدن کی ضیا پاشی نے منور کر دیا جس کا یہ اثر ہوا کہ سارے ایران کو فارس اور ایران کی زبان کو "فارسی" کہنے لگے۔

دورِ ہخامنشی کی زبان

اس عہد کی زبان "قدیم فارسی" کہلاتی ہے۔ فارسی قدیم ڈھائی ہزار سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد آج بھی کتبوں کی صورت میں محفوظ ہے۔ یہ وہ کتبے ہیں جو کوروش اعظم

اور دارائے اعظم کے حکم سے پہاڑوں پر کندہ کرائے گئے تھے۔ ان میں ایک بہت بڑی یادگار کتبہ بیستون ہے، جو دارائے اعظم نے کندہ کرایا تھا۔ بیستون وہی پہاڑ ہے جس کی وادی میں آج بھی فسانۂ فرہاد کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اس کے دامن میں چشمے بہتے ہیں، جہاں کارواں آکر ٹھہرا کرتے تھے۔ غالباً اسی وجہ سے دارائے اعظم نے اپنے زندۂ جاوید کارناموں کو محفوظ کرنے کے لیے اتنا بلند مقام انتخاب کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی کتبے ملتے ہیں، جن میں نقش رجب، نقش رستم اور تخت جمشید خاص طور سے بہت اہم ہیں۔

دارائے اعظم نے کتبوں میں وسیع فتوحات کے تذکرے، بادشاہی فرمان اور کئی دوسرے ملکی امور کندہ کرائے۔ ان کتبوں کی زبان فارسی قدیم ہے۔ جو خطِ میخی میں لکھی گئی ہے۔

ادبیات

ادبیات سے عمدہ اور فصیح نظم و نثر مراد ہے۔ اگرچہ یہ تعریف ان کتبوں پر صادق نہیں آتی، لیکن ان میں اتنا شکوہ ہے کہ انھیں فارسی ادب سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کتبے قدیم ایرانی ادب کا سرمایہ ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان کتبوں کے مطالعے کے بغیر قدیم فارسی کی تاریخ جاننا ممکن نہیں۔

فارسی قدیم رسم الخط

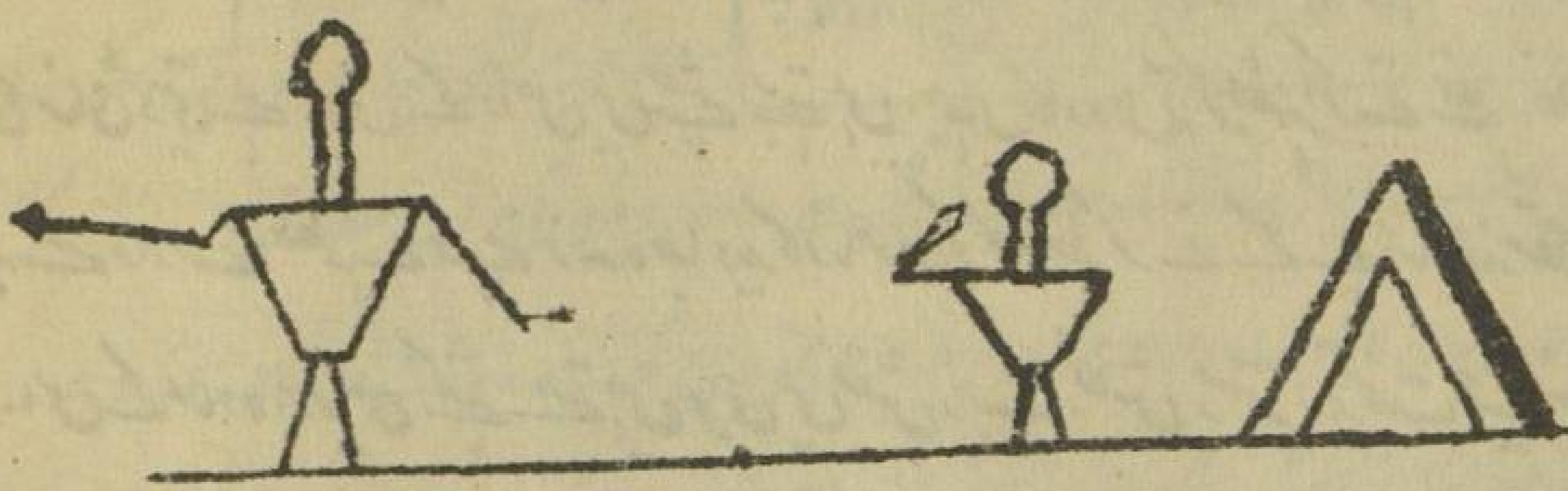
فارسی قدیم کا رسم الخط خطِ میخی CUNIFORM SCRIPT یعنی سہ گوشہ کہلاتا ہے۔ خطِ میخی قدیم زمانے میں بابل اور نینوا میں رائج تھا۔ ایرانیوں نے بھی انہی کے ہاں سے یہ رسم الخط لے کر اپنایا اور اسے ترقی دی۔

خطِ میخی

خطِ میخی کی تاریخ پر نظر ڈالنے کے لیے مصر کے قدیمی رسم الخط کا ذکر کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔ تقریباً سات ہزار سال قبل مسیح میں مصر میں جو رسم الخط رائج تھا، اسے خطِ تصویری (P.CTURIAL SCRIPT) کہتے تھے۔ یہاں کے قدیم باشندے تصویروں کے ذریعے اظہارِ خیالات کیا کرتے تھے۔ ان تصویروں کے نمونے آج تک موجود ہیں، جو عجائب خانوں کی زینت ہیں۔ ذیل میں خطِ تصویری کا ایک نمونہ دیا جاتا ہے۔

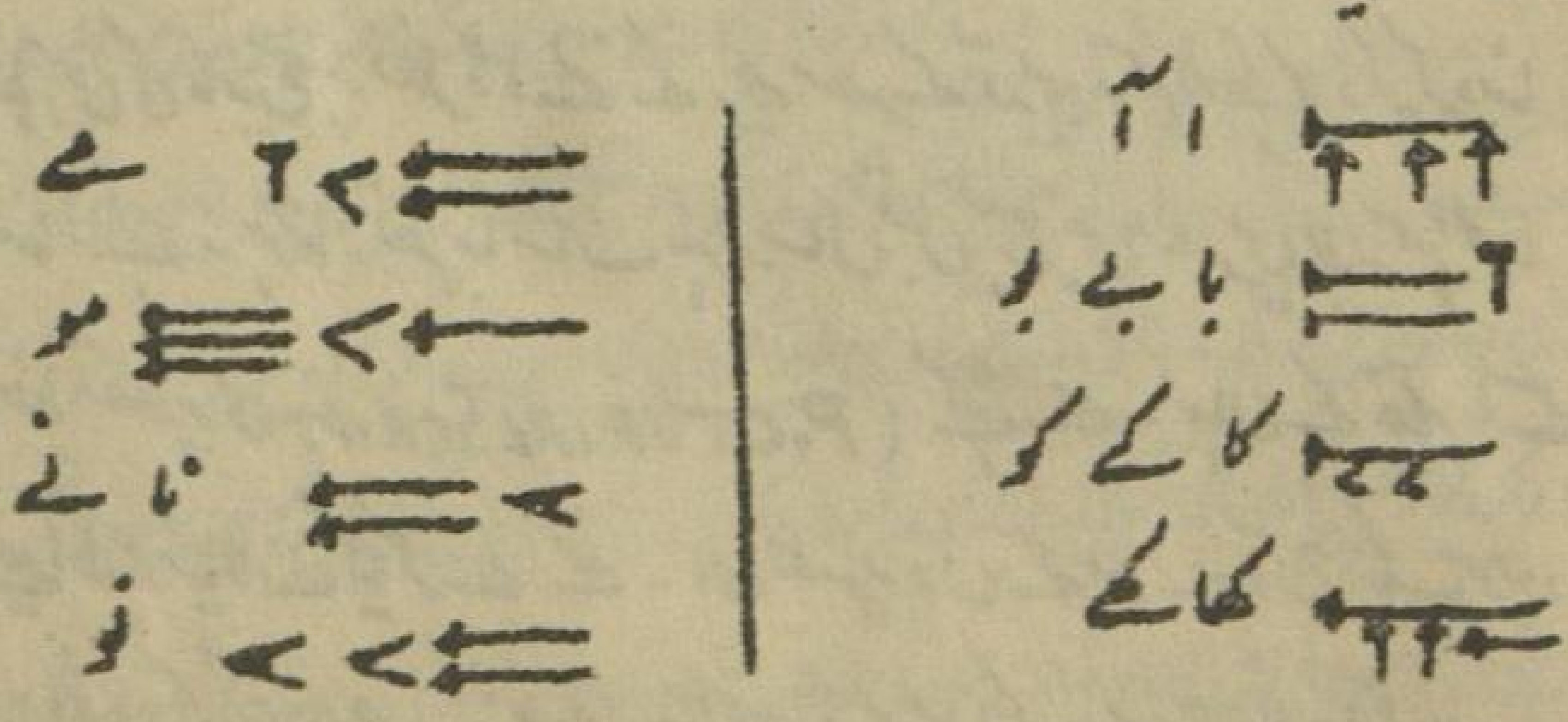
تصویر میں ایک شخص یہ ظاہر کر رہا ہے کہ گھر میں کھانے کو کچھ نہیں اس لیے اب

وہ شکار کرنے جا رہا ہے۔

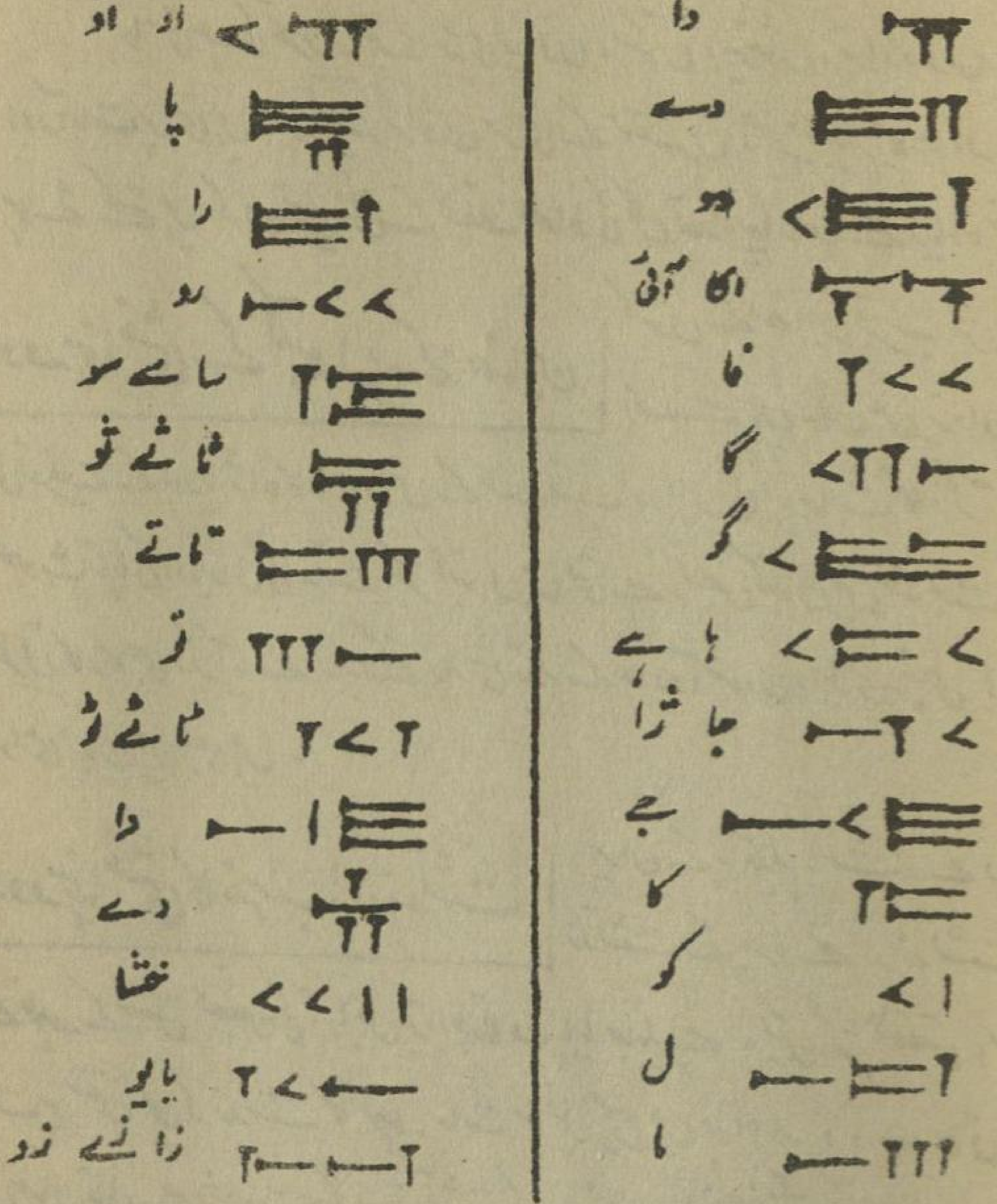


خطِ تصویری میں سیکڑوں قسم کی تصویریں بنانی پڑتی تھیں۔ جن کی وجہ سے اظہارِ خیال میں بڑی دقّت کا سامنا ہوتا تھا۔ اہلِ بابل نے بھی شروع شروع میں اپنے ہاں خطِ تصویری ہی رائج کیا تھا، لیکن اظہارِ خیالات کی مشکلات کو انھوں نے بھی محسوس کیا۔ اور تصویروں کو مختصر کرکے ترقی کی طرف ایک قدم آگے بڑھایا۔ پھر یہ مختصر تصاویر بھی اظہارِ خیال کے لیے ناکافی ثابت ہوئیں، تو انھوں نے تصاویر کے بدلے علامات مقرر کیں۔ ان علامتوں کے ذریعے جو رسم الخط وجود میں آیا اسے "علامت نویسی" سے تعبیر کیا گیا۔ اہلِ بابل نے "علامت نویسی" پر بھی اکتفا نہ کیا، بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھایا اور خطِ میخی ایجاد کیا۔

خطِ میخی میں تصویری علامتوں کے بجائے حروف سے کام لیا گیا۔ ان حروف کو لوہے یا لکڑی کی نکیلی میخوں کے ذریعے ظاہر کیا جاتا تھا۔ خطِ میخی کے حروف[1] علی الترتیب ذیل میں دیے جاتے ہیں۔



[1] رسالہ راہنمائی - ڈاکٹر مقدم مطبوعہ تہران



خطِ میخی بابل سے ایران آیا۔ ایرانی بادشاہ اپنے کارنامے پہاڑوں کی بلند و بالا چٹانوں اور دیواروں پر خطِ میخی میں ہی کندہ کراتے تھے۔ ان کتبوں کا حال جاننے کے لیے اہلِ یورپ نے بڑی کاوش کی۔ مشہور محقق گروٹ فنڈؒ GROTEFEND بڑی سعی و کوشش کے بعد آخر ان کتبوں کی زبان کا حال معلوم کرنے میں ایک حد تک کامیاب ہو گیا۔ گروٹ فنڈ کے بعد لاسن LASSEN ، برنوف BURNOUF اور سر ہنری راؤلنسن نے خطِ میخی کو سمجھنے اور سمجھانے میں بڑی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔

ہخامنشی عہد کی تحریریں بڑی بڑی چٹانوں ، سکوں ، برتنوں ، ترازوؤں ، نگینوں اور آلات پر ملتی ہیں۔ پروفیسر براؤن جرمنی کے مستشرق ڈاکٹر ویسٹبیٹر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ ان تحریروں[1] کے مختلف الفاظ کی کل تعداد چار سو سے زیادہ نہیں۔

دورِ ہخامنشی کے کتبوں کے مضامین

کتبوں کے مضامین قریب قریب ایک سے ہیں۔ ان میں یزدانِ پاک کی تعریف کے بعد بادشاہ کا نام ، اس کے حسب نسب اور اس کی فتوحات کا ذکر آتا ہے۔ جھوٹ ناپاکی اور برائی کی مذمت اکثر کتبوں میں ملتی ہے۔ بعض کتبوں میں حکومت کے طریقِ کار کا بھی ذکر آیا ہے۔ یہ کتبے فارسی قدیم کے علاوہ آسوری ، ایلامی ، نبطی اور آرامی زبان میں بھی ہیں۔

دورِ ہخامنشی کا مذہب اور زرتشت

ایران کے یہ قدیم باشندے دینِ زرتشت کے پیرو تھے۔ زرتشت کے ظہور کے متعلق محققین کی آرا میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن اکثر محققین اس بات پر متفق ہیں کہ زرتشت کا ظہور سات سو قبل مسیح میں ہوا اور وہ ۵۸۳ ق م میں جہانِ فانی سے رخصت ہو گیا۔ زرتشت کو اہلِ فارس اپنا پیغمبر[2] مانتے تھے۔

زرتشت[3] آذربائیجان کے علاقہ اردو بیہ میں پیدا ہوا۔ شروع شروع میں وہ سوچ بچار کا بہت عادی تھا۔ جوانی کے عالم میں اس پر اکثر محویت اور استغراق کی حالت طاری رہتی تھی۔ زرتشت کے خود اپنے قول کے مطابق اسے سات مرتبہ نورِ یزداں[3] نظر آیا۔ آخر زرتشت نے نیا دین پیش کیا۔ کئی سال تک وہ اپنے دین کی تبلیغ کرتا

---

[1] لٹریری ہسٹری آف پرشیا مولفہ پروفیسر ای۔ جی۔ براؤن جلد اول ۲ ص

[2] ہسٹری آف پرشیا مولفہ سر پرسی سائیکس۔ جلد اول ص ۱۰۳ [3] ایضاً ص ۱۰۴

رہا۔ لیکن اُس کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی، آخر وہ ہجرت کر کے مشرقی ایران یعنی بلخ آ گیا۔ بلخ میں اُس وقت وشتاسپ کی حکومت تھی، جسے فردوسی شاہنامے میں گشتاسپ لکھتا ہے۔ وشتاسپ نے یہ نیا مذہب اختیار کر لیا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی رعایا بھی جوق در جوق مذہب زرتشت کی حلقہ بگوش، ہو گئی۔

دین زرتشت کے عقاید ایران کے قدیم باشندے دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے اور اُن کی خوشنودی مزاج حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کی قربانیاں دیتے تھے۔ زرتشت نے خدا کے واحد ہونے کا تخیّل پیش کیا۔ زرتشت کے نزدیک آہورامزدا یعنی خدائے کبیر الیسی کائنات کا خالق ہے، جس میں صرف نیکی ہی نیکی ہے۔ نیکی، صحت و توانائی، اچھے انسان کار آمد حیوان، زمین، بادل، سیّارے اور ستارے سب آہورامزدا کی مخلوق ہیں۔ جسے وہ یزداں بھی کہتا ہے۔

البتہ زرتشت کے نزدیک بدیوں اور بُرائیاں کا بھی ایک خالق ہے۔ جسے وہ اہرمن کہتا ہے۔ بدیوں کی کائنات میں چور، بدکار، کینہ ور اور قاتل بھی ہیں، انسان کو ڈسنے اور ہلاک کرنے والے جانور بھی موجود ہیں۔ ایسے ستارے بھی ہیں۔ جو انسانی زندگی پر منحوس اثر ڈالتے ہیں۔ یہ سب اہرمن کی مخلوق ہیں۔

زرتشت کی تعلیم زرتشت قول و فعل کی سچائی پر بہت زور دیتا ہے۔ اسے یقین ہے کہ آہورامزدا سب کچھ دیکھتا ہے۔ وہ اچھی باتوں پر لوگوں کو اچھا صلہ دیتا ہے۔ اور بری باتوں پر انھیں سزا دیتا ہے۔

دین زرتشت کے بعض اصوُل ۱۔ کھیتی باڑی اور مویشیوں کی پرورش بہترین پیشے ہیں۔ اچھا گھرانا وہی ہے، جس میں مرد، بیوی، بچے، کھیتی باڑی کرنے والے مویشی، رکھوالی کرنے والا کتّا موجود ہو اور جہاں ہمیشہ آگ جلتی رہے۔

٢- نیکی اور بدی میں کشمکش جاری ہے۔ یزدان کی مخلوق اہرمن کی مخلوق پر غلبہ پانا چاہتی ہے اور اہرمن کی مخلوق یزدان کی مخلوق کو مسخر کرنا چاہتی ہے۔ آخر ایسا وقت بھی آئے گا، جب نیکی کی طاقتیں بدی کی قوتوں پر غالب آجائیں گی اور دنیا میں صرف نیکی ہی نیکی رہ جائے گی۔

٣- پرستش کے لائق آہورا مزدا ہے۔ آگ آہورا مزدا کا ایک مادی نشان ہے۔ اس لیے یہ ایک مقدس چیز ہے۔ زمین اور پانی بھی مقدس ہیں۔ پانی کو گدلا اور زمین کو ناپاک کرنا گناہ ہے۔ چنانچہ جب کوئی آتش پرست مرجاتا ہے، تو اس کو زمین میں دفن نہیں کیا جاتا، بلکہ جانوروں کی خوراک بننے کے لیے اسے کسی بلند مقام پر ڈال دیا جاتا ہے جسے دخمہ کہا جاتا ہے۔

٤- زرتشت موت کے بعد کی زندگی پر یقین رکھتا ہے، یہ اس زندگی کے مطابق ہوگی جو دنیا میں گزاری گئی تھی۔ یعنی دنیا میں اچھے اعمال کیے ہونگے تو اچھا صلہ ملے گا اور برے اعمال ہونگے تو عقوبت کا سامنا کرنا پڑیگا۔

دینِ زرتشتی کی مقدس کتاب

آتش پرستوں کے نزدیک کتاب "اوستا" زرتشت کا ایک مقدس صحیفہ ہے۔ اس میں زرتشت کی مذہبی تعلیم کے اصول وقواعد، عبادت کے طریقے، گیت اور دعائیں درج ہیں۔ اوستا کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ بیلوں کی چار سو کھالوں پر سنہرے حروف میں لکھی گئی تھی۔ سکندرِ اعظم نے جب ٣٣٠ ق م میں ایران فتح کیا، تو یہ کھالیں ضائع کردی گئیں۔ آج جس اوستا کا نام سننے میں آتا ہے، ہخامنشی عہد کی قدیم اوستا نہیں، بلکہ یہ ساسانی عہد کی اوستا ہے، جسے ابتدا میں اشکانی عہد کے ایک بادشاہ ولخش یا بلاش سوم نے (١٤٨ تا ١٩١ء) میں مرتب کرنا شروع کیا تھا۔ پھر یہ ترتیب ساسانی عہد کے بانی اردشیر کے حکم سے جاری رہی۔ اس کی تکمیل ساسانی

عہد میں ہوئی، اس لیے اسے "ساسانی اوستا" کہا جاتا ہے۔

ملک الشعراء بہار[1] لکھتے ہیں کہ قدیم اوستا کے اکیس نسک تھے۔ یہ نسک تین قسموں میں منقسم تھے۔ (ا) گاسانیک (ب) ہاتک مانسریک (ج) داتیک

ا۔ گاسانیک دینی نظموں پر مشتمل تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ زرتشت کا اپنا کلام ہے اس میں دعائیں اور مناجاتیں تھیں۔

ب۔ ہاتک مانسریک اخلاقی قوانین اور احکام دین پر مشتمل تھے۔

ج۔ داتیک۔ ان میں زرتشتی فقہ کا بیان ہے۔

قدیم اوستا انہی تین حصوں پر مشتمل تھی، لیکن اس کی یہ قدیم صورت قائم نہ رہ سکی۔ ساسانی عہد میں جو اوستا مرتب ہوئی وہ ذیل کی پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ یسنا۔ ان گیتوں کا مجموعہ ہے، جو فرشتوں اور مقدس روحوں کی خوشنودی کے لیے گائے جاتے تھے۔

۲۔ **یشت**۔ اس کتاب میں دین زردشتی کی عبادت کے اصول وقواعد درج ہیں۔

۳۔ **وینی داد**۔ اس میں وہ دعائیں اور منتر درج ہیں۔ جو اہرمن یعنی شیطان اور اس کی ذریات کے شر سے بچنے کے لیے لکھے گئے تھے۔

۴۔ وسپرد۔ یہ آداب مذہب کا ایک ضابطہ ہے۔

۵۔ خورده اوستا۔ اس میں بھی اصول مذہب درج ہیں۔

اوستا کا اہم ترین حصہ گاتھا کہلاتا ہے۔ جو یسنا کا ایک جزو ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گاتھا زرتشت کا اپنا کلام ہے۔ باقی حصوں کے متعلق وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا گیا کہ یہ زرتشت کا اپنا کلام ہے یا اس کے حواریوں کا۔

---

[1] سبک شناسی جلد اوّل ص ۱۲ بحوالہ مولف دین کرت

اوستا کا رسم الخط

اوستا، اوستی خط میں لکھی گئی تھی۔ شفق[1] کا خیال ہے کہ "قدیم اہلِ ایران خطِ میخی کے علاوہ ایک اور خط بھی استعمال کرتے تھے، جسے خطِ اوستی کہتے ہیں۔ یہ خط سامی رسم الخط سے لیا گیا تھا۔ ممکن ہے جس زمانے میں خطِ میخی پتھر پر کندہ کرنے کے کام آتا تھا، اس زمانے میں خط اوستی ہاتھ سے لکھنے کے کام آتا ہو۔"

خط اوستی کی جامعیت کے متعلق ایک اور ایرانی نقاد سلیم نیساری[2] لکھتے ہیں کہ اوستا کی کتابت کے دوران یہ محسوس ہوا کہ خط اوستی گیتوں کی آوازوں کو ادا کرنے کے لیے کافی نہیں، اس لیے دین زرتشتی کے علما نے چھٹی صدی عیسوی میں اس خط میں اور نئے حروف شامل کیے۔ جن میں اعراب بھی تھے۔ ان اعراب کی وجہ سے یہ نیا اوستائی خط کامل تر ہو گیا۔ اور اس کے ذریعے وہ تمام آوازیں ادا ہونے لگیں، جو خطِ پہلوی میں ادا نہ ہو سکتی تھیں۔

ژند و پاژند

اوستی زبان کو، جس میں اوستا لکھی گئی تھی، بعض لوگ غلط فہمی کی بنا پر ژند بھی کہہ دیتے ہیں۔ لیکن استاد براؤن[3] لکھتے ہیں کہ اوستا کی زبان ژند ہرگز نہیں۔ ژند اوستا کی تفسیر کا نام ہے، جو اصل کتاب اوستا کے ساتھ شامل ہے اور پہلوی زبان میں لکھی گئی ہے۔ تفسیر کے شامل کتاب ہونے کی وجہ سے یہ اوستا و ژند کہلائی۔ لیکن رفتہ رفتہ سہولت کی غرض سے لوگ اسے "ژند اوستا" کہنے لگے۔ چنانچہ بعض محققین کو شبہہ ہوا کہ اوستا ژند زبان میں لکھی گئی ہے، جو درست نہیں۔ اسی طرح پھر ژند کی بھی ایک تفسیر لکھی گئی، جو پاژند کہلاتی ہے۔

---

1. تاریخ ادبیات ایران ص۱۱
2. تاریخ ادبیات ایران ص۲۰
3. لٹریری ہسٹری آف پرشیا مولفہ براؤن جلد اوّل ص۱۵

دوسرا باب

دورِ اشکانیاں

(۲۷۹ ق م سے ۲۲۶ عیسوی تک)

ہخامنشی عہد کے آخری تاجدار دارائے سوم کی شکست کے بعد ایران میں یونانیوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ سکندر کی حکومت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی، کیونکہ وہ جلد ہی یعنی ۳۲۳ ق م میں اس جہانِ فانی کو خیرباد کہہ گیا۔ اس کی وفات کے بعد تمام مفتوحہ علاقے اس کے جانشینوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایران، جس کا ہمارے مضمون سے تعلق ہے۔ سیلیوکس کے حصے میں آیا۔ یہ سکندر کا مشہور جرنیل اور دستِ راست تھا۔ سیلیوکس کے بعد اس کے جانشینوں نے اسّی سال تک حکومت کی۔

اشکانیوں کی حکومت کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اہلِ ایران غیر ملکی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرنے لگے۔ ایران کے مشرقی علاقہ پرتو سے (جسے پارتھیا بھی کہتے تھے، اور آج یہی علاقہ خراسان کے نام سے موسوم ہے) اہلِ ایران قومی جذبے سے سرشار ہو کر اٹھے اور یونانیوں کی غلامی سے وطنِ عزیز کو نجات دلانے میں کامیاب ہو گئے۔

پرتو یا پارتھیا کی اس فاتح قوم کے امیر کا نام ارشک تھا۔ جسے مختصر صورت میں اشک بھی کہا جاتا تھا۔ اشک نے یونانیوں کو شکست دے کر ایک نئے عہد کی بنیاد رکھی، جو عہدِ اشکانیاں کے نام سے موسوم ہوا۔

اشکانیوں نے کم و بیش پانچ سو سال تک حکومت کی۔ یہ لوگ بہادر اور محبِّ وطن تو ضرور تھے، لیکن صحرا نشین اور علم و فضل سے بیگانہ تھے۔ اس لیے اتنے طویل عرصہ حکومت

میں اس عظیم الشان تمدن کو پھر سے زندہ نہ کر سکے، جو ہخامنشیوں نے پیش کیا تھا، یہ لوگ یونانیوں کے تمدن سے متاثر ہوئے اور بالآخر اسی تمدن کو اپنا لیا۔ یہاں تک کہ بعض اشکانی حکمران ایسے بھی تھے، جو "فیل ہیلن" یعنی حامیٔ یونان کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اس حقیقت کا اعتراف انھوں نے اپنے سکوں میں بھی کیا ہے۔

عہدِ اشکانی کی نئی زبان پہلوی

عہد اشکانیاں میں خطِ ہخامنشی کے ساتھ ساتھ یونانی رسم الخط بھی رائج تھا۔ اشکانی حکمران فرہاد چہارم کے زمانے میں ایک اور خط بھی رائج ہوا، جسے "خطِ پہلوی" کہتے ہیں۔ اس خط میں پہلوی زبان لکھی جاتی تھی۔ براؤن ایک محقق اولز ہاسن (OLSHAUSON) کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "پہلوی[1] زبان صوبہ پرتو یا پارتھیا کی زبان تھی، جہاں سے اٹھ کر اشکانیوں نے یونانیوں کو مغلوب کیا تھا۔ لفظ پرتو نے کئی صورتیں بدلیں۔ پرتو یا پرتوا سے یہ لفظ پرہاو بنا۔ پرہاو سے پلہاو اور پھر پہلاوا ہوا۔ اسی نسبت سے وہاں کی زبان پہلوی کہلائی۔ پہلوی یوں تو محض ایک صوبے پرتو یا پارتھیا کی زبان تھی، لیکن یہ اتنی مشہور ہوئی کہ سارے ایران میں سمجھی اور بولی جانے لگی۔ یہ زبان دائیں سے بائیں کو لکھی جاتی تھی۔"

خطِ پہلوی کی دو قسمیں ہیں ایک کو "خطِ قدیم" یا "خطِ کلدہ" کہتے ہیں۔ اسی خط میں پتھروں پر کتبے کندہ کیے جاتے تھے۔ دوسری قسم کو "خطِ ساسانی" یا "پہلوی کتابی" کہتے ہیں، جس میں کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ پہلوی کا تمام کتابی لٹریچر اسی خط میں ہے۔

پہلوی رسم الخط میں بیشتر الفاظ سامی طریقے کے مطابق لکھے جاتے تھے لیکن فارسی طریقے سے پڑھے جاتے تھے۔ مثلاً "مہ" لکھتے تھے اور "دہ" پڑھتے تھے اسی

---

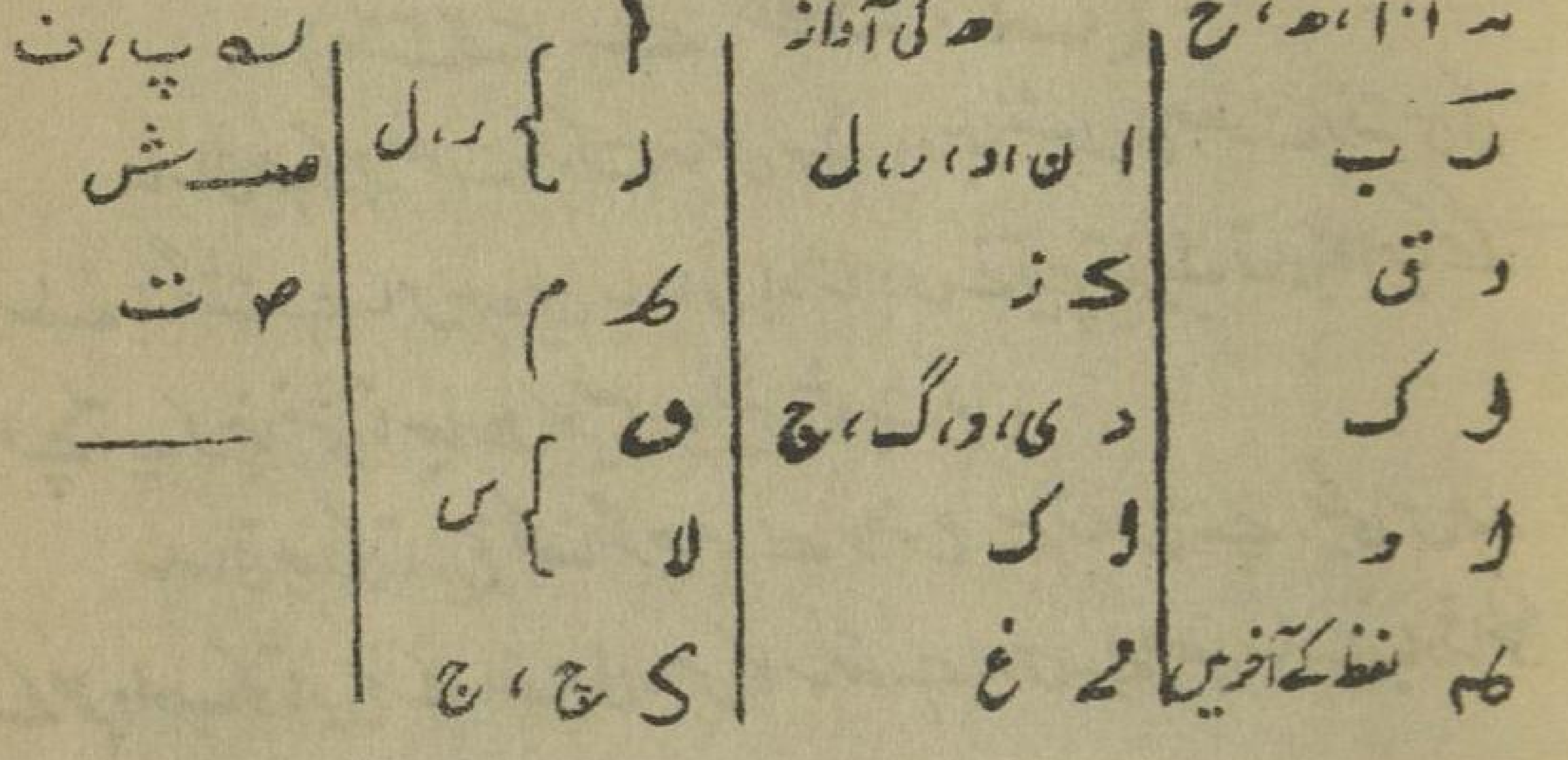
[1] لٹریری ہسٹری آف پرشیا مؤلفہ براؤن جلد اول ص۷۲

تاریخ ادبیات ایران شفق ص۱۳

طرح "ملکاں ملکا" لکھتے اور "شاہنشاہ" پڑھتے تھے۔

پہلوی کے وہ الفاظ جو سامی طرز میں لکھے جاتے اور فارسی طریقے سے پڑھے جاتے تھے۔ انھیں ہزوارش کہتے ہیں۔

خطِ پہلوی کے حروف ابجد حسب ذیل ہیں۔



تیسرا باب

دورِ ساسانیاں

(۲۲۶ء سے ۶۵۲ء تک)

ساسانی عہد کو جو عظمت و شوکت حاصل ہوئی، وہ ہخامنشیوں کی عظمت رفتہ ہی کی صدائے بازگشت ہے۔ اس عہد میں ساسانی بادشاہوں نے قدیم تہذیب تمدن کا احیا کر کے اپنے آپ کو ہخامنشی تاجداروں کا صحیح جانشین ثابت کیا۔

ساسانی عہد کی تاریخ لکھنا اگرچہ ہمارے موضوع سے خارج ہے، لیکن اس عہد کے علم و ادب کو تاریخ کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لیے بعض ساسانی بادشاہوں کے حالات پر سرسری نظر ڈال لینی چاہیے۔

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، ہخامنشی عہد کے آخری تاجدار دارائے سوم کو سکندرِ اعظم نے شکست دی اور سکندر کے بعد اس کے مشہور جرنیل سلیوکس نے ایران میں سیلو کی حکومت قائم کی، جو اسی سال تک جاری رہی۔ سیلو کی حکومت کو اشکانیوں نے ختم کیا۔ اشکانیوں کا عہدِ حکومت پانچ سو سال تک قائم رہا۔ اس طویل عرصے میں بھی ایرانی حکومت پر یونانیوں ہی کا اثر غالب رہا۔ بالآخر مغربی اثر و اقتدار کے خلاف ایک خالص وطنی اور قومی تحریک شروع ہوئی اور اردشیر بابکان نے آخری اشکانی حکمران اردوان پنجم کو شکست دے کر ۲۲۶ء میں اپنے باپ ساسان کے نام پر دورِ ساسانی کی بنیاد رکھی۔

ایران قدیم میں جس خاندان نے بھی نئے عہدِ حکومت کی بنیاد رکھی، اس کے متعلق عجیب و غریب روایتیں مشہور ہوتی رہیں۔ جو دلچسپ اور حیرت انگیز ہونے کی وجہ سے کسی نہ کسی شکل میں صفحات تاریخ میں جگہ پاتی رہیں۔ اسی طرح ساسانی عہد کے بانی

اردشیر کے ابتدائی حالات پر بھی روائتوں کے دھندلکے چھائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ذیل کی ایک قدیم داستان کا ذکر کر دینا بے محل نہ ہوگا جس کا ماخذ پہلوی کتاب کرنامک اردشیر پاپکان ہے، اور جسے فردوسی نے بعینہ شاہنامے میں نظم کیا ہے۔

ایران چھوٹی چھوٹی دو سو چالیس ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ ان ریاستوں کے فرمانروا اشکانی بادشاہ اردوان پنجم کے ماتحت تھے۔ انہی میں ایک پاپک بھی تھا جس کا دارالسلطنت اصطخر تھا۔ اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ پاپک نے ایک رات خواب میں شاہی اصطبل کے چرواہے ساسان کو دیکھا کہ اس کے سر سے آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔ اور اس کی روشنی دنیا کے کونے کونے میں پھیل رہی ہے۔ دوسری رات اس نے پھر ساسان کو خواب میں دیکھا، کہ وہ سفید ہاتھی پر سوار ہے، لوگ جوق در جوق اس کے پیچھے چلے آ رہے ہیں اور سر جھکا کر عقیدت کا اظہار کر رہے ہیں۔ تیسری رات یہ دیکھا کہ ساسان کے گھر سے مقدس آگ کے شعلے نکل نکل کر بلند ہو رہے ہیں۔ اور ساری دنیا کو روشن کر رہے ہیں۔ پاپک ان خوابوں سے سخت متحیر ہوا اور دانش مندوں سے تعبیر پوچھی۔ سب نے متفقہ طور پر کہا کہ ساسان کے گھرانے میں ایک نئی عظیم الشان حکومت کی بنیاد رکھی جائے گی، جس سے دین زرتشتی کا احیا ہوگا۔ آخر پاپک نے ساسان کو باریابی کا شرف بخشا اور جب اسے معلوم ہوا کہ ساسان ہخامنشی خاندان کا چشم و چراغ ہے، تو اس نے اپنی لڑکی اس سے بیاہ دی جس سے اردشیر پیدا ہوا۔

ایک اور دلچسپ حکایت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اردشیر نے جب ہوش سنبھالا، تو اسے اردوان نے اپنے ہاں بلوا بھیجا اور اس کی پرورش محل شاہی میں شہزادوں کے ساتھ ہونے لگی۔ ایک مرتبہ اردوان کے شہزادے اردشیر سمیت شیر کے شکار کو گئے۔ اردشیر نے ایک شیر کو مار گرایا۔ لیکن دربار میں جب شکار کا ذکر آیا، تو یہ ظاہر کیا گیا کہ یہ شیر شہزادوں کے مارا ہے۔ اس پر اردشیر بول اٹھا۔ کہ یہ شیر خود اس نے مارا ہے۔ اردوان اردشیر

کی اس بے باکی پہ سخت برہم ہوا۔ اردشیر نے سوچا کہ اب خیر نہیں، چپکے سے گھوڑے پر سوار ہو کر نکل بھاگا۔ ساتھ ہی دوسرے گھوڑے پر ایک لونڈی بھی سوار ہوئی، جو اردشیر کی تربیت کے لیے مامور تھی۔ اردوان نے اُن کا تعاقب کیا۔ راستے میں پوچھتے تو یہی پتہ چلتا کہ اردشیر اور وہ لونڈی برق رفتاری سے بڑھے چلے جاتے ہیں۔ ان کے پیچھے ایک مینڈھا اتنی ہی تیزی سے بھاگتا جا رہا ہے۔ آخر دوسرے دن جب اردوان کو یہ خبر ملی کہ یہ مینڈھا بھی اردشیر کے گھوڑے کے پیچھے سوار ہو گیا ہے، تو اردوان سمجھا کہ یہ مینڈھا اصل میں "شوکتِ خسروانہ" ہے جو قدرت نے اردشیر کو عطا کی ہے۔ اس لیے وہ واپس آ گیا۔

یوں تو یہ ایک داستان ہی ہے لیکن اس سے پتہ چلتا ہے کہ ساسانی عہد کے بانی اسی "شوکتِ خسروانہ" کے مُدعی تھے، جو قدرت نے ہخامنشی تاجداروں کو عطا کی تھی۔ شوکتِ خسروانہ ایک مقدس امانت سمجھی جاتی تھی، جو صرف بادشاہ کو نصیب ہوتی تھی اور بادشاہت کا حق دار وہی سمجھا جاتا جس کی رگوں میں شاہی خون ہوتا تھا۔ اہلِ ایران اسی عقیدے کے پیرو تھے۔ اسی عقیدے کا یہ اثر تھا کہ ساسانی عہد میں جب بڑے بڑے بااثر جرنیلوں نے بغاوت کی، تو وہ محض اسی وجہ سے تاج و تخت حاصل نہ کر سکے کہ وہ شوکتِ خسروانہ کے امانت دار نہ تھے۔

یہ داستان درست ہے یا نہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اردشیر نے فوج منظم کر کے اشکانی بادشاہ اردوان پنجم کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند کیا اور کرمان کا قلعہ فتح کر لیا۔ یہ قلعہ اس کے نام سے قلعہ اردشیر مشہور ہوا۔ آخری لڑائی ۲۲۶ء میں ہرمز کے مقام پر ہوئی جس میں اردوان مارا گیا۔ اس فتح کے بعد اردشیر نے اپنے باپ کی نسبت سے "ساسانی عہد کی بنیاد رکھی اور خسرو یا کسریٰ کا لقب اختیار کر کے تخت نشین ہوا۔

اردشیر

اردشیر قدیم بادشاہوں کی نسل سے تھا، اور اس بات پر فخر کرتا تھا کہ اس کا نسب نامہ گشتاسپ اور دارائے اعظم سے ملتا ہے۔ اردشیر کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی اوستا[1] کو مرتب کروایا

[1] تاریخ ادبیاتِ ایران مولفہ شفق ص ۱۹۔

جس کا آغاز جیسے کہ پہلے ذکر آیا ہے ایک اشکانی بادشاہ بلاش سوم نے کروایا تھا۔

اردشیر کے عہد سے ایران کی باقاعدہ تاریخ شروع ہوتی ہے۔ اردشیر کے بعد اُس کا بیٹا شاہ پور اوّل تخت نشیں ہُوا۔ اس نے یونانیوں پر متعدد بار حملے کیے آخر ۲۶۰ء میں اس نے یونانی بادشاہ ولیرین کو اسیر کر کے اس کی سلطنت کو سلطنتِ ایران میں شامل کر لیا۔ اس فتح کی یادگار میں اس نے "نقشِ رستم" ایک کتبہ کندہ کرایا۔ نقشِ رستم میں شاہ پور گھوڑے پر سوار ہے اور ولیرین اس کے قدم چومنے کے لیے آگے کو جھکا ہوا ہے۔ ایک اور کتبہ نقش شاہ پور بھی اس کی فتوحات کی یادگار ہے۔

شاہ پور نے زندگی کا بیشتر حصہ امن پسندانہ سرگرمیوں میں گزارا اس کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے شوشتر پر ایک عظیم بند بندھوایا، جو آج تک قائم ہے۔ شہر نیشاپور بھی اس نے بسایا تھا۔

تحریک مانیہ شاہ پور کے عہد میں ایک مشہور مذہبی تحریک چلی جس کا داعی مانی تھا۔ ابوریحان البیرونی لکھتا ہے کہ مانی اشکانی عہد کے آخر میں پیدا ہوا۔ مانی نے ایک مذہب پیش کیا جس نے نہ صرف اہلِ مشرق بلکہ اہلِ مغرب کو بھی متاثر کیا۔ لیکن مخالفین کے ہاتھوں اس کے پیرووں کو طرح طرح کی اذیتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ مشرق میں زرتشتیوں نے ان کے خون سے ہاتھ رنگین کیے اور مغرب میں عیسائیوں نے ان پر ظلم و ستم کرنے میں کوتاہی نہ کی۔

مشہور مؤرخ گبن رقم طراز ہے کہ مانی نے حضرت عیسیٰؑ اور زرتشت کے بعض دینی عقائد کو ملا کر ایک نئے دین کی بنیاد رکھی۔ یہ ایک ایسی کوشش تھی جس سے مانی نے عیسائیوں اور آتش پرستوں کو اپنا دشمن بنا لیا۔

ثنویت ۔ مانی نے تخلیق کائنات کے متعلق یہ نظریہ پیش کیا کہ کائنات کے دو خالق ہیں، ایک نیکی کا خالق ہے، دوسرا بدی کا۔ روشنی اور تاریکی دو جاودانی اصول ہیں۔ جو چیز اچھی اور مفید ہے۔ روشنی سے منسوب ہے۔ اور جو بُری اور ضرر رساں ہے، وہ تاریکی سے متعلق

ہے۔ پہلے یہ روشنی اور تاریکی الگ الگ تھیں۔ لیکن جب یہ آپس میں ملیں تو اس کے نتیجے میں یہ کائنات وجود میں آئی۔ یہ روشنی اور تاریکی جب پھر الگ ہوں گی، تو کائنات ختم ہو جائے گی۔ جو شخص دنیا میں رہ کر دنیاداری نہ زندگی گزارتا ہے، وہ گویا بدیوں میں اضافہ کرنے کا موجب ہے۔

ثانویت کا عقیدہ تو زرتشت نے بھی پیش کیا تھا، لیکن وہ اپنے پیروؤں کو تلقین کرتا تھا کہ دنیادار بنو۔ دنیا میں رہ کر دنیا کو آباد کرو۔ لیکن مانی اس کے برعکس یہ تلقین کرتا تھا کہ بدیوں سے بچنے کے لیے دنیا سے کنارا اختیار کرو۔ مانی نے اپنے یہ عقائد شاہ پور کی تاج پوشی کے موقع پر ۲۴۲ء میں پیش کیے اور شاہ پور کے بھائی فیروز کی وساطت سے، جو مانی مذہب اختیار کر چکا تھا، اس جشن میں شریک ہوا۔ شاہ پور بھی اس نئے مذہب کی طرف قدرے مائل تھا، لیکن مانی اپنے مذہب کی نشر و اشاعت کے لیے ہندوستان، چین اور تبت میں پھرتا پھرتا رہا، اس لیے شاہ پور کھلم کھلا اس مذہب کو قبول نہ کر سکا۔ مانی کافی عرصے بعد جب ایران واپس آیا، تو اس وقت حکومت کی باگ ڈور بہرام اوّل کے ہاتھوں میں تھی جس نے ۲۷۳ء سے ۲۷۶ء تک حکومت کی۔ بہرام اوّل مانی کے عقیدوں کو نسلِ انسانی کے لیے نہایت مہلک سمجھتا تھا، چنانچہ اس نے مانی اور مانی کے پیروؤں کا قتلِ عام کرایا۔

مانی کی تصنیفات:۔ مانی[1] نے سات کتابیں تصنیف کیں جن میں چھ شامی زبان میں ہیں اور ایک پہلوی میں ہے، جس کا نام "شاہ برقان" ہے۔ یہ کتاب اس نے شاہ پور (۲۴۰ تا ۲۷۱ء) کے لیے لکھی تھی۔ دوسری کتابوں میں جو رسم الخط مانی نے استعمال کیا ہے، وہ مانی کی اپنی ایجاد ہے۔ مانی ایک مشہور مصوّر تھا اس نے اپنا ایک مرقع تیار کیا، جو "ارژنگ مانی" کے نام سے مشہور ہوا، اس نے پیغمبری کا دعویٰ کیا تو وہ اپنی پیغمبری کے ثبوت میں اسی مرقع کو معجزے کے طور پر پیش کیا کرتا تھا۔

---

[1] لٹریری ہسٹری آف پرشیا مولفہ براؤن جلد اوّل ص ۱۵۴

شاہ پور کے جانشین:۔ شاہ پور اوّل کے بعد بہرس دس، بہرام چہارم، یزدگرد، بہرام گور، یزدگرد دوم یکے بعد دیگرے حکمران رہے۔ ان کے بعد قباد بادشاہ بنا۔ قباد کے زمانے میں ایک اور شخص نے پیغمبری کا دعویٰ کیا جس کا نام مزدک تھا۔

مزدک کی تعلیم

مزدک کا مقصد انسانی مساوات کو بحال کرنا تھا۔ اس کا خیال تھا حسد، لالچ اور غصہ وہ برائیاں ہیں جو انسانی مساوات کو تباہ کرتی ہیں، اس لیے ان سے بچنا چاہیے۔

مشہور مستشرق نولدکی لکھتے ہیں کہ مزدک کے نئے مذہبی عقائد کی بنیاد سیاست پر قائم تھی وہ چاہتا تھا کہ آتش پرست امرا اور موبدوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کا خاتمہ کرے۔ قباد نے مزدکی عقاید کو تسلیم کرلیا، بالآخر یہی عقاید اس کی تخت سے دست برداری کا سبب بنے۔

مزدکیوں کا قتلِ عام

قباد کے بیٹے خسرو اول نے فتنہ مزدک کی بیخ کنی کرنے کے لیے ۵۲۸ء کے آخر میں مزدک کے پیرووں کا قتلِ عام کرایا اور خود مزدک کا بھی وہی حشر ہوا جو اس کے پیرووں کا ہوا۔ مزدکی فتنے کو ہمیشہ کے لیے خاموش کردینے کی وجہ سے خسرو اوّل کو انوشیروان یعنی نوشیرواں کا لقب ملا جس کا مطلب ہے غیرفانی روح۔ بالآخر وہ تاریخ میں نوشیروان عادل کے نام سے مشہور ہوا۔

نوشیروان

نوشیروان کو تاریخ ایران میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس کو شاہانہ اوصاف کا کامل نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے دامن پر مزدکیوں کے خون کے دھبے ضرور ہیں۔ لیکن مزدک کی تعلیم ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ کئی اعتبار سے خطرناک ثابت ہوسکتی تھی۔ مثلاً مزدک اشتراکیت کا شدید ترین حامی تھا۔ اس کی اشتراکیت کا دائرہ عمل بہت وسیع تھا۔ وہ عورتوں پر بھی مشترکہ حقِ شوہریت کا حامی تھا۔ اس طرح گویا وہ اس صنفِ لطیف کو بازیچہ اطفال بنا دینا چاہتا تھا۔ یہ تعلیم یقیناً مخربِ اخلاق تھی۔ اگر اس تعلیم کی حوصلہ افزائی کی جاتی، تو اخلاقی، قومی اور ملکی تباہی میں

کسے شبہہ ہو سکتا تھا۔ اسی لیے مزدک اور مزدکیوں کے قتلِ عام کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔

نوشیرواں کو اس فعل کی وجہ سے مذہبی جنونی نہیں سمجھا جا سکتا، کیونکہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ نوشیرواں کو دوسرے مذاہب کے مطالعہ کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس کا یہ شوق ہمیں عباسی خلیفہ المامون اور اکبرِ اعظم کی یاد دلاتا ہے، جن کے درباروں میں ہر شخص مذہبی خیالات بڑی آزادی سے پیش کر سکتا تھا۔

نوشیرواں نے ملکی خوش حالی کے لیے نہایت مفید قوانین بنائے۔ زراعت، تجارت اور ملکی رسل و رسائل کی طرف خاص توجہ دی۔ خارجی استحکام کے لحاظ سے اس نے ایران کو ناقابلِ تسخیر بنا دیا۔ اس کے عہدِ حکومت میں ملک خوش حال اور عوام پُر امن تھے۔ باہر سے آنے والے سیاحوں کی بڑی قدر و منزلت کی جاتی تھی۔

نوفلاطونیت

نوشیرواں کے دربار میں یونان سے سات فلسفی آکر پناہ گزین ہوئے تھے، جنھیں بادشاہِ یونان جسٹینن نے مذہبی تعصب کی بنا پر ملک بدر کر دیا تھا۔ ان فلسفیوں کی دربارِ ایران میں بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ یہ لوگ فلاطونی تعلیم کے مبلغ تھے، ان کے فلسفہ تعلیم کو نوفلاطونیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پروفیسر براؤن[1] کا خیال ہے کہ عجمی تصوف اس نوفلاطونیت ہی کی وجہ سے ظہور میں آیا تھا۔

اشاعتِ علم

نوشیرواں علم و فضل کا بہت بڑا محسن تھا۔ اس کے حکم سے فلاطون اور ارسطو کی کتابیں پہلوی میں ترجمہ ہوئیں، جو اکثر اس کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔ اس نے جندے شاہ پور میں ایک یونیورسٹی بنوائی، جس میں فلسفہ، طب اور دوسرے متعدد علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ نوشیرواں کے حکم سے ایک کتاب "خدائی نامک" پہلوی میں لکھی گئی، جسے نثر کا شاہنامہ سمجھنا چاہیے۔ ہندوستان کی مشہور کتاب "کلیلہ دمنہ" اس کے حکم سے

---

[1] لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد اوّل ۴-۲۰۳

پہلوی میں ترجمہ کرائی گئی۔ اس زمانے میں ایران مشرق و مغرب کے علوم کا بہت بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا۔

حکیم بزرجمہر نوشیرواں کا ذکر اس کے دانشمند وزیر بزرجمہر کے بغیر نامکمل رہ جاتا ہے۔ یہ ساسانی عہد کا بہت بڑا عالم تھا۔ شروع شروع میں بزرجمہر نوشیرواں کے شہزادہ ہرمز کا اتالیق مقرر ہوا۔ پھر ترقی کرتے کرتے وزارت کے عہدے پر فائز ہوا۔ نوشیرواں کی بیشتر ملکی اصلاحات کا ذمہ دار بزرجمہر ہی تھا۔

نوشیرواں کی پریشانی نوشیرواں کے عہدِ آخر میں بعض ایسے واقعات رونما ہوئے، جن کے نتائج بہت دُور رس تھے۔ یمن کا زرخیز علاقہ اسی سال فتح ہو کر سلطنت ایران کا جزو بنا۔ اور پھر اسی سال مکہ معظمہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی۔ جن کی تعلیمات سے دین زرتشتی کا زوال پذیر ہونا مقدر ہو چکا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ کی شبِ ولادت، نوشیرواں نے خواب دیکھا کہ ایران میں ہولناک زلزلہ آیا ہے، جس سے محل شاہی کے چودہ کنگرے گر گئے ہیں۔ ساوہ ندی کا پانی خشک ہو گیا ہے۔ آتش کدوں کی وہ مقدس آگ، جو ہزاروں سال سے لگاتار جل رہی تھی، دفعتہً بجھ گئی ہے۔ ان علامات سے نوشیرواں سخت بے چین ہوا۔ اس نے کاہن سے خواب کی تعبیر پوچھی۔ کاہن نے خواب کی تعبیر یوں کی کہ آپ کے بعد چودہ ساسانی بادشاہ اور بھی حکومت کریں گے۔ ان کے بعد یہاں عربوں کی حکومت قائم ہو جائے گی۔ نوشیرواں کو یہ سن کر قلق تو بے حد ہوا کہ ساسانی بادشاہت ختم بھی ہو سکتی ہے، لیکن اس بات سے کچھ تسلی بھی ہوئی کہ اس کے بعد اسی خاندان کے چودہ اور بادشاہ بھی ہوں گے۔ لیکن یہ کون کہہ سکتا تھا کہ ان چودہ بادشاہوں کی حکومت پچھتر سال کے عرصے ہی میں ختم بھی ہو جائے گی۔

نوشیرواں کا شجرۂ نسب

ساسان

اردشیر ۲۴۰ تا ۲۷۱ ء

شاہ پور اوّل ۲۷۱ تا ۲۷۱ ء

ہرمز اوّل ۲۷۱ تا ۲۷۲ ء

بہرام اوّل ۲۷۲ تا ۲۷۵ ء

بہرام دوم ۲۷۵ تا ۲۸۲ ء

بہرام سوم ۲۸۲ تا ۲۹۲ ء

نرسس ۲۹۲ تا ۳۰۱ ء

ہرمز دوم

شاہ پور اعظم ۳۰۹ تا ۳۷۹ ء

اردشیر دوم ۳۷۹ تا ۳۸۳ ء

شاہ پور سوم ۳۸۳ —— ۳۸۸ ء

بہرام چہارم ۳۸۸ —— ۳۹۹ ء

یزدگرد اوّل ۳۹۹ —— ۴۲۰ ء

بہرام گور ۴۲۰ تا ۴۴۰ ء

یزدگرد دوم ۴۴۰ تا ۴۵۷ ء

ہرمزد ۴۵۷ تا ۴۸۴ ء

فیروز

قباد ۴۸۷ تا ۵۳۱ ء

نوشیرواں عادل ۵۳۱ تا ۵۷۸ ء

ساسانی عہد کا زوال

نوشیرواں نے ۵۷۸ء میں جہانِ فانی کو خیرباد کہا۔ اس عظیم المرتبت شہنشاہ کی وفات کے فوراً بعد ساسانی عہد کا زوال شروع ہو گیا۔ حکومت کے خلاف طرح طرح کی ریشہ دوانیاں اور سازشیں ہونے لگیں۔

نوشیرواں کے بیٹے انوشزاد نے جو عیسائی تھا، نوشیرواں کی زندگی میں اس کے خلاف بغاوت کردی۔ بھائیوں میں خون ریز لڑائیاں ہوئیں۔ بالآخر ہرمزد چہارم تخت نشیں ہوا۔ ہرمزد نااہل بادشاہ تھا، اس نے اپنے ایک بہادر جرنیل بہرام چوبیں سے توہین آمیز سلوک کیا، اس نے توہین کا انتقام لینے کے لیے علم بغاوت بلند کیا۔ ہرمزد مارا گیا اور خسرو پرویز ۵۹۰ء میں تخت نشین ہوا۔ خسرو نے اپنا ایلچی بہرام چوبیں کے پاس مصالحت کے لیے بھیجا۔ لیکن بہرام نے یہ کہلا بھیجا، اب تلوار ہی فیصلہ کرے گی کہ یہ تخت و تاج کس کا ہے۔ چنانچہ خسرو پرویز اور بہرام کے درمیان خونریز جنگ ہوئی جس میں بہرام چوبیں کو فتح ہوئی اور خسرو نے راہ فرار اختیار کرکے بادشاہ ماریس[1] کے ہاں پناہ لی۔

ابھی ایک سال بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ خسرو پرویز رومی بادشاہ سے کمک حاصل کرکے ایران آیا۔ بہرام نے ہر چند مقابلہ کیا لیکن آخر اسے بھاگتے ہی بنی۔ اور خسرو پرویز پھر ۵۹۱ء میں ایران کا تخت و تاج حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ خسرو نے ۵۹۱ء سے ۶۲۷ء تک حکومت کی، لیکن اس عہد میں سازشوں کے جال بچھے رہے بالآخر یہ تاجدار ایران اپنے بیٹے شیرویہ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ خسرو پرویز کو کون نہیں جانتا۔ یہ وہی ساسانی بادشاہ ہے جو اپنے خزانوں، گھوڑوں، محلوں اور سب سے بڑھ کر اپنی محبوبہ شیریں کی وجہ سے مشہور ہے۔

شیرویہ ۶۲۸ء میں تخت نشیں ہوا، تو اس نے اپنی چند ماہ کی حکومت کے دوران اپنے اٹھارہ بھائیوں کو قتل کیا۔ بالآخر وہ بھی ۶۲۹ء میں طاعون کا شکار ہوگیا۔ داخلی بدنظمی اور بدامنی کا دور دورہ تھا اور ادھر مسلمانوں کی طاقت روز بروز بڑھتی جارہی تھی جس سے بالآخر ساسانی بادشاہ کو نبرد آزما ہونا تھا۔ خسرو پرویز کو بھی نوشیرواں کی طرح مستقبل کے اشارات نظر آتے رہے۔ مشہور مؤرخ طبری ایسے تین اشارات کا ذکر کرتا ہے۔

روایت ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے خسرو پرویز کے نام مراسلہ ارسال فرمایا۔ جس میں آنحضرت نے دعوت حق پیش کی، لیکن خسرو نے اسے درخور اعتنا نہ سمجھا۔ مراسلے

---

[1] بادشاہ روم

کا مضمون یہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد رسول اللہ کی طرف سے ——— خسرو بن ہرمز کے نام

وہی خدا ہے، جس نے مجھے بچایا، جب کہ میں یتیم رہ گیا تھا، مجھے دولت و ثروت بخشی جب کہ میں مفلس تھا۔ مجھے راستہ دکھایا، جب کہ میں گمراہی میں بھٹکتا تھا۔ جس پیغام کے پہنچانے کے لیے مجھے مامور کیا گیا ہے، اس پیغام کو صرف وہی رد کرتا ہے، جو عقل سے بیگانہ ہے اور جس کو مصیبت نے گھیرا ہوا ہے۔ خسرو! ایمان لے آؤ تو تم بچ جاؤ گے، ورنہ خدا کے ساتھ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ، جیسے وہ بے بس نہیں رہنے دیگا۔ خدا حافظ"

روایت ہے کہ خسرو پرویز نے اس مراسلے کو چاک کر ڈالا جس پر ایلچی چلّا اٹھا "اے ناپاک بادشاہ! اسی طرح خدا تمہاری سلطنت کے ٹکڑے کرے گا، اور تمہارے لشکروں کو منتشر کر دے گا۔"

اس کے بعد خسرو پرویز کو اپنے زوال کی بعض علامتیں بھی نظر آنے لگیں۔ خواب میں اُسے ایک فرشتہ نظر آیا جس نے ایک عصا ہاتھ میں لے کر توڑ دیا۔ یہ عصا ایرانی قوت و شوکت کا مظہر تھا۔ پھر اُسے دیوار پر غیبی ہاتھ کا لکھا ہوا نظر آیا۔

"اے کمزور بنیان شخص! تحقیق خدا نے اپنے بندوں کے لیے اپنا رسولؐ بھیجا ہے اور اُس پر اپنا کلام اتارا ہے۔ پس تسلیم کرو اور ایمان لے آؤ اور وہ تمہیں اس دنیا اور اگلی دنیا کی نعمتیں بخش دے گا۔ اور اگر یہ نہ کرو گے، تو تم عنقریب تباہ ہو جاؤ گے۔ تمہاری سلطنت چھن جائے گی اور تمہاری قوت و شوکت سلب ہو جائے گی۔"

ایک اور علامت یہ ظاہر ہوئی کہ بصرہ کے قریب جو دجلہ کی طغیانیوں سے بچنے کے لیے بند بندھوایا گیا تھا اس میں دفعتہً شگاف آ گیا۔

ایک تاریخی واقعہ یہ ظہور میں آیا کہ ذوقار کے مقام پر عربوں اور ایرانیوں کے مابین لڑائی

ہوئی جو ۶۰۴ سے ۶۱۰ تک جاری رہی۔ اس لڑائی کی اہمیت اگرچہ کچھ بہت بڑی تو نہ تھی لیکن اس سے عربوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ گو ایرانیوں کو بہت بڑی شان و شوکت حاصل ہے، ان کا تمدن بھی بہت ترقی یافتہ ہے، ان کے پاس دولت کے خزانوں کی بھی کمی نہیں، لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس قوم پر فتح پانا ناممکن نہیں ہے۔

شیرویہ کے بعد اس کا خوردسال بیٹا اردشیر تخت نشیں ہوا۔ لیکن بہت جلد اپنے جرنیل شہر براز کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اُس کے بعد اس کی بہن پوران دُخت تخت نشیں ہوئی۔ لیکن سولہ ماہ کی حکومت کے بعد راہی ملک بقا ہوئی۔ اس کے بعد خسرو کے چچیرے بھائی فیروز نے حکومت سنبھالی، لیکن ایک ماہ حکومت کرنے کے بعد وہ بھی قتل ہوا۔ پھر پوران دُخت کی بہن آزرمی دُخت تخت نشیں ہوئی، لیکن جلد ہی رستم کے ہاتھوں قتل ہو گئی، جو ایران کا ایک مشہور جرنیل تھا۔ وہ خود بھی چار سال بعد مسلمانوں کے خلاف جنگ کرتے ہوئے ۶۳۵ء میں قادسیہ کے مقام پر مارا گیا۔

آزرمی دخت کے بعد خسرو سوم، خرہ زاد، خسرو، فیروز، فرخ زاد، اور ہرمز یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ آخر خسرو پرویز کے پوتے یزدگرد کو جو اصطخر میں گمنامی کی زندگی گزار رہا تھا، ۶۳۴ء میں تخت نشیں کیا گیا۔ اس نے اپنی ہمت اور شجاعت سے ساسانی قصرِ حکومت کو سہارا دینا چاہا، لیکن حادثات کے زلزلوں نے جس قصر میں جگہ جگہ شگاف پیدا کر دیئے ہوں، اسے کوئی سہارا گرنے سے نہیں بچا سکتا۔

یزدگرد کے زمانے میں ہمسایہ ملک عرب میں اسلامی خلافت اپنے عروج کی منزلیں طے کر رہی تھی۔ مسلمان مجاہد اشاعت اسلام کو اپنا سب سے بڑا فرض سمجھتے تھے۔ خسرو پرویز کو آنحضرتؐ نے اسلام کی دعوت دی تھی۔ ایک مرتبہ پھر اسے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں دین حق قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔

جنگ ذات السلاسل | ۱۲/۱۳ھ مطابق ۶۳۳-۶۳۴ء میں حضرت خالد بن ولیدؓ خلیج

فارس کے قریب ایران کی سرحد پر آئے اور مغربی ایران کے گورنر ہرمز کو پیغام بھیجا

"تم خدائے واحد پر ایمان لے آؤ، تو محفوظ رہو گے، ورنہ خراج ادا کرنا قبول کرو۔ خراج ادا کرنے سے انکار کرو گے، تو تم خود ذمہ دار ہو گے۔ مسلمانوں کا لشکر تمہارے سر پر کھڑا ہے، اور مسلمان موت کو ویسا ہی عزیز سمجھتے ہیں جیسے تم زندگی کو سمجھتے ہو۔"

آخر حفیر کے مقام پر مسلمانوں اور ایرانیوں میں جنگ ہوئی۔ جس میں مسلمان کامیاب ہوئے۔ یہ لڑائی جنگِ سلاسل کے نام سے مشہور ہے کیونکہ ایرانی گورنر کے حکم سے متعدد ایرانی سپاہیوں کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دی گئی تھیں، تاکہ وہ بھاگ نہ سکیں۔ اس فتح میں بہت سا مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔

جنگِ پل[1] یا قس الناطف

دوسری جنگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں سنہ ۱۳ھ بمطابق ۶۳۴ء میں ہوئی۔ اس جنگ میں ایرانی لشکر کا سپہ سالار رستم فرخ زاد تھا اور عرب لشکر کے سالار ابو عبید بن مسعود ثقفی تھے۔ جنگ کی ابتدا میں ایرانیوں کا پلہ بھاری تھا، چنانچہ ابو عبید ایک سفید ہاتھی کے پاؤں تلے کچلے گئے اور چار ہزار مسلمانوں نے شہادت کے جام نوش کیے۔ اور فرات کے دائیں ساحل کا علاقہ بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ لیکن اس نازک موقع پر لشکرِ ایران میں قیادت کے مسئلے پر پھوٹ پڑ گئی۔ بالآخر مسلمانوں نے مثنیٰ بن حارثہ شیبانی کی سرکردگی میں اپنی شکست کا نہایت شدید انتقام لیا اور کھوئے ہوئے علاقوں کو پھر ایرانیوں سے لے لیا۔

جنگِ قادسیہ

یہ جنگ سنہ ۱۴ھ مطابق ۶۳۵ء ۶۳۶ء کے آخر میں ہوئی۔ جب لشکرِ اسلام شام اور مصر کی فتوحات سے فراغت پا چکا تھا۔ اس جنگ میں مسلمانوں

---

[1] یہ جنگ پل کے نام سے اس لیے منسوب ہے کیونکہ ابو عبیدہ نے فرات پر پل بندھوا کر اپنی فوج کو پار اتارا تھا۔

کے لشکر سالار سعد بن ابی وقاص تھے۔ ادھر رستم فرخ زاد کو یزدگرد نے ایرانیوں کا لشکر جرار دے کر مسلمانوں کے مقابلے کے لیے بھیجا۔ قادسیہ کے مقام پر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ یہ لڑائی متواتر چار دن اور چار رات ہوتی رہی، ایرانیوں نے بڑی پامردی دکھائی، لیکن بالآخر رستم، ہلال بن علقمہ کے ہاتھوں مارا گیا اور ایرانیوں کو شکست ہوئی۔ ایرانیوں کا علم، جو درفش کاویانی کے نام سے مشہور تھا، عربوں کے ہاتھوں میں آگیا، اور مسلمان دجلہ اور فرات کے درمیانی علاقے پر قابض ہو گئے۔

جنگ مدائن

جنگِ قادسیہ سے فراغت پاکر سعد بن وقاص رضؓ مدائن کی طرف بڑھے اور اسے بھی فتح کر لیا۔ اس فتح سے ساسانی بادشاہوں کا دارالسلطنت بھی مسلمانوں کے تسلط میں آگیا۔ یزدگرد دارالسلطنت کو چھوڑ کر حلوان کے مقام پر آگیا۔ سعد وقاص رضؓ نے اس کے تعاقب میں اپنا لشکر ہاشم بن عتبہ رضؓ کی سرکردگی میں بھیجا۔ جلولار کے مقام پر عرب و عجم کے لشکروں کی مڈبھیڑ ہوئی۔ یہاں بھی عربوں کو فتح ہوئی اور ایرانی مغلوب ہوئے۔

جنگِ نہاوند

تین مشہور جنگوں کے بعد ابھی ایک اور جنگ باقی تھی جس میں عرب و عجم کی قسمت کا فیصلہ ہونا تھا۔ وہ یہ جنگ نہاوند تھی، جو سنہ ٢١ھ مطابق سنہ ٦٤٢ء عیسوی میں ہوئی۔ پچھلی تین جنگوں میں بھی یزدگرد کے لشکر نے بڑی پامردی سے ملک کی مدافعت کی تھی۔ اس جنگ میں خراسان، رے، ہمدان اور نہاوند سے لشکرِ جرار فراہم کیا گیا، جس کی تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار بتائی جاتی ہے۔ اس لشکرِ عظیم کا سپہ سالار فیروزان مقرر ہوا۔ ادھر تیس ہزار مسلمان نعمان بن مقرن رضؓ کی سرکردگی میں آگے بڑھے۔ نہاوند کے مقام پر آخری فیصلہ کن جنگ ہوئی، جو تین دن تک جاری رہی۔ دونوں فوجوں کے ہزاروں آدمی اس جنگ میں کام آئے۔ مسلمانوں کے لشکر کی کمان حذیفہ بن یمان نے ہاتھ میں لی۔ بالآخر مسلمانوں کو یہاں فتح حاصل ہوئی۔ یزدگرد کو شکست کا حال معلوم ہوا، تو اس کی رہی سہی ہمت بھی جاتی رہی۔ وہ اس وقت رے میں تھا۔ رے سے اصفہان کا رُخ کیا، وہاں سے کرمان، مرو، بلخ اور

میں سرگرداں پھرتا رہا۔ اسی اثنا میں وہ لشکر فراہم کرنے کے لیے اپنے اور بیگانے سے مدد کا طالب ہوا۔ فغفور چین اور خاقان ترک سے مدد مانگی، لیکن اس آوارہ دیار کی کسی نے دست گیری نہ کی۔ بالآخر اس نے جان بچانے کے لیے ایک آسیابان کے ہاں پناہ لی، جس کا نام فردوسی نے خسرو بتایا ہے۔ اس آسیابان نے قیمتی لباس اور بیش بہا جواہرات کے لالچ میں، جو شہنشاہ کی آخری متاع، اور بادشاہت کا آخری نشان تھا، اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور اس طرح ۶۱۳ سالہ عظیم ساسانی عہد کا چراغ گل ہو گیا۔

مسلمانوں کا تسلط جنگ نہاوند کے بعد رے، اصفہان، آذربائیجان، خوزستان، فارس، سیستان، مکران اور قزوین وغیرہم علاقے عربوں کے تسلط میں آ گئے اور آخر میں خراسان کے علاقہ پر بھی ان کا تصرف ہو گیا۔ گیلان اور طبرستان کے دور دست علاقوں میں البتہ ۷۶۹ء تک ایرانیوں ہی کی خودمختار حکومتیں قائم رہیں۔

ادبیات پہلوی

پہلوی زبان پہلوی فارسی قدیم سے مشتق ہے۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ فارسی قدیم کے الفاظ و تراکیب میں رفتہ رفتہ تبدیلیاں ہوتی گئیں خط تصویری کے عناصر غیر ضروری سمجھ کر متروک ہو گئے اور اس تبدیل شدہ زبان نے پہلوی نام پایا۔ کچھ اور تبدیلیاں ہوئیں، تو پہلوی نے موجودہ فارسی کی شکل اختیار کی پہلوی اور موجودہ فارسی میں اتنی مشابہت اور یکسانیت پائی جاتی ہے۔ کہ اگر کلاسیکی فارسی میں سے عربی کے الفاظ نکال دیئے جائیں وہ قریب قریب پہلوی ہی ہو جاتی ہے۔ اور بہ آسانی سے سمجھی بھی جا سکتی ہے۔ رضازادہ شفق[1] نے

---

[1] تاریخ ادبیات ص ۲۲

پہلوی زبان کی حسب ذیل مثالیں دی ہیں۔

از کتاب گجستک اَبالش :۔

ایدون گوینیَ کو گجستک اَبالش زندی از استخر بود۔ مردی وہ زبان دوست بوذ۔ او روزی گرسنہ (گرسک)، وتشنہ آتشگاسی آمد کو باتر گیرم اد او نو کس نبود۔

اس عبارت کی موجودہ صورت یہ ہے۔

چنیں گویند کہ ملعون ابالش زندی از استخر بود۔ مرد خوب روان (مہربان) ودوست بود وروزی گرسنہ وتشنہ بہ آتشیں گاہ کہ باج[1] گیرد آنجا کس نبود

از کارنامگی اردشیر پاپکان":

پہ کارنامگی ارتخشیر پاپکان ایتوں نپشت کو پس اچ مرگی الکساندر رومیک ایرانشتر ۲۴۰ کوتک خوتائی بود اسپہان او پارس اوکوستیھای اودیش پہ دستی اردوان سردار بوذ۔ پاپک مرزبان اوشترداری پارس بوذ۔

اس کی موجودہ صورت یہ ہے

بہ کارنامہ اردشیر بابکان چنیں نوشتہ است کہ پس از مرگ اسکندر رومی ایرانشہر ۲۴۰ کتخدائی[2] بود۔ اصفہان وپارس واطراف آں بدست اردوان سردار بود۔ بابک مرزبان وشہردار فارس بود۔

ادبیات پہلوی

پہلوی ادب زیادہ تر دین زرتشتی کی اخلاقی اور مذہبی کتابوں پر مشتمل تھا۔ مذہبی کتابوں کے علاوہ داستانوں اور حکائتوں کی کتابیں بھی تھیں، لیکن جب عربوں کا ایران پر غلبہ ہوا تو جہاں پہلوی رسم الخط مٹ گیا۔ وہاں پہلوی کی متعدد کتابیں بھی کالعدم ہوگئیں۔ ان کتابوں کا نام محض تذکروں میں باقی رہ گیا۔ انہی میں علم وفلسفہ کی وہ کتابیں بھی

---

[1] باج بمعنی برکت یا فیض

[2] لغات: ایتون، ایدوں، چنیں، اچ، از۔ کوتک خدائی، کتخدائی، حکومت۔ کوستی، ساحل، کنار، اطراف۔ اودیش، ایشاں، او

تھیں، جو نوشیرواں عادل کے زمانے میں یونانی اور سنسکرت میں ترجمہ ہوئیں۔ ہاں البتہ پہلوی کی وہ کتابیں ضرور موجود ہیں، جو دوسری صدی ہجری میں آتش پرست مصنفوں نے لکھی تھیں۔ بہار نے سبک شناسی حصۂ اوّل میں پہلوی کتابوں کی حسب ذیل فہرست دی ہے

۱۔ وندیداد
۲۔ یسنا
۳۔ نیرنگستان
۴۔ ویشتاسپ یشت
۵۔ ویسپ رذ
۶۔ فرہنگ دایم۔ ہاوک
۷۔ اوہرمزد یشت
۸۔ بہرام یشت
۹۔ ھادُخت نسک
۱۰۔ ہاوُگما وائیچا
۱۱۔ چیتک اوپستاک گاسان
۱۲۔ اتھش نیایش
۱۳۔ دُچر کرت دینیک
۱۴۔ آفرینکان گاھنبار
۱۵۔ ھپتان یشت
۱۶۔ سروش یشت ھادُخت
۱۷۔ سی روچک بزرگ
۱۸۔ سی روچک کوچک
۱۹۔ خورشید نیایش
۲۰ آبان نیایش
۲۱ آفرینکان دھمان
۲۲ آفرینکان گاتھ
۲۳۔ خورشید یشت
۲۴ ماہ یشت
۲۵۔ قطعۂ ازیشت
۲۶۔ آفرینکان فروردگان
۲۷۔ ماہ نیایش

اخلاقی، دینی اور ادبی کتابیں

۲۸۔ دین کرت
۲۹ بُن دھش
۳۰۔ داستان دینیک
۳۱ تفسیر بر وندیداد

۳۲ - روایات پهلوی

۳۳ - روایات همت اشوهشتان

۳۴ - دینیک وچرکرت

۳۵ - منتخبات از زاتسپرم

۳۶ - شکند گمانیک وچار

۳۷ - شائست نی شائست

۳۸ - داستان مینوک خرت

۳۹ - نامه های منوچهر

۴۰ - ارتائی ویراژ نامک

۴۱ - ستایشن سی روزه کوچک

۴۲ - جاماسپ نامک

۴۳ - بهمن یشت

۴۴ - ماتیکان یوشت فریان

۴۵ - پرسشهائیکه بآیات اوستا پاسخ داده شده است

۴۶ - اندرج اتوربات مارسپندان

۴۷ - پتیت ایرانیک

۴۸ - پند نامک وزرگ میتر بوختکان

۴۹ - پتیت اتوربات مارسپندان

۵۰ - پندنامک زرتشت

۵۱ - اندرج اوشنر دانک

۵۲ - آفرین شش گاهنبار

۵۳ - واچکی ایچند اتوربات مارسپندان

۵۴ - ماتیکان گجستک ابالش

۵۵ - ماتیکان سی روچ

۵۶ - پتیت وترتکان

۵۷ - پتیت خوت

۵۸ - ماتیکان هپت امهرسپنت

۵۹ - اندرزهانی به هروبیتان

۶۰ - اندرز دستوران به بهدینان

۶۱ - خصائص یک مرد شادمان

۶۲ - ماتیکان ماه فروردین روچ خوردت

۶۳ - آفرین هفت امهرسپندان

۶۴ - پدری پسر خود را تعلیم دهد

۶۵ - ستایش درون

۶۶ - آفرین ارتا فروشی

۶۷ - اندرز داناک مرت

۶۸ - اشیرواد

۶۹ - آفرین میزد

۷۰ - اندرج خسروکواتان

۷۱ - چم درون (زبان مقدس)

۷۲ - نامه اوهرمزد

۷۳ - سخنان اتور فرنبغ و بوخت آفرید

۷۴ - نیرنگ بوی داتن

۷۵ - نام ستایشینہ

۷۶ - پنج دستور از موبدان دوہ پند برائے بہدنیان

۷۷ - آفرین وزرگان

۷۸ - آفرین گاہنبار چشینہ

۷۹ - اور متن شہ وہرام ورجاوند

۸۰ - داروک خرسندیہ

۸۱ - پاسخ ہای سہ مرد دانش مند بشاہ

۸۲ - ماتیکان سی یزتان

غیر دینی کتابیں

۸۳ - قانون مدنی پارسیان در عہد ساسانی

۸۴ - کارنامک ارتخشر پاپکان

۸۵ - ادی واتکار زریران

۸۶ - خسرو کواتان وریدک

۸۷ - فرہنگ پہلویک

۸۸ - ابیادوین ماتک نپشتن

۸۹ - شترہای ایران

۹۰ - وچارشن چترنگ

۹۱ - درخت آسوریک

۹۲ - ابرستایشنی ماریہ سور آفرین

۹۳ - اندیہا و سہیکیہای سگستان

۹۴ - اندرج پیشیکان

۹۵ - چینیاک اندرج فریود کیشان

۹۶ - اندرج دیہ زات فرخ بیرون

۹۷ - ابوز پنج جیم ہوسران

۹۸ - ادر بتہانی کنک فوتایہ

۹۹ - داچکی چند ہیچ فرہنک متر

۱۰۰ - افسون گزندگان

۱۰۱ - ماتیکان ہزار دادستان

زبانِ پہلوی کے اشعار پروفیسر براؤن[1] لکھتے ہیں کہ ساسانی عہد میں شعر و شاعری کا بھی پتا چلتا ہے۔ دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ باربد خسرو پرویز

[1] لٹریری ہسٹری آف پرشیا صفحہ ۱۴

کا دربار گویا تھا۔ خود شعر کہتا اور چنگ و رباب کے ساتھ گا کر سناتا تھا۔

مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں۔ "میرا قیاس[1] یہ کہتا ہے کہ جس طرح ہر ولایت میں اپنی اپنی طبیعت کے بموجب نظم اور نظم کی خوبی ہے۔ فارس بھی اس فن سے بے بہرہ نہ ہو گا۔ انقلاب زمانہ نے جس طرح اس کے علوم و فنون کو فنا اور کتابوں کو برباد کیا، نظم کی لڑیاں بھی توڑ ڈالیں اور دیوان درہم برہم کر دیے پھر بھی خوش حالی اور بدحالی میں قوم قائم تھی۔ ٹوٹے پھوٹے شعر، گیتوں کی آواز، شادی کے سہاگ یا بچوں کی لوریوں میں مدت تک زبان بزبان چلے آتے ہوں گے۔"

مولانا شبلی نعمانی کو اس مفروضہ سے اختلاف[2] ہے وہ لکھتے ہیں کہ "ایران کی آب و ہوا کی فرحت انگیزی میں شبہہ نہیں لیکن یہ بھی بدیہی واقعات ہیں کہ ایران کی سیکڑوں تلمیحات اور روایتیں آج موجود ہیں۔ ایران کا فلسفہ اور علوم نہیں رہے، لیکن حکمائے ایران کے نام اور اُن کے اقوال آج تک کتابوں میں نقل ہوتے چلے آئے ہیں۔ یورپ کے محققوں نے پہلوی زبان کی بہت سی کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں لیکن چار شعر بھی ہاتھ نہ آئے۔ فارسی کے قدیم اشعار نہ ملتے، تو نہ ملتے لیکن شعرا کا نام تو زبان پر ہوتا۔"

ایرانی محققین، جنھیں پہلوی زبان میں بھی دسترس ہے، اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پہلوی کتابوں میں کلام منظوم بھی پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض کتبوں میں اشعار بھی ملتے ہیں اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ دورِ ساسانی میں شعر بھی کہے جاتے تھے۔

رضا زادہ شفق اپنی تاریخ ادبیات ایران میں نمونے کے طور پر ذیل کے قطعات پیش کرتے ہیں۔

---

[1] سخندان فارس صفحہ ۲۵۹

[2] شعرالعجم جلد اوّل ص ۲۵

[1]

آپر یوانی پرستگاں

پرستگان روشنان   فیرہگان کردگاران

نعان تہمان اود   مہرسپندان استادان

ھیاران زورمندان

اسی قطعہ کو وہ موجودہ فارسی میں یوں لکھتے ہیں۔

فرشتگان روشنان   فیرہگان کردگاران

نغان تہمان فو   مہرسپندان اوستادان

پہلوی ادب کے متعلق شفق[2] لکھتے ہیں کہ قدیم ایران کے باشندوں کا اپنا رسم الخط تھا، ان کی اپنی زبان تھی اور ان کا اپنا ادب تھا۔ ان کا ادب نظم و نثر دونوں پر مشتمل تھا۔ آثار و قرائن سے پتا چلتا ہے کہ ان کے ادب میں فلسفہ کا بھی خاص حصہ تھا۔ سرکاری مدارس بھی تھے جن میں موبد درس دیتے تھے۔ علم طب کو کافی اہمیت حاصل تھی۔ دارا کے زمانے میں ایک مصری قیدی کو اس لیے آزاد کر دیا گیا۔ کہ مصر جا کر وہاں کی طبی درسگاہوں کے متعلق معلومات حاصل کرکے ایران میں اسی قسم کی درس گاہیں قائم کرے۔ تاریخ نویسی کا بھی رواج تھا۔ ایران کے قدیم مورخین واقعات و حالات احاطہ تحریر میں لاتے تھے۔ ساسانی دور میں یونانی اور سنسکرت کی فلسفہ کی کتابیں پہلوی میں ترجمہ کرائی گئیں، جن سے ملک کے علم و ادب میں اضافہ ہوا۔ اخلاقیات اور اجتماعیات پر علوم کا ذخیرہ جمع تھا۔ عربوں کے غلبہ پر بہت سی کتابیں ضائع ہو گئیں۔ لیکن اس کے باوجود بعض پہلوی کتابیں پہلی صدی ہجری میں بھی محفوظ رہیں، جن کا ذکر عربی کی کتابوں میں موجود ہے۔ عربی کی بعض کتابوں میں پہلوی کی کتابوں کے اقتباس بھی ملتے ہیں۔ بعض کتابوں کا عربی میں ترجمہ بھی ہوا۔ چنانچہ "المحاسن و المساوی" یا "المحاسن و الاضداد" یا کتاب "ادب الکبیر" و کتاب الادب الصغیر" پہلوی سے ترجمہ کی گئیں جن کا پہلوی نام شائست و ناشائست" تھا۔

---

[1] لغات:۔ پرستک، فرشتہ، فرہ، فر، بغ، خدا، تہم، قوی، مہر سپند در اصطلاح۔ مانویان بہ عنصر، گوہران گفتہ می شد۔ اَستود، ستودہ۔ [2] تاریخ ادبیات ایران مولفہ شفق صفحہ ۲۶

چوتھا باب

فارسی ادب ظہورِ اسلام کے بعد

اہلِ ایران ایک نئے انقلاب کے منتظر تھے

ساتویں صدی عیسوی کے پہلے نصف میں بازنطینی اور ایرانی حکومتیں مغربی ایشیا پر غلبہ پانے کیلئے بدستور ایک دوسری سے نبرد آزما رہیں۔ دونوں حکومتوں کے خزانے سکوں سے بھرپور تھے۔ دارالسلطنتوں میں دولت بے دریغ اڑائی جاتی تھی۔ ظاہری شان و شوکت دونوں کی بدستور قائم تھی، لیکن دونوں ایک پوشیدہ مرض کا شکار ہو چکی تھیں، جو اُن کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے چلا جاتا تھا۔ یہ مرض تھا مطلق العنانیت کا۔ شخصی حکومت عوام کے لیے بلائے بے درماں بن چکی تھی۔ مذہبی اختلاف کی بنا پر بے شمار انسانوں کا خون بہا دیا جاتا تھا۔ انہی حالات میں مسلمانوں کی نئی قوم اٹھی۔ جو رسول اکرم صلعم کی سادہ تعلیم کی مشعل راہ بنا کر دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل گئی۔ انہوں نے ایرانیوں کے آخری تاجدار یزدگرد سے حکومت چھین کر ساسانی عہدِ حکومت کا خاتمہ کیا۔ ادھر قسطنطین کے جانشینوں کے علاقے میں اسلامی حکومت کا علم گاڑا۔ ادھر ان کی فاتحانہ فوجیں کوہ ہمالیہ تک بڑھتی چلی گئیں۔

مسلمانوں کا مقصد محض ملکوں کو فتح کرنا نہ تھا

مسلمانوں کی فاتح قوم دوسری فاتح اقوام کی طرح نہ تھی۔ یہ قوم مفتوح قوموں کو غلام نہیں بنانا چاہتی تھی، بلکہ اسلام کی دولت دے کر انھیں اقوامِ عالم میں سرفراز کرنا چاہتی تھی۔ یہ آتش پرستوں کی ثنویت اور عیسائیوں کی تثلیث کے مقابلے میں یہ قوم خدا کی وحدانیت کی تعلیم دیتی تھی۔ انسانی مساوات کا درس دے کر گویا نسلِ انسانی کا

احترام کرنا سکھاتی تھی۔ مفتوح قومیں، اسلام کے سادہ اصولوں کی وجہ سے آپ ہی آپ اسلام کی جانب مائل ہوتی گئیں۔

اشاعت اسلام بعض یورپین کسی مصلحت کی بنا پر یہ کہہ دیتے ہیں کہ مسلمان جب کسی ملک کو فتح کر لیتے، تو وہاں کے باشندوں کے لیے دو ہی رستے کھلے رہ جاتے تھے۔ کہ دینِ اسلام قبول کریں، یا جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ استاد براؤن اس خیال کو بہ الفاظ ذیل جھٹلاتے ہیں "مسلمان فاتح قوم کے متعلق ایسا خیال کرنا غلطی ہے۔ مفتوح قوم خواہ آتش پرست ہو، عیسائی ہو، یا یہودی اُن کو عام اجازت ہوتی تھی کہ وہ چاہیں تو اپنے مذہب پر قائم رہیں، لیکن اس صورت میں وہ جزیہ ادا کریں۔ جزیہ عاید کرنا بھی نامناسب نہ تھا، کیونکہ جو لوگ دینِ اسلام قبول نہیں کرتے تھے۔ ان سے خیرات و صدقات نہیں لیے جاتے تھے، جو مسلمانوں سے لیے جاتے تھے۔ نہ اُن سے فوجی خدمات ہی لی جاتی تھی۔ ان دونوں کے بدلے انھیں جزیہ کی رقم ادا کرنی پڑتی تھی۔ جزیہ وصول کر لینے کے بعد حکمران قوم غیر مسلموں کی جان و مال کی محافظ ہو جاتی تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جو لوگ ایک مرتبہ اطاعت اختیار کر لینے کے بعد بغاوت کرتے، ان پر رحم نہیں کیا جاتا تھا۔"[۱]

مسلمانوں کو نجات دہندہ سمجھا جاتا تھا۔ پروفیسر آرنلڈ[۲] لکھتے ہیں کہ "آتش پرست نہ صرف غیر ملکی مذاہب کے پیروؤں پر ستم روا رکھتے تھے، بلکہ وہ غیر آتش پرست ایرانیوں مثلاً مانویوں، مزدکیوں اور وحدت پرستوں کا وجود بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ اہلِ ایران کے دلوں میں اُن کے متعلق نفرت پیدا ہو چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے عربوں کی فتح میں اپنی نجات سمجھی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو لوگ حلقہ بگوشِ اسلام ہوتے، بہ رضا و رغبت ہوتے۔ اس میں جبر و اکراہ کا کوئی دخل نہ تھا۔"

---

[۱] لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد اوّل ص ۲۰۳ [۲] پریچنگ آف اسلام ص ۱۷۷، ۲۰۱، ۲۱۱

اسلامی عہد میں پہلوی ادب

پروفیسر براؤن[1] لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی فتح کے بعد دین آتش پرستی کو سرکاری مذہب کا درجہ تو حاصل نہ رہا، لیکن ایران سے یہ مذہب نابود بھی نہ ہوا۔ اس کے علاوہ جہاں فاتح قوم کی زبان عربی کی ترویج ہوئی، وہاں نومسلم ادیبوں نے پہلوی زبان میں بھی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ دین آتش پرستی کے موبدوں کو بدستور اہمیت حاصل تھی۔ سرکاری حکام کے ساتھ ان کا رابطہ جوں کا توں قائم رہا۔ آتش کدے حسب سابق روشن تھے ان مسلمانوں کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ جو آتش کدوں کو نقصان پہنچاتے تھے، یہاں تک کہ عربوں کے حملے کے بعد تین سو سال تک بھی آتش کدے قائم رہے۔"

پروفیسر آرنلڈ[2] یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ کہنا بہت زیادتی ہے کہ دین آتش پرستی اس لیے مٹ گیا کہ اس کے پیروؤں کو زبردستی مسلمان بنا لیا جاتا تھا۔ عربوں کے حملوں کے فوراً بعد آتش پرست کثیر تعداد میں مسلمان تو ہو گئے۔ لیکن دین آتش پرستی کا صدیوں تک قائم رہنا، اس بات کی بین دلیل ہے کہ اسلام رفتہ رفتہ، پُرامن طریقے سے پھیلتا رہا۔ آٹھویں صدی کے آخر میں بلخ کے ایک رئیس سامان نے خراسان کے گورنر اسد بن عبداللہ کی تلقین پر اسلام قبول کیا اور اپنے ایک بیٹے کا نام اسی گورنر کے نام پر اسد رکھا۔ یہ وہی نومسلم سامان ہے جس کے نام پر سامانی سلطنت (۲۶۱ تا ۳۸۹ ہجری) مطابق ۸۷۴ء تا ۹۹۹ء کا قیام عمل میں آیا

اسلامی عہد میں پہلوی کا رواج

اسلامی عہد میں ایران میں مالیات کے دیوان بدستور قائم رہے۔ مالیات کا تمام حساب کتاب پہلوی میں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ خلیفہ عبدالملک (۶۶ تا ۸۶ھ مطابق ۶۸۵ء تا ۷۰۵ء) کے زمانے میں ایک شخص صالح کاتب نے دعویٰ کیا کہ وہ مالیات کا حساب کتاب عربی زبان میں

۱؎ لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد اول ص ۲۵۲ ۲؎ لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد اول ص ۲۰۵

بھی رکھ سکتا ہے۔ چنانچہ حجاج بن یوسف نے حکم دیا کہ مالیات کا حساب عربی زبان میں رکھا جائے۔ آخر اس کے حکم کے بموجب عمل درآمد ہوگیا۔

خلافت اسلامی

خلافت اسلامی ذیل کے تین ادوار پر مشتمل ہے

۱۔ خلفائے راشدین کا دور۔ ۱۱ ہجری سے ۴۰ ہجری (مطابق ۶۳۲ء سے ۶۶۱ء) تک رہا۔

۲۔ دورِ بنو اُمیّہ۔ اس دور کے چودہ خلیفوں نے ۴۱ ہجری سے ۱۳۲ ہجری مطابق ۶۶۱ء سے ۷۵۰ء) تک حکومت کی۔

۳۔ دورِ بنو عباس۔ دورِ عباسیہ کے سینتیس خلفا نے ۱۳۲ھ۔ ۶۵۶ ہجری مطابق ۷۵۰ء سے ۱۲۵۸ء تک حکومت کی، بالآخر ہلاکو خان نے بغداد پر حملہ کر کے المستعصم باللہ کو شہید کر دیا جس پر ۶۵۶ ہجری مطابق ۱۲۵۸ء میں اسلامی خلافت کا دور ختم ہوگیا۔

بنو اُمیّہ خلفائے راشدین کے دور میں جمہوری حکومت قائم تھی جو خلافت کے نام سے موسوم تھی۔ اس دور میں عدالت و مساوات کے بلند معیار قائم رہے لیکن جونہی خلفائے راشدین کا دور ختم ہوا اور خلافت بنو اُمیّہ کے ہاتھ آئی، یہ خلافت دفعتہً ملوکیت میں تبدیل ہوگئی۔ اس دور میں اہل عرب ایرانی مسلمانوں کو بھائی بند سمجھنے کی بجائے "موالی" یعنی "غیر عرب مسلمان" سمجھنے لگے، جس سے عرب و عجم کی تفریق پیدا ہوگئی۔ اس تفریق کا جذبہ روز بروز بڑھتا رہا۔ عرب ایرانیوں کو ہر لحاظ سے کمتر سمجھتے تھے۔ اس لیے اہل ایران کے دلوں میں عربوں کی حکومت کے خلاف نفرت پیدا ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سازشیں اور بغاوتیں ہونے لگیں۔ بالآخر ایران میں ایک شخص ابو مسلم خراسانی کی سرکردگی میں بنو اُمیّہ کے خلاف زبردست بغاوت ہوئی جس نے ۱۳۲ھ مطابق ۷۴۹ء میں بنو امیہ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور ابو العباس سفاح نے عباس بن عبدالمطلب کے نام پر خلافتِ عباسیہ قائم کی۔ یہ

خلافت ایرانیوں کی مدد سے قائم ہوئی تھی، اس لیے ان کے پاس خاطر میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جاتی تھی۔ دربار میں ایرانیوں کو زیادہ قرب حاصل تھا۔ اعلیٰ سرکاری عہدے بھی انہی کو ملتے تھے۔ برمکی خاندان کے افراد جو سالہا سال تک یکے بعد دیگرے وزارت جلیلہ پر فائز رہے، ایرانی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اہلِ ایران کے اثر و رسوخ کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک مرتبہ پھر قدیم ساسانی تمدن کی جھلک تمدنِ اسلامی کے رنگ میں نظر آنے لگی۔

وطنی حکومتوں کا قیام

خلافت عباسیہ میں ایرانیوں کو اقتدار تو حاصل تھا لیکن اب وہ اس فکر میں تھے کہ ایران میں عربوں کا اقتدار ختم کر کے ملکی حکومتیں قائم کریں۔ چنانچہ دسویں خلیفہ المتوکل باللہ ۲۳۲ھ مطابق ۸۴۶ء کی خلافت میں جونہی کچھ ضعف کے آثار رونما ہوئے، اہل ایران کو جنبش ہوئی اور خلیفہ بغداد کی مخالفت میں آوازیں اٹھنے لگیں بالآخر ایران کے مختلف گوشوں میں ملکی حکومتیں قائم ہونے لگیں۔ یہ حکومتیں بظاہر خلیفہ بغداد کے ماتحت ہوتی تھیں لیکن حقیقت میں خودمختاری کا دم بھرتی تھیں۔ یہ حکومتیں حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ حکومت طاہریہ

اولیں ملکی حکومت، جو ظہور اسلام کے بعد ایران میں قائم ہوئی آل طاہر کی تھی۔ اس حکومت کا زمانہ ۲۰۵ تا ۲۵۹ ہجری مطابق ۸۲۰ء۔ ۸۷۲ء ہے۔ طاہریہ حکومت خراسان میں قائم ہوئی۔ نیشاپور اس کا دارالسلطنت تھا۔ آل طاہر کے حکمران بظاہر خلیفہ بغداد کے ماتحت تھے، لیکن حقیقت میں وہ خودمختار تھے۔

۲۔ حکومت صفاریہ

صفاریہ خاندان کی حکومت ۲۵۲ سے ۲۹۱ ہجری مطابق ۸۶۷ء۔ ۹۰۳ء تک رہی۔ یہ خالص ایرانی حکومت، خلافتِ بغداد کے متوازی قائم ہوئی تھی۔ صفاریہ حکمرانوں نے خراسان، سیستان، فارس، کرمان، ہرات، اہواز اور بلخ کو مسخر کر کے خلافت بغداد کو سخت بے چین رکھا۔ اس حکومت کا دارالسلطنت سیستان تھا۔

۳۔ حکومت سامانیہ

اس حکومت کا دور ۲۶۱ ہجری تا ۳۸۹ ہجری مطابق ۸۷۴ء تا ۹۹۸ء ہے۔ سامانی حکمرانوں کا دارالسلطنت بخارا تھا۔ ان کی حکومت ہر لحاظ سے ایک با اقتدار حکومت تھی۔ ان کی قلمرو میں ماوراء النہر، خراسان، سیستان اور طبرستان

ترکستان، رے اور اصفہان کے علاقے شامل تھے۔

۴۔ حکومت دیالمہ آل بویہ نے، جو دیالمہ بھی کہلاتے تھے، ۳۲۵ سے ۴۴۸ ہجری بمطابق ۹۳۶ء ۱۰۵۶ء حکومت کی۔ ان کی سلطنت میں فارس، کرمان، خوزستان، ہمدان، رے، کردستان، اصفہان وغیرہم علاقے شامل تھے۔ ایران کے علاوہ عراق عرب موصل اور گرد و نواح کے علاقے بھی انہی کے زیر نگیں تھے، خلافت بغداد میں بھی انھیں کافی اثر و رسوخ حاصل تھا۔

۵۔ حکومت آل زیارہ آل زیارہ نے ۳۱۶ سے ۴۳۴ ہجری بمطابق ۹۱۸ء تا ۱۰۴۲ء حکومت کی۔ ان کی حکومت طبرستان اور جرجان میں تھی۔ رفتہ رفتہ ری، ہمدان، کاشان، اصفہان اور تمام عراق عجم پر ان کا قبضہ ہو گیا۔

۶۔ حکومت غزنویہ غزنوی حکومت کی مدت ۳۳۶ تا ۵۸۳ ہجری بمطابق ۹۴۷ء سے ۱۱۸۷ء ہے۔ غزنوی حکمرانوں کا دارالسلطنت غزنی تھا۔ ان کی حکومت خراسان، سیستان، عراق، کرمان، بلوچستان، زابلستان، ماوراءالنہر، خوارزم، غرجستان، ری، اصفہان اور شمال مغربی ہندوستان میں تھی۔

۷۔ حکومت سلجوقیہ سلجوقی حکمرانوں کا عہد حکومت ۴۳۹ سے ۵۵۲ ہجری بمطابق ۱۰۴۷ء سے ۱۱۵۷ء تک رہا۔ ان کے دارالسلطنت بدلتے رہے۔ ظہور اسلام کے بعد سلجوقیوں کا خاندان وہ اولیں سلسلہ ہے، جس نے تمام چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو مٹا کر پورے ایران میں ایک وسیع اور منظم حکومت قائم کی۔ سلجوقیوں کا دور ایران کا سنہرا دور کہلاتا ہے۔ ان کی سلطنت کی حدود کی سرحد کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی تھیں۔

۸۔ اتابکان فارس ان کا دائرہ عمل فارس کے صوبے تک محدود تھا۔ ان کی حکومت ۵۴۳ سے ۶۲۳ ہجری بمطابق ۱۱۴۸ تا ۱۲۲۶ء رہی۔

۹۔ اتابکان آذربائیجان

آذربائیجان کے اتابکوں نے ۵۳۱ سے ۶۲۲ ہجری بمطابق ۱۱۳۶ تا ۱۲۲۵ حکومت کی۔

۱۰۔ حکومت خوارزمشاہی

خوارزم شاہی حکمرانوں نے ۴۹۱ ہجری سے ۶۶۸ ہجری بمطابق ۱۰۹۷ء تا ۱۲۶۹ حکومت کی۔ ان کا دارالسلطنت گرگانیہ (جرجانیہ) تھا۔ ان کے علاقے کی حدود بلخ سے کرمان تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس سلسلے کا آخری تاجدار جلال الدین منکبرنی[1] تھا، جو چنگیز خاں کے پے در پے حملوں کا مقابلہ کرتا ہوا بالآخر مارا گیا۔

مذکورہ بالا دس حکومتوں کے علاوہ بعض مذہبی رہنماؤں اور چھوٹے چھوٹے امرا کے درباروں کا بھی ادبیات ایران کی تاریخ پر گہرا اثر تھا، اس لیے ان کا مختصر سا ذکر کرنا مناسب ہوگا۔

فرقہ اسمٰعیلیہ کے رہنما

ان کا اثر و نفوذ ۴۸۳ھ سے ۶۵۵ ہجری بمطابق ۱۰۹۰ء ۱۲۵۷ء تک ری، طبرستان، خراسان، قہستان، عراق، شام وغیرہم علاقوں میں تھا۔

ملوک غور، امرائے چغانیاں اور حکام سیستان، یہ لوگ عہد سامانیہ اور عہد غوریہ میں بڑے بڑے منصب رکھتے تھے۔ اور بعض چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی سرداری بھی انھیں حاصل تھی۔ علم و ادب کے بہت بڑے سرپرست تھے۔

عربوں کی حکومت کا ادبیات ایران پر اثر

ملکی حکومتوں کا مختصر سا ذکر کرنے کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔

یہ بات کسی تشریح کی محتاج نہیں کہ جب کسی ملک میں سیاسی یا مذہبی انقلاب آتا ہے، تو

---

[1] بعض محققین کے نزدیک یہ لفظ منکبرنی ہے۔ یعنی منبرا ناک سے تعلق رکھنے والا۔ جلال الدین کا ۴

اس سے وہاں کی ادبیات میں بھی تغیر پیدا ہوتا ہے۔ ہنحامنشیوں اور ساسانیوں کی مملکت میں خلافت اسلامی کا قائم ہونا حقیقت میں ایک انقلابِ عظیم تھا۔ چنانچہ اس انقلاب نے اہلِ ایران کی زندگی اور ان کے ادبیات پر بھی بڑا گہرا اثر ڈالا۔ یہ بیان بہت طویل ہے، اس لیے محض اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۱۔ تبدیلی مذہب۔ اہل ایران دین زرتشتی کے پیرو تھے۔ عربوں کی فتح کے ساتھ ہی اکثر آتش پرست حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

۲۔ عربی زبان رفتہ رفتہ پہلوی کی جگہ لیتی رہی۔

۳۔ عربی کے متعدد الفاظ پہلوی میں شامل ہوئے، مثلاً زکوٰۃ، حج، مسلم، مومن، کافر، منافق، قرآن، اقامہ، قبلہ، محراب، منبر، منارہ، ابلیس، تسنیم، کوثر، سلسبیل، ہاروت، ماروت، یاجوج ماجوج، حور، غلمان، دعا وغیرہم۔

۴۔ خطِ پہلوی، عربی زبان کے رائج ہوتے ہی متروک ہوتا گیا۔ خطِ پہلوی کے متروک ہونے کے اسباب قدرے تفصیل طلب ہیں اس لیے ذیل میں ان کی وضاحت کی جاتی ہے

ا۔ دین زرتشتی کے پیروؤں کا علم و ادب تمام تر پہلوی زبان میں تھا۔ اس لیے یہ لوگ پہلوی رسم الخط کو مقدس سمجھتے تھے، لیکن جونہی کوئی آتش پرست مذہبِ اسلام قبول کر لیتا، تو پہلوی زبان کے ساتھ اس کا جذباتی تعلق بھی ختم ہو جاتا۔ چنانچہ جوں جوں اسلام پھیلتا گیا، پہلوی رسم الخط کو زوال آتا گیا۔

---

۴ لقب مینگبرنی اس لیے ہوا کہ اس نے ایک ہزار لڑائیاں لڑی تھیں۔ بعض کے نزدیک یہ لفظ مینگبرنی ہے۔ مینگ ترکی زبان کا لفظ ہے، جس کا معنی تل ہے اور برنی سے مراد بینی یا ناک ہے۔ چوں کہ اس کی ناک پر تل تھا۔ اس لیے اسے مینگ برنی کہا جاتا تھا۔

ب - پہلوی رسم الخط بہت پیچیدہ اور مبہم تھا، اس کو سیکھنے کے لیے بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے لوگوں کا رجحان اس کی طرف سے بتدریج ہٹتا چلا گیا۔

ج - پہلوی رسم الخط کے مقابلے میں اور کوئی رسم الخط موجود نہ تھا اس لیے لوگ مجبوراً اُسے ہی سیکھتے تھے لیکن جب مسلمانوں نے عربی رسم الخط پیش کیا جو نسبتاً زیادہ واضح اور سادہ تھا، اہلِ ایران نے فوراً اُسے اختیار کر لیا۔

۵ - شعر و سخن میں عربی اثرات داخل ہوئے۔ شباب و شراب کی تعریف و توصیف میں جو اشعار لکھے گئے، اُن کا آغاز بنو امیہ کے عہد میں ہوا۔ سب سے پہلے ابو نواس نے، جو اہواز کا رہنے والا تھا، عربی زبان میں شراب و شباب کے گیت گائے۔ اس کے بعد ایران کے فارسی شاعروں نے اس موضوع کو اپنایا۔

۶ - عرب[1] حکام کا یہ عقیدہ تھا۔ کہ اُن کے لیے کتاب اللہ اور دینی علوم کافی ہیں۔ ان کے علاوہ جو بھی کتابیں ہیں، وہ سب دین و آداب آتش پرستی سے تعلق رکھتی ہیں، اس لیے مسلمانوں کے لیے بے کار ہیں، چنانچہ اکثر کتابیں نذرِ آتش کر دی جاتی تھیں۔ اس طرح پرانی کتابوں کا ایک گراں قدر ذخیرہ تلف ہو گیا۔

خلفائے راشدین اور بنو اُمیہ کے عہد میں علم و ادب

ایران پر عربوں کی فتح اور خلافت اسلامی کے قیام کا مختصر سا ذکر آ چکا ہے اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ظہور اسلام کے بعد ایرانی علوم کی نشر و اشاعت کا سلسلہ رُک گیا تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ دور علم و ادب سے بالکل تہی دامن ہے؟ اگر نہیں تو ایرانی باشندوں نے علم و ادب کی کیا خدمت کی؟

خلفائے راشدین کے زمانے میں مسلمانوں کے دل کچھ اس طرح اسلامی تعلیم سے سرشار تھے کہ وہ کلام مجید کی موجودگی میں اپنے آپ کو تمام علوم سے بے نیاز سمجھتے تھے۔

---

[1] لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد اوّل ص ۹-۱۰

ان کی تمام تر کوششیں قرآن کریم جمع کرنے اور آیات قرآنی کی حفاظت کرنے پر مرکوز تھیں۔ لیکن یہ کام آسان نہ تھا۔ اس وقت قرآنِ کریم کی آیات مقدسہ عموماً جانوروں کی کھالوں، کھجور کے پتوں، اور اونٹوں کی ہڈیوں پر لکھ کر محفوظ کر لی جاتی تھیں۔ یہ آسانی ضرور تھی کہ بعض مسلمانوں نے قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ بہرحال ایسے حالات میں کلام پاک کی تدوین انتہائی مشکل کام تھا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں جب جنگِ یمامہ پیش آئی، تو اس میں ایک ہزار دو سو مسلمان شہید ہوئے۔ ان میں سات سو حافظِ قرآن بھی تھے۔ اتنی بڑی تعداد میں حفاظ کے شہید ہو جانے سے خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں مسلمان قرآن مجید کے کسی حصے سے محروم ہی نہ ہو جائیں، چنانچہ کلام پاک کی باقاعدہ تدوین کا خیال پیدا ہوا۔ اس عظیم الشان کام کے لیے مسلمانوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف رجوع کیا۔ آپ پہلے تو اس عظیم ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے کچھ گھبرائے۔ بالآخر کلام پاک کی تدوین کا کام اپنے ذمے لے لیا۔ زید بن ثابت نے کمال جانفشانی سے یہ بکھرے ہوئے مطہر جواہر پارے اکٹھے کر کے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سپرد کیے۔ ۱۳ ہجری بمطابق ۶۳۴ء میں آپ نے وفات پائی، تو یہ کام حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے ذمے لیا۔ آپ کے بعد یہ کام بی بی حفصہؓ کے سپرد ہوا، جو آنحضرت کی ازواج مطہرات سے تھیں۔ بالآخر حضرت عثمانؓ نے ۳۰ ہجری بمطابق ۶۵۰ء میں ترتیب و تدوین سے کلام پاک کے چھ نسخے تیار کرائے۔ چار نسخے مکہ کے گرد و نواح، بصرہ اور کوفہ اور شام بھیجے گئے۔ ایک اہل مدینہ کے لیے مخصوص ہوا اور ایک نسخہ انھوں نے اپنے پاس رکھا۔

کلام مجید کی تدوین کے قدرے مفصل ذکر سے یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ یہ کام اتنا اہم تھا کہ مسلمانوں کی توجہ کسی اور علمی کام کی طرف مبذول نہ ہوئی

کلام مجید سے متعلقہ علوم

آتش پرست جب حلقہ بگوش اسلام ہوتے تو کلام پاک

کا مطالعہ کرنے کا انھیں شوق ہوتا تھا۔ اس لیے عربی کی تدریس کے ساتھ ساتھ عربی گرامر اور عربی لغات کی بھی ضرورت محسوس ہوئی۔ بعض الفاظ اور اصطلاحیں سمجھنے کے لیے یہ ضرورت ہوتی تھی کہ عربی شعرا کے دیوانوں کا مطالعہ کیا جائے۔ دیوانوں کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے نسب ناموں کے علم کی ضرورت لاحق ہوئی۔ عربوں کی جنگوں کا حال پڑھنے کے لیے تاریخ کا مطالعہ لازم آیا۔ قرآنی احکام کی وضاحت کے لیے آنحضرتؐ کے اصحاب کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو علم حدیث کا مطالعہ ناگزیر ٹھہرا۔ پھر احادیث کو جانچنے پرکھنے کے لیے یہ جاننے کی ضرورت ہوئی کہ راوی کیسے ہیں؟ راویوں کی متانت، سنجیدگی اور سچائی جانچنے کے لیے ان کے سوانح حیات کا مطالعہ کرنا پڑا۔ عربوں کی تاریخ جاننے کی ضرورت پڑی تو یہ خیال آیا کہ عربوں کے روابط ہمسایوں کے ساتھ کیسے تھے۔ اس سے پھر اہلِ یونان، اہلِ حبش اور خود اہلِ ایران کی تاریخوں کے مطالعے کی ضرورت محسوس ہوئی اور قرآنِ کریم کی بعض جغرافیائی تلمیحات سمجھنے کے لیے علم جغرافیہ بھی لازمی قرار پایا۔

ان ضروریات کے پیشِ نظر خلفائے بنو امیہ کے عہد میں قرآنی علوم مثلاً قرأت، فقہ، حدیث اور تفسیر کے فن کو ترقی ہوئی۔ عربی زبان کی تدریس کے لیے ایک فاضل شخص ابوالاسود دؤلی نے عربی صرف و نحو کے قواعد منضبط کر کے اس علم کی تعلیم سہل کر دی۔ اس کے علاوہ تاریخ و انساب کے علم نے بھی ترقی پائی اور عربی رسم الخط بڑی تیزی سے ایران میں رائج ہو گیا۔

خلفائے راشدین کی مدّت خلافت ۱۱ تا ۴۰ ہجری مطابق ۶۳۲ء تا ۶۶۰ء

۱۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ ۱۱ تا ۱۳ ہجری مطابق ۶۳۲ تا ۶۳۴ء

۲۔ حضرت عمر خطابؓ ۱۳ تا ۲۳ ہجری مطابق ۶۳۴ تا ۶۴۳ء

۳- حضرت عثمانؓ ۲۳ تا ۳۵ ہجری مطابق ۶۴۳ تا ۶۵۵ ع

۴- حضرت علی المرتضیٰؓ ۳۵ تا ۴۰ ہجری مطابق ۶۵۵ تا ۶۶۰ ع

خلفائے بنو اُمیّہ کی مدّت خلافت ۴۱ تا ۱۲۶ ہجری مطابق ۶۶۱ تا ۷۴۹ ع

۱- معاویہؓ بن ابی سفیان ۴۱ تا ۶۰ ہجری مطابق ۶۶۱ تا ۶۷۹ ع

۲- یزید بن معاویہؓ ۶۰ تا ۶۴ ہجری مطابق ۶۷۹ تا ۶۸۳ ع

۳- معاویہ بن یزید ۶۴ تا ۶۴ ہجری مطابق ۶۸۳ تا ۶۹۳ ع

۴- مروان بن حکم ۶۴ تا ۸۵ ہجری مطابق ۶۹۳ تا ۷۰۴ ع

۵- عبدالملک بن مروان ۸۵ تا ۸۶ ہجری مطابق ۷۰۴ تا ۷۰۵ ع

۶- ولید بن عبدالملک ۸۶ تا ۹۶ ہجری مطابق ۷۰۵ تا ۷۱۴ ع

۷- سلیمان بن عبدالملک ۹۶ تا ۹۹ ہجری مطابق ۷۱۴ تا ۷۱۷ ع

۸- عمر بن عبدالعزیز ۹۹ تا ۱۰۱ ہجری مطابق ۷۱۷ تا ۷۱۹ ع

۹- یزید بن عبدالملک ۱۰۱ تا ۱۰۵ ہجری مطابق ۷۱۹ تا ۷۲۳ ع

۱۰- ہشام بن عبدالملک ۱۰۵ تا ۱۲۵ ہجری مطابق ۷۲۳ تا ۷۴۲ ع

۱۱- ولید بن یزید بن عبدالملک ۱۲۵ تا ۱۲۶ ہجری مطابق ۷۴۲ تا ۷۴۳ ع

۱۲- یزید بن ولید ۱۲۶ تا ۱۲۶ ہجری مطابق ۷۴۳ تا ۷۴۴ ع

۱۳- مروان ثانی ۱۲۷ تا ۱۳۲ ہجری مطابق ۷۴۴ تا ۷۴۹ ع

پانچواں باب

خلافتِ عباسیہ

جیساکہ پہلے ذکر آچکا ہے ابو مسلم خراسانی کی سرکردگی میں بنو اُمیہ کے خلاف پُرزور بغاوت ہوئی، جس میں بنو اُمیہ کا خلیفہ مروان مارا گیا اور بنو اُمیہ کے بجائے بنو عباس کی خلافت قائم ہوگئی اور ابو العباس السفاح مسندنشین خلافت ہوا۔ اس خاندان کے سینتیس خلیفوں نے ۱۳۲ تا ۶۵۶ ہجری مطابق ۷۴۹ء تا ۱۲۵۸ء حکومت کی۔

خاندانِ عباسیہ کی تاریخ لکھنا ہمارا منصب نہیں، لیکن ہم ان حالات و واقعات کا مختصراً ضرور ذکر کریں گے۔ جن کا اہلِ ایران کی زندگی اور اُن کے علم و ادب پر اثر پڑا۔

خاندانِ عباسیہ کا دوسرا خلیفہ ابو جعفر منصور ہے۔ جس کی خلافت ۱۳۶ ہجری سے ۱۵۸ ہجری مطابق ۷۵۳ء تا ۷۷۴ء قائم رہی۔ بغداد کا مشہور شہر اسی کے حکم سے ۱۴۵ ہجری مطابق ۷۶۲ء میں بسایا گیا۔ منصور کی طویل مدت خلافت میں ایرانی اثر و رسوخ لگاتار بڑھتا گیا۔ ایرانی لباس، درباری لباس قرار پایا۔ خلیفہ نے علم ادب، علم طب اور علم ہیئت کی ترویج و ترقی میں ذاتی دلچسپی لی، اور یونان کی علمی کتابوں کا ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ گویا علمی لحاظ سے خلیفہ منصور ہی نے اس سنہرے دور کی بنیاد رکھی تھی، جس نے ہارون الرشید اور مامون الرشید کے عہد میں کمال حاصل کیا۔

المقنع تیسرے خلیفہ مہدی کے زمانے میں ۱۵۸ تا ۱۶۹ ہجری مطابق ۷۷۴ تا ۷۸۵ء ایک شخص المقنع۔ یعنی "نقاب پوش" نے بغاوت کی مشہور

مؤرخ البیرونی نے اس کا نام ہاشم بن حکیم لکھا ہے لیکن ابن خلقان اس کا نام عطا لکھتے ہیں۔ المقنع کو سحر و طلسم میں بڑی دسترس حاصل تھی، ریاضی اور کیمیا میں بھی وہ ماہر تھا۔ اس نے خدا کا مظہر ہونے کا دعویٰ کیا وہ اپنے پیروؤں سے کہتا تھا کہ خدا سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کے پیکر میں ظاہر ہوا، اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کے جسم میں آیا، پھر تمام پیغمبروں کے جسموں میں ظاہر ہوتا ہوا ابو مسلم خراسانی کے قالب میں جلوہ گر ہوا۔ اس کے بعد خود اس کے جسم میں ظاہر ہوا۔

المقنع پست قامت اور بدصورت انسان تھا۔ ایک آنکھ سے محروم بھی تھا۔ اس لیے وہ ظاہری بدصورتی کو چھپانے کے لیے چہرے کو سونے کے پترے سے ڈھانپے رکھتا تھا، اس لیے اسے المقنع یعنی نقاب پوش کہنے لگے۔ اس کے پیرو اس کی پرستش کرتے تھے۔ المقنع طرح طرح کے طلسماتی کرشمے دکھا کر ان کے اعتقادات کو مضبوط کرتا رہتا تھا۔

المقنع[1] نے سیماب اور بعض دوسرے کیمیاوی مرکبات سے ایک مصنوعی چاند تیار کیا۔ یہ چاند نخشب کے ایک کنوئیں سے نکلتا اور ہرات کے قریب پہاڑوں کے پیچھے غروب ہوتا نظر آتا تھا۔ ماہ نخشب، دو ماہ تک متواتر دکھائی دیتا۔ اس کی روشنی بارہ بارہ میل تک نظر آتی تھی۔

المقنع نے اپنے پیروؤں کی ایک فوج بھی منظم کی اور خلیفہ مہدی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور کافی عرصہ اس کے لیے وجہ پریشانی بنا رہا۔ آخر خلیفہ مہدی کے حکم سے مسیب بن زہیر اس فتنے کے استیصال کے لیے نامزد ہوا۔ مسیب نے المقنع کو اس کے صدر مقام پر جا گھیرا۔ اس نے جب دیکھا کہ بچاؤ کی کوئی صورت نہیں، تو اپنی بیویوں اور دوسرے پیروؤں سے دریافت کیا، تم میں سے کون کون میرے ساتھ جنت میں جانا چاہتے ہیں؟

---

[1] مالالہند بحوالہ لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد اول صفحہ ۳۱۹

جنت میں جانے کو بھلا کون تیار نہ تھا، چنانچہ سب نے اس کا ساتھ دینے کی خواہش ظاہر کی۔ آخر اس نے سب کو زہر پلا دیا اور خود تیزاب[1] کے ایک خم میں بیٹھ گیا، جس سے اس کے جسم کے ذرات تیزاب میں تحلیل ہو گئے۔

ہارون الرشید چوتھے خلیفہ ہادی (۶۹ تا ۱۷۰ ہجری بمطابق ۷۸۵ تا ۷۸۶ء) کے بعد اس کا بھائی ہارون الرشید مسند نشین خلافت ہوا اس کی خلافت ۱۷۰ تا ۱۹۳ھ۔ بمطابق ۷۸۶ تا ۸۰۸ع رہی۔ اس کے عہد کو اسلام کا "سنہرا دور" کہا جاتا ہے۔

ایران نے بازنطینیوں کے خلاف ایک قدیمی مہم جاری تھی۔ اسے ہارون الرشید نے بھی جاری رکھا۔ اس کے عہد میں ایرانی بحری بیڑا بڑی کامیابی سے بحیرہ روم میں جنگ کرتا رہا۔ اس کا یہ بھی اثر ہوا کہ اسلام کے مبلغ دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل کر اشاعت اسلام میں مصروف رہے۔

ہارون الرشید علم و ادب کا بہت بڑا محسن خیال کیا جاتا ہے۔ خلیفہ منصور کے عہد میں، جو دارالترجمہ قائم ہوا تھا، اسی عہد میں اپنے اوج کمال کو پہنچا۔

برمکی وزرا خاندان عباسیہ کے پہلے پانچ خلیفے اس لحاظ سے بہت خوش قسمت تھے کہ انھیں برمکی خاندان کے قابل وزیر میسر آئے جنھوں نے پچاس سال تک ۱۳۲ تا ۱۹۳ ہجری بمطابق ۷۴۹ – ۸۰۸ء امور خلافت کو نہایت دانش مندی اور دیانت داری سے چلایا۔ یہ وزرا علم و ادب کے بہت بڑے محسن تھے۔ ان کی سخاوت اور مہمان نوازی زبان زد خلائق تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ برمکی وزرا نے اپنی گوناں گوں صلاحیتوں کے ذریعے عباسی حکومت کو چار چاند لگا دیئے۔

---

[1] ہسٹری آف پرشیا مولفہ پرسی سائیکس حصہ اول ص ۵۶۳

خاندان برامکہ | لفظ "برمک"[1] اصل میں "برمغ" تھا۔ بلخ کے آتش کدہ نوبہار کے متولی کو اہلِ فارس برمغ کہتے تھے۔ اہلِ عرب برمغ کو معرب کر کے برمک کہنے لگے۔ برامکہ اسی خاندان کے افراد کو کہتے تھے۔ یہ لوگ آتش کدہ نوبہار کے متولی تھے۔

مورخین نے برامکہ کی تاریخ کی ابتدا جعفر بن جاماس سے کی ہے، جو نسباً آتش پرست تھا! اور بلخ کے آتش کدہ نوبہار کا متولی تھا۔ جعفر علم و ادب، انشاپردازی اور شاعری میں بہت شہرت رکھتا تھا۔ یہی کمال بالآخر اسے بلخ سے دمشق لے آیا، کیونکہ اس وقت خلیفہ کے دربار کے سوا کمالات کے اظہار کا کوئی اور وسیلہ نہ ہوتا تھا۔ جعفر کو خاندانِ اُمیّہ کے چھٹے خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دربار میں کاتب کا منصب تفویض ہوا۔ بالآخر ولید ہی کے فیضِ صحبت سے جعفر مشرف بہ اسلام ہوا۔

جعفر کے بیٹے خالد نے جب ہوش سنبھالا، تو بنو اُمیّہ کے اقتدار کو زوال آ چکا تھا۔ آخر جب آلِ عباس نے بنو اُمیّہ کے مقابلے میں علم بلند کیا تو اس وقت خالد نے آلِ عباس کی حمایت میں بڑی اہم خدمات انجام دیں۔ چنانچہ جب عباسی خلافت قائم ہوئی اور ابو العباس السفاح مسندِ خلافت پر بیٹھا، تو خالد کی خدمات کے صلے میں وزارت کا منصب اُسے سونپا گیا۔

خالد کا نامور بیٹا یحییٰ تھا جو سنِ رشد کو پہنچتے ہی علم و فضل میں بہت بڑی شہرت حاصل کر چکا تھا، چنانچہ اُسے شہزادہ ہارون کا اتالیق مقرر کر دیا گیا۔ آخر خلیفہ مہدی کے بیٹوں ہادی اور ہارون میں لڑائی چھڑی اور ہارون الرشید خلافت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو ہارون نے یحییٰ کو اپنا وزیر بنا لیا۔

یحییٰ کا عہدِ وزارت مختلف علوم کی اشاعت کے لیے مشہور رہے۔ اس عہد میں

---

[1] لٹریری ہسٹری آف پرشیا مؤلفہ براؤن جلد اول ص ۲۵۷

فلسفے کی بعض اہم کتابوں کے ترجمے ہوئے اور علمی ذوق پیدا کرنے کے لیے "بیت الحکمت" اور "مجالس مناظرہ" کا قیام عمل ہو آیا۔

یحییٰ کی ضعیفی کی وجہ۔ اس کا بیٹا فضل، ہارون الرشید کا وزیر مقرر ہوا لیکن کچھ عرصے بعد فضل کی بجائے اس کے بھائی جعفر کو یہ منصب عطا ہوا۔

جعفر برمکی وہ جلیل القدر شخص ہے، جس کی وجہ سے برمکی خاندان کی شہرت انتہا کو پہنچی اور پھر یہی وہ بدنصیب شخص ہے، جس کی وجہ سے اس رفیع الشان خاندان کا خاتمہ بھی ہوا۔ جعفر نے وزارت کے فرائض نہایت قابلیت سے ادا کیے۔ اس کے عہد میں علوم و فنون نے بہت ترقی پائی ملک خوشحال تھا اور عوام مطمئن تھے۔ وہ خود ایک عالی رتبہ اور خود مختار وزیر تھا۔ کسی معاملے میں اپنے آپ کو خلیفہ کے مشورے کا محتاج نہ سمجھتا تھا۔ ہارون کو اسکی قابلیت پر بہت ناز تھا۔ خلیفہ کی کوئی محفل ایسی نہ تھی جس میں جعفر کی شرکت ضروری نہ سمجھی جاتی تھی۔

زوالِ برامکہ

کوئی چیز جب انتہائی عروج کو پہنچ جاتی ہے، تو اُس کا زوال ایک لازمی امر ہو جاتا ہے۔ برامکہ کا اقتدار بھی بالآخر اسی قانون انقلاب کی زد میں آیا۔ برمکیوں کے زوال کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور رہیں، لیکن بہر حال یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ جعفر امور خلافت میں کچھ اس طرح دخیل ہو چکا تھا کہ خلیفہ اپنے آپ کو بے بس سمجھتا تھا خلیفہ کو جعفر کا اقتدار سخت ناگوار گزرتا تھا۔ جعفر کی قابلیت، جس پر پہلے خلیفہ کو فخر تھا، اب اُس کے لیے وحشت کا موجب بن گئی۔ یہی وحشت آخر جعفر کے قتل کا سبب بنی۔ اسی پر بس نہیں، اس کے بعد اس کا بھائی فضل اور برمکی خاندان کے بیشتر قابلِ ذکر افراد خلیفہ کے رشک و غضب کا نشانہ بنے۔ اس طرح ایران کا یہ نامور خاندان، جس نے پچاس سال تک نہایت کامیابی سے حکومت چلائی، یکایک ہارون الرشید کے ہاتھوں صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔

ہارون کے جانشین امین اور مامون ۱۹۳ تا ۲۰۸ ہجری مطابق ۸۰۸ء تا ۸۲۳ء

ہارون الرشید نے اپنا جانشین تو امین کو نامزد کیا جو عرب عورت زبیدہ کے بطن سے تھا لیکن مامون کو، جو ایرانی لونڈی کے بطن سے تھا، ہمدان کی حکومت دی اور وصیت کی کہ امین کے بعد اس کا جانشین مامون کو مقرر کیا جائے۔

ہارون کی اس وصیت سے دونوں بھائی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن گئے۔ مامون نے خراسان کے علاقے میں اپنے پاؤں جمائے جہاں کے باشندے اسے "خواہر زادہ" کہا کرتے تھے۔ اس نے رفتہ رفتہ سمرقند کا علاقہ بھی فتح کر لیا آخر اس نے "خلیفۂ مشرق" کے نام سے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ ادھر امین کو اہل بغداد اپنی آنکھوں کا تارا سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس نے بغداد کو اپنی طاقت کا سرچشمہ بنایا، جہاں کے لوگ مامون کو محض اس لیے نفرت کی نگہ سے دیکھتے تھے کہ وہ ایک ایرانی عورت کے بطن سے تھا، اور اس کی ہمدردیاں ایرانیوں کے ساتھ تھیں۔

مامون کے جرنیل طاھر کی فتوحات

امین نے بغداد سے فوج بھیج کر چاہا کہ مامون سے ہمدان اور خراسان کے علاقے لے لے، لیکن اسے اپنے ارادے میں کامیابی نہ ہو سکی۔ مامون کے جرنیل طاہر نے امین کی فوجوں کو شکست فاش دے کر لوٹا دیا۔ اس فتح کے بعد طاہر نے کئی اور مقامات پر امین کو شکست دی، بالآخر امین مارا گیا اور مشرقی اور مغربی ایران میں ۱۹۶ ہجری مطابق ۸۱۱ء میں مامون الرشید کی خلافت قائم ہو گئی۔

علمی ترقی کا سنہرا دور

مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ مامون الرشید کا دور ۱۹۶ تا ۲۰۸ ہجری مطابق ۸۱۱ء تا ۸۲۳ء اسلامی عہد

کا سنہرا دور ہے۔ اس عہد میں طب، فلسفہ، ریاضی اور سائنس کے علوم کی تدریس کے وسیع پیمانے پر انتظامات کیے گئے تھے۔ علما کی بہت قدر و منزلت ہوتی تھی۔ علماء خواہ مسلمان ہوں، یا آتش پرست، عیسائی ہوں یا یہودی، خلیفہ کی نظروں میں ان کی یکساں قدر و منزلت تھی۔ اس دَور میں یونانی علوم کی مستند کتابیں عربی میں ترجمہ کرائی گئیں تاکہ علوم کا ذخیرہ وسیع ہو سکے۔

فرقۂ معتزلہ

اس عہد میں فرقۂ معتزلہ کے عقاید کا مختصراً ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، جن کا خلیفہ مامون اور اس کے امرائے دربار پر گہرا اثر تھا۔ فرقہ معتزلہ کے لوگ مسئلہ تقدیر کے قائل نہ تھے، بلکہ اس کے برعکس وہ انسان کو ہی اپنے افعال و کردار کا مختار سمجھتے تھے۔[1] ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ قرآن کریم (نعوذباللہ) خدا کا کلام نہیں، بلکہ انسان کی تخلیق ہے۔

عقاید معتزلہ کا بانی

مشہور صوفی حسن بصری کے مریدوں میں ایک شخص واصل بن عطا تھا۔ اسے اپنے مرشد کے ساتھ ایک مسئلہ پر اختلاف ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک مومن کسی گناہ عظیم کا مرتکب ہونے کے بعد مومن کہلانے کا حق دار نہیں رہتا۔ وہ نہ مومن کہلا سکتا ہے، نہ غیر مومن، اس کا درجہ ان دونوں کے مابین ہو گا۔ لیکن حسن بصری کا یہ خیال تھا کہ ایسا شخص گناہ گار تو ضرور ہے، لیکن مومنوں کی فہرست سے خارج نہیں ہو سکتا۔ اسی اختلاف کی بنا پر واصل نے مسجد کے ایک گوشے میں الگ بیٹھنا شروع کیا۔ اس کے ساتھ اس کے بعض دوسرے ہم خیال بھی شریک ہو گئے۔ اس گروہ کو دیکھ کر حسن بصری نے کہا: اِعتَزَلَا اَنَا، یعنی وہ ہم سے الگ ہو گیا۔ چنانچہ واصل کا یہ گروہ معتزلہ کہلانے لگا۔

---

[1] بحوالہ لٹریری ہسٹری آف پرشیا حصہ اوّل صفحہ ۲۸۴

اس فرقے کا تعلق یوں تو عراق سے تھا، لیکن معتزلہ عقائد کی نشو ونما زیادہ تر دمشق میں ہوئی، اُن کا خیال ہے کہ انسان اپنے افعال و اعمال پر قادر ہے، اس لیے اس لیے اس فرقے کو "قدریہ" بھی کہتے ہیں۔

فرقہ معتزلہ کے عقاید سے خلیفہ مامون اور امرائے دربار بھی متاثر ہوئے اب بجائے اس کے کہ یہ دوسرے مسلمانوں کو آزادی سے اظہار خیالات کا موقع دیتے، جبر و تعدی سے ان کو اپنے عقائد کی طرف مائل کرنے لگے۔ خلیفہ مامون نے اپنی خلافت کے آخری سال میں حکام کے نام فرمان جاری کیے، کہ جو مسلمان قرآن کریم کو انسانی تخلیق نہ سمجھے، اسے سرزنش کی جائے اسی سلسلے میں خود خلیفہ کے دربار میں دو درجن مقتدر علما پیش کیے گئے، جن میں امام حنبل رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔ ان سے کہا گیا کہ وہ قرآن کے انسانی تخلیق ہونے کا اقرار کریں ورنہ انھیں سخت سے سخت سزا کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ بعض دوسرے علمانے تو عافیت اسی میں کہ قرآن کو انسانی تخلیق تسلیم کر لیں، لیکن امام حنبلؒ نے بڑی سے بڑی دھمکی پر بھی اپنے عقیدے کو نہ چھوڑا

مامون الرشید کے بعد اس کے جانشینوں معتصم اور واثق باللہ نے بھی سخت گیری کا یہی طریق کار اختیار کیا۔ آخر جب المتوکل خلیفہ بنا، تو اس تحریک کا ردِ عمل شروع ہوا۔ کیونکہ وہ فرقہ معتزلہ کا شدید ترین مخالف تھا، چنانچہ اس کی متشددانہ حکمت عملی سے اس کے عہد میں ۲۳۲ تا ۲۴۷ ہجری مطابق ۸۴۶ - ۸۶۱ء فرقہ معتزلہ کی سیاسی قوت ختم ہو گئی۔

الاشعری کی تعلیم

خلیفہ المتوکل کی وفات کے بعد ایک مشہور عالم الوالحسن الاشعری نے معتزلیوں کا رہا سہا طلسم بھی توڑ دیا۔ یوں تو الوالحسن کو بھی نئی مذہبی رَد کے موافق شروع شروع میں معتزلی عقائد ہی کی تعلیم دلائی

گئی تھی، لیکن اس سے انھیں اطمینان حاصل نہ ہو سکا۔ بالآخر وہ اپنی تحقیق سے اس نتیجے پر پہنچے کہ معتزلی عقائد گمراہیوں کا پلندا ہیں، چنانچہ ان عقائد کو خیرباد کہہ کر انھوں نے معتزلی عقائد کو جھٹلانے کے لیے منطقی طریقہ اختیار کیا اور ان کی تردید میں مدلل کتابیں تصنیف کیں۔

اخوان الصفا الاشعری کی تعلیمات سے معتزلہ عقائد کے اثرات مذہب دم ہوتے چلے گئے، لیکن بالکل محو نہ ہوئے۔ چوتھی صدی ہجری کے شروع میں "اخوان الصفا" کے نام سے ایک پُراسرار جماعت وجود میں آئی، جو مذہب اور سائنس کی تعلیم میں یکسانیت پیدا کر کے دراصل معتزلہ عقائد کی اشاعت کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اخوان الصفا نے اس مقصد کے لیے اپنی متفقہ کوششوں سے پچاس رسالے تصنیف کیے۔

تحریک شعوبیہ خلافتِ راشدہ جب تک قائم رہی، عدل و مساوات کے نوریں اصولوں پر عمل ہوتا رہا، امیر، غریب اور عرب و عجم کا کوئی امتیاز نہ تھا، لیکن جونہی بنو امیہ کی خلافت قائم ہوئی، انھوں نے مساوات کے اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا۔ عرب اہلِ ایران کو موالی یعنی "غیر عرب مسلمان" سمجھنے لگ گئے۔ موالی کو وہ اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے، نہ ان سے رشتے ناطے ہی کرنا چاہتے تھے۔ اہلِ ایران کو عربوں کی نسلی برتری کا خیال سخت ناگوار گزرتا تھا آخر شدید ردِ عمل شروع ہوا اور "شعوبیہ" کے نام سے ایک خالص ایرانی تحریک چلی جس کا نصب العین یہ تھا کہ اہلِ ایران کو عربوں سے ہر لحاظ سے فائق و برتر ثابت کیا جائے، چنانچہ اس سلسلے میں ہر طرح کی کوشش عمل میں لائی گئی۔

ایرانی نسب کی برتری کو ظاہر کرنے کے لیے اسحٰق بن حسن الخرمی سغدی اپنے ایک شعر میں یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کا جدِ امجد ساسان اور باپ نوشیرواں ہے۔

اور اس کے چچا خاقان ہیں۔ ابو عثمان سعید بن جنید نے ایرانیوں کی فضیلت پر متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ ابو ریحان البیرونی کا شمار بھی اسی تحریک کے علم برداروں میں ہوتا ہے۔

شعوبیہ تحریک کا اثر ہمہ گیر تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ خلیفہ ابو جعفر منصور کے عہد میں ایک عرب کو باریابی کا شرف حاصل کرنے کے لیے گھنٹوں کھڑا رہنا پڑتا اور بالعموم اُسے مایوس لوٹنا پڑتا لیکن اس کے برعکس ایک خراسانی جب چاہتا، بلا روک ٹوک دربار میں چلا جاتا۔

شیعانِ علی

خلفائے راشدین میں سے چوتھے خلیفہ حضرت علی کرم اللہ وجہ، رسول اکرمؐ کے چچیرے بھائی تھے۔ اس لیے آنحضرتؐ کی وفات کے بعد بعض مسلمان آپ ہی کو خلافت کا حق دار سمجھتے رہے۔ یہ مسلمان شیعہ کہلائے۔ شیعہ حضرات، حضرت علیؓ کو پہلا امام سمجھتے ہیں، جو انسان اور خداوند تعالیٰ کے مابین روحانی قرب کا وسیلہ ہیں۔ شیعہ حضرات کے نزدیک امامت حضرت علیؓ کے گھرانے کا حق ہے۔ چنانچہ آپ کے بعد آپ کی اولاد سے دس اور امام بھی ہوئے جن کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔ حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت زین العابدین، حضرت محمد الباقر، حضرت جعفر الصادق، حضرت موسیٰ کاظم، حضرت علی ارضا، حضرت محمد التقی، حضرت علی النقی اور حضرت حسن العسکری، بارہویں امام مہدی ہوں گے۔

شیعہ حضرات بارہ اماموں کو مانتے ہیں، اس لیے انھیں اثنا عشریہ بھی کہتے ہیں۔

فرقہ اسمٰعیلیہ

شیعہ حضرات کے چھٹے امام حضرت جعفر الصادق نے اپنے بڑے بیٹے اسمٰعیل کو امام نامزد کیا تھا، لیکن ان کی امامت کسی وجہ سے منسوخ کردی گئی۔ اسمٰعیل کے بعض پیروؤں کا خیال تھا کہ امامت ایک مقدس امانت ہے، جو حق تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتی ہے، اور کسی صورت میں منسوخ نہیں ہو سکتی۔ جو لوگ اسماعیل کو بدستور امام سمجھتے رہے، "اسمٰعیلی" کہلائے۔ اسمٰعیل کا ایک ہی بیٹا

محمد تھا، جو باپ کی زندگی ہی میں فوت ہو گیا۔ اس لیے امامت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اسمٰعیلی بعد کے اماموں کو نہیں مانتے۔ فرقہ اسمٰعیلیہ اور اثنا عشریہ میں شروع شروع میں صرف یہی فرق تھا کہ اوّل الذکر پہلے سات اماموں کو مانتے تھے اور موخر الذکر بارہ اماموں کو، لیکن جب فرقہ اسمٰعیلیہ کی رہنمائی کا منصب عبداللہ میمون القداح کو ملا، تو عقائد کے لحاظ سے اختلافات کی خلیج وسیع ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ اثنا عشری اسمٰعیلیوں کو ملحد کہنے لگے۔ اسمٰعیلیوں کے عقائد اور عبداللہ میمون کا ذکر آگے آئے گا۔

تصوف کا آغاز

اسی زمانے میں تصوف کی اہم تحریک شروع ہوئی جس نے دنیائے ادب کو بہت متاثر کیا، اس لیے اس کا قدرے تفصیل سے ذکر کرنا مناسب ہوگا۔

آغاز تصوف کے متعلق مختلف آرا

بعض محققین کا خیال ہے کہ تصوف اہل ہند کے قدیم فلسفہ ویدانت کا پرتو ہے۔ اس میں شک نہیں کہ چھٹی صدی عیسوی، یعنی ساسانی بادشاہ نوشیرواں عادل کے زمانے میں ایران اور ہند میں کچھ روابط قائم ہو گئے تھے۔ چنانچہ اسی زمانے کی یادگار مشہور کتاب کلیلہ و دمنہ ہے، جو سنسکرت سے پہلوی میں ترجمہ ہوئی۔ لیکن ان روابط کے باوجود ایران پر ہندی ویدانت کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ ہندی فلسفہ مذہب کا مطالعہ کرنے والا سب سے پہلا مسلمان البوریحان البیرونی ہے، جس نے سلطان محمود غزنوی کی یلغاروں میں ہندوستان میں رہ کر سنسکرت زبان سیکھی اور "تحقیق ماللہند"[1] کتاب تالیف کی، لیکن تاریخ تصوف کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ آٹھویں صدی کے

---

[1] کتاب کا پورا نام "تحقیق ماللہند من مقولۃ مقبولۃ فی العقل او مرذولۃ" ہے۔ عام طور پر یہ کتاب "الہند" کے نام سے مشہور ہے۔

وسط میں تصوف کی مذہبی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔

۲- بعض ایرانی مورخین کا یہ خیال ہے کہ تصوف خالص ایرانی تحریک ہے، جو بہت قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ اس خیال کی تائید میں وہ ایک ایرانی مفکر مانی کی دینی تعلیم کا حوالہ دیتے ہیں۔ مانی نے ۲۱۵ء میں ساسانی بادشاہ شاہ پور کے زمانے میں اہل ایران کو ایک نئی دینی تعلیم سے روشناس کرایا۔ اس تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا فانی ہے اس سے دل لگانا عبث ہے، بلکہ یہاں کی ہر اس چیز سے پرہیز کرنا چاہیے، جو دنیا سے انسانی تعلق کو استوار کرنے والی ہو۔ اس کے نزدیک شادی بیاہ دنیاوی تعلقات کو بڑھانے کا موجب ہیں۔ اس لیے اس نے اپنے پیروؤں کو شادی بیاہ سے بھی روکا مانی نے ترک دنیا کی جو تلقین کی، وہ ویدانت سے مشابہت رکھتی ہے، مگر تصوف کو ویدانت سے کوئی مشابہت نہیں۔ ویدانت اور مانی کی تعلیم منفی فلسفے کی حیثیت رکھتی ہے یعنی دنیا کو ترک کرو جسم کو مسلسل ایذائیں دے کر نابود کر دو، اور عالم بالا سے لو لگا دو۔ اس کے برعکس تصوف کی حیثیت مثبت فلسفے کی ہے۔ یعنی مجاہدہ کرو، حق کی جستجو کرو، نفس کی تہذیب تربیت کے لیے جد و جہد کرو۔ آئینۂ باطن کو اس حد تک جلا دو، کہ اس میں جلوۂ حق نظر آنے لگے۔ دنیا میں رہو اور دنیا کے حقوق و فرائض پورے کرو۔ اہل دنیا کی بے ریا خدمت کرو۔ ریاضت و مجاہدہ کو کشف و شہود کا ذریعہ بناؤ اور کسب معرفت کرو۔ گویا تصوف، طلب و جستجو، خلوص و محبت، تربیت نفس اور کسب معرفت کا نام ہے۔

۳- بعض محققین کا خیال ہے کہ تصوف فلاطون کی نوفلاطونیت "یعنی اشراقی تعلیم کی صدائے بازگشت ہے۔ اشراقی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ جو کچھ ہے نفس مدرک کے اندر ہے۔ خارج میں کسی چیز کا وجود نہیں۔ نفس مدرک خارجی مظاہر کو وجود دیتا ہے۔ وجود مطلق خدا کی ذات ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے حقیقی نہیں، بلکہ محض ظاہری اور اعتباری حیثیت رکھتا ہے۔ خدا کو جاننا چاہتے ہو، تو اپنے نفس کا مطالعہ کرو۔ ایک عارف عقل

کے ساتھ ساتھ نورِ اشراقی ہی کے ذریعے حقیقت مطلق کو جان سکتا ہے۔" فلاطون کی اشراقی تعلیم کا سرچشمہ ۳۰۰ ق م میں یونان سے پھوٹا تھا۔

تصوّف اور اشراقی تعلیم میں کچھ مشابہت ضرور ہے جس کی وجہ سے محققین کو یہ خیال ہوا کہ تصوف اشراقی فلسفے ہی کا پرتو ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فلاطونی تعلیم کے سات پیرو کار یونانی بادشاہ جسٹینین کے مذہبی تعصب کی وجہ سے ترک وطن کرکے ایران آ گئے اور نوشیرواں عادل کے دربار میں پناہ لی، لیکن قدیم تذکروں میں اس بات کا کہیں پتا نہیں چلتا کہ اہل ایران اشراقی تعلیم سے متاثر ہوئے، بلکہ اس کے برعکس مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ تصوف کی تحریک ساسانی بادشاہت کے اختتام کے بعد ایران سے نہیں، بلکہ عراق سے شروع ہوئی اور پھیلتی ہوئی ایران پہنچی۔ اگر تصوّف اشراقی تعلیم کا پرتو ہوتا تو تحریک تصوف کا مرکز عراق کی بجائے ایران ہوتا اور مسلمانوں کی بجائے ساسانی آتش پرست اس کے مبلغ ہوتے۔

۴۔ چوتھا نظریہ قدیم صوفیائے کرام کا ہے۔ یعنی یہ کہ تصوف ایک خالص اسلامی تحریک ہے سنہ ۱۵۰ھ کے قریب عراق سے چلی اور ایران میں پہنچی۔

تصوّف کی وجہ تسمیہ

تصوف کی وجہ تسمیہ کے متعلق بھی محققین کی مختلف آرا ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ صوفی لفظ "صفا" سے ہے۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ رسُولِ اکرمؐ کے زمانے میں بعض مسلمان درویش اور صحابہ کرام چبوتروں پر بیٹھا کرتے تھے، جو اصحاب الصفہ" کہلاتے تھے۔ انہی کو لوگ صوفی کہنے لگے۔ لیکن قدیم صوفیائے کرام اس بات پر متفق ہیں کہ لفظ صوفی کو صوف سے نسبت ہے۔ صوف کو پشمینہ اور اون بھی کہتے ہیں۔ اوّلیں مسلمان عموماً اون کے جبّے پہنا کرتے تھے۔ یہ اونی جبّے فقر اور سادگی کا نشان سمجھے جاتے تھے۔ اس لیے اونی جبّے پہننے والوں کو صوفی کہا جاتا تھا۔

اوّلیں صوفیاء کے متعلق ایک مشہور صوفی القشیری لکھتے ہیں کہ حضرت رسولِ اکرمؐ

کی وفات کے بعد وہ مسلمان بہترین مسلمان خیال کیے جاتے تھے، جن کو آنحضرت کا صحابی ہونے کا شرف حاصل تھا۔ ان کے بعد وہ بہترین مسلمان تھے، جو ان صحابیوں کی صحبت میں رہے۔ اور تابعین کہلائے۔ تابعین کے بعد ان مسلمانوں کا درجہ ہے، جو تابعین سے رسم و راہ رکھتے تھے، اور تابع تابعین کہلاتے تھے۔ ان لوگوں کے بعد رفتہ رفتہ اسلامی عقاید میں کچھ فرق آنے لگا، لیکن اس وقت بھی ایسے مسلمان موجود تھے، جو اسلامی عقاید کے پُرجوش مبلغ تھے اور جگہ جگہ ان عقاید کی اشاعت کرتے تھے۔ یہ مسلمان صوفی کہلاتے تھے۔

مولانا جامی نفحات الانس میں لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے صوفی کا لقب ابوہاشم کو ملا، جو کوفے میں پیدا ہوئے اور ۱۶۱ ہجری مطابق ۷۷۸ء میں وفات پائی۔ صوفیا کی طریقت کی وضاحت اور تشریح سب سے پہلے ذوالنون مصری نے کی، جن کی وفات ۲۴۶ ہجری مطابق ۸۶۰ء میں ہوئی پھر جُنید بغدادی طریقت کو وسعت دے کر اسے ضبطِ تحریر میں لائے اور شبلی نے باقاعدہ طریقت کی نشر و اشاعت کی۔

اوّلیں صوفیا میں ابراہیم ادھم، داؤد طائی، فضیل بن عیاض، معروف کرخی، حسن بصری، رابع بصری، شفیق بلخی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اوّلیں صُوفیا کی تعلیم

اوّلیں صُوفیا جہاں توحید اور دین داری کی تلقین کرتے تھے، وہاں مقامِ انسانی کی عظمت، امید و رجا اور تربیتِ نفس کی بھی تعلیم دیتے تھے۔ وہ اس بات پر بھی زور دیتے تھے کہ علومِ ظاہری سے آراستہ ہو کر زہد اختیار کرو، نفس کی تہذیب کے لیے ریاضت کرو اور روح کو تقویت دو۔ درویشی کو آسان کام نہ سمجھو، خانقاہوں کو نمود و نمائش کا مقام نہ بنا لو۔

تصوّف اسلامی ایک مثبت فلسفہ ہے، جو طلب و جستجو، خلوص و محبت، ایثار و

خدمت خلق مطالعہ و تربیت نفس، کسب معرفت اور فنا فی الذات ہونے پر مشتمل ہے۔ جس مسلک پر اہل طریقت عمل کرتے ہیں، وہ طریقت کہلاتا ہے۔ طریقت کی کئی منزلیں ہیں۔ سالک ریاضت و مجاہدہ سے تزکیہ باطن کر کے قلب کو عشق و محبت کا مرکز بناتا ہے۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ کی جلوہ گاہ بننے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے اور عالم سفلی کی کثرت کو پیچھے چھوڑتا ہوا عالم بالا کی وحدت کے مقام پر پہنچنے کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔

شریعت اور تصوف

مولانائے روم نے شریعت کے اسرار کے ساتھ ساتھ طریقت اور حقیقت کے مسائل بھی بیان کیے ہیں۔

شریعت، طریقت اور حقیقت کا فرق دفتر پنجم میں اس طرح کرتے ہیں "شریعت ایک شمع ہے، جو ہمیں راستہ دکھاتی ہے۔ جب ہم شمع کی روشنی کی مدد سے راستے پر چل نکلتے ہیں، تو یہ راستہ طریقت ہے اور جب ہم اس راستے پر گامزن ہو کر منزل مقصود پر پہنچتے ہیں تو یہ منزل مقصود حقیقت ہے"۔

مولانا کے اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کے نزدیک شریعت اور طریقت الگ الگ یا متضاد مسلک نہیں، بلکہ تربیت نفس کی یہ دو منزلیں ہیں۔ ایک منزل طے کر کے ہم دوسری منزل میں آتے ہیں۔

مامون کے جانشین

مامون الرشید کی وفات پر خلافت کی باگ ڈور خلیفہ معتصم کے ہاتھوں میں آئی۔ معتصم کے خلیفہ بننے سے تقریباً چالیس سال پیشتر خلیفہ ہارون الرشید نے ایرانی فوج کا سپہ سالار کسی عرب کی بجائے ایک ترک جرنیل کو مقرر کیا تھا، اور یہ سلسلہ خلیفہ معتصم کے عہد میں بھی جاری رہا۔ ہزاروں ترک غلام ایشیا سے لا کر فوج میں بھرتی کیے گئے۔ اس پر عرب سپاہی سخت بددل ہو گئے اور ایران سے دل برداشتہ ہو کر رفتہ رفتہ صحرائے عرب کی راہ لیتے رہے۔

معتصم کے بعد واثق باللہ ۲۲۷ تا ۲۳۲ ہجری مطابق ۸۴۱ تا ۸۴۶ء مسند خلافت پر متمکن رہا، اس نے بھی ترکوں کو اپنے قدم جمانے میں مدد دی۔

المتوکل کا عہدِ خلافت ۲۳۲ تا ۲۴۷ ہجری مطابق ۸۴۶ تا ۸۶۱ء تھا۔ معتزلی عقاید کا وہ شدید ترین مخالف تھا۔ شیعانِ علی کی طرف بھی اس کی نگاہ قہر آلود ہی رہی۔ یہودی اور عیسائی بھی اس کے تعصب کا شکار ہوئے۔ پندرہ برس کی خلافت کے بعد بالآخر یہ خلیفہ اپنے بیٹوں کے ہاتھوں مارا گیا۔

متوکل ہی وہ خلیفہ ہے جس کے عہد میں اہلِ ایران کو ملکی حکومتیں قائم کرنے کا خیال آیا تھا۔

خاندانِ طاہریہ ۲۰۵ تا ۲۵۹ ہجری مطابق ۸۲۰-۸۷۲ عیسوی

خلفائے عباسیہ کے عہد میں سب سے پہلی وطنی حکومت آلِ طاہر کی قائم ہوئی۔ اس حکومت کا بانی طاہر ذوالیمینین ایک ایرانی النسل شخص تھا جس کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ طاہر ایک فوجی جرنیل تھا۔ ہارون الرشید کی وفات پر جب اس کے بیٹوں امین اور مامون کے مابین مسندِ خلافت کے لیے جنگ چھڑی، تو طاہر نے مامون کا ساتھ دیا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ مامون ایرانی عورت کے بطن سے تھا، اس لیے اہلِ ایران اُس سے زیادہ مانوس تھے۔ بالآخر مامون الرشید جب فتح یاب ہو کر مسندِ خلافت پر متمکن ہوا، تو طاہر ذوالیمینین کو جنگی خدمات کے صلے میں خراسان کا حاکم بنا دیا۔ خراسان کی حکومت تیسری نسل تک اسی کے خاندان میں رہی آخر ۲۵۹ ہجری مطابق ۸۷۲ء میں طاہریہ خاندان کی حکومت صفاریوں نے ختم کر دی۔

زبانِ فارسی کا احیاء

آلِ طاہر کی حکومت خالص ایرانی تھی۔ اس کے عہد کے حکمرانوں نے فارسی زبان و ادب کی طرف خاص توجہ

دی۔ اور بخارا اور نیشاپور علم و ادب کے مرکز بن گئے ۔ اس عہد میں پہلی مرتبہ شعراء نے اپنی ملکی زبان فارسی میں شعر کہنے شروع کیے اس عہد کا ایک مشہور شاعر حنظلہ بادغیسی ہے۔

حنظلہ بادغیسی

فارسی زبان کا یہ وہ پہلا شاعر ہے ، جس نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا۔ حنظلہ نے اکثر اشعار میں شجاعت و مردانگی کا درس دیا ہے۔ نظامی عروضی[1] سمرقندی لکھتا ہے کہ احمد بن عبداللہ خجستانی سے کسی شخص نے سوال کیا، آپ کا پیشہ گدھوں کی پرورش کرنا تھا، خراسان کی امارت آپ کو کیسے مل گئی ؟ اس نے جواب دیا کہ اس کی وجہ حنظلہ کے یہ اشعار ہیں۔

مہتری گر بکام شیر در است　　　شو خطر کن زکام شیر بجوی

یا بزرگی و عزّ و نعمت و جاہ　　　یا چو مردانت مرگ رُ دیا روی

حنظلہ بادغیسی کی وفات ۲۱۹ یا ۲۲۰ ہجری بمطابق ۸۳۴ء - ۸۳۵ء بتائی جاتی ہے۔

خاندان صفاریہ

المتوکل کے عہد میں سیستان میں صالح بن نضر ایک شخص تھا، جو لوگوں کو دینی امور میں درس دیا کرتا تھا ۔ اس کے درس میں اکثر نوجوان شریک ہوتے تھے ۔ نوجوانوں کی ایک فوج بھی اس نے منظم کی تھی ، جس نے خوارج کے گروہ کو شکست دی ، جو آئے دن سیستان میں فتنہ بپا کرتے رہتے تھے ۔ یعقوب بن لیث صالح کا ایک دلیر اور جانباز پیروکار تھا۔ اس کے آباؤ اجداد ٹھٹھیروں کا کام کرتے تھے ۔ اس نے اپنا آبائی پیشہ ترک کر کے صالح کو فوجی جماعت منظم کرنے میں مدد دی تھی ۔ چنانچہ اسے سیستان کی اس فوج کا جرنیل بنا دیا گیا ۔ صالح فوت ہوا ، تو اہل سیستان نے یعقوب کو اپنا امیر

---

[1] چہار مقالہ مرتبہ مرزا محمد قزوینی صفحہ ۴۲

منتخب کر لیا۔ یعقوب کے کچھ پاؤں جمے، تو اس نے ۲۵۳ ہجری بمطابق ۸۶۷ء میں ہرات کا رُخ کیا، اور اُسے فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ پھر کرمان اور فارس کے علاقے فتح کر کے ایک وسیع سلطنت کا حکمران بن گیا اور عہدِ صفاریہ کی آزاد حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

صفاریہ عہد کی حکومت اگرچہ کم مدت تھی، لیکن یہ خالص ایرانی حکومت تھی، جو خلیفہ کی حکومت سے آزاد تھی۔ اس لیے ایرانیوں کے دل میں اس کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ یہ حکومت کچھ اس لیے بھی ایرانیوں کو عزیز تھی کہ رستم کے وطن سیستان میں قائم ہوئی تھی۔

یعقوب بن لیث جب پاؤں جما چکا تو اپنا ایلچی متوکل کے بیٹے معتمد کے پاس بھیجا، جو اس وقت خلیفہ وقت تھا۔ خلیفہ معتمد نے یہ سوچ کر کہ اس سرکش شخص کو جہاں تک ممکن ہو بغداد سے دُور رکھنا چاہیے، یعقوب کو بلخ اور ترکستان کی حکومت دے دی۔

خاندان طاہریہ کا حکمران، یعقوب کی یلغاروں کا منظر خاموشی سے دیکھتا رہا، اس کے اپنے علاقے بھی چھنے، لیکن اسے پھر بھی جنبش نہ ہوئی، چنانچہ اب یعقوب نے خراسان کا رُخ کیا اور خراسان کو فتح کر کے طاہری عہد کا خاتمہ کر دیا۔ پھر طبرستان کی طرف بڑھا اور حسن بن زید کو شکست دے کر عہدِ علویہ کا بھی خاتمہ کیا۔

یعقوب اب نصف ایران پر مسلط ہو چکا تھا۔ فتوحات کے نشے میں سرشار ہو کر اُس نے ۲۶۲ ہجری مطابق ۸۷۵ء میں ارادہ کیا کہ خلیفہ سے دو دو ہاتھ کر کے عربوں کا تسلط ختم کر دے۔ چنانچہ پہلے اس نے خلیفہ معتمد سے صوبہ فارس کی حکومت مانگی۔ خلیفہ نے نہ صرف یہ کہ فارس کی حکومت اُس کے سپرد کرنے سے انکار کیا، بلکہ خراسان کی حکومت بھی اس سے لے لی۔ یعقوب نے حالات بگڑتے دیکھے تو

سیدھا بغداد کی طرف بڑھا۔ دارالخلافہ کے قریب خلیفہ کی فوج سے مڈبھیڑ ہوئی لیکن اُسے منہ کی کھانی پڑی۔ اس پر بھی اس کے حوصلے پست نہ ہوئے اور واپس آکر نیا لشکر فراہم کرنے میں مشغول ہو گیا۔

۲۶۵ ہجری مطابق ۸۷۸ء میں خلیفہ نے خیرسگالی کے لیے اپنا ایک ایلچی یعقوب کے پاس بھیجا۔ جب یہ ایلچی پہنچا، تو یعقوب اس وقت صاحب فراش تھا۔ اسے کھانا پیش کیا جا رہا تھا۔ جس میں صرف ایک روٹی اور ایک پیاز تھا۔ اسی صورت میں یعقوب خلیفہ کے ایلچی سے ملا اور خلیفہ کو کہلا بھیجا کہ اگر میں زندہ رہا تو ہمارا فیصلہ تلوار کرے گی، اگر مجھے فتح ہوئی تو جس طرح میں چاہوں گا، ویسا ہی ہوگا اور اگر تمہیں فتح ہوئی تو میرے لیے یہ پیاز اور روٹی کا ٹکڑا تو ہے ہی۔ جو شخص اس قسم کی غذا پر مطمئن ہو سکتا ہے۔ اس پر نہ تم فتح پا سکتے ہو نہ قسمت؛ لیکن زندگی نے یعقوب کا ساتھ نہ دیا۔ جونہی ایلچی خلیفہ کے پاس پہنچا، یعقوب کو موت نے آلیا۔

یعقوب کی موت کے بعد اس کا بھائی عمر ؔلیث اس کا جانشین ہوا۔ اس کے بعد اُس کے بیٹے نے حکومت سنبھالی۔ بالآخر عہد صفاریہ ۲۸۸ھ مطابق ۹۰۰ء میں خاندان سامانیہ کے حکمران اسمٰعیل سامانی کے ہاتھوں ختم ہوا۔

عہد صفاریہ میں فارسی علم و ادب

عہد صفاریہ میں فارسی علم و ادب کو عہد طاہریہ کی نسبت زیادہ ترقی ہوئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عہد صفاریہ کا بانی یعقوب سیستان میں پیدا ہوا تھا، جو ایرانی داستانوں کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ یعقوب عربی زبان سے نابلد تھا۔ اس لیے شعرا جب عربی زبان میں قصیدے لکھ کر لاتے، تو وہ انھیں کہتا کہ ایسی زبان میں قصیدہ کہنے سے کیا حاصل، جسے میں سمجھتا ہی نہیں۔ یہ کہہ کر گویا اس نے ایران کے شاعروں

اور ادیبوں کی توجہ فارسی زبان کی طرف دلائی۔ چنانچہ شعرا فارسی زبان میں قصیدے کہنے لگے۔

عہد صفاریہ کے شاعر

یعقوب نے جس زمانے میں اپنے حریفوں زنبیل اور عمار خارجی کو ہلاک کیا اور ہرات پر فتح پائی تو اس وقت دربار صفاریہ کے شاعر محمد بن الوصیف سیستانی نے فارسی میں قصیدہ لکھ کر پیش کیا جس کے چند شعر حسب[1] ذیل ہیں۔

ای امیری کہ امیران جہان خاص و عام	بندہ و چاکر و مولائی و سگ بند و غلام
ازلی خطی در لوح کہ ملکی بدہید	بہ ابی یوسف یعقوب بن اللیث ہمام
بلام آمد زنبیل و لتی خورد بلنگ	لترہ شد لشکر زنبیل و ہبا گشت کنام
لمن الملک بہ خواندی تو امیرا بہ یقین	با قلیل الفئہ کت داد در آں لشکر کام
عمر عمار ترا خواست و زو گشت بری	تیغ تو کرد میانجی بمیان و دو دام
عمر او نزد تو آمد کہ تو چون نوح بزی	در آکار[2] تن او سر او باب طعام

فیروز مشرقی

صفاریہ دربار کا ایک مشہور شاعر فیروز مشرقی عمرو لیث کا ہم عصر تھا۔ اس کی یادگار ایک قطعہ ہے، جو اس نے اپنے ممدوح کے تیر کی تعریف میں لکھا تھا۔

---

[1] آقائے جلال ہمائی اپنی تالیف "تاریخ ادبیات ایران حصہ دوم ص ۲۵۱ پر لکھتے ہیں کہ یہ اشعار تاریخ سیستان میں لکھے گئے ہیں جس کے مولف کا پتہ نہیں چل سکا، لیکن قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تاریخ ۶۸۰ — ۶۸۵ھ مطابق ۱۲۸۱ — ۱۲۸۶ء میں لکھی گئی تھی

[2] "در آکار" اور "باب طعام" شہر سیستان کے دو دروازوں کے نام ہیں۔ یعقوب نے عمار خارجی کو قتل کرنے کے بعد اس کا سر ایک دروازے پر لٹکایا اور دھڑ دوسرے دروازے پر آویزاں کیا۔

مرغی الیست خدنگ ای عجب دیدی | مرغی کہ بود شکار او جانا
دارو پر خویش گر کسش ہدیہ | تا نہ بچہ اسش بر دیہم مانا

ابو سلیک گرگانی عہد صفاریہ کا ایک اور شاعر ابو سلیک گرگانی ہے۔ ذیل کا قطعہ اس کی یادگار ہے، جس سے اس کی آزاد روی، غیرت اور شرافت النفس کا پتہ چلتا ہے۔

خون خود را اگر بریزی بر زمین | بہ کہ آب روی ریزی در کنار
بت پرستیدن بہ از مردم پرست | پند گیر و کار بند و گوش دار

فارسی شاعری کا آغاز

ایرانی محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ساسانی عہد میں شعر کہے جاتے تھے، لیکن یہ شعر دعاؤں اور مناجاتوں پر مشتمل ہوتے تھے، چنانچہ اوستا کا قدیمی حصہ "گاتھا" نظم ہی میں تھا۔ البتہ ان اشعار کے بحر مختلف ہوتے تھے۔ ہمیں قدیمی اوستا کی شاعری سے بحث نہیں۔ ہمیں یہ بتانا مقصود ہے کہ فارسی جدید میں سب سے پہلے شعر کب کہے گئے۔

بعض تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ فارسی شعرا کی ابتدا بہرام گور اور اس کی محبوبہ دلآرام کے دو مصرعوں سے ہوئی، کہا جاتا ہے کہ بہرام نے یہ مصرعہ کہا۔

منم آں پیل دمان و منم آن شیر یلہ

دلآرام جھٹ بول اٹھی

نام بہرام ترا پدرت بو جبلہ

دونوں مصرعے ایک ہی وزن میں ہیں، اس لیے یہ شعر تو ہو گیا، لیکن ساسانی عہد کی یادگار صرف یہی ایک شعر ہے۔ ایک شعر کو شعر و سخن کی بنیاد نہیں قرار دیا

جاسکتا۔ بعض تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ خسرو پرویز ۵۹۰ تا ۶۲۷ء کے دربار میں ایک مغنّی تھا۔ جس کا نام باربد تھا۔ یہ خود ہی گیت لکھتا اور خود ہی گا کر سناتا تھا۔ ایک اور قدیم تذکرہ نویس کا بیان ہے کہ قصرِ شیریں کی ایک دیوار پر ایک فارسی قطعہ لکھا ہوا تھا۔ یہ قصرِ شیریں ۵۹۰ تا ۶۲۸ء زیر تعمیر رہا۔ ایک اور تذکرے میں ذکر آتا ہے کہ امیر عبداللہ حاکم خراسان کی خدمت میں، جو ۸۴۴ھ میں بقیدِ حیات تھا، نیشاپور میں "وامق عذرا" ایک منظوم داستان پیش کی گئی۔ یہ کتاب نوشیرواں کے نام سے منسوب تھی۔ امیر عبداللہ نے کہا، اچھے مسلمانوں کے لیے قرآن اور حدیث ہی کافی ہے۔ یہ کتاب آتش پرستوں کی لکھی ہوئی ہے، اس لیے اسے نذرِ آتش کر دیا جائے۔ مجمع الفصحا کے مولف رضا قلی ہدایت لکھتے ہیں کہ ایران میں ظہورِ اسلام کے بعد کا پہلا شاعر حکیم ابوحفص سغدی تھا، جو پہلی صدی میں ہوا۔ ذیل کا شعر اس کی یادگار ہے۔

آہوی کوہی در دشت چگونہ دودا　　　یار ندارد بی یار چگونہ دودا

حکیم ابوحفص کا پہلی صدی میں ہونا مشتبہ ہے، کیونکہ شمس قیس الرازی اپنی تصنیف کتاب المعجم فی معائیر اشعار العجم میں لکھتا ہے کہ حکیم ابوحفص تیسری صدی میں ہوا ہے اور یہ رودکی کا ہمعصر تھا۔ اس لیے یہ فارسی کا پہلا شاعر نہیں ہو سکتا۔

جلال الدین ہمائی تاریخ ادبیات ایران میں تاریخ سیستان کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ فارسی زبان کا سب سے پہلا شاعر محمد بن الوصیف سیستانی ہے، جس نے یعقوب بن لیث کی فتح پر قصیدہ لکھا تھا جس کا ذکر آچکا ہے قصیدہ کا مطلع یہ ہے۔

ای امیری کہ امیران جہان خاص و عام　　　بندہ و چاکر و مولای و سگ بند و غلام

نظامی عروضی سمرقندی حنظلہ بادغیسی کو قدیم ترین شاعر سمجھتے ہیں، جیسا

کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔ محمد عوفی اپنے تذکرہ لباب الالباب میں لکھتے ہیں کہ قدیم ترین شاعر عباس مروزی ہے، جو مامون الرشید کا معاصر تھا۔ مامون مرو میں پہلی مرتبہ آیا، تو عباس نے خلیفہ کی شان میں ایک قصیدہ کہا۔ عباس نے بھی دعویٰ کیا ہے کہ اس سے پہلے کسی نے ایسے شعر نہیں کہے۔

کس بدین منوال پیش از من چنین شعری نگفت مر زبان فارسی را هست تا این نوع بین
لیک ز آن گفتم من این مدحت ترا تا این لغت گیرد از مدح و ثنای حضرت تو زیب و زین

عباس مروزی کا قصیدہ ذیل کے مطلع سے شروع ہوتا ہے۔

ای رسانیده بدولت فرق خود تا فرقدین گسترانیده بجود و فضل در عالم یدین

مرزا محمد قزوینی نے "قدیم ترین شعر فارسی" کے عنوان سے ایک محققانہ مقالہ سپردِ قلم کیا ہے۔ اس میں انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ قصیدہ جو عباس کے نام منسوب ہے۔ عباس کے زمانے کا لکھا ہوا نہیں، بلکہ کہیں بعد کا لکھا ہوا ہے۔ ان کے دلائل مختصر طور پر ذیل میں لکھے جاتے ہیں۔

(۱) قصیدے کے اشعار کی ترکیب و بندش سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قدیم نہیں، بلکہ جدید ہیں۔

(۲) ایرانیوں نے اگر قدیم زمانے میں شعر کہے، تو ظاہر ہے کہ یہ عربی کی تقلید میں نہیں کہے گئے تھے۔ عربی عروض کے موافق اہل ایران نے اس وقت شعر کہنے شروع کیے، جب کہ عربی عروض کے موجد خلیل بن احمد کے توسط سے علم عروض کی نشر و اشاعت بڑھتے بڑھتے ایران میں بھی ہوئی۔ اہلِ ایران نے شروع شروع میں عربوں کے تمام اوزان کی تقلید کی اور جب تجربہ سے یہ معلوم ہوا کہ بعض عربی اوزان اہلِ ایران کے مزاج کے موافق نہیں، تو انہوں نے بعض بحروں کو ترک کر دیا۔ اور بعض میں زحافات کے ذریعے عربی اوزان سے نئے اوزان وضع کیے، تو

بعد میں اہلِ ایران ہی کے لیے مخصوص ہو گئے۔ مثلاً بحر ہزج اور بحر رمل کے ارکان عربوں کے عروض کی رو سے چھ ہیں، لیکن اہلِ ایران نے انہی بحروں میں دو اور ارکان کا اضافہ کر کے آٹھ ارکان والی بحریں بنا لیا۔ اس صورت میں یہ بحریں اہلِ ایران کو پسند آ گئیں۔

عباس کا یہ قصیدہ بحر رمل مثمن و محذوف میں ہے۔ متذکرہ بات سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ خلیل بن احمد کے عروض کی نشر و اشاعت کے کافی عرصے بعد ایران میں سب سے پہلے عربی عروض اور اس کے بعد بحر رمل مثمن رائج ہوئی ہو گی۔ خلیل بن احمد نے ۱۷۵ ہجری مطابق ۷۹۱ء میں وفات پائی اور یہ ناممکن بات ہے کہ ۱۹۳ ہجری مطابق ۸۰۸ء میں یعنی خلیل کی وفات کے صرف اٹھارہ سال بعد اس کے عروض کے قاعدے ایران کے گوشے گوشے میں پھیل گئے۔ ان عروض کے تجربات بھی ہوئے اور پھر ان سے زحافات کے ذریعے نئے اوزان بھی بنا لیے گئے۔ چنانچہ یہ ممکن نہیں کہ ایک نئے وزن بحر رمل مثمن مقصور (فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات کے وزن) میں خراسان ایسے دُور افتادہ علاقے کے ایک شاعر عباس نے یہ قصیدہ کہا ہو۔

(۳) سب سے پہلے محمد عوفی نے اپنے تذکرہ الالباب میں یہ ذکر کیا ہے کہ اوّلیں اشعار فارسی زبان میں عبّاس مروزی نے لکھے تھے، لیکن اس کے ہمعصر تذکرہ نویسوں نے کہیں یہ ذکر نہیں کیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ عوفی کا بیان قابلِ اعتماد نہیں۔

مرزا محمد قزوینی طبری کی "تاریخ کبیر" اور "کتاب الاغانی" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یزید بن معاویہ کی خلافت ۶۰ تا ۶۴ ہجری مطابق ۶۷۹-۶۸۳ء میں عباد بن زیاد سیستان کا گورنر بنا کر بھیجا گیا، تو یزید بن مفرغ شاعر بھی اس

کے ساتھ آیا تھا۔ یہاں آکر وہ عباد کی توجہات سے محروم ہو گیا۔ اس لیے اس نے عباد کی ہجویں لکھیں جن کے تین مصرعے حسب ذیل ہیں

آبست بنیذ است — عصارات زبیب است

سمیہ روسپید است

"یہ پانی ہے یا جو کی شراب ہے، خشک انگوروں یا کھجوروں کا رس ہے۔ سمیہ[1] ایک بدکار عورت ہے۔"

اسی طرح طبری، تاریخ کبیر میں ۱۰۸ھ مطابق ۷۲۶ء کے واقعات کے تحت لکھتا ہے: "ابو منذر اسد بن عبداللہ القسری نے جب خاقان ترک سے شکست کھائی اور جب وہ پریشان حال ہو کر لوٹا، تو اہل خراسان نے اس کے متعلق ذیل کے شعر کہے، جو چھوٹے چھوٹے بچے گلی کوچوں میں پڑھتے پھرتے تھے۔

از ختلان آمذی — برو تباہ آمذی

از ختلان آمذی — برو تباہ آمذی

بی دل فراز آمذی

از ختلان آمذی — برو تباہ آمذی

آبار باز آمذی — خشک نزار آمذی

ان اشعار کو اگرچہ ادبی لحاظ سے شعر نہیں کہا جا سکتا، لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ فارسی شاعری کا اولیں نمونہ ہیں۔

---

[1] سمیہ زیاد کی ماں کا نام ہے۔

چھٹا باب

دورِ سامانیہ

طاہریہ اور صفاریہ حکومتوں سے زیادہ مضبوط حکومت جو قائم ہوئی آلِ سامان کی تھی۔ اس حکومت سے ایران کی مستقل آزادی کی بنیاد قائم ہوئی۔

آل سامان کا مورثِ اعلیٰ ایک شخص سامان خدا تھا، جس کا دعوےٰ تھا کہ وہ بہرام چوبیں کی نسل سے ہے۔ ابو ریحان البیرونی نے بھی اس کے دعوے کی تصدیق کی ہے۔ سامان بلخ کے رؤسا میں سے تھا۔ لیکن حالات کچھ ایسے ناموافق ہوئے کہ وہ ترکِ وطن پر مجبور ہوگیا۔ اسد بن عبداللہ حاکم خراسان نے خلیفہ مہدی کے زمانے میں اس کی پشت پناہی کی، جس سے اس کا بلخ میں آبرومندی سے رہنا ممکن ہوگیا۔ سامان دین زرتشتی کا پیرو تھا، لیکن اسد بن عبداللہ کا اس قدر شکر گزار تھا کہ بالآخر اسد کی تلقین پر وہ حلقہ بگوشِ اسلام ہوگیا، اور اپنے ایک بیٹے کا نام اُس کے نام پر اسد رکھا۔

سامان کے چار بیٹے تھے۔ یہ چاروں ہارون الرشید کی ملازمت میں تھے۔ انھوں نے بغاوتوں کو فرو کرنے میں بہت نمایاں خدمات انجام دی تھیں، چنانچہ مامون الرشید مسند نشین خلافت ہوا، تو اس نے ان چاروں بھائیوں کی خدمات کے صلے میں علی الترتیب انھیں سمرقند، فرغانہ، شاش اور ہرات کی حکومت دے دی۔ ان بھائیوں میں احمد سب سے زیادہ زیرک تھا اور اپنی حکومت کو مضبوط اور

منظم کرنے میں سب سے زیادہ کامیاب رہا۔ اس کا بھائی نوح فوت ہوا تو اس نے سمرقند اور کاشغر کے علاقے بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیے۔ لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اس نے حکومت اپنے بیٹے نصر کے سپرد کر کے خود گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ نصر تخت نشیں ہوا تو اس نے اپنے چھوٹے بھائی اسمٰعیل کو بخارا کی حکومت دے دی۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد دونوں بھائیوں کے درمیان لڑائی چھڑ گئی، جس میں اسماعیل کو فتح ہوئی اور نصر اسیر ہو گیا، لیکن اسماعیل نے برادرانہ شفقت سے کام لے کر نصر کو آزاد کر دیا اور اس کی حکومت پھر اسی کو دے دی۔ نصر نے ۲۷۹ھ مطابق ۸۹۲ء میں وفات پائی تو سمرقند کا صوبہ اسمٰعیل کی سلطنت میں شامل ہو گیا۔ عہد سامانیہ کی مستقل حکومت اسماعیل ہی سے شروع ہوتی ہے۔

اسماعیل نے ۲۸۷ھ مطابق ۹۰۰ء میں عمرولیث کے بیٹے کو شکست دے کر مشہور صفاریہ دور کا خاتمہ کیا۔ خلیفہ بغداد نے اسماعیل کی خدمات کے صلے میں خراسان، ترکستان اور ماوراء النہر کی حکومت بھی اسے دے دی۔

اسمٰعیل نے بخارا کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ یہ سامانی حکمران علم و فضل کا بہت بڑا قدردان تھا، اس لیے متعدد مؤرخ، شاعر اور فقیہ بخارا آ گئے اور بخارا علم و فضل کا مرکز بن گیا۔

اسمٰعیل کے بعد اس کا جانشین احمد ہوا، جو ۳۰۱ھ مطابق ۹۱۳ء میں قتل ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا آٹھ سالہ بیٹا نصر تخت نشین ہوا، یہ وہی تاجدار ہے، جس کے دربار کا ملک الشعراء رودکی تھا، جو فارسی شاعری کا ابوالآبا سمجھا جاتا ہے۔ اس کے عہد میں رے، قم اور اصفہان بھی سلطنت سامانیہ کا حصہ بن گئے۔ نصر کو سامانی عہد کا المامون سمجھا جاتا ہے۔ یہ تیس سال کی حکومت کے بعد ۳۳۱ھ مطابق ۹۴۲ء میں فوت ہوا۔

عہدِ سامانیہ کا اختتام

نصر کے بعد نوح تخت نشیں ہوا۔ اس کے عہد میں سلطنتِ سامانیہ کو زوال آنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کا جانشین عبدالملک ہوا۔ یہ حکمران سات سال کی حکومت کے بعد پولو کھیلتا ہوا گر پڑا اور جاں بحق ہو گیا۔ عبدالملک کے بعد اس کا بھائی منصور تخت نشیں ہوا۔ منصور کے بعد نوح دوم کو حکومت ملی۔ اس کے امراء نے اس کے خلاف سازش کر کے بغراخاں کو حملے کی دعوت دی۔ بغراخاں ترکی قبائل کا سردار تھا جس کا صدر مقام کاشغر تھا۔ بغرا نے حملہ کر کے بخارا فتح کر لیا۔ لیکن اسے زندگی نے زیادہ مہلت نہ دی۔ چنانچہ نوح نے پھر بخارا کی حکومت سنبھال لی۔ اس کے سازشی امراء بھاگ کر خراسان آ گئے اور دیلمی حکمران کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئے۔ نوح نے سبکتگین سے مدد چاہی، جس نے سامانی حکمرانوں کے علی الرغم غزنی میں آزاد حکومت قائم کر لی تھی۔ سبکتگین نے کمک کے طور پر اپنی فوج بھیجی اور ہرات کے مقام پر ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں نوح فتح یاب ہوا۔ نوح نے صلے کے طور پر خراسان کی حکومت سبکتگین کو دے دی۔ اس لڑائی میں محمود غزنوی نے بھی حصہ لیا تھا، اور اس کی خدماتِ جلیلہ کے صلے میں نوح نے اسے سیف الدولہ کا خطاب دیا۔

نوح دوم کا جانشین منصور دوم خود شاعر تھا اور شعرا کی بہت قدر و منزلت کرتا تھا۔ اس نے جب سامانی حکومت کی باگ ڈور سنبھالی، تو عہدِ سامانی روبہ زوال تھا۔ بہرحال آلِ سامان کی جلیل القدر حکومت کا اختتام دیکھنے سے پہلے وہ راہیٔ ملکِ بقا ہوا اور عبدالملک دوم اس کا جانشین ہوا۔

ترک قبیلے کا سردار بغراخان جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے، بخارا فتح کر کے وہاں مستقل حکومت قائم نہ کر سکا۔ اب اس کے جانشین ایلک خان کو موقع ملا، تو اس نے

۳۸۹ھ مطابق ۹۹۹ء میں بخارا پر حملہ کیا۔ اور آخری سامانی تاجدار عبدالملک کو اسیر کر کے زندان میں ڈال دیا، جہاں اس نے زندگی کے آخری ایام پورے کیے اور اس پر سامانی عہد کا خاتمہ ہو گیا۔

دورِ سامانیہ کا علم و ادب

دورِ سامانیہ کو ادبیات فارسی کا اوّلیں دور سمجھنا چاہیئے۔ اس عہد کے بادشاہ اپنے آپ کو شاہانِ قدیم کے جانشین سمجھتے تھے۔ اس لیے اپنی قوم اور نسل کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ اور زبان و ادب فارسی کے بھی شیدائی تھے۔ سامانی بادشاہوں کے علاوہ ان کے وزرا ابو الفضل بلعمی اور ابو علی بلعمی بھی اپنے وقت کے بڑے عالم تھے اور علم و فضل کی ترویج و اشاعت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سامانی عہد میں نظم و نثر فارسی، نے بہت ترقی کی۔

زبان دری

خلافتِ عباسیہ کے دور میں رودکی، دقیقی اور فردوسی نے جس زبان میں شعر کہے، "دری" یا دری پارسی کہلاتی ہے۔" دری لفظ" در" (یعنی دربار یا درگاہ) سے منسوب ہے۔ اس لیے جو زبان بادشاہوں کے درباروں میں رائج ہوتی تھی، "دری" کہلاتی تھی۔

لفظ "دری" قدیم زمانے سے مستعمل چلا آتا ہے۔ مثلاً عبداللہ[1] بن مقفع

---

[1] بحوالہ الفہرست ص ۱۹

کا کہنا ہے کہ دورِ ساسانیہ میں جو زبان مدائن میں بولی جاتی تھی۔ "دری" کہلاتی تھی۔ "مدائن ساسانی بادشاہوں کا دارالسلطنت تھا۔ یہاں کی زبان کو صرف اسی لیے دری کہتے تھے۔ کہ یہ ساسانی دربار میں مستعمل تھی۔

المقدسی[۱] لکھتا ہے کہ اہل بخارا کی زبان "دری" ہے۔ اس زبان کو دری اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس میں شاہی فرمان لکھے جاتے ہیں اور رعایا کو جو عرض معروض کرنا ہوتا ہے اسی زبان میں کرتے ہیں۔ المقدسی لکھتے ہیں کہ "دری" در سے مشتق ہے، اس لیے جو زبان دربار یا درگاہ شاہی میں بولی جاتی ہے، اسے "دری" کہتے ہیں۔

مشرقی ایران میں زبان دری

عباسی خلافت کے دور میں مشرقی ایران، یعنی خراسان اور ماوراءالنہر کے علاقوں میں ایران کی چھوٹی چھوٹی خود مختار حکومتیں قائم ہوئیں۔ حکمرانوں کے اپنے دربار لگتے تھے۔ یہ حکمران حب الوطنی کے جذبے کے تحت اپنی زبان کی ترویج و اشاعت کی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے تھے۔ اس دور میں "پہلوی اشکانی" اور عربی کے بعض الفاظ کے امتزاج سے، جو زبان وجود میں آئی اور پہلے پہل ان درباروں میں بولی گئی، اسے "دری" کہتے تھے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ تیسری صدی ہجری میں، خراسان اور ماوراءالنہر کے ایرانی شعرا اسی زبان میں شعر کہنے لگے۔ پس خلافت عباسیہ کے دور میں جس زبان کو "دری" کہتے تھے، وہ ایران کے مشرقی اور شمال مشرقی علاقوں کی ادبی زبان تھی۔ فردوسی، رودکی کی منظوم "کلیلہ دمنہ" کی زبان کو جو نصر کی فرمائش پر لکھی گئی تھی، پارسی دری کہتا ہے

بتازی ہمی بود تا گاہ نصر   بدانگہ کہ شد در جہان شاہ نصر

---

۱ احسن التقاسیم ص ۳۲۵

بفرمود تا پارسیٔ دری نوشتند کوتاه شد داوری

اسی منظوم ترجمے کی زبان کو ابو منصور المعمری اپنے مقدمہ شاہنامہ میں "پارسی" کہتا ہے:-

"تاموں آن نامہ بجو است وآں نامہ بدید، فرمود دبیر خویش را تا از زبان پہلوی بزبان تازی گردانید پس امیر سعید نصر بن احمد این سخن بشنید، خوش آمدش، دستور خویش را خواجہ بلعمی، برآن داشت تا از زبان تازی بزبان "پارسی" گردانید"۔

اسی زبان کو فردوسی "پارسی" بھی کہتا ہے۔

بسی رنج بردم درین سال سی عجم زندہ کردم بدین پارسی"

بعض دوسرے شعراء اپنی زبان کو کبھی دری اور کبھی فارسی کہتے ہیں۔

دل بدان یافتی از من کہ نکو دانی خواند

مدحت خواجۂ آزادہ بالفاظ دری

خاصہ آن بندہ کہ ماننده من بندہ بود

مدح گوینده و دانندۂ الفاظ دری (فرخی)

من آنم کہ در پای خوکان نریزم مرایں قیمتی در لفظ دری را (ناصر خسرو)

زبان دری یا پارسی دری، یا پارسی، یعنی خراسان اور ماوراءالنہر کی درباری زبان یہاں کی مقامی حکومتوں کے درباروں میں پرورش پاتی رہی۔ شعرا اور نثر نگار اسی زبان میں اظہار خیال کرنے لگے۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ چوتھی صدی ہجری میں رودکی، دقیقی اور فردوسی ایسے نامور شعرا نے فن شعر کو اس زبان کی ترقی کا وسیلہ بنایا۔ بعض نثر نویسوں نے بھی، جن کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔ اسی زبان کی نثر میں اپنی تالیفات پیش کیں۔ پھر یہ زبان رفتہ رفتہ جنوبی اور مغربی ایران تک بھی پھیل گئی۔ اور ان علاقوں کے شعرا اور نثر نگار بھی پارسی دری میں اپنے

علمی و ادبی کارنامے پیش کرنے لگے۔

عہدِ سامانیہ کے شعراء

رودکی سامانی دور کا مشہور ترین شاعر رودکی ہے۔ عبدالکریم بن محمد السمعانی[1] نے رودکی کا پورا نام ابو عبداللہ جعفر بن محمد بن حکیم بن عبدالرحمٰن بن آدم لکھا ہے۔

سمرقند کے علاقہ رودک میں ایک چھوٹا سا قصبہ "بنج" ہے۔ رودکی یہاں تولد ہوا۔ اور رودک کی نسبت سے رودکی تخلص کیا۔ تخلص کے متعلق دولت شاہ[2] سمرقندی کا بیان ہے کہ رودکی "رود" ساز خوب بجاتا تھا۔ اسی نسبت سے اس نے رودکی تخلص کیا۔

ذبیح اللہ صفا لکھتے ہیں کہ اگر اس کا تخلص "رود" کی نسبت سے ہوتا، تو یہ تخلص رودکی کی بجائے رُودی ہونا چاہیے تھا۔ آقائے سعید نفیسی اپنی تالیف "احوال و[3] اشعار رودکی" میں لکھتے ہیں۔ کہ "رود" کی تصغیر "رودک" تو ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ تصغیر فارسی زبان میں رائج نہیں اس لیے یہ تخلص "رُود" کی نسبت سے نہیں بلکہ "رودک" کی نسبت سے ہے۔

ابتدائی حالات رودکی کی تاریخ ولادت کسی تذکرے میں نہیں ملتی، ہاں

---

۱ کتاب الانساب گب میموریل ایڈیشن ص ۲۶۲

۲ تاریخ ادبیات در ایران حصہ اول ص ۳۴۴

۳ جلد دوم صفحہ ۴۶۵

البتہ اس کا سال وفات تذکرہ[1] نویسوں نے ۳۲۹ھ مطابق ۹۴۰ء سال وفات ۳۰۴ھ مطابق ۹۱۶ء لکھا ہے ، جو درست نہیں ۔ رودکی نے اشعار میں اپنے بڑھاپے کا ذکر کیا ہے مثلاً

من موی خویش را نہ از آن می کنم سیاہ تا باز نوجوان شوم و نو کنم گناہ

چون جامہا بوقت مصیبت سیہ کنند من موی از مصیبت پیری کنم سیاہ

ایسے اشعار کے پیش نظر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ رودکی تیسری صدی ہجری کے وسط میں پیدا ہوا ۔ اگر اس نے ستر بہتر سال عمر پائی ہو تو ۲۵۵ھ سے کر ۲۶۰ھ مطابق ۸۷۳ء تک کسی ایک سال میں اس کی ولادت ہوئی ہوگی ۔

محمد عوفی[2] لکھتا ہے کہ رودکی اس قدر ذکی اور تیز فہم تھا کہ اس نے آٹھ سال کی عمر میں کلام مجید حفظ کیا اور قرأت کا فن بھی سیکھا ۔ شعر گوئی شروع کی تو اس میں کمال حاصل کیا ۔ لوگ اس کی بہت قدر کرتے اور احتراماً استاد کہہ کر پکارتے تھے ۔ آواز بڑی دل کش پائی تھی ، اس لیے شاعری کے ساتھ ساتھ موسیقی کی طرف رجوع کیا ۔ بربط خوب بجاتا تھا ، اس لیے موسیقی کی وجہ سے بھی اس کی شہرت دور دور پہنچی ۔ امیر نصر بن احمد سامانی نے اسے قرب خاص بخشا تھا ۔"

رودکی بصارت سے محروم تھا ، چنانچہ بعض شعرا نے اس کی طرف اشارے بھی کیے ہیں ۔ دقیقی لکھتا ہے ۔

استاد شہید زندہ بایستی وآن شاعر تیرہ چشم روشن بین

تا شاہ مرا مدیح گفتندی بالفاظ خوش و معانی رنگین

---

[1] تاریخ ادبیات ایران شفق صفحہ ۵۰ احوال و اشعار رودکی جلد دوم صفحہ ۴۶۷

[2] سخن و سخنوران حصہ اوّل ص ۳ بحوالہ دیوان حکیم ناصر خسرو

ناصر خسرو نے لکھا ہے۔

اشعار زہد و پند بسی گفت است　　آن تیرہ چشم شاعر روشن بین

محمد عوفی کا بیان ہے کہ رودکی مادر زاد اندھا تھا۔ لیکن ایک جدید ایرانی تذکرہ نویس بدیع الزمان فروز انفر لکھتے ہیں کہ رودکی آخر عمر میں بصارت سے محروم ہوا۔ یہی بات درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ رودکی کے اشعار میں بعض تشبیہات ایسی بھی ہیں، جنھیں وہی شخص لکھ سکتا ہے جو بصارت کی دولت سے بہرہ ور رہ چکا ہو۔ مثال کے طور پر چند اشعار درج ذیل ہیں۔

چادرکی دیدم رنگین براو　　رنگ بسی گونہ بر آن چادرا

لالہ میان کشت بخند وہمی ز دور　　چون پنجۂ عروس بحناشدہ خضیب

ایک اندھا شخص گلِ لالہ کو دلہن کے حنائی ہاتھ سے کیسے تشبیہ دے سکتا ہے۔

وآن عقیقین مئی ھمہ کہ بدید　　از عقیق گداختہ نشناخت

اس شعر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے عقیق کا رنگ بھی دیکھا تھا اور شراب کا بھی۔

بیاد آن چی کہ پنداری روان یاقوت نابستی

دیا چون بر کشیدہ تیغ پیش آفتابستی

ایسا شعر بھی وہی شاعر کہہ سکتا ہے جس نے یاقوت اور شراب کا رنگ دیکھا ہے اور جس نے سورج کے سامنے کسی کو تیغ کشیدہ حالت میں بھی دیکھا ہے۔

رودکی اندھا کیوں کر ہوا؟ آقای سعید نفیسی لکھتے ہیں کہ رودکی کی آنکھوں میں گرم سلائی پھیر دی گئی تھی۔

ل احوال و اشعار رودکی صفحہ ۵۵۵

اس کے لیے انہوں نے کوئی قطعی شہادت تو پیش نہیں کی، البتہ اس کی دو قیاسی صورتیں پیش کی ہیں۔ اول یہ کہ رودکی کو آنکھوں کا ایک عارضہ لاحق ہو گیا تھا جس کو ناخنہ کہتے ہیں۔ اس عارضے میں آنکھوں میں جھلی سی آجاتی ہے، جس سے رفتہ رفتہ بینائی زائل ہو جاتی ہے۔ جھلی کو جلانے کے لیے لوگ آنکھوں میں گرم سلائی پھیر دیا کرتے تھے۔ لیکن بعض اوقات بے احتیاطی کی وجہ سے جھلی جلاتے جلاتے بینائی بھی جاتی رہتی تھی۔ ممکن ہے رودکی کے معاملے میں ایسا ہی ہوا ہو۔ پھر اس کی دوسری صورت یہ بیان کرتے ہیں کہ ابوالفضل بلعمی، رودکی کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ اسمٰعیل بن احمد سامانی نے جب ناراض ہو کر بلعمی کو معزول کیا تو وہ اور اس کے عزیز و اقارب بھی مورد عتاب ہوئے۔ انہی میں رودکی بھی تھا۔ ممکن ہے عتاب ہی کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں گرم سلائی پھیر دی گئی ہو جو اس زمانے کی ایک معمولی سزا تھی۔

رودکی کے ممدوحین

رودکی کا اولیں ممدوح نصر بن احمد سامانی ہے، جس کے دربار کا وہ شاعر تھا، رودکی کے اشعار میں تو نصر بن احمد کا نام نظر نہیں آتا، لیکن اکثر تذکرہ نویسوں نے یہ واقعہ نقل کیا ہے، کہ جب نصر بن احمد ہرات میں ٹھہرا ہوا تھا اور وہاں سے ہلنے کا نام نہ لیتا تھا، تو اس وقت رودکی ہی نے ایک قصیدہ کہہ کر اسے وطن واپس آنے پر ابھارا۔

رودکی کا ایک اور ممدوح امیر ابوجعفر حاکم سیستان تھا، چنانچہ اس کا ذکر ذیل کے اشعار میں آیا ہے۔

شادی بوجعفر احمد بن محمد — آں مہ آزادگان و مفخر ایران

خلق ز خاک و ز آب و آتش و بادند — وین ملک از آفتاب گوہر ساسان

ابوطیب مصعبی بھی رودکی کا ممدوح ہے، جو نصر بن احمد کا ایک نامور وزیر تھا اور علم و سخاوت میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔

رودکی کے ہم عصر شعرا رودکی کے ہم عصر شعرا کے نام حسب ذیل ہیں، جن میں سے بعض کا ذکر آگے آئے گا۔

شہید بلخی، فرالاوی، مرادی، ابوالعباس ربنجنی، ابوالمثل بخارائی، ابو اسحٰق جوئباری، ابوالحسن اغجی، طخاری، خبازی نیشاپوری، ابوالحسن کسائی، دقیقی، ابو زراعہ گرگانی، استغنائی نیشاپوری، ابوعبداللہ جنیدی، عمارہ مروزی۔

رودکی کا علم موسیقی فریدون[1] میرزا لکھتے ہیں کہ علم موسیقی میں رودکی، باربد اور نکیسا سے بڑھا ہوا تھا..... چنگ و بربط نوازی میں وہ خاص ملکہ رکھتا تھا۔" نظامی[2] عروضی سمرقندی لکھتے ہیں کہ نصر بن احمد کو بخارا واپس لانے کے لیے اس نے اپنا قصیدہ "عشاق راگ" میں سنایا تھا۔ اپنے علم موسیقی کے متعلق رودکی خود کہتا ہے۔

بحسن صوت چو بلبل مقید نظمم — بجرم حسن چو یوسف اسیر زندانی

مقبولیت عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ آل سامان کا نام جس شاعر کی بدولت زندہ ہے، وہ رودکی ہی ہے۔ چنانچہ شریف گرگانی نے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے۔

ازان چندان نعیم جاودانی — کہ ماند از آل ساسان و آل سامان
ثنای رودکی ماندست و مدحش — نوای باربد ماندست و دستان

رودکی کے اکثر ہمعصر شعرا شاعرانہ رقابت رکھنے کے باوجود اس کی شاعرانہ عظمت کے قائل ہیں۔ معمری گرگانی خود اپنے علم و فضل کا دعوی کرتا ہے، لیکن جب رودکی

---

[1] دیباچہ دیوان رودکی مرتبہ فریدون مرزا

[2] چہار مقالہ مرتبہ دکتر محمد معین ص ۵۳

کے مقابلے میں آتا ہے، تو اپنی زبان سے اپنے حریف کی عظمت کا بھی اقرار کرتا ہے
اگر بدولت با رودکی نہ ہمسانم　　عجب مکن از رودکی نہ کم دانم
عنصری، جو غزنوی عہد میں قصیدے کا استاد سمجھا جاتا تھا، غزل یعنی تشبیب
میں رودکی کی فنکاری کا معترف ہے۔
غزل رودکی وار نیکو بود　　غزل ہای من رودکی وار نیست
رودکی کا ہم عصر کسائی مروزی کہتا ہے۔
رودکی استاد شاعران جہان بود　　صد یک از وتوی کسائی برگست
رودکی کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف شعرا کو ہی نہیں، علما فضلا بھی اس
کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ اسماعیل بن سامانی کا وزیر ابوالفضل بلعمی لکھتا ہے۔
"امیر نصر بن احمد اکثر اس پر انعام واکرام کی بارش برساتا
تھا۔ وزرا اور امرا کی طرف سے بھی اسے گراں قدر صلے ملتے تھے۔ نظامی عروضی
سمرقندی لکھتا ہے کہ جب[1] وہ امیر نصر کے ہمراہ ہرات سے بخارا کو چلا، تو چار سو
اونٹوں پر اس کا ساز و سامان لادا گیا تھا۔ عوفی لکھتا ہے کہ اس کے پاس دو سو غلام
تھے۔ اس سے رودکی کی امیرانہ سج دھج کا اندازہ ہو سکتا ہے"۔

سبک خراسانی

قصیدے میں رودکی کا انداز سبک خراسانی[2] کہلاتا ہے۔
سبک خراسانی جب کہا جاتا ہے، تو اس سے ایک مخصوص
اندازِ فکر مراد ہوتا ہے۔ جو خراسان کے قدیم شعرا نے اختیار کیا، سبک خراسانی کی
خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

---

[1] چہار مقالہ مرتبہ ڈاکٹر محمد معین ص
[2] مفصل حال کے لیے راقم الحروف کا مضمون "فارسی غزل" رسالہ صحیفہ جولائی ۶۴ء
ملاحظہ کیجئے۔

۱۔ سبک خراسانی کے پیرو قصیدے لکھتے ہیں۔ ان کے خیالات میں منطقی استدلال پایا جاتا ہے۔

۲۔ قصائد کے الفاظ پُر شکوہ ہوتے ہیں۔

۳۔ حسن کلام کے لیے تشبیہیں اور استعارے استعمال کرتے ہیں جو عموماً قدرتی اور فہم انسانی سے قریب تر ہوتے ہیں۔

۴۔ مضامین میں تسلسل اور ترتیب پائی جاتی ہے۔

۵۔ مناظر قدرت اور مظاہر فطرت ان کے خاص موضوع ہیں۔

رودکی کا کلام سبک خراسانی کا عمدہ نمونہ ہے۔ بلکہ رودکی کو سبک خراسانی کا پیش رو سمجھنا چاہیے۔

قصیدہ اور رودکی

رودکی اپنے قصائد کی وجہ سے مشہور ہوا۔ اس کے قصیدوں میں یہ اہتمام کیا گیا کہ پہلے مطلع آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی "تشبیب" شروع ہو جاتی ہے۔ تشبیب میں شاعر عموماً اپنے محبوب کے حسن و جمال کا ذکر کرتا ہے، اس لیے اسے غزل بھی کہا جاتا تھا۔ شروع میں غزل گوئی جداگانہ صنفِ سخن نہ تھی، بلکہ تشبیب ہی کو غزل کہتے تھے۔

تشبیب کے بعد ممدوح کی تعریف کی طرف گریز ہوتا ہے اور اس کے عدل و انصاف، جود و سخا، دلیری اور شجاعت کا ذکر آتا ہے۔ پھر ممدوح کے حق میں دُعا ہوتی ہے۔ آخر میں شاعر ممدوح کو اپنی ضرورتوں کا احساس دلاتا ہے۔ جسے "طلب" یا "حسن طلب" کہتے ہیں۔ جس شعر میں شاعر اپنا تخلص لاتا ہے اُسے مقطع کہتے ہیں۔ رودکی نے قصیدہ لکھنے کا جو انداز اختیار کیا تھا، وہ آج بھی جوں کا توں قائم ہے۔

افکار رودکی

رودکی کا دل بہت حساس ہے اس لیے دنیا اور حالاتِ دنیا سے اُس کا دل متاثر ہے۔ کسی کے حالات ہمیشہ سازگار نہیں

رہتے، اس لیے رودکی دنیا کو ہیچ سمجھتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے۔

این جہان پاک خواب کردار است — آن شناسد کہ دلش بیدار راست

پھر یہ تلقین کرتا ہے:۔

ز آمدہ شادمان نباید بود — وز گزشتہ نکرد باید یاد

جب سب کا انجام ایک سا ہے تو غم کھانا عبث ہے۔

زندگانی چہ کوتہ و چہ دراز — نہ بآخر بمرد باید باز

خواہی اندر عنا و شدت زی — خواہی اندر امان بنعمت و ناز

این ہمہ روز مرگ یکسانند — نشناسی ز یک دگر شان باز

رودکی کے مطالب میں گہرائی ہوتی ہے اس کے اکثر قطعات عبرت آموز اور حکیمانہ ہیں۔

زمانہ پند آزادہ وار داد مرا — زمانہ را چو نکو بنگری ہمہ پند است

بروز نیک کسان گفت غم مخور زنہار — بسا کسا کہ بروز تو آرزومند است

رودکی افکار دنیا کے ہوتے ہوئے قوی اور توانا دل رکھتا ہے اور دوسروں کو بھی صبر و تحمل کی تلقین کرتا ہے۔ ابوالفضل بلعمی کے بیٹے کی وفات پر مرثیہ لکھا ہے، جس میں اسے صبر و تحمل کی تلقین کرتا ہے۔

ای آنکہ غمگینی و سزاواری — و اندر نہان سرشک ہمی باری

رفت آنکہ رفت و آمد آنک آمد — بود آنکہ بود خیرہ چہ غم داری

ہموار کرد خواہی گیتی را — گیتی ست کہ پذیرد ہمواری

رو تا قیامت آید زاری کن — کی رفتہ را بزاری باز آری

اندر بلائی سخت پدید آید — فضل و بزرگ مردی و سالاری

رودکی دنیاوی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے تو کہتا ہے، لیکن ساتھ

ہی یہ بھی تلقین کرتا ہے کہ ان نعمتوں پر مغرور نہ ہونا چاہیے۔

مهتران جهان همه مُردند	مرگ را سر فرو همی کردند
زیر خاک اندرون شدند آنان	که همه کوشک‌ها برآوردند
از هزاران هزار نعمت و جاه	نه بآخر بجز کفن بردند

دنیا میں بڑے بڑے عظیم المرتبت لوگ آئے، لیکن آخر موت کے سامنے سر جھکاتے ہی بنی۔ انھوں نے بڑے بڑے محل تعمیر کیے، لیکن آخر سپردِ خاک ہوئے۔ دنیاوی نعمتیں سب کی سب یہیں چھوڑ گئے، اور اپنے ساتھ سوائے کفن کے کوئی چیز نہ لے جا سکے۔

رودکی کو اس شخص سے سخت نفرت ہے، جس کے دل میں کچھ اور ہے اور زبان پر کچھ اور، جس کی زبان حق آگاہ ہے اور دل کفر آشنا۔

روی بمحراب نمودن چه سود	دل به بخارا و بتان طراز
ایزد ما وسوسهٔ عاشقی	از تو پذیرد نه پذیرد نماز

خمریات

جب سے شعر وجود میں آیا ہے، غالباً اسی وقت سے خمریات کا موضوع شعر کی زینت بنا ہوا ہے۔ شروع شروع میں یونانیوں اور عربوں نے خمریات کو موضوع سخن بنایا اور ان کے بعد اہل ایران نے اس موضوع کو اپنایا۔ رودکی کے کلام میں نشۂ شراب صاف جھلکتا نظر آتا ہے۔

بیار آن می که پنداری روان استی	و یا چون برکشیده تیغ پیش آفتابستی
بپاکی گوئی اندر جام مانند گلابستی	بخوشی گوئی اندر دیدهٔ بی خواب خوابستی
سحابستی قدح گوئی مُی قطره سحابستی	طرب گوئی که اندر دل دعای مستجابستی
اگر می نیستی یکسر همه دلها خرابستی	اگر در کالبد جان را ندیدستی شرابستی

شراب کی تعریف میں ایک جگہ یوں کہا ہے ؎

وآن حقیقی می که هر که بدید — از عقیق گداخته نشناخت

هر دو یک گوهر اند لیک بطبع — این بیفسرد و آن دگر بگداخت

نابسوده دو دست رنگین کرد — ناچشیده تبارک اندر تاخت

فلسفہ نشاط

فلسفہ نشاط کی انتہا خیام کی رباعیوں میں ہمیں نظر آتی ہے۔ لیکن اس کے ابتدائی نقوش رودکی کے کلام میں ملتے ہیں۔

شاد زی با سیاه چشمان شاد — که جهان نیست جز فسانه و باد

ز آمده شادمان نباید بود — وز گذشته نکرد باید یاد

نیک بخت آن کسی که داد و بخورد — شور بخت آن که او نخورد و نداد

منظر کشی

رودکی کو تصویر کشی میں خاص ملکہ ہے۔ ذیل کے اشعار میں جوانی اور بڑھاپے کا ذکر اس خوبی سے کیا ہے کہ دونوں تصویریں ہو بہو نظر آتی ہیں۔

شد آن زمانه که رویش بسان دیبا بود — شد آن زمانه که مویش بسان قطران بود

در آن زمانه که او شاد بود و خرم بود — نشاط او به فزون بود و غم به نقصان بود

همیشه دستش زی زلفکان خوشبو بود — همیشه گوشش زی مردم سخندان بود

همیشه شاد ندانستمی که غم چه بود — دلم نشاط طرب را فراخ میدان بود

همی خرید و همی ریخت بی شمار درم — به شهر هر چه یکی ترک نارپستان بود

بسا کنیزک نیکو که میل داشت بدو — بشب زیارت او نزد او به پنهان بود

شد آن زمانه که شعر او جهان بنوشت — شد آن زمانه که او شاعر خراماں بود

تو رودکی را ای ماهرو کنون بینی — بدان زمانه ندیدی که در خراسان بود

بدان زمانه ندیدی که در جهان رفتی — سرود گویان گوئی هزار دستان بود

کرا بزرگی و نعمت ازین و آن بودی — ورا بزرگی و نعمت ز آل سامان بود

کنون زمانہ دگر گشت و من دگر گشتم　　عصا بیار کہ وقت عصا و انبان بود

تغزل

غزل کا جداگانہ وجود تو سعدی اور اُن کے معاصروں کے زمانے میں قائم ہوا۔ البتہ قصیدے کی ابتداء میں چند اشعار لکھے جاتے تھے، جن میں محبوب کے حسن و زیبائی اور شاعر کی اپنی کیفیات قلب کا بیان ہوتا تھا۔ اس حسن و عشق کے بیان کو تشبیب یا غزل کہتے تھے۔ اس قسم کی غزل سرائی میں رودکی کو اوّلیت کا درجہ حاصل ہے۔ چند شعر ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں، جن سے رودکی کے تغزل کا اندازہ ہو سکے گا۔

عشق را گر پیمبری لیکن　　حسن را آفریدگار توئی

عاشق چاہتا ہے کہ محبوب کو اپنی طرف مائل کرے۔ اس کے لیے ذیل کے اشعار میں جو پیرایہ اختیار کیا ہے، تاثر سے خالی نہیں۔

چون کشتہ بہ بینی ام دو لب گشتہ فراز　　از جان تہی این قالب فرسودہ باز

بر بالینم نشین و می گوی بناز　　کای من تو بکشتہ و پشیمان شدہ باز

ایک قصیدے کی ابتداء یوں کی ہے ؎

ای جان من آرزوی تو پژمان　　بنمائی یکی ردی بہ بخشای برین جان

دشوار نمائی رُخ و دشوار دہی لَس　　آسان بربائی دل و آسان ببری جان

شوش است دلم از کرشمہ سلمیٰ　　چناں کہ خاطر مجنوں ز طرّہ لیلیٰ

تشبیہات

کسی شاعر کی خوبئ بیان کا اندازہ ان تشبیہات سے ہوتا ہے، جو وہ اپنے اشعار میں لاتا ہے۔ تشبیہ کے بغیر شعر اس حسن کی مانند ہے، جو آراستہ نہ کیا گیا ہو۔ تشبیہ شعر کے لیے ایسی ہی ضروری ہے جیسا کہ حسنِ نسوانی کے لیے آرائش اور زیور ضروری ہے۔ تشبیہ کی خوبیاں مختصراً ذیل میں بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ تشبیہ میں ہمہ گیری ہو۔ یعنی کسی چیز کو کسی ایسی چیز سے تشبیہ دی جائے جو ہر جگہ اور ہر زمانے سے متعلق ہو، اور ہر شخص اس کی لطافت کو محسوس کر سکے۔

۲۔ تشبیہ کا تعلق کچھ اس طرح قائم کیا جائے کہ مشبّہ بہ اپنے مشبہ سے زیادہ حسین اور جامع ہو۔

۳۔ تشبیہ فطری اور روزمرہ کے موافق ہو اور ذہن فوراً اس تشبیہ کی طرف منتقل ہو سکے۔

۴۔ تشبیہ میں نیا پن ہو۔

رودکی کی اکثر تشبیہات اِن خوبیوں کی حامل ہیں۔

وآن عقیق مئی کہ ہر کہ بدید　　　از عقیق گداختہ نشناخت
ہر دو یک گوہر اند لیک بطبع　　　این بفسرد و آن دگر بگداخت

شراب کو سُرخ عقیق سے تشبیہ دے کر کہا ہے کہ ان کا جوہر ایک ہے۔ یُوں سمجھو کہ ایک نے جم کر جماد کی صورت اختیار کر لی ہے، اور دوسرا پگھل کر سیال ہو گیا ہے۔

آنکہ اگر نیم شب درش بگشائی　　　چشمہ خورشید را بہ بینی تابان

اگر تم آدھی رات کے وقت اس کا دروازہ کھولو گے، تو چشمہ خورشید چمکتا دیکھو گے۔

ور بہ بلور اندرون ببینی گوئی　　　گوہر سُرخ است بکف موسیٰ عمران

اور شیشے کے اندر دیکھو گے، تو کہو گے یہ موسیٰ عمران کے روشن ہاتھ میں گویا سُرخ موتی ہیں۔

تاثیر کلام کی مثال

نظامی عروضی سمرقندیؒ نے شعر کی ایک خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اس میں اثر ہونا چاہیئے، جو دلوں کو متاثر

کر کے آمادہ حرکت کر سکے ۔ مثال کے طور پر رودکی کا ایک قطعہ پیش کیا ہے ، اور قطعہ کے شان نزول میں ذیل کا واقعہ قلم بند کیا ہے ۔

نصر بن احمد سامانی کا معمول تھا کہ سردیوں کے موسم میں اپنے امراء سمیت بخارا میں مقام کرتا اور گرمیاں سمرقند یا خراسان کے کسی شہر میں بسر کرتا ۔ ایک مرتبہ موسم گرما ہرات میں گزارنے کا اتفاق ہوا ۔ ہرات میں طرح طرح کے باغات دیکھے ۔ قسم قسم کے پھل کھائے ، رنگا رنگ پھولوں سے مسرور ہوا ، تو خیال آیا کہ یہ موسم یہیں گزارا جائے ۔ موسم گرما گزر گیا تو سردیوں کے پھل آنے لگے ، پھل بہت شیریں اور لطیف تھے ، چنانچہ یہ خیال کیا کہ سردیوں کا موسم بھی یہیں گزارا جائے ۔ غرض موسم پر موسم یونہی گزرتے گئے ۔ امراء حیران اور مصاحب بے بس تھے اور گھروں کو لوٹنے کے لیے بے تاب تھے ۔ آخر رودکی کے پاس گئے اور کہا اگر آپ کسی حیلے بادشاہ کو واپس جانے پر آمادہ کر لیں ، تو پانچ ہزار دینار خدمت میں پیش کیے جائیں گے ۔ رودکی بادشاہ کے مزاج سے خوب آشنا تھا ، ایک قصیدہ کہا ، اور علی الصباح نصر بن احمد کی خدمت میں لے گیا ۔ بادشاہ ابھی صبوحی سے فارغ ہی ہوا تھا کہ رودکی نے چنگ بجا کر "عشاق راگ" میں قصیدہ الاپنا شروع کیا ۔

بوی جوی مولیان آید همی — یاد یار مهربان آید همی
ریگ آموی و درشتی های او — زیر پایم پرنیان آید همی
آب جیحون از نشاط روی دوست — خنگ ما را تا میان آید همی
میر ماه است و بخارا آسمان — ماه سوی آسمان آید همی

۱؎ چہار مقالہ مرتبہ ڈاکٹر محمد معین ص ۴۹

میر سرو است و بخارا بوستان   سرو سوی بوستان آید ہمی
ای بخارا شاد باش و شاد زی   شاہ سویت میہمان آید ہمی

رودکی نے آخری شعر سنایا، تو بادشاہ اس قدر متاثر ہوا کہ رات کے لباس میں ہی کوچ کا حکم دیا۔

مشہور مستشرق ایڈورڈ براؤن لکھتے ہیں کہ "ان اشعار میں ایسی اثر خیز کوئی بات نہیں کہ بادشاہ جو اتنا طویل عرصہ ہرات کی رنگینیوں میں کھویا بیٹھا تھا، رات ہی کے لباس میں وطن کو چل دیا"[1] اہل یورپ صرف اپنی نظر اور اپنے اندازِ فکر کے موافق حالات کا جائزہ لیتے ہیں، ممکن ہے انھیں ان اشعار میں کوئی اثر خیز بات نظر نہ آئی ہو، لیکن اگر کوئی شاعر اپنے اشعار کے ذریعے وطن کی بھولی بسری یاد کو تازہ کر دے، تو ایسا معجزہ بھی ہو سکتا ہے۔

رودکی کی تصنیفات

تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ رودکی نے کلیلہ و دمنہ کو فارسی میں نظم کیا۔ جسے نوشیرواں عادل کے زمانے میں حکیم بزرجمہر نے ایک مشہور عالم ابن المقفع سے عربی سے پہلوی میں ترجمہ کرایا تھا۔ یہ منظوم کلیلہ و دمنہ اب ناپید ہے، لیکن اس کے بعض اشعار فرہنگ اسدی طوسی میں درج کیے گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس نظم سے کی کو چالیس ہزار درہم انعام میں ملے تھے۔

محمد عوفی[2] لکھتے ہیں کہ "رودکی بہت پرگو شاعر تھا۔ اس نے ایک سو منظوم کتابیں لکھی ہیں"، ممکن ہے عوفی کا بیان درست ہو، لیکن اب رودکی

---

[1] لٹریری ہسٹری آف پرشیا: جلد اول
ص ۱۶ - ۱۸

[2] تذکرہ لباب الالباب مرتبہ پروفیسر براؤن جلد اول صفحہ ۶

کے ایک دیوان کے سوائے کوئی یادگار باقی نہیں۔

دیوان رودکی کا دیوان قصائد، رباعیوں، مثنویوں اور قطعات پر مشتمل ہے۔ رباعی پہلی مرتبہ رودکی ہی کے کلام میں نظر آتی ہے۔ اس لیے رباعی لکھنے میں اوّلیت رودکی کو حاصل ہے۔

دیوان کے متعدد اشعار ایسے ہیں۔ جو رضازادہ شفق[1]، ذبیح اللہ صفا اور سعید نفیسی[2] کے نزدیک الحاقی ہیں۔ ان اشعار کو قطران تبریزی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے تذکرہ نویس رضاقلی ہدایت ہے جس نے ان اشعار کو الحاقی بتایا ہے۔ ہدایت لکھتا ہے کہ جب حکیم قطران کا دیوان دست یاب ہوا۔ تو اس میں متعدد اشعار ایسے بھی دیکھنے میں آئے جو دیوان رودکی میں بھی موجود ہیں تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ یہ اشعار جو دونوں دیوانوں میں مشترک ہیں رودکی کے نہیں بلکہ حکیم قطران کے ہیں، جو دیوان رودکی کو ترتیب دیتے ہوئے اس میں شامل کر دیئے گئے تھے۔" ان اشعار کے الحاقی ہونے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ "قطران کے دیوان میں ابونصر کے قصیدے ملتے ہیں، اس لیے یہ سمجھ کر کہ یہ ابونصر وہی نصر بن احمد سامانی ہوگا، جس کے دربار کا شاعر رودکی تھا، چنانچہ یہ شعر بھی رودکی کے ہوں گے۔

مسعودی مروزی مسعودی مروزی تیسری صدی ہجری کے اواخر چوتھی صدی ہجری کے آغاز کا شاعر ہے۔ یہ سب سے پہلا شاعر ہے، جس نے مثنوی لکھی اور شاہنامے کی صورت میں ایران قدیم کی تاریخ نظم

---

[1] تاریخ ادبیات ایران ص ۵۰

[2] اشعار و احوال رودکی جلد دوم ص ۶۵۸

کی، جو آج کل ناپید ہے۔

"شاہنامہ مسعودی" کا ذکر عربی تاریخ "البدءِ والتاریخ"[1] میں دو مرتبہ آیا ہے۔ کیومرث کا حال بیان کرتے ہوئے، جو ایران قدیم کا اوّلیں بادشاہ سمجھا جاتا ہے، البدء والتاریخ کا مولف مطہر بن طاہر لکھتا ہے "وقد قال المسعودی فی قصیدۃ المحبرۃ بالفارسیۃ"

نخستین کیومرث آمذ بشاهی | بگیتی در گرفتش پیش گاهی
چو سی سالی بگیتی پادشاه بوذ | کی فرمانش بهر جای روا بوذ

پھر ساسانی حکومت کے اختتام کا ذکر کرتے ہوئے مطہر لکھتا ہے۔

"وانقضی امر ملوک الفرس واظہر اللہ دینہ وانجز وعدہ ..... و یقول المسعودی فی آخر قصیدۃ الفارسیۃ"۔

سپری شد زمان خسروانا | کہ کام خویش راندند در جهانا

مطہر یہ بھی لکھتا ہے کہ "شاہنامہ مسعودی" کو اہل ایران قومی تاریخ سمجھتے ہیں، اس لیے اس کی بڑی عزت کرتے ہیں۔

"کتاب البداء والتاریخ" ۳۵۵ ہجری کی تالیف ہے۔ ظاہر ہے کہ "شاہ نامہ مسعودی" اس سے پہلے ہی لکھا گیا ہوگا۔ یوں بھی مسعودی کے اشعار میں عربی الفاظ کی مطلقاً آمیزش نہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شاہنامہ ۳۰۰ ہجری یا اس کے کچھ عرصہ بعد لکھا گیا ہوگا۔

رابعہ قزداری

رابعہ بنت کعب قزداری بلخی، چوتھی صدی ہجری کی مشہور شاعرہ ہے، جو عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتی تھی۔[2]

رابعہ ایک عربی النسل[3] شخص کعب کی بیٹی ہے، جو حسن و جمال میں یکتا اور علم و فضل

---

[1] البدء والتاریخ مطبوعہ پیرس ج ۳ ص ۱۳۸ [2] تذکرہ لباب الالباب [3] مجمع الفصحا ص ۵۶۴، ص ۲۲۲ تفصیل کے لیے ڈاکٹر انعام الحق کوثر کا مضمون رابعہ خضداری مطبوعہ جرنل آف دی پاکستان ہسٹاریکل کراچی جنوری ۱۹۶۱ء دیکھیے۔

میں بے مثال تھی۔ اسی لیے لوگ اسے "زین العرب" کہہ کر پکارتے تھے۔ رابعہ کو بکتاش نامی غلام سے عشق ہوگیا۔ اس کے بھائی حارث کو معلوم ہوا، تو اس نے غیرت میں آکر رابعہ کو ہلاک کر دیا۔

مولانا جامی نے رابعہ کو زاہد اور صوفی عورتوں میں شمار کیا ہے۔ اس کے بعض اشعار تذکروں کی زینت بنے ہوئے ہیں، جو اس کے واردات قلب کا پتہ دیتے ہیں۔

عشق او باز اندر آوردم بہ بند	کوشش بسیار نامد سود مند
عشق دریای کرانہ ناپدید	کی توان کردن شنا ای ہوشمند
عشق را خواہی کہ تا پایان بری	بس کہ بپسندید باید ناپسند
زشت باید دید و انگارید خوب	زہر باید خورد و انگارید قند

دعوت من بر تو آن شد کایزدت عاشق کناد
بر یکی سنگین دلی نامہربان چون خویشتن

تا بدانی دردِ عشق و داغ ہجر و غم خوری
تا بہ ہجر اندر بپیچی و بدانی قدر من

مرا بعشق ہمی متہم کنی بہ حیل	چہ حجت آری پیش خدای عزّوجل
بعشقت اندر عاصی ہمی نیارم شد	بدینم اندر طاغی ہمی شوم بمثل
نعیم بی تو نخواہم جحیم با تو رواست	کہ بی تو شکّر زہر است و با تو زہر عسل
بروی نیکو تکیہ مکن کہ تا یک چند	بہ سنبل اندر پنہان کنند نجم زحل
ہر آئینہ نہ دروغ است آنچہ گفت حکیم	فمن تکبر یوماً فبعد عزّ ذلّ

---

[1] نفحات الانس ص ۵۶۲۔

ابوشکور بلخی

ابوشکور نام اور وطن بلخ ہے۔ یہ نوح بن نصر کا درباری شاعر تھا۔ بعض تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ فارسی میں سب سے پہلے مثنوی لکھنے والا شاعر ابوشکور ہے۔

عوفی[1] لکھتا ہے، ابوشکور نے ۳۳۳ ہجری مطابق ۹۴۴ء میں مثنوی "آفرین نامہ" لکھنی شروع کی اور ۳۳۶ھ مطابق ۹۴۷ء میں اسے ختم کیا۔ اس مثنوی کے چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

بدشمن برت استواری مباد — که دشمن درختی است تلخ از نهاد
درختی که تلخش بود گوهرا — اگر چرب و شیرین دهی مر ورا
همان میوهٔ تلخ آرد پدید — از و چرب و شیرین نخواهد مزید
ز دشمن گر ایدون که یابی شکر — گمان بر که زهر است هرگز مخور

فردوسی نے غالباً ذیل کے اشعار ابوشکور کے انہی اشعار سے متاثر ہو کر کہے ہیں۔

درختی که تلخ است وی را سرشت — گرش بر نشانی بباغ بهشت
سرانجام گوهر بکار آورد — همان میوهٔ تلخ بار آورد

ذبیح اللہ صفا[2] لکھتے ہیں کہ "آفرین نامہ" کے علاوہ ابوشکور نے دو اور مثنویاں بھی لکھی تھیں، جن کے بعض اشعار تذکروں میں ملتے ہیں، یہ اشعار بحر ہزج اور بحر خفیف میں ہیں۔ نمونہ کی غرض سے ان مثنویوں کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

درستی عمل گر خواهی ای یار — ز الفنجیدن[3] علم است ناچار

---

[1] تذکرہ لباب الالباب مطبوعہ پروفیسر براؤن جلد اوّل ص ۲۱ نیز زنان سخنور جلد اوّل تہران ۱۳۳۵ھ (علی اکبر مشیر سلیمی ص ۲۰۶ -
[2] تاریخ ادبیات در ایران ۳۶۷ [3] اندوختن

زر روز وا پسین آنکش خبر نیست | جز او رند یدنش[1] کار دگر نیست

دیو بگرفتہ مر ترا بفسوس | تو خوری بر زبان حال افسوس
ہمہ دعوی کنی وخائی ژاژ | در ہمہ کارہا حقیری و ہاژ[2]

ابو الحسن شہید بلخی ابو الحسن شہید فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ فرخی نے ایک مصرع میں اس کے اشعار کی تازگی اور دل آویزی کا ذکر کیا ہے

از دل آویزی و نغزی چون غزلہای شہید

رودکی بھی اسے شاعر مطلق کہہ کر یاد کرتا ہے ۔

شاعر شہید و شہرہ فرالادی[2] | وین دیگران بجملہ ہمہ را دی

شاعری کے علاوہ اسے علوم فلسفہ میں بھی دسترس تھی۔ لیکن اس کی شہرت کا سبب صرف اس کی شاعری ہوئی۔

شہید بلخی کی پیدائش اور وفات کے متعلق تذکرے خاموش ہیں، لیکن اس قدر پتا چلتا ہے کہ اس کی وفات پر رودکی نے مرثیہ کہا تھا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی وفات، رودکی کی وفات ۳۲۹ھ بمطابق ۹۴۰ء سے پہلے ہی ہوئی ہوگی۔ مرثیے کے دو شعر حسب ذیل ہیں۔

کاروان شہید رفت از پیش | زآن ما رفتہ گیر و می اندیش
از شمار دو چشم یک تن کم | در شمار خرد ہزاران بیش

---

[1] متحیر [2] ابو عبداللہ محمد بن موسیٰ الفرالادی شہید بلخی کا ہمعصر تھا۔

شہید کے چند شعر نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

اگر غم را چو آتش دود بودی
جہان تاریک بودی جاودانہ

درین گیتی سراسر گر بگردی
خردمندی نیابی شادمانہ

دانش و خواستہ است نرگس و گل
کہ ببیک جای نشگفند بہم

ہر کرا دانش است خواستہ نیست
و آنکہ را خواستہ است دانش کم

شنیدہ ام کہ بہشت آن کسی تواند یافت
کہ آرزو برساند بآرزو مندی

ہزار کبک ندارد دلی یکی شاہین
ہزار بندہ ندارد دل خداوندی

ابوشعیب ہروی

ابوشعیب صالح بن محمد دورِ سامانیہ کا شاعر ہے۔ سال پیدائش کسی تذکرہ نویس نے نہیں لکھا، البتہ رضا قلی ہدایت[1] کے بیان سے یہ ضرور پتا چلتا ہے کہ وہ رودکی کی وفات تک زندہ تھا۔ ایک قطعہ کے تین شعر حسب ذیل ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حسن بیان کے لیے بہت تازہ اور شگفتہ تشبیہات لاتا ہے۔

دو رخی کیشی بہشتی روی و قد
آہو چشمی حلقہ زلفی لالہ خد

سلسلہ جعدی بنفشہ عارضی
کش سیاوش آمد و پرویز جد

لب چنان کز خامۂ نقاش چین
بر چکد از سیم بر شنگرف مد

ابواسحق جوئباری

محمد عوفی[2] لکھتا ہے کہ ابواسحاق جوئباری کا پیشہ زرگری تھا۔ ایک فنکار کو اگر شعر گری کا ذوق ہو، تو اس کے اچھا ہونے

---

[1] مجمع الفصحاء

[2] لباب اللباب

میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ اس کی ایک غزل نمونے کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔

بامیر نہان کرد آفتاب تابان را | بسبزہ نہفت آن لالہ برگ خندان را
ببندی ہر دو جعدش بزہ دو شاخ ریحاں بود | بشاخ مورو بہ پیوست شاخ ریحان را
تنی کہ خستہ و لالی را ببوسہ درمانست | دریغ دادا زین رو دیدہ درمان را
بامیر نیسان ماتم کنون من از غم او | سزد کہ صنعت خوبست ابر نیسان را
بیک گزر کہ سحر گاہ بر گلستان کرد | بہشت کرد سراسر ہمہ گلستان را

خبازی نیشاپوری

تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ خبازی نیشاپوری کو سامانی دور میں شعر و سخن کی بدولت بڑی شہرت حاصل ہوئی، لیکن چند اشعار کے سوا اس کی کوئی یادگار باقی نہیں۔ تذکرہ لباب الالباب عوفی سے دو شعر پیش کیے جاتے ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ خبازی کے انداز بیان میں سادگی اور مضمون بندی میں جدت ہے۔

می بینی آن دو زلف کہ بادش ہمی برد | گوئی کہ عاشقی است کہ ہیچش قرار نیست
یا نہ کہ دست حاجب سالار لشکر است | کز دور می نماید کامروز بار نیست

یعنی محبوب کی زلفیں ہوا کے جھونکے سے ہل رہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے، کوئی عاشق ہے کہ اُسے کسی پہلو قرار نہیں، یا پھر سالار لشکر کے نقیب کا ہاتھ ہے، جو دُور سے اشارہ کر کے بتا رہا ہے، کہ آج باریابی نہ ہوگی۔

عمارہ مروزی

عمارہ مروزی دورِ سامانیہ کے عہد آخر کا شاعر ہے، اسے بیانیہ شاعری میں ید طولےٰ حاصل ہے، جہاں کہیں منظر کشی کا موقع آیا ہے، موزوں الفاظ و تشبیہات سے ہو بہو تصویر کھینچ دی ہے۔ دورِ سامانیہ کے آخری شاہزادہ ابو ابراہیم منتصر کا قصیدہ لکھا ہے، جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

جہان زبرف اگر چندگاہ سیمین بود | زمرد آمد و بگرفت جائی تودہ سیم
بہار خانہ کشمیریان بوقت بہار | بباغ کرد ہمہ نقش خویشتن تسلیم
بدو رباد ہمہ روئی آبگیر نگر | پشیزہ ساختہ بر شکل پشت ماہی سیم

عمارہ نے پند و موعظت میں متعدد قطعات لکھے ہیں، جو خود ستا اور مغرور لوگوں کے لیے درسِ عبرت ہیں۔

غرہ مشو بدانکہ جہانت عزیز کرد | ای بس عزیز را کہ جہان زود کرد خوار
مار است این جہان و جہانجوی مار گیر | وز مار گیر مار برآرد شبی دمار

ابراہیم منتصر نے، جس کا مرثیہ عمارہ نے لکھا، ۳۹۵ ہجری میں وفات پائی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ عمارہ اس وقت تک بقید حیات تھا۔

کسائی مروزی

ابوالحسن مجد الدین اسحق نام، کسائی تخلص ہے۔ یہ سامانی دور کے آخر کا ایک مشہور شاعر ہوا ہے۔ اکثر نامور شعرا اس کا بڑی عزت سے نام لیتے ہیں۔ ناصر خسرو لکھتا ہے۔

من چاکر و غلام کسائی کہ او بگفت | جان و خرد رونده بر این چرخ اخضر ند

کسائی کے کلام میں بہت شگفتہ تشبیہیں دیکھنے میں آتی ہیں۔

نیلوفر کبود نگہ کن میان آب | چون تیغ آبدار و یاقوت آبدار
ہمرنگ آسمان و بکردار آسمان | رویش بر میانہ چو ماہ دہ و چہار
چون راہبی کہ دو رخ او سال ماہ زرد | وز مطرف کبود ردا کردہ و ازار

کسائی وہ پہلا شاعر ہے جس نے بعض دینی مسائل اور فلسفیانہ مطالب نظم کیے ہیں۔ روح اور عقل کے متعلق ایک قصیدہ لکھا ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے۔

جان و خرد رونده بر این چرخ اخضر ند | یا ہر دو آن نہفتہ ہدین گوی اغبر ند

کسائی حکمتِ دین کی بلندیوں سے اتر کر کبھی کبھی دنیا کی رنگینیوں پر بھی نظر ڈال

لیتا ہے، چنانچہ کہتا ہے۔

سرود گوئی شد آن مرغک سرودسرای | چو عاشقی کہ معشوق خود دہد پیغام
ہمی چہ گوید، گوید کہ عاشق شب گیر | بگیر دست دلآرام وسوی باغ خرام

بلبل نغمہ سرائی میں محو ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، عاشق اپنے محبوب کو پیغام دے رہا ہے۔ آخر وہ کیا کہہ رہا ہے؟ وہ کہہ رہا ہے۔ اے نیند کے متوالے عاشق اٹھ! محبوب کا ہاتھ تھام اور چل دے

ابومنصور دقیقی بلخی دربار سامانیہ میں رودکی کے بعد جس شاعر نے سب سے زیادہ شہرت پائی، وہ ابومنصور محمد بن احمد دقیقی ہے۔ دقیقی کے وطن کے متعلق تذکرہ نویس متفق نہیں۔ محمد عوفی نے اسے طوسی لکھا ہے۔ رضا قلی ہدایت مجمع الفصحا میں لکھتا ہے کہ "دقیقی کو بعض بلخی بتلاتے ہیں اور بعض سمرقندی" جدید تذکرہ نویس شفق[1] نے اسے بلخی لکھا ہے، اس لیے اسے بلخی ہی سمجھنا چاہیے۔

دقیقی کے معاصر حکمران ماوراالنہر کے علاقے میں امرائے چغانیاں کی ایک چھوٹی سی حکومت تھی۔ دقیقی شروع شروع میں انہی کے دربار سے وابستہ ہوا۔ یہاں اس کی شعر و شاعری کی بہت شہرت ہوئی فخرالدولہ ابوسعید منصور امیر چغانیاں اکثر اسے انعام و اکرام سے نوازتا تھا۔

امیر منصور بن نوح سامانی (۳۵۰ھ تا ۳۶۶ھ مطابق ۹۶۱ء تا ۹۷۶ء) نے دقیقی کی شہرت سنی تو اسے اپنے دربار میں بلالیا۔ امیر منصور کے بعد جب اس کا بیٹا نوح بن منصور (۳۶۶ھ تا ۳۸۷ھ مطابق ۹۷۶ء تا ۹۹۷ء) تخت نشین

---

[1] تاریخ ادبیات ایران ص

موانع اس کی فرمائش پر دقیقی نے شاہنامہ لکھنا شروع کیا۔ لیکن شاہنامہ مکمل کرنے کی سعادت اس کی قسمت میں نہ تھی، ابھی وہ ایک ہزار شعر ہی لکھ پایا تھا کہ ایک غلام کے ہاتھوں مارا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ہلاکت عین عالم جوانی میں ہوئی، کیونکہ فردوسی اسے جوان ہی بتاتا ہے۔

جوانی بیامد گشادہ روان   سخن گفتن خوب وطبع روان

دقیقی نے ان اشعار میں گشتاسپ کی بادشاہت، ظہور زرتشت اور گشتاسپ وارجاسپ تورانی کی مذہبی جنگوں کا ذکر کیا ہے۔

دقیقی آتش پرست تھا

دقیقی اپنے اشعار میں زرتشت کا نام بڑی عقیدت سے لیتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ دین آتش پرستی کا پیرو تھا۔ جیسا کہ اشعار ذیل سے ظاہر ہوتا ہے۔

دقیقی چار خصلت برگزیدہ است   بگیتی از ہمہ خوبی و زشتی
لب یاقوت رنگ و نالہ چنگ   مئی خوش رنگ وکیش زردہشتی

بیزدان کہ ہرگز بنید بہشت   کسی کا ونداردرہ زردہشت

کبھی وہ دین زرتشتی کی کتابوں کا ورد کرنے کی بھی آرزو ظاہر کرتا ہے۔

ببینم اگر روزی لکام دل خود را   گہی ایارده[1] خوانم شبها گہی خورده[2]

دقیقی کا اندازِ نگارش

دقیقی کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک صاحب طرز شاعر تھا۔ رزمیہ شاعری میں اس نے ایک خاص اسلوب قائم کیا ہے جس کی فردوسی نے پیروی کی۔ اس میں شک نہیں

---

[1] ایارده، پاژند   [2] خورده، اوستاخورده

کہ فردوسی کو منظر کشی میں کمال حاصل ہے لیکن میدان جنگ کی معرکہ آرائی کی تصویر پہلے پہل ہمیں دقیقی کے شاہنامے میں نظر آتی ہے۔ چند اشعار درج ذیل ہیں، جن سے دقیقی کے مقام کا کسی حد تک اندازہ ہو سکے گا۔

زبس بانگ اسپان و جوش و خروش — ہمی نالہ کوس نشنیدہ گوش
درفشان بسیار افراشتہ — سر نیزہ ہا زابر بگذاشتہ
پیوستہ درخت از بر کوہسار — چو بیشہ نیستان بوقت بہار
ز تاریکی گرد و بانگ سپاہ — کسی روز روشن نمی دید راہ
بکردند یک تیر باران درست — بسان تگرگ بہاران درست
بپوشیدہ شد چشمۂ آفتاب — ز پیکانہای درخشان چو آب
تو گفتی ہوا ابر آورد ہمی — وز آن ابر الماس بارد ہمی

دقیقی کی مستقل یادگار یہی شاہنامہ ہے، جو گشتاسپ اور زرتشت کے حالات پر مشتمل ہے۔

فردوسی نے جب شاہنامہ لکھنا شروع کیا، تو اور کتابوں کے علاوہ اس کے پیش نظر دقیقی کے یہ اشعار بھی تھے، چنانچہ اس کا ذکر فردوسی نے اپنے شاہنامہ میں کیا ہے۔

کنون رازہا باز گویم ترا — حدیث دقیقی بگویم ترا
چنان دید گوینده یک شب بخواب — کہ یک جام می داشتی چون گلاب
دقیقی ز جائی پدید آمدی — بر آن جام می داستانہا زدی
بہ فردوسی آواز دادی کہ می — مخور جز بہ آئین کاؤس کی

دقیقی کا ذکر کرتے ہوئے فردوسی لکھتا ہے "ایک دن خواب میں میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھ میں جام شراب ہے۔ دقیقی پھرتا پھرتا کہیں سے آنکلتا ہے، اور

اس جام کے متعلق باتیں کرتا ہے اور کہتا ہے، "جام شراب تمہارے پاس بھی ہے۔ لیکن اسے کیانی طریقے سے پینا" ان سے اگلے اشعار کا مطلب یہ ہے کہ کیانی بادشاہوں کے متعلق میں نے بھی ایک ہزار شعر کہے ہیں، اگر مل جائیں، تو اپنے شاہنامے میں شامل کر لینا۔" چنانچہ فردوسی، دقیقی کے اشعار کو شامل کر کے اس کے خواب کی تعبیر کر دیتا ہے۔

قصائد و قطعات

دقیقی کی مستقل یادگار تو یہی اشعار ہیں، جنہیں فردوسی نے شاہنامے میں شامل کر کے انھیں جاودانی بنا دیا ہے، ان کے علاوہ بعض قصائد و قطعات بھی دقیقی کی یادگار رہ گئے ہیں، جو لباب الالباب، مجمع الفصحا، تاریخ بیہقی، ترجمان البلاغۃ، حدائق السحر وغیرہم تذکروں میں ملتے ہیں۔

دقیقی نے قصیدے میں رودکی کی تقلید کی ہے۔ پہلے تشبیب لکھتا ہے، اس کے بعد ممدوح کی تعریف اور پھر دعائیہ اشعار لاتا ہے۔

دقیقی بادشاہ کا قصیدہ کہتے ہوئے محض مدح و ستائش پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ وہ اُن اوصاف کا بھی ذکر کرتا ہے، جو بادشاہ کے لیے ضروری ہیں۔ ذیل کے قصیدے میں لکھتا ہے کہ بادشاہ میں تین صفتیں ہونی چاہئیں، دلیری، سخاوت اور دانش مندی۔ ان میں سے ایک بھی نہ ہو، تو شاہانہ صفات ادھوری رہ جاتی ہیں۔

زود چیز کردند مر مملکت را	یکی پرنیانی یکی زعفرانی
یکی زرّ نام ملک بر نوشته	دگر آهن آب داده یمانی
کرا بویهٔ وصلت ملک خیزد	یکی جنبشی بایدش آسمانی
زبان سخن گوی دوست کشاده	دلی همش کینه همش مهربانی
که ملکت شکاریست کورا نگیرد	عقاب پرنده نه شیر ژیانی

دو چیز است کو را به بند اندر آرد — یکی تیغ هندی دگر زر کانی
بشمشیر باید گرفتن مر اورا — بدینار بستنش پای ار توانی
کرا بخت و شمشیر و دینار باشد — و بالا و تن تهم و نسبت کیانی
خرد باید آنجا وجود و شجاعت — فلک کی دهد مملکت رایگانی

ایک قصیدے میں مئی و محبوب اور رنگینی بہار کا بڑے دل نشیں انداز میں ذکر کیا ہے:-

برافگند ای صنم ابر بہشتی — زمین را خلعت اردی بہشتی
بہشت عدن را گلزار ماند — درخت آراستہ حور بہشتی
زمین بر سان خون آلودہ دیبا — ہوا بر سان نیل اندودہ وشتی
بطعم نوش گشتہ چشمۂ آب — برنگ دیدۂ آہوی دشتی

بعض بعض تشبیہوں میں ذاتی جذبات کی عکاسی کی ہے۔

ای ابر بہمنی نہ بچشم من اندری — دم زن زمانکی و بر آسائی دکم گری
این روز و شب گریستن زار بہر چیست — نی چون منی غریب و غم عشق بر سری
دردا جدا بماندم و در غم ز عشق یار — من زین توانگرم کہ مبادا این توانگری
یاری گزیدم از ہمہ خلقان پری نژاد — زان شد ز پیش چشم من امروز چون پری
لشکر برفت و آن بت لشکر شکن برفت — ہرگز مباد کس کہ دہد دل بہ لشکری

اسدی طوسی

عہدِ غزنویہ اور عہدِ سلجوقیہ میں دو شاعر اسدی طوسی کے نام سے مشہور ہوئے ہیں، ان میں ایک باپ ہے اور دوسرا بیٹا۔ اسدی بزرگ کا نام ابو نصر احمد بن منصور ہے اور بیٹے کا نام علی بن احمد اسدی ہے، جو "گرشاسپ نامہ" کا مصنف ہے اس کا ذکر سلجوقی عہد کے شعراء میں آئے گا۔

اسدی بزرگ کے حالات بہت کم تذکرہ نویسوں نے لکھے ہیں۔ چہار مقالہ اور لباب الالباب اسدی کے متعلق خاموش ہیں۔ لطف علی آذر مولف آتش کدہ نے اسدی کو سلطان محمود کے سبعہ سیارہ میں شمار کیا ہے۔ دولت شاہ[1] سمرقندی لکھتا ہے:" اسدی فردوسی کا استاد تھا۔ خراسان کے اکثر شعرا اسدی کی علمی فضیلت کی وجہ سے اُسے استاد مانتے تھے۔ انھوں نے اسدی کو شاہنامہ لکھنے کی ترغیب دلائی، لیکن اس نے پیری وضعیفی کی وجہ سے معذرت کی

حمد اللہ مستوفی نے تاریخ گزیدہ میں اسدی کا ذکر تو کیا ہے، لیکن اُسے "گرشاسپ نامہ" کا مصنف بتایا ہے۔ مولانا شبلی[2] بھی اسے گرشاسپ نامہ کا مصنف بتاتے ہیں، لیکن ان دونوں محققین کا بیان خلاف واقعہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ گرشاسپ نامہ" ۴۵۸ھ مطابق ۱۰۶۵ء کی تصنیف ہے۔ جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے۔

زہجرت بدور سپہری کہ گشت
شدہ چار صد سال و پنجاہ وہشت

دولت شاہ کے بیان سے یہ بات واضح ہے کہ اسدی بزرگ فردوسی کا استاد تھا۔ استاد تھا، تو فردوسی سے عمر میں بڑا ہوگا۔ تذکرہ نویس فردوسی کی عمر بیاسی سال وفات ۴۱۱ھ مطابق ۱۰۲۰ء بتاتے ہیں، اس لیے یہ ممکن نہیں کہ فردوسی کا استاد اسدی، فردوسی کی وفات کے بعد اتنا عرصہ اور جیا کہ اس نے ۴۵۸ھ مطابق ۱۰۶۵ء میں مثنوی "گرشاسپ نامہ" تصنیف کی۔ محققین کو غالباً دو شاعروں کا ایک ہی تخلص ہونے کی وجہ سے یہ شبہہ ہوا کہ "گرشاسپ نامہ" کا مصنف اسدی بزرگ ہے۔

اسدی بزرگ فن مناظرہ کا موجد ہے۔ قصائد لکھتے ہوئے وہ بعض اوقات دو چیزوں کا آپس میں مناظرہ کراتا ہے۔ دونوں کی برتری ظاہر کرنے کے لیے دلیلیں

---

[1] تذکرۃ الشعراء۔ مطبوعہ شیخ مبارک علی ص ۱۶
[2] شعر العجم حصہ اوّل ص ۱۲۱

پیش کرتا ہے، بالآخر ممدوح کی تعریف کی طرف گریز ہوتا ہے۔

اسدی کے قصائد تو اب باقی نہیں ہیں، لیکن اس کے مناظروں کا بیان تذکروں میں ملتا ہے، جن کے نام حسب ذیل ہیں۔ عربی و عجمی، شب و روز، آسمان و زمین، قوس و رمح، مسلم و گبر۔

مناظرہ شب و روز کے اشعار کا اقتباس ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:-

بشنو از حجت گفتار شب و روز بهم — سرگذشتی که ز دل دور کند شدت غم
گفت شب، فضل شب از روز فزون آمد ازآنکه — روز را باز ز شب کرد خداوند قدم
قومی را سوی مناجات بشب برد کلیم — هم بشب گشت جدا لوط ز بی داد ستم
قمر چرخ بشب کرد محمد بدو نیم — سوی معراج بشب رفت هم از بیت حرم
سترپوش است شب و روز نماینده عیوب — راحت افزاست شب و روز فزاینده الم
منم آن شاه که تختم زمین است ایوان چرخ — مه سپهدار و همه انجم و سیاره خدم
هر مه و سال عرب را عدد از ماه منست — بر سر ماه منست از پر جبریل رقم
بر رخ ماه من آثار درست است پدید — بر رخ چهره خورشید تو آثار سقم
روز از شب بشنید این و برآشفت و بگفت — خامشی کن چه درائی بسخن نامحکم
روز را عیب بطعنه چه کنی کایزد عرش — روز را بیش ز شب کرد ستائش بقسم
روزه خلق که دارند بروز است همه — بحرم حج و بروز است هم از رب حرم
عید و آدینه و فرخ، عرفه، عاشورا — همه روز است چو بینی هم از عقل و فهم
بوم و خفاش بشب مرغ و سیه جنی و دیو — دزد و اکثر همه شب گرد و همه اهل تهم
من با صل از خور چرخم تو بجنس از دل خاک — من چو تابان شوم نازم تو چو تاریک ستم
روی آفاق ز من خوب نماید ز تو زشت — دیده خلق ز من نور فزاید ز تو نم
مر مرا گونه اسلام ترا گونه کفر — مر مرا جامه شادیست ترا جامه غم

توبجہر از حبشی فخر بہ حُسن ار چہ کنی | حبشی را چہ رسد حسن اگر ہست منم
سپہ و خیل و نجوم از چہ شناسند کہ پاک | بگریزند چہ خورشید من افراخت علم
گر ز ماہ تو شناسند مہ و سال عرب | ز آفتابم ہمہ دانند مہ و سال عجم

دورِ سامانیہ کے نثر نویس

دربارِ سامانیہ میں متعدد انشا پرداز اور ادیب تھے، لیکن ان میں صرف ابو منصور المعمری، ابوعلی محمد بن محمد بلعمی، ابو المؤید بلخی اور موفق ہروی ہی ایسے ادیب ہیں جن کے ادبی کارنامے دست یاب ہوتے ہیں، اس لیے انھی ادیبوں کی تالیفات پر مختصر سا تبصرہ پیش کیا جائے گا جس سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ عہدِ سامانیہ میں نثر لکھنے کا کیا انداز تھا۔

مقدمہ شاہنامہ

"مقدمہ شاہنامہ" نثر فارسی کا قدیم ترین نمونہ ہے۔ اس کا مؤلف ابو منصور بن عبداللہ العمری ہے۔

ملک الشعراء بہار[1] لکھتے ہیں کہ "ابو منصور المعمری سامانی دور میں ابو منصور بن عبدالرزاق کا وزیر تھا۔ اور اسی تاجدار کے حکم سے وہ نثر میں شاہنامہ لکھنے پر مامور ہوا تھا چنانچہ نثر کا شاہنامہ ۳۴۶ھ مطابق ۹۵۷ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ مقدمہ حقیقت میں اسی منثور شاہنامہ کا تھا۔ بعد میں جب فردوسی نے نظم میں شاہنامہ لکھا، تو یہ مقدمہ شاہنامہ فردوسی میں شامل کر دیا گیا۔ مقدمے کا مختصر سا اقتباس ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

"ابو منصور بن محمد بن عبداللہ بن جعفر بن فرخزاد بن کسل کرانخواہ بن کنارنگ پسر سرہنگ پرویز بود و بیکارہای بزرگ اندر رفتی و آنگہ کہ خسرو پرویز بدر روم شد، کنارنگ،

[1] سبک شناسی جلد اول ص ۲۳۴

پیش اُو بود. لشکر پرویز را و حصار روم لبتند و نخستین کسی کہ بر دیوار رفت و باقیصر بر آویخت، داو را بگرفت و پیش شاہ آورد او بود و در ہنگام ساوہ شاہ ترک کہ در ہری آمد، گماز نگ پیش او شد بجنگ و ساوہ شاہ را بہ نیزہ بیفگند و لشکر شکستہ شد و چون رزم ہری بکرد، نشاپور او را داد طوس را خود بدو دادہ بود۔"

شاہنامہ کے محاسن بیان کرتے ہوئے مؤلف لکھتا ہے :-

"خواندن[1] این نامہ دانستن کارہائے شاہان است و بخش کردن گردہی از در زیدگان کار این جہان، و سود این نامہ ہر کسی راست، و رامش جہان است، و اندہ گسار اندوہ گنانست و چارہ در ماندگانست۔" (صفحہ ۲۸)

مقدمہ کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ ٹھیٹھ فارسی زبان میں ہے، جسے فارسیٔ دری کہا جاتا ہے۔ اس میں ناموں کے سوائے کوئی ایک لفظ بھی عربی زبان کا نہیں۔ مقدمے کی زبان سہل اور رواں ہے جملے بہت واضح اور چھوٹے چھوٹے ہیں۔ مرادف الفاظ کہیں نظر نہیں آتے۔ نہ ایسی صنعتیں ہی لائی گئی ہیں، جو فقرات کو مقفیٰ و مسجع بنا دیں۔ دورِ اوّل کی اس قسم کی نثر کا انداز "سبک قدیم" کہلاتا ہے۔

ترجمہ تاریخ طبری

"تاریخ طبری" مشہور مورخ ابوجعفر محمد بن جریر طبری کی تالیف ہے۔ اس تاریخ کا اصل نام "تاریخ الرسل والملوک" ہے اور یہ عربی زبان میں لکھی گئی ہے۔ تاریخ طبری کا فارسی ترجمہ منصور بن نوح کی فرمائش پر اس کے وزیر ابو علی محمد بن محمد نے کیا تھا، جیسا کہ مترجم خود مقدمے میں لکھتا ہے۔

---

[1] سبک شناسی جلد اول ص ۲۸

"بدان کہ این تاریخ نامۂ بزرگست، گرد آوردۂ ابوجعفر محمد بن جریر الطبری رحمہ اللہ که ملک خراسان ابوصالح منصور بن نوح فرمان داد، دستور خویش ابوعلی محمد بلعمی را که این تاریخ نامہ را کہ از آن پسر جریر است، پارسی گردان، ہر چہ نیکوتر، چناں کہ اندروی نقصانی نباشد۔ چون اندروی نگاه کردم و بدیدم اندروی علم ہای بسیار و حجت ہای و آیت ہائے قرآن و شعرہای نیکو و اندروی فائدہ ہا دیدم بسیار، پس رنج بردم و این را پارسی گردانیدم بہ نیروئے ایزد عز و جل۔"

مجمل التواریخ و القصص[1] کا مولف لکھتا ہے کہ ابوعلی محمد بلعمی نے اس عظیم تاریخ کو ترجمہ کرنے کا کام ۳۵۲ھ مطابق ۹۶۳ء میں شروع کیا تھا۔

ترجمہ تاریخ طبری ذیل کے ابواب پر منقسم ہے۔

تمہید۔ پیغمبرانِ قدیم کا تذکرہ۔ زمانہ قبل از تاریخ کے بادشاہ۔ عہد ساسانیہ۔ رسولِ اکرمؐ اور خلفائے راشدین۔ خلفائے بنو امیہ اور خلفائے بنو عباس۔

ترجمہ تاریخ طبری کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بھی مقدمہ شاہنامہ کی طرح سجع، موازنہ یا مرادف الفاظ کا کہیں وجود نہیں۔ اس کی نثر کا انداز "سبک قدیم" کا سا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس میں "مقدمہ" کی نسبت عربی کے الفاظ کچھ زیادہ ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل میں بہرام چوبین کی داستان کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

گریختن پرویز از مدائن

"و پرویز برفت با یاران تا بسہ روز از عراق بیرون شدند و روز و شب ہمی تاختند، تا بحد شام برسیدند، ایمن شدند و از دور صومعۂ دیدند"

---

[1] مولف کا نام تذکرہ نویسوں نے نہیں دیا۔ یہاں تک کہ ذبیح اللہ صفا اور شفق نے بھی مولف کا نام نہیں لکھا۔

راہی آنجا، بدان صومعہ شدند و فرود آمدند، راہب لختی نان خشکار آورد و خود ایشان را نہ شناخت، پس آن نان با آب ترکردند و بخوردند۔ پرویز خواب گرفت کی سہ روزہ بوذ، تا نخفتہ بوذ۔ سر بر کنار بندوی نہاذ و بخفت، و ہر کس ہم چنان بخفتند و بہرام شوبین بمدائن اندر آمد۔ چنین شنید کہ ہرمز را بکشتند تدبیر وی تباہ شد، و پرسیذ کی پرویز از کدام سوی شد؟ گفتند از سوی شام ہمی بہ روم شوذ نزدیک قیصر و ولایت او۔ پس بہرام سیاؤشان را بخواند و چہار ہزار مرد بہ وی داذ و گفت از پس پرویز برد۔ برین اسپان آسودہ بتاختن و ہر کجا او را بیابی با یاران باز گردان و پرویز با یادان اندر صومعۂ راہب خفتہ بوذ۔ آن راہب بانگ کرد کی چہ خسپیذ کہ سپاہ آمد۔ گفتند کجا است؟ گفت برد و فرسنگ ہمی بینم۔ ایشان ہم بر جای بدست و پای بمردند و دانستند کی بہ طلب ایشان آمدند، و دل بمرگ بہ نہادند۔ پرویز گفت چہ کنیم؟ مشورتی بکنیذ کہ خداوند عقل را، چوں متحیر شوذ، ہر چند کاری بزرگ بر وآیذ، ناچار عقل بادی است۔

بندوی گفت: "من یکی حیلت دانم کردن کر ترا برہانم و خود اندر مانم و کشتہ شوم۔"

ترجمہ تفسیر طبری ابو جعفر محمد بن جریر الطبری نے قرآن کریم کی تفسیر بھی لکھی ہے۔ اس کا فارسی ترجمہ ۳۵۲ھ بمطابق ۹۶۳ء کے لگ بھگ ہوا۔ یہ ترجمہ چودہ جلدوں میں ہے اور چند علماء کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ ہے، جیسا کہ مقدمہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

"این کتاب تفسیر بزرگ است از روایت محمد بن جریر الطبری رحمۃ اللہ علیہ ترجمہ کردہ بزبان فارسی و دری راہ راست و این کتاب را بیاوردند از بغداد، چہل مصحف بوذ بنشتہ بزبان تازی، و با سنادہای دراز بوذ، و بیاوردند سوئے امیر سید منظفر ابو صالح منصور بن نوح نصر۔ پس دشخوار آمد بروی خواندن این کتاب و عبارت کردن آن

بزبان تازی وچنان خواست کہ مراین را ترجمہ کنند بہ زبانِ فارسی۔ پس علمائے ماوراء النہر را گرد کرد و این از ایشان فتوی کرد کہ روا باشد کہ این کتاب را بزبان پارسی گردانیم؟ گفتند: روا باشد خواندن و نبشتن تفسیر قرآن بپارسی، مر آن کسی را کہ او تازی نداند"

یعنی ملک منصور بن نوح نے حکم دیا کہ اس تفسیر کا ترجمہ کرنے کے لیے ماوراء النہر کے علما کو دعوت دی جائے تاکہ اس تفسیر کا فارسی دری میں ترجمہ کیا جائے۔ چنانچہ اس کی فرمائش پر اس زمانے کے مستند علما نے اس تفسیر کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

اس ترجمے کا انداز بھی ترجمہ تاریخ طبری کا سا ہے، فرق یہ ہے کہ کلامِ مجید کے بعض کلمات کا ترجمہ کرنے کے لیے عربی کے الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ کا استعمال ناگزیر تھا۔

اَلاَبنیہ عن حقائقِ الادویہ

"الابنیہ عن حقائق الادویہ" موفق الدین ابومنصور علی ہروی کی تالیف ہے۔ اس کتاب میں دواؤں کی خاصیتیں بتائی گئی ہیں۔ بعض مستشرقین[۱] کا خیال ہے یہ کتاب منصور بن نوح سامانی ۳۵۰ تا ۳۶۵ھ مطابق ۹۶۱-۹۷۵ء صدی کے زمانے کی تالیف ہے، لیکن بعض[۲] تذکرہ نویس اسے پانچویں صدی ہجری کی تالیف بتاتے ہیں، اور وجہ یہ پیش کرتے ہیں کہ اس کتاب کا ایک قدیمی نسخہ دستیاب ہوا ہے، جو اسدی طوسی نے ۴۴۷ ہجری مطابق ۱۰۵۵ء میں نقل کیا تھا۔ اس کے پہلے صفحے کی پشت پر کتاب کے مولف کے نام کے ساتھ دعائیہ جملہ "حرسہ اللہ" لکھا گیا ہے۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ کتاب کا مؤلف اسدی طوسی کے زمانے تک زندہ تھا۔ ملک الشعرا[۳] بہار لکھتے ہیں کہ یہ "دلیل فیصلہ کن نہیں قرار دی جاسکتی، کیونکہ کاتب عموماً جوں کی توں عبارت

---

[۱] سبک شناسی جلد دوم ص ۲۴ [۲] لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد اول ص ۸۰

[۳] سبک شناسی جلد اول ص ۲۴

نقل کر دیئے ہیں۔" ہو سکتا ہے کہ کتاب کے مؤلف موفق الدین ابو منصور نے اپنے نام کے ساتھ "حرسہ اللہ" لکھ دیا ہو اور اسدی طوسی نے اسے اسی طرح نقل کر دیا ہو۔"

ذیل کی چند سطور سے پتہ چلتا ہے کہ اس کتاب کی نثر کا انداز چوتھی صدی ہجری کی نثر کا سا ہے۔

بنام ایزد بخشاینده بخشائش گر

ستائش باد یزدان دانا و توانا را کی آفریدگار جہان است و دانندۂ آشکار و نہان است و رانندۂ چرخ و زمان است و دارندہ جانوران است و آورندۂ بہار و خزان است و درود بر ہمہ پیغامبران ایزد و ہمہ فرشتگان و ہمہ پاکان کی اختیار اوامی خدای عز و جل بودند و خلق را براستی بندواندند و بیزدان راہ نمودند و فرش باطل بر نوشتند و لباط حق بگستردند و آفرین بر ہمہ نیکو کاران کی از ہوای این جہان پرہیز کردند، و توشۂ آن جہان بر داشتند و رضای ایزد نگہ داشتند۔

آغاز کتاب کی چند سطور حسب ذیل ہیں:۔

"...... حکیمان روم ہمی گویند کہ بعضی دارو یا غذا گرم است اندر درجۂ اوّل و خشک است اندر درجۂ دوم و اندریں الیشان بہ غلط افتادہ اند و حکیمان ہند بر صواب اند و من راہ حکیمان ہند گرفتہ ام از آن جہت کہ دارو آن جا بیشتر است و عقاقیر آن جا تیز تر و خوش تر و ہمت آن مردمان بہ استقصا اندر حکمت بالغ تر است ....."

عجائب البلدان

"عجائب البلدان" ابو المؤید بلخی کی تالیف ہے، جو خاندان سامانیہ کے مشہور فضلا اور مورخین میں سے تھا۔

"عجائب البلدان" کا اقتباس بہ غرض نمونہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

"........ در ہندوستان درختی است بر سر کوہی در میان دریا و میان

آن درخت چہل درخانہ است وده در دکان از سطبری آن درخت و آن دکان ہا ہمیشہ پر متاع ہا و قماش ہا ست، اگوناگوں و برسر متاعی بہای آن نوشتہ، تا ہر فقیری یا امیری و ہر کس کہ متاعی زاہد بخرد و ہر جنسی بچپیند۔ و آنجا ہیچ مردم نباشند چنانچہ ایشان را بہ بیند چون کشتی آنجا رسد بدارند و در آن دکان ہا و خانہ ہا روند و نرخ ہا بر خوانند، بہا ہا بر سنجند و بہ نہند و آن متاع بر دارند و بروند و ہرگز کس آنجا ندیدہ است و اگر کسی چیزی برگیرد و بہا آنجا نہ نہد، از میان درخت بیرون نتواند آمدن و ہر چند کہ گردند راہ بیرون آمدن نیابند چون متاع را باز بجا نہند یا بہائی آن، راہ یابند و بیرون آیند و این سخت عجب است۔"

ابو المؤید بلخی نے "عجائب البلدان" نوح بن منصور سامانی (۳٦۵ تا ۳۸۴ ہجری مطابق ۹۷۵ و ۹۹۷ عیسوی) کے لیے لکھی تھی اور اسی کے نام منسوب کی۔ دو اور نثر کی کتابیں "شاہنامہ" اور "گرشاسپ نامہ" بھی اس کی یادگار ہیں۔ ان کتابوں کی نثر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صنعت سجع و موازنہ اور مرادفات استعمال نہیں کیے گئے ہیں، نہ فقرات میں ہی کسی قسم کی الجھن ہے۔

مُلکی خود مختار حکومتیں

ہر چند کہ ملکی تاریخ لکھنا ہمارا منصب نہیں، لیکن اس زمانے کے علمی اور ادبی مرکزوں اور اُن کے قائم کرنے والے حکمرانوں کا حال جاننے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر سا تاریخی پس منظر بیان کیا جائے۔

خلفائے بغداد کے ماتحت جو سامانیہ حکومت قائم ہوئی، اس کا ذکر آ چکا ہے، اس کے ساتھ ساتھ چند اور حکومتیں بھی موجود تھیں، جن کا مختصر سا ذکر

ذیل میں کیا جاتا ہے۔

امرائے طبرستان

اس دور میں گرگان و طبرستان میں بعض حکومتیں ایسی بھی قائم تھیں جو ظہور اسلام سے پہلے موجود تھیں اور ظہور اسلام[۱] کے بعد بھی انھوں نے اپنی آزادی کو برقرار رکھا، مثلاً آل باوند اور آل قارن وغیرہ۔

خلیفۃ المستعین (وفات ۲۵۳ ہجری مطابق ۸۶۷ عیسوی کے زمانہ کا ذکر ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نسب سے ایک شخص حسن بن زید بن اسمٰعیل رے میں مقیم تھا۔ یہاں اُس نے بیعت کی دعوت دی۔ طبرستان کے امرا اور عوام عرب حکام سے خوش نہ تھے، اس لیے جوق در جوق اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے۔ اور اسے امیر تسلیم کر لیا۔ آخر ۲۵۰ ہجری مطابق ۸۶۴ عیسوی میں وہ اپنی آزاد حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس وقت ماژندران اور گرگان کے علاقے خلیفہ بغداد کے ماتحت تھے۔ حسن بن زید نے ان علاقوں پر لشکر کشی کر کے خلیفہ کی فوجوں پر فتح پائی اور یہ علاقے بھی اس کی سلطنت کا حصہ بن گئے۔ حسن ۲۷۰ ہجری میں فوت ہوا، تو محمد بن زید ۲۷۰ تا ۲۸۷ ہجری بمطابق ۸۸۳ - ۹۰۰ عیسوی نے حکومت سنبھالی۔ محمد بن زید اسمٰعیل بن احمد سامانی کے ہاتھوں ۲۸۷ ہجری مطابق ۹۰۰ عیسوی میں مارا گیا اور گرگان، ماژندران اور طبرستان کے علاقے سامانی حکمرانوں کے تسلط میں آ گئے۔

آل زیار

آل زیار کی حکومت کا زمانہ ۳۱۶ تا ۴۳۳ ہجری مطابق ۹۲۸ - ۱۰۴۲ عیسوی ہے۔ سامانی حکمران نصر دوم کے زمانے میں ایک شخص علی بن اطروش نے طبرستان میں عہد علویہ کی بنیاد رکھی تھی، لیکن چند ہی سال بعد

[۱] تاریخ ادبیات در ایران مولفہ ذبیح اللہ صفا جلد اول ص ۱۸۲

ایک اور شخص مرداویج بن زیار نے طبرستان کا علاقہ اس سے چھین لیا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ شخص اصفہان اور ہمدان کے علاقوں پر بھی قابض ہوگیا۔ اور آل زیار کی ایک خودمختار حکومت قائم کی۔ جو ایک سو سال سے زیادہ عرصہ تک قائم رہی۔ یہ عہد علم وفضل کی قدردانی کی وجہ سے مشہور ہے۔

قابوس بن دشمگیر زیاری

مرداویج کے جانشینوں میں قابوس بن وشمگیر (۳۶۶ تا ۴۰۳ ہجری مطابق ۹۷۶-۱۰۱۲ء) خاص طور پر بہت مشہور ہے۔ قابوس علم دوست حکمران تھا، خود شاعر بھی تھا اور عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ یہ وہی حکمران ہے جس نے ابوریحان البیرونی ایسے نامور عالم کی پرورش کی۔ ابوریحان نے اپنی مشہور تصنیف "آثار الباقیہ من قرون الخالیہ" اسی حکمران کے نام منسوب کی تھی۔

قابوس نامہ کا مصنف

آل زیار کے عہد کی ایک مشہور یادگار "قابوس نامہ" ہے جو قابوس بن وشمگیر کے پوتے امیر عنصر المعالی کیقاؤس بن سکندر بن قابوس کی تالیف ہے۔ کیقاؤس نے یہ کتاب اپنے بیٹے گیلان شاہ کی رہنمائی کے لیے ۴۷۵ ہجری مطابق ۱۰۸۲ء میں لکھی تھی۔

قابوس نامہ

آل زیار کے عہد کی یہ ایک مشہور یادگار ہے۔ اس کے چند موضوع ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

"قابوس نامہ" ایک دیباچہ اور چوالیس ابواب پر مشتمل ہے۔ دیباچے میں مصنف اس بات کا گلہ کرتا ہے کہ دنیا سے ادب و احترام اٹھ چکا ہے۔ چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز باقی نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے بیٹے گیلان شاہ کو نیکی کی زندگی گزارنے کی تلقین کرتا ہے۔

اس کتاب کے پہلے چار باب ذاتِ باری، تخلیق کائنات، آدابِ مذہب سے متعلق ہیں۔ پانچواں باب حقوق والدین پر اور چھٹا باب ذہنی تربیت اور اظہار و بیان کی قوت سے متعلق ہے۔ ان کے علاوہ متعدد ابواب کھانے پینے، شطرنج اور لوکھیلنے، مہمان داری، ہنسی مذاق، محبت، عیش و نشاط، نیند اور آرام، شکار، جنگ، دولت جمع کرنے، شادی بیاہ، تربیتِ اولاد، دوستوں کے انتخاب، دشمنوں سے احتیاط، معافی، سزا، عطا و بخشش، مطالعہ، شاہانہ فرائض، علوم و فنون، فنِ شعر، مصاحبوں اور دبیروں کے فرائض، سپہ سالار اور وزیر کے اوصاف، بادشاہ کے اوصاف و فرائض، زمینداری اور سخاوت وغیرہ پر مشتمل ہیں۔

"قابوس نامہ" میں پچاس کے قریب حکایتیں ہیں، جن میں بیشتر ذاتی تجربات کا نچوڑ معلوم ہوتی ہیں۔ یہ حکایات حالات و واقعات پر روشنی ڈالنے کے لیے شامل کی گئی ہیں۔

"قابوس نامہ" سادہ، صاف اور روان زبان میں لکھا گیا ہے۔ اس میں شگفتگی اور مزاح کی چاشنی بھی ہے۔ ضرب الامثال کثرت سے استعمال کی گئی ہیں۔ قابوس نامہ میں ایسے متعدد الفاظ نظر آتے ہیں، جو آج کل متروک ہیں۔

قابوس نامہ کے اخلاقی نظریات

اخلاقی نظریات، جو مصنف قابوس نامہ نے پیش کیے ہیں، زندگی کے ساتھ بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً وہ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے۔ "احمقوں سے عقل سیکھو"۔ "بہت زیادہ شرم و حیا نہ کرو، کیونکہ دنیا میں اکثر شخص شرم و حجاب کی وجہ سے اپنے مقاصد میں ناکام رہ جاتے ہیں"۔ "راست گوئی میں شہرت حاصل کرو۔ تاکہ اگر کبھی جھوٹ بھی بولو، تو لوگ یہی سمجھیں کہ سچ ہے۔"

معاشرتی اصول

معاشرتی اصول، جو مصنف نے پیش کیے ہیں، بہت

مفید ہیں۔ چند اصول حسب ذیل ہیں۔

"مہمان کی خاطر مدارات میں کمی ہو جائے، تو معذرت نہ کرو، کیونکہ مہمان اس میں اپنی سبکی محسوس کرے گا۔" "مہمان کی موجودگی میں نوکروں کو سرزنش نہ کرو۔"

شراب نوشی کے متعلق مصنف نے ذیل کی نصیحت کی ہے۔ "شراب مذہباً حرام ہے، لیکن مجھے خیال ہے کہ میں خواہ تمہیں کچھ بھی کہوں، تم شراب ضرور پیوگے، لیکن یہ یاد رکھو کہ صبح کے وقت کبھی شراب نہ پینا اور نہ اس طرح سے پینا کہ تمہاری نمازیں قضا ہو جائیں۔ شراب پینا گناہ ہے، لیکن اگر تمہیں یہ گناہ کرنا ہی ہو، تو سلیقے سے کرنا۔"

ابوریحان البیرونی مشہور فلسفی اور ہیئت دان ابوریحان البیرونی ایران کے مشہور ترین علما میں سے ہے۔ اس کی ولادت خوارزم میں ۳۶۲ ہجری مطابق ۹۷۲ عیسوی میں ہوئی۔ زندگی کا ابتدائی حصہ خوارزم میں گزارا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مامون بن مامون خوارزم شاہ کے دربار میں ہوئی، مامون البیرونی کی بڑی قدر و منزلت کرتا تھا، یہاں سے چل کر وہ کے لیے آل زیار کے حکمران قابوس بن وشمگیر کے دربار میں بھی آیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد وہ پھر دربار خوارزم شاہ میں واپس آگیا۔ یہاں سے بالآخر سلطان محمود غزنوی کے دربار میں چلا گیا۔ ابوریحان کی تصنیفات کا حال عہد غزنویہ کے علم و ادب کے بیان میں آئے گا۔

آل زیار کا دربار علم و فضل کی وجہ سے تو مشہور تھا، لیکن اس دربار کی ایک یادگار یہ بھی ہے کہ زیاری حکمران قابوس نے مشہور آفاق فلسفی طبیب اور شاعر بوعلی سینا کو ان دنوں اپنے دربار میں جگہ دی جب وہ سلطان محمود غزنوی کے تعاقب سے بچنے کے لیے آوارہ دیار ہوا پھرتا تھا۔

خاندان چغانیاں ماوراءالنہر کا ایک معزز خاندان اپنے مورثِ اعلیٰ محتاج کے نام پر آلِ محتاج مشہور ہوا۔ دورِ سامانیہ میں آلِ محتاج نے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے جن کے صلے میں انھیں بڑے بڑے منصب حاصل ہوئے، یہاں تک کہ ماوراءالنہر کی حکومت انھیں سونپ دی گئی۔ آلِ محتاج کا دارالسلطنت چغانیاں تھا، اس نام کی نسبت سے آلِ محتاج کا عہد۔ عہدِ چغانیاں بھی کہلاتا ہے۔

آلِ محتاج کے ایک فرد ابوبکر محمد بن مظفر بن محتاج چغانی کو امیر نصر بن احمد سامانی نے خراسان کا امیرِ لشکر بنایا تھا۔ اس کی وفات پر اس کا بیٹا ابوعلی احمد اسی عہدے پر فائز رہا۔ اس نے ۳۲۹ ہجری بمطابق ۹۴۰ عیسوی میں گرگان اور ری میں ماکان بن کاکی دیلمی پر فتح پاکر گرگان، طبرستان، زنجان اور کرمان شاہ کے علاقے سلطنت سامانیہ میں شامل کیے۔ ۳۳۳ ہجری بمطابق ۹۴۴ عیسوی میں امیر نوح بن نصر سامانی کسی سبب سے ابوعلی پر ناراض ہو گیا۔ اور اسے امیرِ لشکر کے منصب سے معزول کر دیا۔ اس پر ابوعلی نے بغاوت کی جس میں وہ کامیاب ہوا۔ اور امیر نوح بن نصر کو بھاگ کر سمرقند میں پناہ لینی پڑی۔ اس کے بعد سامانی حکمران کی ابوعلی کے ساتھ کبھی صلح ہوتی اور کبھی جنگ۔ آخر ابوعلی ۳۴۴ ہجری بمطابق ۹۵۵ عیسوی میں دارِ فانی کو خیرباد کہہ گیا۔ اس کے بعد ابوعلی کے دو بیٹوں نے بھی مختصر سے وقت کے لیے حکومت کی۔ ان کے بعد ابوعلی کا بھتیجا ابوالمظفر طاہر بن فضل چغانیاں کا حکمران مقرر ہوا۔ عوفی تذکرہ لباب الالباب میں لکھتا ہے کہ یہ حکمران ایک فاضل شخص تھا، خود شعر کہتا اور شعرا اور علماء کی قدردانی کرتا تھا۔ آلِ محتاج کا ایک اور حکمران فخرالدولہ ابوالمظفر احمد بن محمد تھا۔ یہ بھی ابوعلی کا بھتیجا تھا۔ ابوالمظفر وہی حکمران ہے، جس کے قصیدے دقیقی نے کہے، اور جس کی خدمت میں فرخی اپنا مشہور قصیدہ "کاروان حلہ" لکھ کر لے گیا تھا۔

آل بویہ بحیرہ خزر کے ساحل کا علاقہ دیلم کہلاتا ہے۔ خاندان بویہ کو دیلم سے نسبت تھی، اسی لیے یہ لوگ دیلمی کہلائے۔ ابوریحان البیرونی لکھتا ہے کہ ان کا سلسلہ نسب بہرام گور سے ملتا ہے۔ خاندان بویہ کی مدت حکومت ۳۲۰ تا ۴۴۷ ہجری مطابق ۹۳۲ - ۱۰۵۵ عیسوی ہے۔ اس عہد کی بنیاد آل زیار کے ہاتھوں رکھی گئی تھی۔

آل زیار نے کرج کی حکومت ایک شخص ابوالحسن علی بن بویہ کو اس کی خدمات کے صلے میں دی۔ علی کے دو بھائی اور بھی تھے۔ ان میں احمد سب سے زیادہ مشہور ہوا۔ ان تینوں نے مل کر اپنی حکومت کو اتنی وسعت دی کہ جنوبی ایران کا علاقہ فارس بھی ان کی سلطنت کا حصہ بن گیا۔ خلیفہ بغداد نے تینوں بھائیوں کی حکومت تسلیم کر لی۔ اس سے ان کے حوصلے اور بھی بڑھے۔ احمد نے سلطنت کو اور وسعت دینے کے لیے خوزستان کا رخ کیا اور اسے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ احمد پھر ۳۳۴ ہجری مطابق ۹۴۵ عیسوی میں بغداد پر حملہ آور ہوا۔ اور خلیفہ مستکفی کو معزول کرنے میں کامیاب ہو گیا آخر اسی کی کوشش سے مقتدر کا بیٹا فضل خلیفہ بنا۔ فضل نے احمد کو معزالدولہ کا خطاب دے کر امیرالامرا بنا دیا۔ ساتھ ہی اس کے بھائی علی کو عمادالدولہ اور حسن کو رکن الدولہ کے خطاب سے سرفراز کیا۔ رفتہ رفتہ معزالدولہ کو اس قدر اقتدار حاصل ہوا کہ بعد میں جس قدر خلفا مسند خلافت پر بیٹھے آل بویہ کے ہاتھ میں کٹ پتلی بنے رہے۔

آل بویہ کی حکومت بالآخر تین حصوں یعنی رے، عراق اور فارس میں منقسم ہو کر کمزور پڑ گئی اور سلطان محمود غزنوی نے اُن کے بہت سے علاقے چھین کر انھیں مغربی ایران اور عراق کی طرف دھکیل دیا۔ پھر یہ رہی سہی سلطنت آل سلجوق کے ہاتھوں ختم ہو گئی۔

آل بویہ کے حکمراں شمس الدولہ، عطاء الدولہ، عز الدولہ، بہاء الدولہ جو علی، احمد اور حسن کے جانشین بنے۔ خود عالم تھے اور علما کی بہت قدر و منزلت کرتے تھے۔

آل بویہ کے عہد کا نامور وزیر صاحب بن عباد تھا، جو علما کا بہت بڑا مربی اور سرپرست تھا، اس لیے آل بویہ کا دربار علم و ادب کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ اس دربار میں متعدد شعراء تھے، جن میں علی منطقی، ابو بکر محمد، بندار اور بختیاری قابل ذکر ہیں۔ بعض عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، ان میں ابو الفتح بُستی کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ ان شعرا کی مستقل یادگار کوئی نہیں البتہ ان کے نام تذکروں میں باقی رہ گئے ہیں۔

ساتواں باب

دورِ غزنویہ

(۳۵۱ تا ۵۸۲ ہجری مطابق ۹۶۲-۱۱۸۶ عیسوی)

الپتگین خلیفہ عبدالملک سامانی کے عہد میں ایک ترک غلام الپتگین تھا، جسے فوجی قابلیت کے صلے میں خراسانی لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا گیا تھا۔ عبدالملک فوت ہوا، تو الپتگین خراسان چھوڑ کر غزنی آ گیا اور دولت سامانی کے ماتحت غزنی میں اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

سبکتگین الپتگین فوت ہوا، تو سبکتگین نے، جو الپتگین کا غلام اور داماد تھا، غزنی کی حکومت سنبھالی، اور سامانیوں سے آزاد ہو کر عہدِ غزنویہ کی بنیاد رکھی۔ سبکتگین کی سلطنت میں غزنی اور خراسان کے علاقے تھے۔ اس نے حدود ملک کو وسیع کرنے کے لیے ہندوستان کا رُخ کیا اور راجہ جے پال کو شکست دے کر پشاور پر قابض ہو گیا۔ اس سے غزنوی سلطنت پشاور سے خراسان تک پھیل گئی۔

سلطان محمود غزنوی رح سبکتگین کے بعد سلطان محمود غزنوی تخت نشیں ہوا۔ یہ وہ جلیل القدر بادشاہ ہے، جس کے نام کا ڈنکا دُور دُور تک بجتا رہا۔ سلطان محمود نے حکومت سنبھالی تو آلِ سامان کی حکومت ایلِ خان کے ہاتھوں ختم ہو چکی تھی۔ صفاریہ سلطنت کا نشان بھی مٹا چاہتا تھا۔ اس سلطنت کا آخری دعوے دار عمرو لیث کا پوتا خلف بانو تھا، جس نے محمود

کے ہاتھوں شکست کھائی اور حکومت صنعاریہ کا خاتمہ ہو گیا۔ سلطان محمود مطمئن ہو کر غزنی کو واپس ہو لیا۔ ایل خان نے موقع سے فائدہ اٹھا کر خراسان پر حملہ کر دیا۔ سلطان محمود الٹے پاؤں واپس ایران آگیا اور بلخ کے مقام پر اپنے حریف ایل خان کو شکست دے کر اُسے دریائے جیحوں سے پار اتار دیا۔ چند ہی سال گزرے تھے کہ محمود نے بخارا اور سمرقند کے علاقے بھی فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیے۔ اب محمود ایران کی مہم سے فارغ ہو کر غزنی واپس چلا گیا، جہاں اس نے ۴۲۱ ہجری مطابق ۱۰۳۰ عیسوی میں وفات پائی۔

عہد غزنویہ کی بنیاد سبکتگین نے رکھی۔ محمود کے زمانے میں اُسے عروج حاصل ہوا اور محمود کے جانشین مسعود کے زمانے میں عہد غزنویہ کا ایران میں خاتمہ ہو گیا۔

عہدِ غزنویہ میں فارسی علم و ادب

عہد غزنویہ میں بھی عہد سامانیہ کی طرح علم و ادب کو بہت ترقی ہوئی۔ یہ عہد اگرچہ کم مدت تھا، لیکن شعر و سخن کی ترقی اور شعرا کی اہمیت کی وجہ سے ایران کا روشن ترین عہد سمجھا جاتا ہے۔ شعر و تاریخ کا زندہ جاوید کارنامہ یعنی "شاہنامہ فردوسی" اسی عہد کی عظیم یادگار ہے۔

محمود کی علمی خدمات

سلطان محمود خود بھی ایک عالم شخص تھا۔ اس نے علم فقہ میں "تفرید فی الفروع" ایک کتاب تالیف

ل امام المحدث محی الدین اپنی تصنیف "الجواہر المضیۃ" جلد دوم ص ۱۵۷ مطبوعہ حیدرآباد دکن میں لکھتے ہیں کہ امام مسعود شیبہ نے "تعلیم" میں ذکر کیا ہے کہ سلطان محمود کا شمار فقہائے کبار میں ہوتا ہے۔ فقہ اور حدیث میں انہوں نے کتابیں تالیف کی ہیں۔ ان کی ایک تصنیف "کتاب التفرید فی الفروع" ہے۔ جو حنفی مذہب پر انہوں نے لکھی ہے اس میں تقریباً ۶۰ ہزار مسائل ہیں۔

کی، جو دینی مسائل پر مشتمل ہے۔ محمود نے غزنی میں ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا، جس کے ساتھ ایک عجائب خانہ بھی ملحق تھا۔ اس میں نادر کتابیں جمع کی گئی تھیں۔ محمود کو ہندوستان کی فتوحات سے جو گراں بہا خزانے ہاتھ لگے، انھیں وہ ترویج علم کے لیے بڑی فیاضی سے صرف کرتا تھا، یہی وجہ ہے کہ علماء اور شعراء خود بخود اُس کے دربار میں کھنچے چلے آتے تھے۔

محمود اغوا کنندہ علماء تھا

پروفیسر براؤن[1] محمود کو اغوا کنندہ علما لکھتے ہیں۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ سلطان محمود کو جہاں کہیں علما کا پتہ چلتا، انھیں اپنے دربار میں لانے کی کوشش کرتا تھا، اس کی ایک مثال حسب ذیل ہے۔

خوارزم میں مامون بن مامون کے دربار میں علما کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ ان میں ابوریحان البیرونی، بوعلی سینا، ابوسہل مسیحی، ابوالحسن خمار طبیب اور ابونصر عراق ماہر ریاضی، ایسے جید عالم جمع تھے محمود نے ان کی شہرت سنی، تو دربار میں بلانا چاہا۔ ایلچی بھیج کر شہزادہ مامون سے خواہش کی کہ ان علما کو دربار غزنی میں بھیج دیا جائے۔ بظاہر تو یہ محمود کی خواہش ہی تھی، لیکن حقیقت میں یہ حکم تھا، جس سے سرتابی ممکن نہ تھی۔ مامون نے ڈر کر بادل ناخواستہ ان علماء کو اپنے دربار سے رخصت کر دیا۔ ابوریحان البیرونی، ابوالحسن خمار اور ابونصر عراق نے، جو محمود غزنوی کی داد و دہش کے فسانے سن چکے تھے، غزنی کا رُخ کیا۔ بوعلی سینا اور ابوسہل مسیحی غزنی آنے پر رضامند نہ تھے۔ یہ دونوں پا پیادہ خوارزم سے نکل کھڑے ہوئے۔ راستے میں گرد و غبار کا طوفان اٹھا جس سے مسیحی تو ہلاک ہو گیا اور بوعلی سینا تنہا سفر کی صعوبتیں جھیلتا ہوا ابیورد

---

[1] لٹریری ہسٹری آف پرشیا۔ مؤلفہ براؤن جلد ۲ صفحہ ۹۵۔

پہنچا۔ وہاں سے طوس ہوتا ہوا گرگان آیا۔ یہاں قابوس بن وشمگیر کی حکومت تھی، جس نے بوعلی کا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔

سلطان محمود نے بوعلی سینا کے روپوش ہونے کی خبر سُنی، تو سخت برہم ہوا اور اس کی تصویریں ایران کے طول و عرض میں بھجوا کر حکم دیا کہ وہ جہاں کہیں ہو، اسے غزنی بھجوا دیا جائے۔ قابوس نے بوعلی کو دربار غزنی میں بھیجنے کے بجائے اپنے ہاں بڑی عزت و احترام سے رکھا۔ بوعلی آخر کچھ عرصے بعد ری آگیا اور آل بویہ کے حکمران علاءالدولہ دیلمی کی ملازمت اختیار کرلی۔ یہاں اسے وزارت کا منصب سونپا گیا۔ مصنف چہار[1] مقالہ لکھتا ہے کہ "بوعلی اپنی وزارت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے باوجود صبح کی نماز کے بعد روزانہ اپنی عظیم فلسفیانہ کتاب "شفا" کے دو ایک صفحے لکھا کرتا تھا۔"

البیرونی اور مزاج شہنشاہ

دربار غزنی میں البیرونی کی قدر و منزلت تو بہت ہوئی لیکن اس کا علم نجوم کبھی کبھی بادشاہ کے مزاج پر گراں بھی گزرتا۔ مصنف[2] چہار مقالہ لکھتا ہے کہ ایک دن سلطان باغ کی چار دری میں رونق افروز تھا کہ البیرونی سے پوچھا، بتاؤ میں کس راستے سے باہر جاؤں گا۔ البیرونی نے پرزہ کاغذ پر کچھ لکھ کر تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ دیوار توڑی جائے۔ دیوار توڑنے سے جو راستہ بنا، بادشاہ اس سے باہر نکلا۔ البیرونی کا پرزہ کاغذ دیکھا گیا، تو لکھا تھا، بادشاہ سلامت دیوار توڑ کر باہر نکلیں گے۔ سلطان محمود البیرونی کو نیچا دکھانا چاہتا تھا، لیکن اُسے ناکامی ہوئی۔ جس سے شاہی جبیں شکن آلود ہو گئی۔ حکم ہوا کہ ابوریحان کو چھت سے گرا دیا جائے۔ نچلی منزل میں مچھردانی تنی ہوئی تھی، ابوریحان گرا تو مچھردانی پر آپڑا، جس سے وہ بچ گیا۔ بادشاہ نے بلوا کر پوچھا کہ تم جانتے

---

[1] چہار مقالہ مطبوعہ تہران بہ نظر مرزا محمد قزوینی ص ۹۰ [2] صفحہ ۹۰

تھے کہ تمہیں چھت سے گرایا جائے گا، اس نے جیب سے بیاض نکال کر دکھائی، تو یہی واقعہ لکھا ہوا تھا۔ محمود کو غصّہ تو پہلے ہی تھا، اب اور زیادہ غضب ناک ہوا اور حکم دیا، البیرونی کو قلعہ میں قید رکھا جائے۔ جہاں سے چھ ماہ بعد حسن میمندی کی سفارش پر اُسے آزادی ملی۔

عہدِ غزنویہ کے شعرا

سلطان محمود کو ادبیاتِ فارسی سے خاص لگاؤ۔ وہ شعرا اور علما کی داد و دہش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتا تھا، اس لیے دربارِ غزنی علم و فضل کا مرکز بن گیا۔ کہا جاتا ہے، یہاں چار سو شاعر جمع تھے۔ چند شعرا کا ذکر ذیل میں کیا جائے گا

عنصری

ابو القاسم حسن بن احمد نام اور عنصری تخلص ہے۔ سالِ پیدائش ۳۵۰ ہجری مطابق ۹۶۱ عیسوی اور سالِ وفات ۴۳۱ ہجری مطابق ۱۰۳۹ عیسوی ہے۔ عنصری کا باپ تاجر تھا، عنصری نے بھی آبائی پیشے کو معاش کا وسیلہ بنایا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا اثاثہ ایک مرتبہ ڈاکوؤں نے لوٹ لیا۔ اس نقصان کے بعد عنصری نے تعلیم پانی شروع کی۔ شعر گوئی کا فطری ذوق تھا، اس لیے دورانِ تعلیم میں شعر کہنے لگا۔ تعلیم سے فارغ ہوا، تو اس کی شاعری کا شہرہ عام ہو چکا تھا۔

عنصری کے ممدوحین

عنصری کو سلطان محمود کے بھائی امیر نصر بن ناصر الدین کے ساتھ، جو خراسان کا امیرِ لشکر تھا، قلبی تعلق تھا، چنانچہ اس کی مدح میں پُر زور قصیدے کہے ہیں۔ آخر امیر نصر ہی کے وسیلے سے عنصری نے محمود غزنوی کے دربار میں رسائی پائی۔

محمود نے عنصری کی سخن سرائی کی انتہا درجہ قدر و منزلت کی۔ اسے ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز کیا۔ پھر یہ حکم ہوا کہ جو شاعر قصیدہ لکھ کر لائے، پہلے عنصری کو دکھائے، اس طرح محمود نے گویا اسے شہرت کے معراج کو پہنچا دیا۔ عنصری پر انعام و اکرام کی جو بارشیں ہوتی تھیں ان کا اکثر تذکروں میں ذکر آیا ہے۔ ہندوستان

کی ایک فتح پر عنصری نے دس اشعار کا قصیدہ کہا جس کے صلے میں اسے سو تھیلیاں اشرفیوں کی اور دس غلام عطا ہوئے۔ چنانچہ خاقانی ایسا عظیم المرتبت شاعر کہتا ہے ؎

بلی شاعری بود صاحبقران — ز ممدوح صاحبقران عنصری
ز معشوق نیکو و ممدوح نیک — غزل گوشد و مدح خوان عنصری
بدور کرم بخشش نیک دید — ز محمود کشورستان عنصری
بدہ بیت صد بدرہ و برہ یافت — زیک فتح ہندوستان عنصری

عنصری کے مال و دولت کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ اس کے ہاں چاندی کی دیگچوں میں کھانا پکتا، اور سونے کے برتنوں میں کھایا جاتا، چنانچہ خاقانی کہتا ہے ع

شنیدم کہ از نقرہ زد دیگدان — ز زر ساخت آلات خوان عنصری

زلف ایاز کا کاٹا جانا، محمود کا اس پر بے قرار ہونا، عنصری کا قطعہ[۱] سنانا اور محمود کے رنج کا دور ہونا۔ چہار مقالہ کی ایک مشہور حکایت ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ محمود کے دل و دماغ پر عنصری کے اشعار کا کتنا گہرا اثر تھا۔

محمود کے بعد جب سلطان مسعود تخت نشین ہوا تو اس وقت بھی عنصری کے مرتبے میں کسی قسم کی کمی نہیں آنے پائی۔

ہمعصر شعرا

تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ محمود کے دربار میں چار سو شاعر جمع تھے، ظاہر ہے کہ یہ سب عنصری کے ہمعصر تھے، ان میں سے خاص طور سے قابل ذکر فردوسی، فرخی، عسجدی، زینتی علوی، منوچہری دامغانی، غضائری رازی ہیں۔ یہ سب شعرا عنصری کے اخلاق کی بلندی اور علم و فضل کی برتری کی وجہ

---

[۱] گر عیب سر زلف بت از کاستن است — نہ جای بغم نشستن و برخاستن است
وقت طرب و نشاط و می خواستن است — کارآستین سرو ز پیراستن است

سے اس کے دل سے مدح خوان تھے۔ منوچہری نے، جو دربار محمود کا ایک مشہور شاعر تھا، عنصری کی مدح میں "مخاطب بہ شمع" ایک قصیدہ کہا ہے۔ جس کے چند شعر حسبِ ذیل ہیں ؎

تو ہمی تابی و من بر تو ہمی خوانم بمہر — ہر شبی تا روز دیوان ابوالقاسم حسن
اوستاد اوستادان زمانہ عنصری — عنصرش بی عیب و دل بی غش و دینش بی فتن
نعمت فردوس یک لفظ متینش را ثمر — گنج باد آورد یک بیت مدیحش را ثمن
تا ہمی خوانی تو ابیاتش ہمی خائی شکر — تا ہمی گوئی تو ابیاتش ہمی بوئی سمن

کلام کی خصوصیات

عنصری شعر گوئی میں سبک خراسانی کا پیرو ہے۔ قصائد کا آغاز بالعموم قدرتی مظاہر مثلاً رات، بادل، خزاں، اور بہار کے ذکر سے کرتا ہے۔ پھر معنی خیز "گریز" سے اصل مدح کی طرف رجوع کرتا ہے۔ ایک قصیدے کے چند شعر نمونے کے طور پر درج کیے جاتے ہیں۔

باد نوروزی ہمی در بوستان بت گر شود — تا ز صنعش ہر درختی لعبتی دیگر شود
باغ ہمچوں کلبۂ بزاز پر دیبا شود — باد ہمچوں طبلۂ عطار پر عنبر شود
چوں حجابی لعبتان خورشید را بینی ز ناز — گہ برون آید ز میغ و گہ بمیغ اندر شود

اس کے بعد بادشاہ کی مدح کے لیے یوں گریز ہوتا ہے ع

روزی ہر روزی بیفزاید چو قدر شہریار — بوستان چون بخت او ہر روز برناتر شود

واقعہ نگاری

عنصری اکثر سلطان محمود کی مہموں میں اس کا ہم رکاب رہتا اور جنگ کے حالات و واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا، اس لیے اس کے اشعار میدان کارزار کی حقیقی تصویر معلوم ہوتے ہیں۔ محمود کی مدح میں ۱۷۲ اشعار کا ایک قصیدہ لکھا ہے، جس کے چند اشعار حسبِ ذیل ہیں۔

خوارزم کی فتح کے موقع پر لکھتا ہے:-

بوقت آن کہ زمین تفتہ بُد ز بادِ سموم ہوا چو آتش گرداند بُد بجائی شرار

بہ فال اختر نیک بہ نصرت دادار فرو گزشت بآموئیہ شہریار جہان

ہمہ زمین شدہ از روئی بندگان کشمیر ہمہ ہوا شدہ از عکس چاؤشان فرخار

در آب دہمہ غرقہ شدند چون فرعون چو برگزشت بر آن آب شاہ موسیٰ دار

فراخ جیحون چون کوہ شد زبسکہ درہ کلاہ و ترکش و زین بود و جامہ و دستار

کسی کہ زندہ بماند است ازان ہزیمتیان اگرچہ تنش درست است ہست چون بیمار

بہ مغز شش اندر تیغ است اگر بود خفتہ بچشمش اندر تیر است اگر بود بیدار

اگر بجنبد چند قبائی او از باد گمان کند کہ ہمی بر جگرہ خورد مسمار

یعنی شکست کھانے والوں میں جو بچ گئے ہیں، وہ اگرچہ تندرست ہیں، لیکن بیماروں کی مانند ہیں۔ یہ لوگ اگر سوئے بھی ہوں، تو خواب میں انھیں تلواریں نظر آتی ہیں اور جب ان کی آنکھیں کھلتی ہیں تو تیر دکھائی دیتے ہیں۔ اگر ہوا سے ان کی قبائیں ہلتی ہیں، تو وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ کسی نے اُن کے جگر میں میخ ٹھونک دی ہے۔

اخلاقی تعلیم

عنصری کو اگرچہ قصائد ہی کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی لیکن قصائد میں بعض ایسے اخلاقی مسائل بھی بیان کیے ہیں۔ جن سے قارئین کو علو ہمت، بلند نظری اور وسیع ظرفی کا سبق ملتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک قطعہ پیش کیا جاتا ہے۔

میان زاغ سیاہ و میان باز سپید شنیدہ ام ز حکیمی حکایتی دلبر

بباز گفت ہمی زاغ ہر دو یار ہیم کہ ہر دو مرغیم از یک جنس و اصل یکدیگر

جواب داد کہ مرغیم ہر دو بجای ہنر میان طبع من و تو میانہ ایست مگر

خورند از آنکہ بماند ز من، ملوک زمین تو از پلیدی و مردار پر کنی ژاغر

مرا نشست بدست ملوک و دیر و سرا است ترا نشست بویرانہ و ستودان بر

نہ راحت است مرا در نگ زنگ تو نہ عذاب   کہ من نشانہ نہ معروفم و تو انہ منکر
ملوک میل سوی من کنند و سوی تو نہ   کہ میل خیر بخیر است و میل شر بسوی شر
بخورگاہ دہد بوی عنبر آن جامہ   کہ چند روز بماند نہادہ با عنبر
دلی کہ رامش جوید نیابد آن دانش   سری کہ بالش جوید نیابد آن افسر

عنصری اگرچہ قصیدہ گو شاعر ہے، لیکن اس نے کبھی کسی کی بے جا تعریف نہیں کی۔ تملق اور خوشامد سے اس کا دامن داغ دار نہیں۔ ہنر نمائی کی خاطر مبالغہ کرتے ہوئے وہ حد سے بھی نہیں گزرتا، بلکہ حسب موقع بادشاہ کی مدح کرتے ہوئے اسے عفو، رحم، سخاوت اور وفا کی تلقین کرتا ہے۔

چہار چیز گزیدہ ٔ چہار کار بود   کسی ندید و نہ بیند کش ازین چہار جدا
بوقت قدرت عفو و بوقت ذلت رحم   بوقت تنگی رادی بوقت عہد وفا

معنی آفرینی

عنصری کے بعض اشعار سے پتا چلتا ہے کہ وہ شعر و شاعری کے علاوہ مختلف علوم میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ ذیل کے اشعار اس کے علم و آگہی کا پتہ دیتے ہیں۔

وگر فرو شود آہن بآب طبع این است   چرا برآید چوشی ہمی بروی غدیر

وگر حدیث بقول منجمان رانی   بحکم اختر و ایام و طالع و دوران
بعید و لیس عیان است بادشاہی او   کہ کدخدائی جہان است و بادشاہ قران

ذیل کے اشعار میں عنصری کا استدلال قابل غور ہے:۔

ہر کہ با شاعر بود چون کرد قصد مدح او   شاعری گردد کہ شعرش روضۂ رضوان بود
زانکہ بر جشن جمع گرد آید معنی ہای نیک   چون معانی جمع گردد شاعری آسان بود

شکوہ لفظی

عنصری کے قصائد کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے

الفاظ و کلمات بہت زوردار اور پُرشکوہ ہوتے ہیں۔ ذیل کے اشعار سے اس کی قدرت کلام کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

چیست آن آبی چو آتش و آہنی چو پرنیان — بی روان تن پیکری پاکیزہ خون و تن روان

او بجنبانیش آبست ار بلرزانی درخش — ار ببندانیش تیراست ار بخمبانی کمان

آئینہ دیدی بر وگسترده مروارید خرد — ریزهٔ الماس دیدی بافتہ بر پرنیان

بوستان بویدار آتش کار نشناسد خرد — کاتش افروختہ است آن یا شگفتہ بوستان

شاہ گیتی خسرو لشکرکش و لشکر شکن — سایۂ یزدان، شہ کشور دہ کشورستان

زیر کردارش بزرگی زیر گفتارش خرد — زیر پیمانش سپہر و زیر فرمانش جہان

ای خرد را جان و جان را دانش و دل را امید — بادشاہی را چراغ و نیک نامی را روان

کوہ کان باد وزان گرد و بخشش اسپ تست — کوہ گرد و زیر زین و باد گرد و زیر ران

شادی و شاہی تو داری شاد باش و شاہ باش

جامۂ شادی تو پوش و نامۂ شاہی تو خوان

عرب شعرا کا اثر

عنصری کے بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عرب شعرا سے متاثر تھا۔ مقابلے کی غرض سے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

بتیغ شاہ نگر نامۂ گذشتہ مخوان — کہ راست گوی تر از نامہ تیغ او بسیار

عنصری کا یہ شعر ابوتمام کے شعر سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے:-

السیف اصدق انباء من الکتب — فی حدہ الحد بین الجد واللعب

عنصری کا ایک قطعہ ذیل کے شعر سے شروع ہوتا ہے، جو پہلے درج ہو چکا ہے

کسی کہ زندہ بماندہ است از آن ہنر میتان

اگرچہ تنش درست است ہست چون بیمار

یہ قطعہ بھی ابوتمام کے ایک قصیدے سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔

فان یاشو الاصحار فالبیض و القنا | قواہ و اخواض المنایا مناھلہ
وان یبن حیطانا علیہ فانما | اولٰئک عقالاتہ لا معاقلہ
والا فاعلمہ بانک ساخط | علیہ فان الخوف لا شک قاتلہ

رُباعیات قصائد و قطعات کے علاوہ چند رباعیاں بھی عنصری کی یادگار ہیں جن میں سے دو حسب ذیل ہیں۔

در عشق تو کس پای ندارد جز من | در شورہ کسی تخم نہ کارد جز من
با دشمن و با دوست بدت می گویم | تا ہیچ کست دوست ندارد جز من

ای شب نکنی آن ہمہ پرخاش کہ دوش | راز دل من مکن چنان فاش کہ دوش
دیدی چہ دراز بود دوشینہ شبم | ہاں ای شب وصل آنچنان باش کہ دوش

تصنیفات عنصری کا دیوان، قصائد، قطعات، رُباعیات اور مثنویوں کے بعض اشعار پر مشتمل ہے۔ مجمع الفصحا کے بیان کے مطابق اس کے دیوان کے اشعار کی تعداد کبھی تیس ہزار تک پہنچتی تھی۔ دولت شاہ سمرقندی اس کے اشعار کی تعداد تین ہزار لکھتا ہے۔ لیکن آج کل جو دیوان ملتا ہے، اس میں اشعار کی تعداد دو ہزار سے کچھ ہی زائد ہوگی۔ دیوان کے علاوہ عنصریؔ نے بعض مثنویاں بھی لکھیں، جن کے نام یہ ہیں: "عین الحیوٰۃ" "شاد بہر" "وامق و عذرا" "سرخ بت" اور "خنگ بت"، لیکن مقام افسوس ہے، یہ سب مثنویاں اب ناپید ہیں۔ ان کے صرف نام ہی تذکروں میں باقی رہ گئے ہیں۔

غضائری رازی۔ سن وفات ۴۲۶ھ مطابق ۱۰۳۴ء ابو یزید محمد غضائری رازی عراق کے

---

[1] فہرست کتب محمد بن ذکریا ص ۳۹

مشہور شعرا میں سے تھا اور بہاء الدولہ دیلمی کے دربار سے وابستہ تھا محمود غزنوی کی شاعر نوازی کی داستانوں کی گونج عراق میں بھی سنائی دیتی تھی، اس لیے یہاں کے شعرا کو بھی دربار غزنویہ کی طرف رجوع کرنے کا خیال آیا۔ چنانچہ غضائری نے قصیدہ لکھ کر محمود کی خدمت میں بھیجا جو اُسے پسند آیا اور اس نے صلے کے طور پر طلائی مہروں کی دو تھیلیاں غضائری کو بھیجیں، چنانچہ وہ خود کہتا ہے۔

دو بدرہ زر بگر فتم بفتح نار اتن | بفتح رومیہ صد بدرہ گیرم و خرطال

اس قصیدے کا مطلع یہ ہے :-

اگر کمال بجاه اندراست و جاه بمال | مرا به بین که ببینی کمال را بکمال

اس قصیدے میں غضائری نے سلطان محمود کی مدح کے ساتھ ساتھ اپنے علم و فضل کا اظہار اور حاسدوں کے حسد کا ذکر بھی کیا ہے۔ غضائری نے ایاز کی تعریف میں دو شعر کہے تھے، جن کے صلے میں دیناروں کی دو تھیلیاں، اور دو ہزار درہم عطا ہوئے۔

مرا دو بیت بفرمود شہریار جہان | بران صنوبر عنبر عذار مشکین خال

دو بدرہ زر بفرستاد دو ہزار درہم | برغم حاسد و تیمار بد سگال نکال

دولت شاہ سمرقندی[1] کا بیان ہے کہ پہلا قصیدہ غضائری نے غزنی میں لکھا تھا، لیکن اسی قصیدے کے پہلے دو اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ رَی سے ہی قصیدے لکھ کر سلطان کے حضور میں بھیجا کرتا تھا۔

یہ دو شعر حسب ذیل ہیں :-

پیام داد بمن بندہ دوش باد شمال | ز حضرت ملک ملک بخش اعدا مال

کہ شعر شکر بحضرت رسید و بہ پسندید | خدایگان جہان خسرو خجستہ خصال

---

[1] تذکرۃ الشعرا ص ۱۵

مولف مجمع الفصحا لکھتا ہے کہ غضائری کہیں بعد بہ غزنی آیا، جہاں عنصری سے بگڑ گئی اور عنصری نے اس کا دیوان[1] پانی میں بہا دیا۔ رضا قلی کا یہ بیان کچھ محل نظر ہے۔ مسعود سعد سلمان کا شعر ہے۔

بہر قصیدہ کہ از شہر ری فرستادی
ہزار دینار اوستدی ز زر حلال

اس شعر سے واضح ہوتا ہے کہ غضائری ری سے ہی قصیدے لکھ کر بھیجتا رہا، اور پھر عنصری[2] کو اس کا دیوان بہانے کی بھی کیا ضرورت تھی، غضائری کوئی نامور شاعر نہ تھا۔ محمود جو اس کو نوازتا تھا، تو اس میں اس کے اشعار کی خوبی کو کوئی دخل نہ تھا، بلکہ وہ ری کے باشندوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا۔

مجمع الفصحا کے بیان کے مطابق غضائری کی وفات ۴۲۶ ہجری بمطابق ۴۲۶ع میں ہوئی۔

ابوالحسن علی بن جولوغ فرخی سیستانی

سلطان محمود غزنوی کے مشہور شعرا میں فرخی کا بھی شمار ہوتا ہے اس کا نام ابوالحسن علی بن جولوغ اور وطن سیستان ہے۔ دولت شاہ[3] سمرقندی لکھتا ہے کہ فرخی ترمذ کا رہنے والا تھا لیکن فرخی کے ذیل کے شعر سے واضح ہوتا ہے کہ فرخی سیستان ہی کا رہنے والا تھا۔

من قیاس از سیستان دارم کہ آن شہر من است
وز پی خویشان ز شہر خویشتن دارم خبر

---

[1] مجمع الفصحا جلد ۱ ص ۳۶۸

[2] تاریخ ادبیات در ایران مؤلفہ ذبیح اللہ صفا جلد ۱ ص ۴۸۳

[3] تذکرۃ الشعرا ص ۳۰

نظامی عروضی سمرقندی لکھتا ہے کہ فرخی امیر خلف بانو کے ہاں ملازم تھا[۱]۔ طبیعت موزوں پائی تھی۔ شعر خوب کہتا تھا۔ چنگ بجانے میں اسے بڑی دسترس تھی۔ قصیدہ کہنے میں اُسے خاص ملکہ حاصل تھا۔ ابوالمظفر امیر چغانیاں کی فیاضیوں کی شہرت سُنی، تو اس کی مدح میں "کاروان حلّہ" کے عنوان سے ایک قصیدہ کہا، اور دربار چغانیاں کا رُخ کیا۔ قصیدہ حسب ذیل ہے :-

با کاروان حلّہ بر فتم ز سیستان — با حلّۂ تنیدہ ز دل بافتہ ز جان
با حلّۂ بریشم ترکیب او سخن — با حلّۂ نگار گر نقش او زبان
ہر تار او بہ رنج بر آوردہ از ضمیر — ہر پود او بجہد جدا کردہ از روان
نہ حلّۂ کہ آب مر اورا رسد گزند — نہ حلّۂ کہ آتش او را بود زیان
نہ رنگ او تباہ کند تربت زمین — نہ نقش او فرو سترد گردش زمان
این حلّہ نیست بافتہ از جنس حلّہ ہا — ایں را تو از قیاس دگر حلّہ ہا مدان
این را زبان نہاد و خرد رشتہ عقل بافت — نقاش بود دست و ضمیر اندران میان
تا نقش کردہ بر سر ہر نقش بر نوشت — مدح ابوالمظفر شاہ چغانیان

نظامی عروضی لکھتا ہے کہ جب فرخی دربار میں پہنچا، تو امیر داغ گاہ میں تھا۔ اس نے یہ قصیدہ ابوالمظفر کے پیش کار عمید اسعد کو سُنایا، جو خود ایک سخن شناس شخص تھا۔ ایک دہقان کی زبان سے اس قدر رواں اور فصیح قصیدہ سن کر اسے سخت تعجب ہوا، تو اس کی آزمائش کرنی چاہی۔ داغ گاہ کا منظر نثر میں سنایا اور کہا اسے نظم کر دو۔ فرخی نے رات کو داغ گاہ کا قصیدہ کہا اور صبح عمید اسعد کو جا سنایا۔ اس کے چند شعر حسب ذیل ہیں۔

---

[۱] چہار مقالہ مرتبہ ڈاکٹر محمد معین ص ۵۷

تا پرند نیلگوں بر روی پوشد مرغزار　　پرنیان ہفت رنگ اندر سر آرد کوہسار
خاک را چون ناف آہو مشک زاید بی قیاس　　بید را چون پر طوطی برگ روید بی شمار
دوش وقت نیمہ شب بوی بہار آورد باد　　حبذا باد شمال و خرما بوی بہار
راست پنداری کہ خلعت ہای رنگین یافتند　　باغ ہای پر نگار و داغ گاہ شہریار
داغ گاہ شہریار اکنوں چنان خرم بود　　کاندرو از نیکوی خیرہ بماند روزگار
سبزہ اندر سبزہ بینی چون سپہر اندر سپہر　　خیمہ اندر خیمہ بینی چون حصار اندر حصار
بر در پردہ سرای خسرو پیروز بخت　　از پی داغ آتشی افروختہ خورشید وار

عمید اسعد فرخی کا یہ قصیدہ سن کر اور بھی متعجب ہوا، اور اسے اپنے ساتھ داغ گاہ میں لے گیا۔ فرخی نے دونوں قصیدے امیر کی خدمت میں پڑھ کر سنائے۔ امیر سخن فہم تھا۔ قصیدوں کی داد دی اور انعام و اکرام بخشا۔

یہاں سے کچھ عرصے بعد فرخی نے سلطان محمود کے دربار کا رُخ کیا اور وہاں بھی اس کی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔

فرخی کا فلسفہ نشاط

فرخی چنگ بجاتا اور شعر گاتا تھا۔ اس کے نزدیک زندگی وہی زندگی ہے جو عشرت میں بسر ہو۔ چنانچہ اس کے اشعار عیش و نشاط اور مادی لذتوں کے ذکر سے بھرپور ہیں۔ وہ ہر وقت حلاوت نو کا طلبگار نظر آتا ہے۔

فسانہ گشت و کہن شد حدیث اسکندر　　سخن نو آر کہ نو را حلاوتی دگر است

نشاط آگین زندگی کا نقشہ کتنے سرور و کیف سے کھینچا ہے۔

شبی گذاشتہ ام دوش خوش بروی نگار　　خوشا شبا کہ مرا دوش بود با رخ یار
نہ شرم آنکہ ز نا دل بلطف نیاید دوست　　نہ بیم آنکہ با آخر تباہ گردد کار
مئی بدست من اندر چو مشکبوئی گلاب　　بتی بہ پیش من اندر چو تازہ روی بہار

چو شب دو پہر گزشت از دو گونہ مست شدیم ۔۔۔ یکی ز بادہ دوم دیگر ز عشق بادگسار

خصوصیات

فرخی کو تشبیب یا غزل کہنے میں کمال حاصل ہے۔ غزل کے اشعار رواں سادہ اور قدرتی احساسات کے حامل ہیں۔ خیالات وسیع تو ہیں، لیکن ان میں گہرائی نہیں۔ عنصری اور فرخی کے قصائد کا موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عنصری کے قصائد میں گہرائی اور متانت ہے اور فرخی کے اشعار میں سادگی اور روانی ہے۔

جیسا کہ ذکر آچکا ہے فرخی اپنے اشعار چنگ و رباب کے ساتھ گایا کرتا تھا اس لیے اس کی موسیقی کا اثر اس کے اشعار میں جھلکتا نظر آتا ہے۔ وہی روح نشاط، وہی خوش آہنگی، جو چنگ و رباب کے تاروں میں ہے، وہی اس کے اشعار میں بھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نغموں کی صدائیں اشعار کے قالب میں ڈھل گئی ہیں۔

فرخی خوش بیان اور ظریف طبع شخص تھا۔ اس لیے موزوں اور متناسب الفاظ لانے میں اسے خاص ملکہ حاصل ہے۔ اس کے شعر سادہ اور الجھنوں سے پاک ہیں۔ بعض اشعار ایسے رواں ہیں کہ اپنی تمام شاعرانہ لطافتوں کے باوجود نثر معلوم ہوتے ہیں۔

فرخی بھی عنصری کی طرح سلطان محمود کی اکثر جنگوں میں ہم رکاب رہتا تھا۔ رزم کا موقع ہوتا، تو اہلِ رزم کے لیے جوش و خروش کا موجب بنتا، بزم کا موقع ہوتا، تو اہلِ نشاط کے لیے جانِ محفل ہوتا۔ اس کی دنیاوی وجاہت کا یہ عالم تھا، کہ بیس زریں کمر غلام اس کے جلو میں ہوتے تھے۔ لیکن یہ حالات زیادہ دیر تک قائم نہ رہے۔ ایک مرتبہ اس کو ایاز کی محفل میں بادہ گساری کا موقع ملا، تو حاسدوں نے محمود کے کان بھرے۔ محمود سخت غضبناک ہوا اور فرخی کو دربار سے نکال باہر کیا۔ فرخی نے معذرت کی، گڑگڑایا، مصاحبوں نے شفاعت الگ کی، جب کہیں معافی ہوئی۔

فرخی کو اکثر جنگوں میں شریک ہونے کا موقع ملتا، اس لیے جو جو منظر اس کی نظروں سے گزرے انھیں بڑی تفصیل سے قصائد میں پیش کیا ہے۔ اور واقعہ نگاری

کا حق ادا کیا ہے۔ اس طرح سلطان کے جشنوں کے رسوم محفلوں کے آداب اور شکار کے مناظر کی پوری پوری عکاسی کی ہے۔

فرخی نے اپنے کلام میں نہایت لطیف اور عمدہ تشبیہوں سے کام لیا ہے۔ خزاں کی تعریف میں ذیل کا قصیدہ لکھا ہے۔

ہنگام خزان است و خزان را بدر اندر | نو نو زبت زریں ہر جائی بہاری است
بنمودہ ہمہ راز دل خویشں جہان را | چون سادہ دلان ہر چہ بباغ اندر باری است
بر دست خنابستہ نہد پای بہر گام | ہر کس کہ تماشا گہ او زیر چناری است
از لاغر و پژمردہ شدہ گونہ تبہ کرد | غم را اگر اندر دل او راہگذاری است
ہر برگی از او گونہ رخسار نژندی است | ہر شاخی از او گونہ انگشت نزاری است
نرگس تکی گشت ہمانا کہ مراد را | در باغ زہر شاخ دگر گونہ نثاری است

آن آمدن ابر گسستہ نگر امروز
گوئی ز کلنگان پراگندہ قطاری است

ان اشعار میں چنار کے گرے ہوئے پتے کو "دست خنابستہ" سے زرد پتی کو مرجھائے ہوئے رخسار سے، ٹہنیوں کو نحیف انگلیوں سے اور بکھرے ہوئے ابر پاروں کو پراگندہ کلنگوں سے تشبیہ دی ہے۔ جن سے مضمون میں بڑی دلفریبی پیدا ہو گئی ہے۔

فرخی سے پہلے مرثیے بہت کم شعرا نے لکھے اور جو لکھے گئے، ان میں سوز و گداز نام کو نہیں۔ فرخی نے محمود غزنوی کی وفات پر جو مرثیہ لکھا ہے، اس میں محب کے سوگوار احساسات کی پوری پوری تصویر موجود ہے۔ اس کے ساتھ طرز ادا اس قدر اثر انگیز ہے کہ پتھر کا دل بھی پسیج جاتا ہے ؎

شہر غزنین نہ ہمان است کہ من دیدم پار | چہ فتاد است کہ امسال دگر گان شدہ کار
گوئیا بینم پر شورش و سر تا سر کوی | ہمہ پر جوشش و ہمہ جوشش از خیل سوار

مہتراں بینیم بہ روی زنان ہمچو زنان   چشم ہا کردہ خون نابہ برنگ گلنار
ملک امثال تو گر باز نیاید ز غزا   دشمنی روی نہاد است درین شہر و دیار
سیر می خوردہ مگر دی کہ نخفتہ است امروز   دیر تنگ خواست مگر رنج رسیدش ز خمار
خیز شاہا! کہ رسولان شہان آمدہ اند   ہدیہ ہا دارند آوردہ فراواں و نثار
کہ تواند؟ کہ برانگیزد ازین خواب ترا   خفتنی خفتنی کز خواب نگردی بیدار
خفتن بسیار ای خواجہ خوی تو نبود   ہیچ کس خفتہ ندیدہ است ترا زین کردار

عبدالعزیز بن منصور عسجدی مروزی
وفات ۴۲۲ھ ہجری مطابق ۱۰۳۰ عیسوی

عبدالعزیز بن منصور نام اور عسجدی تخلص تھا۔ دولت شاہ نے اسے ہروی لکھا ہے، لیکن جامی نے بہارستان میں اور امین احمد رازی نے تذکرہ ہفت اقلیم میں لکھا ہے کہ وہ مرو کا رہنے والا تھا۔ عسجدی محمود کے عہد کے مشہور شعرا میں سے تھا، اس لیے جہاں عنصری اور فرخی کا نام آتا ہے وہاں عسجدی کا نام بھی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ عسجدی صاحب دیوان تھا، لیکن اس کا دیوان آج کل ناپید ہے۔ تذکروں میں اُس کے قصائد کے بعض اشعار ملتے ہیں۔ ایک قصیدہ اس نے فتح سومنات کے موقعہ پر لکھا تھا۔ اس کے چند شعر حسب ذیل ہیں۔

تا شاہ خسرواں سفر سومنات کرد   کردار خویش را علم معجزات کرد
بزدود نام کفر جہان را ز لوح دین   شکر و دعای خویشتن از واجبات کرد
شطرنج ملک باخت ہمی با ہزار شاہ   ہر شاہ را بہ لعب دگر شاہ مات کرد
محمود شہریار کریم آنکہ ملک را   بنیاد بر محامد و بر مکرمات کرد

عسجدی نے ایک قصیدہ صنعت تکرار میں بھی لکھا ہے۔ دو شعر حسب ذیل ہیں:۔

باران قطرہ قطرہ ہمی بارم ابروار   ہر روز خیرہ خیرہ ازین چشم سیل وار

زان قطرہ قطرہ، قطرہ باران خجل نشد　　　زین خیرہ خیرہ خیرہ دلِ من ز ہجرِ یار

ابوالحسن علی بہرامی سرخسی

امین احمد رازی تذکرہ ہفت اقلیم میں بہرامی کو سلطان محمود غزنوی کا ہمعصر لکھتا ہے۔ مؤلف مجمع الفصحا کا بیان ہے کہ وہ ناصر الدین سبکتگین (وفات ۳۸۷ ہجری مطابق ۹۹۷ عیسوی) کا معاصر تھا، اور ۵۰۰ ہجری مطابق ۱۱۰۶ عیسوی میں اس نے وفات پائی۔

بہرامی نے فنِ عروض پر دو کتابیں "غایۃ العروضیین" اور "کنز القافیہ" لکھی ہیں۔ نظم میں کوئی مستقل یادگار باقی نہیں۔ اس کے دو شعر تذکروں میں ملتے ہیں۔

ما ہر دو بتا گل دو رنگیم　　　بنگر بچہ خواہمت صفت کرد
یک نیمۂ آن توئی بسرخی　　　وین نیم دگر منم چنین زرد

ابوالقاسم فردوسی

فردوسی نے جہاں شاہنامہ لکھ کر ایران قدیم کی تاریخ مرتب کی، وہاں اس نے فارسی زبان کو نئی زندگی بھی دی۔ علم، شعر، تاریخ اور اخلاق کے اعتبار سے فردوسی عہدِ غزنویہ کی تمام ادبیات کا محور نظر آتا ہے، اس لیے اگر اسے عہدِ فردوسی کہا جائے، تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ایران کے موجودہ نقاد بھی یہ کہتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں کہ فردوسی نے فارسی زبان و ادب کا پایہ بہت اونچا کیا اور اسے جاودانی حیثیت بخشی۔ ملتِ ایران اس پر ہمیشہ فخر کرے گی۔

حالاتِ زندگی

فردوسی کی کنیت ابوالقاسم ہے۔ اس کے تخلص اور کنیت پر کسی محقق کو اختلاف نہیں، لیکن اس کے نام اور اس کے والد کے نام پر تذکرہ نویسوں میں اختلاف ہے۔ البنداری[1] نے شاہنامہ کے عربی ترجمے میں اس کا نام حسن بن منصور لکھا ہے، لیکن تاریخ گزیدہ میں حسن بن علی، تذکرہ دولت شاہ

---

[1] تالیف ۶۲۰ ہجری

اور آتش کدہ میں حسن بن اسحٰق بن شرف شاہ لکھا ہے۔ پروفیسر براؤن بھی اسی بات پر متفق ہیں کہ اس کا نام حسن بن اسحٰق بن شرف شاہ ہے۔ لیکن فردوسی کے نام اور اس کی ولدیت پر البنداری کا ترجمہ سب سے قدیمی شاہد ہے، جدید نقاد حافظ محمود شیرانی[1] اور شفق بھی اس سے متفق ہیں، اس لیے اس کا نام حسن بن منصور ہی سمجھنا چاہیے۔

نظامی عروضی سمرقندی نے چہار مقالہ میں فردوسی کے حالاتِ زندگی پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ فردوسی علاقہ طوس میں طابران کے قریب ایک گاؤں باژ کا رہنے والا تھا، جہاں اس کے آباؤ اجداد کھیتی باڑی کیا کرتے تھے۔" لیکن تیموری شہزادہ بایسنغر مرزا نے جو شاہنامہ کا مقدمہ لکھا ہے، اس میں فردوسی کے گاؤں کا نام شاداب رقم کیا ہے۔ بہر حال یہ مسلّم ہے کہ فردوسی طوس کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ یہ وہی مردم خیز خطہ ہے، جس نے امام غزالی محقق طوسی اور نظام الملک ایسے نامور عالم پیدا کیے۔

سنِ پیدائش فردوسی کا سنِ پیدائش کسی تذکرہ نویس نے قطعی طور پر نہیں لکھا اور نہ روایات یا اشعار ہی سے اس کا سنِ پیدائش معلوم ہوتا ہے اس لیے اس سلسلے میں قیاس ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

یہ بات حتمی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ شاہنامہ ۴۰۰ ہجری مطابق ۱۰۰۹ عیسوی میں مکمل ہوا، کیونکہ خود فردوسی کی شہادت اس سلسلے میں موجود ہے۔

زہجرت شدہ پنج ہشتاد بار　　　　کہ من گفتم ایں نامۂ نامدار

شاہنامہ کی تکمیل کے متعلق چند اور اشعار حسب ذیل ہیں

چو سال اندر آمد بہ ہفتاد و یک　　　　ہمی زیر شعر اندر آمد فلک

سی و پنج سال از سرای سپنج　　　　بسی رنج بردم بہ امید گنج

---

[1] تنقید بر شعر العجم ۸۵

ان دو اشعار سے پتا چلتا ہے کہ جب فردوسی اکہتر سال کا ہوا، تو اس وقت وہ پینتیس سال کی محنت شاقہ کے بعد شاہنامہ مکمل کر چکا تھا۔ گویا ۴۰۰ ہجری مطابق ۱۰۰۹ عیسوی میں جب شاہنامہ مکمل ہوا، تو اس کی عمر اکہتر سال تھی، اس لحاظ سے اس کی پیدائش ۳۲۹-۳۳۰ ہجری مطابق ۹۴۰-۹۴۱ عیسوی ہوتی ہے۔ اسی سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ فردوسی نے ۳۶۵ ہجری مطابق ۹۷۵ عیسوی میں شاہنامہ لکھنا شروع کیا تھا۔

شاہنامہ کے بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ فردوسی شروع شروع میں طوس میں کھیتی باڑی کا کام کیا کرتا تھا۔ اسے ہر طرح کی آسائش حاصل تھی۔ جوانی بھی اس نے آرام و راحت میں بسر کی۔ وہ طابران کے ایک باغ میں رہتا تھا، جہاں اس کے دوست اس کے پاس آتے جاتے تھے اور بڑے اطمینان سے وقت گزرتا تھا۔ نظامی عروضی[1] لکھتا ہے کہ یہاں وہ بڑی بے فکری سے زندگی بسر کرتا۔ اور شاہنامہ لکھنے میں مصروف رہتا۔ اس کی ایک بیٹی تھی۔ خیال تھا کہ شاہنامے کا کچھ صلہ ملے، تو اس سے وہ بیٹی کا جہیز تیار کرے گا۔ پچیس سال شاہنامہ لکھنے میں مصروف رہا۔ بالآخر شاہنامہ مکمل کیا۔ شاہنامے میں اس نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے کلام کو آسمان علیین تک پہنچا دیا۔"

نظامی عروضی کے بیان سے یہ پتا چلتا ہے کہ فردوسی نے خود ہی شاہنامہ لکھنا شروع کیا تھا اور ظاہر ہے کہ اتنی ضخیم اور اہم کتاب، ذاتی شوق اور امنگ ہی سے لکھی جا سکتی تھی۔

فردوسی کے اشعار سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ جب شاہنامہ مکمل ہو گیا، تو پیری اور ناتوانی نے اسے آلیا۔ حالات بدل گئے۔ خوش حالی کی جگہ افلاس نے لے لی۔ اس لیے

---

[1] چہار مقالہ مرتبہ محمد قزوینی مقالہ دوم ص ۴۷

فردوسی کو یہ خیال آیا کہ محنت کا کچھ صلہ حاصل کرنا چاہیے۔ اسی اثنا میں ایک دوست نے مشورہ دیا کہ شاہنامے کو کسی بادشاہ کے حضور میں پیش کیا جائے، جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے۔

به شهرم یکی مهربان دوست بود | تو گوئی که با من بیک پوست بود
مرا گفت کاین نامه شاهوار | اگر گفته آید به شاهی سپار

چنانچہ فردوسی نے سلطان محمود کی شان میں قصیدہ لکھ کر شاہنامے میں شامل کیا اور دربار غزنی میں رسائی حاصل کی۔

چہار مقالہ کے اس بیان سے وہ تمام روائتیں غلط ثابت ہوتی ہیں، جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محمود نے فردوسی کو شاہنامہ لکھنے کی فرمائش کی تھی اور ایک اشرفی فی شعر دینے کا وعدہ کیا تھا۔

بہر حال دربار غزنویہ میں فردوسی کچھ مدت تک شاہنامہ سنا کر داد و تحسین حاصل کرتا رہا، لیکن جب انعام واکرام کا وقت آیا، تو حاسدوں نے بدگوئی کی، جس کی وجہ سے بادشاہ کا دل مکدر ہو گیا، اور بقول نظامی عروضی بیس ہزار درم دے کر ٹال دیا۔ نظامی عروضی نے یہ بھی لکھا ہے کہ فردوسی اس سلوک سے سخت افسردہ ہوا۔ غسل کرنے کے لیے ایک حمام میں گیا۔ غسل سے فارغ ہو کر باہر آیا، عطار سے ایک شربت کا گلاس پیا اور بادشاہ کا انعام حمامی اور عطار میں تقسیم کر کے غزنی سے نکل گیا۔ اس نے محمود کی ہجو کہی اور سر بمہر کر کے محمود کے غلام ایاز کے پاس بھیج دی۔"

یہ ہجو کا قصہ بھی محل نظر ہے مشہور محقق پروفیسر حافظ محمود شیرانی[1] "تنقید بر شعر العجم" میں لکھتے ہیں۔ "کہا جاتا ہے کہ فردوسی محمود کے دربار سے محروم ہوا اس پر اس نے ہجو کہی۔ لیکن یہ ہجو کسی اصلی بنیاد پر قائم نہیں۔ موجودہ ہجو دیباچہ بائسنغر مرزا کے عہد

---

[1] تنقید بر شعر العجم "فردوسی" صفحہ ۱۱۶

سے چلتی ہے اور دیباچہ نگار زیادہ تر اس کا ذمّے دار ہے۔ ہجو کے اکثر اشعار شاہنامے ہی سے نکالے گئے ہیں۔ گرشاسپ نامہ اور بہمن نامہ سے بھی بعض اشعار حسب ضرورت لیے گئے ہیں کچھ اور نامعلوم ذرائع سے بھی خوشہ چینی کی گئی پھر کہیں اس کالائے وزدیدہ کو مسلسل نظم کی شکل میں ترتیب دیا گیا اور اس طرح سو شعر کی ہجو تیار ہو گئی۔" حافظ محمود شیرانی نے وہ مقامات بھی بتائے ہیں جہاں جہاں سے یہ اشعار لیے گئے ہیں۔

بہرحال فردوسی غزنی سے چل کر ہرات آیا اور ازرقی کے باپ اسمٰعیل وراق کے ہاں چھ ماہ تک مقیم رہا۔ یہاں سے طبرستان کے حکمران سپہبد شہریار ناصر ملک کی خدمت میں آیا۔ جہاں اُس کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔

تلافی

تذکرہ نویسوں[1] کا بیان ہے ایک دفعہ محمود ہندوستان کی مہم سے واپس آ رہا تھا۔ راستے میں کسی ہندوستانی راجہ کا قلعہ تھا۔ محمود نے راجا کو پیغام بھیجا کہ حاضر ہو کر اطاعت بجالائے۔ راجہ کے جواب میں دیر ہوئی تو محمود نے اپنے وزیر حسن میمندی سے کہا: "اگر جواب ہمارے منشا کے موافق نہ ہوا تو؟" حسن میمندی بے ساختہ کہہ اٹھا۔

اگر جز بکام من آید جواب ہمی گرز و میدانِ افراسیاب

محمود نے سنا، تو پوچھا کس کا شعر ہے، اس میں شجاعت اور مردانگی جھلکتی نظر آتی ہے۔" حسن نے کہا یہ شعر اس بدنصیب کا ہے، جس نے پچیس سال محنت کر کے شاہنامہ لکھا، لیکن بارگاہِ غزنویہ سے محروم و نامراد لوٹا۔ محمود نادم ہوا اور کہا۔ "غزنی پہنچ کر یاد دلانا۔" غرض غزنی پہنچ کر حسن میمندی نے محمود کو یاد دلایا اور ساٹھ ہزار اشرفیاں فردوسی کو بھجوا دی گئیں۔ سُوئے اتّفاق دیکھیے کہ ادھر ایک دروازے سے فردوسی کا یہ انعام شہر میں داخل ہوا ادھر دوسرے دروازے سے فردوسی کا جنازہ شہر سے باہر نکل رہا تھا۔ بالآخر محمود کا یہ انعام فردوسی

---

[1] چہار مقالہ نظامی عروضی۔ مرتبہ مرزا محمد قزوینی ص ۸۰

کی بیٹی کو پیش کیا گیا۔ لیکن جس انعام سے باپ محروم رہا تھا، اُسے بیٹی نے قبول کرنا گوارا نہ کیا محمود کو اطلاع ملی، تو اس نے حکم دیا کہ اس رقم سے فردوسی کے نام پر کارواں سرا بنا دی جائے۔

تذکرہ نویسوں کے بیان کے مطابق فردوسی کی وفات ۴۱۱ھ ہجری مطابق ۱۰۲۰ عیسوی میں ہوئی۔

فردوسی کی مایوسی

فردوسی کی مایوسی اور نامرادی پر جب غور کیا جاتا ہے، تو تعجب بھی ہوتا ہے اور افسوس بھی۔ محمود وہ جلیل القدر پادشاہ تھا، جس نے سومنات کی دولت علم و فضل کی اشاعت کے لیے بے دریغ صرف کی، جس نے عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا اور اس میں نادرہ روزگار اشیاء جمع کیں، جس کے دربار میں چار سو شاعر جمع تھے اور اُن پر انعام و اکرام کی بارشیں ہوتی تھیں اور جو ایک مشہور "اغوا کنندہ علما" تھا۔ ایسے بادشاہ کا ہاتھ فردوسی کے مقابلے میں رُکا، اس کی ضرور کچھ وجوہ ہوں گی۔

دولت شاہ[1] سمرقندی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ دربار کے اکثر شعرا ایاز کی مدحت سرائی کیا کرتے تھے، لیکن فردوسی نے ایاز کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ چنانچہ اس نے بھی فردوسی کے متعلق کبھی کوئی کلمہ خیر نہ کہا، اور کہا تو یہ کہا کہ یہ رافضی اور معتزلی ہے اور کسی بڑے انعام کا مستحق نہیں۔ اس کے اعتزال کی دلیل میں اس کا ایک شعر پیش کیا جاتا تھا۔

به بینندگان آفریننده را   نه بینی مرنجان دو بیننده را

اس کے شیعہ ہونے کی دلیل میں ذیل کے شعر پیش کیے گئے۔

اگر خلد خواہی بہ دیگر سرای   بنزد نبی و وصی گیر جای

بدین زادم و ہم بر این بگذرم   چنان دان کہ خاک پی حیدرم

---

[1] تذکرۃ الشعرا ص ۲۸

چنانچہ فردوسی نے اپنے کلام میں حاسدوں کی بدگوئی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

حسد برد بدگوی در کار من　　تبہ شد بر شاہ بازار من

مرا غمز کردند کاں پر سخن　　بمہر علی و نبی شد کہن

۲- دوسری بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ محمود کی نظروں میں شاہنامے کی زیادہ اہمیت نہ تھی۔ اہمیت ہو بھی کیسے سکتی تھی، کیونکہ اس کتاب میں ایران قدیم کے جلیل القدر بادشاہوں کا بیان ہے، اور قدیم تمدن کی عظمت کا ذکر ہے۔ محمود کو بھلا ایران کے اس سرمایۂ فخر و ناز سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

۳- شاہنامے میں حسب نسب کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ لیکن محمود کسی عالی نسب خاندان سے تعلق نہ رکھتا تھا، اس لیے حسب نسب کی فضیلت کا ذکر اسے کمتری کا احساس دلاتا تھا۔

۴- تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ فردوسی کے شیعہ ہونے کی وجہ سے محمود نے اسے نظر انداز کر دیا۔ لیکن یہ وجہ کچھ معقول نظر نہیں آتی۔ محمود، جسے "اغواکنندہ علما" کہا جاتا ہے، علما کی بڑی قدر و منزلت کرتا تھا۔ ابوریحان البیرونی شیعہ ہی تھا، لیکن اسے دربار خوارزم سے دعوت دے کر بلایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ کئی عیسائی، یہودی اور ہندو بھی دربار محمود میں موجود تھے، جن کی قدر و منزلت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جاتی تھی۔

۵- شاہنامے کے دیباچے میں، جو آخری تیموری شاہزادہ بایسنغر میرزا نے لکھوایا تھا اس میں ایک وجہ یہ بھی لکھی گئی ہے، کہ سلطان محمود کو دیلمی خاندان سے سخت نفرت تھی، اس خاندان کا حکمران فخر الدولہ تھا جس کے دل میں فردوسی کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ فردوسی شاہنامے کے بعض حصے لکھ کر فخر الدولہ کے پاس بھیجا کرتا تھا، اور وہ فردوسی کو صلے میں تحفے تحائف بھیجتا تھا۔ یہ بات محمود کو سخت ناگوار تھی۔

بہر حال وجہ کوئی بھی ہو، فردوسی کو اس بے مثال کارنامے کا کچھ صلہ نہ ملا، اور محمود

کے دامن پر ایسا بڑا دھبہ لگ گیا، جو شاید ہمیشہ تک قائم رہے۔

فردوسی کی وطن پرستی فردوسی کا مقام دربارِ غزنویہ کے دوسرے شعرا سے مختلف ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ فردوسی سے علم وفضل میں کم مرتبہ تھے، ان کے ادبی کارناموں سے بھی فارسی ادب میں نمایاں ترقی ہوئی، لیکن فردوسی اپنے اندازِ فکر اور زاویۂ نگاہ سے ان سب سے مختلف ہے۔ دوسرے شعرا ایرانی النسل تو تھے اور شاعر بھی تھے، لیکن ان کی شاعری دربارِ محمود تک محدود تھی۔ اُن کے برعکس فردوسی کے پیشِ نظر نہ محمود تھا، نہ غزنی اور نہ ہندوستان، بلکہ اس کے پیشِ نظر ایران تھا۔ اس نے جو کچھ لکھا، ایران کے عشق میں سرشار ہوکر لکھا۔

فردوسی انتہا درجے کا وطن پرست ہے، اسے اپنے بزرگوں کی سرزمین سے عشق ہے۔ جہاں کہیں ایران کی کسی شکست کا ذکر آتا ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ زخم خوردہ دل کی صدائیں ہیں، جو مجسم ہوکر شعر بن گئی ہیں۔

ہاماوران کی جنگ اور افراسیاب کے حملے کے وقت کہتا ہے۔

دریغ است ایران کہ ویران شود — کنام پلنگان و شیران شود
ہمہ جائی جنگی سواران بدی — نشستنگہ شہریاران بدی
کنون جای سختی وجائی بلاست — نشستنگہ تیز چنگ اژدھاست

عربوں کے ایران پر حملے کا ذکر کرتا ہے، تو اس وقت فردوسی کی رگ و پے سے نفرت کے فوارے گرتے نظر آتے ہیں۔ اور وہ پکار اٹھتا ہے۔

ز شیر شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائی رسید است کار
کہ تاج کیان را کنند آرزو — تفو بر تو ای چرخ گردان تفو

حملہ آور عرب تھے، جنہوں نے اگر ایران کے قدیمی تمدن کو مٹایا، تو اس کے عوض اُسے ایک نئے اسلامی تمدن کی دولت بخشی۔ عربوں کی وجہ سے اگر آتش کدوں کی آگ سرد

ہوئی، تو وہیں سے اسلام کے چشمے پھوٹ نکلے، لیکن فردوسی اسلام کا پیرو ہونے کے باوجود یہ سب کچھ بھول جاتا ہے، اور وطن کی شیفتگی، اس کی مذہبی عقیدت پر غالب آجاتی ہے۔

ایران قدیم میں شاہنامہ نویسی

ایران میں قدیم زمانے سے بادشاہوں کے اوصاف و واقعات لکھنے کا رواج چلا آتا تھا۔ قدیم زمانے کی ایک کتاب "خدائی نامہ" ہے، جو شاہنامے کی طرز پر لکھی گئی تھی۔ یہ پہلوی زبان میں ساسانی عہد کی عظیم یادگار ہے۔ اس کا ترجمہ ابن مقفع نے "تاریخ ملوک الفرس" کے نام سے عربی میں کیا۔ اصل کتاب اور اس کا ترجمہ اسلامی عہد کے شروع میں ملتے تھے، لیکن آج کل ناپید ہیں۔ اسی قسم کی اور کتابیں "کارنامک اردشیر بابکان" اور "یادگار زریران" بھی پہلوی میں موجود تھیں۔ "یادگار زریران" کو "شاہنامہ گشتاسپ" بھی کہا جاتا تھا۔ اس میں اردشیر اور اس کے بیٹے شاہ پور کی فتوحات، گشتاسپ کے دین زرتشتی قبول کرنے اور ارجاسپ کے ساتھ جنگ کرنے کا ذکر ہے۔

شاہنامہ کے مآخذ

شاہنامہ کے تاریخی مواد کے سلسلے میں شفق[1] لکھتے ہیں "شاہنامہ کا قدیمی مآخذ "اوستا" اور اوستا سے متعلقہ کتابیں مثلاً "بندہشن" اور "دین کرت" وغیرہ ہیں۔ یزدان اور اہرمن کا ذکر، زرتشت سے متعلقہ روایات، تخلیق کائنات کی داستان، کیومرث اور کیانی بادشاہوں کی حکایات، جمشید و فریدون کے قصے سب اوستا سے ماخوذ ہیں۔" ان کے علاوہ عربی زبان کی وہ کتابیں بھی شاہنامہ کا ماخذ ہیں، جو پہلوی سے عربی میں ترجمہ ہو چکی تھیں۔ مثلاً سیر الملوک عبداللہ بن مقفع، سیر الملوک محمد بن جہم البرمکی، سیر الملوک ہشام بن القاسم، سیر الملوک بہرام شاہ بن مردان شاہ، سیر الملوک بہرام اصفہانی۔ ابو ریحان البیرونی نے آثار الباقیہ لکھتے

---

[1] تاریخ ادبیات ایران ص ۸۳

ہوئے متذکرہ کتابوں ہی سے استفادہ کیا تھا جس کا اعتراف اس نے دیباچے میں کیا ہے۔
ظاہر ہے کہ یہ تاریخی کتابیں فردوسی کی نظر سے بھی گزری ہوں گی۔ ان کے علاوہ سامانی دور
کے حکمرانوں نے داد و دہش سے علما کو اس بات پر آمادہ کیا تھا، کہ ملکی زبان فارسی میں اپنی
تصانیف پیش کریں، چنانچہ فردوسی سے پہلے فارسی نظم و نثر میں ذیل کی کتابیں تالیف ہو
چکی تھیں۔

۱۔ "شاہنامہ مسعودی مروزی" چوتھی صدی ہجری کے شروع میں لکھا گیا یہ شاہنامہ
نظم میں تھا۔

۲۔ شاہنامہ ابوالمویدبلخی" اسی زمانے میں نثر میں لکھا گیا

۳۔ ایک شاہنامہ ابوعلی بلخی کے نام سے بھی منسوب ہے۔

۴۔ شاہنامہ ابومنصوری" ابومنصور محمد بن عبدالرزاق کے حکم سے لکھا گیا، جو چوتھی صدی
ہجری میں حاکم طوس تھا۔

۵۔ دقیقی بھی شاہنامہ کے ایک ہزار شعر لکھ کر فردوسی کے لیے زمین تیار کر چکا تھا۔
یہ سب کتابیں سامانی حکمرانوں کے کتب خانوں میں موجود تھیں۔ قیاس غالب
ہے کہ یہ فردوسی کی نظر سے گزری ہوں گی، جیسے کہ وہ خود بھی کہتا ہے۔

بپیچید سر ہیچ بر ہم بپی نامہ خواندم ز گفتار تازی و از پہلوانی[1]

پروفیسر براؤن[2] شاہنامہ کے ماخذوں میں سے "کارنامک اردشیر پابکان کا
ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "جب اس کتاب کا شاہنامہ سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو معلوم
ہوتا ہے۔ کہ فردوسی نے اس کا پورا پورا تتبع کیا ہے۔ یہ دیکھ کر اس کی اہمیت ہماری نظر
میں اور بڑھ جاتی ہے۔ کہ جن کتابوں کو پیش نظر رکھ کر اس نے شاہنامہ لکھا ہے، ان کے

---

[1] پہلوی [2] لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد ۱ ص ۱۲۲

ساتھ شاہنامے کی ترتیب و ادوار مطابقت پائی جاتی ہے۔"

شاہنامے کی تاریخی اہمیت

ادبیات ایران کی اس مختصر سی تاریخ میں اس قدر گنجائش نہیں کہ شاہنامے کی تاریخی اہمیت پر مفصل بحث کی جاسکے۔ البتہ اس قدر بیان کر دینا ضروری ہے کہ شاہنامے میں بعض فوق العادہ واقعات کا ذکر آتا ہے، مثلاً طہمورث کا دیوؤں پر غلبہ پانا اور ان سے تیس زبانیں سیکھنا۔ جمشید کا دیوؤں سے محل تعمیر کرانا، ضحاک کے کندھوں سے سانپوں کا ابھرنا۔ زال کا سیمرغ کی آغوش میں تربیت پانا وغیرہم۔ ان غیر حقیقی واقعات کی وجہ سے بسا اوقات شاہنامے پر حرف گیری کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ قدیم زمانے میں ایران کی کوئی مستند تاریخ موجود نہ تھی۔ "اوستا"، "خدای نامک"، "یادگار زریران" اور "کارنامک اردشیر پاپکان" ایسی کتابیں ضرور دستیاب ہوتی تھیں۔ ان کتابوں میں قدیمی بادشاہوں کے حالات و واقعات درج تھے اور متعدد فوق العادہ اور غیر حقیقی باتیں ان سے منسوب کی جاتی تھیں۔ فردوسی کو شاہنامے کی تیاری میں جو تاریخی مواد میسر آیا، جسے اس نے جوں کا توں نظم کر دیا۔

ملکم اپنی "تاریخ ایران" میں لکھتا ہے کہ "شاہنامے میں اگرچہ شاعرانہ اور افسانوی رنگ غالب ہے، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ایران و توران بلکہ ایشیا بھر میں جو تاریخی مواد دستیاب ہوا، اس کو فردوسی نے نظم کر دیا۔"

اگر بعض فوق العادہ واقعات کی وجہ سے ساری تاریخ کو ناقابل اعتبار سمجھا جاسکتا ہے، تو شاید کسی قدیمی قوم کی تاریخ اعتبار کے معیار پر پوری نہیں اتر سکے گی۔ اس قسم کے اعتراضات صرف شاہنامے پر ہی نہیں، بلکہ تمام متمدن اقوام کی قدیمی تاریخوں پر بھی ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ زال کا سیمرغ کے پاس تربیت پانا، پاریس یونانی پسر پریاموس کی یاد دلاتا ہے۔ اسفندیار کا روئیں تن ہونا، اخیلس یونانی کی مثال پیش کرتا ہے۔ ہفت خوان رستم، ہرکلس کے دوازدہ خوان

سے مشابہہ معلوم ہوتے ہیں۔

اس قسم کی غیر حقیقی روایات زمانہ قدیم کے لوگوں کے اندازِ فکر اور قوتِ تخیل کا پتہ دیتی ہیں۔ غالباً قوتِ تخیل کی بدولت ہی قوموں کی ابتدائی تاریخ میں فوق العادہ واقعات کی رنگ آمیزی ہوتی رہی ہے۔

اہلِ یورپ کے اعتراضات

شاہنامے پر اہلِ یورپ کا ایک اعتراض یہ ہے، کہ ساٹھ ہزار اشعار کی یہ طویل کتاب ایک ہی بحر میں لکھی گئی ہے، جسے پڑھتے پڑھتے طبیعت اکتا جاتی ہے۔ اہلِ یورپ کے نزدیک ممکن ہے یہ صحیح ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ طبیعت کو اکتا دینے والی چیز بحر کی یکسانیت نہیں بلکہ مطالب کی یکسانیت ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے شاہنامے کا دامن اس عیب سے پاک ہے۔ اس میں ہر طرح کے مطالب نظر آتے ہیں جو پوری پوری شاعرانہ دلآویزی کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں اور یوں بھی رزمیہ شاعری کے مزاج کے موافق صرف ایک ہی بحر متقارب ہے، جس میں مثنوی لکھی گئی ہے۔

دوسرا اعتراض اہلِ یورپ کو یہ ہے کہ شاہنامہ محض ایک رزمیہ داستان ہے۔ شروع سے آخر تک یہ کتاب پہلوانوں کی دلیری، اور بہادری کی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ ہر پہلوان للکارتا ہوا اور گرز ہوا میں لہراتا ہوا آتا ہے۔ اور بہادری کے جوہر دکھاتا ہوا حریف پر فتح پا لیتا ہے، یا خود میدان کارزار کی نذر ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ کہنا بھی صحیح نہیں، کیونکہ انہی داستانوں میں توحید، فلسفہ، تاریخ، معاشرت اور اخلاق و تمدن کے بھی مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

مثلاً اللہ تعالیٰ کی حمد اور عقل و خرد کے بیان میں فردوسی لکھتا ہے:-

بنام خداوند جان و خرد	کزین برتر اندیشہ برنگذرد
خداوند نام و خداوند جای	خداوند روزی دہ و رہنمای
خداوند کیوان و گردان سپہر	فروزندۂ ماہ و ناہید و مہر

زنام و نشان و گمان برتر است | نگارندۂ بر شدہ گوہر است
نیابد بدو نیز اندیشہ راہ | کہ او برتر از نام و از جایگاہ
سخن ہر چہ زین گوہران بگزرد | نیابد بدو راہ جان و خرد
ستودن نداند کس او را چو ہست | میان بندگی را ببایدت بست

اِن اشعار سے فردوسی کے عقیدۂ توحید کا پتہ چلتا ہے۔ فردوسی کو یہ بھی یقین ہے کہ فلسفیانہ موشگافیوں سے ذاتِ خداوندی کی حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی، نہ اس کی خاطر خواہ تعریف و توصیف ہو سکتی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ انسان اطاعتِ خداوندی پر کمر بستہ ہو جائے۔

ایمان کے بعد عقل و خرد کا مقام ہے۔ عقل ہی شاہوں کا تاج ہے، اور عقل ہی ناموروں کا زیور، عقل ہی سے زندگی جاودان حاصل ہوتی ہے

خرد افسر شہر یاران بود | خرد زیور نامداران بود
خرد زندۂ جاودانی شناس | خرد مایۂ زندگانی شناس
خرد رہنمائی و خرد دلکشای | خرد دست گیرد بہر دو سرای
ازو شادمانی وزو مردمی است | ازویت فزونی وزویت کمی است

اخلاق و تہذیب کے مسائل کچھ اس طور سے بیان کیے ہیں کہ اس زمانے کی تہذیب و تمدن کا پورا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ بادشاہوں کے دربار کیوں کر لگتے تھے، عوام کے آداب بجالانے کے طور طریق کیا تھے، زمینداری کے لیے کیا قواعد تھے، لگان کیسے مقرر کیا جاتا تھا۔ تجارت کون لوگ کرتے تھے، تعلیم کا طریق کار کیا تھا، کون لوگ اس سے مستفید ہو سکتے تھے، شادی بیاہ کی رسوم کیا تھیں، آداب شکار کیا تھے، محفلیں کیسے برپا ہوتی تھیں، نامہ و پیام کے طریق کیا تھے۔ امراء اور عوام کے لباس کس قسم کے تھے۔
کیا ان مسائل کا مطالعہ کر لینے کے بعد شاہنامہ کو محض ایک رزمیہ داستان کہنا مناسب ہے۔

شاہنامے کی ترتیب

شاہنامہ خداوند تعالیٰ کی تعریف و ثنا سے شروع ہوتا ہے، اس کے بعد عقل و دانش کا بیان ہے۔ پھر رسول اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ کا ذکر ہے۔ اس کے بعد شاہنامہ کے مواد فراہم کرنے کا حال بیان کیا ہے۔ تاریخ ایران کیومرث کے ذکر سے شروع ہوتی ہے، جو ایران کا اوّلین بادشاہ ہے۔ اختتام تک پچاس بادشاہوں کی سرگزشت بیان کی ہے۔ شاہنامے کا خاتمہ ساسانی دور کے آخری بادشاہ یزدجرد اور عربوں کی فتح پر ہوتا ہے۔

شاہنامہ کے حالات و واقعات

شاہنامے کی پچاس فصلیں ہیں، ہر فصل میں ایک بادشاہ کا حال لکھا گیا ہے۔ سب سے پہلے پیش دادی خاندان کا ذکر ہے۔ اس باب کا آغاز بادشاہ کیومرث سے ہوتا ہے۔ جو ایران کا ابوالاباء یعنی آدم سمجھا جاتا ہے۔ کیومرث کے بعد ہوشنگ اور طہمورث اس کے جانشین ہوتے ہیں جنھوں نے ایران کے تمدن قدیم کی بنیاد رکھی۔ اسی خاندان کا ایک نامور بادشاہ جمشید تھا جس نے پرسی پوس شہر بسایا، جو آج تک قائم ہے اور "تخت جمشید" کے نام سے موسوم ہے۔ ایران کا قدیمی کیلنڈر، شراب کی دریافت اور جام جم اس کی نشانیاں یادگار ہیں۔

ایسا وقت بھی آیا کہ جمشید اپنی سلطنت پر بہت مغرور ہوگیا۔ وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ آخر ایک شامی حکمران ضحاک ایران پر حملہ آور ہوا۔ اس لڑائی میں جمشید کو شکست ہوئی اور ضحاک کے ہاتھوں مارا گیا۔ ضحاک ظالم بادشاہ تھا۔ اس کے ظلم و ستم کی داستانیں اب تک زبان زد عوام ہیں۔ آخر کاوہ لوہار نے اس کے ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھائی اور اپنی دھونکنی پر موٹی ٹانگ کر اسے ہوا میں لہرایا، اور اپنے ہم وطنوں کو خطاب کر کے کہا: یہ ایران کی آزادی کا علم ہے، جو لوگ غیر ملکی حکمران کی غلامی سے رہائی حاصل کرنا چاہتے ہیں، وہ اس علم کے نیچے جمع ہو جائیں۔ ضحاک کے خلاف آزادی کی یہ تحریک کامیاب

ہوئی۔ ضحاک گرفتار ہوا اور اسے کوہ البرز کی غار میں ڈال دیا گیا۔ کاوہ کی دھونکنی کے چمڑے نے ایران کے قومی جھنڈے یعنی درفش کاویانی کی حیثیت اختیار کی۔ پیشدادی شہزادہ فریدوں کو جو اب تک روپوش تھا، تخت حکومت پہ بٹھایا گیا۔

فریدوں کے تین بیٹے تھے، جن کے نام سلم، تور اور ایرج ہیں۔ فریدوں نے اپنی زندگی میں مملکت کے بعض علاقے اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیئے۔ سب سے چھوٹے ایرج کو ایران کا علاقہ ملا۔ سلم اور تور نے اس خیال سے کہ مملکت کا بہترین حصہ جو ان کو ملنا چاہیے تھا، وہ ایرج کو ملا ہے، اس کے خلاف سازش کی اور اسے ہلاک کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

ایرج کی وفات کے بعد اس کے ہاں منوچہر پیدا ہوا۔ منوچہر سن بلوغ کو پہنچا تو اس نے اپنے دونوں چچاؤں کے خلاف لشکر کشی کر کے ان پر فتح پائی اور ان کے سر کاٹ کر اپنے دادا فریدوں کے پاس بھیج دیئے۔ فریدوں اس واقعے کے فوراً بعد اپنے پوتے منوچہر کے حق میں دستبردار ہو گیا۔

منوچہر کے عہد میں مشہور پہلوان سام پیدا ہوا۔ پھر زال اور زال کے بعد مشہور آفاق پہلوان رستم کا ظہور ہوا، جو ایرانی فوج کا سپہ سالار تھا۔ منوچہر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا نوذر تخت نشین ہوا لیکن یہ اپنی سات سالہ حکومت کے بعد توران کے بادشاہ افراسیاب کے ہاتھوں مارا گیا۔ یہ حادثہ ایران اور توران کے بادشاہوں میں لڑائیوں کے ایک طویل سلسلے کا موجب بنا۔

پیشدادی خاندان کے بعد کیانی بادشاہوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس سلسلے کے مشہور بادشاہ کیقاوس، کیخسرو اور کیقباد ہیں۔ شاہنامہ کا اہم ترین باب کیانی بادشاہ کیکاؤس سے متعلق ہے۔ اس عہد میں رستم کے ہاتھوں عجیب غریب واقعات ظہور میں آتے ہیں۔ کیکاؤس مازندران میں دیو سپید کے ہاتھوں اسیر ہو جاتا ہے۔ رستم

اسے چھڑانے کے لیے سات منزلیں طے کرتا ہے، جو "ہفت خوان" رستم کے نام سے مشہور ہیں۔ ہر منزل میں اسے فوق العادہ خطرے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہر مہم کو سر کرکے رستم جشن مناتا ہے۔ جو "خوان" کے نام سے موسوم ہے۔ آخر ان ساتوں منزلوں کو طے کرکے رستم منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے اور دیو سپید کو ہلاک کر کے بادشاہ کیقاؤس کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اسی عہد میں دنیا کا ایک بہت بڑا المیہ وقوع پذیر ہوتا ہے، یعنی رستم کا بیٹا سہراب خود رستم کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔

کیقاؤس کا بیٹا سیاؤش کسی وجہ سے ناراض ہو کر ترک وطن کر دیتا ہے اور توران میں آکر پناہ لیتا ہے، وہاں وہ کسی سبب سے مارا جاتا ہے۔ اس سے ایران اور توران کی جنگ تیز تر ہو جاتی ہے۔ آخر کار توران کا بادشاہ افراسیاب ایران کے شہنشاہ کیخسرو کے ہاتھوں گرفتار ہو کر مارا جاتا ہے۔ اس عہد کی داستانوں میں بیژن و منیژہ کے عشق کا قصہ بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی عہد میں زرتشت کا ظہور ہوتا ہے۔ گشتاسپ بادشاہ اس کے پیش کیے ہوئے دین کو قبول کر لیتا ہے۔ اسی عہد میں رستم جہان فانی کو خیر باد کہہ جاتا ہے۔ پھر شہنشاہ دارا کا ذکر آتا ہے۔ دارا اسکندر یونانی سے شکست کھاتا ہے اور کیانی عہد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد مختصر سا ذکر اشکانی عہد کا ہے۔ اشکانیوں کے بعد ساسانیوں کا عہد شروع ہوتا ہے۔ جس کا بانی اردشیر بابکان تھا۔ اس عہد سے ایران کی باقاعدہ تاریخ شروع ہوتی ہے، عہد ساسانیہ کے حالات و واقعات تاریخ ایران سے موافقت رکھتے ہیں۔ یہ باب قدرے تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ شاہنامے کا تقریباً تیسرا حصہ اسی عہد پر مشتمل ہے۔ ایران کی یہ ملی داستان بالآخر ساسانی عہد کے آخری تاجدار یزدجرد پر ختم ہو جاتی ہے۔

شاہنامے کی ادبی اہمیت

عربوں کی فتح کے بعد رفتہ رفتہ عربی زبان طول و عرض ایران میں رائج ہو گئی، اور ایران کی اپنی زبان قصۂ ماضی بن کر رہ گئی۔ آخر جب خلافتِ عباسیہ میں ملکی حکومتیں قائم ہوئیں، تو فارسی زبان کا بھی احیا ہوا۔ فردوسی نے اس دور میں خالص وطنی نقطۂ نظر سے ملکی تاریخ شاہنامے کی صورت میں مرتب کی اور اس طرح ایران کی زبان اور قومی تاریخ دونوں کو ایک نئی زندگی بخشی۔

عربوں کے عہدِ خلافت میں جو فارسی لکھی جاتی تھی، اس میں بیشتر الفاظ عربی کے ہوتے تھے۔ فردوسی کے نزدیک غالباً ایسے الفاظ عرب غلبے کا نشان تھے۔ اس لیے اُس نے کوشش کی کہ ان الفاظ سے اجتناب کرے۔ چنانچہ اس نے عربی کے الفاظ وہیں استعمال کیے ہیں، جہاں اُن کا استعمال ناگزیر ہے۔ گویا فردوسی نے فارسی زبان کو سہل رواں اور خالص ملکی زبان کی صورت میں پیش کر کے آنے والے ادیبوں کے لیے ایک نئی شاہراہ کھول دی۔ ذیل کے اشعار آغازِ آفرینش اور عناصر کی ترتیب کے متعلق ہیں۔ اِن سے پتہ چلتا ہے کہ فردوسی نے کس طرح عربی کے الفاظ دانستہ چھوڑ کر فارسی کے الفاظ استعمال کیے ہیں:۔

از آغاز باید کہ دانی درست	سرمایۂ گوہران از نخست
کہ یزداں ز ناچیز چیز آفرید	بدان تا توانائی آمد پدید
وز و مایۂ گوہر آمد چہار	برآوردہ بی رنج و بی روزگار
نخستین کہ آتش ز جنبش دمید	ز گرمیش پس خشکی آمد پدید
چو این چار گوہر بجای آمدند	ز بہر سپنجی سرای آمدند
گیا رست، با چند گونہ درخت	بزیر اندر آمد سران شان ز بخت
نگہ کن برین گنبد تیز گرد	کہ درمان ازویست و زویست درد

نہ گشت زمانہ بفرسایدش | نہ این رنج و تیمار بگزایدش
نہ از گردش آرام گیرد ہمی | نہ چون ما تباہی پذیرد ہمی

ان اشعار کا موضوع فلسفیانہ ہے۔ اس دقیق موضوع کے لیے ڈھونڈ ڈھونڈ کر فارسی کے الفاظ استعمال کیے ہیں، اگرچہ ان کے مرادف عربی کے الفاظ بھی عام فہم تھے۔

فارسی	عربی	فارسی	عربی
سرمایہ	مادہ	نخست	اوّل
گوہر	عنصر	جنبش	حرکت
آرام	سکون	نیرو	طاقت
گشت	دوران	پوئندہ	متحرک
تباہی	فنا	فرسودن	تغیّر

شاہنامے کے مطالب

شاہنامہ یوں تو ایک رزمیہ مثنوی ہی ہے، لیکن اس میں جنگ و پیکار کے علاوہ مطالب کا اتنا تنوع موجود ہے کہ ہر شخص اپنے ذوق کے موافق سامان مہیا پاتا ہے۔ شاہنامے کے بعض اہم مطالب ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کی تعریف و ثنا اور عقل و خرد کی ستائش، جو بہترین عطیہ خداوندی ہے۔ اس کی مثال پہلے آچکی ہے۔

۲۔ دلیری اور بہادری کی داستانیں۔ فردوسی میدان کارزار میں پہلوانوں کی زور آزمائی کا ذکر کرتا ہے، تو ضمناً پڑھنے والوں کے دلوں میں وطن پرستی کی حس کو بھی بیدار کرتا ہے۔

چو ایران نباشد تن من مباد | چنین دارم از موبد پاک یاد
کہ چون برکشد از زمین بیخ سرو | سزد گر گیا را نبوید تذرو

چنیں گفت موبد کہ مردن بنام   بہ از زندہ دشمن بدو شادکام
بگو تا نترسی تو از مرگ، چیز   کہ کس بی زمانہ نمردہ است نیز
دگرگشت خواہد ترا روزگار   چہ نیکوتر از مرگ در کارزار
چنیں گفت مر جفت را نرہ شیر   کہ فرزند ما گر نباشد دلیر
ببریم ازو مہر و پیوند پاک   پدرش آب دریا و مادرش خاک

۳ - ایران کی تاریخ اور ملی افسانے فردوسی نے بڑی امانت داری سے نظم کیے ہیں - ان میں کسی قسم کا تصرف نہیں کیا - اس سلسلے میں جو حکایتیں درج کی ہیں، ان کے راویوں تک کے نام بتائے ہیں - اس نے محض داستان سرائی نہیں کی، بلکہ حقائق و روایات میں شاعرانہ رنگ آمیزی کرکے انھیں بہت دلکش بنا دیا ہے۔

۴ - پند و نصائح :- بادشاہوں، وزیروں، پہلوانوں اور والدین نے اپنے لواحقین کو جو آخر عمر میں نصیحتیں کی ہیں - انھیں شاعرانہ رنگینی اور فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ذیل کے قطعات انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مشعلِ راہ کا کام دے سکتے ہیں۔

بیا تا جہان را بہ بد نسپریم   بکوشش ہمہ دست نیکی بریم
نباشد ہمی نیک و بد پایدار   ہماں بہ کہ نیکی بود یادگار
ہماں گنج دینار و کاخ بلند   نخواہد بدن مر ترا سودمند
سخن ماند از تو ہمی یادگار   سخن را چنیں خوار مایہ مدار
فریدون فرخ فرشتہ نبود   بمشک و بعنبر سرشتہ نبود
بداد و دہش یافت آں نیکوی   تو داد و دہش کن فریدون توی

میازار موری کہ دانہ کش است   کہ جان دارد و جان شیریں خوش است
سیاہ اندروں باشد و سنگ دل   کہ خواہد کہ موری شود تنگ دل

بسازد وکند شیر ہموارہ کار — ہر آنجاکہ او شد بباید شکار
ز امروز کاری بفردا ممان — کہ داند کہ فردا چہ گردد زمان
گلستان کہ امروز گردد بہار — تو فردا چینی گل نیاید بکار

۵۔ فلسفیانہ رموز۔ شاہنامہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ آشوب و خونریزی کی داستان ہے۔ فردوسی رزم گاہ کی کیفیت بیان کر کے شاعرانہ فرض تو انجام دے دیتا ہے، لیکن یہ بیان اس کے نازک اور بے آزار دل پر رقت بھی طاری کر دیتا ہے اور وہ بے ثباتی دنیا پر زوردار وعظ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

ببازی گری ماند این چرخ مست — کہ بازی نماید بہفتاد دست
زمانی ببادو زمانی بہ میغ — زمانی بہ خنجر زمانی بہ تیغ
زمانی دہد تخت و تاج و کلاہ — زمانی غم و خواری و بند و چاہ

یہ فلک کج رفتار بازی گر کی مانند ہے۔ بازی گر بھی ایسا کہ ایک ہاتھ سے نہیں ستر ہاتھوں سے شعبدہ بازی کرتا ہے۔ کبھی ہواؤں کا طوفان پیدا کرتا ہے، کبھی بادل لاتا ہے، کبھی خنجر دکھاتا ہے، کبھی تلوار چلاتا ہے، کبھی تخت و تاج اور کلاہ سروری دیتا ہے، کبھی ذلیل و خوار کرتا اور کبھی قید و بند میں لا ڈالتا ہے۔

ہمان نام بہتر کہ ماند بلند — کہ مرگ افگند سوی ما ہم کمند
زمانہ بمردن بکشتن یکی است — وفا با سپہر روان اندکی است

گردشِ دوران ہمیشہ کسی کے موافق نہیں ہوتی۔ موت سے سب کو سابقہ پڑتا ہے، آخر یہ ہم پر بھی کمند پھینکے گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ اس چند روزہ زندگی میں نیکی اور فدا کاری اپنی یادگار چھوڑ جائیں۔

فردوسی ظلم و ستم کو انسانی کوتاہی کی دلیل سمجھتا ہے۔ وہ شہنشاہ کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ انسانی زندگی اس لیے نہیں کہ ذرا ذرا سے اختلاف پر خون بہانے

جو لوگ بات بات پر مرنے مارنے کو تیار ہو جاتے ہیں، وہ سخت حیران ہیں

ابر شاہ زشت است خون ریختن — باندک سخن دل برا نگیختن

ہمان چون سبک سر شدہ شہریار — بی اندیشہ دست اندر آرد بکار

ایک طرف فردوسی ہمیں اہل گرز و شمشیر کے رزمیہ جوہر دکھاتا ہے۔ دوسری طرف ٹوٹے ہوئے پلوں، ویران گھروں، یتیم بچوں اور بیواؤں کی طرف بھی ہمیں توجہ دلاتا ہے کچھ اور آگے بڑھ کر ہمیں ان شہروں کا نقشہ بھی دکھاتا ہے، جنھوں نے اب کھنڈرات کی صورت اختیار کر لی ہے اور اب وہ شیروں اور چیتوں کی آرام گاہ بنے ہوئے ہیں۔ ہمیں وہ ان کنوؤں کی طرف بھی لے جاتا ہے جو سالہا سال سے بے آب پڑے ہیں۔

نگہ کن رباطی کہ ویران بود — یکی کان نہز دیک ایران بود

دگر کودکانی کہ بی مادر اند — زنانی کہ بی شو و بی چادر اند

نگہ کن بہ شہری کہ ویران شد است — کنام پلنگان و شیران شد است

دگر چاہساری کہ بی آب گشت — فراوان برا و سالیان برگذشت

بدین گنج سیم و زر آباد کن — ورم خوار کن مرگ را یاد کن

شاہنامہ کے ادبی محاسن

۱- واقعہ نگاری:- واقعہ نگاری میں فردوسی کو کمال حاصل ہے، جو واقعہ بیان کرتا ہے اس کی تمام جزئیات کچھ اس طرح لاتا ہے کہ ہو بہو تصویر کھنچ جاتی ہے۔ دوسرے سفر میں رستم کا گزر ایک بے آب و گیاہ بیابان سے ہوتا ہے۔ گرمی کی شدت کا یہ عالم ہے کہ اڑتے ہوئے پرندے بھی گر گر پڑتے ہیں۔ "رخش" کا جسم عاجز آجاتا ہے۔ رستم کی زبان سوکھ کر کانٹا ہو جاتی ہے۔

یکی راہ پیش آمدش ناگزیر — ہمی رفت باتیت برخیرہ خیر

بیابان بی آب و گرمای سخت | کزو مرغ گشتی بہ تن لخت لخت
چنان گرم گردید ہامون و دشت | تو گفتی کہ آتش بر و بر گذشت
تن رخش و گویا زبان سوار | ز گرمی و از تشنگی شد ز کار
پیادہ شد از اسپ و ژوپین بدست | ہمی رفت پویان بکردار مست
نمی دید بر چارہ جستن رہی | سوی آسمان کرد روی آنگہی

سہراب ایرانی فوج کے ایک ایک سردار کو دیکھتا ہے۔ ہجیر سے ان سب کا اتا پتا پوچھتا ہے۔ آخر اس کی نظر رستم پر پڑتی ہے۔ پوچھتا ہے یہ شخص کون ہے جو آپے سے باہر ہوا جاتا ہے :-

بجوشد سر زمان بر خروشد ہمی | تو گوئی کہ دریا بجوشد ہمی

۲- منظر کشی :- جہاں کہیں قدرتی مناظر پیش آئے ہیں، ایسے موقلم سے تصویر کشی کی ہے کہ سارا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اندھیری رات کا منظر ذیل کے اشعار میں پیش کیا ہے۔

شبی چون شبہ روی شستہ بقیر | نہ بہرام پیدا نہ کیوان نہ تیر
دگرگونہ آرائشی کرد ماہ | بسیچ گذر کرد بر پیشگاہ
شدہ تیرہ اندر سرای درنگ | میان کردہ باریک و دل کردہ تنگ
ز تاجش سہ بہرہ شدہ لاجورد | سپردہ ہوا را بزنگار گرد
سیاہ شب تیرہ بر دشت و راغ | یکی فرش افگندہ چون پر زاغ
چو پولاد زنگار خوردہ سپہر | تو گفتی بقیر اندر اندودہ چہر
چنان گشت باغ و لب جویبار | کجا موج خیزد ز دریای قار
فرو ماندہ گردون گردان بجای | شدہ سست خورشید را دست و پای
زمین زیر آن چادر قیرگون | تو گفتی شدستی بخواب اندرون

نہ آوائے مرغ و نہ ہرّای دد — زمانہ زبان بستہ از نیک و بد

۲- **تشبیہ واستعارہ** :- فردوسی بیان کو رنگین اور پُر زور بنانے کے لیے عموماً ایسی تشبیہیں اور استعارے لاتا ہے جو خالص ایرانی ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایرانی ماحول سے اگر کوئی مناسب تشبیہ نہ ملے، تو وہ قدرتی ماحول کی طرف رجوع کرتا ہے۔

بہ تن ژندہ پیل و بجان جبرئیل — بکف ابر بہمن بدل رود نیل

سخاوت کے لیے حاتم طائی کی شخصیت ضرب المثل ہے، لیکن فردوسی سخاوت کے لیے ابر بہمن کی تشبیہ لایا ہے، جس کے فیض سے دریا کی تہ میں پڑی ہوئی سیپیاں بھی گوہر دار ہو جاتی ہیں۔

یوں تو شاہنامے کے صفحات تشبیہات سے بھرے پڑے ہیں، لیکن یہاں صرف چند مسلسل اشعار نقل کیے جاتے ہیں، جو رودابہ کے تعارف میں لکھے گئے ہیں۔

پس پردہ او یکی دختر است — کہ رویش ز خورشید روشن تر است

ز سر تا بپایش بکردار عاج — برخ چون بہار و ببالا چو ساج[۱]

بر آن سُفت[۲] سیمین دو مشکین کمند — سرش گشتہ چون حلقہ پای بند

رُخانش چو گلنار ولب ناردان — ز سیمین برش رستہ دو ناردان

دو چشمش بسان دو نرگس بباغ — مژہ تیرگی بردہ از پر زاغ

دو ابرو بسان کمان طراز — برو توز پوشیدہ از مشک ناز

اگر ماہ جوئی ہمہ روی اوست — وگر مشک بوئی ہمہ بوی اوست

سر زلف جعدش چو مشکین زرہ — فگندہ است گوی گرہ بر گرہ

---

[۱] صنوبر — [۲] کندھا

وہ انگشت بر سان سیمین قلم | برو کردہ از غالیہ صد رقم
بہشتی است سر تا سر آراستہ | پر آرائش و رامش و خواستہ

۴- ایجاز و اختصار :- فصیح و بلیغ کلام کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ مختصر اور مدلل ہو، اور حقیقت بھی یہ ہے کہ جہاں لمبی چوڑی عبارتیں موثر ثابت نہیں ہوتیں، وہاں ایک مختصر سا جملہ کام کر جاتا ہے۔ ایران کا سب سے بڑا المیہ یعنی داستان سہراب و رستم ذیل کے شعر سے شروع ہوتا ہے۔

کنون جنگ سہراب و رستم شنو | دگرہا شنیدستی ایں ہم شنو

یعنی داستانیں تو اور بھی سنی ہوں گی۔ اب یہ بھی سن لو۔ اس کی بات ہی کچھ اور ہے" ایں ہم "کہہ کر شاعر نے وہ بات پیدا کر دی ہے، جو بڑی سے بڑی تمہید کے ذریعے بھی شاید ہی پیدا ہوتی۔ پھر ایک موقع پر کہا ہے۔

دگر جز بکام من آید جواب | ہمیں گرز و میدان افراسیاب

یعنی اگر میری اُمید و مراد کے خلاف جواب آیا، تو پھر یہ گُرز ہوگا اور میدان افراسیاب ہوگا۔ تنبیہہ و تہدید کا بڑے سے بڑا مضمون "ہمیں گرز و میدان افراسیاب" سے بہتر طور پر ادا نہیں کیا جاسکتا۔

۵- جذبات نگاری۔ جذبات نگاری میں بھی فردوسی کو کمال حاصل ہے۔ ایران اور توران کے دو عظیم ترین بہادر رستم اور سہراب جو ایک دوسرے کو نہیں جانتے، میدان کارزار میں نبرد آزما ہوتے ہیں۔ انہی بہادروں کی فتح و شکست پر دو عظیم سلطنتوں کی فتح و شکست کا انحصار ہے۔ ان میں سے ایک باپ ہے اور دوسرا بیٹا۔ آخر بیٹا باپ کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ سہراب کی ماں کو بیٹے کی موت کی خبر سنائی جاتی ہے۔ اس دردناک کیفیت کو فردوسی نے ذیل کے اشعار میں بیان کیا ہے۔

خروشید و جوشید و جامه درید   به زاری بر آن کودک نارسید
برآورد بانگ و غریو و خروش   زمان تا زمان زو همی رفت هوش
فرو برده ناخن دو دیده بکند   برآورد و بالا در آتش فگند
مر آن زلف چون تاب داده کمند   به انگشت پیچید و از بن بکند
به سر بر فگند آتش و بر فروخت   همه موی مشکین به آتش بسوخت
همی گفت کای جان مادر کنون   کجائی سرشته بخاک و خون
دو چشمم بره بود گفتم مگر   ز سهراب و رستم بیابم خبر
چه دانستم ای پور کاید خبر   که رستم به خنجر دریدت جگر
دریغش نیامد از آن روی تو   از آن برز و بالا و بازوی تو
بپرورده بودم تنش را بناز   به رخشنده روز و شبان دراز
کنون آن بخون اندرون غرقه گشت   کفن بر تن پاک او خرقه گشت
کنون من کرا گیرم اندر کنار   که خواهد بدن مر مرا غمگسار
پدر جستی ای گرد لشکر پناه   به جای پدر گورت آمد براه
چرا نامدم با تو اندر سفر   که گشتی به گردان گیتی سمر
مرا رستم از دور بشناختی   ترا با من ای پور بنواختی
همی گفت و می‌خست و می‌کند موی   همی زد کف دست بر خوب روی
ز خون او همی کرد لعل آب را   به پیش آوریدا اسپ سهراب را
سر اسپ او را به بر در گرفت   بماند جهانی در او در شگفت
گهی بوسه زد بر سرش گه بر روی   ز خون زیر سمش همی راند جوی
بیاورد آن جامه شاهوار   گرفتش چو فرزند اندر کنار
بیاورد خفتان و درع و کمان   همان نیزه و تیغ و گرز گران

بسر بر ہمی زد گران گرز را ۔۔۔ ہمی یاد کرد آن بر و برز را

بیاورد زین و لگام و سپر ۔۔۔ لگام و سپر را ہمی زد بسر

شاہنامے میں صوتی اثرات کی کمی

شاہنامے کی ادبی اہمیت کے ساتھ کچھ ایسی باتوں کا ذکر کرنا بھی مناسب ہوگا، جو فنی نقطۂ نگاہ سے کھٹکتی ہیں۔ ان باتوں کی طرف سب سے پہلے پروفیسر ہادی حسن[1] نے قارئین کی توجہ دلائی ہے۔

شاہنامہ واقعات جنگ کی ایک طویل داستان ہے، جن میں آوازوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے، ان آوازوں پر فردوسی کی توجہ نہیں، بلکہ نہ وہ آوازیں خود سنتا ہے، نہ ہمیں سناتا ہے۔ اس لیے جن صوتی کیفیات سے پڑھنے والوں کی قوتِ سامع مطمئن ہو سکتی تھی، اُن سے وہ محروم رہ جاتے ہیں۔

رستم اور اشکبوس کی جنگ کا بیان ایران میں بہت مقبول رہا ہے۔ اس جنگ کی جزئیات فردوسی ذیل کے اشعار میں بیان کرتا ہے۔

کمان را بمالید رستم بچنگ ۔۔۔ بغرید مانند غران پلنگ

پس آنگہ بہ بند کمر برد چنگ ۔۔۔ گزین کرد یک چوبہ تیر خدنگ

خدنگی برآورد پیکان چو آب ۔۔۔ نہادہ بر او چار پر عقاب

بمالید چاچی کمان را بدست ۔۔۔ بہ چرم گوزن اندر آورد شست

ستون کرد چپ را و خم کرد راست ۔۔۔ خروش از خم چرخ چاچی بخاست

چو سوفارش آمد بہ پہنای گوش ۔۔۔ ز چرم گوزنان برآمد خروش

چو پیکان ببوسید انگشت او ۔۔۔ گزر کرد از مہرۂ پشت او

---

1. Studies in Persian Literature P. 128-129

چو زد تیر بر سینہ اشکبوس | سپہر آں زماں دست او داد بوس
قضا گفت گیر و قدر گفت دہ | فلک گفت احسن ملک گفت زہ
کشانی ہم اندر زماں جاں بداد | تو گفتی کہ او خود ز مادر نزاد

ان اشعار میں پوری پوری منظر کشی کی گئی ہے۔ کئی تصویریں یکے بعد دیگرے ہماری نظروں کے سامنے آتی ہیں اور ہم مناظر جنگ سے متاثر ہوتے ہیں، لیکن میدانِ کارزار کی صداؤں کی کمی سے جنگ کا نقشہ نامکمل سا رہ جاتا ہے۔

تیر چلتے ہیں تو ان کی پرواز میں آواز ہوتی ہے۔ تیر جس کے سینے میں پیوست ہو، اس وقت بھی کچھ صدا سنائی دی ہوگی۔ رستم کو جب اشکبوس پر فتح حاصل ہوئی اور اس نے چپ چاپ جان دے دی، تو اس وقت داد و تحسین کا غلغلہ بپا ہوا ہوگا۔ لیکن فردوسی نے صرف آسمان اور فرشتوں سے اس کی داد دلائی ہے، اور وہ بھی پُرسکوت الفاظ میں۔

فردوسی ذیل کے اشعار میں تہمینہ کے حسن و جمال کا ذکر کرتا ہے۔

پس پردہ اندر یکی ماہروی | چو خورشید تاباں پر از رنگ و بوی
دو ابرو کماں و دو گیسو کمند | ببالا بکردار سرو بلند
بنا گوش تابندہ خورشید وار | فروہشتہ زو حلقہ گوشوار
ستارہ نہاں کردہ زیر عقیق | تو گفتی ورا زہرہ آمد رفیق
روانش خرد بود و تن جانِ پاک | تو گفتی کہ بہرہ ندارد ز خاک

ان اشعار میں تہمینہ کے حسن و جمال کا ہو بہو ذکر آیا ہے۔ لیکن نہیں ہے تو صرف آواز کا ذکر نہیں، حالانکہ اس کی آواز بھی کسی دلفریب نغمہ سے کم اثر انداز نہ ہوگی۔ اب یہی کہا جائیگا کہ فردوسی کی آواز پر توجہ نہیں، نہ اس نے قارئین کی توجہ آواز کی طرف دلائی۔

سہراب کے المیہ کا تقاضا تھا کہ کچھ شور و شیون کی صدائیں بھی سنائی دیتیں۔ چنانچہ ذیل کے اشعار میں صوتی اثرات بھی پیدا کیے گئے ہیں۔

خروشید و جوشید و جامہ درید | بہ زاری بر آن کودک نارسید
برآورد بانگ و غریو و خروش | زمان تا زمان زو ہمی رفت ہوش

ان اشعار کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ صوتی اثرات پیدا کرنے والے الفاظ کی شاہنامے میں اس قدر کمی ہے کہ اظہارِ ماتم کے لیے بھی "خروشید و جوشید" ایسے الفاظ لائے گئے ہیں، حالانکہ یہ الفاظ غیض و غضب کی علامت ہیں اور کپڑے پھاڑنا بھی غصے ہی کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں اگر "زاری" کا لفظ نہ آتا، تو غم و الم اور غیض و غضب کی کیفیت میں امتیاز نہ ہو سکتا۔

مردانہ اور زنانہ احساسات میں یکسانیت

سہراب کی دردناک موت کا صدمہ تو رستم اور تہمینہ کے لیے یکساں تھا۔ اب شاعر کو یہ دکھانا تھا کہ ایک جنگجو بہادر باپ کے دل پر اس صدمے سے کیا اثرات ہوئے اور ایک حساس و ناتوان ماں کے دل پر کیا کیفیت گزری۔ لیکن ذیل کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ اس صدمے میں ماں اور باپ سے جو حرکات سرزد ہوئیں، بالکل ایک سی تھیں اور ان کی زبان سے جو الفاظ نکلے، وہ بھی ایک ہی طرح کے تھے

تہمینہ	رستم
خروشید و جوشید و جامہ درید	بزد نعرہ و خونش آمد بجوش
بزاری بر آن کودک نارسید	ہمی کند موی و ہمی زد خروش
ہمی گفت و می خست و می کند مو	چو بشنید رستم خراشید روی
ہمی زد کف دست بر خوب روی	ہمی زد بسینہ ہمی کند مو

رستم	تہمینہ
ہمی ریخت خون وہمی کند موی	
سرش پرز خاک و پراز آب روی	گہی بوسہ زد بر سرش گہ بردی
ہمی ریخت خون وہمی کند خاک	زخون زیر سمش ہمی راند جوی
تنش جامۂ خسروی کرد چاک	
دریغ آں ہمہ مردی ورائی تو	دریغش نیامد از آن روی تو
دریغ آں رخ و برز و بالائی تو	از آن برز و بالا و بازوی تو

فردوسی کی تصنیفات

کہا جاتا ہے کہ شاہنامہ کے علاوہ فردوسی نے ایک عشقیہ مثنوی "یوسف زلیخا" شاہنامے ہی کی بحر میں لکھی تھی۔ یورپ کے محققین اور قدیم ایرانی تذکرہ نویسوں نے بھی یہ مثنوی اسی سے منسوب کی ہے۔

مثنوی "یوسف زلیخا" کے مقدمے میں لکھا ہے کہ مصنف نے عراق عرب کے سفر کے دوران کچھ عرصہ بغداد میں قیام کیا۔ یہاں اس نے بہاء الدولہ دیلمی آل بویہ کے وزیر ابو علی حسن موفق ۳۹۲ ہجری کی فرمائش پر یہ حکایت نظم کی۔ اس کا مصنف ابو المویدبلخی ہے اور دوسری کا مصنف بختیاری ہے۔ بالآخر یہ مثنوی لکھنے کی مجھے فرمائش ہوئی، جیسا کہ اشعار ذیل سے واضح ہے۔

دو شاعر کہ ایں قصہ را گفتہ اند	بہر جای معروف و نہ نہفتہ اند
یکی بو المؤید کہ از بلخ بود	بدانش ہمی خویشتن را ستود
پس از وی سخن یافت این داستان	یکی مرد بد خوب روی و جوان
نہادہ و را بختیاری لقب	کشادی بر اشعار ہر جائی لب

ا؎ تاریخ ادبیات در ایران۔ جلد اول ص ۴۸۳

قضا را یکی روز اخبار آن | ہمی راندش بی غرض بر زبان
بہ نزدیک تاج زمانہ اجل | موفق سپہر وفا و محل
مرا گفت خواہم کہ اکنون تو نیز | بباشی بگفتار و شغلی بہ نیز
ہم از بہر این قصہ ساز آوری | زہر گوشہ معنی فراز آوری

"یوسف زلیخا" کے اس تیسرے مصنف کو اکثر محققین نے فردوسی سمجھ لیا ہے لیکن ذیل کی وجوہ کی بنا پر کہا جا سکتا ہے، کہ یہ مثنوی فردوسی کی نہیں ہو سکتی۔

۱۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مثنوی بھی شاہنامے کی طرح بحر متقارب میں لکھی گئی ہے، لیکن شاہنامہ کے برعکس اس میں عربی کے الفاظ بکثرت ہیں۔ مقدمے کے انہی آٹھ شعروں میں ذیل کے الفاظ عربی زبان کے ہیں۔

معروف، قضا، اجل، شغل، اخبار

ظاہر ہے کہ فردوسی جس نے شاہنامے میں عربی کے الفاظ استعمال کرنے میں اس قدر بخل سے کام لیا ہے۔ وہ دفعتہً اتنی فیاضی سے عربی کی طرف رجوع نہیں کر سکتا تھا۔

۲۔ ذبیح اللہ صفا لکھتے ہیں کہ اس مثنوی میں رسول اکرمؐ کی نعت کے بعد خلفائے راشدین کی منقبت میں شعر لکھے گئے ہیں۔ ان اشعار میں سب کو برابری کا درجہ دیا ہے۔ فردوسی بھی خلفائے راشدین کی مدح و ثنا تو کرتا ہے، لیکن وہ حضرت علیؓ کو ان سب میں فضیلت دیتا ہے۔ اس لیے اس کا مصنف فردوسی نہیں ہو سکتا۔

۳۔ ذبیح اللہ صفا[1] یہ بھی لکھتے ہیں کہ بعض دانشمند فردوسی کے سفر عراق عرب کی تردید کرتے ہیں، بلکہ مثنوی "یوسف زلیخا" کو فردوسی سے نسبت دینے میں بھی اپنے قوی شبہات کا اظہار کرتے ہیں، شفق[2] یہ لکھتے ہیں کہ حال ہی میں ایک فاضل شخص نے

---

[1] تاریخ ادبیات در ایران جلد اول ص ۴۷۲

[2] تاریخ ادبیات ایران ص ۹۷

یوسف زلیخا کا ایک قلمی نسخہ ڈھونڈھ نکالا ہے۔ جس کے اشعار سے پتا چلتا ہے کہ اس کا مصنف فردوسی نہیں۔ مثنوی کے نسخے پر کسی مصنف کا نام نہیں، لیکن یہ مثنوی سلطان ملک شاہ سلجوقی ۴۶۵ھ تا ۴۸۵ھ ہجری مطابق ۱۰۷۲ء تا ۱۰۹۲ء کے زمانے میں اس کے بھائی طغان شاہ بن الب ارسلان کے نام منسوب ہوئی تھی۔

قطعات اکثر تذکروں مثلاً ہفت اقلیم، ریاض الشعرا، وغیرہم میں بعض متفرق اشعار و قطعات کو فردوسی سے منسوب کیا گیا ہے ان میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

حکیم گفت کسی را کہ بخت والا نیست　　　به هیچ روی مرو را زمانه جویا نیست

لباب الالباب میں ذیل کا قطعہ درج ہے۔

بسی رنج دیدم بسی گفته خواندم　　　ز گفتار تازی و از پهلوانی
بچندین هنر شصت و دو سال بودم　　　چه توشه برم ز آشکار و نهانی
بجز حسرت و جز وبال گناهان　　　ندارم کنون از جوانی نشانی
بیاد جوانی کنون مویه دارم　　　بر آن بیت بو طاهر خسروانی

جوانی من از کودکی یاد دارم
دریغا جوانی، دریغا جوانی

ذیل کا ایک قطعہ بھی فردوسی کے نام منسوب ہے، جو اس نے شاہنامہ کے انعام سے محروم ہو کر لکھا تھا۔

خجسته درگه محمود غزنوی دریاست　　　چگونه دریا کان را کرانه پیدا نیست
چه غوطه ها زدم و اندرو ندیدم در　　　گناه بخت من است این گناه دریا نیست

شاہنامے کی تقلید ایران میں شاہنامے کو جو شہرت حاصل ہوئی، وہ کسی اور کتاب کو حاصل نہیں ہو سکی۔ اس کی مقبولیت

کا یہ عالم ہے کہ اکثر نامور شعرا نے اس کی تقلید میں شاہنامے لکھے، جن میں ذیل کے شاہنامے خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

گرشاسپ نامہ اسدی طوسی	(چھٹی صدی ہجری)
اسکندر نامہ نظامی گنجوی	(چھٹی صدی ہجری)
ظفر نامہ حمداللہ مستوفی	(آٹھویں صدی ہجری)
شاہنامہ احمد تبریزی	(آٹھویں صدی ہجری)
شاہنامہ قاسمی	(دسویں صدی ہجری)
شاہنامہ صبا	(تیرھویں صدی ہجری)

شاہنامے کی تقلید میں پاک و ہند میں بھی متعدد شاہنامے فارسی زبان میں لکھے گئے۔ شاہنامہ تغلق، شاہنامہ کلیم، شاہنامہ بختاور خانی، شاہنامہ قدسی، شاہنامہ نادری، شاہنامہ احمد، شاہنامہ شاہ عالم وغیرہ

ان تمام شاہناموں میں کوئی بھی ایسا نہیں، جو فردوسی کے شاہنامے کے قریب تک بھی پہنچا ہو۔ اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ شاہنامہ گوئی فردوسی نے شروع کی، اور اس فنِ عظیم کا خاتمہ بھی فردوسی پر ہوا۔

شاہنامہ کے ترجمے

"شاہنامہ" ایران کا ایسا زندہ جاوید شاہکار ہے جس نے تمام متمدن دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس لیے اکثر ایشیائی اور یورپی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔

عربی زبان میں قوام الدین فتح بن علی اصفہانی نے ۶۲۲-۶۲۴ ہجری مطابق 1225-1226 عیسوی میں ترجمہ کیا۔ فرانسیسی زبان میں یہ ترجمہ مول (MOHL) کے توسط سے ہوا۔ اطالوی میں پیّزی (PIZZI) نے ترجمہ کیا۔ متعدد ترجمے انگریزی زبان میں بھی ہوئے۔

مشہور جرمن محقق نلدکی نے شاہنامے پر نہایت ہی قابلِ قدر علمی تحقیق کی ہے، جو شاہنامے کے شیدائیوں کے لیے مشعل راہ کا کام دیتی رہے گی۔

حکومتِ ایران کے زیرِ اہتمام ۱۳۱۳ء ہجری شمسی میں فردوسی کی ہزارویں سالگرہ منائی گئی جس میں متعدد اقوامِ عالم کے نمائندوں نے شرکت کی اور گراں قدر تحقیقی مقالے پڑھے گئے۔

فردوسی کی وفات

حمد اللہ مستوفی نے فردوسی کا سالِ وفات ۴۱۶ ہجری مطابق ۱۰۲۵ عیسوی لکھا ہے۔ لیکن دولت شاہ سمرقندی کے بیان کے موافق فردوسی کا سالِ وفات ۴۱۱ ہجری مطابق ۱۰۲۰ عیسوی ہے۔ شاہنامے میں فردوسی نے لکھا ہے کہ اب میری عمر تقریباً اسّی سال کی ہے۔

۴۰۹ اور ۴۱۰ ہجری مطابق ۱۰۱۸ - ۱۰۱۹ عیسوی کے بعد فردوسی نے شاہنامے میں مزید کچھ نہیں لکھا اگر اس کی ولادت ۳۲۹ - ۳۳۰ ہجری مطابق ۹۴۰ - ۹۴۱ عیسوی فرض کرلی جائے، جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے، تو اس لحاظ سے اُس کا سالِ وفات . . . . . دولت شاہ کے بیان کے موافق ۴۱۱ ہجری مطابق ۱۰۲۰ عیسوی ہی درست معلوم ہوتا ہے۔

منوچہری دامغانی (… ۴۳۲ھ مطابق ۱۰۴۰ء)

ابوالنجم کنیت، احمد نام

منوچہری تخلص اور وطن دامغان ہے، جیسے کہ وہ خود لکھتا ہے۔

سوی تاج عمرانیاں ہم بدین سان ... بیامد منوچہری دامغانی

منوچہری شروع شروع میں آلِ زیار کے عہدِ حکومت میں فلک المعالی منوچہر بن قابوس وشمگیر کے دربار سے وابستہ ہوا چنانچہ اسی حکمران کی نسبت سے منوچہری تخلص کیا۔

منوچہری کے ہم عصر غزنوی حکمران

منوچہری کے سلطان محمود کے دربار میں آنے کے متعلق مورخین کی راؤں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ دولت شاہ[1] سمرقندی اپنے تذکرے اور امین احمد رازی "تذکرہ ہفت اقلیم" میں لکھتے ہیں کہ "منوچہری دربار محمود کا شاعر تھا" لیکن منوچہری کے سارے دیوان میں کہیں ایک قصیدہ بھی سلطان محمود کی مدح میں نہیں ہے، اس لیے تعجب ہوتا ہے کہ دربار محمود کا شاعر ہو اور محمود کی شان میں کوئی قصیدہ نہ کہے۔ چنانچہ علامہ شبلی نعمانی اور مشہور ایرانی نقاد رضا زادہ شفق[2] لکھتے ہیں کہ منوچہری محمود کے عہد کا شاعر نہیں، بلکہ محمد بن محمود اور مسعود بن محمود کے دربار کا شاعر ہے۔ چنانچہ اس نے اکثر قصائد مسعود اور اس کے وزرا کی مدح میں لکھے ہیں، اس لیے وہ محمود کی وفات کے بعد ہی دربار غزنی میں آیا ہوگا۔

منوچہری کے دیوان میں اس کے اپنے ممدوح فلک المعالی منوچہر کی مدح میں دو یا تین ہی قصیدے تو نہیں کہے ہوں گے۔ اس پر ہادی حسن اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں، کہ منوچہر بن قابوس سلطان محمود کا وفادار داماد تھا۔ اس لیے جہاں منوچہری نے اپنے ممدوح کے قصیدے کہے، وہاں سلطان محمود کے قصیدے بھی ضرور کہے ہوں گے۔ یہ قصیدے سلطان مسعود کے عہد میں خارج کر دیے گئے۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ سلطان محمود اور اس کے بیٹے[3] شہزادہ مسعود کے مابین شدید اختلافات تھے۔ یہ اختلافات اس بات سے صاف ظاہر ہوتے ہیں کہ سلطان محمود نے تخت و تاج کے وارث مسعود کا حق نظر انداز کر کے اپنا جانشین

---

[1] تذکرہ دولت شاہ صفحہ ۱۹

[2] تاریخ ادبیات ایران ص ۱۷

[3] Studies in Persian Literature

چھوٹے بیٹے محمد بن محمود کو بنایا۔ باپ بیٹے کی دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی، چنانچہ منوچہری سلطان مسعود کے قصیدے میں کہتا ہے ؎

باری خدائے جہان خلیفۂ معبود	نیکش مولود و نیک طالع مولود
گوئی محمود بود پیش از مسعود	نی نی مسعود ہست پیش از محمود

ظاہر ہے کہ ان اشعار میں محمود کی اہانت و تحقیر کرنے کے بعد، وہ محمود کے مدحیہ اشعار کو، جو اس نے لکھے تھے، برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔ کیونکہ اگر وہ محمود کی وفاداری کا دم بھرتا رہتا، تو مسعود کے نزدیک بے وفا ٹھہرتا۔ پس اس نے محمود کی بجائے مسعود کی وفاداری کو مقدم رکھا۔ وہ خود کہتا ہے کہ اس کو دو آقاؤں کی تلاش نہ تھی اسے مسعود ہی کی خواہش تھی، چنانچہ اس کی بارگاہ میں پہنچ کر یہ طلب و جستجو ختم ہوگئی۔

جز بر در شہنشہ بر در گہی نرفتم	نہ بر در حجازی نہ بر در بخاری
چون تو نیم کہ خدمت کہتر کنی و مہتر	از بہر دو وثاقی و ربہر یک دواری

سوائے شاہ کی بارگاہ کے میں کہیں اور نہیں گیا، نہ حجاز کے دربار میں، نہ بخارا کے دربار میں۔ میں تمہاری طرح نہیں، جو بڑے کے بھی خدمت گزار ہو اور چھوٹے کے بھی، اور ایک حرم کی تمنا میں دو بتوں کو پوجتے ہو۔

ان حالات میں یہ ناممکن نہیں کہ ذاتی مفاد کے پیش نظر اس نے محمود کی مدح میں لکھے ہوئے قصائد اپنے دیوان سے خارج کر دیئے ہوں۔ منوچہری کے دیوان کا حجم کم ہونا بھی کچھ اسی بات کا پتا دیتا ہے۔

خصوصیات

۱۔ غزنوی عہد کے تمام شعرا سبک خراسانی کے پیرو ہیں، لیکن ان کے برعکس منوچہری نے عرب شعرا یعنی سبک عرب کی پیروی بھی کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان سے وہ بہت مانوس تھا اور جیسے کہ وہ خود کہتا ہے، شعرائے عرب کے اکثر دیوان اسے ازبر تھے۔

من لسبی دیوان شعر تازیان دارم زبر	تو ندانی خواند الا هبی لصحنک فاصبحین

عربی سے استفادہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب وہ غزنوی دربار میں پہنچا، تو ابھی نوعمر ہی تھا، وہ چاہتا تھا کہ بزرگ شعرا کے مقابلے میں اپنا خاص مقام پیدا کرے۔ چنانچہ اس نے فضیلت وبرتری حاصل کرنے کے لیے عربی الفاظ و موضوعات کا سہارا لیا۔

منوچہری کے قصائد میں عربی الفاظ کی بھرمار ہے۔ ذیل کے قصیدے کے اکثر قافیے عربی کے ہیں۔

عزابا منزل بیشتر زین نعیقا	کہ مہجور کردی مرا از عشیقا
نعیق تو بسیار دمارا عشیقی	نباید بیک دست چندین نعیقا
ایا رسم اطلال معشوق وافی	شدی زیر سنگ زمانہ سحیقا
ز خواب ہوی گشت بیدار ہرکس	نخواہم شدن من ز خواہش مفیقا
بدان شب کہ معشوق من مرتحل شد	دلی داشتم ناصبور و قلیقا

منوچہری نے بعض قصائد ایسی بحروں میں بھی لکھے ہیں، جو صرف عرب شاعری کے لیے مخصوص ہیں۔ ایک قصیدہ اسی قسم کی بحر میں ذیل کے شعر سے شروع ہوتا ہے۔

فغان ازین غراب بین و وائ او	کہ در نوا فگندم آن نوای او

اس بحر میں اہل ایران نے بہت کم طبع آزمائی کی ہے۔ مضمون کے لحاظ سے بھی اس شعر میں عرب شاعری ہی کا عکس جھلکتا ہے۔ "غراب" کو اہل عرب منحوس سمجھتے ہیں، چنانچہ نحس اثرات کو ظاہر کرنے کے لیے اکثر شعرائے عرب کے کلام میں "غراب" اور "نولائے غراب" کا ذکر آتا ہے۔ منوچہری نے بھی کلمہ "غراب بین" لا کر عربوں ہی کی پیروی کی ہے۔ "حدی" عربوں کا خاص لفظ ہے، جو منوچہری کے کلام میں جگہ جگہ آتا ہے۔ اطلال و دمن، حدیث قافلہ، منزل، وصف، بیابان

صحبت خار مغیلاں عرب شعرا کے محبوب موضوع ہیں۔ منوچہری کے اشعار میں بھی ان کا اکثر ذکر آتا ہے۔

عربی میں مہارت تامّہ ہونے کی وجہ سے منوچہری نے بعض قصائد بھی عرب شعرا کے قصائد پر لکھے ہیں۔ مثلاً ایک قصیدے کا مطلع یہ ہے۔

جہانا چہ بی مہرو بو خو جہانی　　　چو آشفتہ بازار بازارگانی

یہ قصیدہ عہد عباسی کے شاعر ابو الشیص کے قصیدے پر لکھا گیا ہے، جیسے کہ منوچہری خود کہتا ہے۔

بر آن وزن این شعر گفتم کہ گفتہ است　　　ابو الشیص اعرابی باستانی

طلوع صبح پر منوچہری کا نہایت فصیح قصیدہ ہے، جس کا مطلع یہ ہے۔

چو از زلف شب باز شد تابہا　　　فرو مرد قندیل محرابہا

یہ قصیدہ اعشی بن قیس باہلی کی طرز پر ہے، جیسے کہ وہ خود کہتا ہے۔

ابر زیر و بم شعر اعشی قیس　　　زنندہ ہمی زد مصابہا

۲۔ روانی و سادگی۔ اگر منوچہری کے قصائد کے عربی الفاظ و تراکیب کو نظر انداز کیا جائے، تو کہا جا سکتا ہے، ان میں روانی اور سلاست بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس کی شاعری کا یہی وہ وصف ہے، جس کی بدولت منوچہری کا شمار شعرا کی اوّلیں صف میں ہوتا ہے۔ ایک قصیدے کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

دلم ای دوست تو دانی کہ ہوای تو کند　　　لب من خدمت خاک کف پای تو کند

دانگان خشک فروشی نکند ہیچ کسی　　　در کند ہیچ کسی لطف عطای تو کند

چہ دعا گر جی جانان کہ چنین خوب شدی　　　تا چو تو چاکر تو نیز دعای تو کند

این جہان کرد برای تو خداوند جہان　　　و آن جہان نیز برانم کہ برای تو کند

۳۔ مطالعہ فطرت۔ معلوم ہوتا ہے، منوچہری بڑی گہری نظر سے مظاہر فطرت

کا مطالعہ کرتا ہے۔ قدرتی مناظر کا مطالعہ اگر گہری نظر سے کیا جائے، تو اس کا بیان بھی بہت موثر اور مکمل ہوگا۔ بہار کے نغمے گاتے ہوئے شعرا اکثر پھولوں کے رنگ و بو، صدائے بلبل، اور نوائے عشاق کا ذکر کرتے ہیں، یہی ذکر منوچہری کے ہاں بھی ہے، لیکن اس نے پتوں، شاخوں، پھولوں، درختوں اور پرندوں کا کچھ اس پیرائے میں ذکر کیا ہے، گویا ان کی صحبت میں برسوں رہا ہے۔

آمد نوروز ہم از بامداد   آمدنش فرخ و فرخندہ باد
باز جہان خرم و خوب ایستاد   مرو زمستان و بہاران بزاد
ز ابر سیہ روی سمن بوی زاد
گیتی گردید چو دار القرار

روی گل سرخ بیاراستند   زلفک شمشاد بپیراستند
کبکان بر کوہ بہ تک خواستند   بلبلگان زیر و ستا خواستند
فاختگان ہم بر نشاستند
نای زنان بر سر شاخ چنار

لالہ بہ شمشاد بر آمیختند   ژالہ بہ گلزار در آویختند
بہ سوسن مشک فرو بیختند   وز بر این دُرّ فرو ریختند
نقش و تماثیل بر انگیختند
از دل خاک و دو رخ کوہسار

قمریگان نای بیاموختند   صلصلگان مشک تبت سوختند
زردگلان شمع برافروختند   سرخ گلان یاقوت اندوختند
سرو بنان جامۂ نو دوختند
زین سو و زآن سو لب جوئبار

باز جہان خرم و خوش یافتیم — نی سمن و سوسن بشتافتیم
زلف پری رویان بر تافتیم — دل ز غم ہجران بشگافتیم
خوب تر از بوقلمون یافتیم
بوقلمونی ماند نو بہار

پیکر در پیکر بنگاشتیم — لالہ بہ لالہ فرو کاشتیم
گیتی را چون چمن انگاشتیم — دست بیاقوت تر انباشتیم
باز بہر گوشہ برافراشتیم
شاخ گل و نسترن آبدار

مرغ نہ بینی کہ چہ خواند ہمی — میغ ندانی کہ چہ راند ہمی
دشت نہ بینی کہ چہ ماند ہمی — دوست نہ بینی چہ ستاند ہمی
باغ بستان را بنشاند ہمی
بر سمن و نسترن و لالہ زار

می بردم نیمہ ز بہاری کنم — بر رخش از مدح نگاری کنم
بر سرش از قد خماری کنم — بر تنش از شعر شعاری کنم
دین ہمہ را زود نثاری کنم
پیش امیر الامرا روز بار

۴۔ منظر کشی۔ مطالعہ فطرت کے ساتھ اسے منظر کشی میں بھی بڑی مہارت حاصل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ماہر نقاش کے ہاتھ میں مو قلم ہے اور وہ کسی قدرتی منظر کو رنگوں کے سانچے میں ڈھال رہا ہے۔ منظر کشی میں نہایت عمدہ تشبیہیں لاتا ہے۔ تشبیہوں میں عالم محسوسات سے بھی استفادہ کرتا ہے اور قوتِ خیال سے بھی۔ "شب تاریک" کے چند شعر درج ذیل ہیں۔

شبی گیسو فرو هشته بدامن | پلاسین معجر و قیرینہ گرزن
بکردار زن زنگی کہ ہر دم | بزاید کودکی بلغاری آن زن
کنون شویش بمرد و گشت فرتوت | ازان فرزند زادن شد سترون
شبی چون چاہ بیژن تنگ و تاریک | چو بیژن در میان چاہ او من
ثریا چون منیژہ بر سر چاہ | دو چشم من بدو چون چشم بیژن

۵۔ منوچہری کے کلام میں مسرت اور نشاط ۔ منوچہری ایک عشرت طلب اور خوش باش شاعر ہے ۔ اس کے تمام دیوان میں سوائے ایک نظم "شمع" کے اور کہیں غم و اندوہ کا ذکر نہیں آیا ۔ معلوم ہوتا ہے اس نے تمام زندگی عیش و نشاط میں بسر کی ۔ اس کا دیوان اس کی شگفتہ اور پُر سرور زندگی کا تابناک عکس ہے ۔ ایک قصیدے کی تشبیب میں شراب کی تمنا کس والہانہ انداز میں کی ہے ۔

آمد شب و از خواب مرا رنج و عذاب است
ای دوست بیار آنچہ مرا داروی خواب است

می خواہ نبیدہ ہمی ناب ربائیم
آری عدوی خواب جوانان می ناب است

نحتم عجب آید کہ چگونہ بردش خواب
آن را کہ بہ کاخ اندر یک شیشہ شراب است

وین نیز عجب تر کہ خورد بادہ بی چنگ
بی نغمہ چنگش بمی ناب شتاب است

منوچہری کو صنف مسمط کا موجد بیان کیا جاتا ہے چنانچہ اسے مسمط کی ایجاد پہ ناز بھی ہے ۔

طاؤس مدیح عنصری خواند | دُرّاج مسمط منوچہری

منوچہری کے مسمّط بھی مستی و سرشاری کا مرقع ہیں۔

ایک مسمّط کے دو بند درج ذیل ہیں:۔

آمد بانگ خروش موذن می خوارگان
صبح نخستین نمود روی به نظارگان
کہ بکتف برگرفت جامۂ بازارگان
روی بمشرق نہاد خسرو سیارگان
بادہ فراز آورید چارۂ بی چارگان
قوموا شرب الصبوح معشر النائمین

می زدگانیم ما در دل ما غم بود
چارہ ما بامدار رطل دما دم بود
راحت کژدم زدہ کشتہ کژدم بود
می زدۂ را ہم دارو و مرہم بود
ہر کہ صبوحی زند با دل خرم بود
با دو لب مشکبوی با دو رخ حور عین

منوچہری نے جوانی ہی میں انتقال کیا۔ اس کا سنِ وفات بقول مجمع الفصحا ۴۳۲ھ مطابق ۱۰۴۰ء ہے۔

لبیبی خراسانی

محمد عوفیؒ کے قول کے مطابق لبیبی خراسانی چوتھی صدی ہجری کے آخر کا شاعر ہے اور فرخی کے معاصرین میں سے ہے۔ اس نے ابوالمظفر امیر چغانیاں کی مدح میں بھی قصیدے لکھے ہیں، جن کے اشعار تذکروں میں ملتے ہیں۔

لبیبی اپنے عہد کا مشہور شاعر تھا۔ اس کی شہرت اس کی وفات کے بعد

بھی قائم رہی، چنانچہ غزنوی دور کے مشہور شاعر مسعود سعد سلمان نے اس کی مدح میں قصیدہ کہا ہے۔ جس کے دو شعر حسب ذیل ہیں۔

بدین قصیدہ کہ گفتم من اقتفا کردم
با دستاد لبیبی کہ سید الشعراست

بر آن طریق بنا کردم این قصیدہ کہ گفت
"سخن کہ نظم کنند آن درست باید و راست"

لبیبی کے متعدد اشعار تذکروں میں ملتے ہیں، ان میں سے بعض درج ذیل ہیں:۔

چون بر کندم از دیدار دلبر
نہادم مہر خرسندی بدل بر

تو گوئی داغ سوزان بر نہادم
بدل، کز دل بدیدہ در زد آذر

شر بعیدم کہ بر رویم ہمی جست
ز مژگان ہم چو سوزان سوزنش سر

مرا دید آن نگارین چشم گریان
جگر بریان پُر از خون عارض و بر

بچشم اندر شرارہ آتش عشق
بچنگ اندر عنان خنگ رہبر

مرا گفت آن دلآرام ای بی آرام
ہمیشہ ماندیان بی خواب و بی خور

ز جابلسا بہ جابلقا رسیدی
ہمان از باختر رفتی بخاور

سکندر نیستی لیکن دو بارہ
بگشتی در جہان ہم چون سکندر

ندانم تا ترا چند آز مایم
چہ مایہ بینم از کار تو کیفر

مرا دو آتش سوزان چہ سوزی
چہ داری عیش من بر من مکدر

فرود آ زود ز این زین دبیا رام
فرو نہ یکسرہ و بر گیر ساغر

فغان زین بادپای کوہ دیدار
فغان زین رہ نورد بحر گستر

خرد زین سو کشید و عشق ز آن سو
فرو ماندم من اندر کار مضطر

بہ دلبر گفتم ای از جان شیرین
مرا بایستہ تر، وز عمر خوشتر

سفر بسیار کردم راست گفتی
سفرہای ہمہ بی سود و بی ضر

بدانم سرزنش کردی روا بود
گذشتت از گذشتہ یاد نآور

مخور غم می رہم درویش زین جا   ولیکن زود باز آئیم تونگر

زینتی علوی محمودی

زینتی علوی محمودی، سلطان محمود اور سلطان مسعود کے دربار کا شاعر ہے۔ ابوالفضل بیہقی نے اسے عہد غزنوی کے مشہور شعرا میں شمار کیا ہے۔ دربارِ مسعود میں انعام و اکرام کی جو بارشیں اس پر ہوتی تھیں، ان کا اکثر تذکرہ نویسوں نے ذکر کیا ہے۔ ابوالفضل[1] لکھتا ہے کہ زینتی کے ایک قصیدے پر خوش ہو کر سلطان مسعود نے حکم دیا کہ ایک ہاتھی اور ہزار درم اس کے گھر پہنچا دیئے جائیں۔ دوسری مرتبہ پھر ایک ہاتھی اور پچاس ہزار درم اس کے ہاں بھیجے گئے۔

زینتی کے بعض اشعار مشہور تذکروں میں ملتے ہیں۔ انہی سے یہ چند شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

آن قطرهٔ باران بر ارغوان بر   چون خوی بر بناگوش نیکوان بر

و آن فاختہ بر شاخ او نشستہ   عاشق شدہ بر صفتِ این و آن بر

و آن نرگس بین چشم باز کردہ   نازان ہمہ باغ و بوستان بر

بر خوید چکیدہ سر شک باران   مانند ستارہ بر آسمان بر

ای خداوند روزگار پناہ   مطربان را بخوان و بادہ بخواہ

تا بدان لعل می فرو شوئیم   کام ما راز گرد خشکی راہ

پس جوان مرد وار بر سازیم   مجلسی پر نہنگ و شیر آگاہ

میسرہ مطربان خوش سازیم   میمنہ دوستان نیکو خواہ

قلب نیزہ دست ما گیریم   از گل و سنبل شگفتہ بگاہ

---

[1] تاریخ بیہقی صفحہ ۱۳۱   [2] صفحہ ۲۷۸

بدل جوشن و زرہ پوشیم — برخود از دوستان خطا و گناہ
بر سر اسپر کنیم تا داریم — خویشتن را ز تیر غمزہ نگاہ
غم گریزد ز پیش ما چو نانک — خان و قیصر ز پیش شاہنشاہ
خسرو خسروان ملک محمود
ملت و ملک را ہمیشہ پناہ

منشوری سمرقندی

ابو سعد احمد بن محمد منشوری سمرقندی عہدِ غزنوی کا شاعر ہے۔ اس کے اشعار و قطعات تذکروں میں ملتے ہیں۔ چند اشعار جو اس نے آتش سدہ کی تعریف میں لکھے ہیں، درج ذیل ہیں۔

یکی دریا پدید آمد زمین از مشک و آب از زر
معلق موج زر نیش باوج اندر کشیدہ سر
نشیب و قعر آں دریا ہمہ پر رشتۂ مرجان
فراز موج او ہر سو ہمہ پر زہرہ از ہر
نہنگ سندروسنش بہ سیماب اندرون غلطان
دم تمساح زرنیش پریشان از گوہر
گہی چوں عبہری سیمین ہمی بر آسمان تازد
گہی چون ابر یاقوتین ہمی نالد بہ ابر اندر
ز زیرین گرد و از زنگش بدید آید ہمی لؤ لؤ
عقیقین گرد و از عکسش بگردون بر ہمی اختر
تو گوئی ہمت خسرو برای نعمت زائر
یکی زرین فلک خواہد بر آورد ہمی دیگر
بدست و تیغ و جام و جان بیاسای تیغہا آتین
چنانک از نام نعمت نیاساید ہمی رہبر

چه باید رفت خسرو را پس دشمن سوی مکران
بگو تا چون نهنگ او را بدم زی خود کشد لشکر

مسعودی غزنوی

مسعودی کو ترجمان البلاغت اور لباب الالباب میں غزنوی ظاہر کیا گیا ہے، لیکن ابوالفضل نے تاریخ بیہقی میں اسے رازی لکھا ہے۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ سلطان محمود نے سنہ ۴۳۰ھ مطابق ۱۰۳۸ء میں جشن مہرگان منعقد کیا، جس میں علما اور شعرا پر انعام واکرام کی بارشیں ہوئیں، لیکن سلطان نے مسعودی رازی کا قصیدہ سنا، تو دفعتاً غضب آلود ہو گیا، اور حکم دیا کہ اسے ہندوستان بھیج کر قید رکھا جائے۔ اس ناراضی کی وجہ یہ تھی کہ مسعودی نے قصیدے میں بادشاہ کو نصیحتیں کی تھیں، جو سلطان کو گراں گزریں۔ قصیدے کے دو شعر حسب ذیل ہیں۔

مخالفان تو موران بدند و مار شدند — برآر زود ز موران مار گشته دمار
مده زمانشان زین بیش و روزگار مبر — که اژدها شود ار روزگار یابد مار

۴۳۱ھ مطابق ۱۰۳۹ء میں پھر جشن مہرگان منایا گیا۔ اس موقع پر بھی شعرا اور علماء کو انعام واکرام سے نوازا گیا۔ اس تقریب میں امرا نے مسعودی رازی کی سفارش کی جس پر فرمان جاری ہوا کہ اسے تین سو درم انعام کے طور پر عطا کیے جائیں اور ہزار دینار ماہ بماہ بطور مشاہرہ دیئے جائیں، لیکن وہ ہندوستان ہی میں رہے۔ اس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

جاه جوی که می بجوی سیم — سیم و جز سیم زیر جاه درست
سیم را هر کسی بیابد و باز — جاه با اژدها بچاه درست

ای دل بر بنده هر چه توانی همی کنی — میدان فراخ یافته ای گوی زن هلا
عشق ترا و فاز تو پیشت ازانکه تو — از من جدا شدی و نشد عشق تو جدا

عطاردی امام ابوعبداللہ عبدالرحمٰن بن محمد عطاردی، محمود غزنوی کے دربار کا شاعر ہے۔ اس کے چند اشعار تذکروں میں ملتے ہیں، یہ اشعار اس کے فکر اور جذبات و احساسات کی گہرائی کا پتہ دیتے ہیں۔ چند اشعار درج ذیل ہیں۔

سیلی وارم برخ پر از خونِ جگر — آن روز کہ مژگانِ ترا بینم تر
ای چون شکر شکستہ از پا تا سر — مگری کہ تباہ گردد از آب شکر

شدیار و مرا بوسہ خوشنود نکرد — پرسش ننمود و نیز بدرود نکرد
آن آتش افروختہ جز دور نکرد — بر عشق بتان ہیچ کسی سود نکرد

بالیث طبری بالیث طبری کو بھی عوفی نے آل سبکتگین کے عہد کا شاعر لکھا ہے۔ اس کے اشعار تذکروں میں ملتے ہیں۔ چند اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

دلم میان دو زلف نہان شد ای مہروی — ز بہر آنکہ ز چشمت ہمی بپرہیزد
نہ بینی آن کہ چو تو زلف را بشانہ زنی — سر دو زلف تو در شانہ می در آویزد
دل من است کہ با شانہ کارزار کند — دمی آن میان کہ از و باد مشک می بیزد
ہمی بترسد کاو را بدان برد ز میان — چو دید چشمت ز و رستخیز بر خیزد
از ان قبل ہمہ شب مستمند تو لیث — بہ ہای ہای ہمی خون ز دیدگان ریزد

غزنوی دور کے علما

سلطان محمود غزنوی کا دربار علم و فضل کا بہت بڑا مرکز تھا، یہاں شعرا کے

علاوہ مشہور آفاق علما بھی جمع تھے، جن کی گراں قدر تالیفات آج بھی علمی تحقیق کا مفید ترین ماخذ سمجھی جاتی ہیں۔ ان میں ابوریحان البیرونی، اور ابوالفضل بیہقی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ شیخ الرئیس بوعلی سینا اور بدیع الزمان ہمدانی کو اگرچہ غزنوی دربار سے تعلق نہ تھا، لیکن یہ اسی زمانے کے عالم تھے، اس لیے ان کا ذکر بھی اسی دور کے علما میں آئے گا۔

ابوریحان البیرونی (۳۶۲-۴۴۰ ہجری مطابق ۹۷۲-۱۰۴۸ عیسوی)

ابوریحان چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کے علما میں سے ہے۔ محققین اسے علوم عقلی یعنی علم ہیئت، علم طبعیات، علم جغرافیہ اور ریاضیات کے بزرگ ترین علما میں شمار کرتے ہیں۔

ابوریحان خوارزم میں ۳۶۲ھ مطابق ۹۷۲ء میں پیدا ہوا اور یہیں علوم عقلی کی تعلیم پائی۔ ابوریحان شہر سے باہر ایک محلے میں رہتا تھا، جو "بیرون" کے نام سے موسوم تھا۔ اسی محلے کی نسبت سے بالآخر ابوریحان نے البیرونی کے لقب سے شہرت پائی۔

البیرونی نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد خوارزم میں شہزادہ مامون بن مامون کے دربار سے تعلق پیدا کیا، جہاں علم و فضل کی بدولت اس کی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ یہاں سے کچھ عرصے بعد گرگان چلا گیا، جو زیاری حکمران شمس المعالی قابوس بن وشمگیر تاجدار عراق کا دارالسلطنت تھا۔ یہاں بھی اسے بڑا اقتدار حاصل ہوا۔ اس نے اپنی مشہور کتاب "الآثار الباقیہ" اسی دربار میں تالیف کی اور قابوس بن وشمگیر کے نام منسوب کی۔ یہاں سے چل کر البیرونی پھر مامونی دربار میں آ گیا اور چند سال اس دربار میں گزار کر سلطان محمود غزنوی کی دعوت پر غزنی چلا گیا۔

البیرونی کو سلطان محمود کی یورشوں میں ہندوستان آنے جانے کے موقعے

ملتے رہتے تھے۔ یہاں رہ کر اس نے سنسکرت زبان سیکھی اور اہل ہند کے مذاہب علوم کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نے ایک کتاب "تحقیق ماللہند" عربی زبان میں لکھی، جس میں ہندوؤں کے مذہبی عقائد اور علوم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

البیرونی کی ایک اور تصنیف "التفہیم لاوایل صناعت التنجیم" علم نجوم پر ہے۔ یہ بھی عربی زبان میں لکھی گئی تھی، لیکن بعد میں خود ہی مؤلف نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ علم نجوم پر ایک اور کتاب "قانون مسعودی" تالیف کی، جو اس نے سلطان مسعود کے نام منسوب کی۔ ان کے علاوہ ابوریحان نے متعدد اور کتابیں بھی عربی زبان میں تالیف کیں۔ اس کی تالیفات کی تعداد ایک سو تیرہ بتائی جاتی ہے۔ ابوریحان نے ۴۴۰ھ مطابق ۱۰۴۸ء میں وفات پائی۔

شیخ الرئیس ابوعلی سینا

بوعلی سینا کا شمار دنیا کے ان عظیم ترین دانشمندوں میں ہوتا ہے، جن کی تعلیم سے اہل مشرق اور اہل مغرب نے یکساں فیض اٹھایا۔

بوعلی سینا کے والد بلخ کے رہنے والے تھے، نوح بن منصور سامانی کے عہد میں بلخ سے چل کر بخارا آ گئے۔ ابن سینا بخارا کے قریب قصبہ خرمیثن میں ۳۷۰ ہجری مطابق ۹۸۰ عیسوی میں تولد ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد فقہ، منطق، ریاضی اور فلسفہ کی تعلیم میں مشغول ہو گئے۔ فارابی کی منتہیانہ تصانیف کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ علم ماورالطبیعت اور علم الٰہیات کی طرف رجوع ہوئے اور ان علوم میں بھی دسترس حاصل کی۔ پروفیسر براؤن لکھتے ہیں کہ "ابن سینا فلسفے میں ارسطو اور طب میں بقراط اور جالینوس کی تعلیم سے مستفید ہوا، اور پھر اس عالم بے بدل نے نہ صرف ایشیا، بلکہ یورپ بھر کو اپنے علم کی شعاعوں سے منور کیا۔"

ابن سینا ایک طرف فلسفے کے مسائل کی چھان بین کرتے۔ تو دوسری طرف

علم طب کی تحقیقات میں مصروف رہتے ۔ ساتھ ہی ساتھ آپ لوگوں کا علاج معالجہ بھی کرتے تھے۔ نوح بن منصور سامانی، مجد الدولہ دیلمی اور شمس الدولہ دیلمی کا بہت کامیابی سے علاج کیا، اس سے آپ کی شہرت دُور دُور پھیل گئی۔

نوح بن منصور آپ کی بہت عزّت کرتا تھا۔ اس نے اجازت دے رکھی تھی۔ کہ اس کے فقید المثال کتب خانے سے آپ جب چاہیں استفادہ کریں۔ یہ وہی کتب خانہ ہے جس کے متعلق خود ابنِ سینا لکھتے ہیں کہ یہاں بے شمار کتابیں ایسی ہیں، جن کے ناموں سے بھی علماء ناواقف ہیں۔ اس میں متعدد کتابیں ایسی تھیں جو اس سے پہلے میری نظر سے نہیں گزری تھیں، نہ یہاں سے چل کر پھر کبھی دیکھنے میں آئیں۔

شروع شروع میں ابنِ سینا نے سامانیوں کے دارالسلطنت بخارا ہی میں اقامت اختیار کی، لیکن بعد میں مامون بن مامون خوارزم شاہی کے دربار میں آ گئے۔ کچھ عرصہ یہاں اطمینان سے گزرا تھا، کہ اتنے میں سلطان محمود غزنوی نے دربار خوارزم کے علماء کو غزنی آنے کی دعوت دی۔ آپ نے غزنی جانا پسند نہ کیا اور خوارزم کو خیرباد کہہ کر آ گئے۔ سرگردانی کی حالت میں پھرتے پھراتے آل زیارہ کے پایۂ تخت گرگان آئے، پھر رَی، ہمدان اور اصفہان ہوتے ہوئے شمس الدولہ بن فخر الدولہ دیلمی کی خدمت میں پہنچے۔ جہاں آپ کے علم وفضل کی بدولت آپ کو وزارت کا منصب سونپ دیا گیا۔

وزارت کے اہم ترین امور انجام دینے کے ساتھ ساتھ آپ علم وہنر کے طلب گاروں کو فلسفہ اور طب کا درس بھی دیا کرتے تھے۔ کچھ فراغت ہوتی، تو اپنی مشہور کتاب "شفا" تصنیف کرتے۔ ابنِ سینا کی تصنیفات کی تعداد ایک سو سے زائد بتائی جاتی ہے۔ ان میں زیادہ مشہور شفا، قانون اور اشارات ہیں۔ شفا، منطق، طبیعیات، علم الٰہیات اور ریاضیات پر مشتمل ہے۔ قانون طب کا عظیم ترین نسخہ ہے اور اشارات منطق اور فلسفہ سے متعلق ہے۔ ان کتابوں کی تعلیم مشرق اور

مغرب کی درسگاہوں میں دی جاتی رہی ہے۔ فارسی میں دانش نامہ علائی آپ کی ایک مشہور تصنیف ہے۔

جیسا کہ ظاہر ہے علم و فضل میں آپ کا مقام بہت بلند ہے لیکن ادب و شعر کے لحاظ سے بھی آپ کا مرتبہ کچھ کم اونچا نہیں علم ادب میں دو مشہور قصے "حیّ بن یقظان" اور سلامان والسبال" آپ کی یادگار ہیں۔ آپ کے شاگرد جوزجانی کا بیان ہے کہ عربی زبان میں ایک لغت بھی آپ نے مرتب کی تھی، جو آج کل ناپید ہے۔

فارسی اشعار بو علی سینا فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ نمونے کے طور پر ایک رباعی ذیل میں لکھی جاتی ہے۔

کفر چو منی گزاف و آسان نبود | محکم تر از ایمان من ایمان نبود
در دہر چو من یکی و آنہم کافر | پس در ہمہ دہر یک مسلمان نبود

بو علی سینا کا سالِ وفات ۴۲۷ ہجری مطابق ۱۰۳۵ عیسوی ہے۔

بدیع الزمان ہمدانی (وفات ۳۹۸ ہجری مطابق ۱۰۰۷ عیسوی) بدیع الزمان ہمدانی آلِ زیار کے دربار کا وہ نامور ادیب ہے، جس نے پہلی مرتبہ حکایات و روایات مسجع عربی نثر میں لکھیں۔ اور مقامات نویسی کا فن ایجاد کیا۔

ابو علی مسکویہ (وفات ۴۲۱ ہجری مطابق ۱۰۳۰ عیسوی) ابو علی مسکویہ کا شمار اس دور کے مشہور ادبا اور مورخین میں ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے پہلے یہ دین آتش پرستی کا پیرو تھا، بعد میں حلقہ بگوش اسلام ہوا۔ ابو علی مسکویہ آل بویہ کے حکمران عضد الدولہ کے دربار سے

۱؎ اسی نام کے دو قصے لکھے گئے تھے۔ ایک بو علی سینا کی تصنیف ہے اور دوسرا ابن طفیل کا نتیجۂ فکر ہے۔

وابستہ تھا۔ عربی زبان میں اس کی دو مشہور کتابیں "تجارب الامم" اور "تہذیب الاخلاق و تطہیر الاعراق" ہیں۔ موخر الذکر کتاب حکمت عملی اور علم اخلاق پر مشتمل ہے حکیم نصیر الدین طوسی نے اس کا فارسی میں تلخیص و ترجمہ کر کے اور اس میں کچھ اپنی طرف سے اضافہ کر کے "اخلاق ناصری" کتاب تالیف کی ہے۔

ابو منصور عبد الملک بن محمد ثعالبی نیشاپوری ایک مشہور عربی تذکرہ "یتیمۃ الدہر" کا مؤلف ہے۔ اس میں شعرائے عرب کے ساتھ ان ایرانی شعراء کا حال بھی لکھا گیا ہے۔ جو عربی میں شعر کہتے تھے۔ اس کتاب کی تکمیل کے بعد ضرورت محسوس ہوئی کہ کچھ اور شعرا کا حال بھی ضبطِ تحریر میں لایا جائے، چنانچہ ثعلبی نے اس کتاب کا تکملہ "تتمہ یتیمۃ الدہر" کے نام سے تالیف کیا۔

ابو نصر بن مشکان سلطان محمود غزنوی کے دیوانِ رسالت میں ایک فاضل شخص شیخ عمید ابو نصر بن مشکان تھا، جو عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں بڑی دسترس رکھتا تھا۔ محمود کے بعد جب مسعود بن محمود تخت نشین ہوا تو اس وقت بھی وہ دیوانِ رسالت کے اسی منصب پر فائز رہا۔ ابو نصر کی کوئی مستقل ادبی یادگار تو نہیں لیکن تاریخ بیہقی اور محمد عوفی کی تالیف "جوامع الحکایات" میں اس کی انشا کے نمونے ملتے ہیں۔

ابو الفضل بیہقی یہ عظیم مورخ ابو نصر بن مشکان کا شاگرد تھا۔[1] ابو الفضل ۳۸۵ ہجری مطابق ۹۹۵ عیسوی میں علاقہ بیہق کے شہر حارث آباد میں پیدا ہوا۔ اوائل عمر میں نیشاپور میں تعلیم پائی۔ تعلیم سے

---

[1] مقدمہ تاریخ بیہقی مصحح ڈاکٹر غنی و ڈاکٹر فیاض (صفحہ د)

فراغت پاکر غزنی کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی اور اسے دیوان رسائل کے رئیس ابونصر مشکان کا نائب دبیر مقرر کیا گیا۔ یہاں اس نے ابونصر کی رہنمائی میں فنِ دبیری میں کمال حاصل کیا۔"

عوفی لکھتا ہے کہ ابوالفضل بیہقی غزنوی حکمران عبدالرشید کے عہد میں دیوان رسائل کا رئیس مقرر ہوا لیکن زیادہ دیر اس منصب جلیلہ پر فائز نہ رہ سکا۔ ابونصر کی وفات کے بعد اس کے سب حریف بیہقی کے دشمن ہو گئے، جو اکثر عبدالرشید کے کان بھرتے رہتے تھے۔ آخر ان کی تدبیریں کامیاب ہو گئیں اور بیہقی کو اس منصب سے ہٹا کر زندان میں ڈال دیا گیا اور اس کا مال و متاع بھی ضبط کر لیا گیا۔ عبدالرشید بالآخر ایک غلام کے ہاتھوں قتل ہوا تو بیہقی کو زندان سے نجات ملی۔" اس کے بعد اس نے کبھی کسی دربار کی طرف رجوع نہ کیا، اور باقی زندگی تصنیف و تالیف میں گزار دی۔

تاریخ بیہقی

یہ ضخیم اور عظیم تاریخ بیہقی کی یادگار تھی۔ جس کا بیشتر حصہ اب ناپید ہے۔ بقول ابن فندق یہ کتاب تیس جلدوں پر مشتمل تھی لیکن افسوس کا مقام ہے کہ پوری تاریخ زمانے کی دست برد سے محفوظ نہیں رہ سکی۔ اس کا اب صرف ایک آخری حصہ باقی رہ گیا ہے، جو سلطان محمود کے بیٹے سلطان مسعود کے عہد سے متعلق ہے۔ یہ حصہ "تاریخ بیہقی" یا "تاریخ مسعودی" کے نام سے موسوم ہے۔

تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ "تاریخ بیہقی" ایک غیر جانبدار مورخ کا عظیم تاریخی کارنامہ ہے، جس میں تعصب کا شائبہ تک نہیں۔ ساری تاریخ ایک دیانت دار مورخ کے زاویہ نگاہ سے لکھی گئی ہے اور تاریخ نویسی کی ایک قابلِ تقلید مثال ہے۔

سب سے پہلے تاریخ بیہقی کو ایک انگریز مستشرق مورلی نے ہندوستان میں طبع کرایا۔ پھر کپتان ناسولیس نے ۱۸۶۲ء مطابق ۱۲۷۹ھ میں کلکتہ میں شائع کرایا۔ اس کے بعد ادیب پشاوری نے تصحیح کے بعد اسے طہران میں چھپوایا۔ پھر یہ تاریخ آقائے سعید نفیسی کے زیر اہتمام دوسری مرتبہ ایران میں شائع ہوئی اور حال ہی میں ڈاکٹر غنی اور ڈاکٹر فیاض کی متحدہ کوشش سے ایک مرتبہ پھر پوری آب و تاب سے ایران میں شائع ہوئی ہے۔

تاریخ بیہقی کا انداز نگارش

اس تاریخ کا انداز نگارش پہلے دور کی نثر سے بہت مختلف ہے۔ جملوں میں پہلی مرتبہ اختصار کی بجائے تفصیل نظر آتی ہے۔ عربی الفاظ اور ترکیبیں بھی فارسی نثر کا جزو بن گئی ہیں۔ عبارت کو موثر بنانے کے لیے مناسب حکایتیں اور موزوں اشعار بھی شامل کتاب کیے گئے ہیں، کہیں کہیں نثر میں شاعرانہ چاشنی بھی ہے۔ صنائع لفظی سے بھی کام لیا گیا ہے۔ نمونے کے طور پر چند سطور ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

"ہمی گوید ابوالفضل محمد بن الحسین بیہقی رحمۃ اللہ علیہ، ہر چند این فصل از تاریخ مسبوق است بر آنچه بگذشت در ذکر، لیکن در رتبه سابق است۔ ابتدا بباید دانست که امیر ماضی رحمۃ اللہ علیہ شگوفه نهالی بود که ملک از آن نهال پیدا شد و در رسید و چون امیر شهید مسعود بر تخت ملک جایگاه پدر نشست و آن افاضل که تاریخ امیر عادل سبکتگین را براندند، از ابتدائی کودکی وی تا آنگه که بسرای الپتگین افتاد، حاجب بزرگ و سپاه سالاران سامانیان و کارهای درشت که بروی بگذشت تا آنگاه که درجه امارت غزنین یافت، و در آن عز گذشته شد و کار با میر محمود رسید، چنانکه بنشته اند و شرح داده و من نیز تا آخر عمرش بنشتم، آنچه بر ایشان بود کردند و آنچه مرا دست داد، به مقدار دانش خویش نیز کردم، تا بدین پادشاه بزرگ رسیدم۔"

اس عبارت سے پتا چلتا ہے کہ بیہقی نے سلطان سبکتگین اور سلطان محمود کے زمانے تک کی بھی تاریخ لکھی تھی، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ بیہقی میں مرادف الفاظ اور تشبیہوں اور استعاروں سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اس مختصر سی تاریخ میں گنجائش نہیں کہ تاریخ بیہقی کی نثر کی تمام خصوصیات کی مثالیں درج کی جائیں اور مؤلف کے طریق استدلال پر بحث کی جائے۔ اس لیے انہی مذکورہ سطور کی مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

زینۃ الکتاب[1] بیہقی نے آداب کتابت پر بھی ایک کتاب لکھی تھی۔ لیکن اب یہ ناپید ہے۔ بیہقی اپنے ایک رسالے کا بھی ذکر کرتا ہے۔ اس میں ان مراسلات کی نقلیں تھیں۔ جو وہ حکومت غزنوی کی طرف سے لکھا کرتا تھا لیکن یہ بھی ناپید ہے۔

ترجمان البلاغت فن عروض و بلاغت کی یہ کتاب غزنوی عہد کے شاعر فرخی کی تصنیف ہے لیکن آج کل ناپید ہے۔ اسی موضوع پر ایک اور کتاب "خجستہ نامہ" بہرامی نے تصنیف کی تھی۔ لیکن اس کا بھی صرف تذکروں ہی میں نام باقی رہ گیا ہے۔

زین الاخبار یہ ابوسعید عبدالحی بن ضحاک بن محمود گردیزی کی تالیف ہے اور آفرینش عالم سے سلطان مودود بن مسعود غزنوی تک کے حالات پر مشتمل ہے اس میں مختلف قوموں کے رسوم و حالات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کا ذکر سامانی عہد کی کتابوں میں آچکا ہے

دورِ غزنویہ کی نثر

سامانی عہد میں ایرانی علما نے اگرچہ فارسی نثر میں ضخیم کتابیں تالیف کیں، لیکن ان

---

[1] تاریخ بیہقی مصحح ڈاکٹر غنی و ڈاکٹر فیاض۔ مقدمہ صفحہ ز۔

میں بشیتر عربی سے فارسی میں ترجمہ کی گئی تھیں۔ غزنوی دور میں علما نے فارسی نثر پر اور بھی زیادہ توجہ دی، چنانچہ اُن کی کوشش اور تحقیق سے بعض بیش قدر علمی کتابیں تصنیف و تالیف ہوئیں۔ ان میں دانش نامہ علائی، التفہیم، تاریخ بیہقی اور ترجمان البلاغت خاص طور سے مشہور ہیں۔

دانش نامہ علائی

یہ شیخ الرئیس بوعلی حسین بن عبداللہ بن سینا کی تالیف ہے۔ اور علاء الدولہ پسر کاکویہ کے نام کی نسبت سے "دانش نامہ علائی" کے نام سے موسوم ہے۔ جیسے کہ مؤلف نے خود دیباچے میں لکھا ہے، یہ کتاب فارسی دری میں لکھی گئی ہے اور اس میں علم منطق، علم طبیعات، علم ہیئات، علم موسیقی اور علم مافوق الطبیعات پر بحث کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر دیباچے کی چند سطور درج ذیل ہیں۔

"سپاس و ستائش مر خداوند آفریدگار بخشایندہ مر خرد را و درود بر پیامبر گزیدۂ وی محمد مصطفےٰ و بر اہل بیت و یاران وی۔ فرمان بزرگ خداوندِ ما۔ ملک عادل عضد الدین، علاء الدولہ، ابوجعفر محمد بن دشمنزیار کہ زندگانیش دراز باد و بخت پیروز باد و پادشاہیش بر افزون آمد، من بندہ و خادم درگاہ وی، کہ یافتہ ام اندر خدمت وی، ہمہ کام ہای خویش از ایمنی و بزرگی و شکوہ و کفایت پرداختن بعلم، و نزدیک داشتن، کہ بایدمر خادمان مجلس وی را کتابی تصنیف کنم بپارسی دری کہ اندر وی اصل ہا و نکتہا پنج علم از علم ہای حکمت پیشینگان گرد آورم، بغایت مختصری یکی: علم منطق کہ وی علم ترازوست، دوم: علم طبیعات کہ علم آن چیزہاست کہ بحس بشایند و اندر جنبش و گردش اند و سوم، علم ہیئات و نہاد عالم و حال صورت و جنبش آسمان ہای و ستارگان چنانکہ باز نمودہ اند کہ چون بشائیست حقیقت آن دانستن، چہارم: علم موسیقی و باز نمودن سبب سازو ناسازی آواز ہا و نہادن لحن ہا و پنجم: علم آنچہ بیرون از طبیعت است۔"

دانش نامہ علائی کی زبان سادہ اور رواں ہے۔ عربی الفاظ کی آمیزش بہت کم

ہے "مر" "اندر" "ہمیدون" وغیرہ الفاظ، جو قدیم نثر کا خاصہ ہیں۔ اس کتاب میں بھی موجود ہیں۔ قدیمی نثر کی کتابوں میں "د" کو "ذ" کی صورت میں لکھتے تھے، اس کتاب میں بھی "ذ" کی یہی صورت قائم ہے۔ اس لحاظ سے دانش نامہ علائی کا انداز بھی سبک قدیم کا سا ہے۔

اس کے علاوہ بوعلی سینا نے دو رسالے "قراضہ طبیعیات" اور "رسالہ نبض" بھی فارسی میں تالیف کیے ہیں۔ ان میں بھی سبک قدیم ہی کی پیروی کی گئی ہے۔

التفہیم لاوائل صناعت التنجیم

یہ ابوریحان البیرونی کی ایک مشہور تالیف ہے، جو عربی میں لکھی گئی تھی، بعد میں مؤلف نے خود ہی اس کا ترجمہ فارسی میں کیا۔

"التفہیم" غزنوی دور کی مشہور کتاب ہے۔ اس دور کی نثر میں سبک قدیم کی نسبت کافی تبدیلیاں ہوئیں، لیکن معلوم ہوتا ہے جدید ادب نے ابوریحان کو متاثر نہیں کیا۔ چنانچہ یہ کتاب سبک قدیم میں ہی لکھی گئی۔ اس میں وہی سادگی، روانی اور اختصار پایا جاتا ہے، جو قدیمی نثر کا خاصہ ہے اور یہی لفظ "التفہیم" میں "ی" بکثرت دیکھنے میں آتا ہے۔ اس کے علاوہ "د" بھی "ذ" ہی کی صورت میں لکھی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

"فلک چیست؟"

فلک چیست؟ فلک جسمی است، چون گوی گردندہ جای خویش واندر میان او چیزہاست کہ حرکت ایشان بہ سرشت خویش بخلاف حرکت فلک است و ما اندر میان او ئیم و او را فلک نام کردند، از بہر حرکت او کہ گردان است، ہمچوں حرکت باذریسہ[1] و فیلسوفان او را

---

[1] باذریسہ: باد ریس و چرم پا چوبی مدور، در گوی دوک کنند بجہت آنکہ ریسمان کہ می ریسند یک جا جمع شود و بہ عربی فلکہ گویند۔ برہان۔

"اثیر" نام همی کنند"

"فلک یکی است یا بیشتر؟

فلک ها هشت گوی اند یک به دیگر پیچیده، همچون پیچیدن توی های پیاز و فرو ترین فلک ها آن است که بما نزدیک تر است، ماه اندر او همی رود و همی بر آید و فرود آید تنهائی انبار[1]. و هر کره ای را مقداریست از ستبری و کره دوم که زبر کره قمر است و پنجم آن مریخ و ششم آن مشتری و هفتم آن زحل. این گوی های هفت سیاره رونده اند، و زبر این همه گوی ستارگان بیابانی را ثابت خوانند، ایشان را یعنی ایستاده....."

---

۱ انبار، شریک.

آٹھواں باب

دورِ سلجوقیہ

(۴۲۹ھ تا ۵۵۲ھ ہجری مطابق ۱۰۳۷ تا ۱۱۵۷ عیسوی)

سٹینلے لین پول[1] اپنی تالیف "اسلامی سلطنتیں" میں لکھتا ہے کہ "سلجوقی ترکوں سے اسلامی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے، انھیں جب اقتدار حاصل ہوا، تو خلافت بغداد روبزوال تھی۔ وہ عظیم الشان حکومت جو کبھی ایک خلیفۃ المسلمین کے ماتحت بغداد اور ایشیائے کوچک سے لے کر ہسپانیہ اور افریقہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اب چند چھوٹی چھوٹی حکومتوں پر مشتمل رہ گئی۔ ہسپانیہ اور افریقہ خلیفہ کے ہاتھوں سے نکل گئے۔ شام اور ایشیائے کوچک میں عرب امرا نے آزاد حکومتیں قائم کرلیں۔ ایک ایران بچا تھا، لیکن یہاں بھی آل زیار اور غزنویوں کی خود مختار حکومتیں قائم ہوئیں۔ آل بویہ اور آل زیار کی حکومتیں تو پرانی تھیں، غزنویوں کی حکومت البتہ نئی تھی، لیکن محمود کی وفات کے ساتھ ہی اس میں دفعتہً انحطاط آگیا۔ اب ایک مضبوط اسلامی حکومت قائم ہونے کی صرف یہی تدبیر باقی تھی کہ کوئی انقلاب آتا، جو چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو ختم کرکے، اُن کی جگہ کوئی وسیع اور مضبوط سلطنت قائم کرتا چنانچہ ایسا ہی انقلاب سلجوقیوں کے حملے کی صورت میں رونما ہوا۔"

---

[1] بحوالہ لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم ص ۱۶۵

سلطان محمود غزنوی اور سلجوقی ترک

سلجوقی، غز ترکوں کی ایک شاخ تھے۔ سلجوقی خاندان کا مورث اعلیٰ دُقاق، سلجوق کا باپ تھا، جس کے نام پر ایک عظیم الشان سلجوقی عہد کی بنیاد رکھی گئی۔ دُقاق اپنے قبیلے کے ہمراہ ترکستان سے نکل کر ماوراءالنہر آ گیا۔ سلطان محمود نے اس وجہ سے انھیں ماوراءالنہر کے گرد و نواح میں بسنے کی اجازت دے دی کہ ان کی وجہ سے اس کی ایرانی سرحدیں محفوظ ہو جائیں گی۔ لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ انہی سے محمود کو خطرہ پیدا ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ محمود نے سلجوق کے بیٹے اسرائیل کو کہلا بھیجا کہ اگر ضرورت آن پڑے، تو وہ کتنی کمک بھیج سکتا ہے۔ اسرائیل نے جواب دیا، اگر سلطان اپنا ایک تیر بھیج دے، تو ایک لاکھ سلجوقی ترک خدمت کے لیے حاضر ہو جائیں گے لہٰذا اگر وہ ساتھ میں ایک کمان بھیجے گا، تو دو لاکھ ترک اور شریک کارزار ہو جائیں گے۔ محمود نے سلجوقی ترکوں کی جمعیت کا حال سُنا، تو سخت گھبرایا اور ان کی جمعیت کو توڑنے کی فکر کرنے لگا۔ آخر موقع پا کر اسرائیل کو گرفتار کر کے ہندوستان کے قلعہ کالنجر میں نظر بند کر دیا۔ جہاں وہ سات سال رہ کر دنیا کو خیرباد کہہ گیا۔ آخر محمود نے سلجوقیوں کو ڈرا دھمکا کر اُن کا رُخ نسا اور ابیورد کے علاقوں کی طرف پھیر دیا۔

محمود کے جانشین

سلطان محمود نے اپنی زندگی میں چھوٹے بیٹے محمد بن محمود کو ولی عہد نامزد کیا تھا۔ چنانچہ باپ کی وفات پر وہی تخت نشیں ہوا، لیکن اُس کے بڑے بھائی مسعود بن محمود نے تخت و تاج اس سے چھین کر خود اس کی جگہ حکومت سنبھالی۔ اب صورتِ حال کچھ بگڑ رہی تھی۔ ادھر خراسان کے علاقے میں غز ترک تاخت و تاراج کر رہے تھے، ادھر طبرستان اور گرگان کے زیاری شہزادوں اور خوارزم کے عامل نے غزنوی اطاعت کا جوا اتار پھینکا۔ ساتھ ہی ہندوستان میں غزنوی حکومت کے خلاف بغاوت کے آثار رونما ہونے لگے۔ لیکن

مسعود نے بڑی پامردی سے ان سب خطرات کا مقابلہ کیا۔ ۴۲۶ھ ہجری مطابق ۱۰۳۷ عیسوی میں اس نے ہندوستان سے کثیر فوج لے کر غز ترکوں کو خراسان کے علاقوں سے مار بھگایا۔ پھر طبرستان پر حملہ کر کے زیاری شہزادوں کو مطیع و منقاد کیا۔ ان مہموں سے فراغت پا کر سلطان مسعود نے ہندوستان کا رُخ کیا، جس کی اہمیت اس کی نگاہوں میں بہت زیادہ تھی۔

غزنوی عہد کا خاتمہ

اسرائیل سلجوقی کے بھائی میکائیل کے دو بیٹے چغری بیگ اور طغرل بیگ تھے، جنھوں نے سلطان مسعود کو غز ترکوں کے خلاف مدد دی تھی۔ لیکن بالآخر ان کی وفاداری دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ مسعود کے ہندوستان روانہ ہونے کے دوسرے ہی سال چغری بیگ نے مرو پر حملہ کر دیا۔ اور مرو کے غزنوی جرنیل کو شکست دے کر ۴۲۹ھ ہجری مطابق ۱۰۳۷ عیسوی میں مرو پر قابض ہو گیا۔ اس سے اگلے سال طغرل نے یلغار کر کے نیشاپور فتح کر لیا۔ پھر رفتہ رفتہ سارا خراسان سلجوقیوں کے تسلط میں آ گیا۔ اسی سال، یعنی ۴۳۰ھ ہجری مطابق ۱۰۳۸ عیسوی سے سلجوقی عہد کی ابتدا ہوتی ہے۔

مسعود نے جو اب ہندوستان کی بغاوتوں میں الجھا ہوا تھا، یہ سنا، تو ہندوستان سے خراسان آیا اور صورتِ حال کا مردانہ وار مقابلہ کیا، لیکن آخر ۴۳۱ھ ہجری مطابق ۱۰۳۸ عیسوی میں اسے سلجوقیوں کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ اس پر بھی اس نے ہمت نہ ہاری اور ہندوستان واپس آ کر لشکر فراہم کرنے میں مصروف ہو گیا۔ مگر بدنصیبی نے یہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ ہندوستانی فوج نے مسعود کے خلاف بغاوت کر دی اور وہ تخت و تاج سے دست بردار ہو کر بالآخر قتل ہوا۔ اور تیسرے ہی سال سلجوقیوں نے مودود بن مسعود کو ایک فیصلہ کن شکست دے کر ایران سے کلیتہً غزنوی دور کا خاتمہ کر دیا۔

سلجوقیہ دور کا آغاز

عباسیہ خلافت اگرچہ بہت کمزور ہو چکی تھی، لیکن ایرانی

حکمرانوں کے لیے اب بھی یہ ضروری تھا کہ خلیفۃ المسلمین سے حکومت کا اختیار نامہ حاصل کریں۔ چنانچہ سلجوقی حکمرانوں نے بھی خلیفہ بغداد قائم باللہ سے مہر تسلیم ثبت کرانے کے لیے اسے اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ خلیفہ نے سلجوقی حکمرانوں کی عرضداشت منظور کرلی اور آل بویہ کی بجائے طغرل سلجوقی کے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کرنے کا حکم صادر کیا۔

سلجوقیوں نے رفتہ رفتہ تمام ایران کو اپنے تسلط میں لے لیا اور ایران بھر میں وسیع و عریض سلطنت قائم کرلی۔ آخر اس مملکت کی تقسیم یوں ہوئی۔ بست، ہرات اور سیستان، سلجوق کے بیٹے موسیٰ ارسلان بیغو کے حصے میں آئے اور موسیٰ ارسلان کے بھتیجوں جغری بیگ داؤد اور طغرل کے حصے میں مرو اور عراق آئے۔ جغری بیگ کے دو بیٹوں قاورت اور یاقوتی کو کرمان، طوس، طباس، آذربائیجان، ابخاز اور زنجان کے علاقے ملے اس کے تیسرے بیٹے الپ ارسلان نے اپنے چچا طغرل بیگ کے ساتھ رہنا پسند کیا جس نے رے کو اپنا دارالسلطنت بنالیا تھا۔ ہمدان کا علاقہ ابراہیم بن اینال بن سلجوق کو دیا گیا۔ اور موسیٰ ارسلان کے بیٹے قتلمش کے حصے میں گرگان اور دامغان کے علاقے آئے۔

طغرل بیگ ۴۲۹ تا ۴۵۵ھ ہجری مطابق ۱۰۳۷ تا ۱۰۶۳ عیسوی

طغرل بیگ نے اپنی فتوحات سے فارغ ہو کر چاہا کہ خلیفہ القائم سے ملاقات کا شرف حاصل کرے۔ چنانچہ وہ بغداد آیا۔ خلیفہ نے اس کی بڑی عزت افزائی کی اور تخت خلافت پر اپنے پہلو میں جگہ دی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد طغرل کی بھتیجی یعنی الپ ارسلان کی بہن ارسلان خاتون بڑی شان و شکوہ کے ساتھ خلیفۃ المسلمین کے ساتھ بیاہ دی گئی۔ اور طغرل تیرہ ماہ کے قیام کے بعد خلیفہ کی طرف سے "ملک المشرق والمغرب" کا خطاب حاصل کر کے واپس ہوا۔

الپ ارسلان ۴۵۵ تا ۴۶۵ھ ہجری مطابق ۱۰۶۳ تا ۱۰۷۲ عیسوی

طغرل نے

۴۵۵ ہجری بمطابق ۱۰۶۳ عیسوی میں وفات پائی۔ طغرل نے اپنی زندگی میں الپ ارسلان کو ہی اپنا جانشین بنایا تھا، لیکن اس کے وزیر عمید الملک الکندری نے طغرل کے بھائی سلیمان کی حمایت کی۔ لیکن اس کی حمایت بے اثر ثابت ہوئی اور الپ ارسلان تخت نشین ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ الپ ارسلان نے وزارت کا منصب نظام الملک طوسی کو سونپا۔ الکندری نہ صرف وزارت سے معزول ہوا، بلکہ قتل بھی کر دیا گیا۔

الپ ارسلان کی مدت حکومت اگرچہ بہت مختصر ہے، لیکن اس کے عہد میں سلجوقی سلطنت کو بہت وسعت ہوئی۔ اس نے ہرات اور ماوراء النہر کا علاقہ جلد فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ عرب میں فاطمیوں کی خلافت کا غلبہ تھا اس سے عربوں کو نجات دلائی اور مکہ اور مدینہ کو ان کے تسلط سے آزاد کرایا۔ ۴۶۴ ہجری بمطابق ۱۰۷۱ عیسوی میں الپ ارسلان نے ایشیائے کوچک میں رومی لشکر کو شکست دے کر رومی بادشاہ دیوجینس رومانس کو اسیر کیا، لیکن خراج ادا کرنے کی شرط پر اسے آزاد کر دیا پھر خوارزم کے حکمران کے خلاف لشکر کشی کر کے خوارزم کو فتح کیا۔ ان مہموں سے فارغ ہو کر اس نے ۴۶۵ ہجری بمطابق ۱۰۷۲ عیسوی میں ترکوں کے خلاف جنگ کرنے کا ارادہ کیا، اور دو لاکھ جانبازوں کا لشکر جرار لے کر دریائے جیحوں کے کنارے آ پہنچا۔ یہاں ایک عجیب حادثہ پیش آیا، جس سے الپ ارسلان کی یہ مہم ناکام ہو گئی۔ ایک شخص یوسف خوارزمی کو الپ ارسلان کی خدمت میں پیش کیا گیا، جو سلجوقیوں کے خلاف لڑا تھا اور خوارزم کے قلعے کی حفاظت میں ہمت اور مردانگی کے جوہر دکھائے تھے۔ الپ ارسلان نے اس سے بعض سوالات دریافت کیے، لیکن ان سوالات کا جواب اس نے بڑی گستاخی سے دیا، جس سے بادشاہ سخت برافروختہ ہوا، اور حکم دیا کہ اس کے ہاتھ پاؤں پر میخیں ٹھونک کر اسے ہلاک کیا جائے۔ قیدی نے بدکلامی کرتے ہوئے کہا۔ "مجھ جیسے بہادر انسان کا یہ انجام! کہ اسے یوں ذلت کی موت مرواتے ہو؟" الپ ارسلان نے طیش میں آ کر نگران سپاہیوں کو ایک طرف ہٹ جانے کا حکم دیا اور کمان

پکڑ کر خود اس پر تیر چلایا۔ تیر خطا ہو گیا اور پیشتر اس کے کہ سپاہی قیدی کو پکڑتے، اس نے تیزی سے الپ ارسلان پر خنجر سے حملہ کر دیا۔ قیدی کو تو اسی وقت مار ڈالا گیا، لیکن الپ ارسلان بھی اس زخم سے جان بر نہ ہو سکا۔ اور ۴۶۵ہجری مطابق ۱۰۷۲ عیسوی میں راہی ملک عدم ہوا۔

الپ ارسلان نے مرتے وقت وصیت کی کہ اس کا بیٹا ملک شاہ اس کا جانشین بنے اور اس کے دوسرے بیٹے ایاز کو بلخ کی حکومت دی جائے اور کرمان اور فارس کی حکومت اس کے بھائی قاورت ہی کے پاس رہے۔" الپ ارسلان کی زبان سے آخری الفاظ جو نکلے، یہ تھے:۔

"میں نے خدا کی مدد مانگے بغیر کبھی کسی دشمن کے خلاف لشکر کشی نہیں کی لیکن کل جب میں پہاڑی کی چوٹی پر کھڑا ہوا لشکر کو دیکھ رہا تھا، تو لشکر کی ہیبت سے زمین تھراتی نظر آتی تھی۔ مجھے یہ احساس تھا کہ میں دنیا کا بادشاہ ہوں، کسی کی مجال نہیں کہ میرے سامنے دم مار سکے۔ میں نے غرور کیا، یہ اس غرور کا نتیجہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے کمزور ترین انسان کے ہاتھوں مجھے بے بس کر ڈالا"

نظام الملک طوسی

نظام الملک طوسی کا حال قدرے تفصیل سے ملک شاہ کے باب میں آئے گا، لیکن الپ ارسلان کا عہد بھی نظام الملک کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں۔ سرزمین ایران نے دو یا تین وزیر ایسے پیدا کیے، جن کا نام تاریخ ایران میں ہمیشہ یادگار رہے گا، ان میں ایک نظام الملک طوسی بھی ہے۔

نظام الملک کا نام ابو علی حسن بن اسحاق ہے یہ اپنے وقت کا ایک جلیل القدر مدبر تھا اس کی پیدائش ۱۰۱۷ء مطابق ۴۰۸ھ میں طوس میں ہوئی۔ باپ کھیتی باڑی کرتا تھا، مالی حالت کچھ اچھی نہ تھی، لیکن اس کے باوجود اس کی تعلیم خاطر خواہ ہوئی۔ حدیث، فقہ اور عربی زبان میں منتہی کا درجہ حاصل کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حاکم بلخ نے اپنے دیوان

رسالت میں اسے ایک ذمے دار عہدے پر فائز کردیا۔ نظام الملک نے فطری ذہانت کی بدولت یہاں بہت عزت اور ناموری حاصل کی۔ یہاں تک کہ حاکم بلخ نے زندگی کے آخری لمحات میں شہزادہ الپ ارسلان کی خدمت میں اس کی پر زور سفارش کی۔ اسی سفارش کا یہ نتیجہ ہوا کہ شہزادہ نے اسے اپنا مشیر مقرر کیا اور جب وہ تخت نشیں ہوا، تو اسے ایران کی وزارت عظمیٰ کا منصب سونپا گیا۔

نظام الملک ایک اعلیٰ درجے کا مدبر اور ایک متدین عالم تھا۔ دہریوں، ملحدوں اور فرقہ اسمٰعیلیہ سے اسے دلی نفرت تھی، اس کا خیال تھا کہ یہ لوگ دین حق کے بدترین دشمن ہیں۔ نظام الملک علماء کا قدر دان، اہل خیر کا دوست اور اہل علم کا شیدائی تھا۔ وہ شب و روز اسی کوشش میں لگا رہتا کہ ملک میں امن و امان قائم رہے، عوام خوشحال ہوں اور علم اور دین کی اشاعت ہو۔

نظام الملک نے وزارت کے دوران سب سے پہلا اہم کام یہ کیا کہ بغداد میں مدرسہ نظامیہ کی بنیاد رکھی۔ اس مدرسے میں جس کو حقیقت میں یونیورسٹی کہنا چاہیے، شہرہ آفاق معلم تدریس کے لیے مقرر کیے گئے تھے۔ انہی معلمین میں ابو حامد الغزالی بھی تھے، جو اس زمانے کے ایک نامور عالم تھے۔

ملک شاہ

جلال الدین ملک شاہ ابھی سترہ یا اٹھارہ برس کا تھا کہ اس نے ۴۶۵ھ بمطابق ۱۰۷۲ء میں اپنے باپ کی وسیع و عریض سلطنت سنبھالی۔ شروع شروع میں اسے بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ چچا قاورت حکومت کا دعوے دار بن کر رے اور کرج کی طرف بڑھا۔ الپتگین خان سمرقند نے مملکت سلجوقیہ پر لشکر کشی کی۔ سلطان ابراہیم غزنوی نے ملک شاہ کے وفادار چچا عثمان کو اسیر کرلیا۔ اسی پر بس نہیں، اس کے اپنے بھائی نے اس کے خلاف بغاوت کردی۔ ملک شاہ اگرچہ ابھی نوعمر تھا، لیکن نظام الملک کے تدبر سے وہ بالآخر ملک کی

تمام آفتوں کو فرو کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ تخت نشینی کے پانچویں سال وہ سلطنت کی حدود وسیع کرنے کی طرف متوجہ ہوا۔ چنانچہ ملک شاہ کے جرنیلوں نے مغرب میں شام اور مصر اور مشرق میں بخارا اور سمرقند فتح کیے۔ ساتھ ہی کاشغر کا حکمران بھی سلجوقی تاجدار کا باجگزار بنا۔

ملکی خوشحالی:۔ اس عہد میں ملک خوشحال اور رعایا فارغ البال تھی مشہور روایت ہے کہ ملک شاہ کا لشکر جب جیحوں سے پار اترا، تو نظام الملک نے ایشیائے کوچک کے ملاحوں کو انعامی چیک لکھ کر دیا۔ جس کا پورا روپیہ انھیں ایشیائے کوچک ہی میں وصول ہوگیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سلجوقی سلطنت کی حدیں کہاں تک تھیں اور مالی استحکام کس قدر تھا۔

ترویج علوم:۔ ملک شاہ علم و ادب کا بھی دلدادہ تھا۔ علم و ادب کی ترویج میں اس نے بڑی کوشش کی۔ نیشاپور میں ایک رصد خانہ بنوایا۔ جس میں حکیم عمر خیام نے دوسرے علماء کے ساتھ مل کر زیچ ملک شاہی تیار کی۔ امور سیاست پر علما کو کتابیں تالیف کرنے کا حکم ہوا۔ نظام الملک نے اسی سلسلے میں خود بھی فن حکمرانی پر ایک مشہور کتاب "سیاست نامہ" تالیف کی۔

نظام الملک کا زوال

نظام الملک خوش حالی اور امن و امان کے اس دور میں بیشتر وقت ملک شاہ کے ساتھ گزارتا اور اپنے مفید مشوروں سے اس کی رہنمائی کرتا تھا۔ ساتھ ہی وہ ان مدارس کی بھی دیکھ بھال کرتا۔ جو اس نے بغداد، نیشاپور اور اصفہان میں قائم کیے تھے۔

نظام الملک کے بارہ بیٹے تھے۔ اور سب کے سب اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز تھے۔ نظام الملک کی علمی اور سیاسی خدمات، اس کی اور اس کے بیٹوں کی ذہانت و فطانت ہمیں ایران کے نامور برمکی خاندان کی یاد دلاتی ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ اس خاندان کا انجام بھی ویسا ہی حسرت ناک ہوا، جیسا کہ برمکی خاندان کا ہوا تھا۔ نظام الملک کے

خاندان کے علم وفضل اور جاہ وجلال پر اکثر لوگ حسد کرنے لگے اور اس کی تباہی کے منصوبے سوچنے لگے۔ نظام الملک کی ایک بڑی دشمن ملکہ ترکان خاتون تھی جس کی خواہش تھی کہ اپنے خورد سال بیٹے محمود کو ولی عہد بنوائے۔ لیکن نظام الملک ملک شاہ کے بڑے بیٹے برکیا روق کی ولی عہدی کے حق میں تھا۔ اُدھر نظام الملک کے خلاف حاسد ملک شاہ کے کان بھرتے، ادھر ترکان خاتون لگائی بجھائی کرتی۔ نظام الملک کے زوال کا ایک فوری سبب یہ بھی ہوا کہ کسی شخص نے اس کے ایک پوتے کے خلاف شکایت کی جو مرو کا حاکم تھا۔ اس پر ملک شاہ نے نظام الملک کے نام نہایت عتاب آمیز مراسلہ لکھا۔ اس میں طنزیہ انداز میں یہ پوچھا تھا "آپ وزیر مملکت ہیں یا مملکت کے حصے دار ہیں؟" ساتھ ہی یہ گلہ کیا کہ آپ کے رشتے داروں نے نہ صرف یہ کہ بڑے بڑے عہدے سنبھال رکھے ہیں، بلکہ ان کا رویّہ بھی گستاخانہ ہے۔

نظام الملک نے بادشاہ کا یہ اہانت آمیز مراسلہ پڑھا، تو اُسے سخت رنج ہوا۔ اس کا یہ رنج بجا تھا، کیونکہ سلجوقی عہد کی خوش حالی اور سلطنت کی وسعت بڑی حد تک اسی کے تدبر کی رہین منت تھی۔ اس نے مراسلے کا یہ جواب لکھ بھیجا کہ "جس نے آپ کو تاج بخشا ہے، اسی نے مجھے دستار عطا کی ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں اور جدا نہیں ہو سکتے۔"

بہر حال کئی اور مبالغہ آمیز باتیں بھی حاسدوں نے بادشاہ تک پہنچائیں۔ آخر نظام الملک کو وزارت کے منصب سے سبکدوش کر دیا گیا اور اس کی بجائے ابو الغنائم تاج الملک وزیر مقرر ہوا۔ نظام الملک اس بے آبروئی کے بعد زیادہ عرصہ زندہ نہ رہا۔ وہ اپنے اہل و عیال سمیت حج کو روانہ ہوا۔ راستے میں نہاوند کے مقام پر ۴۸۵ھ مطابق ۱۰۹۱ء میں دیلم کے ایک شخص نے اس جلیل القدر عالم کے پیٹ میں خنجر بھونک کر اس کا خاتمہ کر دیا۔ کہا جاتا ہے، یہ قاتل حسن بن صباح کے فدائیوں میں سے تھا۔

اس قتل کی بڑی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ نظام الملک فرقہ اسمٰعیلیہ سے سخت نفرت کرتا

تھا۔ ان کو وہ ملحد سمجھتا تھا۔ "سیاست نامہ" کے چند ابواب میں اس نے یہ ثابت کرنے پر زور دیا ہے کہ فرقہ اسمٰعیلیہ کے پیرو کا فراور ملحد ہیں۔ بعض تذکرہ نویس یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ قتل تاج الملک کے ایما پر ہوا تھا، جو معزول شدہ وزیر کو ہمیشہ کے لیے راستے سے ہٹا کر اپنے آپ کو محفوظ کر لینا چاہتا تھا۔

ملک شاہ خود بھی زیادہ دیر تک زندہ نہ رہا اور نظام الملک کی وفات کے ایک ماہ بعد ہی راہیِ ملکِ بقا ہو گیا۔

تین دوستوں کی روایت

سلجوقی عہد کے تین دوستوں کی روایت آج تک موضوع بحث بنی ہوئی ہے۔ اکثر تذکروں میں ذکر آیا ہے کہ جب حسن بن علی (نظام الملک) مدرسے میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اس وقت اس کے ہم سبقوں میں عمر خیام اور حسن بن صباح بھی تھے۔ تینوں نے بچپن میں عہد کیا تھا کہ ہم میں سے جب کوئی کسی بڑے منصب پر پہنچے گا، تو دوسروں کی مدد کرے گا۔ تحصیل علم کے بعد نظام الملک ترقی کرتے کرتے الپ ارسلان کا وزیر بن گیا اور جب ملک شاہ سلجوقی تخت نشین ہوا، تو اس نے اپنی وزارت نظام الملک ہی کو سونپ دی۔ عمر خیام نے اپنے اس ہم مکتب کے اقتدار کا حال سنا، تو اس کی ملاقات کے لیے اصفہان آیا۔ نظام الملک نے بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔ اس کو بچپن کا عہد یاد تھا، چنانچہ پوچھا میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ خیام قناعت پسند اور گوشہ نشین شاعر تھا، اس نے معمولی وسیلہ معاش کی خواہش ظاہر کی۔ اس پر نظام الملک نے خیام کے وطن نیشاپور میں اسے کم و بیش بارہ سو روپے سالانہ کی جاگیر دلا دی۔ حسن بن صباح بھی بچپن کا عہد یاد دلانے نظام الملک کے پاس آیا۔ اور یہ خواہش کی کہ اسے دربار میں کوئی اعلیٰ ملازمت دلائی جائے۔ چنانچہ دیوانِ مالیات میں اسے ایک ممتاز عہدے پر فائز کر دیا گیا، جہاں اس نے اپنی ذہانت کی بدولت کافی ترقی کی، لیکن حسن بن صباح بہت مفاد پرست اور جاہ پسند شخص تھا، اس لیے اقتدار حاصل کرنے

کے لیے طرح طرح کی ریشہ دوانیاں کرنے لگا، بالآخر اُسے ولیعہد (یا ولایت) سے الگ کر دیا گیا۔

اس قدیمی روایت پر جدید محققین نے شبہے کا اظہار کیا ہے، بہرحال اس روایت کے منفی اور مثبت پہلوؤں پر مختصر سی بحث کسی دوسرے باب میں آئے گی۔

تحریک اسمٰعیلیہ تحریک اسمٰعیلیہ شروع شروع میں تو محض ایک مذہبی تحریک تھی۔ لیکن جب ۲۶۰ ہجری بمطابق ۸۷۳ عیسوی میں ایک شخص عبداللہ میمون القداح نے نئے مذہب کی تبلیغ کا کام اپنے ہاتھوں میں لیا، تو تحریک نے سیاسی شکل اختیار کر لی۔

عبداللہ بن میمون القداح:۔ عبداللہ بن میمون اہواز کا ایک طبیب تھا، بظاہر وہ ایک اسمٰعیلی رہنما تھا، لیکن اس کے دل میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کا طوفان موجزن تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ فرقہ اسمٰعیلیہ کی ایک طاقتور حکومت قائم کرے، جو خلیفہ بغداد کے تسلط سے یکسر آزاد ہو۔ عربوں کی حکومت اسے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی، بلکہ حقیقت[1] میں وہ روح اسلام پر ضرب کاری لگانا چاہتا تھا جو عربوں کی طاقت کا اصل سرچشمہ تھی۔ وہ ایران کو عربوں کے تسلط سے آزاد کرا کے، اس مرتبے پر پہنچانا چاہتا تھا: جو گزشتہ زمانے میں ایران کو حاصل تھا۔ عبداللہ بن میمون اپنے آپ کو اسمٰعیلیوں کے آخری امام اسمٰعیل کی نسل سے ظاہر کرتا تھا۔ اس نے اسمٰعیلیہ عقائد کی اشاعت کو اقتدار حاصل کرنے کا وسیلہ بنایا اور بڑے جوش و خروش سے ان عقائد کی تبلیغ کرنے لگا۔

اسمٰعیلی عقائد:۔ اسمٰعیلی عقاید فلفسیانہ نوعیت کے تھے۔ ان میں قدیم ایرانی، سامی، نو فلاطونی اور فیثاغورث کے بعض نظریات سے بھی استفادہ کیا گیا تھا۔

اسمٰعیلی عقائد میں لفظ "سات" کو بڑی اہمیت حاصل ہے، بلکہ یہ ہندسہ

---

[1] لٹریری ہسٹری آف پرشیا۔ جلد اوّل صفحہ ۲۹۶-۲۹۸

ان کے نزدیک مقدس ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ دنیا میں سات بڑے پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں۔ ہر پیغمبر کے سات امام ہوتے ہیں۔ آخری پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتویں امام اسمٰعیل ہیں۔ سات کا ہندسہ ساری کائنات کو محیط ہے۔ جسم کے بڑے بڑے اعضا سات ہی ہیں۔ مثلاً کان، آنکھ، ناک، ہاتھ، پاؤں، دل اور دماغ۔ سیارے بھی سات ہیں، ہفتے کے دن بھی سات ہیں، زمینیں سات اور آسمان بھی سات ہیں۔

علم عرفان حاصل کرنے کے لیے انسان کو تعلیم کی ضرورت ہے جس کے لیے پیغمبر وقتاً فوقتاً مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ پیغمبروں کی باطنی تعلیم کے لیے امام نامزد ہوتے ہیں۔

اشاعت اور طریق کار:۔ اسمٰعیلی عقاید کی اشاعت کے لیے مخلص اور جان نثار نوجوانوں کو مقرر کیا جاتا تھا، جو "داعی" کہلاتے تھے۔ داعی اپنے زہد و تقا اور سخاوت کی وجہ سے عوام میں شہرت حاصل کرتے تھے۔ یہ لوگ جہاں کہیں جاتے، ان کا اولین کام یہ ہوتا کہ اپنے نیک کردار کی وجہ سے لوگوں میں مقبولیت حاصل کریں۔ اپنا سکہ جما لینے کے بعد عجیب و غریب سوال پوچھ کر لوگوں کو شک و شبہہ میں ڈال دیتے۔ مثلاً:۔

خداوند تعالیٰ نے کائنات سات دن میں کیوں بنائی؟ سات آسمان اور سات زمینیں کیوں تخلیق کیں؟ سات سمندر کیوں وجود میں آئے؟ کلام مجید کا اولین باب سات آیات پر کیوں مشتمل ہے؟ اس قسم کے سوالات پوچھ کر داعی حقیقت میں یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ مذہب ایک پوشیدہ حقیقت ہے جس کو سمجھنے کے لیے محض نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ایسے فرائض ادا کرنا ہی کافی نہیں، داعی جب لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیاب ہو جاتا، تو پھر انھیں یہ کہتا کہ اگر مذہب کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہو، تو اس کے لیے شرط یہ ہے کہ امام وقت کے ہاتھ پر بیعت کر لو۔

خلافت بنی فاطمہ

تحریک اسمٰعیلیہ بظاہر ایک مذہبی تحریک تھی لیکن اس کے علم بردار حقیقت میں سیاسی غلبہ حاصل کرنے کے آرزومند

تھے۔ اسمٰعیلی تحریک کا ایک باثر مبلغ میمون القداح تھا۔ یہ اہواز کا رہنے والا ماہر امراضِ چشم تھا۔ اس نے ایک نئے فرقے کی بنا ڈالی جو اس کے نام کی نسبت سے "میمونہ" کہلایا۔ میمون نے یہ عقیدہ پیش کیا کہ اماموں میں خود ذاتِ خداوندی نے حلول کیا ہے۔ گویا خدا ہی ان انسانی جسموں میں متشکل ہوا ہے۔

عبداللہ بن میمون نے اپنے باپ کی وفات کے بعد نبی ہونے کا دعویٰ کیا۔ اپنی نبوّت کے ثبوت میں وہ متعدد کرشمے دکھاتا تھا جنھیں . . . اس کے پیرو معجزات سمجھتے تھے اس کا دعویٰ تھا کہ وہ چشم زدن میں سارے کرۂ ارض کی سیر کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دور دراز کے حالات اسے فوراً معلوم ہو جاتے مختلف علاقوں کے حالات تو اسے معلوم ہو جاتے تھے لیکن اس کا وسیلہ قاصد کبوتر تھے جن کے ذریعے عبداللہ کے پیرو پیغام بھیجا کرتے تھے۔

عبداللہ بن میمون القداح اپنے قدیمی وطن اہواز کو خیر باد کہہ کر پھرتا پھراتا شام چلا گیا اور حمص کے قریب ایک شہر سلمیہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہاں سے وہ کوفہ کے آس پاس کے علاقوں میں اپنے داعی بھیج کر اپنے عقائد کی اشاعت کرتا رہا۔

عبداللہ کا ایک نہایت باثر مبلغ ہمدان بن الشعث تھا جو اپنی چھوٹی چھوٹی ٹانگوں کی وجہ سے "قرمط" کے لقب سے مشہور ہوا اس کے نام کی نسبت سے اس فرقے کے لوگ "قرامطہ" کہلائے۔

عبداللہ بن میمون القداح کا انتقال ۲۶۱ھ مطابق ۷۵-۸۷۴ء میں ہوا۔ اس کے بعد اس کا جانشین اس کا بیٹا محمد ہوا۔ محمد کے بعد عبداللہ کا دوسرا بیٹا احمد جانشین بنا۔ تیسرا جانشین حسین بن عبداللہ بن میمون کا بیٹا سعید ہوا جو اپنے دادا کی وفات سے ایک سال پہلے سلمیہ میں پیدا ہوا تھا۔ سعید ہی وہ شخص تھا جس نے اپنے دادا کے سیاسی غلبے کی آرزو کی تکمیل کی۔

سعید نے اپنے داعی ابو عبداللہ کی سرکردگی میں شمالی افریقہ بھیجے۔ جنہوں نے اشاعت و تبلیغ کا کام شروع کیا۔ ۲۹۷ ہجری بمطابق ۹۰۹ عیسوی میں ابو عبداللہ نے سعید کو پیغام بھیجا کہ یہاں کے لوگ اسمٰعیلی مذہب کے والہ و شیدا ہیں اور آنے والے مہدی کے انتظار میں ہیں۔ سعید سلمیہ سے چل کر شمالی افریقہ پہنچا۔ یہاں اس نے اپنے آپ کو آخری اسمٰعیلی امام اسمٰعیل کے فرزند محمد کا بیٹا بتایا اور ابو محمد عبیداللہ اپنا نام اختیار کیا۔ یہاں اس نے فرقہ اسمٰعیلیہ کی زمام اختیار سنبھالی —— اور مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔ لوگ منتظر تو تھے ہی، جوق در جوق اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے۔ عبداللہ کو کچھ اقتدار حاصل ہوا، تو اس نے فوجی طاقت بھی منظم کی اور اسمٰعیلی جاں نثاروں کی مدد سے وہاں کے حکمران خاندان اغلبیہ کا صفایا کر کے فاطمی خلافت کی بنیاد رکھی۔ اور "مہدیہ" شہر بسا کر اسے اپنا دارالخلافہ بنایا۔

عبداللہ میمون اور اس کے جانشینوں کا دعویٰ تھا کہ وہ حضرت بی بی فاطمۃ الزہرا رضی کی اولاد سے ہیں۔ اس لیے وہ علوی کہلاتے تھے۔ حقیقت میں یہ عبداللہ بن میمون ہی کی نسل سے تھے۔ انہوں نے ایک متوازی خلافت قائم کر کے اسے خلافت بنی فاطمہ کے نام سے اس لیے موسوم کیا کہ خلافت بغداد سے مسلمانوں کو جو عقیدت ہے وہ ان کے دلوں سے دور کر دی جائے اور انھیں نئی خلافت کی طرف رجوع کیا جائے۔

فاطمی خلافت کا دائرہ اقتدار روز بروز وسیع ہوتا گیا، یہاں تک کہ ۳۵۷ھ بمطابق ۹۶۷ء مصر کا وسیع علاقہ بھی ان کی مملکت میں شامل ہو گیا۔ پھر رفتہ رفتہ شام کا بیشتر علاقہ بھی خلافت بنی فاطمہ کے حلقہ اقتدار میں آ گیا۔ اس وسیع سلطنت کے چودہ خلیفے حکمران رہے اور عباسی خلافت کے لیے مستقل خطرہ بنے رہے۔ بالآخر یہ خلافت ۵۶۷ ہجری بمطابق ۱۱۷۱ عیسوی میں صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں ختم ہوئی۔

خلافت بنی فاطمہ کا آٹھواں حکمران فاطمی خلیفہ المستنصر حسن نے ۱۰۳۵ تا ۱۰۹۴ء

حکومت کی۔ ملک شاہ سلجوقی کا ہم عصر تھا۔ اس کی ساٹھ سالہ حکومت میں اسمٰعیلیوں کے اقبال کا ستارہ عروج پر تھا۔ اس کی سلطنت میں شمالی افریقہ، مصر، سسلی، مالٹا، شام، ایشیائے کوچک اور بحیرہ احمر کے بیشتر ساحلی علاقے شامل تھے، یہاں تک کہ اہلِ بغداد کو بھی المستنصر کو ہی خلیفۃ المسلمین تسلیم کرنا پڑا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مکہ اور مدینہ کے مقدس مقامات بھی عارضی طور پر اس کے تسلط میں آ گئے۔

حسن بن صباح

حسن بن صباح فرقہ اسمٰعیلیہ کا بہت پُرجوش مبلغ تھا۔ اس کا پورا نام حسن ابن علی بن محمد جعفر بن الحسین الصباح ہے۔ اس کا باپ کوفہ سے قم میں آ کر آباد ہوا تھا۔ حسین یہاں پیدا ہوا۔ اسے مطالعہ کا قدرتی شوق تھا، چنانچہ سترہ سال کی عمر میں وہ حدیث و فقہ کی منتہیانہ تعلیم حاصل کر چکا تھا۔ باپ کی طرح یہ بھی اثنا عشری تھا، لیکن ایک اسمٰعیلی داعی امیر دوّاب سے متاثر ہو کر اس نے اسمٰعیلی عقاید قبول کر لیے اور خود بھی بڑے جوش و خروش کے ساتھ ان عقاید کی اشاعت کرنے لگا۔ اس سلسلے میں حسن کو مصر بھی جانے کا اتفاق ہوا جہاں فاطمی خلیفہ المستنصر کی حکومت تھی۔ حسن خلیفہ کی خدمت میں باریاب ہوا جہاں اس کی پوری پوری عزت افزائی ہوئی۔ مصر سے رخصت ہوتے وقت حسن بن صباح نے خلیفہ سے دریافت کیا کہ اس کے دونوں بیٹوں مستعلی اور نزار میں سے کس کے حق میں اہلِ ایران سے بیعت لی جائے۔ خلیفہ نے اسے اپنے چھوٹے بیٹے نزار کے حق میں بیعت لینے کا اختیار دیا۔ شاید اس لیے کہ مستعلی کے ہاتھ پر تو اہلِ مصر بیعت کریں گے اور ایران میں نزار کے لیے جگہ ہموار کی جائے۔ چنانچہ حسن بن صباح ایران پہنچ کر نزار کے حق میں پروپیگنڈا کرنے لگا۔ اس مقصد کے لیے اس نے یزد، کرمان اور طبرستان کو منتخب کیا۔ رے کے علاقے کو اس نے ارادۃً چھوڑ دیا، کیونکہ وہاں کا حاکم نظام الملک کا داماد تھا۔ جو اسمٰعیلیوں کو دشمنانِ اسلام سمجھتا تھا۔

حسن بن صباح نے اپنی دانائی سے اثر و رسوخ پیدا کر کے ۴۸۳ھ ہجری بمطابق ۱۰

۱۰۹۰ عیسوی میں قلعہ الموت[1] پر قبضہ کر لیا، جو قزوین سے رشت کو جانے والی سڑک پر ہے۔ یہ قلعہ بہت بلندی پر واقع ہے۔ اور اس تک پہنچنے میں بہت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یہاں رہ کر اس نے اور بھی زیادہ اثر و رسوخ بڑھایا اور رفتہ رفتہ کئی اور قلعوں پر قابض ہو گیا۔

حسن بن صباح کے پروپیگنڈے سے اسمٰعیلی دو شاخوں میں بٹ گئے۔ مصر کے اسمٰعیلی مستعلی کو خلیفہ مانتے تھے۔ اور ایران کے اسمٰعیلی نزار کو۔ اس وجہ سے ایران کے اسمٰعیلی "نزاری" بھی کہلانے لگے۔

باغ بہشت: حسن بن صباح نے قلعہ الموت کی وسیع و عریض وادی میں ایک باغ بنوایا، جو فردوس بریں کے نام سے موسوم ہوا۔ اس باغ میں جنت کی روائتی خصوصیات موجود تھیں۔ شہد و شیر کی نہریں، سدابہار درخت، شراب طہور اور حور و غلمان، غرض کہ جنت کی وہ کونسی نعمت تھی، جو اس فردوسِ بریں میں نہ تھی۔ اس جنت میں صرف وہی نوجوان جا سکتے تھے، جنھیں حسن بن صباح کی طرف سے اجازت ملتی تھی۔

حشیش اور داخلہ فردوس: حشیش بھنگ کو کہتے ہیں، جسے پہلے پہل ایران میں حسن بن صباح نے دریافت کیا تھا۔ بھنگ کو اس نے اسمٰعیلی عقائد کی اشاعت کا ایک زود اثر ذریعہ بنایا۔ وہ جب نوجوانوں کو درس دیتا، تو اپنی بنائی ہوئی جنت کا بھی ذکر کرتا تھا، جو نوجوان اسمٰعیلی عقائد پر پورا پورا ایمان رکھتے تھے اور سیر فردوس کی تمنا کرتے۔ انھیں کچھ عرصے کے لیے فردوسِ بریں میں سیر و تفریح کے لیے بھیج دیا جاتا۔ جب کسی نوجوان کو جنت کی سیر کی اجازت ملتی، تو اسے حشیش کا سفوف پانی میں حل کر کے پلا دیا جاتا، جس سے وہ بے ہوش ہو جاتا اور عالمِ بے ہوشی میں اسے جنت کے

---

[1] الہ اموت

حسین و جمیل باغ میں پہنچا دیا جاتا۔ جُوں جُوں وہ ہوش میں آتا، اپنے آپ کو بہشت کے بھرپور جلوؤں میں گھرا ہوا پاتا۔ چند دن فردوس بریں میں گزارنے کے بعد اُسے پھر وہی سفوف پلا کر عالم بے ہوشی میں بہشت سے باہر ڈال دیا جاتا۔

جن جن نوجوانوں کو فردوس بریں کی سیر کی اجازت ملتی، انھیں حسن بن صباح بڑی خطرناک مہموں پر مامور کرتا تھا۔ مثلاً اگر کسی شہزادے کو ہلاک کرانا مقصود ہوتا، تو کسی جنّت کے متوالے کو حکم دیا جاتا کہ فلاں مسجد میں جمعہ کی نماز سے فارغ ہوتے ہی اسے خنجر سے ہلاک کر دو۔ اگر ہلاک کرنے کے بعد تم بھی مارے گئے تو تم پر جنّت کے دروازے ہمیشہ کے لیے کھل جائیں گے۔ اور اگر تم بچ گئے تو غازی بنو گے۔ وہ نوجوان، جو ایک مرتبہ جنّت کی رنگینیوں کو دیکھ چکا ہوتا تھا، اسے حاصل کرنے کے لیے بڑے سے بڑے خطرے میں کود پڑتا۔ حسن بن صباح، جس حکمران یا شہزادے کو اپنے راستے کی رکاوٹ خیال کرتا، اسے فدائیوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتروا دیتا۔ ان خنجر والے فدائیوں کی ایشیا اور یورپ میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ ان کے نام سے امراء اور شہزادے کانپ کانپ اُٹھتے تھے۔ اور اپنی سلامتی کی خاطر حسن بن صباح کو خراج دینا منظور کر لیتے تھے۔ جنّت کے متوالے "فدائی" کہلاتے تھے۔ فدائیوں کا انتخاب بڑی احتیاط سے کیا جاتا۔ ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ طاقتور، نڈر اور جاں نثار ہوں، ان فدائیوں کو اسمٰعیلی عقائد کی فلسفیانہ تاویلوں سے آگاہ نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ انھیں ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی۔ فدائیوں کی جاں نثاری ضرب المثل کی حیثیت رکھتی تھی۔ ایک مشہور روایت ہے کہ یروشلم[1] کا بادشاہ ہنری کاؤنٹ چمپین حسن بن صباح کی ملاقات کو آیا۔ ایک دن جب یہ دونوں چہل قدمی کر رہے تھے، تو انھیں ایک بلند چٹان پر دو نوجوان بیٹھے نظر آئے۔ حسن بن صباح نے ایک کو انگلی سے اشارہ کیا، پھر دوسرے کو۔ دونوں سر کے بل گر کر

---

[1] لٹریری ہسٹری آف پرشیا حصہ دوم ص ۲۰۸

جان بحق ہو گئے۔ حسن بن صباح نے ہنری سے پوچھا "کیا آپ کی رعایا میں بھی ایسے جاں نثار لوگ موجود ہیں"؟ ہنری اس استفسار پر حیران رہ گیا۔

فدائیوں کو باطنی تعلیم سے تو روشناس نہیں کرایا جاتا تھا، لیکن ہتھیار چلانے، جفاکشی کا عادی بنانے اور سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے اور بہروپ دھارنے میں انھیں بڑی ہوشیاری سے تربیت دی جاتی تھی۔ بعض حالات میں تو یورپی اقوام کی زبانوں میں بھی انھیں طاق کر دیا جاتا تھا۔ مثلاً جن فدائیوں کو کانرڈ مارکوئس کو قتل کرنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ وہ بے تکلف فرانسیسی بولتے تھے۔[1]

فدائیوں سے ڈرانے اور ہراس پھیلانے کا کام لیا جاتا تھا۔ کبھی کوئی سلجوقی جرنیل اسمٰعیلیوں کے قلعوں پر حملہ کرنے کے ارادے سے آتا، تو علی الصبح وہ اپنے دائیں یا بائیں خنجر گڑا ہوا دیکھتا جس پر لکھا ہوتا۔ "اگر تم ارادے سے باز نہ آئے، تو یہ خنجر تمہارے سینے میں بھی پیوست ہو سکتا ہے"! چنانچہ اکثر جرنیل خوف زدہ ہو کر واپس چلے جاتے۔

فرقہ اسمٰعیلیہ نے ایران میں ساتویں صدی ہجری تک اشاعت اور ہلاکت کے مشغلوں کو بڑی کامیابی سے جاری رکھا۔ یہاں تک کہ منگولوں کے ہاتھوں ان کا آخری شیخ الجبال رکن الدین خورشاہ گرفتار ہو کر مارا گیا۔ اور اسمٰعیلیوں کے قلعے ایک ایک کر کے ان سے چھین لیے گئے۔ اور اس طرح ان کا اقتدار ختم ہو گیا۔

سلجوقی عہد کے دو دور

سلجوقی عہد کے دو دور سمجھنے چاہییں۔ پہلا دور طغرل، الپ ارسلان اور ملک شاہ کا ہے، جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ اور دوسرا دور سلطان سنجر کی وفات سے سلجوقیوں کے اختتام تک ہے، جو اس عہد کے ضعف اور انحطاط کا زمانہ ہے۔ آخری دور میں سلجوقی

---

[1] لٹریری ہسٹری آف پرشیا حصہ دوم ص ۲۰۸

شہزادوں میں رفتہ رفتہ اختلافات ہوتے گئے۔ مرکزی حکومت کا اقتدار جاتا رہا اور حکومت سلجوقیہ ذیل کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں بٹ گئی۔

۱۔ سلاجقہ کرمان (۴۳۳ھ-۵۶۳ ہجری بمطابق ۱۰۴۱-۱۱۶۷ عیسوی) ان کا موسس الپ ارسلان کا بھائی قاورت تھا۔

۲۔ سلاجقہ عراق (۵۱۱ تا ۵۹۰ ہجری بمطابق ۱۱۱۷-۱۱۹۳ عیسوی) ملک شاہ کے بیٹے سلطان سنجر کی وفات کے بعد حکومت سلاجقہ صرف عراق تک محدود رہ گئی تھی۔ اس سلسلے کا آخری بادشاہ طغرل سوم تکش خوارزم شاہ کے ہاتھوں قتل ہوا۔

۳۔ سلاجقہ روم (۴۷۰ھ تا ۶۹۱ ہجری بمطابق ۱۰۷۷-۱۲۹۱ عیسوی) ان کی حکومت ایشیائے کوچک میں قائم ہوئی تھی۔ قونیہ ان کا دارالسلطنت تھا۔ ان حکمرانوں کی وجہ سے ایشیائے کوچک میں فارسی کا رواج ہوا۔ چنگیز خان کی بربریت کے دور میں شمس تبریزی اور مولانا جلال الدین رومی یہیں پناہ گزیں تھے۔

۴۔ سلاجقہ سوریہ (۴۸۷ھ تا ۵۱۱ ہجری بمطابق ۱۰۹۴-۱۱۱۷ عیسوی) اس سلسلے کا موسس تتش بن الپ ارسلان تھا۔ سلجوقیوں کے ہم عصر چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے کئی اور سلسلے بھی تھے۔ ان میں سے بعض ایسے تھے جن کی بنیاد خود سلجوقیوں نے اپنے ہاتھوں سے رکھی تھی۔

دور سلجوقیہ میں فارسی علم و ادب

دورہ سلجوقیہ کو علم و ادب کی ترقی کے لحاظ سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ سلجوقی بادشاہ علم و ادب کے بڑے محسن تھے۔ ان کے وزرا بھی علم و ادب کے شیدائی تھے۔ طغرل بیگ کا وزیر عمید الملک الکندری ایک عالم شخص تھا اور فارسی شعرا اور ادبا کی بہت حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ الپ ارسلان اور ملک شاہ کا وزیر نظام الملک طوسی تھا جو بہت بڑا مدبر، سیاست دان اور متبحر عالم تھا۔ عربی زبان اور عربی ادب کی طرف بہت زیادہ متوجہ تھا۔

نظام الملک نے تعلیم و تدریس کے لیے بڑی بڑی آسائشیں مہیا کیں۔ مدرسہ نظامیہ کے علاوہ، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، بلخ، نیشاپور، ہرات اور اصفہان میں بھی بڑی بڑی درس گاہیں کھولیں، جن میں شہرہ آفاق عالم درس دیتے تھے۔ سلجوقی حکومت کا پایہ تخت نیشاپور علم و ادب کا بہت بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ یہاں شعرا اور ادبا کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔

سلجوقی دور کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ تصوف نے بہت ترقی کی اور اس سلسلے کے شعرا اور مشائخ نے اپنی تصنیفات سے فارسی علم و ادب کے سرمائے کو اور بڑھایا۔

ناصر خسرو، خیام، انوری، معزی، قطران، حکیم سنائی، خواجہ عطار ایسے نامور شاعر، راوندی ایسے مورخ اور غزالی، قشیری اور نجم الدین ایسے عارف باللہ اسی عہد میں ہوئے، جن کا ذکر آگے آئے گا۔

علم و ادب کی ترقی کی وجہ محض سلجوقی حکمرانوں کی حوصلہ افزائی نہ تھی۔ بلکہ سلجوقی دور میں یعنی پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں غوریوں، خوارزم شاہیوں، آل بویہ، غزنویوں اور اتابکوں کی معاصر حکومتیں بھی علمی خدمات میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔

غزنوی حکمران مودود کے شکست کھانے کے بعد غزنوی دور ایران میں تو ختم ہو گیا، لیکن غزنی اور ہند میں ان کی حکومت ابھی قائم تھی۔ ان کے دربار سے مسعود سعد سلمان اور حکیم سنائی ایسے نامور شاعر وابستہ تھے۔

بابا طاہر عریاں

طاہر نام، عریاں تخلص اور وطن ہمدان تھا۔ مسلک درویشی تھا۔ اس لیے عمر بھر گوشہ نشین رہے۔ آپ کی زندگی کے حالات تفصیل سے کسی تذکرے میں نہیں ملتے۔ بعض صوفیائے کرام کے تذکروں میں البتہ آپ کی ریاضت، درویشی، تقویٰ اور استغنا کا ذکر آتا ہے۔ اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ۴۴۷ھ

بمطابق ۱۰۵۵ء میں اوّلین سلجوقی بادشاہ طغرل بیگ سے آپ کی ملاقات ہوئی تھی۔ پروفیسر براؤن[1] "راحت الصدور" کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"میں نے سنا ہے جب سلطان طغرل بیگ ہمدان آیا، تو یہاں تین بزرگ صوفی بابا طاہر، بابا جعفر اور شیخ حمشہ اکھٹے رہتے تھے۔ یہ تینوں ہمدان کی پہاڑی خضر پر کھڑے تھے۔ سلطان کی نظر اُن پر پڑی، تو فوج کو ٹھہرنے کا حکم دیا۔ تعظیماً گھوڑے سے اُتر پڑا۔ آگے بڑھ کر ان بزرگوں کے ہاتھوں پر بوسہ دیا۔ بابا طاہر نے کہا "اے ترک بادشاہ! خدا کے بندوں کے ساتھ تم کیسا سلوک کرو گے؟" سلطان نے جواب دیا "جو آپ مجھے حکم دیں گے۔" بابا طاہر نے کہا "تمہیں وہ کرنا چاہیے جو خدا کا حکم ہو۔ بیشک خدا عدل و انصاف اور نیکو کاری کا حکم دیتا ہے۔" یہ سن کر سلطان طغرل آبدیدہ ہوگیا اور کہنے لگا "میں اسی کے حکم کی پیروی کروں گا۔" بابا طاہر کے ہاتھ میں مٹی کے لوٹے کا ٹوٹا ہوا دستہ تھا۔ ہاتھ اٹھا کر کہا "کیا میری طرف سے یہ (ہدیہ) قبول کرو گے؟" سلطان نے کہا "بسر و چشم!" بابا طاہر نے یہ دستہ سلطان طغرل کی انگلی میں ڈال دیا اور کہا، "اسی طرح دنیا کی بادشاہت بھی تیرے ہاتھ آگئی۔ عدل و انصاف سے حکومت کرنا" کہا جاتا ہے، طغرل اس دستے کو اپنے تعویذوں میں رکھا کرتا اور جب کسی مہم پر جاتا، تو یہ دستہ انگلی میں ڈال لیتا۔"

بابا طاہر حساس اور دردمند دل رکھتے تھے، ان کی یادگار چند قطعات ہیں، جو رباعیات کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ قطعات بابا طاہر کے قلبی سوز و گداز کا پتہ دیتے ہیں۔ اور بہت شیریں اور مؤثر انداز میں لکھے گئے ہیں۔ مسٹر ہیرن ایلن نے "نغان بابا طاہر" کے نام سے انگریزی نثر میں ان کا ترجمہ کیا ہے، جس کے ساتھ مسز الزبتھ کرٹس برین ٹن کا منظوم

---

[1] لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم ص ۲۶۰

ترجمہ بھی شامل ہے۔ باباطاہر کے یہ قطعات مقامی بولی لُری میں لکھے گئے ہیں۔ جو پہلوی زبان سے قریب تر ہے۔

باباطاہر کا اندازِ بیان سادہ اور رواں ہے۔ خیالات بھی سادہ ہیں۔ ان میں فلسفہ یا گہرائی نہیں۔ آپ کے کلام میں بالعموم انہی واردات و کیفیات کا ذکر آتا ہے، جن سے ہر صاحبِ دل کو سابقہ پڑتا ہے۔ جو شخص ان کا کلام پڑھتا ہے، سمجھتا ہے کہ انھوں نے اس کے دل کی ترجمانی کی ہے۔

آپ کے قطعات میں اخلاق و عرفان، ہجر و فراق، درد و غم، اندوہ و اندوہ طلبی کے مضامین پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند قطعات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

ان قطعات کے بعض الفاظ عام مروجہ فارسی سے مختلف نظر آئیں گے۔

خرم آنانکہ ہر زمان تہ و وینن — سخون واتہ کرن واتہ نشینن

گرم پائی نہ بی کایم تہ دینن — بشم آنون بوینم کہ تہ دینن

قطعات کے بعض مخصوص الفاظ مروجہ فارسی میں یوں لکھے جائیں گے۔

تہ و وینن ۔ ترا بینند

سخون واتہ کرن واتہ نشینن — سخن با تو کنند با تو نشینند

گرم پائی نہ بی ۔ اگر مرا پائی نبود

بشوم آنون بوینم ۔ بشوم آنان ببینم کہ ترا بینند ۔

بتہ یا بب بہ بستان گل مرویاد — اگر رویاد ہرگز کس مبو یاد

بتہ گرول بخندلب کشاید — رخش از خون دل ہرگز مشویاد

نواز قالو بتی تشویش ویرم — گناہ از برگ وادن بیش دیرم

چو فردا نومہ خونون نومہ خونن　　　مو در کف نومہ سربیش دیرم

مو - من + دیرم - دارم + دارون - دارا ہے۔
نامہ خونون - نامہ خوانان + خونن - خوانند

باباطاہر کے قطعات میں انتہا درجے کی سادگی ہے۔ آپ نے وارداتِ قلب نہایت شیریں انداز میں بیان کیے ہیں۔

خداوندا کہ بوشم باکہ بوشم　　　مژہ پر اشک خونین تاکہ بوشم
ہمہ کز در برانن سوتہ آیم　　　تو کم از در برانی واکہ بوشم

خداوندا ز بس زارم ازین دل　　　شود روزان در آزارم ازین دل
ز بس نالیدم از نالیدنم کس　　　ز مو بستون کہ بیزارم ازین دل

بلایہ دل بلایہ دل بلایہ　　　گنہ چشمون کردن دل مبتلایہ
اگر چشمون نوینن دی زیبا　　　چہ ذونو دل کہ خوبون درکجایہ

بعالم ہمچو مو پروانہ نہ　　　جہان راہمچو مو دیوانہ نہ
ہمہ ماردن و موردن لانہ ویران　　　من بیچارہ را ویرانہ نہ

باباطاہر بھی اہلِ تصوف کی طرح محسوس کرتے ہیں کہ وہ وجودِ مطلق کا ایک حصہ ہیں جس نے ایک پیکرِ خاکی اختیار کرکے محدود صورت اختیار کرلی ہے۔

مو آن بحرم کہ در ظرف آمدستم　　　مو آن نقطہ کہ در حرف آمدستم

بہر الفی الف قد برآید   الف قدم کہ در الف آمدستم

تصنیف - آپ کی یادگار چند قطعات ہیں، جو رباعیات بابا طاہر کے نام سے مشہور ہیں۔

ابوسعید ابوالخیررح — شیخ ابوسعید فضل اللہ بن ابوالخیر خراسان کے علاقے خاوران میں پیدا ہوئے۔ سال پیدائش ۳۵۰ھ مطابق ۹۶۱ء ہے۔ ابتدائی تعلیم خاوران میں پائی، پھر فقہ کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے مرو گئے۔ عبداللہ الحضری اس زمانے کے ایک مشہور فقیہ تھے، ان کی شاگردی اختیار کی، اور علم طریقت میں دسترس حاصل کی۔ اپنے زمانے کے بزرگ ترین مشائخ شیخ ابوالفضل سرخسی، ابوالعباس احمد قصاب اور ابوالحسن خرقانی سے بھی اکتساب فیض کیا اور ابوعبدالرحمٰن کے ہاتھوں سے خرقہ طریقت پہنا۔ آپ کی زندگی کے حالات تفصیل سے "اسرار التوحید فی مقامات شیخ ابوسعید"[1] میں ملتے ہیں۔

اسرار توحید میں بعض اقوال نقل کیے گئے ہیں، جن سے آپ کے عرفانی نظریات و عقائد پر روشنی پڑتی ہے۔

"خدا اور بندے کے درمیان زمین ہے نہ پردہ، نہ آسمان، بلکہ وجود انسان خود پردہ ہے، جب اس پردے کو ہٹا دوگے، تو خدا کو پالوگے"!

آپ سے کسی نے سوال کیا کہ تصوف کی حقیقت کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا، دل میں جو خواہشات ہیں، ان کو نکال دو اور ہاتھ میں جو کچھ ہے، دے دو جو کچھ تم پر گزرے؛ اسے اللہ کی رضا سمجھو اور حرف شکایت لب پر نہ لاؤ۔

صوفیانہ عقائد کا اثر آپ کے اخلاق و کردار پر بہت نمایاں تھا آپ بہت شیریں گفتار اور صلح کل انسان تھے۔ دولت مندوں سے جو کچھ ملتا قبول کرلیتے اور غریبوں کو دے دیتے۔ کسی کے متعلق دل میں کینہ نہ رکھتے تھے۔ مشہور صوفی ابوالقاسم قشیری

---

[1] اس کتاب کا مولف ابوسعید ابوالخیر کا نواسہ محمد منور ہے۔

کے دل میں آپ کے متعلق کچھ کدورت تھی۔ اس کے بارے میں مصنف اسرار التوحید لکھتے ہیں:۔

"ایک دن قشیری نے کہا۔ ابو سعید کو ذات خداوندی سے بڑی محبت ہے اور حق تعالیٰ ہم سب کو عزیز رکھتا ہے۔ فرق اس قدر ہے کہ ہم ہاتھی ہیں اور ابو سعید پشہ ہے۔"

کسی نے ابو سعید کو یہ بات پہنچا دی۔ آپ نے اس سے کہا کہ جاؤ میری طرف سے امام قشیری کی خدمت میں عرض کرو کہ وہ تو ہاتھی ہیں اور پشہ بھی وہی ہیں۔ میں تو اُن کے سامنے ہیچ ہوں۔" امام قشیری نے سنا تو اُن کا دل صاف ہو گیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ امام قشیری شیخ ابو سعید کے پاس خود چل کر آئے اور وہاں سے جب اٹھے تو اُن کی کدورت محبت میں تبدیل ہو گئی تھی۔

بوعلی سینا اور ابو سعید کی ملاقات

بوعلی سینا فلسفی تھے اور ابو سعید اہل حال صوفی۔ فلسفی اور صوفی میں جو بُعد ہو سکتا ہے، وہ ظاہر ہی ہے۔ ایک مرتبہ ان دونوں کی ملاقات ہوئی، جس کا ذکر اسرار توحید میں یوں آیا ہے۔

بوعلی اور ابو سعید دونوں کو ایک مرتبہ مل بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ تین دن کی مجلسی صحبت کے بعد بوعلی وہاں سے رخصت ہوئے۔ بوعلی سینا کے شاگردوں نے اُن سے پوچھا۔ "آپ نے شیخ ابو سعید کو کیسا پایا؟" آپ نے کہا۔ "جو کچھ میں جانتا ہوں وہ ابو سعید دیکھتا ہے۔" ابو سعید کے مریدوں نے جب اُن سے دریافت کیا کہ "آپ نے بوعلی سینا کو کیسا پایا؟" آپ نے جواب میں کہا۔ "جو کچھ میں دیکھتا ہوں، وہ جانتا ہے۔"

آپ ہر ایک سے خندہ پیشانی ملتے۔ یہاں تک کہ عشرت پسند رندوں سے ملنے میں انھیں پرہیز نہ تھا۔ ایک مرتبہ اپنے مریدوں سمیت کسی بزرگ کے مزار پر گئے۔ دیکھا کہ کچھ مے نوش وہاں جمع ہیں۔ کچھ گا رہے ہیں، کچھ ساز بجا رہے ہیں۔ شراب کا دور

چل رہا ہے۔ شیخ کے مریدوں کو سخت غصہ آیا اور سرزنش کرنی چاہی، لیکن شیخ نے انھیں روک دیا۔ اور مے نوشوں سے کہا جس طرح خداوند تعالیٰ نے تمھیں اس دنیا میں شادمانی بخشی ہے، اسی طرح اگلی دنیا میں تمھیں خوشی اور شادمانی عطا کرے۔ شیخ کی یہ مختصر سی بات اُن کے دل پر اثر کر گئی۔ شراب بہا دی۔ ساز توڑ دیئے اور توبہ کرکے روحانی دولت حاصل کی۔

آپ نے سنہ ۴۴۰ھ مطابق ۱۰۴۸ء میں مہنہ میں وفات پائی۔ کہا جاتا ہے کسی نے آپ سے عالمِ نزع میں پوچھا کہ کلام مجید کی کونسی صورت سنائی جائے۔ آپ نے جواب دیا کلام مجید تو بہت پاک اور باعظمت کلام ہے۔ میرے لیے اس وقت یہی دو شعر کافی ہیں۔

بہ از این در جہان ہمہ چیز بود کار   دوست برد دوست رفت یار بہ یار
آں ہمہ اندوہ بود و این ہمہ شادی   آں ہمہ گفتار بود و این ہمہ کردار

ابوسعید ابوالخیرؒ وہ پہلے صوفی ہیں جنھوں نے صوفیانہ اسرار و رموز اور عاشقانہ واردات کے لیے رُباعی کو ذریعہ اظہار بنایا۔

صوفیا کے نزدیک اللہ تعالیٰ مختارِ مطلق اور خیرِ محض ہی نہیں، بلکہ وجودِ مطلق اور حسنِ مطلق بھی ہے۔ دنیا اور موجودات محض مثالی چیزیں ہیں۔ صوفی کو دنیاوی حسن محض اس لیے متوجہ کرتا ہے کہ اس میں حسنِ مطلق کا پرتو نظر آتا ہے۔ ذیل کی رباعی میں انھی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

گفتم کہ کرائی تو بدین زیبائی   گفتا خود را کہ من خودم یکتائی
ہم عشقم و عاشقم وہم معشوقم   ہم آئینہ ہم جمال ہم بینائی

آپ کے نزدیک دردِ دل سرمایۂ ایمان ہے۔ کوئی یادِ محبوب میں سبحہ گردانی کرے، یا جام و سبو سے دل بہلائے، بہرحال اگر محبوب کے پاس تحفہ لے جانا چاہے، تو وہ

صرف دردِ دل ہی ہے۔

گر سبحہ صد دانہ شماری خوب است — در جام می اندکے گذاری خوب است
گفتی چہ کنم چہ تحفہ آرم بر دوست — بی درد میا ہر آنچہ آری خوب است

علم عمل کے بغیر تو ہیچ ہے، لیکن اگر علم کے ساتھ عمل بھی شامل ہو تو حالات سازگار ہو سکتے ہیں۔

با علم اگر عمل برابر گردد — کارِ دو جہان ترا میسر گردد
مغرور مشو بخود کہ خواندی ورقی — زان روز حذر کن کہ ورق برگردد

وقت برق رفتاری سے گزر رہا ہے۔ جو وقت گزر جاتا ہے، کسی صورت لوٹ کر نہیں آ سکتا۔ گزرے ہوئے وقت پہ طیور بھی فغان و فریاد کرتے ہیں، لیکن انسان ہے کہ اسے جہانِ گزران کا کچھ احساس نہیں۔

در وقت سپیدہ دم خروس سحری — دانی کہ چرا کند نوحہ گری
کز آئینۂ صبح نمودند او را — کز عمر شبی گذشت و تو بی خبری

ابوسعید اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ وحدانیت کے ادراک کے لیے تنگ خیالی اور مذہبی قیود کو خیرباد کہنا پڑتا ہے۔ جو لوگ اس مسلک پر چل کر بھی تنگ خیالی کو نہیں چھوڑتے وہ وحدانیت کے راز کو نہیں سمجھ سکتے۔ چنانچہ اس مضمون کو ذیل کی رباعی میں پیش کیا ہے۔

آن آتشِ سوزندہ کہ عشقش لقب است
در ہیکلِ کفر و دین چو سوزندہ تب است
ایمان دگر و کیشِ محبت دگر است
پیغمبرِ عشق نہ از عجم نہ عرب است

عبداللہ انصاری

خواجہ عبداللہ بن محمد انصاری نام، اور وطن ہرات ہے۔ سال ولادت ۳۹۶ھ مطابق ۱۰۰۵ء ہے۔ آپ الپ ارسلان سلجوقی خواجہ نظام الملک اور شیخ ابوسعید ابوالخیر کے ہمعصر تھے سلسلۂ نسب ابوایوب انصاری سے ملتا ہے۔ آپ کا شمار محدثین اور عرفا میں ہوتا ہے۔ آپ نے مسجع نثر اور رباعیوں کی وجہ سے شہرت پائی۔ آپ کو عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں قدرت حاصل تھی۔ عربی میں آپ نے "ذم الکلام" اور "منازل السائرین" کتابیں تصنیف کیں اور فارسی میں "زاد العارفین" اور "کتاب اسرار" اپنی یادگار چھوڑیں۔ چند رسائل[1] بھی آپ نے تصنیف کیے ہیں، جن کے نام حسب ذیل ہیں۔ رسالہ "دل وجان" کنز السالکین، رسالہ ارادت، قلندر نامہ، ہفت حصار، محبت نامہ، رسالہ مقولات، الٰہی نامہ۔ نثر میں آپ نے مناجاتیں بھی لکھی ہیں، جو بہت سادہ، موثر اور شیریں فارسی میں ہیں۔

نثر کا انداز

عبداللہ انصاری ان اولین نثر نویسوں میں ہیں، جنھوں نے مسجع نثر لکھی اور نثر کو دلکش اور موثر بنانے کے لیے نثر میں اشعار بھی شامل کیے۔ یہ وہی اندازِ نگارش ہے، جس نے سعدی کے گوہر بار قلم کے ذریعے کمال حاصل کیا اور ادب فارسی کے گلستان کی آبیاری کی۔

مثال کے طور پر آپ کی نثر کا اقتباس "مقولات" سے پیش کیا جاتا ہے۔

"چون پیش بزرگی درآئی، ہمہ گوش باش۔ چون او سخن گوید، تو خاموش باش، پنج چیز نشانۂ نحسی است بی شکری در وقت نعمت، بی صبری در وقت محنت، بی رضائی در وقت قسمت، کاہلی در وقت خدمت، بی حرمتی در وقت صحبت عیت

---

[1] تاریخ ادبیات ایران۔ مولفہ آقای رضازادہ شفق صفحہ ۱۱۰

ماہی در آب است وحیات بچہ را شیر۔ شریعت را استاد باید و طریقت را پیر۔ زاہد مزدور به بهشت می نازد و عارف بدوست ۔ از صوفی چه گویم که صوفی خود اوست ۔

روزگاری او را می جستم خود را می افتم ، اکنوں خود را می جویم ، او را می یابم ۔

عشق آمد و شد چو خونم اندر رگ و پوست

تا کرد مرا تهی و پر کرد ز دوست

رباعیات

شیخ عبداللہ انصاری کی رباعیاں خاص طور سے مشہور ہیں ان کا موضوع معرفت اور روحانیت ہے۔ آپ کی رباعیاں سادہ رواں اور موثر ہیں۔ چند رباعیاں حسبِ ذیل ہیں:۔

از ہجر ہمی سوزم از شرم خیال
در وصل ہمی سوزم از بیم زوال
پروانہ و شمع را چنین باشد حال
در ہجر بسوزد و بسوزد ز وصال

دی آمد و ہیچ نامد از من کاری
وامروز ز من گرم نشد بازاری
فردا بروم بی خبر از اسراری
نا آمده به بُدی ازیں بسیاری

در عشق تو گہ پست و گہی ہست شوم
در یاد تو گہ نیست گہی ہست شوم
در پستی و مستی از نگہ رہ دستم
یک بارگی ای نگار از دست شوم

آپ کا میلان باطن کی طرف تھا اور ظاہر سے احتراز کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی رباعیوں سے ذاتِ الٰہی کا عشق جھلکتا نظر آتا ہے۔

حکیم عمر خیامؔ

ابو الفتح عمر خیام بن ابراہیم نیشاپوری علم ہیئت اور علم ریاضی کا بہت بڑا فاضل تھا۔ ان علوم کے علاوہ شعر و سخن میں اس کا پایہ بہت بلند ہے۔ اس کے علم و فضل کا اعتراف اہلِ ایران سے بڑھ کر اہلِ یورپ نے کیا ہے۔

تعجب کا مقام ہے کہ اس نامور عالم کی زندگی کے بعض پہلو پورے طور سے آشکارا نہیں۔ خیام کے متعدد سوانح نگار، اس کا سالِ پیدائش ۴۰۸ھ یا ۴۱۰ھ ہجری مطابق ۱۰۱۷-۱۰۱۹ عیسوی لکھتے ہیں، وہ بھی اس روایت کی بنا پر کہ نظام الملک، خیام اور حسن بن صباح ہم سبق تھے، تو آخر ہم عمر ہی ہوں گے۔ نظام الملک کا سالِ پیدائش ۴۰۸ھ یا ۴۱۰ھ ہجری ہے۔ اس لیے خیام کا سالِ پیدائش بھی ۴۰۸ھ یا ۴۱۰ھ ہجری ہی ہوگا۔

خیام کے سالِ وفات کے متعلق بھی کوئی فیصلہ کن بات نہیں کی گئی۔ بروکلمین نے "تاریخ ادبیاتِ عرب" میں اس کا سالِ وفات ۵۱۵ھ مطابق ۱۱۲۱ء لکھا ہے۔ بعض دوسرے مغربی مصنفین ۵۱۷ھ مطابق ۱۱۲۳ء بتاتے ہیں۔ آزاد بلگرامی نے "ید بیضا" میں سالِ وفات ۵۱۸ھ مطابق ۱۱۲۴ء بتایا ہے۔ اس سلسلے میں خیام کے معاصر اور شاگرد نظامی عروضی سمرقندی چہار مقالہ میں لکھتے ہیں: "۵۳۰ھ مطابق ۱۱۳۵ء میں میں نے خیام کی قبر کی زیارت کی، تو مجھے معلوم ہوا خیام چار سال پیشتر عالمِ فانی کو خیر باد کہہ چکا ہے۔" اس لحاظ سے خیام کا سالِ وفات ۵۲۶ھ مطابق ۱۱۳۱ء ہوتا ہے۔

خیام کی تعلیم | خیام نے امام موفق (متوفی ۴۴۰ھ مطابق ۱۰۴۸ء) کی صحبت

ہی رہ کر قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ علم ہیئت میں استاد ابوالحسن الانبیری سے تلمذ تھا۔ فلسفے میں اس کا استاد بوعلی سینا تھا، جس کا وہ خود اپنے رسالہ "کون و تکلیف" میں اعتراف کرتا ہے۔

تین ہم سبق مشہور روایت ہے کہ نظام الملک، خیام اور حسن بن صباح تینوں ہم مکتب تھے اور امام موفق کے شاگرد تھے۔ اس سلسلے میں رشید الدین، فضل اللہ جامع التواریخ میں لکھتا ہے:-

"سیدنا (حسن بن صباح) و عمر خیام و نظام الملک بہ نیشاپور در مکتب بودند۔ چنانکہ عادت ایام صبی و رسم کودکان باشد، قاعدہ مصادقت و مصافات ممہد و مسلوک می داشتند، تا غایتی کہ خونِ یکدیگر بخوردند و عہد کردند کہ از ایشان ہر کدام بدرجہ بزرگ و مرتبہ عالی رسد، دیگران را تربیت و تقویت کند۔ از اتفاق بہ موجبی کہ در تاریخ آل سلجوق مسطور و مذکور است، نظام الملک بوزارت رسید۔ عمر خیام بخدمت او آمد، عہد ایام کودکی را بیاد وش آورد۔ نظام الملک حقوق قدیم را بشناخت و گفت تولیت نیشاپور و نواحی آن تر است۔ عمر مرد بزرگ، حکیم، فاضل و عاقل گفت، سودائی ولایت داری ندارم۔ مرا بر سبیل مشاہرہ ادراری وظیفہ فرمای۔ نظام الملک او را دہ ہزار دینار ادرار کرد و ہم چنین حسن صباح از شہر ری بخدمت او رفت، الکریم اذا وعد وفی۔ نظام الملک گفت، تولیت ری یا از اصفہان اختیار فرمای۔ حسن بن صباح ہمت عالی بدان مقدار قانع و راضی نہ شد و قبول نکرد، چہ توقع شرکت در وزارت می داشت۔ نظام الملک چوں دانست کہ طالب وزارت است و قصد جاہ و مرتبہ را دارد، از و اعتذار نمود۔"

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بچپن میں یہ تینوں ہم مکتب تھے۔ اور تینوں نے عہد کیا تھا کہ ان میں سے جو کسی بلند منصب پر پہنچے گا، وہ دوسروں کی مدد کرے گا۔ نظام الملک

ترقی کر کے ملک شاہ سلجوقی کا وزیر بنا۔ اُس نے خیام کو اس کی خواہش کے موافق نیشاپور میں ایک ہزار دینار کی سالانہ جاگیر دے دی۔ حسن بن صباح کو بھی اس نے اس کی خواہش کے موافق دربار شاہی میں جگہ دلائی، لیکن حسن وزارت کا طالب تھا، اس لیے اسے وہاں سے نکلنا پڑا۔

میر خواند روضۃ الصفا میں لکھتا ہے "نظام الملک گوید کہ امام موفق نیشاپوری از کبار علماء خراسان بود و بسیار معزز و متبرک و شہرتی تمام داشت کہ ہر فرزندی کہ پیش او قرآن می خواند و حدیث قرأت می کرد، بدولت و اقبال می رسید بنابراں پدرم مرا از طوس بہ نیشاپور فرستاد، تا در مجلس آں بزرگوار بہ استفادہ و تعلیم مشغول شوم۔ او در من نظر عنایتی و عاطفتی و مرا بخدمت او الفت و موانستی تمام پیدا شد۔

چنانکہ مدت چہار سال در خدمت او بسر بردم و حکیم عمر خیام و مخذول حسن بن صباح دو نو رسیدہ بودند در آن مجلس تخمیناً با من ہم سال با جودت فہم و قوتِ طبع و غایت کمال و با من اختلاط می کردند و چون از مجلس امام بیرون آمدم، در مراقبت من می آمدند و با یک دیگر درس گذشتہ را اعادہ می نمودند"

میر خواند کے قول کے مطابق نظام الملک خود کہتا ہے کہ تینوں تقریباً ہم عمر تھے، اور ہم سبق تھے۔

ہم سبق ہونے میں شبہ

ان تینوں کے ہم سبق ہونے میں مستشرقین کو شبہ ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں ذکر آیا ہے کہ سب سے پہلے اسے نکو نے اس شبہے کا اظہار کیا۔ پھر ایک فرانسیسی عالم ہوتسما نے اس شبہے کی تائید کی، اور مشہور مستشرق پروفیسر براؤن[1]

---

[1] دیکھیے تنقید بر شعر العجم مولفہ حافظ محمود شیرانی

نے ان کی ہم نوائی کی۔ آخر ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم سابق پروفیسر اورینٹیل کالج لاہور نے اپنے ایک عالمانہ مضمون میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ان تینوں کا ہم سبق ہونا بعید از قیاس ہے۔

ڈاکٹر اقبال نے اس خیال کی تائید میں ذیل کی دو دلیلیں پیش کی ہیں۔

۱۔ نظام الملک کا سال پیدائش ۴۰۸ھ مطابق ۱۰۱۷ء اور سال وفات ۴۸۵ھ مطابق ۱۰۹۲ء ہے۔ خیام اور حسن بن صباح کی پیدائش کے سن معلوم نہیں، لیکن ان دونوں کی وفات ۵۱۷ اور ۵۱۸ ہجری مطابق ۱۱۲۳-۱۱۲۴ء میں ہوئی۔ اگر تینوں کو ہم سبق سمجھ لیا جائے، تو خیام اور حسن بن صباح کی عمر سو سال سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ معترضین کو تعجب اس بات پر ہے کہ خیام اور حسن نے اتنی لمبی عمریں پائیں اور تقریباً ایک ساتھ دنیا سے رخصت ہوئے۔

۲۔ دوسری دلیل فاضل مضمون نگار نے یہ پیش کی ہے کہ اگر خیام اور حسن نے سو سے زیادہ عمر پانے کی بجائے یہی کوئی اسی پچاسی سال کی طبعی عمر پائی ہو، تو اس صورت میں ان کی پیدائش ۴۳۵ھ مطابق ۱۰۴۳ء کے لگ بھگ ہونی چاہیئے اور جیسے کہ پہلے ذکر آچکا ہے، نظام الملک کا سال پیدائش ۴۰۸ھ مطابق ۱۰۱۷ء ہے۔ تو یہ کیسے ممکن ہوا کہ ان دونوں سے عمر میں ستائیس سال بڑا نظام الملک ان کا ہم سبق ہو۔

ان دلیلوں پر غور کرنے سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ تینوں کے ہم سبق ہونے کی روائیت کن کن لوگوں نے بیان کی ہے۔ یہ روایت سب سے پہلے نظام الملک نے اپنی تصنیف "وصایا" میں لکھی جس کا حوالہ میر خواند نے "روضتہ الصفا" میں دیا۔ اس کے بعد مشہور مورخ رشید الدین فضل اللہ نے اپنی تاریخ "جامع التواریخ" میں حسن بن صباح کی سوانح حیات

"سرگزشت سیدنا" کے حوالے سے یہ حکایت بیان کی ہے ، جس کا اقتباس اوپر نقل کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں تیسری شہادت خیام کی ہے ، جس سے تینوں کے ہم سبق ہونے پر روشنی پڑتی ہے۔ خیام اپنے رسالہ " الکون و التکلیف" میں ابنِ سینا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس مسئلے پر میں نے اور میرے اُستاد بو علی سینا نے خوب غور کر لیا ہے " بو علی سینا کو خیام نے اپنا استاد ظاہر کیا ہے ، جس کی وفات ۴۲۸ ہجری مطابق ۱۰۳۶ عیسوی میں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ خیام نے سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں بو علی سینا سے تعلیم حاصل کی ہوگی اس صورت میں اس کی پیدائش ۴۱۰ھ مطابق ۱۰۱۹ء کے لگ بھگ ہو سکتی ہے ، جو خود نظام الملک کا سالِ پیدائش ہے۔

ہم درسی کا امکان

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں[1] اگر ۵۱۷ ہجری مطابق ۱۱۲۳ عیسوی تک خیام کا سنِ وفات تسلیم کر لیا جائے ، جیسا کہ عام طور سے تذکروں میں لکھا گیا ہے۔ تو ۴۳۰ ہجری مطابق ۱۰۴۸ عیسوی میں جو ان کے استاد کا سنِ وفات ہے ، تینوں کا ہم عمر ہونا تو ممکن نہیں ، لیکن ان کا ہم سبق ہونا ممکن ہے۔ کیونکہ یہ ہم درسی ابجد خوانی میں نہ تھی ، جیسا کہ غلطی سے عام طور پر سمجھا جاتا ہے ، بلکہ دینیات کی اعلیٰ تعلیم میں تھی۔ خود "وصایا" میں لکھا ہے۔ یہ قرآن اور حدیث کے درس میں شرکت تھی۔ جس کے لیے خاصی بڑی عمر درکار ہے۔"

یورپ کے تعلیمی اداروں میں ممکن ہے طلبہ کی عمروں میں اس قدر تفاوت نہ ہو ، لیکن ہمارے ہاں کی درس گاہوں مثلاً لا کالج ، ٹریننگ کالج اور ایم۔ اے

---

[1] دیکھیئے خیام اور اس کی سوانح حیات پر ناقدانہ نظر صفحہ ۲۱

کے طلبہ کی عمروں میں ایسا تفاوت نظر آجاتا ہے۔ اور پھر خیام اور حسن بن صباح کا سو سال سے زائد عمر پانا بھی کوئی ایسی ناممکن بات نہیں۔ ان مفروضات کی بنا پر بھی نظام الملک اور رشید الدین فضل اللہ کی بیان کی ہوئی روایات کو باطل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

علمی فضیلت

تذکروں سے یہ بات واضح ہے کہ خیام کو ۴۶۷ھ مطابق ۱۰۷۴ء میں علم و فضل میں بہت شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ چنانچہ اسی سال جب ملک شاہ سلجوقی نے اپنے ملک میں ایک عظیم رصد خانہ قائم کرنا چاہا۔ تو اس غرض کے لیے ملک کے بڑے بڑے علماء اور ہئیت دان بلوائے گئے۔ ان میں ابوالمظفر اسفزاری، میمون بن نجیب واسطی اور خیام بھی تھے۔

ابن الاثیر لکھتا ہے کہ زر کثیر صرف ہونے کے بعد اس رصد سے جو زیچ تیار ہوئی، وہ خیام ہی کے فکر کا نتیجہ تھی۔

خیام کو آج کل شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے، لیکن وہ فلسفہ میں بوعلی کا ہمسر اور مذہبی علوم میں امام فن تھا۔ علوم نجوم کا تو وہ ماہر مانا گیا تھا۔ بادشاہ وقت خاص خاص تقریبات کی تاریخ مقرر کرانے کے لیے خیام ہی کی طرف رجوع کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ملک شاہ نے شکار کو جانا چاہا۔ خیام سے کہا۔ ایسا دن مقرر کرے کہ دو تین روز تک برف و باراں نہ ہو۔ خیام نے علم نجوم کے حساب سے ایک دن مقرر کیا اور بادشاہ کو خود سوار کرایا، لیکن اسی وقت مطلع ابر آلود ہو گیا اور بارش کے آثار نمودار ہوئے۔ لوگ خیام پر ہنسنے لگے، خیام نے بادشاہ سے مخاطب ہو کر کہا "بادل ابھی چھٹ جائیں گے، مطلع صاف ہو جائے گا۔" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ خیام علم طب میں بھی بڑی مہارت رکھتا تھا، بیہقی لکھتا ہے۔ "خیام ملک شاہ کے دربار کا طبیب تھا، چنانچہ

شہزادہ سنجر مرض چیچک میں مبتلا ہوا، تو اس کا علاج خیام ہی نے کیا تھا۔

خیام ایک آزاد خیال فلسفی تھا اور مذاہب کے معاملے میں کسی شدت اور سخت گیری کا قائل نہ تھا، اس لیے بعض ہم عصر علما اسے ملحد کہتے تھے۔ زکریا بن محمد بن محمود قزوینی آثار البلاد و اخبار العباد (سال تالیف ۶۷۴ھ مطابق ۱۲۷۵ء) میں لکھتا ہے۔

"عمر خیام حکیمی بانواع حکمت مخصوصاً در حکمت ریاضی دانا بود۔ در عصر سلطان ملک شاہ می زیست ..... می گویند فقیہی ناپسندیدہ اخلاق ہر روز قبل از طلوع آفتاب بخدمت حکیم می رسید و از درس فیلسوف استفادہ می کرد و چوں روز بر فراز منبر می شد، از بان بہ طعن آن بزرگوار می کشود۔ چوں خیام را ازیں معنی آگہی دادند، مخفیانہ چند نفر طبال و بوق زن و جمعی از طلاب را بخواند و بخانہ پنہاں کرد و ہنگامی کہ فقیہہ مذکور بعادت مالوف بہ منزل وی فرود آمد۔ امر داد، طبالان و بوق زنان باد بہ بوق کردہ و طبل زدند۔ چوں مردم گرد آمدند آن ہا را مخاطب ساختہ گفت، ایں عالم شما است، ہر روز ایں جا می آید، کسب دانش می کند و چون ازیں جا بیرون می رود، مرا بہ بدی یاد می نماید۔"

مختصر یہ کہ یہ عالم دین نماز فجر سے پہلے حکیم خیام سے اکتساب فیض کرتا اور جب صبح کی نماز کے وقت منبر پر چڑھ کر وعظ کرتا، تو اس میں حکیم خیام کو ملحد اور بے دین کہتا تھا۔

تصنیفات انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں مذکور ہے کہ "خیام ریاضی میں مہارت رکھتا تھا۔ اس نے عربی زبان میں جبر و مقابلہ لکھا جس کے نسخے لیڈن میں موجود ہیں۔ مصادرات پر جو تحقیق خیام نے کی ہے، اس کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔" فیلسوف عرب میں پہلی مرتبہ خیام کی

شہرت اس کی ریاضی دانی کی ہی بدولت ہوئی۔ فرانسیسی زبان میں اس کے جبر و مقابلہ کا ترجمہ "جبر عمر" کے نام سے ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں ہوا۔

سید سلیمان ندوی نے "خیام اور اس کے سوانح حیات پر ناقدانہ نظر" میں خیام کی ذیل کی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

۱- رسالہ استخراج اضلاع مربعات و مکعبات

۲- رسالہ جبر و مقابلہ جس کا پورا نام "رسالۃ فی براھین الجبر والمقابلہ" ہے۔

۳- رسالہ شرح ما اشکل من مصادرات اقلیدس

۴- زیچ ملک شاہی

۵- رسالہ مختصر در طبیعیات

۶- میزان الحکم

۷- رسالہ الکون والتکلیف

۸- رسالہ موضوع علم کلی موجود

۹- رسالہ فی کلیات الوجود

۱۰- رسالہ اوصاف یا رسالہ الوجود

۱۱- غرائس النفائس

۱۲- نوروز نامہ

۱۳- رباعیات خیام

۱۴- بعض عربی اشعار

۱۵- مکاتبات خیام فارسی، جو اب ناپید ہیں۔

خیام کا تعارف مختلف علوم میں ماہر ہونے کے باوجود خیام کی شہرت کا سرمایہ اس کی فارسی رباعیات ہیں۔ اس بلند پایہ شاعر

کا علمی دنیا سے تعارف کرانے میں اہلِ یورپ نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ہے۔ سب سے پہلے روسی پروفیسر ولنتین ژوکوفسکی نے رباعیاتِ خیام کا ترجمہ کیا۔ پھر فٹز جیرالڈ نے خیام کی بعض رباعیوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور بعض اہم مضمون رباعیوں کا مفہوم پیش کر کے کچھ ایسے انداز میں اہلِ یورپ کو خیام سے روشناس کرایا کہ اُسے زندہ جاوید بنا دیا۔

رُباعیاتِ خیام

خیام جب نجوم، ریاضی اور فلسفے کے پیچیدہ مسائل سے فارغ ہوتا، تو دلی اور دماغی تفریح کی غرض سے شعر کی طرف مائل ہوتا۔ خیام کی شاعری کا حاصل صرف اس کی فارسی رباعیات ہے۔ رباعیوں کی زبان بڑی سادہ، سہل اور رواں ہے، لیکن ان میں فلسفیانہ رموز ہیں، جو اس کے ذاتی تاثرات کی آئینہ دار ہیں۔

سب سے پہلی چیز جو خیام کی رباعیوں میں ہمیں نمایاں طور پر نظر آتی ہے، وہ انسانی زندگی کے آغاز و انجام پر غور و غوض ہے۔

انسانی زندگی باوجودیکہ نہایت مختصر ہے اور اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا لیکن دریافت اور جستجو کی ایک امنگ ہے، جو انسان کو قانع نہیں رہنے دیتی اور اس کی بدولت وہ اپنے آغاز و انجام کے متعلق سوچتا رہتا ہے۔ اس کے کانوں میں رہ رہ کر یہ صدا گونجتی ہے۔

"ما ز آغاز و ز انجام جہان بی خبریم   اول و آخر این کہنہ کتاب افتادست"

اس کے باوجود انسان کی گرمیٔ رفتار اور بے چین روح اسے جستجو اور دریافت کی راہ پر لگائے رکھتی ہے۔ سقراط، افلاطون، ارسطو، ایپکورس، خیام، رازی اور مولانائے روم اس جستجو میں لگے رہے، اور تحقیق و تلاش کے راستے تراشتے رہے۔ خیام کو بھی اسی امنگ نے دریافت اور جستجو میں سرگرم رکھا۔ اُس نے

یہ جاننا چاہتا ہے کہ انسان کہاں سے آتا ہے ؟ اسے جانا کدھر کو ہے ؟ زندگی کی کشمکش کی غرض و غایت کیا ہے ؟ لیکن وہ کوئی ایسا جواب نہیں پاتا جو اس کی بے چین روح کو تسلی دے سکے ۔ چنانچہ ذیل کی رباعی میں اپنی ناکامی کا اعتراف کرتا ہے ۔

آورد باضطرار اول بہ وجود — جز حیرتم از حیات چیزی نفزود
رفتیم باکراه و ندانیم چه بود — زین آمدن و رفتن و بودن مقصود

خیام چاہتا ہے کہ دنیا کے عقدوں کو عقل کے گرہ کشا ناخن سے کھول دے، لیکن جب وہ اپنی کوشش میں ناامید ہوتا ہے، تو وہ فطرت کے مناظر کی طرف لوٹتا ہے اور ان سے دل بہلانے لگتا ہے لیکن روح کا فشار اُسے دم نہیں لینے دیتا۔ دیکھیے! خیام ابر باراں، بادۂ ارغوان سے دماغ کو تازہ کرنا چاہتا ہے، لیکن فکر اور سوچ کی شدت اسے روکتی ہے اور وہ پکار اٹھتا ہے ۔

ابر آمد و باز بر سبزہ گریست — بی بادۂ ارغوان نمی باید زیست
این سبزہ کہ امروز تماشاگہ ماست — تا سبزۂ خاک ما تماشاگہ کیست

دریافت اور تلاش کی وادی میں کچھ اور فلسفی بھی ہیں، جو خیام ہی کی طرح بے بس ہیں اور آفرینش کے بھید سے واقف نہیں ہو سکے، اس لیے وہ کہتا ہے ۔

آنانکہ محیط فضل و آداب شدند — از جمع کمال شمع اصحاب شدند
رہ زین شب تاریک نبردند برون — گفتند فسانہ و در خواب شدند

خیام کے کلام میں حزنیت یہ حساس فلسفی دیکھتا ہے کہ دنیا میں رنج و اندوہ کی کوئی حد نہیں۔ ہر شخص کسی نہ کسی رنج میں مبتلا ہے۔ زندگی میں ہر وقت موت کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ اس سے خیام کا دل اور دماغ متاثر ہوتا ہے چنانچہ اس کی اکثر رباعیوں میں حزن و ملال کے جانکاہ اثرات جھلکتے نظر آتے ہیں ۔

پیش از من و تو لیل و نہاری بودہ است — گردندہ فلک نیز بکاری بودہ است
زنہار قدم بخاک آہستہ نہی — کان مردمک چشم نگاری بودہ است

دوری کہ درو آمدن و رفتن ماست | آنرا نہ بدایت نہ نہایت پیداست
کس می نزند دمی دراین معنی راست | لیکن آمدن از کجا و رفتن بکجاست

گردونِ گرداں کے ہاتھوں انسان مجبور ہے۔ خوشی کے لمحے اگر نصیب بھی ہوتے ہیں، تو یہ آنے والی مصیبت کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں۔ انسانوں کی ہستی شطرنج کے مہروں کی سی ہے جنھیں آسمان کی حرکت کچھ عرصہ اِدھر اُدھر پھراتی ہے اور پھر صندوقِ عدم میں ڈالتی جاتی ہے۔

از روی حقیقت است نہ از روی مجاز | مالعبت گانیم و فلک لعبت باز
بازیچہ ہمی کنیم بر نطعِ وجود | رفتیم بہ صندوقِ عدم یک یک باز

خیام انسانی زندگی کو حسرت و حرمان کا مجموعہ تو خیال کرتا ہے، لیکن وہ بے بس ہو کر آنسو نہیں بہاتا۔ بلکہ ایک فلسفی کی طرح ایسی حالت میں بھی جینے کی تدبیر بتاتا ہے۔ یہ تلقین کرتا ہے کہ رنج و غم کو بھولنے کی کوشش کرو۔ جو وقت گزر چکا ہے، وہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔ اور جو وقت آنے والا ہے، اس کے متعلق کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اس لیے صرف موجودہ زمانہ ہی سے سروکار رکھو۔ اگر تم خوش رہو، تو خوب خوشی مناؤ۔ اور اگر رنج و اندوہ کا شکار ہو، تو بھولنے کی کوشش کرو۔

روزی کہ گزشتہ است ازو یاد مکن | فردا کہ نیامدہ است فریاد مکن
بر نامدہ و گزشتہ بنیاد مکن | حالی خوش باش و عمر بر باد مکن

برخیز و مخور غم جہان گزران | خوش باش دمی بشادمانی گزران
در طبع جہان اگر وفائی بودی | نوبت بتو خود نیامدی از دوران

فلسفہ جبر

خیام کی رباعیوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عقیدہ جبر کا پیرو تھا۔ اُس کے نزدیک انسان بے بس اور مجبور ہے

اپنے ارادے سے وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ انسان کی زندگی کواکب کی گردش کے تابع ہے، لیکن کواکب کی گردش بھی مجبوری کا نتیجہ ہے۔ پس اگر ہم مجبور ہیں۔ تو کواکب کی گردش ہم سے بھی زیادہ بے بس ہے۔ گویا ساری کائنات مجبوری کا پتہ دیتی ہے۔

خوبی و بدی کہ در نہاد بشر است　　شادی و غمی کہ در قضا و قدر است
با چرخ مکن حوالہ کاندر رہ عقل　　چرخ از تو ہزار بار بیچارہ تر است

سازندۂ کار مردہ و زندہ توی　　دارندۂ این چرخ پراگندہ توی
من گرچہ بدم صاحب این بندہ توی　　کس را چہ گنہ چو آفرینندہ توی

فلسفۂ نشاط

خیام نشاط و لذات کا اتنی شگفتگی سے ذکر کرتا ہے کہ اس کی رباعیات بالکل عشرت پسند ایپکیورس کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہیں۔

یک شیشۂ شراب و لب یار و لب کشت　　این جملہ مرا نقد و ترا نسیہ بہشت
قومی بہ بہشت و دوزخ اندر گروند　　کہ رفت بدوزخ و کہ آمد ز بہشت

ذکر شراب

شاعر شراب تو پیتے ہیں، لیکن اکثر ان کی شراب کو لوگ رفتہ رفتہ شراب معرفت سمجھنے لگتے ہیں۔ حافظ شیرازی ایسے ہی خوش نصیب شاعروں میں سے تھے، لیکن خیام نے کچھ اتنے شوق اور شیفتگی سے مادی شراب پی ہے، کہ کسی کو اس کی شراب نوشی میں شبہ نہیں رہتا۔

مائیم خریدار مئ کہنہ و نو　　وانگاہ فروشندۂ عالم بہ دو جو
گفتی کہ پس از مرگ کجا خواہم رفت　　می پیش من آر و ہر کجا خواہی رو

گر فوت شوم بباده شوئید مرا — تلقین ز شراب ناب گوئید مرا
خواہید کہ روز حشر یابید مرا — از خاکِ درِ میکدہ جوئید مرا

خیام ذیل کی رباعی میں اپنی رندمشربی کو کچھ اس طرح ظاہر کرتا ہے کہ اس کی شراب صاف مادی شراب کی صورت میں جھلکتی نظر آتی ہے۔

تا ہشیارم طرب زمن پنہان است — چون مست شوم در خردم نقصان است
حالی است میان مستی و ہشیاری — من بندۂ آنم کہ زندگانی آن است

شباب کے عارضی ہونے کا غم خیام کو شباب بہت عزیز ہے۔ اسے افسوس ہے کہ زندگی کا یہ خوب صورت اور گراں مایہ حصہ بہت جلد گزر جانے والا ہے۔ ایام شباب کے جلد رخصت ہونے کا بڑے سوز و گداز سے ذکر کیا ہے۔

افسوس کہ نامۂ جوانی طے شد — وین تازہ بہار زندگانی طے شد
آن مرغ طرب کہ نام او بود شباب — فریاد ندانیم کہ کی آمد و کی شد

بے ثباتی دنیا خیام کا دل بے ثباتی دنیا پر سخت کڑھتا ہے۔ دنیا اس کے نزدیک بے ثباتی کی ایک المیہ داستان ہے۔ شاہ و گدا امیر و وزیر کوئی فنا کے ہاتھوں محفوظ نہیں رہ سکتا۔ یہ مٹی جو پاؤں تلے روندی جاتی ہے، گزری ہوئی باعظمت ہستیوں کی یاد دلاتی ہے۔

خاکی کہ بزیر پای ہر حیوانی است — زلف صنمی و عارض جانانی است
ہر خشت کہ بر کنگرۂ ایوانی است — انگشت وزیری و سر سلطانی است

ای کوزہ گرا بخود اگر ہشیاری — تا چند کنی بر گل آدم خواری
انگشت فریدون و کف کیخسرو — بر چرخ نہادہ چہ می پنداری

گفتار کا خلوص خیام جس بات کو درست سمجھتا ہے، اس کا اظہار بڑی بے باکی سے کرتا ہے۔ یہ ہرگز خیال نہیں کرتا کہ دوسرے اس کے متعلق کیا کہیں گے۔ لوگوں کی نظروں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے کسی باطل عقیدے کو وہ کبھی حق نہیں کہتا۔ خیام بھی والٹیئر اور اناطول فرانس کی طرح تنگ خیالی پر طنز اور استہزا کے قہقہے مارتا نظر آتا ہے۔

گویند مرا کہ دوزخی باشد مست ۔۔۔ قولی است خلاف دل در آن نتوان بست
گر عاشق و مست دوزخی خواہد بود ۔۔۔ فردا بینی بہشت ہمچون کف دست

اخلاقی تعلیم اکثر ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں کے قول و کردار میں بہت فرق ہوتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کا حق غصب کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو اذیت پہنچاتے ہیں اور شرماتے نہیں۔ اس مضمون کو خیام ایک انوکھے انداز میں پیش کرتا ہے۔

زاہد بہ زنی فاحشہ گفتا مستی ۔۔۔ کز خیر گسستی و بہ شر پیوستی
گفتا من آن کہ می نمائیم ہستم ۔۔۔ تو نیز چنان کہ می نمائی ہستی

خیام جب رنج و اندوہ میں گھر جاتا ہے، تو شراب پی کر سب کچھ بھول جانا چاہتا ہے۔ عارضی سی خود فراموشی کا ذریعہ تو اسے مل جاتا ہے لیکن اُسے یہ بھی یاد رہتا ہے کہ شراب پی کر وہ جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس لیے خدا کے حضور توبہ کو بخشش و نجات کا وسیلہ بناتا ہے۔

بر سینۂ غم پذیر من رحمت کن ۔۔۔ بر جان و دل اسیر من رحمت کن
بر پائی خرابات روی من بخشای ۔۔۔ بر دست پیالہ گیر من رحمت کن

خیام مغفرت کی دعا بھی بڑے انوکھے انداز میں مانگتا ہے۔ خود اپنے لیے کچھ نہیں کہتا، بلکہ پیالہ گیر ہاتھ کے لیے دُعا مانگتا ہے اور اپنی جبین کے لیے دعا مانگتا ہے، جو مے خانے کے دروازے پر جھکی رہتی ہے۔

سالِ وفات

خیام کے سالِ پیدائش کی طرح اس کے سالِ وفات کے متعلق تذکروں میں کوئی فیصلہ کن بات نہیں ملتی۔ نظامی عروضی[۱] جو اس کا ہم عصر اور شاگرد ہے۔ لکھتا ہے۔ ۔ سنہ ۵۰۶ھ مطابق سنہ ۱۱۱۲ء کا واقعہ ہے کہ بلخ میں خواجہ امام عمر اور مظفر اسفزاری، امیر ابو سعد کی سرائے میں مقیم تھے۔ میں بھی خدمت میں حاضر ہوا اس صحبت میں میں نے سنا حکیم حجت الحق عمر خیام کہہ رہے تھے کہ میری قبر ایسے مقام پر ہوگی۔ کہ موسم بہار میں بادِ شمال مجھ پر پھول برسایا کرے گی۔ مجھے اس وقت یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوئی۔ لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ آپ کی یہ بات محض لاف بھی نہیں ہو سکتی۔ سنہ ۵۳۰ھ مطابق سنہ ۱۱۳۵ء کو جب مجھے نیشاپور جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے سنا چار سال کا عرصہ ہوا کہ یہ بزرگ دنیائے فانی کو خیرباد کہہ چکا ہے۔ وہ میرے استاد تھے جمعہ کے دن میں اُن کی قبر کی زیارت کو گیا قبر باغ کی دیوار کے ساتھ تھی۔ امرود اور زرد آلو کی شاخیں اس پر جھکی ہوئی تھیں ان کے پھولوں سے قبر لد گئی تھی مجھے استاد کی وہ بات یاد آگئی جو بلخ کی سرائے میں انھوں نے کہی تھی، اس سے میری آنکھیں آبدیدہ ہوگئیں۔

ناصر خسرو

پیدائش سنہ ۳۹۴ھ مطابق سنہ ۱۰۰۳ء
وفات سنہ ۴۸۱ھ مطابق سنہ ۱۰۸۸ء

سلجوقی عہد کا ایک اور نامور شاعر حکیم ناصر خسرو ہے، جس نے شاعری کو مذہبی عقائد کی نشر و اشاعت کا وسیلہ بنایا۔

ناصر خسرو کی کنیت ابو معین اور لقب حجت ہے۔ جو اسے فاطمی خلیفہ مستنصر باللہ کی طرف سے ملا تھا۔ اس لقب کو وہ اکثر اشعار میں تخلص کے طور پر لاتا ہے۔

تعلیم و تحقیق

ناصر خسرو بھی شہر قبادیان میں سنہ ۳۹۴ھ مطابق سنہ ۱۰۰۳ء میں پیدا ہوا۔ اسے علم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا، چنانچہ قرآنِ کریم

۱۔ چہار مقالہ مرتبہ

حفظ کیا، حدیث وفقہ کی تعلیم پائی۔ ریاضی، طب، موسیقی، نجوم و فلسفہ اور علم کلام میں کمال حاصل کیا۔ ناصر خسرو کو مختلف مذاہب کی تحقیق کا بہت شوق تھا، چنانچہ اس نے مذہب زرتشت، مذہب مانیہ، یہود و نصاریٰ اور ہندوؤں کے مذاہب کا بہت گہرا مطالعہ کیا۔

ملازمت و مسافرت

ناصر خسرو فارغ التحصیل ہونے کے بعد کچھ عرصہ غزنوی بادشاہوں محمود اور مسعود کے درباروں سے وابستہ رہا، جیساکہ اس نے اپنے سفر نامہ میں اشارہ کیا ہے۔ بعد میں دربار سلجوقیہ کی ملازمت اختیار کی۔ یہاں اسے دبیری کا منصب ملا۔ پھر محکمہ مال کے ایک ذمے دار عہدے پر بھی فائز ہوا۔ آخر بینتالیس سال کی عمر میں ملازمت کو خیرباد کہہ کر ۴۳۹ھ مطابق ۱۰۴۷ء میں حج کعبہ کو روانہ ہوا۔ مکہ سے دمشق ہوتا ہوا بیت المقدس پہنچا، وہاں سے مصر آیا اور قاہرہ میں مقیم ہوا۔ دوران سیاحت اس نے ارمنستان، ایشیائی کوچک، طرابلس، شام، فلسطین، جزیرۃ العرب، قیروان اور سوڈان کی سیاحت کی، اور چار مرتبہ حج کی سعادت سے بھی سرفراز ہوا۔

ناصر خسرو نے سیاحت کے دوران اپنا سفر نامہ مرتب کیا۔ اس میں ان شہروں کا مفصل حال لکھا ہے، جہاں جہاں سے اس کا گزر ہوا۔ ان لوگوں کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے، جن سے اسے ملنے کا موقع ملا۔ سفر نامے کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مصر میں تین سال مقیم رہا۔ یہاں وہ فاطمی خلیفہ المستنصر کے نظم و نسق، عدل و انصاف اور شان و شکوہ سے بہت متاثر ہوا۔ اس کے علاوہ اسمٰعیلی عقائد کا بھی اس پر بہت اثر تھا۔ چنانچہ قیام مصر کے دوران وہ اس نئے دین کا حلقہ بگوش ہوگیا۔ ناصر خسرو کو خلیفہ کی خدمت میں مشرف باب ہونے کے اکثر موقعے ملتے تھے۔ خلیفہ اس کی بہت عزت کرتا تھا، چنانچہ اسے "حجت" کے لقب سے نوازا اور اسے اختیار دیا کہ

ایران جاکر اسمٰعیلیہ عقائد کی نشر و اشاعت کرے۔

وطن کو واپسی اور ہجرت

ناصر خسرو مصر اور حجاز سے لوٹ کر بلخ واپس آگیا۔ یہاں اس نے دین اسمٰعیلیہ کی اشاعت کرنی چاہی، لیکن علمائے اسلام اور امرائے سلجوقیہ نے اس کی شدید مخالفت کی اور اس کی دشمنی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ کوئی ایسا ضرر نہ تھا جو اسے نہ پہنچایا جاتا۔ وہ سخت بے بس تھا، لیکن دین اسمٰعیلی کی محبت میں سب کچھ برداشت کرتا۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہا، کہ بلخ کو خیرباد کہہ جائے۔ ناصر یہاں سے چل کر پوشیدہ طور پر اسمٰعیلی عقائد کی اشاعت کرتا رہا لیکن جہاں کہیں جاتا، اس کے لیے پریشانیاں پیدا ہو جاتیں۔ اس مسافرت میں اسے طرح طرح کی مصیبت جھیلنا پڑی، جیسا کہ اشعار ذیل سے ظاہر ہے۔

آزردہ کرد کژدم غربت جگر مرا | گوئی زبون نیافت زگیتی مگر مرا
گویم چرا نشانۂ تیر زمانہ کرد | چرخ بلند جاہل بیدادگر مرا
گر بر قیاس فضل بگشتی مدار دہر | جز بر مقر ماہ نبودی مقر مرا
نی نی کہ چرخ و دہر ندانند قدر فضل | این گفتہ بود گاہ جوانی پدر مرا

اس غریب الوطنی کی یادگار اس کی تصنیف "زاد المسافرین" ہے۔ اس کتاب میں ناصر خسرو نے اسمٰعیلی عقائد کو دلائل و براہین سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ متعدد فلسفیانہ اور محققانہ مقالات بھی لکھے ہیں۔ اس لحاظ سے "زاد المسافرین" کا شمار فارسی کی معدودے چند فلسفیانہ کتابوں میں ہوتا ہے۔

ناصر خسرو مازندران اور طبرستان ہوتا ہوا ۴۵۶ھ مطابق ۱۰۶۳ء میں بدخشان پہنچا اور یمگان میں گوشہ نشینی اختیار کی اور یہیں بالآخر ۴۸۱ھ مطابق ۱۰۸۸ء میں وفات پائی۔

تصنیفات

"سفرنامہ" اور "زاد المسافرین" کے علاوہ ذیل کی کتابیں بھی

حکیم ناصر خسرو کی یادگار ہیں

وجہ دین :- یہ کتاب نثر میں ہے اور اس میں اسمٰعیلیہ عقاید کی وضاحت کی گئی ہے۔

روشنائی نامہ :- مثنوی روشنائی نامہ بحر ہزج میں ہے۔ اس میں عقل و دانش، علم اخلاق اور علم الٰہیات پر بحث کی گئی ہے۔ دانش کے متعلق لکھتے ہیں :-

ز دانش زندہ مانی جاودانی ‏ ‏ ز نادانی نیابی زندگانی
نماند بر تو پنہان ہیچ حالی ‏ ‏ نبینی از جہان در دل ملالی
اگر کاری کنی مزدی ستانی ‏ ‏ چو بیکاری، یقین بی مزد مانی

ذیل کے اشعار میں خودی اور خود شناسی کی اہمیت بتائی گئی ہے :-

بدان خود را کہ گر خود را بدانی ‏ ‏ ز خود ہم نیک و ہم بد را بدانی
شناسای وجود خویشتن شو ‏ ‏ پس آنگہ سر فراز انجمن شو
یکی بیدار شو تا چند خفتی ‏ ‏ ببین خود را کہ خیری بس شگفتی
تو ز انسان آفریدہ بہر کاری ‏ ‏ دریغ آید کہ مہمل در گذاری
ملک فرمان بر شیطان دریغ است ‏ ‏ ملک دستور دیوان دریغ است

دوست کی کم یابی اور اس کی صفات کے متعلق ناصر خسرو کہتا ہے :-

رفیقی من درین منزل ندیدم ‏ ‏ حقیقت دوستی یک دل ندیدم
ازین مشت رفیقان ریائی ‏ ‏ بریدن بہتر است از آشنائی
عزیزی، تا کہ داری زر و دینار ‏ ‏ چو دینارت نماند آنگہ شوی خوار
چو مالت کاست از مہرت بکاہند ‏ ‏ زبانت بہر سود خویش خواہند
کسی را مرد عاقل دوست خواند ‏ ‏ کہ او در نیک و بد با دوست ماند
فرو بندد کمر در مہربانی ‏ ‏ برای دوست خواہد زندگانی

جدا از خود نداند دوستان را   کند یک رنگ دل را و زبان را

سعادت نامہ :۔ مثنوی سعادت نامہ کا موضوع اخلاقیات ہے۔ یہ مثنوی ۳۰ ابواب اور ۲۸۷ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ بھی بحرِ ہزج میں ہے۔ ذیل کے چند اشعار میں دل آزاری سے پرہیز کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

فزوں خواہی نفادلہا میازار   کہ دائم دیر زی باشد کم آزار

ہمیشہ نیک خواہ مردمان باش   بہ نیکی کوش و آنگہ در امان باش

چو بد خواہی بکس از خشم بکاہی   نہ بینی ہیچ بد گر نیک خواہی

مروت نیست گر افتاد گانی   برہ بینی و خود مرکب برانی

ز نیکاں باش و اندر نیکوی کوش   مکن نیکی مکس از دل فراموش

دلجوئی اور ہمدردی کو کس خوبی سے بیان کیا ہے :۔

بہ لطف و مرحمت دل ہا نگہدار   کس از دست و زبان خود میازار

بہ کار افتادہ کار آموز می باش   بہر دل سوختہ دل سوز می باش

چو مرہم خستہ را راحت رسان باش   بسختی چارۂ بی چارگان باش

دیوان :۔ کہا جاتا ہے ناصر خسرو کا دیوان تیس ہزار اشعار پر مشتمل تھا لیکن آج کل جو دیوان ملتا ہے، اس میں کل گیارہ ہزار اشعار ہیں۔ ناصر خسرو کا دیوان فلسفہ، اخلاق، پند و موعظت، عقل و دانش اور مذہب ایسے موضوعات پر مشتمل ہے آپ نے متعدد قصیدے بھی لکھے ہیں۔ یہ قصیدے کسی کی مدح و ستائش میں نہیں، بلکہ ان میں عقل و دانش کی فضیلت اور دینی مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ یہ تلقین بھی کی گئی ہے، کہ مادی دنیا کی رنگینیوں سے پرہیز کرو اور ریاضت و تقوی کی زندگی بسر کرو۔ ایک مشہور قصیدے کے چند شعر درج ذیل ہیں۔

نکوہش مکن چرخ نیلوفری را   برون کن ز سر باد خیرہ سری را

چو تو خود کنی اختر خویش را بد — مدار از فلک چشم نیک اختری را

به سوزند چوب درختان بی بر — سزا خود همین است مر بی بری را

درخت تو گر بار دانش بگیرد — به زیر آوری چرخ نیلوفری را

صفت چند گوئی ز شمشاد و لاله — رخ چون مه و زلف عنبری را

بعلم و بگوهر کنی مدحت آن را — که مایه است مر جهل و بد گوهری را

به نظم اندر آری دروغ و طمع را — دروغ است سرمایه مر کافری را

من آنم که در پای خوکان نریزم — مر این قیمتی دُرِّ لفظ دری را

ایک قصیدے میں حکمت، علم و ہنر اور جد و جہد کے متعلق لکھا ہے:

بی خرد گرچه رها باشد در بند بود — با خرد گرچه بود بسته چنان دان که رهاست

حکمت آموز و کم آزار و نکو گوی و بدانک — رود خشر این همه را قیمت و بازار و بهاست

مردم آن است که دین است و هنر جامهٔ او — نه یکی بی هنر و فضل که دیباش قباست

اسماعیلی عقاید کی پیروی کرتے ہوئے ناصر خسرو باطنی تعلیم پر زور دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مذہب کی حقیقی روح سے آگاہ ہونے کے لیے محض ظاہری تعلیم کافی نہیں۔ اس کے لیے باطنی تعلیم کی ضرورت ہے، اور باطنی تعلیم امام وقت کی بیعت کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

بچشم جهان بین نهان جهان را — که چشم عیان بین نبیند نهان را

نهان در جهان چیست آزاده مردم — نبینی نهان را ببینی عیان را

جهان را با آهن نشایدش بستن — بزنجیر حکمت ببند این جهان را

دو چیز است بند جهان علم و طاعت — بدین هر دو بگمار تن را و جان را

ناصر خسرو کے اشعار کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ صاحبِ نظر اور آزاد منش شاعر ہے اس کے افکار و خیالات سے اس کی ذاتی دیانت اور خلوص

ٹپکتا ہے۔ اشعار میں مے و معشوق کی بجائے روحانی اور اخلاقی مطالب ملتے ہیں۔ شعر و فکر میں ناصر کا ایک خاص انداز ہے۔ کسی شخص کو فرخی کا قصیدہ پڑھ کر یہ تو گمان ہو سکتا ہے کہ یہ عنصری کا قصیدہ ہے، لیکن ناصر خسرو کا قصیدہ پڑھ کر یہ گمان نہیں گزرتا کہ یہ اس کے سوا کسی اور کا قصیدہ ہو سکتا ہے۔

دیوان میں کچھ قطعات بھی ہیں۔ "از ماست کہ بر ماست" آپ کا ایک سبق آموز قصیدہ درج ذیل ہے۔

روزی ز سر سنگ عقابی بہوا خاست | از بہر طمع بال و پر خویش بیاراست
بر راستی بال نظر کرد و چنین گفت | امروز ہمہ روی زمین زیر پر ماست
گر اوج بگیرم بپرم از نظر شید | می بینم اگر ذرہ ای اندر تہ دریاست
گر بر سر خاشاک یکی پشہ بجنبند | جنبیدن آن پشہ عیان در نظر ماست
بسیار منی کرد و ز تقدیر نترسید | بنگر کہ ازین چرخ جفا پیشہ چہ برخاست
ناگہ ز کمین گاہ یکی سخت کمانی | تیری ز قضا و قدر انداخت بر او راست
بر بال عقاب آمد آن تیر جگر دوز | وز ابر مر او را بسوی خاک فرو خاست
بر خاک بیفتاد و بغلطید چو ماہی | و آنگاہ پر خویش کشید از چپ و از راست
گفتا عجب است این کہ ز چوبست و ز آہن | این تیزی و تندی و پریدنش کجا خاست
زی تیر نگہ کرد و پر خویش برو دید | گفتا ز کہ نالیم کہ از ماست کہ بر ماست

انوری ہروی ابوبکر زین الدین ہروی، اسمٰعیل وراق کا بیٹا ہے جس کے پاس فردوسی نے دربار غزنی سے نکل کر پناہ کی تھی۔

ازرقی الپ ارسلان کے بیٹے طغانشاہ کے دربار سے وابستہ تھا جو خراسان

لہ یعنی سوئی طرف

کا حاکم تھا چنانچہ متعدد قصائد اس کی شان میں لکھے ہیں۔

انداز بیان :۔ ازرقی قصائد میں عنصری سے متاثر معلوم ہوتا ہے مثلاً ازرقی کا یہ قطعہ :۔

جود حاتم را در اخبار و سمر خوانم ہمی — زانکہ لفظ حقیقی نیست جاری در سمر
جود او را من بچشم سر ہمی بینم عیان — کین عیان نزدیک من فاضل تر است از خبر

عنصری کے قطعہ ذیل سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔

ایا شنیدہ ہنر ہای خسروان بخبر — بیا ز خسرو مشرق عیان ببین تو ہنر
دروغ زیر خبر دان و راست زیر عیان — اگر دروغ چہ نیکست بلست نیکوتر

لیکن وہ اپنے آپ کو عنصری سے برتر سمجھتا ہے، جیسا کہ اشعار ذیل سے واضح ہوتا ہے۔

عنصری در خدمت محمود دائم فخر کرد — زانکہ دادش درہم و دینار و خلعت بر سری
اندرین میدان شعر اکنون سبق مربندہ را — گو درین میدان در آید گر تواند عنصری

ازرقی کے بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ علوم متداولہ میں دسترس رکھتا تھا، مثلاً

قمر ز اسپ تو آموخت سیر ازین معنی — سریع تر بود از ہر ستارہ سیر قمر
ہلال شکل ز نعل سمند او گیرد — ازین سبب ز خسوف ایمن است شکل ہلال
چنان کمان و در دست گیری مایہ سعدی شہا — مایہ سعد است چو در قوس باشد مشتری

ازرقی کے بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ آنا خیال اور بلند ہمت شخص تھا۔ اس کا پیرہن اگر کہنہ ہو تو یہ اسے گوارا ہے، لیکن یہ گوارا نہیں کہ کسی نااہل کی مدح و ستائش کرتے کرتے اس کا جسم ضعیف ہو جائے۔ اس کے نزدیک جسم کو کفن سے ڈھانپنا، اس سے کہیں بہتر ہے کہ کسی لئیم سے خلعت پا کر اپنے جسم کو آراستہ کرے۔

در مدح ناکسان نکنم کہنہ تن بنیز — زان باک نایدم کہ بود کہنہ پیرہن
آراستہ بجامہ تن از صلت لئیم — بہ زان کفن کشیدن و پوشیدن کفن

فی البدیہہ شعر کہنے میں ازرقی کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ نظامی[۱] عروضی لکھتا ہے کہ ایک دن طغانشاہ چوپٹ کھیل رہا تھا، اسے بازی جیتنے کے لیے دو چھکوں کی ضرورت تھی، لیکن دو اکے آ گئے جس سے طغانشاہ سخت غضبناک ہوا، لمحہ بہ لمحہ اس کا ہاتھ قبضہ شمشیر کی طرف بڑھتا تھا۔ ازرقی نے اپنے ممدوح کی حالت غیر دیکھی، تو فی البدیہہ

گر شاہ دو شش خواست دو یک زخم افتاد	تا ظن نبری کہ کعبتین داد نداد
آن زخم کہ کرد رائ شاہنشاہ یاد	در حضرت شاہ روی باخاک نہاد

طغانشاہ کا غصہ فرو ہو گیا اور حکم دیا، اس کا منہ موتیوں سے بھر دیا جائے۔

تصنیفات

ازرقی کی یادگار اس کا دیوان ہے، جو دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ آقای قزوینی نے اس کی ایک منظوم[۲] داستان "سندباد" کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ازرقی نے اس موضوع پر متعدد اشعار لکھے تھے، جو تذکروں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ ازرقی کا قطعہ ذیل اس کا شاہد ہے۔

ہر کو بلند شہریارا بیند ہای سندباد	نیک داند کاندر او دشوار باشد شاعری
من معانی ہای اورا یاور دانش کنم	گر کند بخت تو شاہا خاطرم را یاوری

لیکن آقائی قزوینی خود ہی لکھتے ہیں کہ یہ داستان اب ناپید ہے۔ ازرقی کے سال وفات کے متعلق تذکرہ نویسوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مولف مجمع الفصحا نے سال وفات ۵۲۶ھ مطابق ۱۱۳۱ء لکھا ہے تقی الدین کاشی نے ۵۲۷ھ ہجری مطابق ۱۱۳۲ عیسوی بتایا ہے۔ لیکن آقائی[۳] قزوینی لکھتے ہیں کہ ازرقی ۴۶۵ ہجری مطابق ۱۰۷۲ء سے پیشتر وفات پا چکا تھا

---

۱ چہار مقالہ مرتبہ میرزا قزوینی ص ۴۹ ۲ حاشیہ چہار مقالہ ص ۱۷۵ مرتبہ میرزا قزوینی
۳ دیکھیے صفحہ ایضاً۔

اسدی ابو نصر علی بن احمد نام، اسدی تخلص اور وطن طوس ہے۔ اسدیؔ کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے، جنھوں نے فردوسی کے شاہنامے کی تقلید میں رزمیہ مثنویاں لکھیں۔ چنانچہ ایسی ہی ایک مثنوی "گرشاسپ نامہ" اسدی کی یادگار ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ اسدی کے والد ابو نصر احمد کا تخلص بھی اسدی تھا، جو غزنوی دور میں منظوم مناظرے لکھنے کی وجہ سے مشہور ہوا باپ اور بیٹے کا ایک ہی تخلص ہونے کی وجہ سے بعض تذکرہ نویسوں کو گمان گزرا ہے کہ "گرشاسپ نامہ" اسدی بزرگ کی تصنیف ہے۔ علامہ شبلیؔ[1] نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ جدید[2] ایرانی محقق شفق کو بھی اس قسم کی غلط فہمی ہوئی ہے اور وہ پانچویں صدی کے اساتذہ یعنی اسدی خورد کو مناظروں کا مصنف بتاتے ہیں۔

سب سے پہلے ایتھے اور پھر پروفیسر[3] براؤن نے قارئین کی توجہ اس غلط فہمی کی طرف دلائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "گرشاسپ نامہ کا مصنف اسدیؔ خورد ہے۔ اسے اسدی بزرگ سے مختلف سمجھنا چاہیے، جو مناظروں کا مصنف تھا۔"

ان دو علما کے بعد پروفیسر[4] حافظ محمود شیرانی نے بھی اس غلط فہمی پر روشنی ڈالی ہے۔ "گرشاسپ نامہ" ۴۵۸ھ مطابق ۱۰۶۵ء میں لکھا گیا تھا، جیسا کہ مصنف نے خود ظاہر کیا ہے۔

ز ہجرت بدور سپہری کہ گشت شدہ چار صد سال و پنجاہ و ہشت

---

[1] شعر العجم جلد اوّل ص ۱۲۱

[2] تاریخ ادبیات ایران ۱۳۷

[3] لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم ص ۲۷۲

[4] تنقید بر شعر العجم ص ۱۵۳

لیکن اسدی بزرگ غزنوی دور کا شاعر تھا، جس کی وفات سلطان مسعود غزنوی کے عہد میں ہوئی۔ اس لیے "گرشاسپ نامہ" اسدی بزرگ کی تصنیف نہیں ہو سکتا۔ اور نہ بقول شفق پانچویں صدی ہجری کا اسدی، مناظروں ہی کا مصنف ہو سکتا ہے جو چوتھی صدی ہجری میں اسدی نے لکھے تھے۔

"گشتاسپ نامہ" یا "گرشاسپ نامہ" شاہنامے کی تقلید میں لکھا گیا ہے۔ اس میں زرتشت کے پیرو گشتاسپ کے حالات نظم کیے گئے ہیں۔ "گشتاسپ نامہ" شاہنامے ہی کی بحر میں لکھا گیا ہے۔ اس کا اندازِ نگارش بھی وہی ہے۔ اس میں تقریباً نو ہزار اشعار ہیں، جیسا کہ اسدی خود لکھتا ہے ؎

برآمد ہمی بیت بانہ ہزار | دو سال اندرو بردہ شد روزگار

گشتاسپ کا ذکر اوستا میں آیا ہے۔ ابوالمؤید بلخی کے شاہنامہ منثور اور فردوسی کے شاہنامے میں بھی گشتاسپ کا ذکر اختصار سے کیا گیا ہے۔ اسدی لکھتا ہے کہ فردوسی نے گشتاسپ کے مفصل حالات نہیں لکھے تھے، اس لیے اسے گشتاسپ کے مفصل حالات لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

بہ شہنامہ فردوسی نغز گوی | کہ از پیش گویندگان برد گوی

بسی یاد از رزم یلان کردہ بود | ازین داستان یاد ناوردہ بود

من اکنون ز طبعم بہار آورم | برین شاخ نو را ببار آورم

گرشاسپ پیشدادی خاندان کا ایک مشہور بادشاہ ہوا ہے، اس کی حکومت زابلستان میں تھی۔ فنِ پہلوانی میں یکتائے روزگار تھا۔ فردوسی نے جس طرح رستم کو پہلوانی اور جوانمردی کا شاہکار بتایا ہے، اسی طرح اسدی نے گرشاسپ کو دلیری اور شجاعت کا مجسمہ ظاہر کیا ہے اور یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ گرشاسپ کو رستم پر فوقیت حاصل تھی۔ جیسا کہ اشعار ذیل سے ظاہر ہے

ز کردار گرشاسپ اندر جہان — یکی نامہ بد یادگار جہان
پر از دانش و پند آموزگار — ہم از راز چرخ و ہم از روزگار
ز فرہنگ و نیرنگ و داد و ستم — ز خوبی و زشتی و شادی و غم
ز نخچیر و گردن فرازی و رزم — ز مہر دل و کین و شادی و بزم
کہ چون خوانی از ہر دری اندکی — بسی دانش افزایدت از ہر یکی
ز رستم سخن چند خواہی شنود — گمانی کہ چون او بمردی نبود
اگر رزم گرشاسپ یاد آوری — ہمہ رزم رستم بباد آوری
ہمان بود رستم کہ دیو نژند — ببردش با بیرو بدریا فگند
زبون گردش اسپندیار دلیر — بکشتیش آورد و سہراب زیر
سپہدار گرشاسپ تا زندہ بود — نہ گردش زبون کس نہ افگندہ بود
بہند و بروم و بچین از نبرد — بکرد آنچہ دستان و رستم نکرد

گشتاسپ کو رستم سے بڑھانے میں اگرچہ اسدی نے سارا زور طبیعت صرف کر ڈالا ہے، لیکن ہر شخص آسانی سے فیصلہ دے سکتا ہے کہ جاودانی حیثیت کس پہلوان نے حاصل کی، رستم نے یا گرشاسپ نے۔

گرشاسپ نامہ اور شاہنامہ میں گرشاسپ کے حالات بڑی حد تک مطابقت رکھتے ہیں، لیکن اوّل الذکر مثنوی میں گرشاسپ کی ان فتوحات کا بھی ذکر آیا ہے، جو اسے ہند، چین، قرطبہ، روم، توران اور بعض جزیروں میں حاصل ہوئیں جن کا شاہنامہ میں ذکر نہیں۔

ماحول اور منظر کشی جنگ کا ماحول اسدی کے فکر پر کچھ اس طرح چھایا ہوا ہے کہ قدرتی مناظر بھی اُسے میدان کارزار کی یاد دلا دیتے ہیں۔

گرشاسپ کا گزر ایک گھنے جنگل سے ہوتا ہے۔ جنگل کو میدان کارزار سے کیا نسبت ہو سکتی ہے، لیکن شاعر کا ذوقِ رزم آرائی دیکھیے کہ جنگل کے گھنے درخت بھی اسے مردانِ کارزار نظر آتے ہیں۔ درختوں کی الجھی ہوئی شاخیں ان کی کمانیں ہیں، اور پھل اُن کے گرز ہیں، پتے اُن کے لیے ڈھالوں کا کام دیتے ہیں، اور نوک دار کانٹے برچھیوں کا۔ اس ساز و سامان کے ساتھ وہ گویا ایک دوسرے پر حملہ آور ہیں۔

چنان تنگ و درہم کہ بیشہ بود کہ رفتن درآن کار اندیشہ بود
درختانش ہم در کشیدہ بسر چو خط دبیران یک اندر دگر
ہمہ شاخ ہا تا بہ چرخ کبود بہم در شدہ تنگ چون تار و پود
تو گفتی سپاہی است در جنگ سخت زدہ ہیبت گرد دگر سر درخت
کمان شاخ ہا شان ہمہ گرز بار ہمہ برگ ہا دشنہ ان نوک خار
نہ سایہ اندر وی از چرخ ہور ز تنگی رہش پوست رفتی ز مور

جنگی ماحول پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ منظر کشی بھی کچھ اس انداز میں کی ہے کہ گھنے درخت کا سماں آنکھوں میں پھرنے لگ جاتا ہے۔

پند و نصائح اسدی نے فردوسی کی طرح واقعات جنگ سے بڑے سبق آموز نتائج اخذ کیے ہیں۔ مثلاً گرشاسپ اپنے بھتیجے کو نصیحت کرتا ہے۔

نگر تا گناہت نباشد بسی بیزدان از بخت نالد کسی
فرومایہ را دار دور از برت مکن آن کہ ننگی شود گوہرت
بکس بیش از اندازہ نیکی مکن کہ گر خود بد اندیشہ شد بشنو سخن
بفرہنگ پرور چو داری پسر نخستین نویسندہ کن از ہنر
نویسندہ را دست گویا بود گل دانش از کلکش بویا بود

به بخشای بر زیردستان بمهر — بر آشیان بهر خشم مغرور چهر
چو دشمت بسند و ستان ابپای — که تا در غم آرند حسرت بجای

لغت فرس

"گرشاسپ نامہ" کے علاوہ اسدی کی ایک اور یادگار اس کا لغت ہے، جو "لغت فرس" یا "فرہنگ اسدی" کے نام سے مشہور ہے۔ اسے شعرا کا ایک مختصر سا انسائیکلوپیڈیا کہنا چاہیئے۔

لغت فرس میں ایسی منظوم کتابوں کے اشعار بھی ملتے ہیں، جو اب ناپید ہو چکی ہیں لیکن ان کا ذکر تذکروں میں آتا ہے۔ ایسی ہی ایک کتاب "کلیلہ و دمنہ" تھی جو رودکی نے نظم کی۔ رودکی کی اس منظوم داستان کے کچھ مٹے ہوئے نقوش دیکھنے ہوں، تو لغت فرس میں نظر آسکتے ہیں۔ اس لغت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ایسے متعدد الفاظ کے معنی دیئے گئے ہیں جن کو ایرانی ادب بالکل فراموش کر چکا ہے۔ الفاظ کے معانی کو واضح کرنے کے لیے مستند شعرا کے اشعار شاملِ کتاب ہیں۔

اسدی کی کتابت کا ایک نمونہ

عہد سامانی میں، جیسا کہ ذکر آچکا ہے، ابو منصور موفق ہروی نے ایک کتاب "الابنیہ عن حقائق الادویہ" تصنیف کی تھی۔ اس کا ایک نسخہ اسدی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ملتا ہے۔ یہ نسخہ خطِ فارسی کی کتابت کا ایک قدیمی نمونہ ہے۔

اسدی کا سن وفات ۴۶۵ھ مطابق ۱۰۷۲ء ہے۔

قطران تبریزی

ابو منصور قطران تبریز میں پیدا ہوا، اور اس کی عمر کا بیشتر حصہ آذربائیجان میں گزرا، جہاں کے حکمرانوں کی وہ مدح سرائی کرتا رہا۔ سنہ ۴۳۸ھ مطابق سنہ ۱۰۴۶ء میں جب ناصر خسرو تبریز آیا، تو جیسا کہ اس نے اپنے سفرنامہ میں ذکر کیا ہے، اس کی ملاقات قطران سے ہوئی اور اس کے اشعار سن کر بہت محظوظ ہوا۔

قطران نے متعدد قصائد آذربائیجان کے حکمرانوں کی مدح میں لکھے ہیں۔ ان

میں امیر وہسودان خاص طور سے اس کا محسن اور مربی تھا۔ اس کی وفات کے بعد جب ابونصر حاکم تبریز ہوا، تو قطران نے اس کی مدح میں بھی قصیدے کہے ہیں۔

قطران مکتب خراسانی کا پیرو ہے، لیکن نئی نئی ترکیبیں لانے میں اسے خاص ملکہ حاصل ہے۔ اس کی تشبیہات میں جدت پائی جاتی ہے۔ کلام میں صنایع بدایع بھی ہیں۔ ذو قافیہ نظمیں لکھنے میں اسے خاص مہارت حاصل ہے۔ مثلاً

چوں بطرف جوی بنماید گل خود روی روی
جای با معشوق می خوردن بطرف جوی جوی

برده از مرجان بگونه لالهٔ نعمان سبق
برده از مطرب بدستان بلبل خوشگوی گوی

بستد از یاقوت و لبید لاله و گلنار رنگ
یافت از کافور و عنبر خیری و شبوی بوی

قطران کو واقعہ نگاری اور منظر کشی میں بہت دسترس حاصل ہے۔ اس کی ایک عمدہ مثال قصیدہ "زلزلہ تبریز" ہے، جو اس نے ۴۳۴ھ مطابق ۱۰۴۲ء میں لکھا تھا، چند شعر حسب ذیل ہیں۔

بود محال ترا داشتن امید محال	بعالمی که نباشد همیشه بر یک حال
از آن زمان که جهان بود حال این بود	جهان بگردد لیکن نگردد ش احوال
دگر شوی تو ولیکن همان بود شب و روز	دگر شوی تو ولیکن همان بود مه و سال
نبود شهر در آفاق خوشتر از تبریز	به ایمنی و بمال و به نیکوی و جمال
در و بکام دل خویش هر کسی مشغول	امیر و بنده و سالار و فاضل و مفضال
یکی بطاعت ایزد، یکی بخدمت خلق	یکی بجستن نام و یکی بجستن حال
یکی بخواستن جام با سماع غزل	یکی بتاختن یوز و شکار غزال

خدا بمردم تبریز برفگند فنا ‏ ‏ ‏ ‏ خدا بہ نعمت تبریز برگماشت زوال
فراز گشت نشیب و نشیب گشت فراز ‏ ‏ ‏ ‏ رمال گشت بحار و بحار گشت رمال
دریدہ گشت زمین و خمیدہ گشت نبات ‏ ‏ ‏ ‏ دمندہ گشت بحار و روندہ گشت جبال
بسا سرای کہ بامش ہمی بسود فلک ‏ ‏ ‏ ‏ بسا درخت کہ شاخش ہمی بسود ہلال
ازان درخت نماندہ کنوں مگر آثار ‏ ‏ ‏ ‏ وزاں سرای نماندہ کنوں مگر اطلال
کسی کہ رستہ شد از مویہ گشتہ بود چو موی ‏ ‏ ‏ ‏ کسی کہ جستہ بد از نالہ گشتہ بود چو نال
یکی نبود کہ گوید بدیگری کہ مموی ‏ ‏ ‏ ‏ یکی نبود کہ گوید بدیگری کہ منال
کمال دور کناد ایزد از جمال جہان ‏ ‏ ‏ ‏ کجی رسند بجمالی کجا گرفت کمال

اس قصیدے سے پتہ چلتا ہے کہ قطران نے محض مدحیہ قصائد ہی نہیں لکھے، بلکہ طبعی حوادث اور تاریخی واقعات بھی نظم کیے ہیں۔

قطران کا دیوان دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ایک مثنوی "ناقوس نامہ" بھی اُس کی یادگار ہے۔

قطران کا سال وفات ۴۶۵ھ مطابق ۱۰۷۲ء بیان کیا جاتا ہے۔

فخرالدین گرگانی

فخرالدین اسعد جرجانی سلجوقی حکمران ابوطالب طغرل بیگ ۴۳۲ھ تا ۴۵۵ھ مطابق ۱۰۴۰ء تا ۱۰۶۳ء کے دربار کا شاعر تھا۔ اس کی یادگار ایک عشقیہ مثنوی "ویس ورامین" ہے۔ عوفی تذکرہ لباب الالباب میں لکھتا ہے کہ یہ مثنوی ۴۴۶ھ مطابق ۱۰۵۴ء میں تصنیف ہوئی۔

ویس ورامین کا ماخذ پہلوی کی اسی نام کی ایک داستان ہے۔ فخرالدین اسعد نے اسے سادہ اور سلیس فارسی میں نظم کیا۔ مثنوی کے مقدمے میں اسعد نے سلجوقی حکمران ابوطالب بیگ کی مدح میں بھی چند شعر کہے ہیں۔ دو شعر مدح کے حسب ذیل ہیں:-

ابوطالب شہنشاہِ معظم　　خداوند خداوندانِ عالم

بہر کس نفرستادہ عز و نعمت　　ملک طغرل بک آن خورشید ہمت

دولت شاہ سمرقندی نے اس مثنوی کا ذکر تو کیا ہے، لیکن فخر الدین اسعد کا کہیں ذکر نہیں۔ اس مثنوی کو وہ نظامی عروضی سمرقندی کی تصنیف بتاتا ہے، لیکن جیسا کہ مقدمہ سے ظاہر ہوتا ہے، یہ مثنوی ابوطالب طغرل کے زمانے میں لکھی گئی، نظامی عروضی کی وفات سنہ ۵۴۷ھ مطابق ۱۱۵۲ء کے بعد ہوئی، اس لیے دولت شاہ سمرقندی کا بیان درست معلوم نہیں ہوتا۔

فخر الدین اسعد کا اندازِ بیان سادہ، شیریں اور رواں ہے۔ ذیل کے چند اشعار بطور مناجات لکھے ہیں:-

سپاس و آفرین آن پادشہ را　　کہ گیتی را پدید آورد و ما را

بدو زیباست ملکِ پادشاہی　　کہ ہرگز ناید از ملکش جدائی

خدای پاک و بی ہمتا و بی یار　　ہم از اندیشہ دور و ہم ز دیدار

نہ تواند مرورا چشم دیدن　　نہ اندیشہ در و داند رسیدن

نشاید وصف او گفتن کہ چونست　　کہ از تشبیہ و از وصف او برونست

ذیل کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالفتح مظفر نے اسعد کو یہ مثنوی لکھنے پر آمادہ کیا تھا جو حکومت سلجوقیہ کی طرف سے اصفہان کا حاکم تھا

خداوند جہان سلطانِ اعظم　　بعزم رفت از صفاہان شاد و خرم

مرا اندر صفاہان بود کاری　　در آن کارم ہمی شد روزگاری

شدم زی تاج دولت خواجہ بوالفتح　　کہ بادش جاودان در کارہا فتح

پس آنگہ گفت با ما این زمستان　　ہمی باش و مکن عزم کہستان

مرا یک روز گفت آن قبلہ دین　　چہ گوئی در حدیث ویس و رامین

که می گویند چیزی سخت نیکوست | درین کشور همه کس داردش دوست
بگفتم کان حدیث سخت زیباست | زگرد آورده شش مرد دانا ست
ولیکن پہلوی باشد زبانش | نداند هر که برخواند بیانش

فخر الدین اسعد کی وفات پانچویں صدی کے وسط میں ہوئی۔

فصیحی گرگانی اسی عہد کا ایک اور شاعر فصیحی گرگانی ہے۔ جو مثنوی "وامق و عذرا" کا مصنف بتایا جاتا ہے۔ فصیحی سے پہلے عنصری نے بھی اس داستان کو نظم کیا تھا۔

وامق و عذرا کا ماخذ بھی پہلوی کی ایک داستان ہے، جس کے متعلق دولت شاہ سمرقندی لکھتا ہے۔ "کہا جاتا ہے[1]، امیر عبداللہ بن طاہر خلافت عباسیہ کے زمانے میں نیشاپور کا حاکم تھا۔ اس کے پاس ایک شخص آیا اور ایک کتاب تحفے کے طور پر پیش کی۔ امیر نے پوچھا، یہ کیسی کتاب ہے۔ اس نے جواب دیا، یہ وامق و عذرا کی ایک عشقیہ داستان ہے، جو بادشاہ نوشیرواں کے لیے لکھی گئی تھی۔ امیر نے کہا، ہم کلام مجید کی تلاوت کرتے ہیں، ہمارے لیے کلام مجید اور احادیث نبوی ہی کافی ہیں۔ ایسی کتابیں آتش پرستوں کی تصنیفیں ہیں، جن کی ہمیں ضرورت نہیں۔

آج کل عنصری اور فصیحی کی مثنویاں ناپید ہیں۔ ان کا ذکر صرف تذکروں میں باقی رہ گیا ہے۔ دولت[2] شاہ لکھتا ہے کہ فصیحی کی مثنوی کے چند دریدہ سے صفحات اس کے دیکھنے میں آئے ہیں۔ نمونے کے طور پر ایک شعر، جو اس نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے، حسب ذیل ہے۔

چه فرخ وجودے که از همتش | بمیرو بپاے ولی نعمتش

دولت شاہ یہ بھی لکھتا ہے کہ فصیحی کا ممدوح عنصر المعالی کیقاؤس شاہزادہ

---

[1] تذکرۃ الشعراء ص ۴۰ [2] تذکرۃ الشعراء ص ۴۰

طبرستان ہے، جو خود ایک فاضل شخص ہے اور مشہور کتاب "قابوس نامہ" کا مصنف ہے۔

خاندانِ سلجوقیہ کے اوّلیں دور کے نثر نویس

سلجوقی حکمرانوں کے پہلے دور میں، جو طغرل بیگ سے شروع ہو کر ملک شاہ پر ختم ہوتا ہے، نظم کی طرح نثر نے بھی ترقی کی۔ ذیل کی کتابیں اس دور کے مشہور ادبی کارنامے ہیں۔

سیاست نامہ سیاست نامہ یا سیر الملوک، نظام الملک طوسی کی تالیف ہے، جو ملک شاہ سلجوقی کی فرمائش پر ۴۸۴ھ مطابق ۱۰۹۱ء میں لکھی گئی تھی۔

سیاست نامہ حکمرانی کے اصول اور بادشاہوں کی سیرت پر ایک مفید اور دلچسپ کتاب ہے۔ اس میں نظام الملک نے اپنے سالہا سال کے تجربات کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ سیاسی نظریات کے ساتھ ساتھ تاریخی حکایات بھی بیان کی ہیں، جن سے کتاب دلچسپ ہو گئی ہے۔

"سیاست نامہ" پچاس ابواب پر مشتمل ہے۔ ان میں معاشرت، اخلاق اور سیاست ملوک پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ امراء وزراء، قاضیوں اور خطیبوں کے آداب و فرائض پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے سات باب فرقہ اسمٰعیلیہ سے متعلق ہیں، جن میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسمٰعیلی عقاید اصل میں مزدکی تعلیم کی صدائے بازگشت ہے، جو نسلِ انسانی کے لیے تباہ کن ثابت ہو چکی ہے۔ چنانچہ مولف نے پُر زور الفاظ میں اسمٰعیلی عقاید کی مذمت کی ہے۔

سیاست نامہ کا اندازِ تحریر:- سیاست نامہ کا انداز، عبارت کی سادگی اور روانی کے لحاظ سے "تاریخ بلعمی" سے مشابہت رکھتا ہے، لیکن اصطلاحات اور تشبیہات کے اعتبار سے ابوالفضل کی "تاریخ بیہقی" سے ملتا جلتا ہے۔ سیاست نامہ

میں جابجا عربی کے الفاظ بھی آئے ہیں، جو اس سے پہلے کی کتابوں میں دیکھنے میں نہیں آئے۔ سیاست نامہ کی چند سطور درج ذیل ہیں۔

نوشیرواں (پدر را) گفت: ہفتہ دیگر ملک مزدک را بخواند و بگوید کہ دوش نوشیرواں خوابی دیدہ است و ترسیدہ است و بامداد پیش من آمد و گفت کہ دوش در خواب چناں دیدم کہ آتش عظیم قصد من کردی، و من پناہ جستمی، تا صورت نیکوئی پیش من آمدی، و من او را گفتمی کہ این آتش از من چہ می خواہد؟ گفتی کہ آتش می گوید کہ من با تو خشم دارم کہ تو مرا دروغ زن داشتی۔ گفتمی تو بچہ می دانی؟ گفتی من سروشم و از ہمہ چیزی خبر دارم، از خواب در آمدم[1]

تاریخ بیہق

یہ کتاب ابوالحسن علی ابن زید بیہقی کی تالیف ہے۔ اس میں علاقہ بیہق کے تاریخی حالات اور وہاں کے علما کے سوانح حیات درج ہیں۔

راحت الصدور

اس عہد میں جیسا کہ کہہ چکے ہیں فارسی زبان میں جو کتابیں لکھی گئیں، ان میں "راحت الصدور" خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ یہ ۵۹۹ھ مطابق ۱۲۰۲ء کی تالیف ہے۔ کتاب کا اصلی نام "اعلام الملوک المسمی براحت الصدور و آیت السرور" ہے۔ اس کا مولف محمد بن علی بن سلیمان راوندی ہے۔ محمد بن علی اصفہان کے ایک گاؤں راوند کا رہنے والا تھا۔ فن خطاطی کا بہت بڑا ماہر تھا۔ اس کا ماموں جب طغرل بن ارسلان ۵۷۳ھ تا ۵۹۰ھ مطابق ۱۱۷۶ء تا ۱۱۹۴ء کا اتالیق مقرر ہو کر ہمدان آیا۔ تو مولف راحت الصدور بھی اس کے ساتھ گیا۔ ملک الشعرا بہار لکھتے ہیں کہ طغرل بن ارسلان کلام مجید اپنے ہاتھوں سے لکھتا تھا اور مولف راحت الصدور اس کو طلائی نقش و نگار سے مزین کرتا تھا۔

---

[1] سبک شناسی جلد دوم۔ ص ۴۰۵۔

حکومتِ سلجوقیہ کے اختتام پر خوارزمیوں نے غلبہ پایا تو محمد بن علی عراق سے چل کر ایشیائے کوچک پہنچ گیا، جہاں اُس نے سلجوقیوں کی یہ تاریخ یعنی "راحت الصدور" لکھی اور وہاں کے حکمران کیخسرو بن قلیج ارسلان کے نام منسوب کی۔

"راحت الصدور" کا شمار نثر فارسی کی بہترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ تاریخ بھی "کلیلہ و دمنہ" کی طرح فنی نثر کا نمونہ ہے، لیکن یہ نسبتاً سادہ ہے اور اس میں عربی کے الفاظ بھی کم ہیں۔ البتہ آیات و احادیث سے کلام کو مزین کیا گیا ہے۔ مناسب موقعوں پر مشہور شعرا کے اشعار بھی درج کیے ہیں۔ بعض شعرا کے قصیدے بھی لکھے ہیں۔ ہر فصل میں اپنا ترجیع بند بھی لکھا ہے، جس میں اپنے ممدوح کی مدح و ستائش کی ہے۔ راحت الصدور سادہ اور رواں فارسی میں لکھی گئی ہے۔ ایک حکایت بطور نمونہ نثر ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

"در روزگار دیالم بکرمان نشان گنجی یافتند۔ پادشاہ را خبر کردند، صندوقی بود، بگشودند، در تختہ زری نہادہ بودند، در دانہ جو در و۔ بسنجیدند، ہر یک مثقالی بود۔ پادشاہ را عجب آمد، این چہ حالت تواند بود؟ مردی پیر را طلب کنید کہ از او پیر تر نباشد، تا این حال از او بپرسیم، بہمہ ولایت طلب کردند، پیری را یافتند، پشت دوتا شدہ و سر بر زمین نہادہ ......

پادشاہ گفت "از حال جو خبر داری؟"

گفت دارم۔ در فلان روزگار پادشاہی عادل بود۔ بہ عہد وی یکی زمینی بدیگری فروخت مشتری گنجی در وی بیافت۔ داوری بنزد پادشاہ بردند۔ مشتری گفت، من زمین خریدہ ام گنج نخریدہ ام، بفرما تا گنج باز ستانند۔

بایع گفت، من زمین با گنج فروختم، آن من نیست، باز نستانم، پادشاہ گفت، دختری بہ پسر این دیگر دہید و زمین و گنج بدیشان دہید، تا گر از آن بایع باشد

اگر از آن مشتری از میان سر دو بدر نرود۔

چنیں کردند و این زمین آں سال خوب بکشتند، این جو بہ آمد۔ پادشاہ فرمود کہ در جہان ببرید بہ نہید، تا بعد از ما بدانند کہ اثر عدل و ہمت پادشاہ چگونہ اثر کند۔

ہر کہ نیکی کند ثنا یابد بد کنش میوہ بلا یابد[1]

مجمل التواریخ والقصص یہ تاریخ کیانی اور ساسانی بادشاہوں کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس کا انداز بھی سادہ اور رواں ہے۔ ملک الشعرا بہار نے سبک شناسی جلد دوم میں اس کا ذکر کیا ہے لیکن اس کے مولف کا نام نہیں بتایا۔

سکندر نامہ بہار[2] لکھتے ہیں کہ یہ کتاب غالباً عربی سے فارسی میں ترجمہ کی گئی ہے۔ اس کے بعض شروع کے اور کچھ آخر کے صفحات نہیں ہیں۔ اس لیے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کا اصل مولف اور مترجم کون ہے۔ یہ کتاب سکندر اعظم کے حالات پر مشتمل ہے۔ سکندر کو اس میں ذوالقرنین بتایا گیا ہے۔ مولف کے نزدیک سکندر ذوالقرنین، دارا پسر بہمن اسفندیار کا بیٹا اور فیلقوس قیصر روم کا نواسہ ہے۔ دارا اپنی ملکہ سے ناراض ہو کر اسے روم واپس بھیج دیتا ہے، جہاں سکندر پیدا ہوتا ہے۔ فیلقوس اس واقعہ کو چھپانے کی غرض سے اُسے اپنا بیٹا ظاہر کرتا ہے۔ سکندر کو بلوغت پر جب پتہ چلتا ہے کہ وہ ایران کے شہنشاہ دارا کا فرزند ہے، تو اپنا تخت و تاج حاصل کرنے کے لیے ایران پر چڑھائی کرتا ہے۔ سکندر نامہ میں یہ بھی ذکر آیا ہے کہ سکندر حضرت خضر علیہ السلام کی معیت میں آب حیات کی تلاش کو بھی گیا تھا۔

---

[1] راحت الصدور ص ۷۴ تا ۷۶
[2] سبک شناسی جلد دوم ص ۱۲۸

سکندر نامہ کا اندازِ بیان تاریخ بلعمی کی طرح سادہ اور رواں ہے۔

سفر نامہ ناصر خسرو

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، یہ سفر نامہ ابو معین حمید الدین ناصر بن خسرو قبادیانی کی تصنیف ہے۔ اس میں حجاز اور مصر کی مسافرت کا مفصل حال لکھا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ناصر نے کس کس راستے سے سفر کیا۔ کن کن لوگوں سے ملا۔ کہاں کہاں ٹھہرا۔ وہاں کے لوگ کیسے اور ان کے عادات و اطوار کیسے ہیں؟ مدینہ سے مکہ تک کا سفر سطور ذیل میں بیان کیا گیا ہے۔

"از مردم خراسان، قومی براہ شام و مصر رفتہ بودند بہ کشتی بہ مدینہ رسیدند۔ ششم ذی الحجہ ایشان را صد و چہار فرسنگ ماندہ بود، تا بہ عرفات رسند۔ گفتہ بودند ہر کہ ما را درین سہ روز، کہ ماندہ است، بہ مکہ رساند، چنان کہ حج دریابیم، ہر یک از، چہل دینار بدہیم۔ اعراب بیامدند و چنان کردند کہ بدو روز و نیم ایشان را بہ عرفات رسانیدند و زر بستاندند و ایشان را یک یک بر شتران جمازہ ببستند و از مدینہ بیاوردند و بہ عرفات آوردند۔ مدتن مردہ کہ بر آن شتران بستہ بودند، چہار تن زندہ بودند، اما نیم مردہ۔ نماز دیگر کہ ما آنجا بودیم برسیدند چنان شدہ بودند کہ بر پای نمی توانستند ایستادن و سخن نیز نمی توانستند گفتن۔ حکایت کردند کہ در راہ بسی خواہش بدین اعراب کردیم کہ زر کہ دادہ ایم شما را باشد، ما را بگذارید کہ بی طاقت شدیم، از ما نشنیدند و ہم چنین براندند۔"

زاد المسافرین

ناصر خسرو کی یہ ایک اور نثر کی کتاب ہے۔ اس میں فلسفہ کی متعدد اصطلاحات دیکھنے میں آتی ہیں۔ یہ اصطلاحات فارسی کی بھی ہیں اور عربی کی بھی۔ بغرض اختصار "زاد المسافرین" کی نثر کا نمونہ نہیں دیا گیا۔

روضۃ المنجمین

یہ کتاب شاہ مردان بن ابی الخیر کی تالیف ہے۔ جو پانچویں

صدی کے آخر کا ادیب تھا۔ اس کے اندازِ تحریر میں بھی وہی سادگی ہے جو "تاریخ بیہقی" اور "سفر نامہ ناصر خسرو" میں پائی جاتی ہے۔ شاہ مردان "جشنِ نوروز" کے متعلق لکھتا ہے۔

"آنچہ معروف است، آن است کہ خسروان چون نوروز بودی بہ تخت نشستندی و پنج روز رسم بودی کہ عطاہای فراوان دادندی و چون این پنج روز بگذشتی بہ لہو کردن و بادہ خوردن مشغول شدندی، پس این روز از این سبب بزرگ کردندی و گفتہ اند کہ روزی است کہ جمشید مردم را بشارت دادی، بہ بی مرگی و تندرستی و امر زندگی و گویند کہ ہم اندرین روز بود کہ کیومرث اژدر دیو را کشت۔"

نزہت نامہ علائی شاہ مردان کی یہ دوسری کتاب ہے، جو ۴۹۴ھ مطابق ۱۱۰۰ء میں لکھی گئی۔ یہ کتاب علاء الدولہ خاصبک ابو کالیجار گرشاسف حسام امیر المومنین کے نام منسوب ہے۔

نوروز نامہ یہ مختصر سا رسالہ حکیم عمر خیام کی تالیف ہے۔ اس کی زبان صاف اور رواں ہے۔ حال ہی میں آقائے مجتبیٰ مینوی نے تہران سے اسے شائع کرایا ہے۔ "نوروز نامہ" میں بتایا گیا ہے کہ جشنِ نوروز کیونکر شروع ہوا؟ کس بادشاہ نے شروع کیا؟ ساسانی بادشاہ کس طرح جشنِ نوروز مناتے تھے؟ اس رسالے کا اندازِ تحریر "تاریخ بلعمی" اور "تاریخ بیہقی" سے ملتا جلتا ہے۔ اس کی زبان سادہ ہے۔ عربی الفاظ کی آمیزش نہیں۔ فقرات چھوٹے چھوٹے ہیں۔ لیکن کہیں کہیں تاریخ بیہقی کی طرح تشبیہات و اصطلاحات دیکھنے میں آتی ہیں۔ فاعل عموماً فقرے کے شروع میں لانے کی بجائے آخر میں فعل سے پہلے لاتے ہیں۔ اس رسالے کا اندازِ بیان "سیاست نامہ" اور "قابوس نامہ" کی نسبت سبکِ قدیم سے زیادہ قریب ہے۔ نوروز نامہ کی چند سطور ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

"چون صد و شصت و چہار سال از ملک افریدون بگذشت، دور دوم از تاریخ کیومرث تمام شد۔ و او دین ابراہیم پذیرفتہ بود۔ پیل و شیر و یوز را مطیع گردانید۔ و خیمہ و ایوان او ساخت و تخم و درختان میوہ دار و نہال و آبہای روان در عمارت و باغ ہا او آورد، چون ترنج و نارنج و بادرنگ و لیمو و بنفشہ و نرگس و نیلوفر و مانند این در بوستان آورد و مہرگان ہم او بنہاد۔"

کیمیائے سعادت

سلجوقی دور کی ایک نادر و جاوید کتاب "کیمیائے سعادت" ہے جس کے مصنف محمد غزالی ہیں۔ اس کتاب پر تبصرہ کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کا مختصر سا حال لکھا جائے۔

امام غزالی پانچویں صدی کے بہت بڑے مفکر اسلام ہوئے ہیں آپ کی تصنیفات کا چرچا ایشیا ہی میں نہیں، بلکہ یورپ میں بھی ہوا۔ آپ کا نام ابو حامد غزالی ہے علاقہ طوس کے ایک گاؤں طابران میں پیدا ہوئے۔ سال پیدائش ۴۵۰ھ مطابق ۱۰۵۸ء اور سال وفات ۵۰۵ھ مطابق ۱۱۱۱ء ہے۔ والد سوت کا کاروبار کرتے تھے، اسی نسبت سے آپ کا خاندانی نام غزّالی ہوا۔ بعض مورخین لکھتے ہیں کہ غزالی طوس کے پاس ایک گاؤں میں رہتے تھے جس کا نام غزالہ تھا اس نسبت سے آپ غزالی کہلائے۔ اس صورت میں غزالی تشدید کے بغیر لکھا جانا چاہیے لیکن تحقیق یہ ثابت ہوا ہے کہ طوس کے قریب غزالہ نام کا کوئی گاؤں نہ تھا۔ اس لیے یہی درست سمجھنا چاہیے کہ پیشے کی نسبت سے غزالی کہلاتے تھے۔ بچپن ہی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والد کے ایک دوست نے آپ کو ابتدائی تعلیم دلائی۔ پھر مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے طابران سے جرجان چلے گئے جو علم و فضل کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ یہاں ایک مشہور عالم امام ابو نصر اسمٰعیلی سے تعلیم حاصل کی۔ اس زمانے میں مدرسوں کا یہ قاعدہ تھا کہ استاد علمی مطالب پر جو بحث کرتا، شاگرد اس کا ضروری

حصّہ قلم بند کر لیتے تھے۔ شاگردوں کی یہ یادداشتیں "تعلیقات" کہلاتی تھیں۔ چنانچہ امام صاحب نے بھی "تعلیقات" کا مجموعہ تیار کیا تھا۔ فارغ التحصیل ہو کر جب وطن واپس آ رہے تو ڈاکوؤں نے لوٹ لیا۔ امام صاحب کا اثاثہ بھی ڈاکوؤں کے ہاتھ آ گیا۔ آپ کو تعلیقات کے لٹ جانے کا بہت رنج تھا، اس لیے ڈاکوؤں کے سردار کے پاس گئے اور کہا میں آپ سے اپنے اسباب میں سے صرف اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی چند یادداشتیں مانگنے آیا ہوں، کیونکہ انہی کی خاطر میں نے دُور دراز کا سفر طے کیا تھا۔ یہ مجھے واپس نہ ملیں، تو علم کی دولت سے محروم رہ جاؤں گا۔ ڈاکو ہنس پڑا اور کہا: "یہ تم نے کیسا علم سیکھا ہے، جو صرف انہی یادداشتوں میں بند ہے۔ یادداشتیں تمہارے پاس نہ رہیں، تو تم علم سے کورے رہ گئے۔"

ڈاکو نے یہ کہہ کر یادداشتیں آپ کو واپس دے دیں۔ ڈاکو کا یہ سلوک آپ کے لیے درسِ عبرت تھا، چنانچہ انھوں نے محنت کر کے تمام یادداشتوں کے مفہوم کو ذہن میں محفوظ کر لیا۔

جرجان سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نیشاپور چلے گئے۔ یہاں آپ نے امام الحرمین کی صحبت میں رہ کر حدیث، فقہ اور فلسفہ کی انتہائی تعلیم حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہوئے تو اُس وقت ملک شاہ سلجوقی کی حکومت تھی اور نظام الملک طوسی وزیرِ اعظم تھا۔ امام غزالی نے شروع میں نظام الملک کے دربار کا رُخ کیا۔ یہاں علماء کے مباحثوں میں حصّہ لینے لگے۔ تھوڑے ہی عرصے میں آپ کے علم و فضل کا سکّہ سارے دربار پر جم گیا۔ نظام الملک آپ کے علم و فضل سے بہت متاثر تھا۔ چنانچہ ۴۸۴ھ مطابق ۱۰۹۱ء میں آپ کو نظامیہ بغداد کا صدر مدرس مقرر کر دیا۔ یہاں علمی خدمات کی وجہ سے آپ کی شہرت کو اور بھی چار چاند لگے۔ درس و تدریس کا سلسلہ چار سال تک جاری رہا۔ اس کے بعد ۴۸۸ھ مطابق ۱۰۹۱ء میں نظامیہ بغداد کو خیرباد کہہ کر حج کو چلے گئے۔

وہاں سے شام پہنچے اور جامعہ دمشق میں دو سال تک ریاضت اور مجاہدۂ نفس میں مشغول رہے۔ یہ دور آپ کی معرفت کا دور تھا۔ یہاں آپ نے عربی زبان میں اپنی زندہ جاوید کتاب "احیاءالعلوم الدین" تصنیف کی۔ اس جلیل القدر تصنیف کو ائمہ اسلام الہامات ربانی سمجھتے تھے۔ اہل یورپ بھی اس کتاب سے بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ جارج ہنری لوئیس اپنی تصنیف "تاریخ فلسفہ" میں لکھتے ہیں "اگر ڈیکارٹ کے زمانے میں، جو یورپ میں فلسفہ جدید کا بانی خیال کیا جاتا ہے احیاءالعلوم کا ترجمہ فرانسیسی میں ہو چکا ہوتا، تو ہر شخص یہی کہتا کہ ڈیکارٹ نے احیاءالعلوم الدین ہی کو چرا لیا ہے۔"

اکسیر ہدایت

امام غزالی کی دوسری اہم تصنیف "اکسیر ہدایت" ہے جو عربی زبان میں لکھی گئی تھی، لیکن بعد میں خود ہی اس کا ترجمہ فارسی میں "کیمیائے سعادت" کے نام سے کیا۔

کیمیائے سعادت

اس عظیم کتاب کا موضوع اخلاقیات ہے۔ اس میں احیاء العلوم کی طرح فلسفے اور مذہب کا لطیف امتزاج پایا جاتا ہے "کیمیائے سعادت" کا شمار سلجوقی دور کی بہترین کتابوں میں ہوتا ہے۔

انداز بیان:- کیمیائے سعادت کا انداز بیان سادہ اور رواں ہے۔ عبارت کے جملے چھوٹے چھوٹے ہیں۔ مترادف الفاظ اور غیر ضروری فقرات کہیں نام کو نہیں۔ استدلال کی غرض سے قرآنی آیات اور احادیث نبوی سے کلام کو زینت دی گئی ہے۔ بعض بعض فقرات کے آخری فعل مثلاً بود، باشد، شد، گشت وغیرہ حذف کر دیتے ہیں جس سے کلام میں حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی کسی فلسفیانہ نکتے کو واضح کرنے کے لیے اس کی تشریح بھی کر دیتے ہیں۔ لیکن تفصیل میں غیر ضروری امر اوقات نہیں آنے پاتے۔ مثلاً "مثل دل چوں حوضی است، و مثیل پنج حواس چوں پنج جوی است که آب اندی

جوحض می آید از بیرون. و اگر خواہی کہ آب صافی از قعرِ حوض برآید، تدبیر آن بود کہ این آب را جملہ از وی بیرون کنی و گل سیاہ کہ در زیر آن آب است، جملہ بیرون کنی و راہ ہمہ جوی ہا را بربندی، تا آب نیز در وی نیاید و قعر حوض می کنی تا آب صافی از درون حوض پدید آید و تا حوض بدآن آب کہ از بیرون درآمدہ است، مشغول باشد، ممکن نبود، کہ آب از درون برآید۔ ہمچنین این علم کہ از بیرون درآمدہ است، ممکن نبود کہ از درون دل علم بیرون برآید، تا دل از ہرچہ کہ از بیرون درآمدہ است، خالی نشود۔"

عربی نویس ایرانی علما

اس مختصر سے تذکرے میں گنجائش نہیں کہ اس دور کے عربی نویس علما کی زندگی کے حالات اور ان کے ادبی کارناموں پر بحث کی جائے، اس لیے ان کے نام اور ان کی تالیفات کا مختصر سا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

شیخ طوسی پورا نام شیخ ابوجعفر محمد بن حسن طوسی ہے۔ سالِ پیدائش ۳۸۵ھ مطابق ۹۹۵ء اور سال وفات ۴۶۰ھ مطابق ۱۰۶۷ء ہے۔ "کتاب الاستبصار، تہذیب الاحکام، کتاب العدۃ فی اصول الفقہ، کتاب الرجال، کتاب الغیبہ، کتاب التبیان اور فہرست کتب الشیعہ و اکابر المصنفین" آپ کی مشہور کتابیں ہیں۔

امام غزالی آپ کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ احیاء العلوم، اکسیر ہدایت کے علاوہ مقاصد الفلاسفہ، تہافت الفلاسفہ اور معیار العلم بھی عربی زبان میں آپ کی علمی یادگاریں ہیں۔

شیخ طبرسی شیخ ابوعلی فضل بن طبرسی نام اور سال وفات سنہ ۵۵ھ مطابق

۱۱۵۳ء ہے۔ مجمع البیان آپ کی مشہور کتاب ہے۔

زمخشری — آپ کا پورا نام ابوالقاسم محمود، سال پیدائش ۴۶۷ھ مطابق ۱۰۷۵ء اور سال وفات ۵۳۸ھ مطابق ۱۱۴۳ء ہے۔ زمخشر میں تولد ہوئے اور اسی نسبت سے زمخشری مشہور ہوئے۔ تفسیر پر "الکشاف عن حقیقۃ التنزیل"، علم نحو پر "المفصل" اور عربی و فارسی لغت کی تحقیق پر "احساس البلاغہ" اور "مقدمۃ الادب" آپ کی مشہور کتابیں ہیں۔

میدانی — ابوالفضل احمد بن محمد میدانی آپ کا نام ہے، سال وفات ۵۱۸ھ مطابق ۱۱۲۴ء ہے۔ "مجمع الامثال" اور "السامی فی الاسامی" دو کتابیں آپ کی یادگار ہیں۔

شہرستانی — ابوالفتح محمد شہرستانی نام، ۴۷۹ھ مطابق ۱۰۸۶ء میں پیدا ہوئے، ۵۴۸ھ مطابق ۱۱۵۳ء میں وفات پائی۔ "الملل والنحل" آپ کی مشہور علمی یادگار ہے۔

باخرزی — ابوالحسن علی بن حسن باخرزی نام ہے۔ سال وفات ۴۶۷ھ مطابق ۱۰۷۵ء ہے۔ "دمیۃ القصر" آپ کی مشہور کتاب ہے۔

عبدالقاہر بن عبدالرحمان جرجانی — علم نحو کے استاد تھے، ۵۰۱ھ مطابق ۱۱۰۸ء میں وفات پائی اور العوامل کتاب اپنی یادگار چھوڑی۔

آلِ سلجوق کا دوسرا دور

سنجر اور اس کے جانشین

ملک شاہ کا جانشین برکیاروق — ملک شاہ کے جانشین ۴۸۵ھ تا ۵۵۲ ہجری مطابق ۱۰۹۲ تا ۱۱۵۷ عیسوی

چار بیٹے تھے۔ ان میں سب سے بڑا برکیا روق باپ کی وفات پر بارہ سال کا تھا۔ محمد اس سے چھ ماہ چھوٹا تھا، سنجر کی عمر آٹھ سال تھی۔ سب میں چھوٹا محمود تھا جس کی عمر چار سال تھی۔

برکیا روق باپ کی وفات کے وقت اصفہان میں تھا۔ ملکہ ترکان خاتون اپنے چار سالہ بیٹے محمود کے ساتھ بغداد میں مقیم تھی۔ یہاں وہ خلیفہ بغداد المقتدی سے اپنے بیٹے کی تخت نشینی کا اختیار نامہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ چنانچہ محمود کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا گیا۔ نظام الملک کے بیٹوں نے سنا تو وہ برکیا روق کو، جو ملکہ زبیدہ کے بطن سے تھا، رَی لے گئے اور وہاں اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس عرصے میں ترکان خاتون نے مجد الملک تاج الملک ابوالغنائم اور امیر بغراخان کی مدد سے اصفہان پر قبضہ کر لیا۔ برکیا روق نے اصفہان پر فوج کشی کی لیکن اس کے فوجی دستے پانچ لاکھ دینار کی رقم قبول کر کے لوٹ آئے۔ ترکان خاتون کی ریشہ دوانیاں بدستور جاری رہیں۔ اب اس نے ملکہ زبیدہ کے بھائی ملک اسمٰعیل پر ڈورے ڈالے اور شادی کی امید دلا کر اسے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اپنے بھانجے برکیا روق پر حملہ کرے، چنانچہ اس نے رَی پر فوج کشی کی، لیکن اسے منہ کی کھانی پڑی۔ اب برکیا روق کی بادشاہت کا اعلان بغداد میں بھی کر دیا گیا۔ برکیا روق کی حکومت تو تسلیم کر لی گئی۔ لیکن ابھی اس کی مشکلات ختم نہ ہوئی تھیں۔ برکیا روق کے چچا توتوش نے بغاوت کر کے اسے اسیر کر لیا اور اصفہان لے گیا، جہاں محمود کے حکم سے اُسے زندان میں ڈال دیا گیا۔ محمود چاہتا تھا کہ اسے اندھا کر کے ہمیشہ کے لیے تخت و تاج سے محروم کر دے، لیکن عمر نے وفا نہ کی اور وہ خود ایک ہفتہ بھر چیچک کے عارضے میں مبتلا رہ کر راہی ملک عدم ہوا۔ اس پر امراء نے برکیا روق کو زندان سے نکال کر تخت نشین کر دیا۔ برکیا روق نے اب توتوش پر حملہ کر کے اسے کیفر کردار تک پہنچایا۔ جب برکیا روق

مشکلات پر قابو پا چکا تو ۴۸۹ھ مطابق ۱۰۹۶ء میں اس نے خراسان کی حکومت سنجر کے سپرد کر دی، اور خود عراق چلا گیا۔

سلطان سنجر

سنجر نے خراسان کی حکومت سنبھالی، تو تین سال بعد ۴۹۲ھ مطابق ۱۰۹۸ء میں اس کے بھائی محمد نے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ نظام الملک کے بیٹے مؤید الملک نے محمد کا ساتھ دیا۔ کیونکہ برکیارق نے اُسے وزارت سے معزول کر کے اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ سلجوقی عہد کا یہ وہ زمانہ ہے، جب کہ شاہی خاندان کے متعدد افراد اور وزراء چن چن کر قتل کرائے گئے۔ برکیارق کی والدہ زبیدہ کو محمد کے حکم سے گلا گھونٹ کر مروا دیا گیا۔ مجد الملک، جو مؤید الملک کی معزولی کے بعد وزیر بنا تھا، تیغ انتقام کا نشانہ بنا۔ مؤید الملک کو برکیارق کے حکم سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ آخر اس خونیں ڈرامہ کے بعد کچھ عرصہ کے لیے ملک شاہ کے بیٹوں میں صلح ہو گئی۔

برکیارق فوت ہوا تو اس کے بیٹے ملک شاہ دوم نے عراق کی حکومت سنبھالی لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ محمد نے اُسے گرفتار کر کے اندھا کر دیا۔ اور خود عراق کی حکومت سنبھال لی۔ محمد فوت ہوا، تو اس کا بیٹا محمود چودہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اس نے عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی خراسان پر فوج کشی کی، جہاں اس کا طاقتور چچا سنجر حکمران تھا۔ سنجر نے ساوہ کے میدان میں اسے شکست دی۔ آخر اس کی خطا سے درگزر کر کے سلطان سنجر نے اپنی بیٹی ماہ ملک کے ساتھ اس کی شادی کر دی اور عراق کی حکومت بھی اسی کو دے دی۔

سلجوقی عہد میں حشیشین

حشیشین، جن کا ذکر حسن بن صباح کے سلسلے میں آ چکا ہے۔ برکیارق کے زمانے میں اور بھی زیادہ منظم ہو گئے۔ آخر اسے حکم دینا پڑا کہ جہاں جہاں اس فرقے کے افراد ملیں، انھیں

قتل کر دیا جائے۔ برکیارق کے بعد سلطان محمد نے بھی اسمٰعیلیہ کے خلاف اپنی جد و جہد جاری رکھی، لیکن فدائیوں کی دہشتناکیوں میں روز افزوں ترقی ہوا کی۔ یہ لوگ ہراس پھیلانے کی غرض سے بے گناہ مخلوق کو بھی ظلم و ستم کا نشانہ بنانے میں دریغ نہ کرتے تھے۔ سلطان سنجر نے ان کا زور توڑنے کے لیے قلعہ الموت پر فوج کشی، لیکن ایک دن صبح کے وقت جب وہ نیند سے بیدار ہوا، تو اس نے اپنے قریب سخت زمین میں ایک خنجر گڑا ہوا دیکھا۔ خنجر کے ساتھ ایک کاغذ کا پرزہ تھا جس پر لکھا تھا: "سلطان سنجر! ہوشیار رہو۔ اگر تمہارا احترام مدنظر نہ ہوتا تو وہ ہاتھ جس نے سخت زمین میں یہ خنجر گاڑا تھا، اس خنجر کو تمہارے نرم و نازک سینے میں بھی پیوست کر سکتا تھا۔" اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اور سلطان سنجر الموت پر حملہ کرنے کا ارادہ ترک کر کے واپس ہو لیا۔

سلجوقی عہد کی دوسری حکومتیں

پیشتر اس کے کہ ہم سلجوقی عہد کے فارسی ادب کی طرف رجوع کریں، ان چھوٹی چھوٹی حکومتوں کا ذکر کر دینا بھی مناسب سمجھتے ہیں، جن کے درباروں سے شعرا اور ادیب وابستہ تھے۔

خاندانِ غوریہ

۵۴۳ھ تا ۶۱۲ھ بمطابق ۱۱۴۹ء تا ۱۲۱۵ء ہرات اور غزنی کے مابین پہاڑی علاقے میں غوریوں کی حکومت تھی۔ یہ حکومت محمود غزنوی کے زمانے سے قائم تھی۔ غزنویوں اور غوریوں میں بڑے خوش گوار مراسم تھے۔ آپس میں رشتے ناطے بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ غزنوی حکمران بہرام شاہ نے غوری شہزادہ قطب الدین محمد کو اپنی بیٹی بیاہی تھی۔ لیکن ان دونوں حکومتوں کے خوش گوار تعلقات زیادہ دیر تک قائم نہ رہے۔ بہرام شاہ نے کسی غلط فہمی کی بنا پر اپنے داماد قطب الدین کو قتل کرا دیا۔ غوری شہزادے کے قتل کی خبر سے اہل غور بھڑک اٹھے۔ چنانچہ

شہزادے کا انتقام لینے کے لیے انھوں نے ۵۴۳ ہجری میں غزنی پر حملہ کیا۔ بہرام شاہ مقابلے کی تاب نہ لاکر غزنی سے بھاگ کھڑا ہوا اور غور کے حکمران علاء الدین نے اپنے بھائی سیف الدین کو غزنی کا حاکم مقرر کردیا، لیکن جونہی کہ موسم سرما آیا، برف باری شروع ہوئی، تو اہل غزنی نے سازش کرکے بہرام شاہ کو بلا بھیجا۔ بہرام شاہ نے غزنی میں داخل ہوکر سیف الدین کو بے خبری کی حالت میں گرفتار کرلیا اور اسے بیڑیاں پہنا کر غزنی کے گلی کوچوں میں پھرایا۔ آخر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

علاء الدین محمد نے چھ سال بعد اپنے بھائی سیف الدین محمد کے قتل کا اتنا شدید انتقام لیا کہ تاریخ نے اسے "جہاں سوز" کا لقب دیا۔

علاء الدین نے غزنی پر فتح پاکر یہ حکم دیا کہ غزنی کی اُن تمام عمارتوں کو نذر آتش کردیا جائے، جو محمود، مسعود، اور ابراہیم کے حکم سے تعمیر ہوئی تھیں۔ چنانچہ غزنی کے گلی کوچوں سے کئی دن آگ کے شعلے بلند ہوتے رہے۔ اور سر بفلک عمارتیں کھنڈرات ہوکر رہ گئیں۔ نظامی عروضی[1] لکھتا ہے کہ علاء الدین کو یہ گوارا نہ تھا کہ کوئی شخص محمود اور اس کے جانشینوں کا نام تک بھی لے، اس لیے اس نے سونے کی مہروں کے عوض لوگوں سے وہ تمام قصائد خرید لیے، جو ان کے پاس تھے۔

خاندان خوارزمشاہی

سلجوقی عہد میں خوارزمشاہی حکمرانوں کی ایک نئی سلطنت قائم ہوئی، جو حقیقت میں سلجوقی حکمرانوں ہی کی شرمندۂ احسان تھی۔ خوارزمشاہی حکمرانوں کا مورث اعلیٰ انوشتگین تھا، جو کبھی ملک شاہ سلجوقی کا ساقی تھا، ملک شاہ نے ساقی گری کی خدمات کے صلے میں انوشتگین کو خوارزم یا خیوہ کی حکومت عطا کردی۔ انوشتگین فوت ہوا۔

---

[1] چہار مقالہ مرتبہ میرزا محمد قزوینی ص ۴۶

تو قطب الدین محمد اس کا جانشین بنا۔ اس کے عہد میں چینی ترکستان کے علاقہ خطا سے قراخطائیوں نے اٹھ کر خوارزم پر حملہ کر دیا۔ قطب الدین نے ان کے مقابلے کے لیے کثیر فوج بھیجی لیکن ان سے شکست کھائی۔ بالآخر خوارزمشاہی حکمران نے سالانہ خراج ادا کرنے کی شرط پر قراخطائیوں سے صلح کر لی۔

قطب الدین محمد ۴۹۰ھ مطابق ۱۰۹۰ء میں فوت ہوا۔ اس وقت اس کا بیٹا اتسز سنجر کے دربار میں ساقیِ بزرگ کے منصب پر فائز تھا۔ آخر وہ سلطان سنجر سے اجازت پا کر خوارزم آ گیا۔ اتسز بہت جاہ پسند شخص تھا۔ وہ محض خوارزم کی حکومت پر قناعت نہیں کرنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے اپنے آقا اور محسن سلطان سنجر کے خلاف بغاوت کر دی۔ سنجر نے خوارزم پر فوج کشی کی اتسز شکست کھا کر فرار ہو گیا، اور سنجر کا بھتیجا غیاث الدین سلیمان شاہ خوارزم کا حاکم مقرر ہوا لیکن سنجر ابھی مرو ہی پہنچنے پایا تھا، کہ اتسز واپس خوارزم آ گیا اور غیاث الدین کو شکست دے کر وہاں کی حکومت پھر سنبھال لی۔

سنجر کی شکست

خوارزمشاہ، جیسا کہ ذکر آ چکا ہے، اب قراخطائیوں کا باجگذار تھا۔ اتسز نے مصلحتِ وقت کے خیال سے ان سے گہرے روابط قائم کر لیے اور بالآخر انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ خراسان پر حملہ کریں۔ چنانچہ قراخطائی قبائل چینی ترکستان کا لشکرِ جرار لے کر حملہ آور ہوئے۔ دریائے جیحون کے کنارے معرکہ آرا جنگ ہوئی اور اس جنگ میں سلطان سنجر کو اپنے شاندار دورِ حکومت میں پہلی مرتبہ شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس جنگ میں سلجوقیوں کو سخت مالی اور جانی نقصان ہوا اور قراخطائی قبائل مرو اور نیشاپور پر قابض ہو گئے۔ سنجر کو بلخ اور ترمذ کے علاقوں میں پناہ لینی پڑی۔ اتسز نے موقع سے فائدہ اٹھا کر خوارزم میں اپنی آزاد اور خود مختار حکومت کا اعلان کر دیا۔

جہاں سوز کا خراسان پر حملہ

غوری سلطان علاء الدین بھی حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ چنانچہ موقع کو غنیمت جان کر خراسان پر حملہ آور ہوا۔ لیکن سلطان سنجر نے اسے شکست دے کر اسیر کر لیا۔

سلطان سنجر کی اسیری

۵۴۸ھ بمطابق ۱۱۵۲ء میں قراخطائی قبائل نے جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے، غز قبائل پر غلبہ پاکر ان کی چراگاہیں چھین لیں اور انھیں بلخ کے علاقے کی طرف دھکیل دیا۔ غز قبائل کو سلطان سنجر نے اس شرط پر بلخ کے علاقے میں آباد ہونے کی اجازت دے دی کہ وہ سالانہ خراج کے طور پر چوبیس ہزار بھیڑیں بھیجا کریں گے۔ خراج ادا کرنے کا وقت آیا تو بھیڑوں کی اقسام پر حاکم بلخ سے کچھ جھگڑا ہو گیا، جسے حاکم بلخ نے نپٹانے کی بجائے اور طول دیا۔ آخر ۵۴۸ھ بمطابق ۱۱۵۳ء میں سلطان سنجر کو غز قبائل کے خلاف فوج کشی کرنی پڑی۔ غز قبائل سخت خوف زدہ ہوئے۔ اور کثیر رقم بطور تاوان ادا کرنے کی پیش کش کی۔ لیکن حاکم بلخ مصر تھا کہ قبائل کو عبرت ناک سزا دی جائے، چنانچہ سلطان کے حکم سے ایک لاکھ فوج نے غز قبائل پر حملہ کر دیا۔ ان کے لیے اب کوئی چارہ کار نہ رہا کہ سلطان کا مقابلہ کریں۔ وہ اتنی بے جگری سے لڑے کہ سلطان کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس پر بس نہیں، وہ غزوں کے ہاتھوں اسیر بھی ہو گیا، الوری نے اپنا مشہور قصیدہ "اشک ہای خراسان" سلطان سنجر کی اسیری کے دوران میں ہی لکھا تھا۔

سلطان کی شکست سے غزوں کے حوصلے اور بڑھے اور انہوں نے مرو کی طرف پیش قدمی کر کے اسے بھی فتح کر لیا۔ یہاں سلجوقیوں کے جمع کیے ہوئے خزانے ان کے ہاتھ لگے۔ دولت کے انبار حاصل کر لینے کے بعد انھوں نے اہل مرو کا قتل عام کر دیا۔ مرو سے فارغ ہوئے تو نیشاپور کا رخ کیا۔ یہاں بھی نوع انسان کا خون بہایا۔

سلطان سنجر کی رہائی اور وفات

سلطان سنجر چار سال تک غزوں کی قید میں رہا۔ مشہور روایت ہے کہ غزدن کے وقت سلطان کو تخت پر بٹھاتے اور رات ہوتے ہی اسے زندان میں بند کر دیتے تھے۔ آخر کسی تدبیر سے سنجر ان کی قید سے رہائی پانے میں کامیاب ہوگیا۔ کہا جاتا ہے، جب وہ مرو پہنچا، تو اس تباہ شدہ شہر کو دیکھ کر اسے سخت رنج ہوا۔ جینے کی اُمنگ جو اسے یہاں تک لے آئی تھی۔ مرو کو دیکھ کر سرد پڑ گئی۔ اسی افسردگی کی حالت میں سلطان سنجر ۵۵۲ ہجری مطابق ۱۱۵۷ عیسوی میں جہانِ فانی کو خیرباد کہہ گیا۔

سلطان سنجر کے دربار کے شعرا

امیر معزّی

ابوعبداللہ محمد بن عبدالملک کا شمار آخری سلجوقی عہد کے مشہور شعرا میں ہوتا تھا۔ اس کا وطن نیشاپور، اور معزّی تخلص ہے یہ تخلص اس نے ملک شاہ سلجوقی کے لقب امیر معز الدولہ والدین کی نسبت سے اختیار کیا۔

معزی کا والد عبدالملک برہانی الپ ارسلان سلجوقی کے دربار کا شاعر تھا برہانی نے ملک شاہ سلجوقی کے آغازِ حکومت میں وفات پائی اور وفات سے پہلے قطعہ ذیل کہہ کر ملک شاہ کی خدمت میں اپنے بیٹے کی سفارش کی۔

خسروا شاہا گر آمد عمر برہانی بسر　　تاقیامت وارث عمر جناں چاکر توئی
جان او ہر ساعتی گوید کہ ای فرزند من　　پیش سلطان جہاں حق مرا حق ور توئی

معزی اگرچہ ملک شاہ کے دربار سے وابستہ تھا، لیکن کافی عرصہ اس کو باریابی کا شرف حاصل نہ ہوسکا۔ آخر بقول نظامی عروضی علاء الدولہ امیر علی فرامرز

کاکویہ کی وساطت سے بادشاہ کی خدمت میں رسائی ہوئی۔ ایک دن بادشاہ کے مصاحب عید کا چاند دیکھنے میں مصروف تھے۔ بادشاہ بھی سراپردہ سے باہر آیا۔ اتفاق کی بات کہ بادشاہ سب سے پہلے چاند دیکھنے میں کامیاب ہوا۔ معزی نے فی البدیہہ ذیل کی رباعی کہی۔

ای ماہ چو ابروان یاری گوئی   یا نی چو کمان شہریاری گوئی

نعلی زدہ از زر عیاری گوئی   در گوش سپہر گوشواری گوئی

ملک شاہ کو رباعی پسند آئی اور معزی کو انعام میں ایک گھوڑا اور خلعت بخشی معزی نے شکرانے کے طور پر ذیل کی رباعی کہی۔

چوں آتش خاطر مرا شاہ بدید   از خاک مرا بر زبر ماہ کشید

چوں آب یکی ترانہ از من بشنید   چون باد یکی مرکب خاصم بخشید

بادشاہ کی نگاہ میں معزی کی قدر و قیمت اور بڑھ گئی چنانچہ حکم ہوا کہ اسے شاہانہ لقب کی نسبت سے "امیر معزی" کہہ کر پکارا جائے چنانچہ وہ اسی لقب سے مشہور ہوا۔

سنہ ۴۸۰ھ مطابق ۱۰۸۷ء میں ملک شاہ عالم جاودانی کو سدھارا، تو اس کے بعد سنجر کے عہد میں بھی معزی کو بہت عزت حاصل ہوئی، یہاں تک کہ اسے ملک الشعراء ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہوا۔ اس عہد میں بھی اس پر انعام و اکرام کی بارشیں ہوتی تھیں۔ سنہ ۵۱۰ھ مطابق ۱۱۱۶ء میں غزنی فتح ہوا، تو معزی نے قصیدہ لکھ کر پیش کیا سلطان سنجر نے حکم دیا کہ اس کا منہ موتیوں سے بھر دیا جائے، چنانچہ معزی نے ذیل کے شعر میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

کردم اندر فتح غزنین ساحری در شاعری

کرد پر گوہر دہانم پادشاہ گوہری

۵۔ سخن و سخنوران جلد اول صفحہ ۳۴۰

سلطان سنجر معزی کی بزرگی کے خیال سے اسے بمنزلہ باپ کے سمجھتا تھا جیسا کہ معزی خود کہتا ہے۔

تا قیامت فخر من باشد کہ اندر بزم خویش
در بہ تختم نشانی و پدر خوانی مرا

محمد عوفی، امیر معزی کی قدر و منزلت کے سلسلے میں رقم طراز ہے کہ "سامانی عہد میں رودکی، غزنوی عہد میں عنصری اور سلجوقی عہد میں امیر معزی کو اتنا جاہ و حشم حاصل ہوا کہ ایران کے اور کسی شاعر کو نصیب نہ ہو سکا۔[1]

وفات معلوم ہوتا ہے اس خوش نصیب شاعر کا انجام اچھا نہ ہوا۔ محمد عوفی[2] لکھتا ہے کہ سلطان سنجر تیر اندازی کی مشق کر رہا تھا کہ ایک تیر خطا ہو کر امیر معزی کے آلگا۔ تیر کا زخم بالآخر اس کی ہلاکت کا موجب بنا۔ حکیم سنائی نے، جو امیر معزی کا معاصر تھا، ذیل کے اشعار میں اس حسرت ناک واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

تا چند معزا ای معزی کہ خدایش
زین جا الفلک بردو قبای ملکی داد

چون تیر فلک بود ترنغش بره آورد
پیکان ملک بردو بہ تیر فلکی داد

امیر معزی کی وفات کے متعلق عام طور سے یہی واقعہ مشہور ہے، لیکن رضا قلی لکھتا ہے کہ سنجر کے تیر سے وہ زخمی تو ہوا، لیکن، اس کا زخم اچھا ہو گیا تھا چنانچہ امیر معزی خود کہتا ہے ؎

منت خدای را کہ بہ تیر خدایگان
من بندہ بی گناہ نشدم کشتہ رائگاں

معزی کی وفات ۵۲۴ ہجری مطابق ۱۰۶۲ عیسوی ہوئی۔

---

[1] لباب الالباب مرتبہ پروفیسر براؤن۔ جلد دوم ص ۶۹

[2] لباب الالباب جلد اوّل ص ۱۷۵

امیر معزی کی قصیدہ گوئی

عموماً تذکرہ نویسوں نے امیر معزی کی قصیدہ گوئی کے متعلق بہت بلند رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ خود بھی دعویٰ کرتا ہے کہ اگر دوسرے شعرا کے اشعار کو قافلہ فرض کر لیا جائے، تو اس کے اشعار قافلہ سالار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دگر قیاس کنی شعر شاعران دگر　　بود چو قافلہ و شعر او چو پیش آہنگ

امیر معزی کی طبیعت اگرچہ رسا ہے، لیکن اس نے زور طبیعت عنصری، فرخی اور منوچہری کی تقلید کرنے پر صرف کیا ہے۔ امیر معزی کے چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

ایا نبشتہ ہنر نامہ ہا فزون ز ہزار
دیا شنیدہ ظفر نامہ ہا برون ز شمار

چو رزم شاہ ہنر نامۂ شگفت بخوان
چو فتح شاہ ظفر نامۂ بدیع بیار

مشاہدت ہمہ وقت بہتر از ماضی
معاینت ہمہ حال بہتر از اخبار

چنیں بماند ز تائید ایزدی تاثیر
چنیں بماند ز شمشیر سنجری آثار

امیر معزی کے یہ اشعار عنصری کے قصیدے کا اقتباس معلوم ہوتے ہیں۔ جس کے دو شعر حسب ذیل ہیں۔

ایا شنیدہ ہنرہای خسروان بخبر
بیاز خسرو مشرق عیان ببین تو ہنر

دروغ زیر خبر دان و راست زیر عیان
اگر دروغ چہ نیکوست راست نیکوتر

امیر معزی کا ایک قصیدہ مطلع ذیل سے شروع ہوا ہے ۔

رمضان شد چو غریبان بسفر بار دگر
اینت فرخ شدن و اینت بہنگام سفر

یہ قصیدہ فرخی کے ایک قصیدے کی پیروی میں لکھا گیا ہے جس کا مطلع یہ ہے ۔

رمضان رفت و رہی دور گرفت اندر بر
انچوشش آنکو رمضان را بسزا برد بسر

قدما کی پیروی کرنے کی وجہ سے بدیع الزمان[1] نے اس کے متعلق بعض تلخ سے فقرات لکھے ہیں۔ مثلاً " امیر معزی ، عنصری اور فرخی کے الفاظ و ترکیبات ہی سے قصیدہ تیار کر لیتا ہے ، اس طرح گویا عنصری اور فرخی کے دیوانوں کا خون امیر معزی کی گردن پر ہے ۔ چنانچہ انوری کا یہ شعر معزی پر صادق آتا ہے ۔

کس و انم از اکابر گردنکشان نظم
کو را صریح خون دو دیوان بگردن است

معزی اپنے بعض قصائد میں منوچہری کی طرح " سبک عرب " کا پیرو بھی نظر آتا ہے ۔ عرب شعرا اکثر دیوان مقامات پر آنسو بہاتے ہیں ۔ دیار محبوب کی تعریف کرتے ہیں ۔ محبوب کے اشتیاق میں کوسوں بڑھے چلے جاتے ہیں ۔ زاغ ان کے نزدیک منحوس پرندہ ہے جس کا وہ اکثر ذکر کرتے ہیں ۔ امیر معزی کے کلام میں انہی رجحانات کا پتہ چلتا ہے ۔ مثلاً

ای ساربان منزل مکن جز در دیار یار من
تا یک زمان زاری کنم بر ربع و اطلال و دمن

---

[1] سخن و سخنوران ، جلد اول صفحہ ۲۱۸

بر ربع از دلم پرخون کنم خاک دمن گلگون کنم

اطلال را جیحون کنم از آب چشم خویشتن

از روی یار خرگہی ایوان ہمی بینم تہی

از قد آن سرو سہی خالی ہمی بینم چمن

بر جای رطل و جام می گوران نہادستند پی

بر جای چنگ و نای و نی آوای زاغ است و زغن

آن جا کہ بود آن دلستان با دوستان در بوستان

شد گرگ و روبہ را مکان شد گور و کرگس را وطن

زین سان کہ چرخ نیلگون کرد این سرا را

دیاری گردد کنون گرد دیار یار من

اس میں شک نہیں کہ امیر معزی نے سبک خراسانی کی پیروی کی، اور سبک خراسانی کے بہت بڑے پیروؤں یعنی عنصری، فرخی اور منوچہری کے کلام سے متاثر بھی ہوا، لیکن تشبیہات کی جدت اور مدح و ستائش میں مبالغہ، جو قصیدہ نگار کے دو بڑے ضروری وصف سمجھے جاتے تھے، ان میں وہ کسی سے پیچھے نہیں، بلکہ اگر کہا جائے کہ ان میں بھی امیر معزی نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ ایک قصیدے کے چند اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں، جو اس نے نظام الملک طوسی کی مدح میں کہا تھا۔

آمد آن فصلی کہ از طبع جہان دیگر شود
ہر زمین از صنعت ابر آسمان پیکر شود

باغ از و مانند صورت خانۂ مانی شود
باغ از و مانند لعبت خانۂ آزر شود

کوہسار از ژالہ در سیماب گون آید برون
چون عروس باغ در زنگار گون چادر شود

گاہ بو کوکب شود بی گنبد اخضر درخت
گاہ بی کوکب چمن چون گنبد اخضر شود

سرو ہم چون منبری گردد ز مینا ساختہ
شاخِ گل مانندۂ بی جادہ گون چنبر شود

گفتم این مدحت بد آن سانی کہ گوید عنصری
باد نوروزی ہمی در بوستان بتگر شود

اس قصیدے کی تشبیہات میں جدت اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ مثلاً بادِ بہاری کی آمد پر زمین طرح طرح کی صنعت کاری سے "آسمان پیکر" بن گئی ہے۔ باغ زنگار رنگ پھولوں کی وجہ سے "صورت خانۂ مانی" دکھائی دیتا ہے۔ کوہسار پر پڑی ہوئی برف چادرِ سیماب نظر آتی ہے۔ سرو گویا مینا کا بنا ہوا منبر ہے۔ بادِ نوروز کیا ہے گویا ایک بُت گر ہے

معزی کے قصائد کی تشبیب میں تغزل کی پوری شان پائی جاتی ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:۔

اگرچہ خرمیِ نرگس از بہار بود	ہمیشہ خرمیِ من ز روی یار بود
بجویبار توم پیش سرو سجدہ کنم	اگر چو قامت او سرو جویبار بود
بنفشہ گرچہ بدیع است از چہ اندیشد	کسی کہ بستہ آن زلف تابدار بود

دو چیز را بدو ہنگام لذت دگر است
سماع را بہ صبوح و صبوح را بہ بہار

خوشا سماع صبوحی چو با تو باشد دوست
خوشا صبوح بہاری چو با تو باشد یار

صبوح ساز و دگر بارہ عشرت از سر گیر
کہ باغ تازگی از سر گرفت دیگر بار

نوروز ز بساط نو گستر دبہ گلزاران | وز باغ بساط دی بر بود چو عیاران
بشگفت بہار نو شد راست نگار نو | مادی و بہار نو بر دامن کہساران
از قمری و از بلبل در ہر چمنی غلغل | گلزار ز بوی گل چون کلبۂ عطاران

معزی کے قصائد کی تاریخی اہمیت

معزی کے بعض قصائد میں ملک شاہ اور سلطان سنجر کے زمانے کے تاریخی حالات بھی ملتے ہیں، جن سے اس زمانے کے بعض تاریخی اور معاشرتی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

معزی کے معاصر حکمران

۱۔ معزی نے اپنے باپ کی وفات کے بعد ملک شاہ کے دربار کی طرف رجوع کیا۔ یہاں وہ بادشاہ کے ندیموں میں داخل ہوا، اور معزی کے لقب سے سرفراز ہوا۔

۲۔ رکن الدین برکیارق بن ملک شاہ ۴۸۵۔ ۴۹۸ ہجری بمطابق ۱۰۹۲۔ ۱۱۰۴ عیسوی

۳۔ غیاث الدنیا والدین محمد بن ملک شاہ ۴۹۸۔ ۵۱۱ ہجری بمطابق ۱۱۰۴۔ ۱۱۱۷ عیسوی

۴۔ ارسلان ارغون بن الپ ارسلان ۴۸۵۔ ۴۹۰ ہجری بمطابق ۱۰۹۲۔ ۱۰۹۳ عیسوی

۵۔ سنجر بن ملک شاہ ۵۱۱۔ ۵۵۲ ہجری بمطابق ۱۱۱۷۔ ۱۱۵۷ عیسوی۔ سنجر کے دربار میں جیسا کہ لکھا جا چکا ہے معزی کو بہت زیادہ عزت حاصل ہوئی۔ بادشاہ اسے بمنزلہ باپ کے سمجھتا تھا۔

۶۔ جب بہرام شاہ بن مسعود مدد حاصل کرنے کے لیے سلطان سنجر کے پاس آیا، تو معزی نے اس کے قصیدے کہے۔

۷۔ اتسز بن محمد خوارزمشاہ ۵۲۱۔ ۵۵۱ ہجری بمطابق ۱۱۲۷۔ ۱۱۵۶ عیسوی ہوا، تو اتسز نے آدھی رات کو اس کا استقبال کرنے کے لیے دو میل تک پیش قدمی کی جیسا کہ معزی کے اشعار سے واضح ہوتا ہے۔

تو گردِ رنگ نگردی و آمدی بشتاب
ز بہر پرسشِ من نیم شب بیک فرسنگ
بنزد کہ بقیمت خوار زم را انہم تفضیل
چہ بر نواحی روم و چہ بر نواحی زنگ۔

معزی کے ہم عصر شعراء معزی کے ہم عصر شعراء مندرجہ ذیل ہیں: مسعود سعد سلمان، سنائی، سوزنی، سید حسن غزنوی، انوری، ادیب صابر، رشید الدین وطواط، عمعق بخارائی اور رشیدی سمرقندی۔

وفات معزی کی وفات کے متعلق تذکرہ نویسوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ قدیم تذکرہ نویسوں نے اس کا سال وفات ۵۴۲ ہجری بمطابق ۱۱۴۷ عیسوی لکھا ہے۔ پروفیسر براؤن[۱] اور مولف مجمع الفصحا نے بھی اس کی وفات ۵۴۲ ہجری بمطابق ۱۱۴۷ عیسوی ہی بتائی ہے۔ مولف سخن و سخنوران[۲] نے بھی ان کی تائید کی ہے۔ شفق[۳] نے البتہ معزی کی تاریخ وفات ۵۲۰ ہجری بمطابق ۱۱۲۶ عیسوی لکھی ہے، لیکن اس کے لیے کوئی خاص دلیل پیش نہیں کی، اس لیے اس کا سال وفات ۵۴۲ ہجری بمطابق ۱۱۴۷ عیسوی ہی سمجھنا چاہیے۔

دیوان امیر معزی کی یادگار اس کا دیوان ہے، جو اٹھارہ ہزار پانچ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں قصائد، قطعات اور رباعیاں ہیں۔

---

[۱] لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم ص ۳۲۸

[۲] سخن و سخنوران، جلد اول صفحہ ۱۷۵

[۳] تاریخ ادبیات ایران ص ۱۷۳

رشید الدین وطواط

رشید الدین محمد بن عبدالجلیل عمری سال پیدائش ۴۸۱ ہجری بمطابق ۱۰۸۸ عیسوی اور وطن بلخ ہے۔ دولت شاہ سمرقندی لکھتا ہے کہ رشید الدین کا سلسلۂ نسب حضرت عمرؓ سے ملتا ہے۔ اس لیے آبا ؤ اجداد "عمری" کہلاتے تھے۔ رشید الدین نے ابتدائی تعلیم نظامیہ بلخ میں پائی۔ یہ عربی اور فارسی دونوں زبان میں شعر کہتا تھا اور انہی دو زبانوں میں نثر بھی لکھتا تھا اس کا شمار اپنے زمانے کے نامور شاعروں اور ادیبوں میں ہوتا تھا۔ فارغ التحصیل ہو کر اتسز کے دربار میں کاتب یعنی سیکرٹری کے منصب پر فائز ہوا اور تیس سال تک اسی دربار میں خدمات بجالاتا رہا۔

رشید الدین کوتاہ قامت اور نحیف الجثہ شخص تھا۔ اسی نسبت سے اسے لوگ وطواط[1] کہنے لگے۔ دولت شاہ اپنے تذکرے میں لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ اتسز کی صحبت میں گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔ وطواط اپنے مخصوص انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔ اتفاق کی بات کہ اتسز اور وطواط کے درمیان ایک دوات پڑی ہوئی تھی۔ اتسز وطواط کے فصیح و بلیغ الفاظ سن کر بہت خوش ہوا اور کہا "میز پر سے یہ دوات اٹھا دو تاکہ ہم دیکھ تو سکیں کہ یہ کون گفتگو کر رہا ہے۔" وطواط فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا "آدمی دو خوبیوں کی وجہ سے آدمی سمجھا جاتا ہے اور وہ خوبیاں دل اور زبان ہیں۔"

وطواط نے طویل عمر پا کر خوارزم میں ۵۷۸ ہجری مطابق ۱۱۸۲ عیسوی میں وفات پائی۔ دولت شاہ سمرقندی لکھتا ہے۔ کہ وطواط بہت تیز زبان تھا اور اس نے اپنی تیز زبانی کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ چنانچہ دشمنوں کی دراندازی کی وجہ سے اتسز اس پر ناراض ہو گیا۔ جس کی وجہ سے کچھ عرصہ وہ دربار خوارزمشاہی سے دور رہا۔ بالآخر ذیل

---

[1] تاریخ ادبیات ایران ص ۱۷۳

کے اشعار لکھ کر اتسز کی خدمت میں بھیجے۔ اتسز ان اشعار کو سن کر بہت خوش ہوا اور دوبارہ اسے دربار میں باریاب کیا۔

سی سال شد کہ بندہ بہ صفّ نعال در
بودہ است مدح خوان و تو بر تخت مدح خواہ

داوند خدای عرش کہ ہرگز نہ ایستاد
چون بندہ مدح خوانی در ہیچ بارگاہ

اکنون ولت زبندہ سی سال شد ملول
در دل بہ طول مدت یابد ملال راہ

لیکن مثل زنند کہ مخدوم شد ملول
جوید گناہ و بندۂ بی چارہ بی گناہ

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے ۵۴۲ ہجری مطابق ۱۱۴۷ عیسوی میں اتسز خوارزمشاہ نے اپنے ولی نعمت سلطان سنجر سلجوقی کے خلاف بغاوت کردی۔ سنجر نے فوج کشی کی اور اتسز ایک قلعہ میں محصور ہوگیا جس کا نام "ہزار اسپ" تھا۔ انوری اس وقت سلطان سنجر کے ہمراہ تھا اس نے ایک رباعی کہی جس کو سنجر نے تیر پر لکھوا کر قلعے میں پھنکوا دیا۔ رباعی یہ ہے:۔

اے شاہ ہمہ ملک زمین حسب تراست
وز دولت و اقبال جہان کسب تراست

امروز بیک حملہ "ہزار اسپ" بگیر
فردا خوارزم و صد ہزار اسپ تراست

وطواط نے جواب میں فی البدیہہ ذیل کا شعر کہا اور اسی طرح تیر پر لکھوا کر سلجوقیوں کی لشکر گاہ میں پھنکوا دیا۔

گر خصم تو ای شاہ شود رستم گرد
یک خر ز ہزار اسپ نتواند برد

سلطان سنجر نے جب اتسز کو شکست دے کر قلعہ ہزار اسپ فتح کر لیا، تو سب سے پہلے وطواط کی سرزنش کرنی چاہی۔ وطواط جب سلطان کے حضور پیش ہوا، تو حکم ہوا کہ اس کے سات ٹکڑے کر دیے جائیں۔ وطواط کی حاضر جوابی یہاں بھی کام آئی۔ اس نے جواب دیا "میں تو اتنا نحیف و نزار ہوں کہ میرے سات ٹکڑے نہیں ہو سکیں گے۔ حکم دیا جائے کہ دو ٹکڑے کیے جائیں، بادشاہ اس کے جواب سے خوش ہوا اور وطواط کو آزاد کر دیا۔[1]

فیاضی اور علم پروری

وطواط بہت فیاض شخص تھا، اسے جو انعام و اکرام کے طور پر ملتا وہ لوگوں میں بانٹ دیتا تھا۔ اس نے ایک ہزار مشہور کتابوں کے قلمی نسخے، جن کی خود اپنے ہاتھ سے تصحیح کی تھی، علم کے شائقین کے مطالعے کے لیے وقف کر رکھے تھے۔ وہ علم و فضل کا بڑا شیدائی تھا لیکن بہت مغرور اور خود ستا تھا یہی وجہ ہے کہ اتسز کے سوا اس نے کبھی کسی کی مدحت سرائی نہیں کی۔

اندازِ نگارش

وطواط کے اکثر قصائد اتسز کی جنگوں اور مہموں سے متعلق ہیں۔ وطواط صنائع و بدائع کا بہت شیدا تھا۔ اس وجہ سے اس کے کلام میں تصنع اور تکلف کا رنگ غالب ہے۔ اس کی تشبیہیں اور استعارے بھی بعض اوقات ناپسندیدہ ہوتے ہیں۔ اس کے اکثر اشعار لطیف احساسات سے عاری ہوتے ہیں۔ ایک قصیدے میں والدہ سے ملنے کے لیے اتسز سے رخصت چاہی ہے۔ اس قصیدے میں کچھ اصلیت کا رنگ ضرور جھلکتا نظر آتا ہے۔ چند شعر حسب ذیل ہیں:-

---

[1] سخن و سخنوران مولفہ آقای بدیع الزمان۔ جلد اول صفحہ ۳۴۸

صدرا بفخر تو که نهشتم بصبر خود

عرض کریم را بهوی در کف هوان

زانها یکه به دو بهر کس کنم قرار

بهم چنان سگان به بهر یکی پاره استخوان

گر مال نیست هست مرا فضل بی شمار

ور سیم نیست هست مرا علم بی کران

با فضل به مرا که بسی در شاهوار

با علم به مرا که بسی گنج شایگان

مسکین ضعیف والده گنده پیر من

بر خود همی به پیچد ازین غم چو خیزران

دارد بسی گران ز دل خاطر سبک

دارد دلی سبک ز غم و اندهی گران

خارش رسیده در کف تیمار من بلب

کارش رسیده از غم تیمار من بجان

چون تار ریسمان تن او شد نزار در من

بشنو کجا شوم ببیکی تار ریسمان

پوشیده رفت خواهم از دگر گریستن

بر بند و اشک دیده او در راه کاروان

یارب چگونه صبر کند در فراق من

آن طبع ناشکیبش و آن شخص ناتوان

شب های تیره راز بسی گفت خواهد او

یارب تو آن غریب مرا باز من رسان

وطواط کے چند اور اشعار نمونے کی غرض سے درج ذیل ہیں ؎

بهار چهرهٔ جانان همی بیاراید   جمال چهرهٔ بستان همی بیفزاید

سحاب روی شگوفه همی بیفروزد   شمال جعد بنفشه همی بپیراید

یکی بکوه و صحرا گلاب می ریزد   یکی بباغ و به بستان عبیر می ساید

کشادہ نرگس چشم امید را ہمہ شب | کہ صبح بر چہ ملد گل جمال بنماید

گرفتہ لالہ بکف جام لعل و ماندہ بپای

مگر بہ بزم خودش گل شراب فرماید

○

جانان لب چون شراب داری	رخسار چو آفتاب داری
در پیش ضیاء آفتابت	از ظلمت شب نقاب داری
پیوستہ رہ فراق پوئی	ہموارہ سر عتاب داری
ای روئی تو رحمت الٰہی	تا چند مرا عذاب داری
ای تافتہ زلف یار آخر	تا کی دل من تباب داری

ہم عصر شعراء وطواط کے ہم عصر شعرا الوری، معزی، سنائی، ادیب صابر، سوزنی، خاقانی، مختاری اور سید حسن غزنوی تھے۔

تصنیفات وطواط کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:۔

۱- **دیوان فارسی**۔ وطواط کا دیوان تقریباً پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے اس میں اکثر اور بعض وزرا کے قصائد ہیں۔

۲- **رسائل عربی**۔ یہ مجموعۂ مراسلات عربی زبان میں ہے۔

۳- **حدائق السحر فی دقائق الشعر**۔ اس کا موضوع صنائع شعری ہے۔

وفات رشید الدین وطواط کی وفات کے متعلق تذکرہ نویسوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یاقوت حموی اور جلال الدین سیوطی اس کی وفات ۵۷۳ھ مطابق ۱۱۷۷ء میں بیان کرتے ہیں اور دولت شاہ نے اپنے تذکرہ میں، اور رضا قلی خاں نے مجمع الفصحا میں اس کا سال وفات ۵۷۸ھ مطابق ۱۱۸۲ء لکھا ہے یاقوت حموی کا قول زیادہ درست معلوم ہوتا ہے، کیونکہ

اس کا تذکرہ نسبتاً زیادہ قدیم ہے۔

ادیب صابر

رشید الدین وطواط کا سب سے بڑا حریف ادیب صابر ہے۔ جو سلطان سنجر کے دربار کا شاعر تھا۔ اس کا نام شہاب الدین ادیب صابر بن اسمٰعیل اور وطن ترمذ ہے۔ ابتدائی تعلیم ترمذ میں ہوئی۔ پھر کچھ وقت بلخ اور خوارزم میں بھی گزارا۔ دولت شاہ سمرقندی لکھتا ہے کہ ادیب صابر کے مراسم شروع شروع میں خوارزم کے حکمران اتسز کے ساتھ بھی تھے چنانچہ اس کی مدح میں بھی بعض قصائد کہے ہیں۔

ادیب صابر کے ہم عصر اس کا بہت احترام کرتے تھے۔ انوری ایسا نامور شاعر بھی اپنے اشعار میں اس کی حیثیت کا ذکر کرتا ہے۔ وہ جہاں ادیب صابر کو حکیم سنائی سے برتر خیال کرتا ہے، وہاں اپنے آپ کو اس سے کم مرتبہ سمجھتا ہے۔ جیسا کہ مصرعہ ذیل سے واضح ہے۔

چوں سنائی ہستم آخر گرنہ ہم چوں صابرم

اندازِ نگارش

ادیب صابر کے قصیدوں کی تشبیب میں تغزل کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ اسی تغزل کی وجہ سے وہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ادیب صابر چوٹ کھائے ہوئے تھا۔ اس لیے رموزِ عشق بیان کرنے میں اسے خاص ملکہ ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے، اس میں اس کے واردات قلب کا عکس جھلکتا نظر آتا ہے۔ ایک تشبیب کے چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

توئی کہ مہر تو در مہرگان بہار من است
کہ چہرۂ تو گلستان و لالہ زار من است

بہار و سرو و گل و سوسن ای بہار بتان
چو در کنار منی جملہ در کنار من است

قرار من ہمہ در زلف بی قرار تو باد
کہ تاب حلقۂ او منزل قرار من است

طراوتی کہ غزل ہای آبدار مرا است
نہ عشق قسمت کہ در عالم اختیار من است

صابر میگساری اور عشق و نشاط کا دلدادہ ہے۔ اس کے اشعار میں سرود و سرور اور عشق و مستی جھلکتی نظر آتی ہے۔

شب آدینہ و من مست و خراب
عاشقی در سر و در دست شراب

ہر کجا بزمکی از می بینم!
بر سرش خیمہ زنم ہمچو حباب

مر مرا شنبہ و آدینہ یکی است
کہ چنین دیدہ ام از عشق صواب

پیش من شمع و من از عشق چو شمع
رنج او ز آتش و رنج من از آب

صحبت من ہمہ با عشق و نبیذ
الفت من ہمہ با جام شراب

عاشق و مست و خرابم چہ کنم
عاشق آن بہ کہ بود مست و خراب

می خورم سرخ تر از چشم خروس
در شب تیرہ تر از پر غراب

کرد بر دیدۂ من خواب حرام
عشق آن نرگس آلودہ بخواب

چہ کنم گر نکنم عیش و نشاط
چہ خورم گر نخورم جام شراب

نتوان خورد غم کار جہاں
کہ جہاں سایہ ابر است و سراب

بنمیند روشن داد از رود و روی چو ماہ
تو کلاں صبوحے شد بامداد پگاہ

سپیدہ دم چو برآید کہ باد صبح دمید
ببینید روشن روی چو ماہ و زلف سیاہ

ز دوام فتنہ دہند گنہ چہ آگاہ است
کہ نیست جان و دل او از این سہ چیز آگاہ

چو آفتاب برآید تو بادہ بر کف نہ
چو شب ز صبح بکاہد تو غم زیادہ بکاہ

بد آفتاب کہ روشن بود نباید کرد
ز حرمت رخ ساقی بہ آفتاب نگاہ

ادیب صابر اپنے سرود و نغمہ میں بھی دنیا کے عارضی اور فانی ہونے کو نہیں بھولتا۔ اسے یہ بات بھی ہمیشہ یاد رہتی ہے کہ انسان محض مجبور اور بے بس ہے۔

چو راز این برکشیدہ ایوانست — کہ درو مشتری و کیوانست
گر چہ گہ سعد و گاہ نحس دہد — ور چہ رزق و گاہ حرمانست
ز و چہ نالی کہ چون تو مجبور است — ز و چہ گوئی کہ چون تو حیرانست
نائب پردہ ہای اسرار است — پردۂ رازہای پنہان است

دور او ہر چہ کرد و ہر چہ کند — کردۂ کردگار گیہان است
جان کہ جان آفرین بما داد است — ملک ما نیست بلکہ مہمان است

زندگی را زوال در پیش است
زندۂ بی زوال یزدان است

ادیب صابر کے بعض قصائد میں درس عبرت اور پند و موعظت بھی ہے۔ مثال کے طور پر ذیل میں چند شعر پیش کیے جاتے ہیں۔

ز روزگار حذر کن ز کردگار مترس — دگر ترا بر ہمہ آفاق دسترس باشد
چو روزگار برآشفت کردگار گرفت — زوال دولت تو در یکی نفس باشد
نہ کردگار بہ تدبیر خلق کار کند — نہ روزگار بفرمان ہیچ کس باشد

ہم عصر شعراء اس کے ہم عصر شعرا انوری، معزی، مسعود سعد سلمان، رشید الدین وطواط، خاقانی، سنائی، عمعق بخارائی، سوزنی سمرقندی تھے۔

وفات ادیب صابر کی وفات ۵۴۶ھ مطابق ۱۱۵۱ء میں ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان سنجر نے ادیب صابر کو جاسوسی کی غرض سے خوارزم بھیجا تھا۔ یہاں آکر اُسے معلوم ہوا کہ اتسز نے دو آدمیوں کو متقرر کیا ہے کہ سلطان سنجر کو قتل کر دیں۔ اس نے سلطان کو مطلع کر دیا۔ سلطان سنجر کو وقت پر پتہ چل گیا۔ اتسز کے بھیجے ہوئے دونوں شخص گرفتار کر لیے گئے۔ اور بالآخر موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ لیکن اتسز کو جب معلوم ہوا کہ ادیب صابر بھی جاسوس بن کر آیا ہے، تو اُس نے اُسے گرفتار کر کے دریائے دجلہ کی پرآشوب موجوں میں بہا دیا۔

عمعق بخارائی (وفات ۵۴۳ ہجری مطابق ۱۱۴۸ عیسوی)

شہاب الدین عمعق

بخارائی آلِ خاقان کے حکمران خضر خان کے دربار کا نامور شاعر تھا۔ عمر بھر اسی دربار سے وابستہ رہا۔ اس لیے اس کی زندگی کا بیشتر حصہ ماوراء النہر میں گزرا جو آلِ خاقان کا دار السلطنت تھا۔ عمعق امیر الشعرا کے خطاب سے بھی سرفراز ہوا۔ ہم عصر شعرا مثلاً انوری اور سوزنی اسے اُستادِ سخن کہا کرتے تھے۔ اور اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ جیسے کہ انوری کے مصرعہ ذیل سے واضح ہے۔

"ہم برانگونہ کہ استادِ سخن عمعق گفت"

سوزنی نے عمعق کا ذیل کا مصرعہ یوں تضمین کیا ہے ؎

خیز ای بتِ بہشتی و آن جام می بیار

"کاردی بہشت کرد جہان را بہشت وار"

نظامی عروضی مصنف چہار مقالہ[1] لکھتا ہے کہ "عمعق دربار خاقانیہ کا ملک الشعراء تھا۔ اُسے تیز رفتار گھوڑے، سونے چاندی کے برتن، غلام کنیزیں، غرض کہ ہر قسم کی چیزیں اور آسائشیں میسّر تھیں۔ بادشاہ کے دربار میں اس کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ دربار کے تمام شعرا اس کی عزّت کرتے تھے۔"

عمعق کی شاعری کا چرچا سلطان سنجر کے دربار میں تھا۔ چنانچہ ۵۲۴ھ مطابق ۱۱۲۹ء میں جب سلطان سنجر کی بیٹی ماہ ملک کا انتقال ہوا۔ تو سلطان نے اُسے مرثیہ کہنے کے لیے بُلا بھیجا۔ عمعق اس وقت ضعیف و ناتوان تھا بڑھاپے کی وجہ سے اس کی بصارت میں بھی کمی آگئی تھی۔ چنانچہ معذرت کی اور ایک مرثیہ لکھ کر سنجر کی خدمت میں بھیج دیا۔ اس کے دو شعر حسب ذیل ہیں،

ہنگام آن کہ گل دمد از صحن بوستان

رفت آن گل شگفتہ و در خاک شد نہان

---

[1] مقالہ مرتبہ مرزا محمد قزوینی ص ۲۷

ہنگام آن کہ شاخ شجر نم کشد ز ابر

بی آب ماند نرگس آن تازہ بوستان

عمعق اپنے قصیدوں میں عمدہ تشبیہیں اور بدیع ترکیبیں لاتا ہے۔ قصیدۂ اردی بہشت" عمعق کی شعری خصوصیت کا حامل ہے۔ اس قصیدے کے چند شعر درج ذیل ہیں۔

خیز ای بُت بہشتی و آن جام می بیار

کاُردی بہشت کرد جہان را بہشت وار

نقش خورنق است ہمہ باغ و بوستان

فرش ستبرق است ہمہ دشت و کہسار

این چون بہار خانۂ چین پُر ز نقش چین

و آن چون نگار خانۂ مانی پر از نگار

این چون عذار حور پُر از گوہری سرشک

و آن چون بساط خلد پر از عنبرین نثار

گلبن عروس وار بیاراست خویشتن

وابرش مشاطہ وار ہمی شوید از غبار

آن لالہ بین شگفتہ در اندر آب چشم ابر

گوئی کہ جامہای عقیق است پر عقار

با شعلہ ہای آتش تیز است اندر آب

یا موج ہای لعل بدخشی است جہ بہار

عمعق بخارائی کے ممدوح خضر خان کے متعلق مصنف چہار مقالہ[1] لکھتا ہے، کہ

---

[1] مرتبہ میرزا محمد قزوینی صفحہ ۴۳

وہ شعراء کا بہت بڑا حامی اور مربی تھا۔ اس کے دربار سے متعدد شعراء وابستہ تھے، جن میں امیر عمعق بخاری، استاد رشیدی، نجار ساغرجی، علی پانیزی، بشر درگوشی، پسرا سفرائینی، علی سپہری اور داجبی فرغانی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ یہ شعراء قصیدے کہتے تھے، اور ان پر انعام واکرام کی بارشیں ہوتی تھیں۔

عمعق کی وفات ۵۴۳ھ مطابق ۱۱۴۸ء میں ہوئی۔

رشیدی سمرقندی

عمعق کا حریف سید الشعراء رشیدی تھا، جو خضر خان کی ملکہ زینب ستی کی مدح خوانی کیا کرتا تھا۔ اس لیے خضر خان کی بھی اس پر بہت توجہ تھی۔ اس کے قصائد تو نہیں ملتے، لیکن تذکروں میں اس کا ذکر آتا ہے۔ مصنف چہار مقالہ لکھتا ہے کہ شعرائے دربار عمعق کی بہت خدمت بجالاتے تھے، وہ رشیدی سے بھی اسی قسم کی توقع رکھتا تھا، لیکن رشیدی اسے خاطر میں نہ لاتا تھا۔ ایک دن رشیدی کی عدم موجودگی میں خضر خان نے عمعق سے پوچھا، سید الشعراء رشیدی کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ عمعق نے جواب دیا، شعر خوب کہتا ہے، لیکن اس کے اشعار کچھ بے نمک سے ہوتے ہیں۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ رشیدی دربار میں آیا، خضر خان نے اسے پاس بلایا اور کہا عمعق کہتا ہے کہ تم شعر تو خوب کہتے ہو، لیکن ان میں نمک نہیں۔ کہو تمہارا کیا خیال ہے؟ رشیدی سلام کر کے بیٹھ گیا اور فی البدیہہ یہ قطعہ کہا:

شعرہای مرا بہ بی نمکی ۔۔۔ عیب کردی روا بود شاید
شعر من ہمچو شکر و شہد است ۔۔۔ وندرین دو نمک نکو باید
شلغم و باقلہ است گفتۂ تو ۔۔۔ نمک ای قلتبان ترا باید

خضر خان یہ قطعہ سن کر بہت خوش ہوا، اور ایک ہزار طلائی مہریں انعام میں دیں۔

نظامی عروضی سمرقندی

نظامی عروضی سمرقندی کو جو آج شہرت حاصل ہوئی، وہ اس کے شاعر ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ مؤلف "چہار مقالہ" ہونے کی حیثیت سے ہے جس کے حوالے اس تاریخ میں جا بجا دیے گئے ہیں۔ چہار مقالہ کا مفصل ذکر اس دور کی نثر کی کتابوں میں آئے گا یہاں صرف نظامی عروضی کے مختصر حالات زندگی اور اس کی شاعرانہ حیثیت کا تذکرہ مقصود ہے۔

نظامی کا نام احمد بن عمر بن علی، لقب نجم الدین اور تخلص نظامی ہے۔ اس کے کئی ہم عصر نظامی تخلص کرتے تھے۔ اس لیے امتیاز کی غرض سے تخلص کے ساتھ عروضی بھی لکھنا شروع کیا۔ چنانچہ نظامی عروضی کے نام سے ہی شہرت پائی۔

سوانح حیات

نظامی عروضی کے حالات زندگی تذکروں میں بہت کم ملتے ہیں۔ چہار مقالے[1] کے مطالعے سے صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ نظامی کو سنہ ۵۰۶ھ مطابق ۱۱۱۲ء میں نیشاپور میں حکیم عمر خیام کی صحبت میسر تھی۔ تین سال بعد وہ ہرات گیا جہاں اسے رودکی کی زندگی کے حالات و واقعات سننے کا موقع ملا۔ سنہ ۵۱۰ھ مطابق ۱۱۱۶ء میں وہ نیشاپور اور طوس گیا جہاں اس نے فردوسی کے متعلق کچھ اطلاعات فراہم کیں اور فردوسی کے مزار کی زیارت کی۔ اسی زمانے میں سلطان سنجر کے ملک الشعراء امیر معزی کی وساطت سے سلجوقی دربار میں رسائی حاصل ہوئی۔ سنہ ۵۱۲ھ مطابق ۱۱۱۸ء میں وہ نیشاپور میں تھا۔ سنہ ۵۳۰ھ مطابق ۱۱۳۵ء میں ایک مرتبہ پھر اسے نیشاپور جانے کا اتفاق ہوا۔ اس مرتبہ اس نے حکیم عمر خیام کی قبر کی زیارت کی۔

---

[1] چہار مقالہ مرتبہ مرزا محمد قزوینی صفحہ ۹۹

تصنیفات

دولت شاہ[1] سمرقندی کا بیان ہے کہ نظامی عروضی نے ایک مثنوی "ویس و رامین" تصنیف کی تھی، چنانچہ نمونے کے طور پر مثنوی کا حسب ذیل ایک شعر لکھا ہے۔

ازان گویند آرش را کمان گیر — کہ از آمل بمرو انداخت او تیر

تذکرہ دولت شاہ کے علاوہ کسی اور تذکرے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ مثنوی نظامی عروضی کی تصنیف ہے۔

عوفی نے تذکرہ لباب الالباب میں نظامی عروضی کے پانچ قطعے نقل کیے ہیں۔ ان میں سے ایک حسب ذیل ہے۔

چہ گوئی در علی آلی چہ گوئی — کہ خاک از خون ایشان زن رسپی بہ
چہ گوئی در ہمہ عالم کہ از وی — شناسی در مروت ہیچ کس نہ
سر دریشی نکو دارد و لیکن — چو نیکو بنگری کس نیست در دہ
دو فرزند خلف کاورا رسیدند — نبا میرو نہی دو گبر سگ زہ
چہ زیبا باشد اندر چشم این میل — چہ نیکو باشد اندر حلق آن زہ
برون رفتہ سر این از چنگ ہر دو — بر آسودہ جہان از ننگ سرسہ

عوفی نے یہ بھی لکھا ہے کہ نظامی عروضی نے متعدد مثنویاں لکھی تھیں، لیکن اب یہ سب ناپید ہیں، یہاں تک کہ تذکروں میں ان کے نام بھی نہیں ملتے۔

نظم[2] میں نظامی کی کوئی یادگار باقی نہیں، جس پر اظہار خیال کیا جائے۔ لیکن نظامی خود چہار مقالے کے دوسرے مقالے میں فی البدیہہ گوئی کے سلسلے میں لکھتا ہے:

---

۱ تذکرہ دولت شاہ ص ۳۴

۲

جب شہزادہ شہید کے دربار میں تھا، تو وہ میرے متعلق بہت بلند رائے رکھتا تھا۔
ایک مرتبہ رمضان کے آخری روزے کے افطار کی تقریب میں امیر شیخ عمید سیف الدین ابوبکر محمد بھی آل غور کے دربار میں موجود تھا۔ وہ اگرچہ نوعمر ہی تھا، لیکن ایک ماہر انشا پرداز اور ثقہ شخص تھا۔ لوگوں میں اسے بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ بادشاہ نے اس کا خیر مقدم کرنے کے بعد کہا نظامی کو بلاؤ۔ امیر عمید بول اٹھا، کیا نظامی یہاں ہے؟ اسے بتایا گیا کہ نظامی یہیں ہے۔ امیر عمید سمجھا کہ یہ نظامی منیری ہے، چنانچہ اس کی تعریف کرنے لگا۔ "واہ کیا خوب شاعر ہے اور لوگوں میں مقبول کتنا ہے!"

طلبی کا حکم ملتے ہی میں دربار میں حاضر ہوا۔ آداب بجا لایا اور قریب ہی ایک جگہ پر بیٹھ گیا۔ شراب کے ایک دو دور ہو چکے، تو امیر عمید کہنے لگا۔ "کیا نظامی نہیں آیا؟ بادشاہ نے جواب میں کہا۔ "آیا تو ہے، دیکھیے وہ ہے نظامی" عمید نے کہا "میں نے اس کا ذکر نہیں کیا تھا، میں اسے نہیں جانتا، میں نے جس نظامی کا ذکر کیا تھا، وہ اور شخص ہے۔"

یہ سن کر بادشاہ کے چہرے پر ملال کے آثار نمودار ہوئے اور میری طرف متوجہ ہو کر کہا "کیا کوئی اور نظامی بھی ہے؟" میں نے جواب میں کہا، ولی نعمت بیشک۔ دو نظامی اور بھی ہیں۔ ایک نظامی سمرقند کا رہنے والا ہے، جو نظامی منیری کے نام سے مشہور ہے۔ دوسرا نظامی نیشاپوری ہے۔ جسے نظامی اثیری کہتے ہیں۔ بندہ نظامی عروضی ہے۔" اس پر بادشاہ نے پوچھا۔ "شعر و سخن میں ان میں سے کون بہتر ہے؟"

امیر عمید نے محسوس کیا کہ یہ سوال کچھ ٹیڑھا سا ہے۔ اور بادشاہ کے چہرے پر کچھ تغیر سا بھی آ گیا ہے، اس لیے کہنے لگا، آقا وہ دونوں کچھ جھگڑالو قسم کے ہیں، شراب کے نشے میں محفل کو درہم برہم کر دیتے ہیں۔ اور فتنہ و فساد پیدا کر دیتے ہیں۔" اس پر بادشاہ نے کہا ایک دور ہو جائے، تو پھر اس کو بھی دیکھنا کہ یہ کیسے مجلس کو برہم کرتا ہے۔ بادشاہ

نے اپنا پچھرہ ہی سوال دہرایا کہ ان تینوں میں شاعری کے لحاظ سے کون بہتر ہے؟ عمید نے جواب دیا۔ "ان دو کا تو مجھے ذاتی طور پر علم ہے، لیکن ان سے ملنے کا مجھے اتفاق نہیں ہوا، نہ ان کے شعر ہی کبھی سنے ہیں، اس لیے میں ان کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر اسی زیر بحث موضوع پر نظامی کچھ کہہ کر سنائیں، تو میں ان کی قوتِ طبع کا اندازہ کر کے کچھ عرض کر سکوں گا۔ کہ کون بہتر ہے۔"

بادشاہ یہ سن کر میری طرف متوجہ ہوا اور کہا "نظامی! دیکھنا، ہمیں نادم نہ ہونا پڑے، امیر عمید کی خواہش کے موافق کچھ سنانا۔"

"آلِ غور کے دربار میں میری فکر رسا اور طبیعت رواں تھی۔ اور میرے ممدوح کے انعام واکرام نے میرے ذوق کو کچھ ایسی جلا دی تھی کہ فی البدیہہ شعر آب رواں کی مانند چلے آتے تھے۔ میں نے اس وقت قلم ہاتھ میں لیا۔ شراب کے ابھی دو ہی دور ہوئے تھے کہ ذیل کے پانچ شعر کہہ کر حضور میں پیش کیے۔

در جہاں سہ نظامیم، ای شاہ!	کہ جہانی زما با فغانند
من بور رساد پیش تخت شہم	وآن دو در مرو پیش سلطانند
بحقیقت کہ در سخن امروز	ہر یکی مفخر خراسانند
گرچہ ہمچوں روان سخن گویند	ورچہ ہمچوں خرد سخن دانند
من شرابم کہ شان چو دریابم	ہر دو از کار خود فرو مانند

میرے اشعار سن کر امیر عمید آداب بجا لایا اور کہنے لگا۔ "بادشاہ سلامت! ان دو کا تو ذکر ہی کیا میں نے ماوراء النہر، عراق اور خراسان بھر میں کوئی شاعر ایسا نہیں دیکھا جو اتنی خوبی سے ایسے شیریں اور رواں پانچ شعر فی البدیہہ کہہ سکے اور ان کے معانی بھی طبع زاد ہوں۔"

بادشاہ کہہ اٹھا۔ "نظامی خوش ہو کہ آج روئے زمین پر تمہاری کوئی نظیر نہیں۔"

اس پر امیر عمید نے کہا۔ "ولی نعمت! نظامی بہت دانش مند اور زود فہم شاعر ہے۔ فنِ شعر میں یدِ طولیٰ رکھتا ہے۔ آپ کے اقبال سے اس وقت یہ یکتائے روزگار ہے۔ ابھی نو عمر ہے۔ جوں جوں وقت گزرے گا، اس کے شعر و سخن کا مرتبہ اور بھی بلند ہوگا۔"

یہ سن کر بادشاہ کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ اور حکم دیا کہ ورساد کی سکے کی کان عید رمضان سے عید قربان تک نظامی کو دی جائے۔ اس کان سے مترہ دنوں میں نظامی کو بارہ ہزار من سکہ ملا۔

عبدالواسع جبلی عبدالواسع نام، جبلی تخلص اور وطن غرجستان[1] ہے۔ غرجستان ایک پہاڑی علاقہ ہے۔ اور پہاڑ یعنی جبل ہی کی نسبت سے اس نے جبلی تخلص کیا۔ عبدالواسع کا لقب فریدالدین یا فریدالزماں تھا، جیسا کہ اس کے اشعار سے ظاہر ہے ؎

پیش ازنیم فرید خواندندی	خاصہ و عامہ از رہ تقلید
شد کنون این لقب بمن لائق	کہ بماندم زخدمت تو فرید

جبلی کے والد کا نام عبدالجامع بن عمران بن ربیع ہے اور جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے، اس کا سلسلۂ نسب آنحضرتؐ سے ملتا ہے۔

زخاندان قدیم من و شما وانید
کہ واجب است مراعات خاندان قدیم
نکرد با من محروم قصد جباری
کہ من زنسل رسول خدائی جبارم

عبدالواسع غرجستان سے چل کر ہرات آیا، یہاں سے پھر غزنی آگیا۔ جہاں چار سال

---

[1] غرج بمعنی کوہ و غرجستان کوہستان است۔ معجم البلدان جلد ششم صفحہ ۲۷۷

تک سلطان بہرام بن مسعود غزنوی کے دربار سے وابستہ رہا۔ دولت شاہ سمرقندی کا بیان ہے کہ ۵۱۰ھ مطابق ۱۱۱۶ء میں جب سلطان سنجر نے غزنین پر فوج کشی کی اور فتح پائی تو جبلی نے قصیدہ کہہ کر سلطان کی خدمت میں پیش کیا جس پر سلطان نے اسے طرح طرح کے انعام و اکرام سے نوازا۔ اس قصیدے کا مطلع حسب ذیل ہے۔

زعدل کامل خسرو زامن شامل سلطان
تذرو کبک و گور و مور در گشتند در گیہان

اندازِ نگارش عبدالواسع طبع سلیم اور فکر بلند رکھتا تھا لیکن اس نے تمام شاعرانہ صلاحیتیں صنائع بدائع پر وقف کر دیں۔ صنائع کا حسن تو اس نے ضرور پیدا کیا لیکن شعروں کے حسن لطیف کو ضائع کر دیا۔ یہ وہ پہلا شاعر ہے، جس نے شعر و سخن کا کمال صنائع بدائع کو سمجھا۔ اس کے اشعار میں صنعت مقابلہ صنعت لف و نشر، اور صنعت ایہام بکثرت ہیں۔ ان صنعتوں سے جبلی کی قدرت طبع کا تو پتہ چلتا ہے، لیکن اس کے شعر اصلیت اور حقیقت سے عاری ہو گئے ہیں۔ نمونے کے طور پر اس کے ایک قصیدے کے بعض شعر ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

چون شد از باد خزان ای شمسہ خوبان چین
باغ چون روی م برنگ و آب چون زلف بچین

سوی کاشانہ خرام و عذر مستانہ مگوی
گرد پیمانہ بگرد و یار فرزانہ گزین

حبذا عشرت بر دی دلبران غمگسار
فرغا نزہت بیاد و دوستان راستین

گاہ نوشیدن برغبت بادہ لعل کہن
گہ نیوشیدن بعشرت نالہ چنگ حزین

خورد باید بادۂ ہم رنگ دیوی گل کنون
چون چمن خالی شد از گل ہای ماہ فروردین
ور تہی شد بوستان از لعبتان چین ہمی
خانہ باید کرد از آتش چون نگارستان چین
برگسست و برکشید و برگرفت و برفشاند
تا سپاہ مہرگان کردند بر بستان نگین
حلقہ گوش ارغوان و حلۂ شخص بوستان
خیمہ دقد نوبہار و یارہ دست یاسمین
باد پاشد بر شمر ہر ساعتی زر عیار
ابر بارد بر شجر ہر لحظۂ در ثمین

اگرچہ شعرا قصائد کو فراہمی زر اور حصول اقتدار کا ذریعہ بناتے ہیں لیکن جبلی اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ وہ کسی طمع کی غرض سے قصیدہ گوئی نہیں کرتا، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ عظیم کارناموں کو منظر عام پر لائے۔ وہ اپنے گوشہ تنہائی اور موجودہ مال و منال پر قانع ہے۔ قناعت کا ایک ذرہ اس کے نزدیک ایک وسیع ملک سے بہتر ہے۔

اگرچہ پیشہ مدح جز طمع نبود   نیز دمن طمع است از کبائر اعمال
نہ در صدد و تملق کنم ز بہر طمع   نگویم از جہت مال مدحت از دوال
کنم بگوشۂ خالی کفایت از دنیا
کنم بہ توشۂ خالی قناعت از اموال

O

منزوی باشم ہمیشہ تا نباید رفتنم   نزد ممدوح لئیم و پیش مخدوم حقیر

زانکہ یک ذرہ قناعت نزد ارباب ہنر	مہتر از ملک عظیم و بہتر از ملک کبیر

میں ہمیشہ گوشہ نشین رہنا چاہتا ہوں تاکہ مجھے کسی لئیم ممدوح اور کسی حقیر مخدوم کے سامنے نہ جانا پڑے کیونکہ اہلِ ہنر کے نزدیک ذرہ بھر قناعت بہت بڑی سے بڑی جائداد اور وسیع ملک سے بہتر ہے۔

ہم عصر شعراء جبلی کے ہم عصر شعراء، مسعود سعد سلمان، انوری، معزی، ادیب صابر، سوزنی، سنائی، عثمان مختاری، سید حسن غزنوی وغیرہم تھے۔

جبلی نے ۵۵۵ھ مطابق ۱۱۶۰ء میں وفات پائی۔

سوزنی سوزنی تخلص اور نام محمد ہے۔ اس کے والد کا نام پروفیسر براؤن نے دولت شاہ کے حوالے سے علی لکھا ہے، لیکن اس کے اپنے اشعار سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس کا نام محمد بن مسعود ہے[1]

مداح تو صد ہزار کس است	ہر سو بیکی زبان، دیگر
زایشان چو محمد بن مسعود	نی کہتر و مدح خوان دیگر

سوزنی نسف[2] میں پیدا ہوا اور بخارا میں تفسیر اور حدیث کی تعلیم پائی۔ پھر شعر و شاعری کی طرف رجوع کیا۔ محمد عوفی اس کے تخلص اور آغازِ شعر و شاعری کے متعلق لکھتا ہے۔ کہ محمد کو ایک دن سوئیاں بنانے والے کی دکان پر جانے کا اتفاق ہوا۔ اس سوزن گر کا ایک شاگرد تھا جو حسن و جمال میں چندے آفتاب چندے ماہتاب تھا۔ محمد بن مسعود پہلی ہی نظر میں دل دے بیٹھا۔ چنانچہ وہ سوزن گر کے پاس گیا اور سوزن گری کا کام سیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ آخر وہ اپنے محبوب کے دوش بدوش سوزن گری کا

---

[1] سخن و سخن وران مولفہ بدیع الزمان حصہ اوّل صفحہ ۳۳۴ [2] جیحون اور سمرقند کے بیچ ایک بہت بڑا شہر ہے اسے نخشب بھی کہتے ہیں۔ (معجم البلدان)

کام سیکھنے میں کامیاب ہوا، اور اس صنعت کی یاد میں اس نے سوزنی تخلص کیا۔

انداز نگارش

سوزنی کا بیان بہت سہل، سادہ اور شیریں ہے۔ اس کے سارے دیوان میں ایک شعر بھی ایسا نہ ہوگا، جو الجھا ہوا ہو لیکن اس کی تمامتر توجہ ہجو اور ہزل گوئی پہ مبذول رہی۔ لاف و گزاف میں اس کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ اس زمانے کے کم ہی لوگ ہوں گے، جو اس کی ہجو کی تیغ سے زخمی نہ ہوئے ہوں۔ اس کی ہجویں بہت عریاں ہیں۔ دولت شاہ سمرقندی نے سوزنی کا ذکر تو کیا ہے، لیکن اس کے اشعار کا نمونہ دینے کے لیے معذرت چاہی ہے۔ عوفی اس کی شاعرانہ قابلیت کا معترف ہے، لیکن اس نے بھی اپنے تذکرہ لباب الالباب کے دامن پر اس کی ہجوؤں کے بدنما دھبے نہیں آنے دیے۔ عوفی دعا کرتا ہے کہ خدا گم کردہ راہ شاعر کو راہ مستقیم دکھائے۔

سوزنی کی طبیعت جو ہزل اور ہجو پہ مائل ہوئی، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ دنیا کے عیش و نوش سے محروم رہا۔ اگر دنیا میں نااہل لوگوں کو جاہ و اقتدار حاصل ہو اور وہ شب و روز عیش و نشاط میں بسر کرتے ہوں، تو ایک ذہین شخص پہ، جو ناکامی اور نامرادی کی زندگی بسر کر رہا ہے، اس کا یہ ردِ عمل تو ہو سکتا ہے، کہ وہ ناکامیوں کا انتقام لینے کے لیے ہجو کے تیر و نشتر چلائے اور جو اس کے سامنے آئے، اس پر وار کرے۔ ذیل کے اشعار اس کی محرومیوں کا پتہ دیتے ہیں ؎

در این جہان کہ سرای غم است و تاسہ و تاب

چو کاسہ بر سر آبیم و تیرہ دل جو حباب

یعنی دنیا اس کے لیے ایک سرائے غم ہے اور اس کی زندگی ایک نگوں کاسہ کی مانند ہے، جو پانی پر تیرتے ہوئے بھی پانی سے محروم ہے۔ پھر اسی مضمون کی وضاحت اگلے شعروں میں کی ہے ؎

خراب عالم و ما چند و اہ ازین نہ عجب   عجب از آن کہ نمانند چند را بخراب

مجحاب غفلت خفتیم خوردہ شربت جہل — کہ تا شدیم ز بیداد نفس بی خور و خواب
کباب آتش حرصیم و آن ز خامی ماست — حقیقت است کہ ہر خام را کنند کباب
تقی و عاقبت اندیش نیست از ما کس — ازیں شدیم سزاوار گونہ گونہ عتاب
عقاب طاعت ما باز ماندہ از پرواز — شدیم صید معاصی چو کبک صید عقاب

تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ آخر عمر میں سوزنی نے ہجو گوئی سے توبہ کرلی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سوزنی کی یہ ذہنی اور دلی تبدیلی حکیم سنائی کی صحبت کا نتیجہ تھی۔ لیکن یہ وجہ بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی ہجوؤں کے ترکش سے حکیم سنائی پر بھی تیر چلائے تھے۔ یہ ہجویں اس کے دیوان میں موجود ہیں۔

اس کے ایک شعر سے تو پتہ چلتا ہے کہ حکیم سنائی کی ہجو کہنا اس کے نزدیک وعد اور رباب کی داستان سے زیادہ بہتر ہے۔ چنانچہ "ہجو حمخانہ و مدح نظام الدین" میں کہتا ہے۔

سوزنی مدح گوئی مجلس او — کو ہمی داشت بر ہمہ اصحاب
با سنائی بدی مطایبتش — خوشتر از داستان وعد و رباب

سوزنی اپنے اشعار میں کسب ہنر کی تلقین کرتا ہے۔

اندر جہان چو بی ہنری عیب عار نیست — با فخر و با ہنر زی و بی عیب عار باش
فخر از ہنر نما و باہل ہنر گرای — وز عیب عار بی ہنری بر کنار باش

سوزنی کے ہم عصر شعراء

سوزنی کے ہم عصر شعرا عمعق، انوری، وطواط، نجیبی، دہقان علی شطرنجی، سنائی، معزی، ادیب صابر اور نظامی عروضی سمرقندی ہیں۔ سوزنی کے یہ ہم عصر اس کی بدزبانی کی وجہ سے مصیبت میں مبتلا تھے۔ وہ ان شعرا کے قصائد کے جواب لکھتا، اور ان کی ہجویں کہتا تھا۔ سنائی اور معزی جن کا شمار اس زمانے کے بزرگ شعرا میں ہوتا تھا، خاص طور سے اس کی

ہجووں کا نشانہ بنے۔ خمخانہ بھی اس کا ایک ہم عصر شاعر تھا، اور حبلالی تخلص کرتا تھا۔ وہ یا اس کے آباو اجداد عیسائی تھے۔ عوفی نے جلالی کو حکیم جلال لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ سوزنی حکیم جلال کی ہجو کہتا تھا۔ یہ غریب اس کی ہجووں کی وجہ سے سخت مصیبت میں مبتلا تھا۔

جلالی کی ہجو کے تین شعر حسب ذیل ہیں:

همه سوداش آنکه نقش کند | بجلالی جریدهٔ القاب
ناگرفته دراو کمند بریاق | خوک بچگان نابر آمد ناب
تامر اہل کتاب را مہمان | کند آن بحترین اہل کتاب

دولت شاہ سمرقندی تذکرۃ الشعرا میں لکھتا ہے کہ مدرسے کے علما نے پسر خمار کو آمادہ کیا کہ سوزنی کی ہجو کہے۔ اس نے شامت اعمال سے سوزنی کی ہجو کہہ دی۔ سوزنی نے پسر خمار کی ہجووں کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ پسر خمار خمخانہ ہی ہے جس کا ذکر آچکا ہے۔ ہجووں کا یہ سلسلہ بہت دراز ہوا۔ سوزنی کے دیوان کا تقریباً ایک تہائی حصہ اسی شاعر کی ہجووں پر مشتمل ہے۔

وفات سوزنی نے بہت لمبی عمر پائی۔ آخر عمر میں بہت ضعیف و ناتوان ہو گیا تھا۔ ساٹھ سال کی عمر میں اس نے یہ شعر کہے۔

صیاد پیری آمد و برا صطیاد من | داس کمند و تیر گشاد از چہار تیر
یک تیر او زمستان یک تیر او بہار | یک تیر او تموز دگر تیر ماہ تیر
از داس پی زد و بہ کمندم ببند کرد
و آنگاہ از کمان بمن انداخت شست تیر

ستر سال کی عمر میں یہ شعر کہا ؎

در باغ عمر سوزنی ای صد روز بہ | ہفتاد شد خزان و تموز و دی از بہار

اسی سال کا ہوا تو یہ شعر کہا ؎

جز مدح شاہ بیہدہ گوئی است شاعری
ہشتاد سال بس کہ بدی بیہدہ سرای

اس کے بعد کوئی ایسا شعر نہیں ملتا جو اس کی عمر پر مزید روشنی ڈال سکے۔

مہستی

سلطان سنجر سلجوقی کے دربار سے ایک مشہور شاعرہ مہستی بھی وابستہ تھی۔ یہ وہ دربار ہے جس میں امیر معزی، ادیب صابر، اور انوری ایسے شعراء قصیدے پڑھا کرتے تھے۔ ان اساتذہ کے دوش بدوش بیٹھ کر ایک عورت کا نغمہ سرا ہونا اس کے کمال فن کی دلیل ہے۔

مہستی لطیف طبع اور شیریں بیان شاعرہ تھی۔ اس کی طبیعت کا میلان صنف رباعی کی طرف زیادہ تھا۔ فی البدیہہ کہنے میں بھی اسے خاص ملکہ تھا۔ تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ سردیوں کا موسم تھا۔ سلطان سنجر گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ پائے رکاب کو حرکت دینے ہی والا تھا کہ برف باری ہونے لگی۔ سلطان سنجر نے مہستی سے خطاب کر کے کہا: "کہو ہوا کیسی ہے؟" اس نے فی البدیہہ ذیل کی رباعی کہی ؎

شاہا فلکت اسپ سعادت زین کرد
وز جملۂ خسروان ترا تحسین کرد
تا در حرکت سمند زرین نعلت
بر گل ننہد پای زمین سیمین کرد

تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ مہستی ایک شاعر تاج الدین احمد بن خطیب گنجوی کی بیوی تھی، چنانچہ تاریخ گزیدہ کے مؤلف حمد اللہ مستوفی نے ان میاں بیوی کی رباعیاں درج کی ہیں، جو انہوں نے ایک دوسرے کے جواب میں مختلف موقعوں پر کہی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان سنجر کے دربار میں کاتب کے فرائض بھی اُس کے سپرد تھے۔ اس لیے اُسے

مہتی دبیر بھی کہا جاتا ہے۔

حکیم سنائی ابوالمجد مجدود بن آدم نام اور سنائی تخلص ہے۔ پیدائش پانچویں صدی ہجری کے وسط میں ہوئی۔ ایران کے جن تین نامور شاعروں نے تصوف کو اپنے کلام کا باقاعدہ موضوع بنایا، اور اُس پر ضخیم کتابیں لکھیں، ان میں سب سے پہلے سنائی ہیں۔ ان کے بعد عطار اور جلال الدین رومی کا نام آتا ہے۔ چنانچہ مولینائے روم لکھتے ہیں ؎

عطار رُوح بود و سنائی دو چشم او　　　ما از پی سنائی و عطار آمدیم

حکیم سنائی کا نام تذکرہ نویس آپ کا نام ابوالمجد مجدود بن آدم لکھتے ہیں، لیکن آپ کی تصنیف "حدیقۃ الحقیقت" کے ایک شعر سے پتہ چلتا ہے کہ "مجدود" آپ کا لقب یا کنیت تھی۔

زانکہ جدّ را بتن شدم نسبت　　　کرد مجدود ما ضمیم کنیت

حکیم سنائی نے ایک قصیدہ قاضی اسعد ہروی کی مدح میں لکھا ہے، جس میں اپنا نام حسن ظاہر کیا ہے۔

پسری دارم ہمنام رہی　　　از تو می خدمت او جوئیم من
زانکہ کند از ہمنامی　　　مدحت خواجہ حسن بندہ حسن

ایک دوسرے قصیدے میں کہتے ہیں ؎

حسن اندر حسن اندر حسنم　　　تو حسن خلق و حسن بندہ حسن

ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا نام حسن تھا۔ لیکن آپ کی کنیت اس قدر مشہور ہوئی کہ بالآخر اُس نے نام کی جگہ لے لی۔

ابتدائی حالات شروع شروع میں حکیم سنائی نے بھی دوسرے قصیدہ نویسوں کی طرح مدح سرائی کو جاہ و منزلت حاصل کرنے

کا ذریعہ بنایا اور سلاطین و امراء کے قصیدے کہے۔ حرص و آز کا ان پر بھی اتنا غلبہ تھا کہ اگر کہیں سے انعام و اکرام نہ ملتا تو ہجو پر بھی اتر آتے تھے۔

آخر ایسا بھی وقت آیا، کہ دل اور دماغ میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ ہمت کی پستی، بلندی میں تبدیل ہو گئی۔ شاہوں کے ایوانوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ جہان اور اہل جہان سے منہ پھیر لیا۔ زر و مال کی طلب کی جگہ حقیقت کی جستجو نے لے لی۔ چنانچہ اس تبدیلی کا ذکر سنائی نے ذیل کے اشعار میں کیا ہے۔

حسب حال آنکہ دیو آز مرا — داشت یک چند در گداز مرا
گرد آفاق گشتہ چون پرکار — گرد گردان ز حرص دائرہ وار
شاہ خورسندیم جمال نمود — جمع منع و طمع محال نمود
شدم اندر طلاب مال ملول — از جہان و جہانیاں معزول

اس تبدیلی کے بعد استغنا کا یہ عالم بھی میسر آیا کہ بہرام شاہ غزنوی نے اپنی ہمشیرہ کے ساتھ ان کی شادی کرنا چاہی، لیکن آپ نے اسے قبول نہ کیا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکیم سنائی نے دفعتہً پیشہ ورانہ زندگی کو چھوڑ کو تصوف کی منزل کیسے اختیار کی؟ دولت[1] شاہ سمرقندی تذکرۃ الشعرا میں اس کی وجہ حسب ذیل بیان کرتے ہیں۔

بہرام شاہ غزنوی ہندوستان کی مہم پر جا رہا تھا کہ ایک دیوانہ، جو شراب خانوں میں شراب کی تلچھٹ مانگ کر پیتا تھا اور مست پڑا رہتا تھا، کہنے لگا۔ "شاہ کے اندھے پن کے صدقے میں ایک پیالہ شراب کا اور دینا۔" سنائی پاس سے گزر رہا تھا، سنا تو کہنے لگا، "کیا پاگل پنے کی باتیں کرتے ہو۔" دیوانے نے کہا، "ابھی غزنی کے کام سے فارغ

---

[1] تذکرۃ الشعرا صفحہ ۵۹

نہیں ہوا کہ دوسرے ملک کا رُخ کیا ہے، اس سے بڑھ کر اندھا پن اور کیا ہوگا!"

یہ کہہ کر شراب کا پیالہ پی گیا۔ پھر کہنے لگا "لانا ایک اور پیالہ سنائی کے اندھے پن کے صدقے میں بھی! اس سے بڑھ کر حماقت کیا ہوگی کہ دو چار جھوٹی سچی باتیں جوڑ کر کسی بیوقوف رئیس کے پاس جاتا ہے، اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ قیامت میں اگر سوال ہوا کہ کیا لایا ہے تو کیا جواب دے گا!"

حکیم سنائی پر دیوانے کی بات کا اتنا اثر ہوا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گوشہ نشین ہو گئے۔

زاویۂ نگاہ کا بدلنا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا، اس لیے ان کے کلام میں کہیں نہ کہیں اس کا ذکر ضرور ہونا چاہیے تھا، لیکن اُس کا کہیں اشارہ تک نہیں۔ اور نہ ہی کسی قدیم تذکرہ نویس نے یہ واقعہ لکھا ہے۔ اس لیے ممکن ہے یہ حکایت محض دولت شاہ کی دماغی اختراع ہو۔

ترکِ تعلقات کے بعد سنائی غزنی سے حج کو روانہ ہوئے۔ سفر کے دوران آپ نے اکثر علاقوں کی سیاحت کی اور متعدد صوفیا کی صحبت میسر آئی۔ اس صحبت نے ان کی منزلِ حقیقت کو اور بھی روشن کر دیا۔

اندازِ نگارش

سنائی کے قصائد سے پتا چلتا ہے کہ شروع شروع میں آپ نے فرخی اور منوچہری کا انداز اختیار کیا تھا۔ ان کے بعض اشعار کو تضمین بھی کیا۔ ایسی تضمینوں کی دو مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔

مگر دانم مذین عالم زپیش آذی دگر عقلی

"چو رای عاشقان گردان چو طبع بیدلان شیدا!"

اس شعر کا مصرعہ ثانی فرخی کا ہے۔

دو دہ دین خود بوالعجب مردی اگت اندر وی چو شمع

"چوں شوی بیمار خوشتر گردی از گردن زدن"

اس کا دوسرا مصرعہ منوچہری کا ہے۔

حال باشعر فرخی آریم   رقص بر شعر بوالفتوح کنیم

اس عقیدت کا یہ نتیجہ ہے کہ آپ کے قصائد کی اکثر تشبیہیں فرخی سے مشابہ ہیں۔ لیکن محض تقلید کرنے سے کسی کی شاعرانہ عظمت کا پتہ نہیں چلتا۔ اس لیے ان کی درباری شاعری سے ان کا مقام متعین کرنے میں ہمیں مدد نہیں ملتی۔ لیکن جب آپ کی زندگی میں فکری اور روحانی انقلاب آیا تو آپ نے تقلید کو چھوڑ کر تحقیق کی منزل میں قدم رکھا۔ یہاں سے آپ کے فکر و خیال کی آزادی کا دور شروع ہوا۔ اس انقلاب نے آپ میں ایک خاص استغنا پیدا کر دیا۔ اور شعر و فکر میں آپ کا ایک مخصوص انداز ہو گیا۔ جو اس دور کے تمام شعراء سے مختلف ہے۔

آپ کے انقلابی دور کی شاعری عارفانہ رنگ میں ہے اور فکر کی گہرائی اور خیالات کی وسعت کا پتہ دیتی ہے۔ یہ شاعری دعوت و تعلیم کی شاعری ہے۔ شاعر فلسفیانہ انداز میں تزکیۂ نفس، ردّ غرور اور ترک ظاہر پرستی کی تلقین کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ذیل کے اشعار میں سنائیؒ ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ آدمیت محض ظاہریت اور جاہ و مال سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اُس کے لیے کوشش، خدمت اور صفائی قلب کی ضرورت ہے۔

ہر کسی از رنگ گفتاری بدآن رہ کی رسد
درد باید مرد سوز و مرد باید گام زن

سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی ز آفتاب
لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

ماہ ہا باید کہ تا یک پنبہ دانہ ز آفتاب
زاہدی را خرقہ گردد یا حماری را رسن

عمر ہا باید کہ تا یک کودکی از روی طبع
عالمی گردد نکو یا شاعری شیرین سخن

تزکیۂ نفس اور خود شناسی نے انہیں ایسے مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ دوست کا دامن اُن کے ہاتھ میں اور حلقہ دوست اُن کے کان میں پڑا ہوا ہے۔ سیاروں اور ستاروں کی حرکت اُن کے منشاء کے مطابق ہے۔

طلب ای عاشقان خوش رفتار　　طرب ای نیکوان شیریں کار
تا کی از خانہ ہین رہ صحرا　　تا کی از کعبہ ہین در خمار
زین سپس دست ما و دامن دوست　　بعد ازین گوش ما و حلقہ یار
در جہان شاہدی و ما فارغ　　در قدح جرعۂ و ما ہشیار
چرخ را اجرام چاکران تواند　　تو از ایشان طمع مدار مدار
حلقہ در گوش چرخ و انجم کن　　تا دہندت ببندگی اقرار
کلبۂ کاندرو نخواہی ماند
سال عمرت چہ دہ، چہ صد، چہ ہزار

آپ کے دیوان میں اکثر اشعار ظاہر پرستی، ریاکاری، ایذا پسندی اور بیوفائی کی شکایت میں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں دنیا میں تلخ تجربات بھی ہوئے ہیں۔ اس لیے انہوں نے اصلاح حال کی طرف توجہ دلائی ہے اور صفائی قلب، کسب حکمت، ترک حرص اور ایمان و عرفان کی دعوت دی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

مکن در جسم و جان منزل کہ این دون است و آن والا
قدم زین ہر دو بیرون نہ نہ این جا باش و نہ آن جا
بہر چہ از راہ دور افتی چہ کفر آن حرف و چہ ایمان
بہر چہ از دوست وامانی چہ زشت آن نقش و چہ زیبا
ترا دنیا ہمی گوید کہ دل در ما نہ بندی بہ
تو خود می پند ننیوشی ازین گویان ناگویا

گر امروز از آتش شهوت بکشتی بیگمان رستی
وگرنہ تف این آتش ترا هیزم کند فردا
چو علمت هست خدمت کن چو دانایان کہ زشت آید
گرفتہ چینیان احرام و مکی خفتہ در بطحا
چہ علم آموختی از حرص آنگہ ترس کاندر شب
چو دزدی با چراغ آید گزیدہ تر برد کالا
گر از زحمت همی ترسی ز نا اہلان ببر صحبت
کہ از دام زبون گیران بہ عزلت رستہ شد عنقا
نخواہم لاجرم نعمت نہ در دنیا نہ در جنت
همی گویم بہر ساعت چہ در سرا چہ در ضرا
کہ یا رب مر سنائی را سنائی دہ تو در حکمت
چناں کزوی برشک آید روان بو علی سینا

تصنیفات حکیم سنائی نے ایک دیوان اور سات مثنویاں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان مثنویوں میں "حدیقۃ الحقیقت" بہت مشہور ہے۔ باقی مثنویوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

طریق التحقیق، غریب نامہ، سیر العباد، کارنامہ، عشق نامہ، عقل نامہ۔

دیوان :- آپ کا دیوان بارہ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں قصیدے، ترجیع بند، ترکیب بند، غزلیات اور رباعیاں ہیں۔

خصوصیات شاعری ۱۔ حکیم سنائی نے گو شروع شروع میں فرخی اور منوچہری کی طرز پر قصیدے کہے تھے۔ لیکن ان کے کلام میں بہت پختگی اور برجستگی ہے۔ کہیں کہیں طرز ادا میں جدت بھی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ای جان جانہا روی تو، آشوب دلہا موی تو
دامہا خم گیسوی تو، پنہان ہزاران صبحدم
روی تو بنا میزد چو مہ، زلف تو بنا میزد سیہ
ہم عذر با تو ہم گنہ، ہم نور با تو ہم ظلم
بر روی از بہر شرف، با ما گہ خشم و لطف [1]
گہ لعل گوید لاتخف گہ چرغ [2] گوید لاتنم

۲۔ سنائی پہلا شاعر ہے جس نے تصوف کے اسرار و رموز بیان کرنے کے لیے شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا۔ ابو سعید ابوالخیرؒ نے بھی اپنے عارفانہ تاثرات رباعیوں میں پیش کیے ہیں۔ لیکن ان کا کلام تصوف کی کوئی باقاعدہ اور مستقل تصنیف نہیں ہے۔ بخلاف اس کے حکیم سنائی کی تمام مثنویاں تصوف کے اسرار و رموز کی مستقل تصنیفیں ہیں۔ چنانچہ مولانائے روم ایسے عارف کو بھی اس بات کا اعتراف ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

ترک جوشی کردہ ام من نیم خام | از حکیم غزنوی بشنو تمام
در الٰہی نامہ گوید شرح این | آن حکیم غیب و فخر العارفین

حدیقۃ الحقیقت تصوف و اخلاق کے موضوع پر حکیم سنائی کا یہ ایک زندہ جاوید کارنامہ ہے۔ اس میں آپ کی قادر الکلامی پوری طرح سے آشکار ہے۔

اس مثنوی کے دس باب ہیں۔ پہلے باب میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہے اور دوسرے باب میں رسول اکرم صلعم کی مدح و منقبت۔ تیسرے باب کا موضوع عقل و دانش

---

[1] لطف بہ فتح دوم بمعنی لُطف۔

[2] چرغ ، خرمہ یمانی، جس میں سپیدی بھی ہوتی ہے اور سیاہی بھی۔ اسے آنکھ سے تشبیہ دیتے ہیں

ہے، اور چوتھے کا علم۔ پانچویں باب میں بے پروائی اور اس کے نقصانات کا بیان ہے چھٹا باب سیاروں اور آسمانوں سے متعلق ہے۔ ساتواں فلسفہ و حکمت پر ہے۔ آٹھویں میں عشق و محبت کا ذکر ہے۔ نویں میں شاعر نے اپنے ذاتی حالات بیان کیے ہیں۔ دسواں باب غزنی کے حکمران بہرام شاہ کی تعریف و توصیف میں ہے۔ مثنوی کے ہر باب میں فلسفیانہ اور صوفیانہ اسرار و رموز کی وضاحت کے لیے حکایتیں اور مثالیں بھی لکھی گئی ہیں۔ معرفت اور اخلاقیات کے مسائل کے لحاظ سے یہ مثنوی ایک گنج گراں مایہ ہے۔ اس کا شمار تصوف کی ممتاز ترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ نظامی گنجوی نے اپنی کتاب "تحفۃ الاسرار" اور خاقانی نے "تحفۃ العراقین" کی تصنیف میں اسی کتاب سے استفادہ کیا ہے۔ "مثنوی معنوی" لکھتے وقت مولانائے روم کے پیش نظر بھی یہ مثنوی رہی ہے۔

سنائی نے مثنوی میں اصلاح حالات کے لیے نہایت مفید تعلیم دی ہے ذیل کے چند اشعار کردار کی فضیلت کے بیان میں ہیں۔

ابلہی دید اشتری بہ چرا — گفت نقشت ہمہ کژ است چرا
گفت اشتر کہ اندرین پیکار — عیب نقاش می کنی ہشدار
در کژی من مکن بہ عیب نگاہ — تو ز من راہ راست رفتن خواہ

عقل کام کرنے اور جدوجہد کرنے کے لیے ہے، نہ کہ شیخی بگھارنے کے لیے۔۔۔

تو بہ گفتار غرہ ای شب و روز — لیک معلوم تو نگشت امروز
بیش مشنو ز نیک و بد گفتار — آنچہ بشنیدہ ای بکار در آر
دانشت ہست کار بستن تو — خنجرت ہست صف شکستن تو
علم با کار سود مند بود — علم بی کار پای بند بود

عقل بہترین رہنما ہے۔ یہ ہمیں راہِ حق دکھاتی ہے اور برائیوں سے باز رکھتی ہے۔

ہر چہ در زیر چرخ نیک و بد اند — خوشہ چینان خرمن خرد اند

جسم را جان و بہرہ باری دہ | نفس را علم بخش و یاری دہ
عقل در راہ حق دلیل تو بس | عقل ہر جائیگہ خلیل تو بس
بادشاہی شود ز سایۂ عقل | آفتابی شود ز سایہ عقل

انسان بات کرے، تو عقل و شعور سے کرے۔ ورنہ خاموش رہے۔

نطق زیبا ز خامشی بہتر | ورنہ در جان فرامشی بہتر
در سخن دُرِ ببایدت سفتن | ورنہ گنگی بہ از سخن گفتن
گنگ اندر حدیث کم آواز | بہ کہ بسیار گوی بیہدہ ناز

سنائی نے رباعیاں اور قطعات بھی لکھے ہیں، ان سب کا موضوع بھی پند و موعظت ہے۔ ذیل کے قطعات میں لکھتے ہیں کہ موت کے بعد صرف ایک ہی ایسی چیز ہے، جس سے نام زندہ رہتا ہے اور وہ نیک نامی ہے۔

تو مانی و بد و نیکت چو زین عالم برون رفتی
نیاید با تو در خاکت نہ فغفوری نہ خاقانی
فسانہ خوب شو آخر چو می دانی کہ پیش از تو
فسانہ نیک و بد گشتند سامانی و ساسانی

ہم عصر شعرا حکیم سنائی کے ہم عصر شعرا مسعود سعد سلمان، عثمان مختاری، حسن غزنوی، معزی، انوری اور سوزنی ہیں۔

وفات سنائی نے طویل عمر پائی اور غزنی میں رحلت کی۔ آپ کے سال وفات کے متعلق تذکرہ نویسوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مولانا جامی نے "نفحات الانس" میں اور حمد اللہ مستوفی نے "تاریخ گزیدہ" میں ان کا سال وفات ۵۲۵ھ مطابق ۱۱۳۰ء بتایا ہے۔ لیکن یہ درست معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ انھوں نے اپنی مثنوی "طریق التحقیق" ۵۲۸ھ مطابق ۱۱۳۳ء میں مکمل کی تھی جیسا کہ

وہ خود لکھتے ہیں۔

"پانصد و بیست و ہشت و آخر سال　　بود کایں نظم نغز یافت کمال"

دولت شاہ سمرقندی نے ان کا سالِ وفات ۵۷۶ھ مطابق ۱۱۸۰ء بتایا ہے۔ ایران کے جدید محققین تقی کاشی اور بدیع الزماں[1] نے ان کا سالِ وفات ۵۴۵ھ مطابق ۱۱۵۰ء لکھا ہے۔ اور اس کو صحیح سمجھنا چاہیے۔

مسعود سعد سلمان ——
(پیدائش ۴۴۰ھ مطابق ۱۰۴۸ء)
(وفات ۵۱۵ھ مطابق ۱۱۲۱ء)

مسعود بن سعد بن سلمان غزنوی اور سلجوقی دور کا ایک مشہور شاعر ہے۔ اس کے آبا و اجداد کا وطن ہمدان ہے۔ مسعود کے والد سعد بن سلمان ہمدان چھوڑ کر لاہور آ گئے۔ مسعود یہیں ۴۴۰ھ مطابق ۱۰۴۸ء میں پیدا ہوا۔

مسعود کے باپ کا شمار مشہور علماء میں ہوتا تھا۔ چنانچہ علم و فضل کی بدولت دربارِ غزنویہ میں رسائی ہوئی۔ اور ساٹھ سال تک اسی دربار سے وابستہ رہا۔ جیسے کہ وہ خود لکھتا ہے۔

شصت سال تمام خدمت کرد　　پدر بندہ سعد بن سلمان
کہ بہ اطراف بودی از عمّال　　کہ بدرگاہ بودی از اعیان

درباری زندگی

اس عرصے میں مسعود کے والد کو خدمات کے صلے میں جاگیریں بھی عطا ہوئیں۔ مسعود آغاز جوانی میں ابراہیم بن مسعود غزنوی (۴۵۰ھ مطابق ۱۰۵۸ء تا ۴۹۲ھ مطابق ۱۰۹۸ء) کے دربار سے وابستہ ہوا اور سلطان ابراہیم اور اس کے بیٹے سیف الدولہ محمود کی مدح میں قصیدے کہتا رہا۔ ۴۶۹ھ مطابق ۱۰۷۶ء[2] میں جب سلطان ابراہیم نے ہندوستان کی

---

[1] سخن و سخنوران صفحہ ۲۷۵ جلد اوّل

حکومت اپنے بیٹے سیف الدولہ محمود کے سپرد کی تو مسعود بھی اس کے ساتھ ہندوستان آگیا اور لاہور میں اقامت اختیار کی۔ مسعود نے ایام جوانی کے بہترین قصیدے یہیں لاہور میں سیف الدولہ کی شان میں کہے ہیں۔

مسعود کو لاہور میں بڑی شان و شوکت حاصل تھی۔ اپنے اس محسن حکمران کی علم پروری کی وجہ سے اس نے جوانی کا ابتدائی حصہ بڑے امن و عافیت سے گزارا۔

قید و بند

اس کی یہ خوش حالی زیادہ دیر تک نہ رہ سکی۔ سلطان ابراہیم کو کسی نے یہ اطلاع دی کہ امیر محمود سلطان ملک شاہ سلجوقی کے ساتھ ساز باز کر رہا ہے اور وہ ہندوستان چھوڑ کر عراق جانے والا ہے چنانچہ امیر محمود کو مع اس کے مصاحبوں کے گرفتار کر لیا گیا۔ انہی میں مسعود سعد بھی تھا۔ مسعود، امیر محمود کی مصاحبت کی پاداش میں سات سال دہک اور سو کے قلعوں میں اور تین سال قلعہ نائ میں قید رہا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔

ہفت سالم بکوفت سو و دہک ‏ ‏ ‏ پس از آنم سہ سال قلعہ نای

قید و بند کے اس طویل عرصے میں مسعود نے نہایت پرسوز اور دردناک شعر کہے ہیں، جن کی مثال ملنی مشکل ہے۔

نظامی عروضی سمرقندی نے مسعود کے شعروں کا حوالہ دیا ہے جو اس نے سلطان ابراہیم کی خدمت میں اپنی بے گناہی ظاہر کرنے کے لیے لکھے تھے۔ یہ شعر حسب ذیل ہیں۔

در بند تو ای شاہ ملک شاہ باید ‏ ‏ ‏ تا بند تو پای تاجداری شاید

آنکس کہ ز پشت سعد سلمان آید ‏ ‏ ‏ گر زہر شود ملک ترا نگزاید

ان اشعار کا سلطان پر کچھ اثر نہ ہوا اور مسعود بدستور قید و بند کی سختیاں جھیلتا رہا۔ اسیری کے دوران مسعود نے پھر سلطان ابراہیم کی خدمت میں ذیل کا قصیدہ لکھ کر بھیجا۔

بزرگوار خدایا چو قرب دہ سال است ‏ ‏ ‏ کہ می بکاہد جان من از غم و تیمار

چرا ز دولت عالیٔ تو بہ چیسم روئی | کہ بندہ زادۂ ایں دولتم بہفت تبار
نہ سعد سلماں پنجاہ سال خدمت کرد | بدست کرد بسنج ایں ہمہ ضیاع و عقار
بمن سپرد و زمن بستدند فرعونان | شدہ بہ عجز دحضرت زخان و مان آوار
بحضرت آمدم انصاف خواہ وداد طلب | خبر نداشتم از حکم ایزد داد ار
ہمی ندانم خود را گناہی وجرمی | مگر سعایت وتلبیس دشمن مکار

ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ مسعود سعد کی اسیری محض حاسدوں اور دشمنوں کی بدگوئی اور دردانداز ی کا نتیجہ تھی۔

دس سال کی اسیری کے بعد سلطان ابراہیم نے اسے عمید الملک ابوالقاسم کی سفارش پر قید سے آزاد کردیا۔ بالآخر مسعود لاہور آگیا اور یہاں اپنی جاگیر کی غور و پرداخت میں مصروف ہوگیا۔

سلطان ابراہیم کی وفات پر مسعود بن ابراہیم نے غزنی کی حکومت سنبھالی۔ ۴۹۲ھ تا ۵۰۸ھ مطابق ۱۰۹۸ء تا ۱۱۱۴ء اس نے اپنے بیٹے امیر عضد الدولہ شیرزاد کو ہندوستان کی حکومت سپرد کی۔ اور ہندوستان کی فوج کا سپہ سالار قوام الملک نظام الدین بونصر پارسی کو مقرر کیا، جو علم و ادب کا شیدائی اور مسعود کے دوستوں میں سے تھا۔ اس کے توسط سے مسعود سعد کو جالندھر کا حاکم مقرر کردیا گیا۔ چنانچہ وہ خود لکھتا ہے

چون بہندوستان شدم ساکن | برضیاع و عقار پیر پدر
بندہ بونصر برگماشت مرا | بعمل ہم چو نائبان دگر

لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ بونصر شاہی عتاب کا شکار ہوا اور اس کی دوستی کی وجہ سے مسعود سعد کو گرفتار کرکے قلعہ مرنج میں ڈالا گیا۔ مسعود یہاں بھی آٹھ سال قید رہا، بالآخر ۵۰۰ھ مطابق ۱۱۰۶ء کے جو وہ زندان سے باہر آیا، تو بحکت

نحیف و ناتواں ہو گیا تھا، اور شاہی دربار کو رجوع کرنے کے بجائے اس نے گوشہ نشینی کو ترجیح دی۔ اور جیتے جی اس گوشے کو نہ چھوڑا۔ آخر ۷۰ سال کی عمر میں اس دارِ محن کو "خیرباد" کہہ گیا۔

حبسیات مسعود سعد سلمان کی مشہور تصنیف "حبسیات" ہے۔ جو اس کے اٹھارہ سالہ دورِ اسیری کی یادگار ہے۔ مسعود کو شعر و سخن میں جو اتنا بلند مقام حاصل ہوا، وہ "حبسیات" کی بدولت حاصل ہوا۔ مسعود کی یہ حبسیاتی شاعری رنج و الم کے سلسلۂ طویل کا نتیجہ ہے۔ اس میں وہ کراہیں اور آہیں سنائی دیتی ہیں، جو وہ دھک، سو اور نای و مرنج کے قلعوں کے تاریک گوشوں میں بھرتا رہا۔ تعجب ہوتا ہے کہ دردمند مسعود کے حزین اور دردناک شعروں نے سلطان کے سنگین دل پر کوئی اثر نہ کیا اور ایسا دانش مند شخص زندان کے تاریک گوشوں میں جاں کنی کی اذیت برداشت کرتا رہا۔

ایک حبسیہ میں ناامیدی اور بے چارگی کی کیفیت بیان کی ہے۔

تاکی دل خستہ در گمان بندم — جرمی اگر کنم بہ این و آن بندم
بدہا کہ بمن ہمی رسد از من — بر گردش چرخ و بر زمان بندم
افتادہ دخم چرا ہوس چندین — بر قامت سرو بوستان بندم
این سستی بخت پیر ہر ساعت — در قوت خاطر جوان بندم
چند از پی وصل در فراق افتم — دم از پی سود در زیان بندم
دین دیدۂ پرستارہ را ہر شب — تا روز ہمی بر آسمان بندم
در عجز دو گوش تا بپیدہ دم — در نعرہ و بانگ پاسبان بندم
چون اشک ز دیدہ بر دو رخ بارم — باران بہار در خزان بندم
خونی کہ ز سرخ لالہ بگشایم — اندر تن زار ناتوان بندم

ذیل کے اشعار میں مسعود نے اپنی بے گناہی اور زندان کی وحشت بیان کی ہے۔

از کردهٔ خویشتن پشیمانم　　جز توبه ره دگر نمی دانم
کارم همه بخت بد بپیچاند　　در کام زبان همی چه پیچانم
این چرخ بکار من نمی گردد　　بر خیره سخن همی چه گردانم
در دانش تیز هوش برجیسم　　در جنبش کند سیر کیوانم
گر خسته ز آفت لها وورم　　گر بسته به تهمت خراسانم
تا زاده ام ای شگفت محبوسم　　تا مرگ نگر که وقف زندانم
چون پیرهن عمل بپوشیدم　　بگرفت قضای بد گریبانم
بر مغز من ای سپهر هر ساعت　　چندین چه زنی که من نه سندانم
در خون چه کشی تنم نه ترو بینم　　در لعف چه بری دلم نه پیکانم
واللہ که چو گرگ یوسفم واللہ　　بر خیره همی نهند بهتانم
گر هرگز ذرهٔ کثری باشد　　در من نه ز پشت سعد سلمانم
در بند نه شخص روح می کاهم　　از دیده نه اشک مغزی رانم
بیهش نیم و چو بیهشان باشم　　صرعی نیم و بصرعیان مانم
چون سایه شدم ضعیف از محنت　　از سایهٔ خویشتن هراسانم
اندر زندان چه خویشتن بینم　　تنها گوئی که در بیابانم
گرماند جان بیاس بگذارم　　گر آتش دل به اشک بنشانم
تن سخت ضعیف و دل قوی بینم　　امید به لطف صنع یزدانم
از قصهٔ خویشتن اندکی گفتم　　گرچه سخن است بس فراوانم

ایام جوانی کی یاد میں لکھا ہے :-

دریغا جوانی و آن روزگار | که از رنج پیری دل آگه نبود
نشاط من از عیش کم تر نشد | امید من از عمر کوته نبود
ز سستی مرا آن پدید آمد ست | در این مه که هرگز در آن مه نبود
سبک خشک شد چشمه بخت من | مگر آب آن چشمه را ره نبود
در آن چاہم افگند گردون دون | که از ژرفی آن چاه را ته نبود
بسا شب که در حبس بر من گزشت | که پہنائی آن شب جز الکہ نبود
سیاہی سیاه و درازی دراز | که آنگه امید سحر گه نبود

مسعود کی حبسیات اس کے زہرہ گداز درد و الم کی داستان ہے، لیکن اتنا ستم اٹھانے کے بعد بھی کہیں نفرت اور حقارت کا اظہار نہیں کیا، وہ اِس دُنیا کو ایک تجربہ گاہ سمجھتا ہے۔ جہاں اگر خوشی ہے، تو رنج بھی ہے۔ اگر یہاں انسان کچھ کھوتا ہے، تو پاتا بھی ہے۔

گرم نعمتی بود کاکنون نماند | کنون دانشی ہست کان گه نبود

فہرست حال من ہمہ تاریخ وبند بود | از رنج ماند عبرت و از بند پند ماند
لیکن بشکر گویم کز طبع پاک من | چندین ہزار بیت بدیع بلند ماند

مسعود کے بعض قصائد اس کی ہمت عالی کے آئینہ دار ہیں۔

ہر بہ بیش خسان فرد نارم | که من از کبر سر دبر چمنم
منت ہیچ کس نخواہم از انک | بندہ کردگار ذوالمننم
گر ز خورشید روشنی خواہد | دیدگان را ز بیخ و بن بکنم

زندان کی مصیبتیں مسعود کی ہمت و حوصلہ کو پست نہیں کر سکیں، چنانچہ وہ تلقین کرتا ہے کہ مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہیے۔

از فلک تنگ دل مشو مسعود | گر فرادان ترا بیازارد

بد میندیش و سر چو سر برآرد
گر جہان بر سرت فرو آرد

خصوصیات

۱۔ مسعود کے فکر و خیال میں بہت جدت ہے۔ ہوا چلتی ہے اور بادل مینہ برساتا ہے، یہ روزمرہ کی باتیں ہیں، لیکن اس سے مسعود نے کتنا نیا مضمون پیدا کیا ہے۔

ای باد بروب راہ را یکسر
وی ابر ببار بر زمین گوہر

۲۔ مسعود نے کئی نئی ترکیبیں وضع کر کے مضامین اور معانی کو بلند کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کے شعر پیش کیے جاتے ہیں۔

ورزمانہ زگفت ہای من است
شعر ہامون نورد، کوہ گزار

قوت طبع من کند آسان
ہر چہ از باب شعر شد دیوار

نشود جز بمن کشادہ دری
کہ ضرورت بر آن زند مسمار

مسعود قصیدہ نگاروں کی صفِ اول میں ہے۔ اسے حال زار کے بیان کرنے اور اندوہگین زندگی کی تصویر کھینچنے میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ مسعود کی سخن وری کا سکہ تمام اہل قلم کے دلوں پر تھا، اور اس کے ہم عصر شعرا اس کی فضیلت کی وجہ سے اس کا بہت احترام کرتے تھے۔ حکیم سنائی ایسے صوفی صافی بزرگ نے مسعود کی وفات کے بعد اس کا دیوان مرتب کیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے دل میں مسعود کی کس درجہ قدر و منزلت تھی۔

ہم عصر شعراء

مسعود کے ہم عصر شعرا راشدی، معزی، سنائی، عثمان مختاری، محمد خطیب غزابی، ابوالفرج رونی اور عطا بن یعقوب تھے۔[۱]

وفات

بعض تذکرہ نویس اس کا سال وفات ۵۲۵ھ مطابق ۱۱۳۰ء اور بعض ۵۱۵ھ مطابق ۱۱۲۱ء لکھتے ہیں۔ مرزا محمد قزوینی کے نزدیک

۱؎ سخن و سخنوران مرتبہ بدیع الزمان۔ جلد اول صفحہ ۲۱۹

آخری سال وفات درست ہے۔

ابوالفرج بن مسعود رونی عہد

ابوالفرج بن مسعود رونی (وفات ۵۱۰ھ مطابق ۱۱۱۶ء)

غزنویہ کا نامور شاعر ہے۔ اس کا تعلق سلطان ابراہیم بن مسعود کے دربار سے تھا۔ سلطان ابراہیم اور اس کے بیٹے مسعود بن ابراہیم کی شان میں اس نے متعدد قصیدے کہے ہیں۔

محمد عوفی[1] لکھتے ہیں کہ ابوالفرج لاہور کے ایک قصبہ رُونہ کا رہنے والا تھا۔ یہ قصبہ سلطان ابراہیم غزنوی کے عہد میں علم و فضل کا مرکز تھا۔ امین احمد رازی نے تذکرہ ہفت اقلیم میں ابوالفرج کا ذکر شعرائے لاہور کے ضمن میں ہی کیا ہے۔ بعض تذکرہ نویس اسے خراسانی اور نیشاپوری بھی بتاتے ہیں، لیکن مرزا محمد قزوینی[2] اسے غزنوی بتاتے ہیں۔

رونی مسعود سعد سلمان کا ہم عصر تھا۔ قصیدہ گوئی میں اُسے ید طُولیٰ حاصل تھا۔ مسعود سعد اور انوری ایسے نامور شعرا اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ انوری ایک قصیدے میں لکھتا ہے۔

در متانت خیل اقبالت چو شعر بوالفرج

در عذوبت مشرب عیشت چو نظم فرخی

قصائد

رونی کے قصیدے بھی رودکی کے قصیدوں کی طرح تشبیب یا غزل سے شروع ہوتے ہیں۔ ایک قصیدے کی تشبیب حسب ذیل ہے۔

جشن فرخندۂ فروردین است	روز بازار گل و نسرین است
آب چون آتش عود افروز است	باد چون خاک عبیر آگین است

[1] تذکرہ لباب الالباب۔ مصححہ ایڈورڈ براؤن جلد دوم صفحہ ۲۴۱

[2] بحوالہ سخن و سخنوران حاشیہ صفحہ ۲۱۹ جلد دوم

باغ پیراستہ، گلزارِ بہشت — گلشن آراستہ حور العین است
بُرج ثور است، مگر شاخِ سمن — کہ گلشن را شبہ پروین است
در گلستان ز فروغِ لالہ — گوئی آتش کدہ برزین است
بچہ مانند بعرو سی عالم — کہ سبک درع و گران کابین است
بیشہ از سبزہ و از جوی و درخت — چون زمین گلی غزنین است

رونی بھی اگرچہ قصیدے کا آغاز تشبیب یا بہاریہ سے کرتا ہے لیکن وہ محض تقلید نہیں کرتا بلکہ نئے نئے مضمون پیدا کرتا ہے۔ مثلاً

نوروز جوان کرد بدل پیر و جوان را — ایام جوانی است زمین را و زمان را
ہر سال درین فصل برآید فلک از خاک — چون طبع جوانان جہان دوست جہان را
گر شاخ نوان بود ز بی برگی و بی برگ — از برگ نوا داد قضا شاخ نوان را
بگرفت شگوفہ بچمن بر گذر باغ — چونان کہ ستارہ گذر و کاہکشان را
آن غنچہ گل بین کہ ہمی ناند بر باد — از خندۂ در دیدہ فرو بستہ دہان را

دیوان رونی طبع ہو چکا ہے۔ یہ دیوان چار ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل ہے۔ رونی کی وفات چھٹی صدی ہجری کے آخر میں یا ساتویں صدی کے شروع میں ہوئی۔

رونی کے قصیدوں میں تاریخی اشارات بھی پائے جاتے ہیں، جن سے غزنوی تاجداروں کے کارناموں پر روشنی پڑتی ہے۔

رونی بھی بعض دوسرے اہلِ دانش کی طرح زمانے کی ناقدری کا شاکی رہا ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے۔

گردون ز برای ہر خردمند — صد شربت جانگزا در آمیخت
گیتی ز برای ہر جوانمرد — ہر زہر کہ داشت در قدح ریخت
بر اہل ہنر جفا کند چرخ — نتوان ز جفای چرخ بگریخت

سید حسن غزنوی (وفات ۵۵۶ھ مطابق ۱۱۶۰ء)

سید حسن غزنوی بن ناصر علوی نام

اور اشرف لقب تھا۔ اپنے زمانے کے مشہور واعظ تھے۔ آپ کا وعظ سننے کے لیے لوگ اکثر آپ کے گرد جمع رہتے۔ حسن شعر بھی کہتے تھے۔ چنانچہ بہرام شاہ بن مسعود غزنوی کی مدح میں اکثر قصائد کہے ہیں۔ دربار میں آپ کی بڑی قدر و منزلت تھی اس وجہ سے حاسد بھی پیدا ہو گئے، جنھوں نے آپ کے خلاف بہرام شاہ کے کان بھرنے شروع کیے۔ بالآخر سید حسن دربار کو خیرباد کہہ کر حج کو چلے گئے۔ واپسی پر بغداد ٹھہرے یہاں ملک غیاث الدین مسعود بن محمد نے، جو عراقی سلجوقیوں کا چوتھا بادشاہ تھا، اپنی مہربانیوں سے آپ کو نوازا۔

مجمع الفصحا کے مؤلف رضا قلی ہدایت لکھتے ہیں کہ آپ کا دیوان پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ انھوں نے سید حسن کا سال وفات ۵۰۶ھ مطابق ۱۱۱۲ء لکھا ہے۔ آپ کا ایک طویل قصیدہ ہے، جس میں بڑی بلاغت کے ساتھ خودستائی کی ہے۔ اس قصیدے کے چند شعر حسبِ ذیل ہیں۔

داند جہان کہ قرۂ عین پیمبرم　　　شائستہ میوۂ دل زہرا و حیدرم
دریا چو ابر بارد گر آب شد ز شرم　　　چون گشت روشنش کہ چہ پاکیزہ گوہرم
طبعم چو آتش تر و ہر دم خلیل وار　　　ہر خوش گلی دگر دمد از آتش ترم
دُری پر از عجائب دریا شود ز علم　　　ہر قطرۂ کہ در صدف جان پرورم
سہل است اگر بمنظر من ننگری ز آنک　　　منظور عالم ملکوتست مخبرم
بی نقش ہمچو آئینۂ آبی منقشم　　　بی عطر چون فرشتہ جانی معطرم

سلطان سنجر کی مدح میں بھی آپ نے ایک قصیدہ لکھا، جس کے چند شعر مندرجہ ذیل ہیں۔

جہان را شاخ فرخ پی چنین باید چنین باید　　　کہ خلق عالمی در سایہ عدلش بیاساید

خجستہ رای او از ملک راہ فتنہ بربندد　　مبارک دی او از خلق کار بستہ بکشاید

چو دریا طبع او ورادی کند اما غنی ماند　　چو گردون کار او گردش بود اما نفرساید

گہی بر صفحہ اقبال نقش خویش بنگارد　　گہی ز آئینہ انصاف زنگ ظلم بزداید

ملی را گر عطا باید عدو را گر خطا افتد　　خدا و خلق داند کاین ببخشد و آن ببخشاید

مختاری غزنوی (سال وفات ۵۴۴ھ یا ۵۴۵ھ مطابق ۱۱۴۹-۱۱۵۰ء)

عثمان مختاری غزنوی دور کا شاعر تھا۔ اس نے غزنوی بادشاہوں اور کرمان کے سلجوقی تاجداروں کی مدح میں متعدد قصیدے کہے ہیں۔ قصائد کے علاوہ ترجیع بند بھی لکھے ہیں۔ ایک مثنوی "شہریار" بھی اس کی یادگار ہے۔ یہ مثنوی فردوسی کے تتبع میں لکھی گئی ہے۔ عثمان مختاری کو طرح طرح کی تشبیہات لانے میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ اس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

شاخ مرصع شد از جواہر الوان　　شیخ تل یاقوت شد ز لالہ نعمان

ابر گہرہای گل بسفت ہمانا　　خوشۂ الماس گشت قطرہ باران

خوش ز نیلوفر و چمن ز گل سرخ　　کوہ نشاہ پور گشت و کان بدخشان

بود گل ناشگفتہ بر صفت دل　　باز چو بشگفت گشت بر صفت جان

باغ چو میدان آبگینہ شد از خوید　　برگ شگوفہ ز باد تخت سلیمان

انجیل آغاز کرد بلبل بر گل

چون زبنفشہ بدید حالت برہان

اس کا دیوان آٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔

عثمان مختاری کی وفات ۵۴۴ یا ۵۴۵ھ مطابق ۱۱۴۹-۱۱۵۰ء

انوری (وفات ۵۸۳ھ مطابق ۱۱۸۷ء)

اوحد الدین محمد انوری ابیورد کے

ایک گاؤں بدنہ میں پیدا ہوا۔ ابیورد دشت خاوران میں واقع ہے، اس لیے اسی دشت کی نسبت سے شروع شروع میں خاوری تخلص کیا۔ بعد میں بدل کر انوری رکھا۔

دولت شاہ سمرقندی[1] لکھتا ہے کہ انوری نے مدرسہ منصوریہ میں تعلیم حاصل کی۔ کہا جاتا ہے ایک دن مدرسے کے پاس سے ایک شخص زرق برق لباس پہنے گھوڑے پر سوار گزرا۔ اس کے پیچھے ملازم اور نوکر چاکر تھے۔ انوری نے پوچھا، یہ کون ہے، لوگوں نے بتایا کہ یہ شاعر ہے۔ انوری پکار اٹھا اللہ اللہ! علم و حکمت کا درجہ اتنا بلند ہے اور میں اس قدر محتاج اور بے کس ہوں۔ شاعری کا درجہ اس قدر پست ہے اور یہ شخص اتنا دولت مند ہے۔ میں آج سے عہد کرتا ہوں کہ علم و حکمت کو خیر باد کہہ کر شاعری شروع کروں گا۔

چنانچہ اسی رات اُس نے اپنا مشہور و معروف قصیدہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے۔

گر دل و دست بحر و کان باشد　　　دل و دست خدا یگان باشد

صبح یہ قصیدہ لے کر سلطان سنجر کے دربار میں حاضر ہوا۔ پڑھ کر سنایا۔ سُلطان بہت خوش ہوا۔ پوچھا، دولت چاہتے ہو یا دربار کی ملازمت؟ اُس نے فی البدیہہ شعر کہہ کر بادشاہ کے تقرّب کی خواہش ظاہر کی۔ اس پر سلطان سنجر نے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا اور اپنے ساتھ مرو لے گیا۔

انوری کی تعلیم اور اس کی شاعری کے آغاز کا یہی ذکر علامہ شبلی[2] نے بھی کیا ہے، لیکن یہ بات انھیں کھٹکتی ہے کہ اوّلیں کوشش میں اتنا استادانہ قصیدہ کہا اور صبح کو سلطان سنجر کے دربار میں تقرب حاصل ہو گیا۔ اس واقعہ کی تردید کرتے ہوئے وہ انوری کے اسی قصیدے کے دو شعر پیش کرتے ہیں۔

---

[1] تذکرۂ دولت شاہ صفحہ ۱۵　　[2] شعر العجم حصّہ اوّل صفحہ ۱۷۷

خسرو! بندہ را چو دہ سال است | کہ ہمی آرزوی آن باشد
کز ندیمان مجلس ار نہ شود | از مقیمان آستان باشد

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ سلطان سنجر کے دربار تک رسائی حاصل کرنے میں اسے دس سال کا طویل عرصہ انتظار کرنا پڑا۔ بہر حال اس میں کلام نہیں کہ انوری دربار سنجر میں رسائی حاصل کر کے ندیمانِ خاص میں داخل ہو گیا۔

۵۴۲ھ مطابق ۱۱۴۷ء میں جب کہ سلطان سنجر نے دوسری مرتبہ خوارزم پر حملہ کیا تاکہ اتسز کو اس کی بغاوت کی قرار واقعی سزا دے، تو اس وقت انوری بھی سلطان کی خدمت میں تھا۔ سلطان نے "ہزار اسپ" نام قلعے کا محاصرہ کیا، تو انوری نے ذیل کی رباعی کہی، جس کا مفصل ذکر رشید الدین وطواط کے سلسلے میں آچکا ہے۔

ای شاہ ہمہ ملک زمین حسب تراست | وز دولت اقبال جہان کسب تراست
امروز بیک حملہ "ہزار اسپ" بگیر | فردا خوارزم و صد ہزار اسپ تراست

شاعری کے علاوہ انوری کو ریاضی، فلسفہ، موسیقی اور علم ہیئت میں بھی دسترس حاصل تھی، چنانچہ وہ خود کہتا ہے۔

کمینہ چاکر علمت ہزار افلاطون | کہینہ بندۂ فضلت ہزار ما سکندر
ز شکل ہائے تو عاجز ہزار بطلیموس | ز حکم ہای تو قاصر ہزار بو معشر

منطق و موسیقی و ہیئت بدانم اندکی | راستی باید بگویم با نصیبی وافرم

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے احکام نجوم کبھی کبھی غلط بھی ہوتے تھے چنانچہ دولت شاہ[1] سمرقندی لکھتا ہے: "اتفاق سے سبعہ سیارہ برج میزان میں جمع ہوئے۔ تو انوری نے

---

[1] تذکرۃ الشعرا مطبوعہ شیخ مبارک علی۔ صفحہ ۵۲

پیش گوئی کی کہ اس زور سے طوفان آئے گا کہ عمارتیں تباہ وبرباد ہو جائیں گی۔ لوگوں کو اس پیش گوئی کا علم ہوا، تو سخت گھبرائے اور گھروں میں تہہ خانے کھود لیے۔ جب مقررہ وقت آیا، تو ان سرد خانوں میں گھس گئے۔ لیکن اس دن ہوا کا یہ عالم رہا کہ اگر کوئی شخص مرو کے مینار پر چراغ جلا کر رکھ دیتا تو وہ بھی نہ بجھتا۔ لوگوں نے انوری کا مضحکہ اڑانا شروع کیا۔ سلطان سنجر نے انوری کو بلایا اور سرزنش کی۔ اس شرم سے اس نے مرو کو خیرباد کہا اور بلخ کی راہ لی۔"

امین احمد رازی نے بھی تذکرہ ہفت اقلیم میں یہ حکایت نقل کی ہے۔ لطف علی آذر نے آتش کدہ میں اس واقعہ کی تائید کی ہے۔ لیکن مزید[1] تحقیق کی روشنی میں یہ واقعہ کچھ مشتبہ نظر آتا ہے۔ اس کی وجوہ حسب ذیل ہیں۔ حمد اللہ مستوفی نے تاریخ گزیدہ میں لکھا ہے کہ سبعہ سیارہ برج میزان میں ۵۸۱ھ مطابق ۱۱۸۵ء میں جمع ہوئے۔ اس کی عبارت حسب ذیل ہے:-

"در رجب سنہ احدی وثمانین وخمسمایہ ہفت کوکب سیارہ در سیم درجہ میزان بریک دقیقہ جمع شدند...... منجمان حکم کردند کہ در ربع مسکون اثر آبادانی نماند بلکہ کوہ ہا خراب شود و از زمین باد چند گز بردارد و طوفان باد باشد و غلو در این معنی انوری بیش می کرد۔"

ابن الاثیر نے کامل التواریخ میں لکھا ہے کہ سبعہ سیارہ برج میزان میں ۵۸۲ھ مطابق ۱۱۸۶ء میں جمع ہوئے۔

اگر سبعہ سیارہ برج میزان میں ۵۸۲ھ مطابق ۱۱۸۶ء میں ہی جمع ہوئے ہوں، تو گویا کہا جائے گا کہ یہ واقعہ سنجر کی وفات کے پورے تیس سال بعد رونما ہوا۔ پس یہ کیونکر ممکن ہوا کہ انوری کی پیشین گوئی کے غلط ہونے پر سلطان سنجر نے اسے بلایا اور سرزنش کی۔

---

[1] دیکھیے تنقید بر شعر العجم مؤلفہ حافظ محمود شیرانی۔ صفحہ ۹۸-۱۰۶

۱۔ دولت شاہ سمرقندی نے انوری کی وفات کا سال ۵۴۷ھ مطابق ۱۱۵۲ء لکھا ہے چنانچہ یہ کیسے ممکن ہے کہ جو واقعہ انوری کی وفات کے چونتیس یا پینتیس سال بعد رونما ہوا ہو اس کے متعلق انوری کو ایک غلط پیشین گوئی کرکے زندگی میں شرمندگی اٹھانی پڑی

آدکارہ و مطالب | انوری کا شمار ایران کے درجہ اول کے قصیدہ نگاروں میں ہوتا ہے اسی لیے اہل ایران اس کا نام فردوسی اور سعدی کے ساتھ لیتے ہیں۔

در شعر سہ تن پیمبرانند — ہر چند کہ لا نبی بعدی

ابیات و قصیدہ و غزل را — فردوسی و انوری و سعدی

ظاہر ہے کہ انوری سے پہلے بھی عنصری، فرخی ایسے نامور قصیدہ نگار استاد موجود تھے جنھوں نے اپنی فصاحت و بلاغت سے قصائد کی بنیادیں کافی اوپر اٹھائیں، لیکن انوری کے زمانے تک مضامین کے لحاظ سے قصائد میں وسعت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ انوری نے فلسفہ حکمت، ریاضی اور علم ہیئت کے نکات کو شعروں کے پیکر میں سمو کر قصائد میں وسعت پیدا کر دی۔ اب قصیدہ محض ممدوح کی تعریف و توصیف تک محدود نہ رہا۔ بلکہ مختلف علمی مسائل کے اظہار کا وسیلہ بھی بن گیا۔ انوری کے بعض موضوعات کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

بے نیازی اور آزادروی :- انوری نے انسان کو بے نیازی اور آزادمنشی کی ذیل کے شعر میں تلقین کی ہے۔

آزادی ست حلقۂ مردان و انوری — آن دست گاہ کو کہ من آزاد مردمے

قناعت کی تلقین :-

کیمیائی ترا کنم تعلیم — کہ در اکسیر و رضاعت نیست

رو قناعت گزین کہ در عالم — کیمیای بہ از قناعت نیست

رنج و راحت کی بے ثباتی کا اشعار ذیل میں ذکر کیا ہے؟

در حدود ری یکی دیوانہ بود — روز و شب کردی بسوی دشت گشت

در تموز و در بہار و در خزاں — سوئے بازار آمدی از سوی دشت

۱۔ تذکرۃ الشعراء صفحہ ۵۰۳ مطبوعہ شیخ مبارک علی

گفتی ای آنانکه عیش آماده اید ‏ ‏ ‏ ‏ ہر زمانی زیر این زرینه طشت
قاقم و سنجاب در ہر ماه سه چار ‏ ‏ ‏ ‏ توزی و کتان بگرما ہفت و ہشت
گر شمارا بانوائی بد چه شد ‏ ‏ ‏ ‏ ور چه مارا بی نوائی بد چه شد
راحت ہستی و رنج نیستی ‏ ‏ ‏ ‏ بر شما بگذشت و بر ما ہم گذشت

سوال و طمع کی ذلت به اشعار ذیل واضح کی ہے

بودن اندر عذاب چون جرجیس
یا شدن در جحیم چون ابلیس

بهتر است از سوال کردن و طمع
وا ایستادن به پیش مرد خسیس

علم کی بے قدری کی نہایت پُرزور الفاظ میں شکایت کی ہے ۔

ای خواجه مکن، تا بتوانی طلب علم ‏ ‏ ‏ ‏ تا در طلب راتب ہر روزه بمانی
رو مسخرگی پیشه کن و مطربی آموز ‏ ‏ ‏ ‏ تا داد خود از کهتر و مهتر بستانی
فرعون و عذاب ابد و ریش مرصع ‏ ‏ ‏ ‏ موسیٰ کلیم اللہ و چوبی و شبانی

انوری نے جاہ و منزلت کی بڑی بڑی آرزوں کے ساتھ شعر و شاعری کا آغاز کیا تھا، لیکن آخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ شاعری محض بیکار پیشہ ہے۔ یہاں تک کہ شاعروں کو حلال خوروں سے بھی بدتر بتایا ہے۔ چنانچہ اسی خیال کو ذیل کے اشعار میں پیش کیا ہے۔

ای برادر بشنوی رمزی ز شعر و شاعری
تا ز ما مشتی گدا کس را بمردم نشمری

زانکه گر حاجت فتد تا فضلهٔ را کم کند
ناقلی باید، تو نتوانی که خود بیرون بری

کار خالد کی بہ جعفر می شود ہرگز تمام
آن یکی جولاہگی داند دگر بندر می گری

باز گر شاعر نباشد، ہیچ نقصان نافتد
در نظام عالم از روئی خرد گر بنگری

آدمی را چون مؤنث شرطِ کار شرکت است
نان ز کناسی خوری بہ زان بود کز شاعری

حکما ان طبقہ کی مردم ناشناسی کو ذیل کی تمثیل میں پیش کیا ہے۔

روبہی می دوید در غمِ جان　　روبہی دیگرش بدید چنان
گفت خیر است، باز گوی خبر!　　گفت خرگیری کند سلطان
گفت تو خر نہ ای چہ می ترسی　　گفت آری ولیک آدمیان
می ندانند و فرق می نہ کنند　　خر و روباہ شان بود یکسان

کسی لالچ سے خدا کو یاد کیا جائے تو وہ بے اثر ہے۔

حکایتی است بفضل استماع فرمائید　　بشرطِ آنکہ نگیرید ازین سخن آزار
بروزگار ملک شاہ اعرابی حج رو　　مگر بہ بارگہش رفت از قضا یکبار
سوال کرد کہ امسال عزمِ حج دارم　　مرا اگر بدہد بادشاہ صد دینار
چو حلقۂ درِ کعبہ گیرم از سر صدق　　برای دولت و عمرش دعا کنم بسیار
چو بادشہ بشنید این سخن بخازن گفت　　کہ آنچہ خواست عرابی بدو چنین آر
برفت خازن و آورد و پیش شہ بنہاد　　بلطف گفت شہ او را کہ سیدی بردار
سپاس دار و بدان کاین دویست دینار است　　صد است زادِ ترا، دگر ای دیا افزار
صدِ دگر ز خموشانہ می دہم رشوت　　نہ بہر من نہ برای خدای را زنہار
کہ چون بکعبہ رسی ہیچ یاد من نکنی　　کہ از وکیل مزور تباہ گردد کار

سفر سے انسان کو طرح طرح کے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ سفر کے فوائد بیان کرتے ہوئے انوری نے استدلال سے بھی کام لیا ہے ؎

سفر مربی مرد است و آشیانۂ جاہ | سفر خزانۂ مال است و اوستاد ہنر
فدآن زمین کہ تو در چشم خلق خار شدی | سبک سفر کن از آنجا برو بجای دگر
درخت اگر متحرک شدی ز جای بجای | نہ جور ارہ کشیدی و نہ جفای تبر
بشہر خویش درون بی خطر بود مردم | بکان خویش درون بی بہا بود گوہر
بجرم خاک و فلک در نگاہ باید کرد | کہ این کجاست ز آرام و آن کجا ز سفر

خصوصیات

انوری ایران کے بزرگ ترین قصیدہ نگاروں میں ہے۔ اس نے قصیدے میں ابوالفرج رونی کا انداز اختیار کیا ہے۔ جیسے کہ وہ خود لکھتا ہے ؎

باد معلومش کہ من خادم بشعر بوالفرج | تا بدیدستم ولوعی داشتستم بس تمام

انوری کا ایک معرکۃ آرا قصیدہ ہے جس کا مطلع حسب ذیل ہے

باز این چہ جوانی و جمال است جہان را
وین حال کہ نو گشت زمین را و زمان را

۱۔ فصاحت و بلاغت :۔ انوری کے فکر میں توانائی اور طبیعت میں بلا کی روانی ہے۔

اس کے قصیدوں میں فصاحت و بلاغت تشبیہ و استعارہ، ترتیب الفاظ، پختگی اور دقت معنی کا کمال نظر آتا ہے۔ ذیل کی تشبیہیں ان خصوصیات کی حامل ہیں۔

باغ سرمایۂ دگر دارد | کان شد از بس کہ سیم و زر دارد
ہیچ طفلی رسیدہ نیست طلرو | کہ نہ پیرایۂ دگر دارد
می نماید کہ از رسیدن عید | چون دگر مردمان خبر دارد

طبع برکار گاه شاخ نگر — که چه دیبای شوشتر دارد
گل رعنا بباد نرگس مست — جام زرین بدست بردارد
گه زبیجاده تاج دارد گل — زیبه شش ملک تاجور دارد

روز عیش و طرب بستان است — روز بازار گل و ریحان است
توده خاک عبیر آمیز است — دامن باد عبیر افشان است
در ملاقات صبا روی غدیر — راست چون آژده سوهان است
لاله بر شاخ زمرد بمثل — قدحی از شبه مرجان است
تاک شیدرست صهبا خنجر بید — همه گلزار پر از پیکان است

٢- مبالغہ ۔ غلو و اغراق قصیدے کا حسن سمجھا جاتا تھا۔ انوری اس صنعت میں بھی یکتائے روزگار معلوم ہوتا ہے۔ فیروز شاہ والی بلخ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے جس کے چند اشعار کا مفہوم نثر میں پیش کیا جاتا ہے۔

زمین تو زمین آسمان کے سیارے بھی اس کے تابع فرمان ہیں۔ وہ اگر منحوس ستارے کو روک دے، تو دنیا اس کے ضرر سے بھی محفوظ رہ سکتی ہے۔ کوئی دوسرا بادشاہ اس کے سامنے دم نہیں مار سکتا۔ بڑے سے بڑا بادشاہ اپنی بھلائی اسی میں دیکھتا ہے۔ کہ چپ چاپ اپنا ملک اس کے حوالے کر دے۔ اس کے سامنے تمام دنیا کے بادشاہ محض شطرنج کے مہروں کی طرح ہیں۔ جو شخص اس کے ساتھ لڑائی کرتے ہوئے لرزہ براندام ہوتا ہے، اُسے حضرتِ عیسیٰؑ کی مسیحا نفسی بھی نہیں بچا سکتی۔ اگر کہیں اس کی تلوار کی ضرب پہاڑ پر پڑے، تو اس کے آتش جوہر کا یہ اثر ہو کہ کان میں قیمتی نگینوں کی بجائے شعلے اور شرارے بھڑک اٹھیں۔ فیروز شاہ کو اتنی قدرت حاصل ہے کہ وہ چاہے تو فطرت کے آئین کو بھی بدل دے۔

٣- سلاست : صنائع و بدائع اور اغراق کے باوجود انوری کے کلام میں سلاست

اور روانی بھی ہے۔ ذیل میں ایک قصیدے کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں جو اس نے پہلی مرتبہ سلطان سنجر کی مدح میں کہا ہے۔

گر دل و دست بحر و کان باشد — دل و دست خدایگان باشد
شاہ سنجر کہ کمترین خدمش — صد جہان پادشاہ نشان باشد
من نگویم کہ جز خدای کسی — حال گردان و غیب دان باشد
دلت رازہا کند پیدا — کہ ز تقدیر در نہان باشد
رای تو فتنہ ہا کند پیدا — کہ چو اندیشہ بیکران باشد
در جہانی و از جہان بیشی — ہمچو معنی کہ در بیان باشد

۴۔ جذبات و احساسات۔ انوری کہیں رنج و اندوہ کی کیفیت بیان کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے واردات قلب پیش کر رہا ہے۔

۵۴۸ھ مطابق ۱۱۵۳ء میں جب "حادثہ غز" رونما ہوا اور غزوں کو سلطان سنجر کے مقابلے میں فتح ہوئی، تو انھوں نے مرو کا رخ کیا، جو سلجوقی عہد کی ابتدا سے ملک کا دارالسلطنت چلا آتا تھا۔ مرو میں دولت کی انتہا نہ تھی۔ شاہی خزانے اسی شہر میں تھے۔ غز تین دن تک شہر میں لوٹ مار کرتے رہے۔ قتل و غارت اور خون ریزی وسیع پیمانے پر ہوئی۔ ایک مرو پر موقوف نہیں سارے خراسان میں انھوں نے قیامت صغریٰ بپا کی۔ نیشاپور کی یہ کیفیت تھی کہ یہاں انھوں نے پناہ گاہوں میں گھس گھس کر بچوں، عورتوں اور نوجوانوں کا قتل عام کیا۔ یہاں کی مشہور "مسجد مطرز" کو نذر آتش کر دیا۔ اور ستم یہ کہ آگ کے شعلوں کی روشنی میں رات بھر شہر کو لوٹتے رہے۔ غز ملک کے چاروں طرف پھیل کر اپنی بربریت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ لوگ ان کے خوف سے جنگلوں، پہاڑوں اور کنوؤں میں چھپتے پھرتے تھے۔ اہل خراسان نے محمد بن سلیمان شہزادہ سمرقند سے مدد حاصل کرنی چاہی اور انوری نے استدعا کی کہ سفارت کا مضمون تیار کرے۔ چنانچہ انوری نے "اشک ہای خراسان" کے نام سے اہل خراسان کا فریادنا

تیار کیا جس کے حرف حرف سے شہیدوں کا خون ٹپکتا نظر آتا ہے۔ یہ نظم عبرت، حسرت و مظلومی کے اعتبار سے ایک بے مثال نظم ہے۔ غالباً اسی نظم کی وجہ سے انوری کا شمار ایران کے پیغمبرانِ سخن میں ہوا ہے۔ تمہید کے اشعار حسب ذیل ہیں۔

برسمرقند اگر بگذری ای بادِ سحر
نامۂ اہلِ خراسان ببر خاقان بر

نامۂ مطلع آں رنج تن آفت جان
نامۂ مقطع آن درد دل و سوز جگر

نامۂ بر رقمش آہ عزیزان پیدا
نامۂ در شکنش خون شہیدان مضمر

نقش تحریرش از سینۂ مظلومان خشک
سطر عنوانش از دیدہ محرومان تر

ریش گردد ممر صوت از و گاہ سماع
خون شود مردمک دیدہ ازو وقت نظر

اس کے بعد انوری شہزادے کو خطاب کر کے کہتا ہے ؎

تاکنون حال خراسان و رعایا بودہ است
بر خداوند جہان خاقان پوشیدہ مگر

ای کیومرث بقا، پادشہ کسریٰ عدل
ای منوچہر لقا، خسرو افریدون فر

قصہ اہل خراسان بشنو از سر لطف
چون شنیدی ز سر رحم در ایشان بنگر

این دل افگار جگر سوختگان می گویند
ای دل و دولت و دین را ز تو شادی و ظفر

خبرت نیست کزین زیر و زبر شوم غزان
نیست یک تن ز خراسان کہ نشد زیر و زبر

بر بزرگان زمانہ شدہ خردان سالار
بر کریمان جہان گشتہ لئیمان مہتر

بر درِ دونان احرار حزین و حیران

در کف رندان ابرار اسیر و مضطر

شاد الا بدرِ مرگ نہ بینی مردم

بکر جز در شکم مام نیابی دختر

مسجد جامع ہر شہر ستوران شان را

پایگاہیست کہ نہ سقفش پیداست نہ در

نکند خطبہ بہر شہر بنام غز از انک

در خراسان نہ خطیب است کنون نی منبر

کشتہ فرزند گرامی را اگر ناگاہان

بیند از بیم خروشید نیارد مادر

یہ کیفیت حال بیان کر کے انوری خاقان سمرقند سے یوں امداد طلب ہوتا ہے۔

بخدای کہ بپا ماست نبامت دینار

بخدای کہ بہ بیغراخت لبفرت افسر

کہ کنی فارغ و آسودہ دل خلق خدای

زین فرومایہ غز شوم پی غارت گر

وقت آن است کہ یابند زمحت پاداش

گاہ آن است کہ گیرند ز تیغت کیفر

اس قصیدے میں نہ صنائع بدائع کی بھرمار ہے نہ الفاظ و تراکیب پر ہی زور طبع صرف کیا گیا ہے اور نہ تشبیہات و استعارات ہی کی کثرت ہے۔ ایک قومی ابتلا کو نہایت درد بھرے اور سادہ الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ہجو گوئی انوری کو ہجو گوئی میں کمال حاصل تھا۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ اگر ہجو گوئی شریعت

ہوتی، تو انوری اس کا پیغمبر ہوتا۔ انوری کی ہجوؤں میں بھی اچھوتے اور نادر مضامین پائے جاتے ہیں۔ اس نے اپنے حریفوں کی جو ہجویں لکھی ہیں، اس قدر عریاں، اور فحش ہیں، کہ ان کا یہاں دہرانا بھی مذاق سلیم پر گراں گزرے گا۔ حریف تو حریف، انوری کی ہجوؤں کے تیروں سے اس کے عزیز و اقارب بھی محفوظ نہ تھے۔ انوری کے دیوان میں چند ہجویں اس کی بیوی اور بیٹے کی بھی پائی جاتی ہے۔ اپنے گھوڑے کی بھی ایک ہجو لکھی ہے جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

برعادت از وثاق بصحرا برون شدم

بایک دو آشنا ہم از ابنائی روزگار

اسپی چنان کہ دانی زیر از میانہ زیر

دز کاہلی کہ بود نہ سسکک نہ رہوار

در خفت و خیستر ماند ہمہ راہ عیدگاہ

من گاہ از پیادہ و گاہی بر او سوار

نہ از غبار خاستہ بیرون شدی بزور

نہ از زمین خستہ برانگیختی غبار

گہ طعنہ از این کہ رکابش دراز کن

گہ بذلہ از ان کہ عنانش فرد گزار

من وا لہ و خجل متحیر فرو شدہ

چشمی سوی ممانیم و گوشی سوی سیار

کہا جاتا ہے کہ انوری کی ہجو گوئی سے لوگ سخت پریشان تھے اور اس سے انتقام لینے کی غرض سے خود ہجویں لکھ کر انوری کے نام سے مشہور کر دیتے تھے۔ اور خمیازہ انوری کو بھگتنا پڑتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب وہ بلخ آیا، تو یہاں سے ایک شاعر فتوحی[1] نے بلخ کی ہجو لکھ کر انوری

---

[1] مجمع الفصحا مؤلفہ رضا قلی ہدایت، ذکر فتوحی مروزی

کے نام منسوب کردی۔ بلخ کے لوگ سخت برہم ہوئے۔ ممکن تھا کہ وہ دست اندازی بھی کرتے انوری کو اس بے جا تہمت اور لوگوں کی برہمی کی وجہ سے سخت رنج تھا، چنانچہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے ایک نظم لکھی، جس کا عنوان "سوگند نامہ" ہے۔ اس نظم سے لوگوں کا جوش کچھ ٹھنڈا ہوا۔ یہ نظم انوری کی بہترین نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

ای مسلمانان فغان زین دور چرخ چنبری
وز نفاق تیر و قصد ماه و کید مشتری

کار آب مانع اندر مشرب من آتش است
شغل خاک ساکن اندر سکنهٔ من صرصری

آسمان در کشتی عمرم کند دائم دو کار
گاه شادی بادبانی، وقت اندوه لنگری

گر بخندم وان بهر عمریست گوید "زهر خند"
ور بگریم کان بهر روزیست گوید "خوش گری"

بر سر من مغفری کردی کله وان بهر گزشت
بگزرد بر طیلسانم نیز دور معجری

از ستم های فلک چندان که گوئی گنج هست
واثقم زیرا که با من هم بدین گنبد دری

گر بگرداند به پهلو هفت کشور مر ترا
یک دم از حیرت نه گوید کز کدامین کشوری

خیره خیرم کرد صاحب تهمتا هجو بلخ
تا همی گوینده کافر نعمت آمد انوری

قبۃ الاسلام را ہجو ای مسلمان کہ گفت
حاش اللہ باللہ ار گوید جہود خیبری

آسمان را طفل بودی بلخ کردی دایگیش
ملکہ داند کرد معمور جہان را مادری

با چنیں ارکان کہ گر از قدر شان عقدی کشند
فارغ آید چرخ اعظم از چہ از بی زیوری

ہجو گویم بلخ را ہیہات یارب زینہار
خود توان گفتن کہ زنگارست زر جعفری

انوری کے ممدوحین

انوری کے ممدوحین حسب ذیل سلاطین تھے۔

(۱) معزالدین سنجر بن ملک شاہ ۵۱۱ تا ۵۵۲ ھ مطابق ۱۱۱۷-۱۱۵۷ء

(۲) علاء الدین ملک الجبال حسین بن حسین سلطان غوریہ ۵۴۵ تا ۵۵۶ ھ مطابق ۱۱۵۰-۱۱۶۰ء

(۳) انوری کا ایک عزیز ممدوح مجدالدین ابوالحسن عمرانی بھی تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابوالحسن کی فیاضی نے اس کے دل پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ انوری نے اس کی شان میں بہت زوردار قصیدے کہے ہیں۔ جب وہ زیرِ عتاب آتا ہے اور زندان میں بھیج دیا جاتا ہے۔ تو انوری اس کی ڈھارس بندھاتا ہے، اور اس کے احسانات کا اشعار میں ذکر کرتا ہے۔ آخر ابوالحسن قتل کر دیا جاتا ہے، اور انوری اپنے اشعار میں اس کا ماتم کرتا ہے۔ ذیل کے دو شعر اس کے قلبی جذبات کے آئینہ دار ہیں۔

بس دور کہ چرخ داختران بگذارند — تا مردہ دشتے چو بوالحسن باز آرند
گو حیدر ہاشمی و گو حاتم طے — تا ماتم مردمی و مردی دارند

انوری کے ہم عصر شعراء

انوری کے ہم عصر شعراء سنائی، سوزنی، ادیب صابر، رشید الدین وطواط، معزی، فتوحی، محمود بن علی سمائی اور

عمق بخارائی تھے۔ جن کے قصائد کے جواب میں انوری قصیدے لکھتا تھا اور بعض کے کلام کا مضحکہ اڑانے کے لیے ہجویں بھی کہتا تھا۔

انوری اور یورپ انوری کے علم و فضل کی وجہ سے اہل یورپ نے بھی اس کے کلام پر توجہ دی۔ روس کے پروفیسر والنٹن ژکوسکی نے ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۳ء میں انوری کے کلام اور اس کے سوانح حیات پر ایک مختصر سی کتاب "میٹریلس فار اے بائیوگرافی اینڈ کیرکٹرسٹک سکیچ" لکھی ہے۔ جس سے مستشرقین انوری کے حالات لکھتے ہوئے عموماً استفادہ کرتے ہیں۔

سال وفات انوری کی تاریخ وفات کے سلسلے میں تذکرہ نویسوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ "تقویم التواریخ" کے مولف حاجی خلیفہ اور تذکرۃ الشعراء کے مؤلف نے انوری کا سال وفات ۵۴۵ھ مطابق ۱۱۵۰ء بیان کیا ہے۔ ایران کے جدید تذکرہ نویس رضا زادہ شفق[1] نے اس کا سال وفات ۵۸۶ھ مطابق ۱۱۹۱ء لکھا ہے لیکن اس کے لیے کوئی سند نہیں پیش کی۔ غالباً انھیں یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ سبعہ سیارہ کا قران جو ۵۸۱ھ مطابق ۱۱۸۵ء میں ہوا، وہ انوری کی زندگی ہی میں ہوا، جس کی بنا پر اس نے باد و باران کے طوفان کی پیشین گوئی کی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پیشین گوئی غلط ثابت ہونے کے بعد بھی انوری چند سال زندہ رہا۔ غالباً اسی غلط فہمی کی بنا پر شفق نے اس کا سال وفات ۵۸۷ھ مطابق ۱۱۹۱ء لکھا ہے۔ جو قدیم تذکرہ نویسوں کے بیان کے پیش نظر درست معلوم نہیں ہوتا۔

سنجر کے عہد کی نثر

سنجر کے عہد میں نظم کے علاوہ نثر نے بھی بہت ترقی کی۔ نثر کی کتابوں میں حدائق السحر،

---

[1] تاریخ ادبیات ایران صفحہ ۱۸۲

چہار مقالہ، ذخیرہ خوارزم شاہی، مقامات حمیدی اور کلیلہ دمنہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

حدائق السحر

"حدائق السحر فی دقائق الشعر" صنائع شعری پر ایک قدیم تالیف ہے۔ اس کا مؤلف رشید الدین وطواط ہے۔ حدائق السحر بڑی بلیغ نثر میں لکھی گئی ہے۔ شاعرانہ صنعتوں کی وضاحت کرنے کے لیے نظم و نثر کی مثالیں بھی دی گئی ہیں۔ وطواط نے یہ کتاب اتسز خوارزم شاہ (۵۲۱ - ۵۵۱ ہجری) مطابق ۱۱۲۶ - ۱۱۵۶ء) کے حکم سے لکھی تھی۔

چہار مقالہ

"چہار مقالہ" غوری عہد کی مشہور ترین کتاب ہے، اس کا مؤلف نظامی عروضی سمرقندی ہے۔ یہ غوری خاندان کے ایک شہزادہ ابوالحسن حسام الدین علی کے نام سے منسوب ہے اور اس کا سنِ تالیف ۵۵۱ - ۵۵۲ ہجری مطابق ۱۱۵۶ - ۱۱۵۷ء ہے۔

اس کتاب کا اصل نام "مجمع النوادر" ہے۔ لیکن چار مقالوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے یہ "چہار مقالہ" کے نام سے مشہور ہے۔

مؤلف کا خیال ہے کہ ایک بادشاہ کو اپنی داخلی اور خارجی زندگی کے لیے مشیروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان مشیروں میں دبیر، شاعر، طبیب اور منجم خاص طور سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ نظامی عروضی ان چار قسم کے مشیروں کے اوصاف . . . پر بحث کرتا ہے۔ آغاز کتاب، پانچ فصلوں پر مشتمل ہے، جن میں علم الٰہیات اور علم طبیعیات کا ذکر ہے۔ اس کے بعد چار مقالے درج کیے ہیں جن کا مختصر حال ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

پہلے مقالے کا موضوع دبیری ہے۔ اس کی تمہید میں کامیاب دبیر کے اوصاف بتائے ہیں اور حکومت کے کاروبار میں اس کی اہمیت واضح کی ہے۔ اس کے بعد مشہور دبیروں کے متعلق دس حکایتیں بیان کی ہیں جن سے دبیری کے کمالِ فن پر روشنی پڑتی ہے۔

دوسرا مقالہ علم شعر اور صلاحیت شاعر پر ہے۔ آغاز میں شعر و شاعری اور صلاحیت شاعر پر مختصر سی بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جس طرح ہر علم میں شعر و شاعری سے کام لیا جا سکتا ہے اسی طرح ہر علم شعر کے دامن میں سما سکتا ہے۔ یعنی اس کے نزدیک شاعری محض قصیدہ گوئی یا حسن و عشق

کی باتوں پر مشتمل نہیں بلکہ شعر کی چاشنی دے کر ہر علم کو موثر بنایا جا سکتا ہے۔ نیز یہ بھی کہ شاعری کا دامن اتنا وسیع ہونا چاہیے کہ مختلف علوم اس کے ذریعے بیان کیے جا سکیں۔ غالباً مشرقی تنقید کا یہ اولین نظریۂ شعر ہے جس نے شعرا کو پہلی مرتبہ اس بات پر متوجہ کیا کہ وہ مختلف علوم کو شاعری کا موضوع بنائیں۔

اس بحث کے بعد شاعر اور فنِ شعر سے متعلق دس حکایات بیان کی ہیں۔ تاریخی اور تنقیدی لحاظ سے یہ مقالہ بڑی اہمیت رکھتا ہے اس میں متعدد قدیم شعرا کے حالات ملتے ہیں جو سامانی، غزنوی، دیلمی، سلجوقی اور غزنوی حکمرانوں کے ہم عصر تھے یا ان کے درباروں سے وابستہ تھے۔ ان میں رودکی، عنصری، فرخی اور فردوسی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

اس مقالے کی پہلی حکایت بہت فکر انگیز ہے۔ اس میں نظامی نے احمد بن عبداللہ الخجستانی کا حال لکھا ہے جو شروع شروع میں گدھوں کا کاروبار کیا کرتا تھا۔ آخر وہ اپنی فراست اور مردانگی سے اس قابل ہوا کہ بڑھ کر خراسان کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لے۔

لوگوں نے اس کی کامیابی کے اسباب معلوم کرنے چاہے تو اس نے جواب دیا میری ترقی کا سبب حنظلہ بادغیسی کے دو شعر ہیں۔

مهتری گر بکام شیر در است   شو خطر کن ز کام شیر بجوی
یا بزرگی و عز و نعمت و جاه   یا چو مردانت مرگ رویاروی

یعنی سرداری اگر شیر کے منہ میں بھی ہو تو جاؤ خطرے کا مقابلہ کرو اور شیر کے منہ سے اسے حاصل کرو۔ اس طرح یا تو تمہیں بزرگی، عزت، نعمت اور جاہ و منزلت میسر آئے گی یا جوانمردوں کی طرح موت کا سامنا کرو گے۔

اس مقالے کی نویں حکایت میں ابوالقاسم فردوسی کے سوانحِ حیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نظامی نے لکھا ہے کہ فردوسی اپنے آبائی گاؤں باژ میں، جو علاقہ طوس میں ہے، فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ یہاں اس نے پچیس سال کی عرق ریزی سے شاہنامہ مرتب کیا۔

نظامی نے یہ بھی لکھا ہے کہ حالات کی مجبوری کی وجہ سے جب فردوسی شاہنامہ لے کر دربار

غزنی پہنچا تو یہ سات جلدوں پر مشتمل تھا۔گویا چہار مقالہ کی رُو سے ،جو تاریخ و تحقیق کا ایک قدیم ماخذ سمجھا جاتا ہے ، یہ افسانوی روایت غلط ثابت ہوتی ہے کہ "شاہنامہ دربار غزنی میں محمود غزنوی کی فرمائش پر لکھا گیا تھا اور یہ کہ محمود نے فردوسی کو ایک اشرفی فی شعر دینے کا وعدہ کیا تھا۔" البتہ اس مایوسی کا ذکر نظامی نے ضرور کیا ہے جو انعام کی توقع پوری نہ ہونے پر فردوسی کو ہوئی ۔

تیسرا مقالہ علم ہیئت پر ہے ۔اس میں علم نجوم کی مختصر سی بحث کے بعد دس حکایات درج کی گئی ہیں جن میں علمائے نجوم کے علم و فضل پر روشنی پڑتی ہے ۔ان میں یعقوب اسحٰق الکندی، ابوریحان البیرونی ،حکیم موصلی ،اور عمر خیام کے حالات تاریخی اور علمی اعتبار سے بہت اہم ہیں ۔عمر خیام کے متعلق جو معلومات ہمیں حاصل ہوئی ہیں ان کا ماخذ نظامی کے دوسرے مقالے کی حکایات ہی ہیں ۔اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف خود خیام کا ہم عصر تھا اور خیام سے ملاقات کے بھی اسے موقعے ملتے رہتے بلکہ وہ لکھتا ہے کہ "خیام کو مجھ پر استادی کا حق بھی تھا۔" تذکرہ نویسوں نے ان حالات کو مستند سمجھا ہے اور ان سے استفادہ بھی کیا ہے ۔

چوتھا مقالہ علم طب پر ہے ۔اس کی تمہید علم طب کی ماہیت پر مشتمل ہے تمہید کے بعد دس حکایت بیان کی گئی ہیں جن میں مشہور طبیبوں کے طریق علاج کا ذکر ہے جو وہ نفسیاتی طور پر کیا کرتے تھے ۔اس سلسلے میں خواجہ امام ابوبکر دقاق ، بُخت یشوع طبیب بغداد ، بوعلی سینا اور حکیم محمد زکریا کے حالات خاص طور سے بہت اہمیت رکھتے ہیں ۔

چہار مقالہ تاریخ ادبیات کا قدیم ترین ماخذ ہے

چہار مقالہ اگرچہ ایک مختصر سا رسالہ ہے ،لیکن ادبی اور تاریخی اہمیت کے پیش نظر یہ ادبیات ایران کا قدیم ترین ماخذ ہے ۔سب سے پہلا شخص نورالدین محمد عوفی ہے ،جس نے اپنے تذکرہ لباب الالباب (مولفہ ۶۱۷ ہجری مطابق ۱۲۲۰ء) کی تالیف میں چہار مقالہ سے استفادہ کیا ۔عوفی کے بعد حمداللہ مستوفی نے "تاریخ گزیدہ" (۷۳۰ ہجری مطابق ۱۳۲۹ء) کی تالیف میں اس سے مدد لی ۔ دولت شاہ سمرقندی نے اپنے "تذکرۃ الشعراء"

(۸۹۲ ہجری مطابق ۱۴۸۶ء) میں چہار مقالہ کے اقتباسات شامل کیے۔ امین احمد رازی نے ۱۰۰۲ ہجری مطابق ۱۵۹۳ء میں تذکرہ ہفت اقلیم لکھا، اور اس نے بھی چہار مقالہ کے بیانات کو پیش نظر رکھا۔ ایران کے موجودہ تذکرہ نویس رضازادہ شفق، سلیم نیساری، بدیع الزمان، ذبیح اللہ صفا اور مشہور مستشرق پروفیسر براؤن نے بھی جگہ جگہ چہار مقالہ کے حوالے دیے ہیں۔ علامہ شبلی نے شعر العجم میں چہار مقالہ کے بیانات کو سند کے طور پر پیش کیا ہے۔

چہار مقالہ اس لیے بھی تاریخ ادبیات کا بہترین ماخذ سمجھا جاتا ہے کہ یہ سلجوقی دور کی تالیف ہے، جو نظم و نثر کا اہم ترین دور ہے۔ اس زمانے کے بعض شعراء کے ساتھ مؤلف کے دوستانہ مراسم تھے، بعض کی شاگردی کا اسے شرف حاصل تھا۔ بعض کے متعلق اس نے خود بہت کچھ سنا، اس لیے اس کے بیانات نسبتاً زیادہ مستند ہیں۔

اندازِ نگارش جیسے کہ پہلے ذکر آچکا ہے چہار مقالہ چھٹی صدی کے وسط کی تالیف ہے لیکن اس کا انداز پانچویں صدی کی کتابوں مثلاً قابوس نامہ، سیاست نامہ اور تاریخ بیہقی کا سا ہے۔ اس میں بھی وہی سادگی، سلاست، روانی اور اختصار پایا جاتا ہے، جو پانچویں صدی کی نثر کی خصوصیت ہے۔ چھٹی صدی کی نثر میں مترادف الفاظ کی بہتات اور صنعت سجع کی بھرمار نظر آتی ہے جس سے چہار مقالہ خالی ہے۔ معلوم ہوتا ہے نظامی عروضی نے پانچویں صدی ہجری کی نثر میں اس کتاب کو لکھنے کا اہتمام کیا۔ اس لحاظ سے چہار مقالہ کو متقدمین کی ادبی کتابوں کا خاتم سمجھنا چاہیے۔

الفاظ و لغات کے اعتبار سے چہار مقالہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ آغاز کتاب ہے جس کی چار فصلیں ہیں۔ ان میں الٰہیات و طبعیات کا ذکر ہے۔ ان علوم کے بیان میں مؤلف کو علم الٰہی، فلسفہ، طبیعات اور ہیئت کی اصطلاحات استعمال کرنی پڑیں۔ اور عربی الفاظ کا استعمال بھی ناگزیر ہوا۔ لیکن اس کے باوجود مؤلف نے متقدمین کا اسلوب نہیں چھوڑا۔

دوسرا حصہ مقالات کا متن ہے۔ متن کی نثر سادہ، سلیس، رواں اور قدرتی ہے۔ اس

میں چھٹی صدی کی نثر کا کہیں رنگ نظر نہیں آتا۔ کہیں صنعت مقابلہ، صنعت سجع یا استعارہ و کنایہ آیا ہے، تو اس میں بھی سلاست و سادگی کا حسن نمایاں ہے۔

نمونے کی غرض سے ایک حکایت کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

فرخی از سیستان بود، پسر جولوغ، غلام امیر خلف بانو، طبعی بغایت نیکو داشت و شعر خوش گفتی و چنگ تر زدی۔ خدمت دهقانی کردی از دهاقین سیستان و این دهقان او را هر سال دویست کیل پنج منی غله دادی و صد درم سیم نوحی، او را تمام بودی۔ اما زنی خواست هم از موالی خلف۔ خرجش بیشتر افتاد۔ فرخی بی برگ ماند۔ فرخی قصه بدهقان برداشت که مرا خرج بیشتر شده است چه شود که دهقان، از آن جا که کرم اوست، غله من سی صد کیل کند و سیم صد و پنجاه درم، تا مگر با خراج من برابر شود۔ دهقان بر پشت قصه توقیع کرد که این قدر از تو دریغ نیست و افزون ازین را روی نیست۔ فرخی چون بشنید مایوس گشت و از صادر و وارد استخبار می کرد که در اطراف و اکناف عالم نشان ممدوحی شنود تا روی بدو آرد۔ تا خبر کردند او را از امیر ابوالمظفر چغانی به چغانیان که این نوع را تربیت کند قصیده ای بگفت و عزیمت آن جانب کرد

”باکاروان حله برفتم ز سیستان۔ با حله تنیده ز دل بافته ز جان“

چون به حضرت چغانیان رسید بهارگاه بود و امیر به داغ گاه ۔ ۔ ۔ ۔ عمید اسعد که کدخدای امیر بود در نزلی راست می کرد تا در پی امیر برد۔ فرخی بنزدیک او رفت و او را قصیده ای خواند و شعر امیر بر وی عرضه کرد۔ خواجه عمید اسعد مردی فاضل بود و شاعر دوست۔ شعر فرخی را شعری دید تر و عذب، خوش و استادانه، فرخی را سگزی دید بی اندام۔ جبه ای پیش و پس چاک پوشیده، دستار سگزی وار در سر و پای و کفش بس ناخوش و شعری در آسمان هفتم۔ هیچ باور نکرد که این شعر آن سگزی را شاید بود۔ بر سبیل امتحان گفت۔ ”امیر به داغ گاه است و من می روم پیش او و ترا با خود ببرم بداغ گاه، که داغ گاه عظیم خوش جای است۔ جهانی در جهانی سبزه بینی۔ پر خیمه و چراغ چون ستاره۔ از هر یکی آواز رود می آید و حریفان در هم نشسته و شراب همی نوشند و عشرت همی کنند و بدرگاه امیر آتشی افروخته

چند کوہی ورگان داغ ہمی کنند و پادشاہ شراب در دست و کمند در دست دیگر شراب می خورد و اسپ می بخشد۔ قصیدہ ای گوی کہ لائق وقت و صفت داغ گاہ کن۔ تا ترا پیش امیر برم فرخی آن شب برفت و قصیدہ ای پرداخت سخت نیکو و بامداد در پیش خواجہ عمید اسعد آورد۔

فرخی کا یہ قصیدہ ذیل کے مطلع سے شروع ہوتا ہے

چوں پرند نیلگوں بر روی پوشد مرغزار
پرنیان ہفت رنگ اندر سر آرد کوہسار

بعض تاریخی خامیاں

چہار مقالہ مفید ماخذ ہونے کے باوجود تاریخی عیوب سے پاک نہیں کہیں کہیں حافظے کی لغزشیں ہوئی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بعض تاریخی شخصیتوں کے نام اور واقعات کے سنین غلط ہو گئے ہیں۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں[1]۔

۱۔ اسکافی کو نوح بن منصور بن نوح بن نصر بن احمد سامانی کا دبیر فرض کیا ہے[2]۔ حالانکہ اسکافی اس کے جد امجد یعنی نوح بن نصر کا دبیر تھا اور نوح بن منصور کی تخت نشینی سے قریباً بیس سال پہلے وفات پا چکا تھا۔

۲۔ حکومت غزنویہ کے موسس البتگین کو نوح بن منصور کا معاصر سمجھا ہے[3] لیکن وہ پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔

۳۔ نظامی نے لکھا ہے کہ سبکتگین نے سیمجوریوں کے ساتھ مل کر خراسان پر لشکر کشی کی اور البتگین سے لڑائی لڑی[4]۔ لیکن البتگین اس واقعے سے کئی سال پہلے فوت ہو چکا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سبکتگین نے سیمجوریوں کے خلاف لشکر کشی کی تھی نہ یہ کہ سبکتگین نے سیمجوریوں سے اتحاد کیا۔ یہ واقع تاریخ کے مشہور وقائع میں سے ہے۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے "چہار مقالہ" مرتب محمد قزوینی
[2] چہار مقالہ مرتبہ محمد قزوینی با توضیح نکات ادبی محمد معین صفحہ ۲۲ - ۲۳
[3][4] ۔ چہار مقالہ صفحہ ۲۳ -

۴- سامانیوں کے مشہور سردار ابوعلی احمد بن محتاج چغانی کو نوح بن منصور کا معاصر قرار دیا ہے[1].
وہ تو اس کی تخت نشینی سے تقریباً بائیس سال پیشتر دنیا سے رخصت ہو چکا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ
نوح بن منصور کی حکومت کا زمانہ اس نے دیکھا بھی نہ تھا۔

۵- ابوعلی بن محتاج کو خراسان پر سبکتگین کی لشکر کشی میں معاصر سمجھا گیا ہے۔ حالانکہ وہ انتالیس
سال پہلے رحلت کر چکا تھا۔

۶- ماکان بن کاکی کو نوح بن منصور بن نوح بن نصر بن احمد سامانی کا معاصر قرار دیا ہے[2] در اصل
وہ اس کے باپ کے دادا نصر بن احمد کا ہم عصر تھا اور اس کی تخت نشینی سے ۳۹ سال پیشتر وفات
پا چکا تھا۔

۷- سامانیوں کے اس لشکر کا سردار جو ماکان بن کاکی کے خلاف صف آرا ہوا اور اسے تہ تیغ
کیا۔ در اصل ابوعلی ابن محتاج چغانی تھا نہ کہ تاش سپہ سالار جیسا کہ چہار مقالہ میں درج ہے۔[3]

۸- حسن بن سہل کو اس کے بھائی فضل بن سہل کی بجائے سمجھ لیا ہے اور حسن بن سہل کو ذوالریاستین
کے لقب سے خطاب کیا ہے[4] حالانکہ یہ لقب (ذوالریاستین) اس کے بھائی فضل بن سہل کا ہے۔
بوران خانم مامون الرشید کو فضل بن سہل کی بیٹی قرار دیا ہے[5] حقیقت میں وہ حسن بن سہل کی بیٹی تھی۔

۹- سلطان مسعود سلجوقی کا سلطان سنجر سے اشتباہ ہوا ہے اور المسترشد باللہ کا قصد جنگ
سلطان سنجر کے خلاف سمجھا گیا ہے[6] حالانکہ باتفاق مورخین المسترشد باللہ کا یہ قصد جنگ سلطان مسعود
سلجوقی کے خلاف تھا نہ کہ سلطان سنجر کے خلاف۔

---

[1] چہار مقالہ صفحہ ۲۳

[2]، [3] چہار مقالہ مرتبہ محمد معین صفحات ۲۷-۲۵

[4]، [5] چہار مقالہ صفحہ ۳۲

[6] چہار مقالہ صفحہ ۳۷

۱۰۔ ماوراءالنہر کے خان بادشاہوں میں سے ایک خان کو اسی سلسلے کے بغراخان سے ملا دیا ہے اور بغراخان کو سلطان محمود غزنوی کا معاصر قرار دیا ہے[1] حالانکہ وہ ایلک خان کا ہم عصر تھا۔

۱۱۔ یعقوب بن اسحٰق الکندی عرب کا معروف فلسفی تھا۔ وہ اور اس کے آباؤاجداد بنی امیہ اور بنی عباس کے خلفا کے مسلمان مامورین میں سے تھے۔ اس کا دادا اشعث بن قیس حضور پاک سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے تھا۔ اس یعقوب کو یہودی جان لیا گیا ہے[2]، جو بنیادی طور پر غلط ہے۔

۱۲۔ نظام الملک طوسی کے واقعہ قتل کو بغداد میں ظاہر کیا ہے[3] حالانکہ مورخین کی رائے کے مطابق وہ مقام نہاوند تھا، جہاں باطنی فرقے کے ایک شخص نے انھیں جام شہادت پلایا۔

۱۳۔ محمد بن زکریا رازی معروف طبیب کو منصور بن نوح سامانی کا ہم عصر قرار دیا ہے[4] جو منصور کی تخت نشینی سے ۳۰ سال پہلے فوت ہو چکا تھا

۱۴، ۱۵۔ علاءالدولہ کاکویہ کو شمس الدولہ ابن فخرالدولہ دیلمی کی بجائے سمجھ لیا ہے اور شیخ ابوعلی سینا کو علاءالدولہ کا وزیر فرض کیا ہے[5]۔ حالانکہ وہ شمس الدولہ کا وزیر تھا۔ شیخ کی وزارت ری، ہمدان میں تھی نہ کہ ری میں جیسا کہ چہار مقالہ میں لکھا گیا ہے[6]۔

ان اغلاط کے باوجود کتاب کی افادیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ ہر مقالے کی حکایات صرف اس کے مفہوم کو ذہن نشین کرنے کے لیے لکھی گئی ہیں جو مثالوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مثال بالکل فرضی بھی ہو سکتی ہے۔

ذخیرہ خوارزمشاہی | علم طب پر یہ ایک مفید کتاب ہے، جو زین الدین ابوابراہیم اسمٰعیل

۱؎ چہار مقالہ صفحہ ۳۷

۲؎ چہار مقالہ صفحہ ۸۸

۳؎ چہار مقالہ صفحہ ۹۰

۴؎ چہار مقالہ صفحات ۱۱۲ - ۱۱۳

۵؎، ۶؎ چہار مقالہ صفحات ۱۱۹ - ۱۲۱

جرجانی کی تالیف ہے اور التسز کے والد قطب الدین خوارزمشاہ کے نام منسوب ہے۔ اس میں بوعلی سینا کے طبی نظریات آسان فارسی میں پیش کیے گئے ہیں تاکہ ایک عامی بھی اس سے فائدہ اٹھا سکے۔

مقامات حمیدی[1]

"مقامات حمیدی" کا مؤلف قاضی حمید الدین ابوبکر بلخی ہے جو بلخ کا قاضی القضاۃ تھا۔ عربی کی مشہور کتاب "مقامات بدیعی" کے طرز پر لکھی گئی ہے جس کا مولف بدیع الزمان ہمدانی ہے۔ اس موضوع پر عرب کی ایک کتاب "مقامات حریری" ہے جو صنائع سے بھرپور ہے۔ "مقامات حمیدی" دیکھتے ہوئے غالباً قاضی حمید الدین کے پیش نظر کتاب "مقامات حریری" بھی تھی، کیونکہ صنائع کے اعتبار سے دونوں کا اسلوب ایک سا ہے۔

"مقامات حمیدی" چھٹی صدی ہجری کی تالیف ہے۔ اس سے فارسی نثر کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ "مقامات حمیدی" میں نثر کی سادگی کی جگہ تکلف اور تصنع نے لے لی ہے۔ صنعت مقابلہ، صنعت ایہام، صنعت تجنیس، صنعت سجع اور تشبیہیں اور استعارے بکثرت استعمال ہوئے ہیں۔ اسی اسلوب کو بعد کے ادیبوں نے اپنایا ہے۔ نمونے کے طور پر ذیل کی سطور پیش کی جاتی ہیں:

"ہمہ با شادی و نشاط پیوستی، و بر بساط نشاط نشستہ، نا قوس دارنہ در بند آہنگ خود لبودند، و طاؤس وار نہ عاشق رنگ خود، نہ چوں شیر و پلنگ در خروش و عربدہ و ساموس، و نہ چون تذرو طاؤس در بند رنگ و ناموس۔"

بعض مقامات مناظروں کی صورت میں لکھے گئے ہیں، مثلاً شباب و شیب، و طبیب و نجومی۔

---

[1] (صفحہ ۱۳) ایران میں "مقام" آہنگ موسیقی کو بھی کہتے ہیں۔ فقرا کے سوال کرنے کا ایک یہ طریقہ بھی تھا کہ وہ صنعت سجع میں خوش الحانی کے ساتھ اظہار مطلب کر کے دست سوال دراز کرتے تھے۔ درویش لوگ پند و نصائح کے لیے بھی یہی طریقہ اختیار کرتے تھے۔ مجلس آرائی کے لیے پند و نصیحت یا قصے کہانیوں کو سر تال کے ساتھ پڑھنے کو بھی مقام خوانی کہتے ہیں چنانچہ انہی صوتی اثرات کو پیش نظر رکھ کر یہ مقامات لکھے گئے ہیں۔

وغیرہ۔ بعض مقامات مضمون اور پہیلیوں پر مشتمل ہیں۔ بعض بیانیہ ہیں، مثلاً بہار، خزاں، محبت، دیوانگی وغیرہ۔ دو بیانیہ مقامات بلخ اور سمرقند پر بھی لکھے ہیں۔ ان میں بعض تاریخی اور جغرافیائی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں، لیکن ایسے مقامات میں بھی حمیدالدین نے اپنا اسلوب خاص نہیں چھوڑا۔

مقاماتِ حمیدی کو اگرچہ "مقامات بدیعی" اور "مقاماتِ حریری" کا سا بلند مرتبہ تو حاصل نہیں، لیکن اہلِ ایران کے نزدیک "مقاماتِ حمیدی" کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ انوری نے اپنے اشعار میں اس کی بہت تعریف کی ہے۔ انوری کا ایک مشہور قصیدہ ذیل کے مطلع سے شروع ہوتا ہے۔

ای مسلمانان فغان از جورِ چرخ چنبری

وز نفاق تیر و قصد ماہ و کید مشتری

اس قصیدے میں دو شعر حمیدالدین سے متعلق ہیں جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔

گو حمیدالدین اگر خواہی کہ و قتی در دو لفظ

مطلقاً ہر چ آن حمید است از صفتہا بشمری

ور زمانِ او ہنر شگفت اگر قیمت گرفت

گوہر است آری ہنر او بادشاہ گوہری

قاضی حمیدالدین نے ۵۵۹ھ مطابق ۱۱۶۳ء میں وفات پائی۔

تاریخِ بخارا

تاریخ بخارا سامانی دور کی ایک تالیف ہے جو عربی زبان میں ابوبکر محمد بن جعفر النرشخی نے لکھی تھی اور امیر حمید ابو محمد نوح بن نصر سامانی کے نام منسوب کی تھی۔ ابو نصر احمد بن محمد بن نصر القبادی نے ۵۲۲ھ مطابق ۱۱۲۸ء میں قبا اور بخارا کے لوگوں کی خواہش پر اس کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ اس میں جو جو باتیں مترجم نے نامناسب سمجھیں، انھیں حذف کر دیا۔ مترجم نے ابو عبداللہ محمد بن احمد بخاری کی تاریخ بخارا سے استفادہ کر کے بعض حالات اس میں اضافہ بھی کیے ہیں۔ یہ کتاب چھٹی صدی ہجری کے اوائل میں تالیف ہوئی۔

تاریخ بخارا میں خاندان سامانی کے حکمرانوں اور ماوراءالنہر کے خانیہ تاجداروں کے حالات لکھے گئے ہیں۔ بخارا عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں علم و فضل کا بہت بڑا مرکز رہا تھا چنانچہ یہاں کی علمی اور ادبی ترقیوں کی تفصیل بتائی گئی ہے۔

نمونے کے طور پر ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس میں جوی مولیان[1] کا مختصر حال بتایا گیا ہے۔

[2] "سرای پادشاہان بہ جوی مولیان بودہ است کہ بہتر از مقام نفیس بہشت آئین، جوی مولیان در بخارا جای و منزلی نبودہ است، چراکہ ہمہ جای او سراہا و باغ ہا و چمن ہا و بوستان ہا و آب ہای معان علی الدوام در مرغزارہای او درہم پیچیدہ از میان ہم دیگر بکوی ہای گزشتہ اند و ہزار جانب بطرف مرغزارہا و بہ گلزارہا می رفتہ اند و ہر کسی کہ تماشای آب ہای روان می کرد۔ در حیرت می شد کہ از کجا می آید و بکجا می رود۔ و استادان نادرالعصر و معماران چناں طرح کشیدہ اند و صاحب دولتی گفتہ۔

آب حیوان بچمن آمد و با شیون رفت — نالہ ہا کرد کہ می باید ازین گلشن رفت

تاریخ بخارا کو پہلی مرتبہ مشہور فرانسیسی مستشرق شارل شعفر نے طبع کرایا۔ بعد میں مدرس رضوی خراسانی نے اسے تہران میں شائع کرایا۔

کلیلہ و دمنہ سلجوقی عہد کی مشہور ترین کتاب "کلیلہ و دمنہ" ہے جس کا مولف ابوالمعالی حمیدالدین نصر اللہ بن محمد بن عبدالحمید الغزنوی[3] ہے۔

---

[1] یہ وہی جوی مولیاں ہے جس کا ذکر رودکی نے ذیل کے شعر میں کیا ہے۔

بوی جوی مولیاں آید ہمی — یاد یار مہربان آید ہمی

[2] تاریخ بخارا صفحہ ۳۲

[3] بعض تذکروں میں نصر اللہ کو شیرازی لکھا گیا ہے اور بعض میں اسے غزنوی ظاہر کیا گیا ہے۔ ملک الشعرا بہار مولف سبک شناسی اسے شیرازی سمجھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ بہرام شاہ غزنوی اور اس کے باپ مسعود غزنوی کے عہد میں شیراز کے کچھ گھرانے خراسان سے اٹھ کر غزنی آ گئے تھے۔ انہی میں ابونصر فارسی بھی تھا۔ کچھ تعجب نہیں کہ ابوالمعالی نصر اللہ بھی انہی لوگوں میں ہو جنھوں نے دربار غزنویہ میں اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ اس کا شیرازی ہونا اس لحاظ سے بھی درست معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کا انداز نگارش اہل غزنہ کا نہیں بلکہ اہل ایران کا سا ہے۔

ابوالمعالی بہرام شاہ کے زمانے میں (۵۱۲ تا ۵۴۷ ھجری مطابق ۱۱۱۸-۱۱۵۲ء) دربار غزنی سے وابستہ ہوا۔ اور علم و فضل کی بدولت دربار میں شہرت حاصل کی۔ خسرو ملک تاج الدولہ غزنوی کے عہد میں (۵۵۵ تا ۵۸۲ ھجری مطابق ۱۱۶۰-۱۱۸۶ء) وہ وزارت کے منصب جلیلہ پر بھی فائز ہوا لیکن نورالدین عوفی لکھتا ہے کہ اسی عہد میں حاسدوں نے ابوالمعالی کے خلاف خسرو ملک کے کان بھرے، جس سے متاثر ہو کر خسرو نے اسے زندان میں بھیج دیا۔ زندان سے ابوالمعالی نے ذیل کی رباعی لکھ کر تاجدار کی خدمت میں بھیجی۔

ای شاہ مکن آنچہ بپرسند از تو   روزی کہ تو دانی کہ نترسند از تو
خرسندہ ای بملک و دولت ز خدای   من چون باشم بحبس خرسند از تو

ابوالمعالی کی اسیری کے دن ختم ہونے کو آئے تھے کہ دشمنوں کو پھر اس کے خلاف کچھ کہنے سننے کا موقع ملا اور خسرو ملک کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اسے ہلاک کر دیا جائے۔ دشمنوں کے ارادوں کا اسے بھی علم ہو گیا چنانچہ اپنی موت سے پہلے اس نے ذیل کی رباعی کہی

از مسند عز اگرچہ ناگہ رفتیم   حمد اللہ را کہ با آگہ رفتیم
رفتند و شدند و نیز آیند و شوند   ما نیز تو گفتہ علی اللہ رفتیم

جیسا کہ "کلیلہ و دمنہ" کے مقدمہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اصل کتاب سنسکرت میں لکھی گئی تھی اور ہندوستانی راجاؤں کے خزانوں میں جہاں اور گراں بہا چیزیں تھیں، وہاں یہ کتاب بھی رکھی گئی تھی۔

کلیلہ و دمنہ کی تصنیف کا اصل سبب ۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے ایک قدیم راجا کے بیٹے تعلیم سے سخت گریزاں تھے۔ انھیں تعلیم دلانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی، لیکن ان کا دل تعلیم میں نہیں لگتا تھا۔ بالآخر اس زمانے کے ایک مشہور ادیب نے یہ دعوی کیا کہ وہ راجکماروں کو تعلیم دے سکے گا چنانچہ اس نے ایک ایسی کتاب لکھی جس میں تمام سیاسی اور معاشرتی مسائل باتوں ہی باتوں میں زیر بحث آ گئے ہیں۔ راجکماروں نے اس کتاب کو بڑے شوق اور دلچسپی سے پڑھا اور انھیں تعلیم دلانے کا مقصد اسی کتاب سے پورا ہو گیا۔ اس کتاب کا نام "پنچ تنتر" یا کرتکا دمنگا" ہے۔ اور

اس کا مصنف وشنو شرما ہے۔

نوشیروان عادل کے زمانے میں جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، اس کا ایک طبیب برزویہ بادشاہ کے حکم سے، اس کتاب کی ایک نقل ہندوستان سے لایا اور پہلوی زبان میں اس کا ترجمہ کیا۔ پھر برزویہ کی درخواست پر حکیم بزرجمہر نے "باب برزویہ" کے نام سے ایک باب لکھ کر اس میں شامل کیا۔

"کرتکا و دمنگا" کا جب پہلوی میں ترجمہ ہوا، تو یہ کتاب "کلیک و دمنک" کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس کے بعد "کلیلہ دمنہ" کے نام سے ابن المقفع نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا۔ سامانی دور میں رودکی نے نصر بن احمد سامانی کے لیے اسے فارسی نظم میں ترجمہ کیا۔ پھر سلطان بہرام شاہ غزنوی کے عہد میں ابو المعالی نے نثر میں اس کا ترجمہ کر کے بہرام شاہ کے نام سے منسوب کیا۔ یہ کتاب ۵۳۸ تا ۵۳۹ ہجری مطابق ۱۱۴۳ء تا ۱۱۴۴ء میں لکھی گئی۔ اس کے مؤلف ابو المعالی نے ۵۵۵ھ مطابق ۱۱۶۰ء کے لگ بھگ وفات پائی۔

ابو المعالی کی کلیلہ دمنہ کو پھر ملا حسین واعظ کاشفی نے نویں صدی ہجری میں اپنے مخصوص انداز میں ڈھال کر پیش کیا۔ "انوار سہیلی" کا نام دے کر اسے امیر شیخ احمد سہیلی کے نام منسوب کیا۔ بالآخر اسی کتاب کو ابو الفضل نے ہندوستان کے بادشاہ جلال الدین محمد اکبر کے حکم سے "عیار دانش" کے نام سے اپنے اسلوب خاص میں لکھا۔

علم و ادب کی دنیا میں کوئی ایسی کتاب نظر نہیں آتی، جو دنیا کی متمدن زبانوں میں ترجمہ ہونے کے علاوہ ایک ہی زبان میں کئی مختلف صورتوں میں لکھی گئی ہو۔ یہ کتاب بادشاہوں کی مونس، علما کی منظور نظر اور عوام کی انیس و رہنما رہی ہے اور آٹھ سو سال کا طویل عرصہ گزرنے کے بعد آج بھی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔

اندازِ نگارش - اس تاریخ میں اتنی گنجائش نہیں کہ ابو المعالی کے اندازِ نگارش کا پورا پورا تجزیہ کیا جائے۔ لیکن سرسری سا جائزہ لینے پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کلیلہ دمنہ میں خارجی حسن

پیدا کرنے کے لیے صنائع بدائع کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں۔ شاعرانہ صنائع مثلاً طباق، اطناب، مراعاۃ النظیر، اضداد، جمع وتفریق، سیاقت الاعداد، تنسیق الصفات، مجاز مرسل، تشبیہ، استعارہ اور طرد العکس، قافیہ اور سجع کلیلہ و دمنہ کے صفحوں پر جا بجا نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ صنائع کچھ اتنی مہارت سے استعمال کی گئی ہیں کہ نہ عبارت کی موزونی میں فرق آتا ہے، نہ معانی ہی میں کوئی الجھن پیدا ہوتی ہے۔ نمونے کی غرض سے صنائع کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

صنعت مراعاۃ النظیر و جمع اضداد

"دریغا عمر کہ عنان کشادہ برفت واز وی جز تجربت و ممارست عوضی نماند کہ وقت پیری پائمردی و دست گیری تواند بود۔"[1]

"از آب خشکی جستن واز آتش سردی طلبیدن، صغرائی است کہ نتیجہ آن سودای محترق باشد"[2]

"خام طمعی اورا برانگیخت تا نان ردباہ پختہ شد"[3]

کنایات و استعارات

"چندانکہ سیمرغ سحرگاہی برافق مشرق پروازی کرد و بال نور گستر خود را بر اطراف بپوشانید"[4] یہ طلوع خورشید کا کنایہ ہے۔

"بادشاہ کامگار آن باشد کہ براق ہمتش اوج کیوان را بسپرد و شہاب صولتش دیو فتنہ را بسوزد"[5]۔ براق ہمت، شہاب صولت اور دیو فتنہ استعارے ہیں۔

تشبیہات

"روی چون تہمت اسلام در دل کافر، و زلف چون خیال شرک در دل مومن۔"[6]

"ہر زخم کہ زند چون برق بی حجاب باشد و چون قضا بی خطا رود۔"[7]

---

[1] صفحہ ۷۶ [2] صفحہ ۲۰۱ [3] صفحہ ۲۲۸
[4] صفحہ ۲۲۹ [5] صفحہ ۱۷۳ [6] صفحہ ۱۹۳ [7] صفحہ ۱۹۵

طرد العکس

"ضعف دل من بدرجۂ رسید کہ اگر حمل آن بر چرخ گردان نہادندی، چمان کوہ بیارامیدی و اگر سوز آن در کوہ افتادی چون چرخ بگشتی۔"[1]

تناسب لفظی و خوش آہنگی

"سنگ پشت گفت: - بر من مراد جہی اندیشید، و حیلتی سازید، گفتند، رنج ہجران تو مارا بیش است، در کجا ریم اگرچہ در خصب و نعمت باشیم بی دیدار تو از آن تمتع و لذت نیابیم، اما تو اشارت مشفقان و قول ناصحان سبک داری و آنچہ بہ مصلحت مآل وحال تو پیوندد بر آن ثبات نکنی و اگر خواہی کہ ترا ببریم شرط آنست کہ چون ترا برداشتیم و در ہوا رفتیم، چندانکہ مردمان را چشم بر ما افتد، اگر چیزی گویند راہ جدل بر بندی و البتہ لب نگشائی ...... گفت فرمان بردارم و می پذیرم کہ دم نزنم و دل در سنگ شکنم ...... سنگ پشت ساعتی خاموش بود، آخر بی طاقت گشت و گفت: تا کور شود ہر آنکہ نتواند دید - دہان کشادن ہمان بود و از بالا در افتادن ہمان، بطان آواز دادند کہ بر دوستان نصیحت باشد۔ سنگ پشت گفت این ہمہ سودا است، چون طبع اجل را صفرا تیز گردد و دیوانہ وار روی بکسی آرد، از زنجیر گسستن فائدہ حاصل نیاید و مکروحیلت سود ندارد و ہیچ عاقل در دفع آن نبندد۔"[2]

شعرائے آذربائیجان

خاندان ماد کی حکومت، جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، سب سے پہلے آذربائیجان میں قائم ہوئی تھی۔ دین آتش پرستی کا بانی زرتشت یہیں پیدا ہوا۔ اس لیے مذہب اور تمدن کے لحاظ سے آذربائیجان کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔ یہاں تک کہ اسلامی دور میں بھی اس علاقے کی اہمیت میں

---

[1] صفحہ ۱۶۱ [2] صفحہ ۱۰۲ - ۱۰۳

کوئی کمی نہ آئی ۔ یہاں عالم اسلام کے بہت بڑے علما اور فارسی زبان کے بے مثال شاعر پیدا ہوئے ۔ ان میں سے صرف خاقانی، مجیر بیلقانی۔ جمال الدین اصفہانی، فلکی شروانی اور نظامی گنجوی کا تذکرہ کیا جائے گا ۔

افضل الدین بدیل خاقانی شروانی

پیدائش سنہ ۵۲۰ھ وفات سنہ ۵۹۵ھ
بمطابق سنہ ۱۱۲۶ء ۔ سنہ ۱۱۹۸ء

خاقانی کے نام کے متعلق تذکرہ نویسوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ دولت شاہ سمرقندی نے اس کا نام ابراہیم لکھا ہے[1]۔ مولف مجمع الفصحا نے بھی اس کا یہی نام بتایا ہے، لیکن جامی نے نفحات الانس میں اس کا نام بدیل لکھا ہے۔ خاقانی خود بھی ذیل کے شعر میں اپنا نام بدیل ہی بتاتا ہے، اس لیے اس کا یہی نام سمجھنا چاہیے ۔

بدل من آدم اندر جہان سنائی را   بدین دلیل پدر نام من بدیل نہاد

خاقانی کا لقب افضل الدین تھا، چنانچہ اس کے معاصرین اسے اسی لقب سے یاد کرتے ہیں۔ خاقانی شروان میں پیدا ہوا جو آذربائیجان کے قریب ایک مشہور شہر ہے۔ اس کے باپ کا نام علی ہے، جو بڑھئی کا کام کرتا تھا۔ چنانچہ ذیل کے اشعار میں اشارہ بھی کیا ہے ۔

بجان معنی آرائی براہیمی پدید آمد   ز پشت آذر صنعت علی نجار شروانی

خاقانی کی والدہ عیسائی مذہب کی پیرو تھی لیکن بعد میں اسلام قبول کر لیا تھا چنانچہ خاقانی خود لکھتا ہے

کارم ز مزاج بد نہ رستی   گر نہ دعوات مادر ستی
نسطوری و موبدی نژادش   اسلامی و ایزدی نہادش
پس کردہ گزین بعقل و الہام   بر کیش کشیش دین اسلام

---

[1] تذکرۃ الشعراء مطبوعہ شیخ مبارک علی صفحہ ۷۴

خاقانی ابھی بچہ ہی تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس کی تربیت اس کے چچا مرزا کافی بن عثمان نسکی، جو خود علمِ طب اور فلسفہ میں بڑی دسترس رکھتا تھا۔ خاقانی نے چچا کی رہنمائی میں عربی علم طب، ہیئت اور علم الٰہیات کا مطالعہ کیا۔ فارغ التحصیل ہو کر شعر و سخن کی تعلیم ابوالعلا گنجوی سے پائی۔ جو اس زمانے کا مشہور شاعر تھا۔ استاد نے شاگرد کے ذوقِ شعر کو جلا دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، اسے جوہرِ قابل پا کر اپنی بیٹی بھی اس سے بیاہ دی۔ بالآخر استاد ہی کے وسیلے سے اسے خاقان اکبر منوچہر بن فریدون شیرواں شاہ کے دربار میں رسائی ہوئی۔ لیکن مقامِ تعجب ہے کہ جب خاقانی کو شہرت ہوئی تو وہ استاد سے منحرف ہو گیا۔

خاقانی پہلے حقائقی تخلص کرتا تھا لیکن دربار میں رسائی ہوئی، تو خاقان کی مناسبت سے خاقانی تخلص کیا۔

خاقانی کو زندگی میں بہت سی تلخیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بچپن میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، پچیس سال کی عمر میں چچا کی شفقت سے محروم ہوا جس نے اس کی پرورش کی تھی۔ ۵۷۱ھ مطابق ۱۱۷۵ء میں نوجوان بیٹا داغِ مفارقت دے گیا، پھر رفیقۂ حیات عالمِ جاودانی کو سدھاری۔ چنانچہ ان حادثات کا ذکر خاقانی ذیل کے اشعار میں کرتا ہے۔

پسر داشتم چو بلند آفتابی   زناگہ تباری مغاکش سپردم
بدرد پسر مادرش چون فرو شد   بخاک آن تن دردناکش سپردم

خاقانی کی جوانی مفلسی میں بسر ہوئی، کوئی ایسا دلی دوست بھی نہ تھا، جو غم و اندوہ میں کچھ تسکین دلاتا، چنانچہ وہ خود لکھتا ہے ؎

کارِ من بالا نمی گردد درین شیب بلا   در مضیق حادثاتم بستہ بند عنا

در ہمہ شہرداں مرا حاصل نیامد نیم دوست   دوست خود ناممکن است، اے کاش بودی آشنا

دربار میں بھی حالات کچھ سازگار نہ رہے، اس لیے نہ فکرِ معاش سے بے نیاز ہو سکا، نہ زمانے کی سنگینیوں

سے محظوظ ہو سکا۔ چنانچہ ایک مرتبہ[1] اس نے خاقان کو خطاب کر کے ذیل کا شعر کہا۔

دشتقی وہ کہ در برم گیرم — یا دشاتی کہ بر سر کش گیرم

اس شعر میں خاقانی ایک لونڈی، یا سر ڈھانپنے کے لیے ایک چادر کی تمنا کا اظہار کرتا ہے۔ خاقان اپنے لیے توہین کا موجب خیال کرتا ہے کہ اس کے دربار کا شاعر ہو اور یہ التماس کرے کہ اسے پوشاک دی جائے یا کوئی لونڈی عطا کی جائے۔ خاقان سخت زود رنج اور منتقم مزاج شخص تھا۔ حکم دیا خاقانی کا سر قلم کیا جائے۔ خاقانی نے عتاب شاہی سے ڈر کر معذرت چاہی اور عرض کیا کہ میں نے "با" لکھا تھا، لیکن مکھی نقطے پر بیٹھ گئی، جس سے نقطہ پھیل گیا اور "یا" بن گیا۔ خاقان اس معذرت سے خوش ہو گیا اور اسے انعام و اکرام سے نوازا۔"

خاقانی اکثر سیر و سیاحت کی خواہش کرتا، لیکن خاقان اسے اجازت نہ دیتا تھا، چنانچہ وہ سخت پریشان رہتا۔ آخر اس نے ایک مرتبہ خراسان کی سیاحت کے لیے اجازت چاہی، لیکن خاقان کو یہ بھی منظور نہ ہوا۔ چنانچہ خاقانی نے اپنی آزردگی طبع کا اظہار ذیل کے شعر میں کیا ہے۔

چہ سبب سوی خراسان شدنم نگذارند

عندلیبم بہ گلستان شدنم نگذارند

آخر خاقانی کو سفر کی اجازت مل گئی، لیکن شومئی قسمت کہ وہ ری تک ہی پہنچا تھا کہ خراسان میں غز ترکوں کے وحشیانہ ظلم و ستم کی خبر ملی، اس لیے وہیں سے واپس آگیا۔

۵۵۱ھ مطابق ۱۱۵۶ء میں خاقانی حج کے لیے روانہ ہوا۔ حج کی پوری سرگذشت اس کی مثنوی تحفۃ العراقین میں ملتی ہے۔ حج کے دوران اس نے مکہ معظمہ کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا۔ اسی مسافرت میں مدائن جانے کا بھی موقع ملا۔ یہ شہر ساسانی بادشاہوں کا پایہ تخت رہ چکا تھا یہاں طاق کسریٰ کی تباہی اور ایران قدیم کی مٹی ہوئی شان و شوکت دیکھ کر خاقانی بہت متاثر ہوا، چنانچہ

---

[1] تذکرۃ الشعرا دولت شاہ صفحہ ۸۴

ایک مشہور قصیدہ "ایوان مدائن" لکھا، جو خاقانی کی حب الوطنی کے جذبات کی ایک عظیم یادگار ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے ۔

ہاں ای دل عبرت بین از دیدہ نظر کن ہان | ایوانِ مدائن را آئینہ عبرت دان

واپسی پر خاقانی کا گزر اصفہان سے ہوا۔ اصفہان کے متعلق ایک ہجو خاقانی کے ایک شاگرد مجیر بیلقانی نے لکھ کر خاقانی کے نام سے منسوب کر دی تھی۔ اس لیے اہلِ اصفہان خاقانی سے سخت ناراض تھے۔ یہاں اس نے شاگرد کا لگایا ہوا داغ مٹانے کے لیے اصفہان کی مدح میں ایک طویل قصیدہ کہا۔ جس کے چند شعر یہ ہیں ۔

نکہت حُور است یا صفائی صفاہان | جبہت جوز است یا لقای صفاہان
دیو رجیم آنکہ بود دزد بیانم | گردم طغیان زد از ہجای صفاہان
او بقیامت سپید روی نخیزد | زانکہ سیہ بست بر صفای صفاہان

خاقانی دربارِ خاقان میں پہنچا ہی تھا کہ اس کے حاسدوں نے مشہور کر دیا، خاقانی اس دربار سے مطمئن نہیں اور کسی دوسرے ممدوح کی تلاش میں ہے۔ خاقان شیروان سخت ناراض ہوا اور اسے ۵۷۰ھ مطابق ۱۱۷۴ء میں قلعہ شابیران میں محبوس کر دیا، جہاں اُس نے اپنی مشہور نظم "حبسیہ" لکھی۔ اس کے دو شعر یہ ہیں ۔

فلک کثر رو تر است از خط ترسا | مرا دارد مسلسل راہب آسا
مرا از بعد پنجہ سال اسلام | نزیبد چون صلیبی بند برپا

آخر خاقان کی والدہ کی سفارش سے قید سے رہائی حاصل ہوئی۔

تذکرہ نویس یہ بھی لکھتے ہیں کہ خاقان نے چاہا تھا کہ خاقانی کو دربار کا کوئی خاص منصب سپرد کر دے، لیکن اسے اپنی فراغت اور آزادی بہت عزیز تھی، جسے وہ دولت دو عالم کے عوض دینے کو تیار نہ تھا۔ اس لیے ذمّے داری قبول کرنے سے معذرت کی، چنانچہ وہ خود کہتا ہے ۔

گفتی نکنی خدمت سلطان نکنم | یک لحظہ فراغت بدو عالم نفروشم

خصوصیات

خاقانی نے عربی زبان، اسلامی تاریخ، علم ہیئت اور علم الٰہیات کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا، اسی کا یہ اثر ہے کہ وہ مختلف علوم کی اصطلاحیں اور تلمیحات بے تکلف لاتا ہے۔ پڑھنے والا جب تک ان علوم میں دسترس نہ رکھتا ہو، آسانی سے اس کا کلام نہیں سمجھ سکتا۔ مثلاً مکہ معظمہ کی تعریف میں قصیدہ لکھا ہے، جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

تا خیال کعبہ نقش دیدۂ جان دیدہ اند
دیدہ را از شوق کعبہ زمزم افشان دیدہ اند

عشق برکردہ بہ مکہ آتشی کز شرق و غرب
کعبہ را ہر ہفت کردہ ہفت مردان دیدہ اند

ماہ نو را نیمۂ قندیل عیسیٰ یافتہ
دجلہ را پر حلقہ زنجیر مطران دیدہ اند

بر سر دجلہ گزشتہ تا مدائن خضروار
قصر کسریٰ و زیارت گاہ سلمان دیدہ اند

از تحیر گشتہ چون زنجیر پیچان کاندران
بر در ایوان نہ زنجیر و نہ دربان دیدہ اند

تا جدارش رفتہ و دندانہ ہای قصر شان
بر سر دندانہ ہای تاج گریان دیدہ اند

پس بکوفہ مشہد پاک امیر النحل را
ہم چو جیش نحل جوش انس و سبحان دیدہ اند

راندہ از رحبہ دو اسپہ تا منارہ یکسرہ
از سم گوران سر شیران ہراسان دیدہ اند

نمونے کے یہ چند اشعار ہیں۔ ان سے لطف اندوز ہونے کے لیے ادبیات ایران اور اسلامی

تاریخ سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر شعر پڑھنے والے کو جاننا چاہیے کہ "ہفت کرنہ" سے سات سنگار اور ہفت مردان سے اصحاب کہف یا عارفوں کے سات طبقے مراد ہیں۔ مطران حضرت عیسیٰؑ کا لقب ہے۔ ایوان کسریٰ اور مدائن ساسانیوں کے دارلسلطنت تھے۔ سلمان فارسی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے ہیں۔ امیر کو اور نرزنبور کو عربی میں یعسوب کہتے ہیں۔ چونکہ حضرت علی کا لقب یعسوب الدین ہے، اس لیے آپ کا لقب امیر النحل بھی ہے۔ رحبہ اور منارہ خاص اہمیت کے قصبے ہیں۔

۲۔ خاقانی کے اشعار میں بیشتر ترکیبیں ایسی ہیں، جو سبک خراسانی میں نظر نہیں آتیں، یا اگر ہیں تو بہت کم۔ ذیل کے قصیدے میں اپنی افضلیت اور حاسدوں کی کم مائیگی کا ذکر کیا ہے۔ اس کی ترکیبوں کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ خاقانی نے سبک خراسانی سے الگ بھی راہ نکال کر سبک عراقی کی بنیاد رکھی ہے۔ جس کا ذکر بعد میں آئے گا ۔

ہفت اقلیم سخن را بہتر از من بادشاہ
در جہان ملک سخن رانی مسلّم شد مرا

مریم بکر معانی را منم روح القدس
عالم ذکر معانی را منم فرمانروا

شہ طغان عقل را نائب منم نعم الوکیل
نوعروس فضل را صاحب منم نعم الفتا

درع حکمت پوشم و بی ترس گویم القتال
خوان حکمت سازم و بی بخل گویم الصلا

نکتۂ دوشیزۂ من حرز روح است از صفت
خاطر بستن من نور عقل است از صفا

من قرینِ گنجِ دانایان خاک بیزانِ حسد
من چراغِ عقل و آنہا روز کوران ہوا

من ہمین در مسندِ معنی راست ہم چون آدمم
زین خران در چینِ صورت راست چون مردم گیا

شاہ طغانِ عقل، ورعِ حکمت، نکتہ دوشیزہ، خاک بیزانِ حسد، روز کوران ہوا، مسندِ معنی، چینِ صورت، اور اسی قسم کی متعدد اور ترکیبیں، جو اس قصیدے میں یا دوسرے قصائد میں ہیں، خاقانی کی امتیازی حیثیت کا پتہ دیتی ہیں۔

۳۔ خاقانی نے اپنے ہم عصروں کے خلاف واقعہ نگاری بھی کی ہے۔ اس نے بعض قصیدے خاص خاص واقعات پر لکھے ہیں۔ جہاں واقعات کی تصویر کشی کی ہے وہاں کچھ تخیل کا رنگ بھی آگیا ہے۔ حج کو جاتے ہوئے خاقانی کا جب مدائن سے گزر ہوا، اور ایوان کسریٰ کی تباہی کا منظر دیکھا، تو اس سے متاثر ہو کر نہایت پُرسوز اور پُراثر قصیدہ لکھا، جس کے چند شعر حسبِ ذیل ہیں۔

ہان ای دل عبرت بین از دیدہ نظر کن ہان
ایوانِ مدائن را آئینہ عبرت دان

گوید کہ تو از خاکی ما خاک تو ایم اکنون
گامی دو سہ بر ما نہ اشکی دو سہ ہم بفشان

از نوحہ جغد الحق مائیم بہ دردِ سر
از دیدہ گلابی کن دردِ سرِ ما بنشان

ما بارگہ دادیم این رفت ستم بر ما
بر قصر ستمگاران آیا چہ رود خذلان

گوئی کہ نگون کردہ است ایوان فلک وش را
حکم فلک گردان یا حکم فلک گردان

این است ہمان ایوان کز نقش رخ مردم
خاک در او بودی دیوار نگارستان

این است ہمان درگہ کو را ز شہان بودی
دیلم ملک بابل ہندو شہ ترکستان

پندار ہمان عہد است از دیدہ فکرت بین
در سلسلۂ درگہ در کوکبۂ میدان

مست است زمین زیرا خوردہ است بجای می
در کاس سر ہرمز خون دل نوشیروان

کسریٰ و ترنج زر پرویز و ترہ زرین
بر باد شدہ یکسر با خاک شدہ یکسان

پرویز بہر خوانی زرین ترہ گستردی
کردی ز بساط زر زرین ترہ را بستان

پرویز کنون گم شد زان گم شدہ کمتر گو
زرین ترہ کو بر خوان رو کم ترکوا بر خوان

خاقانی ازین درگہ دریوزہ عبرت کن
تا از در تو زین پس دریوزہ کند خاقان

۴۔ خاقانی کو عیسائیت کا مطالعہ کرنے کا بھی موقع ملا تھا، اس لیے عیسائیوں کی اصطلاحات اور ان کی مذہبی روایات کا بے تکلفی سے ذکر کرتا ہے۔ مثلاً ایک ہی قصیدے میں، جس کا اوپر ذکر آیا ہے۔ مریم بکر، روح القدس، نکتہ دوشیزہ، خاطر آبستن، خواص عیسائیوں کی

اصطلاحیں ہیں۔ یہ خصوصیت خاقانی کو عیسائی ماں کے آغوش میں پرورش پانے کی بدولت حاصل ہوئی۔

۵۔ خاقانی کے اکثر قصائد میں ردیف تو ہے، لیکن قافیہ نہیں۔ مثال کے طور پر ایوانِ مدائن اور مکہ معظمہ کی شان میں جو دو قصیدے لکھے ہیں، ان میں قافیہ نہیں ہے۔

۶۔ خاقانی قصیدے کا آغاز تشبیب یا تغزل سے کرتا ہے۔ اس میں وہ بالعموم جلوۂ صبح، طلوعِ مہر، عشق یا وصفِ طبیعت کا ذکر کرتا ہے مثلاً ؎

دست صبا بر فروخت مشعلۂ نو بہار — مشعلہ داری گرفت کوکبۂ شاخسار
زآتش خورشید شد نافۂ شب نیم سوخت — قوت سازان یافت دز خوش دم ازان شد بہار
خامہ نیست طبع چہرہ کشائی جہان — نائب عیسیٰ است ماہ رنگرز شاخسار

۷۔ جذبات نگاری۔ جہاں کہیں رنج و اندوہ کا موقع آیا ہے معلوم ہوتا ہے، اس کے الفاظ میں دل کی غمگین صدائیں بند کی ہیں۔ اپنے بیٹے کی وفات پر مرثیہ لکھا ہے جس کے چند شعر درج ذیل ہیں ؎

صبح گاہان سر خونین جگر بکشائید
ژالۂ صبحدم از نرگس تر بکشائید

دانہ دانہ گہر اشک ببارید چنانک
گرہ رشتۂ تسبیح ز سر بکشائید

خاک لب تشنۂ خون است ز سر چشمۂ دل
آب آتش زدہ چون چاہ سقر بکشائید

سیل خون از جگر آرید سوی بام دماغ
ناودان مژہ را راہ گذر بکشائید

تف خون کز مژہ بر لب زد و لب آبلہ کرد
زہر مہری ز لب آبلہ در بکشائید

بردفای دل من نالہ برآرید چنانک
چنبر این فلک شعبدہ گر بگشائید

بجهان پشت ببندید و بیک صدمت آہ
مهرہ پشت جهان یک زدگر بگشائید

گریہ گر سوی مژہ راہ نیابد مژہ را
رہ سوی گریہ کز دنیست گز ربگشائید

آگهید از رگ جانم کہ چہ خون میریزد
خون ز رگهای دل وسوسہ گر بگشائید

خواب بد دیدم واز بیم خطرناکی خواب
نیک بدرنگ شدم بند خطر بگشائید

آتشی دیدم کو باغ مرا سوخت بخواب
سر این آتش آن باغ ببر بگشائید

نازنینان منا مُرد چراغ دلِ من
ہمچو شمع از مژہ خوناب جگر بگشائید

خاقانی نے طبیعت کا زور محض مدحت سرائی پر ہی صرف نہیں کیا، بلکہ قصیدوں میں ایسے قطعے بھی لکھے ہیں جن سے مسلسل اخلاقی سبق ملتے ہیں مثلاً ؎

در ساحت زمانہ ز راحت نشان مخواہ
ترکیب عافیت ز مزاج جہان مخواہ

در باغ دل بسوز و ز مرہم اثر مجوی
با خویشتن بساز و ز ہمدم نشان مخواہ

اندر قمارخانہ چرخ: در بساط دہر
جنسی حریف وہم نفسی میزبان مخواہ

گر دردمِ نہنگ درآئی نفس مزن

در درِّ گوہرِ محیط درافتی گران مخواہ

از جوہرِ زمانہ خواص دفا مجوی

وز تنگنائی دہر خلاص آسان مخواہ

از ساغرِ سپہر تہی کیسہ میٔ مخور

وز سفرۂ جہانِ سیہ کاسہ نان مخواہ

ہمت کفیل تست کفاف از کسان مجوی

دریا سبیل تست نم از ناودانِ مخواہ

وحدت گزین وہمدمی از دوستان مجوی

تنہانشین وہمدلی از دودمان مخواہ

چو دیدہ ای کہ یوسف از اخوان چہ رنج دید

ہم ناتوان بزی وز اخوان توان مخواہ

ہم عصر شعرا ابوالعلاء گنجوی خاقانی کا استاد تھا۔ اس کے علاوہ رشید الدین وطواط، جمال الدین اصفہانی، اثیر الدین اخیسکتی، فلکی شروانی اور نظامی گنجوی اس کے معاصرین میں سے تھے۔

تصنیفات دیوان۔ خاقانی کا دیوان بائیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں قصائد اور قطعات ہیں۔

مثنوی تحفۃ العراقین۔ خاقانی کی مسافرتِ حج کی پوری سرگزشت اس کی مثنوی تحفۃ العراقین میں ملتی ہے۔ یہ مثنوی پانچ مقالوں میں منقسم ہے۔ پہلا مقالہ توحید وثنا پر مشتمل ہے۔ دوسرے مقالے میں اپنے سوانح حیات بیان کیے ہیں۔ تیسرے میں ہمدان، عراق اور بغداد کا بیان ہے۔ چوتھے مقالہ میں مکہ اور پانچویں میں مدینہ کا ذکر ہے۔

وفات خاقانی نے آخر عمر میں دربار سے تعلق منقطع کر کے تبریز میں گوشہ نشینی اختیار کی اور یہیں وفات پائی۔ خاقانی کے سال وفات پر تذکرہ نویسوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مجمل فصیحی نے بحوالہ مراۃ الخیال[1] اس کا سال وفات ۵۳۲ھ مطابق ۱۱۳۷ء لکھا ہے یہ صریحاً غلط ہے۔ کیونکہ تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ اس کا بیٹا رشید الدین ۵۷۱ھ مطابق ۱۱۷۵ء میں فوت ہوا اور خاقانی نے اس کا مرثیہ لکھا تھا۔ جدید ایرانی محقق آقای[2] میرزا محمد علی خاں تربیت نے اس کا سال وفات ۵۹۵ھ مطابق ۱۱۹۸ء لکھا ہے اور آقای قزوینی بھی ان سے متفق ہیں۔

مجیر الدین بیلقانی (وفات ۵۸۶ھ مطابق ۱۱۹۰ء)

مجیر الدین بیلقان کا رہنے والا تھا، یہ علاقہ آذربائیجان کے شمال میں واقع ہے۔ مجیر کے خاندان کو علم و ادب سے کوئی خاص علاقہ نہ تھا، جیسا کہ وہ خود کہتا ہے۔

ای خداوند نہ آنم کہ مرا بر سر نام   در تعریف وجود از جد و عم ریختہ اند

اس کے ذیل کے شعر سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ ماں کی طرف سے حبشی نژاد تھا ؎

طفلان طبع بین بصفت ترک چہرہ اند   وین طرفہ ترکہ از حبشی بود مادرم

مجیر الدین خاقانی کا شاگرد تھا، لیکن استاد سے اس کی ناچاقی ہو گئی اور جس طرح خاقانی نے اپنے استاد ابو العلا گنجوی کو رنجیدہ کیا، اسی طرح مجیر نے اپنے استاد خاقانی کی ہجو کہی، اور اس کے لیے وجہ پریشانی بنا۔

تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ اتابک حکمران کی طرف سے مجیر کو اصفہان کا حاکم بنا کر بھیجا گیا تھا

---

[1] مراۃ الخیال صفحہ ۳۰ مطبوعہ بمبئی

[2] سخن و سخنوران حصہ دوم صفحہ ۳۴۹

لیکن اہل اصفہان کے سلوک سے وہ مطمئن نہ تھا، چنانچہ اُن کی ہجو کہی۔

صفاہان خرم و خوشش می نماید ۔۔۔ بسان پر شہر آرای طاؤس

ولی زین زاغ طبعان کاہل شہر اند ۔۔۔ خجل شد بال خوش سیمای طاؤس

یقین می دان کہ سیمرغ صفاہان ۔۔۔ چو طاؤس است وایناں پای طاؤس

اصفہان کے شاعر جمال الدین اصفہانی نے جواباً مجیر کی ہجو لکھی اور اس کے استاد خاقانی کو بھی ہدف طعن بنایا کیوں کہ خیال تھا کہ یہ ہجو خاقانی کے ایما پر لکھی گئی ہے۔ خاقانی نے سنا، تو اسے رنج ہوا، اور حج سے واپسی پر جب اس کا گزر اصفہان سے ہوا، تو اہل اصفہان کی رنجیدگی دور کرنے کے لیے مشہور قصیدہ "مدح اصفہان" لکھا جس کا ذکر خاقانی کے باب میں آیا ہے۔

عام روایت ہے کہ مجیر اصفہان کے عوام کے ہاتھوں ۵۸۶ھ مطابق ۱۱۹۰ء میں قتل ہوا۔

مجیر کا دیوان قصائد، غزلیات، قطعات اور رباعیات پر مشتمل ہے۔

مجیر خوش ذوق قصیدہ سرا ہے۔ لیکن اس کے کلام کی شیرینی اور تازگی کے باوجود اس میں گہرائی نہیں۔ صنائع کی کثرت ہے جس سے کلام میں تصنع اور تکلف پیدا ہو گیا ہے، ایک قصیدے کے چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

باد صبح است کہ مشاطہ جعد سمن است
یا دم عیسی پیوند نسیم چمن است

نکہت نافہ مشک است نہ پس چیست بگو
اثر آہ جگر سوختہ ای ہم چو من است

نفس سرد سحر گرم روان بہر چرا است
یا دم آمد زپی آنکہ رسول چمن است

یارب این شیوۂ نو چیست کہ از جنبش باد
طرۂ ژالہ پُر از نافۂ مُشکِ ختن است

باد با دست تہی بر سر گل تاج نہ است
ابر با دامن تر بر در گل نوبہ زن است

دیدہ مردم نرگس ہمہ گریان نگرد
بسوی ژالہ کہ او زندہ مل اندر کفن است

بوی شیر از دہن سوسن ازان می آید
کہ منورش سر پستانِ صبا در دہن است

دہ زبان است و نگوید سخن و حق با اوست
باچنیں عمر کہ او راست چہ جای سخن است

برق ناچخ زن باغ است و صبا حلقہ ربای
ابر نادرہ گر و صاعقہ ژوبین فگن است

مجیر الدین کے ممدوحین مجیر الدین نے جن حکمرانوں کے قصیدے کہے ہیں۔ ان میں خاص طور سے سیف الدین ارسلان، رکن الدین ارسلان بن طغرل، شمس الدین ایلدکز اتابک اعظم اور قزل ارسلان، عثمان بن ایلدکز قابلِ ذکر ہیں

ہم عصر شعراء مجیر کے ہم عصر شعراء اثیر اخسیکتی، خاقانی اور جمال الدین اصفہانی ہیں۔

جمال الدین اصفہانی (وفات ۵۸۸ھ مطابق ۱۱۹۲ء)

جمال الدین محمد عبدالرزاق عراق کے مشہور شعراء میں سے ہے۔ اصفہان میں پیدا ہوا۔ والد پیشے کے اعتبار سے زرگر تھا، چنانچہ جمال الدین نے بھی یہی پیشہ اختیار کیا جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے۔

شاعر زرگر منم ساحرہ ورہ گر تو ئی[1]　　کیست کہ باد و بروت از ماو دو کشخال برد

جمال الدین نے آذربائیجان کے علاقے کی سیاحت کی۔ اسی سلسلے میں شہر گنجہ بھی جانے کا اتفاق ہوا، چنانچہ گنجہ کی تعریف میں دو شعر لکھے ہیں ؎

چو شہر گنجہ اندر کل آفاق　　ندیدستم حقیقت در جہان خاک

کہ رنگ خلد و بوی مشک دارد　　گلابش آب باشد زعفران خاک

اسی مسافت کے دوران ماژندران سے بھی گزر ہوا اور حاکم ماژندران کی مدح میں ایک قصیدہ کہا۔

جیساکہ پہلے ذکر آچکا ہے، خاقانی کے ایک شاگرد مجیر الدین بیلقانی نے اصفہان اور اہل اصفہان کی مذمت میں شعر کہے تھے۔ جمال الدین کے جذبہ حب الوطنی کو ٹھیس لگی۔ اس نے نہ صرف مجیر الدین کو دندان شکن جواب دیا، بلکہ اس کے استاد خاقانی کو بھی نہ چھوڑا، جس پر خاقانی کو معذرت کرنی پڑی۔

جمال الدین کے ممدوح

جمال الدین کے قصائد عراق کے سلجوقی حکمرانوں، آذربائیجان کے آتابکوں، امرائے باوند، آل خجند اور آل صاعد کی مدح میں ہیں۔

اندازِ نگارش

جمال الدین کے اشعار میں اگرچہ صنائع بدائع بکثرت ہیں لیکن خاقانی کی نسبت سادہ اور رواں ہیں۔ ان میں کوئی ابہام یا پیچیدگی نہیں۔ اس کے معاصر خاقانی، نظامی، انوری، اور رشید الدین وطواط وغیرہم تھے۔ وہ ان کے اندازِ تحریر سے خاصا متاثر نظر آتا ہے، جس کا خود اسے اعتراف بھی ہے۔

اشرف و وطواط و انوری سہ حکیم اند
کز سخن ہر سہ شد شگفتہ بہارم

---

[1] گر معنی ورہ گر بمعنی نجار۔ یہاں خاقانی کی طرف اشارہ ہے جن کا آبائی پیشہ نجاری تھا۔

انوری کا مطلع ہے ؎

حبذا بزمی کزد ہر دم دگر گون زیوری

آسمان بر عالمی بندد زمین بر کشوری

جمال الدین نے انوری کے اس قصیدے سے متاثر ہو کر قصیدہ لکھا جس کا مطلع حسب ذیل ہے ۔

اینک اینک نو بہار آورد بیرون لشکری

ہر یکی چون نو عروسی در دگر گون زیوری

حکیم سنائی کا اثر جمال الدین کے اکثر قصائد و قطعات میں نظر آتا ہے ۔ سنائی کے قصیدے کا مطلع ہے ؎

ای خداوندان مال الاعتبار الاعتبار

ای خداخوانان قال الاعتذار الاعتذار

جمال الدین نے اس قصیدے سے متاثر ہو کر قصیدہ لکھا ہے جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں ۔

الحذر ای غافلان زین وحشت آباد الحذر

الفرار ای عاقلان زین دیو مردم الفرار

ای عجب دلتان بنگرفت و نشد جانتان ملول

زین ہواہای عفن زین آبہای ناگوار

عرصہ ای نا دلکشا و بقعہ نا دلپذیر

قرضۂ ناسودمند و تربتی ناسازگار

مرگ دروی حاکم و آفات دروی بادشاہ

ظلم دروی قہرمان و فتنہ دروی پیش کار

امن دروی مستحیل و عدل دروی ناپدید

کام دروی نادر و صحت دروی ناپایدار

مہر را خفاش دشمن شمع را پروانہ خصم
جہل را در دست تیغ و عقل را در پای خار

نرگسش بیماریابی لالہ اش دل سوختہ
غنچہ اش دلتنگ بینی و بنفشہ سوگوار

تو گزیدہ این چنین جای بر ایوان بقا
راست گوئید آن کجا عنوان عقل ست اختیار

ای تو مقصود فلک ہم آنہ راگشتی اسیر
وی تو مسجود ملک ہم دیو راگشتی شکار

خیز کاندر عالم جان مسندت آراستند
بر فشاں پس دامنت زین خاکدان ای خاکبار

جمال الدین کے قصائد کی بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُس نے قصیدے کی تشبیب کو موجودہ غزل سے قریب تر کر دیا ہے۔ تشبیب کے لیے عموماً ایسے الفاظ و تراکیب استعمال کرتا ہے جو صرف غزل ہی کے لیے موزوں ہیں۔ وہ تشبیہوں کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

برخیز کہ موسم تماشا ست — بخرام کہ روز باغ و صحرا ست
امروز بہ نقد عیش خوش دار — و آن کیست کش اعتماد فردا ست
می ہست و سماع و آن دگر نیز — اسباب طرب ہمہ مہیا ست
از دل بدر آ و شاد بنشین — کاین ہستی ما ست کافت ما ست

بی تو ام کار بر نمی آید — بر من این غم بسر نمی آید
ترسم از تن بدر شود جانم — کز درم دوست در نمی آید
این ہمہ یارب سحرگاہی — خود یکی کارگر نمی آید

جمال الدین کے اکثر قصائد کا موضوع اخلاقیات ہے۔ وہ اکثر احساس دلاتا ہے کہ جہان ناپائدار ہے۔ اس سے دل لگانا اور اس پر ناز کرنا بیکار ہے۔ عقلمند انسان دنیا کے سیم وزر کو بھی دنیا کی طرح عارضی اور فانی سمجھتے ہیں۔

این ہمہ لاف مزن گرچہ ترا سیم و زر است
کہ زر و سیم بر اہل خرد مختصر است

دل مبند ار خردی داری بر سیم و زرت
کہ زر و سیم جہان ہمچو جہان برگذر است

تاج زر بر سر شمعست چرا می گرید
خود ہمی گریہ اش از آنست کہ آن تاج زر است

واختر پیرہن کہنہ بپوشید ازان
فارغ از بند و ز دام قفس حیلہ گر است

سرو آزاد از آن شد کہ تہی دست آمد
غنچہ دل تنگ از آنست کہ در بند زر است

ماں باپ کے احترام کے متعلق لکھا ہے۔

بشنو از من نصیحتی کہ ترا | کار ہر دو جہان شود بہ نظام
بد نخواہی کہ باشدت ہرگز | بد مکن خاصہ با اولو الارحام
حق مادر نگاہدار و بترس | زایزد ذوالجلال والاکرام
ہر کہ با مادر و پدر بد کرد | بنود جز ہمیشہ دشمن کام

جمال الدین تواضع کو شرط انسانیت سمجھتا ہے، لیکن دنیاوی جاہ کی خاطر کسی دون ہمت شخص کے سامنے سر نہیں جھکانا چاہتا۔

مرا تواضع طبعی عزیز آمد لیک | مذلت است تواضع بنزد سفلہ نمود

گر تکبر می کنی با خواجگان سفلہ کن ۔۔۔ ور تواضع می کنی با مردم درویش کن

ہم عصر سلاطین جمال الدین کے ہم عصر سلاطین حسب ذیل ہیں۔

حسام الدولہ اردشیر بن علاء الدولہ حکمران آل باوند (۵۶۶ھ تا ۶۰۲ھ مطابق ۱۱۷۱-۱۲۰۵ء) جمال الدین نے اُس کے قصیدے کہے اور گرانقدر صلے حاصل کیے۔ اس کے علاوہ ارسلان بن طغرل (۵۵۵ھ تا ۵۷۱ھ مطابق ۱۱۶۰-۱۱۷۵ء) نصرۃ الدین جہاں پہلوان محمد بن ایلدگز (۵۶۸ھ تا ۵۸۱ھ مطابق ۱۱۷۲-۱۱۸۵ء) اور طغرل بن ارسلان ۵۷۱ھ تا ۵۹۰ھ مطابق ۱۱۷۵-۱۱۹۳ء) کے بھی قصیدے کہے۔

ہم عصر شعراء اس کے ہم عصر شعرا مجیر الدین بیلقانی، خاقانی، انوری، رشید الدین وطواط اور ظہیر الدین فاریابی ہیں۔

وفات جمال الدین اصفہانی کی وفات ۵۸۸ھ مطابق ۱۲۹۲ء میں ہوئی۔

تصنیف جمال الدین اصفہانی کا دیوان اس کی ادبی یادگار ہے۔ جو تقریباً دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں قطعات، قصائد اور رباعیاں ہیں۔

فلکی شروانی (وفات ۵۹۷ھ مطابق ۱۱۹۱ء)

محمد نام، لقب نجم الدین اور کنیت ابو النظام ہے۔

شروان کا دار السلطنت شماخی اس کا وطن ہے۔ علم نجوم و ہیئات میں اسے مہارت تامہ حاصل تھی، چنانچہ اسی نسبت سے فلکی تخلص کیا۔

فلکی چھٹی صدی ہجری کا مشہور قصیدہ گو تھا۔ شروان سے کبھی اسے باہر جانے کا موقع نہیں ملا اور عمر بھر شروان شاہ کے دربار سے وابستہ رہا۔ خاقان اکبر منوچہر بن فریدوں اس کا ممدوح تھا جس کی شان میں اُس نے متعدد قصیدے کہے ہیں۔

فلکی بھی خاقانی کی طرح بخت کی ناسازگاری کا گلہ کرتا ہے۔

ہیچ کس چارہ ساز کارم نیست　　　　چکنم بخت ساز گارم نیست

خاقانی کو اپنے وطن میں کوئی دوست نہیں ملا تھا، فلکی بھی وطن میں مونس و غمخوار کے نہ ہونے کی شکایت کرتا ہے۔

زین دیارم نژاد بود ولیک　　　　ہیچ یار اندرین دیارم نیست

کچھ عرصہ اسے خاقانی ہی کی طرح زندان کی زحمت اٹھانی پڑی۔ کہا جاتا ہے کہ خاقان منوچہر اس کی بہت عزت کرتا تھا اور اکثر اسے انعام و اکرام سے نوازتا تھا، لیکن حاسدوں نے اس پر طرح طرح کی تہمتیں تراشیں، جن کا خاقان کو یقین آگیا اور بالآخر اسے زندان میں ڈال دیا گیا۔ فلکی اپنی بے گناہی ظاہر کرنے کے لیے کہتا ہے۔

شہا دشہر کشایا نمودہ اند بدعت　　　　کہ بندہ بندگی تو گذاشت مہمل و مبہم

ایک اور شعر میں کہتا ہے

بادل رنجہ و تن رنجور　　　　طاقت بند شہریارم نیست

اس قید و بند میں اس نے چند قصیدے کہے، جن میں اس نے خاقان سے دوری کی شکایت اور اپنی بے گناہی کا ذکر کیا ہے۔ ان قصیدوں سے خاقان کو اس کی بے گناہی کا یقین ہو گیا اور اُسے آزاد کر دیا۔

تقی الدین کاشی نے اس کی وفات ۵۸۷ھ مطابق ۱۱۹۱ء بیان کی ہے۔ فلکی نے قصیدہ، غزل، رباعی اور مسمط پر طبع آزمائی کی ہے۔ اس کے اشعار کی تعداد سات ہزار بتائی جاتی ہے۔ لیکن اس کا مطبوعہ دیوان کل بارہ سو اشعار پر مشتمل ہے۔

انداز نگارش فلکی کے زمانے میں قصیدے بہت مشکل اور مبہم انداز میں کہے جاتے تھے۔ لیکن اس نے عام روش کے خلاف نامانوس الفاظ و تراکیب استعمال کرنے سے احتراز کیا۔ علم ہیئت میں اسے خاص ملکہ تھا، اس لیے علم ہیئت کی کیفیات اور اصطلاحات اس کے کلام میں کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بیشتر قصائد سادہ

اور روان ہیں۔ قصائد عموماً تشبیب یا تغزل سے شروع ہوتے ہیں، جن میں محبوب، جمالِ محبوب، می و نغمہ کا ذکر آتا ہے۔ ایک قصیدے کی تشبیب کے چند اشعار حسبِ ذیل ہیں۔

شب نباشد کہ فراق تو دلم خون نکند
وآرزوی تو مرا رنج دل افزون نکند

ہیچ روزی نبود کاندوہِ شوق تو مرا
دل چو آتش کدہ و دیدہ چو جیحون نکند

ہر کجا عشق من و حسن ترا وصف کنند
ہیچ عاقل صفت لیلےٰ و مجنون نکند

سایہ زلف تو چون فر ہماست بفال
چون کہ فال من دل خستہ ہمایون نکند

گرچہ لعلت بوفا وعدہ بسی داد مرا
نکند وعدہ وفا تا جگرم خون نکند

گرچہ در دائرۂ عشق تو بیان در خطر است
فلکی را کس ازین دائرہ بیرون نکند

اس کے اکثر اشعار میں سبک خراسانی کا سا رنگ پایا جاتا ہے۔ مثلاً

چہرہ او آفتاب، چشمہ حیوان لبش
چشم مرا زان دو شکل آفت طوفان رسید

گرچہ ز ظلمت رسید خضر بآبِ حیات
دوش بمن ز آفتاب چشمہ حیوان رسید

دوش خیالش بخواب کرد گذر بر دلم
عقل ولایت سپرد گفت کہ سلطان رسید

بعض شعرائے خراسان کی طرح فلکی کے بعض قصیدوں میں بھی صنعتِ تکرار پائی جاتی ہے۔ ایک قصیدے کے چند شعر حسب ذیل ہیں۔

نارست شعلہ شعلہ رخِ دلبرم زتاب
ماراست عقدہ عقدہ دو زلفش بر آفتاب

زین شعلہ شعلہ آتش نہفتہ روز
زان عقدہ عقدہ زلفش گرفتہ تاب

چون نامہ نامہ مشک دو زلفش برنگ و بو
وز تودہ تودہ عنبر تر بردہ رنگ و آب

زین نافہ نافہ مشک اندرا اہتمام
زان تودہ تودہ تودۂ عنبر در اکتساب

فلکی کے ہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں، جن میں انتہا درجے کی آمد ہے۔ معلوم ہوتا ہے، دلی احساسات ہیں، کہ الفاظ میں ڈھلتے چلے گئے ہیں۔

سودا زدۂ فراق یارم — بازیچۂ دست روزگارم
ناچیدہ گلی ز گلبن وصل — صد گونہ نہاد ہجر خارم
بی آنکہ شراب وصل خوردم — از شربت ہجر در خمارم
اندیشۂ دل نمی گذارد — یک لحظہ مرا کہ دم برآرم
نتوانم گفت کز غم دل — ایام چگونہ می گذارم
از بہر خدا مرا نگوئی — ای دل کہ ز دست تو چہ دارم
یکبارہ سیاہ گشت روزم — یکبارہ تباہ گشت کارم
کارم ہمہ انتظار و صبر است — من کشتہ صبر و انتظارم
جز نقش خیال تو نجویم — بر ہر چہ دو دیدہ برگمارم

دریاب ز بہر روز فردا
امروز مرا کہ سخت دارم

نظامی گنجوی (پیدائش ۵۳۵ھ مطابق ۱۱۴۰ء وفات ۵۹۹ھ مطابق ۱۲۰۲ء)

حکیم ابو محمد الیاس بن یوسف نظامی آذربائیجان کے شہر گنجہ[۱] میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں ہی باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ادھر باپ فوت ہوا ادھر ماں نے بھی داغ مفارقت دیا۔ جیسا کہ نظامی کہتے ہیں۔

گر شد پدرم بسنت جد — یوسف پسر زکی مؤید
با دور بداوری چہ کوشم — دور است ز دور چون خروشم
گر مادر من رئیسہ کرد — مادر صفتانہ پیش من مرد
آن لابہ گری کرا کنم یاد — تا پیش من آردش بفریاد
با این غم و درد بی کنارہ — داروی فرامشیست چارہ

تعلیم و تربیت آپ کے ماموں کی زیر نگرانی ہوئی۔ افراد خانہ کو شعر و ادب کا ذوق تھا۔ چنانچہ آپ کے بھائی مطرزی قوامی خود ایک صاحب طرز شاعر تھے۔ آپ کو بھی شعر و شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ اس لیے تعلیم سے فراغت پا کر شعر و شاعری شروع کی۔

آپ نے زندگی کا بیشتر حصہ گنجہ ہی میں گذارا۔ صرف ایک مرتبہ آذربائیجان تک جانے کا اتفاق ہوا۔ اس کی بھی یہ صورت ہوئی کہ آذربائیجان کے اتابک حکمران قزل ارسلان نے نظامی کے کلام کی شہرت سن کر اپنے ہاں آنے کی دعوت دی، چنانچہ وہاں چلے گئے۔

---

[۱] بعض تذکرہ نویس یہ بھی لکھتے ہیں کہ آپ قم کے رہنے والے تھے چنانچہ ذیل کے شعر میں آپ نے اشارہ بھی کیا ہے۔

چو در گرچہ در بحر گنجہ گم — ولی از قہستان شہر قمم

نظامی کا ایک بیٹا تھا جس کا نام محمد ہے۔ مثنوی خسرو شیریں کے اختتام پر اس کی عمر سات سال تھی۔ چنانچہ ذیل کے شعر میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

بہ بین ای ہفت سالہ قرۃ العین　　مقام خویشتن در قاب قوسین

مثنوی لیلیٰ مجنوں جب شروع ہوئی، تو اس وقت محمد کی عمر ۱۴ سال تھی، چنانچہ لکھتے ہیں:۔

ای چار دہ سالہ قرۃ العین　　بالغ نظر علوم کونین

اخلاق

نظامی کے ہم عصر حکمران اتابکان آذربائیجان، اتابکان موصل اور شروان کے شروانشاہ تھے، لیکن آپ آزاد فطرت کے مالک تھے، طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ حصولِ دولت کے لیے کسی کا قصیدہ کہیں، اس لیے کسی دربار سے تعلق پیدا نہ کیا اور نہ کسی دہلیز پر ان کی پیشانی جھکی۔ جو کچھ کہتے تھے، اپنی خواہش اور اُپج سے کہتے تھے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے اپنی مثنویاں بعض حکمرانوں کے نام منسوب کی ہیں۔ مثلاً "مخزن اسرار" آذربائیجان کے اتابک ایلدگز کے نام۔ "خسرو شیریں" اس کے دو بیٹوں محمد اور قزل ارسلان کے نام "لیلیٰ مجنوں" شیروانشاہ منوچہر کے نام اور "سکندر نامہ" موصل کے حکمران عزالدین مسعود اول کے نام اور آخری مثنوی "ہفت پیکر" قزل ارسلان کے جانشین نصرت الدین ابوبکر کے نام منسوب کی ہے۔ اس کی وجہ مولانا شبلی نعمانی شعر العجم میں یہ بتلاتے ہیں کہ نظامی کی شاعری کا اس قدر شہرہ تھا کہ وقت کے حکمران جاودانی حیثیت حاصل کرنے کے لیے نظامی سے التماس کرتے تھے، کہ اپنی تصانیف ان کے نام منسوب کریں۔ حکمران آپ کو تحفے تحائف بھی بھیجتے تھے۔ آپ نے جب "خسرو شیریں" محمد بن ایلدگز کے نام منسوب کی، تو آپ کو دو گاؤں جاگیر میں دیے گئے۔ محمد بن ایلدگز فوت ہوا، تو اُس کے بھائی قزل ارسلان نے ایک گاؤں اپنی طرف سے انھیں جاگیر میں دیا۔ اس انعام کا نظامی نے خسرو شیریں کے اختتام پر ذکر بھی کیا ہے۔

نظامی زاہد و عابد شخص تھے، لیکن زہد و تقا کا کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ شعر و سخن میں انھیں یکتائی کا درجہ حاصل تھا۔ لیکن کبھی اس کی نمود و نمائش نہیں کی۔ عمر بھر میں انھوں نے کبھی شراب

نہیں پی۔ ان کے نزدیک شاعری کا مقصد یہ نہیں کہ امراء و روٴسا کی مدحت سرائی میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جائیں، بلکہ یہ کہ ادب میں کوئی زندۂ جاوید یادگار قائم کی جائے۔ نظامی نے خودداری پر بھی حرف نہیں آنے دیا۔ مثنویوں میں بعض حکمرانوں کی تعریف ضرور کی ہے، لیکن صرف اسی حد تک جس حد تک شاید وہ اس کے مستحق تھے۔ انھوں نے اپنی آزادی اور راست روی کو کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ آخر عمر میں گوشہ نشین ہو گئے تھے۔

نظامی کے اشعار کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ ان کی فضیلت صرف شعر و شاعری تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ انھیں جوانی میں تاریخ و ادب اور علم ہیئت سے گہری رغبت تھی۔ اور بڑی محنت سے انھوں نے یہ علوم حاصل کیے تھے۔ علم نجوم میں انھیں خاص طور سے بڑی مہارت تھی، چنانچہ وہ خود کہتے ہیں :-

هر چه هست از دقیقه های نجوم | با یکایک نهفته های علوم
خواندم و هر ورق که می جستم | چون ترا یافتم ورق شستم

تصنیفات

آپ کی غیر فانی شہرت کا سرمایہ خمسہ یا "پنج گنج" ہے جو پانچ مختلف مثنویوں پر مشتمل ہے۔ مثنویوں کے اشعار کی تعداد اٹھائیس ہزار بیان کی جاتی ہے۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں۔ مخزن الاسرار، خسرو شیریں، لیلی مجنوں ہفت پیکر اور سکندر نامہ

مخزن الاسرار - یہ نظامی کی اوّلیں مثنوی ہے، جس کے شروع میں تمہید ہے۔ اس کے بعد بیس مقالے ہیں، جو اخلاق و تصوف کے موضوع پر لکھے گئے ہیں۔ یہ ۵۷۰ھ مطابق ۱۱۷۴ء میں مکمل ہوئی۔

خسرو شیریں :- جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ ایک عشقیہ مثنوی ہے، جس کا مواد قدیم ساسانی عہد کی ایک داستان سے ماخوذ ہے۔ اس کا سالِ اختتام ۵۷۶ھ مطابق ۱۱۸۰ء ہے۔

لیلیٰ مجنوں :۔ اس مثنوی کا موضوع نہ صرف ایران، بلکہ ترکی میں بہت مقبول رہا ہے۔ اکثر شعرا نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اس عظیم داستان کا تعلق سرزمین عرب سے بتایا جاتا ہے۔ لیکن اس میں جو رنگ آمیزی کی گئی ہے، خالص ایرانی ہے۔ یہ مثنوی ۵۸۴ھ مطابق ۱۱۸۸ء میں مکمل ہوئی۔ لیلیٰ مجنوں کا قصہ حقیقی ہے یا فرضی! یہ بات عرصے سے موضوع بحث بنی ہوئی تھی، چند سال پیشتر مصر کی یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے دلائل سے یہ بات ثابت کی ہے۔ کہ لیلیٰ اور مجنوں کا قصہ محض فرضی ہے۔ کیونکہ عامر قبیلے میں قیس نام کوئی ایسا شخص نہیں ہوا جس کی محبوبہ لیلیٰ ہو۔[1]

ہفت پیکر یا بہرام نامہ :۔ اس داستان کا ماخذ بھی ساسانی عہد کا ایک قدیم قصہ ہے۔ اس داستان کا ملخص یہ ہے کہ ساسانی شاہزادہ بہرام گور شاہی محل "خورنق" کے ایک پوشیدہ کمرے میں سات مختلف ممالک کی شاہزادیوں کی تصویریں دیکھتا ہے۔ شہزادہ ان تصویروں کو دل وجان سے چاہنے لگتا ہے۔ آخر جب بہرام اپنے والد یزدگرد کی وفات پر تخت نشیں ہوتا ہے، تو وہ اپنی زندگی کا مقصد یہی سمجھتا ہے کہ ان شہزادیوں کو حاصل کرے، چنانچہ وہ ان سے شادی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور تصویروں کی بجائے خود شہزادیاں شاہی محل کی زینت بن جاتی ہے۔ یہ مثنوی ۵۹۳ھ مطابق ۱۱۹۶ء کی تصنیف ہے۔

سکندر نامہ :۔ یہ مثنوی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصے کا نام "اقبال نامہ" ہے۔ اور دوسرے کا "خرد نامہ"۔ اقبال نامہ میں سکندر کی فتوحات کا ذکر ہے اور خرد نامہ میں اس کے علم و دانش کا بیان ہے۔ سکندر نامہ کا سال تالیف ۵۹۷ھ مطابق ۱۲۰۰ء ہے۔

نظامی اپنی مثنویوں کی ترتیب کے متعلق لکھتے ہیں۔

سوی "مخزن" آوردم اول بسیچ   کہ سستی نکردم در آن کار ہیچ

---

[1] دیکھیے فائل رسالہ الہلال ذکر لیلیٰ و مجنوں از ڈاکٹر طٰہٰ حسین

وز دو چرب و شیرینی انگیختم | به "شیرین و خسرو" در آویختم
وز آنجا سرا پرده بیرون زدم | در عشق "لیلی و مجنون" زدم
وزین قصه چون باز پرداختم | سوی "هفت پیکر" فرس تاختم
کنون بر بساط سخن پروری | زنم کوس "اقبال اسکندری"

افکار و مطالب

نظامی کی مثنویاں توحید، نعت اور حکمت کے بیان سے شروع ہوتی ہے۔ توحید اور نعت لکھتے ہوئے شعر اور فلسفہ میں کچھ اس طرح امتزاج پیدا کرتے ہیں کہ مضمون بلند اور باعظمت ہو جاتا ہے۔ یہ خصوصیت آپ کی تمام مثنویوں میں نظر آتی ہے۔ "مخزن الاسرار" کے مقدمے کے چند شعر نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

ای همه هستی ز تو پیدا شده | خاک ضعیف از تو توانا شده
زیر نشین علمت کائنات | ما بتو قائم چو تو قائم بذات
هستی تو صورت و پیوند نه | تو بکس و کس بتو مانند نه
آنچه تغیر نه پذیرد، توئی | آنچه نمرده است و نمیرد توئی
ساقی شب دست کش جام تست | مرغ سحر دستخوش نام تست
پرده برانداز برون آی فرد | گرمنم آن پرده بهم در نورد
عجز فلک را بفلک وانمای | عقد جهان را ز جهان واگشای
ای به ازل بوده و نابوده ما | وی به ابد مانده و فرسوده ما
دور جنیبت کش فرمان تست | هفت فلک غاشیه گردان تست

۲- نظامی نے یوں تو داستان سرائی ہی کی ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ انہوں نے نہایت سود مند اخلاقی اور فلسفیانہ مسائل بھی بیان کیے ہیں۔ بعض بعض جگہ اپنے بیٹے محمد نظامی کو کو خطاب کر کے نصیحتیں کی ہیں۔ ان نصیحتوں کا انداز ایسا ہمہ گیر اور اثر خیز ہے کہ معلوم ہوتا

ہے، بیٹے کا نام لے کر وہ نوع انسان کی نئی پود کو خطاب کر رہے ہیں۔ ذیل کے اشعار میں دانش طلبی، شجاعت اور جدوجہد کی تلقین کی ہے۔ اور اسباب و علل پر نظر رکھنے کو کہا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ مخلوقِ خدا سے ادب شائستگی کا سلوک کرو۔ وہ کام ہرگز نہ کرو جس میں خجالت اٹھانی پڑے۔

واکنون کہ بچاردہ رسیدی — چون سرو باوج سر کشیدی
غافل منشین نہ وقت بازی ست — وقت ہنر است و سرفرازی ست
دانش طلب و بزرگی آموز — تا بہ نگرند روزت از روز
چون شیر بخود سپہ شکن باش — فرزند خصال خویشتن باش
دولت طلبی سبب نگہدار — با خلق خدا ادب نگہدار
وآن شغل طلب ز روی حالت — کز کردہ نباشدت خجالت
می کوش بہر ورق کہ خوانی — کآن دانشی را تمام دانی

اچھی گفتگو اچھے کردار اور بلند خیال رکھنے کے متعلق فرماتے ہیں۔

با اینکہ سخن بہ لطف آب است — کم گفتن ہر سخن صواب است
آب ار چہ ہمہ زلال خیزد — از خوردن پُر ملال خیزد
کم گوی و گزیدہ گوی چون در — تا ز اندکِ تو جہان شود پُر
یکدستہ گل دماغ پرور — از صد خرمن گیاہ بہتر
گر باشد صد ستارہ در پیش — تعظیم یک آفتاب از و بیش

ذیل کے اشعار میں نیک نامی احتیاط اور صبر کی تلقین کی ہے۔

سکہ بر نقش نیک نامی بند — کز بلندی رسی بچرخ بلند
صحبتی جوی کز نکو نامی — دور تو آورد نکو سر انجامی
ہم نشینی کہ نافہ بوی بود — خوب تر ز آنکہ یافہ گوی بود

در چنین رہ محسب چون پیران | گرد کن دامن از زبون گیران
رقص مرکب مبین کہ رہوار است | راہ بین تا چگونہ دشوار است
بس گرہ کو کلید پنہانیست | بس درشتی کہ دردی آسانیست
گرچہ پیکانِ غم جگر دوز است | درع صبر از برای این روز است
عہد خود با خدای محکم دار | دل ز دیگر علاقہ بی غم دار
گوہرِ نیک خود ز عقد مریز | و آنکہ بد گوہر است از و بگریز

دنیا کے عارضی اور فانی ہونے کو نہایت دلنشین اور اثر آفریں انداز میں بیان کیا ہے۔

چہ خوش باغیست باغِ زندگانی | گر ایمن بودی از بادِ خزانی
از ان سرد آمد این کاخِ دلآویز | کہ چون جا گرم کردی گویدت خیز
ز فرداد زدی کس را نشان نیست | کہ رفت آن از میان دین درمیان نیست
یک امروز است ما را نقد ایام | بر او ہم اعتمادی نیست تا شام
بیا تا یک دہن پر خندہ داریم | یک امشب را بشادی زندہ داریم

تلخی انتظار کے بعد وصال کی شیرینی حاصل ہوتی ہے۔

اگر چہ آفت عمر انتظار است | چو سر با وصل دارد سہل کار است
چہ خوشتر زانکہ بعد از انتظاری | بامیدی رسد امیدواری

خصوصیات شعری

ساقی نامہ۔ جب کسی مے گسار کو نشے کی طلب ہوتی ہے، تو وہ ساقی کو پکارتا ہے۔ نظامی کو جب بیان کا سوز نغمے پر اکساتا ہے، تو وہ بھی ساقی سے شراب مانگتے ہیں، لیکن نظامی کی شراب وہ نہیں، جو انسان پر خود فراموشی کا عالم طاری کر دیتی ہے، بلکہ ان کی شراب بھولی ہوئی باتوں کو یاد دلانے والی ہے۔ اس سے بیان کی قوت، تبحر اور استدراک کی قوت روشن ہوتی ہے۔ نظامی کا ساقی ان کا اپنا تخیل ہے اور شراب کے جام ان کے افکار ہیں۔

اس قسم کا شاعرانہ آغاز، جس میں شاعر ساقی کو خطاب کر کے مضمون کی تمہید پیش کرتا ہے، "ساقی نامہ" کہلاتا ہے۔ نظامی ہی وہ شاعر ہے، جس نے پہلے پہل ساقی نامہ لکھ کر فارسی ادب میں ایک نئی صنفِ سخن کا آغاز کیا۔ چنانچہ آپ اکثر اپنے مضمون کا آغاز ساقی نامہ ہی سے کرتے ہیں۔

"اسکندر نامہ" کے اصل مضمون کا آغاز بھی ساقی نامے سے کیا ہے۔ جس کے چند شعر درج کیے جاتے ہیں۔

بیا ساقی آن راحت انگیز روح	بدہ تا صبوحی کنم در صبوح
صبوحی کہ بر آب کوثر کنم	حلال است اگر تا بہ محشر کنم
جہان در بد و نیک پرور دن است	بسی نیک و بد ہاش بر گردن است
ز نیرنگ این پردہ دیر سال	خیالی شدم چون نیارم خیال
شب و روز ازین پردہ نیلگوں	بسی بازی چابک آید برون
گر آید ز من بازی دل پذیر	ہم از بازی چرخ گردندہ گیر
خیالی بر انگیزم از پیکری	کہ نارد چنیں، ہیچ بازیگری

سکندر نامے کا ہر نیا مضمون ساقی نامہ ہی سے شروع ہوتا ہے، جس سے گویا وہ اپنے سامعین کو اگلی بات سننے کے لیے آمادہ کرتے ہیں۔

زورِ کلام۔ نظامی سے پہلے بالعموم مثنوی لکھنے کا انداز یہ تھا کہ شاعر واقعات کی سادگی کے ساتھ ادا کر دیتا تھا۔ نظامی کسی واقعہ کو بیان کرتے ہوئے ایسے الفاظ، تراکیب اور تشبیہات استعمال کرتے ہیں، جن سے بیان باعظمت اور پرشکوہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً کمند کا ذکر کرتے ہیں۔

کمند اژدہای مسلسل شکنج	دمن باز کردہ بہ تاراج گنج

کمند میں شکنیں پڑی ہوئی ہیں۔ اس پیچ در پیچ کمند کو اژدہائے مسلسل شکنج سے تشبیہ دی ہے، جس نے خزانے کو تاخت و تاراج کرنے کے لیے منہ کھول رکھا ہے۔ نظامی نے اس تشبیہ سے کمند کے بیان کو کس قدر زوردار بنا دیا ہے۔

دارا کے جلال و جبروت کا ڈنکہ ایران سے روم تک بجتا تھا۔ اس کے نام سے سلاطین تھرتے تھے۔ روم و شام کے تاجدار اس کے باجگذار تھے۔ روم سے حسب معمول خراج آنے میں دیر ہوئی، تو دارا کی پُر ہیبت پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ اس نے سکندر کے پاس سفیر بھیج کر خراج کا مطالبہ کیا۔ سکندر اپنی فتوحات کے نشے میں سرشار تھا، اس نے ساری دنیا کو فتح کرنے کے منصوبے باندھ رکھے تھے۔ اس پیغام کو سن کر اس کی کیفیت ایسی ہوئی، جیسے کوئی اژدہا کو نوک سنان سے چھیڑ دے۔ سکندر نے جو جواب دیا، اس میں انتہا درجے کی تندی و تیزی ہے نظامی نے پُر شکوہ انداز میں سکندر کی کیفیاتِ قلب کا نقشہ کھینچا ہے۔

سپہر آن بساط کہن در نوشت — بساط دگر ملک را تازہ گشت
ہمہ سالہ گوہر نخیزد ز سنگ — گہی صلح سازد جہان گاہ جنگ
بگردن کشی بر مپیا در نفس — بشمشیر با من سخن گوی و بس
ترا آن کفایت کہ شمشیر من — نیارد بسر تخت تو زیر من
چو من پا رکابی کہ بردا شتم — عنان جہان بر تو بگذاشتم
تو با آنکہ داری چنان توشۂ ای — رہا کن مرا در چنیں گوشۂ ای
مرا آنم میاور کہ عزم آورم — بہم پنجگی با تو رزم آورم
بکیوان نہم مہر و آزرم را — بجوش آورم کینۂ گرم را
مگر شہ نداند کہ در روز جنگ — چہ سرہا بریدم بدانقصائی زنگ
بیک تاختن تا کجا تاختم — چہ گردن کشان را سر انداختم
کسی کار مغانی دہد طوق و تاج — چہ زنہاریان چون فرستد خراج
بدبین پائیگاہ مرا تا کجاست — بدین پایہ باید زمن مایہ خواست

واقعہ نگاری۔ واقعہ نگاری نظامی سے پہلے بھی اکثر شعراء نے کی ہے، لیکن آپ نے مظاہر کی تصویر کچھ اس انداز میں کھینچی ہے کہ ان کی حیات و حرکت بھی تصویر کے ساتھ ساتھ

ہمیں محسوس ہونے لگتی ہے۔ اشعار ذیل نظامی کی واقعہ نگاری کی بہت عمدہ مثال ہیں۔

چو پیر سبز پوشش آسمانی　　ز سبزہ بر کشید یخ جوانی
جوانان را و پیران را دگر بار　　بہ سر سبزی در آمد سرخ گلزار
گل از گل تخت کاؤسی بر آورد　　بنفشہ پر طاؤسی بر آورد
بسا مرغا کہ عشق آوازہ گردد　　بسا عشق کہن کان تازہ گردد
گل از شادی علم در باغ می زد　　سپاہ فاختہ بر زاغ می زد
سہی سرو از چمن قامت کشیدہ　　ز عشق لالہ پیراہن دریدہ
بنفشہ تاب زلف افگندہ بر دوش　　کشادہ باد نسرین را بنا گوش
عروسان ریاحین دست برزدی　　شکر خای شگوفہ شانہ در موی
ہوا بر سبزہ گوہرہا گسستہ　　زمرد را بمروارید بستہ
تذروان بر ریاحین پر فشاندہ　　ریاحین و تذروان بر نشاندہ
ز ہر شاخی شگفتہ نو بہاری　　گرفتہ ہر گلی بر کف نثاری
نوای بلبل و آوای دراج　　شکیب عاشقان را دادہ تاراج

تشبیہ و استعارہ - اکثر شعرا اپنے کلام میں ایسی تشبیہیں اور استعارے لاتے ہیں، جن سے حالات و واقعات کی تصویر کھنچ جاتی ہے، اور مضمون زیادہ بلند ہو جاتا ہے، لیکن نظامی نے اس فن میں اور بھی زیادہ جدت پیدا کی ہے۔ مثلاً ذیل کے شعر میں برف باری کا منظر پیش کیا ہے۔

ز باریدن ابر کافور بار　　سمن رستہ از دست ہای چنار

یعنی بادل جو کافور کی طرح برف برسا رہا ہے اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چنار کے ہاتھوں پر چنبیلی کے پھول کھل رہے ہیں۔

نظامی کی تشبیہوں میں نہ صرف یہ کہ ذوقِ نظارہ کی تسکین ہوتی ہے، بلکہ قوتِ لمس

بھی محظوظ ہوتی ہے۔

شیریں حوض میں نہا رہی ہے۔ اس لطافت اور نزاکت کو ذیل کے شعر میں بیان کیا ہے۔

تن صافش کہ می غلطید در آب	چو غلطد قاقمی بر روی سنجاب

شیریں کا لطیف اور شفاف جسم پانی میں لہراتا ہوا اس طرح نظر آتا ہے، جیسا کہ سطح سنجاب پر قاقم تھرک رہا ہے۔ سنجاب و قاقم لطافت و ملائمت کا مجسمہ تو ہیں، لیکن ساتھ ہی سنجاب پر قاقم کے تھرکنے سے وہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے، جو کسی مخملیں چیز کو چھونے سے حاصل ہوتی ہے۔

نظامی تشبیہ کے ذریعے حرکت و رفتار کا تصور بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ شیریں آراستہ ہو کر خسرو کی طرف جا رہی ہے۔ نظامی الفاظ کے ذریعے قارئین کو حسن رفتار کا تصور دلاتے ہیں۔

بدین طاؤس کرداری ہمائی	روان شد چون تذروی در ہوائی

شیریں ایک ہما ہے، جس نے طاؤس کا سا رنگ و روپ اختیار کیا ہے۔ اور وہ، ایسے بانکپن سے چلی جا رہی ہے، جیسے چکور ہوا میں تیرتا چلا جاتا ہے۔

نظامی اکثر ایک مفصل مضمون کو اس طرح مختصر الفاظ میں پیش کرتے ہیں کہ مضمون بہت بلند ہو جاتا ہے۔ دارا ہنخامنشی عظمت کا ایک نشاں ہے۔ اس کی وجہ سے تمام گزشتہ بادشاہوں کے کارنامے زندہ ہیں۔ نظامی اس کی موت کا ذکر ذیل کے شعر میں کرتے ہیں۔

نسب نامۂ دولت کیقباد	ورق بر ورق ہر سوی برد باد

یعنی دارا کا وجود کیانی بادشاہوں کا پورا نسب نامہ تھا۔ اس کی موت سے گویا اس نسب نامہ کا ایک ایک ورق اڑ کر بادِ اجل کی نذر ہو گیا۔

جذبات نگاری۔ قدما میں جذبات نگاری کی طرف جن شعراء نے اعتنا کیا، ان میں فردوسی کا کوئی جواب نہیں، لیکن فردوسی نے بھی انہی حالات سے متاثر ہو کر جذبات

نگاری کی ہے، جو بڑی وضاحت سے اس کے سامنے تھے۔ نظامی کی نظر جذبات کے اُن دقیق اور عمیق پہلوؤں پر بھی گئی ہے، جو عام نظر سے اوجھل ہیں۔

شیریں کے مرنے کی جھوٹی خبر سے متاثر ہو کر فرہاد نے چاہا کہ زندگی عشق کی بھینٹ چڑھا دے۔ چنانچہ جس تیشے سے وہ جوئے شیر کاٹ کر لا رہا تھا، اسی کو اپنے سر پر مار کر اپنی ناکام زندگی کو ختم کر دیا۔ فرہاد شیریں کا سچا پرستار تھا جس سے شیریں محروم ہو چکی ہے۔ اسے زندگی ایک طویل اور ڈراؤنی رات نظر آتی ہے، جو ختم ہوتی نظر نہیں آتی۔ اس رات کے خاتمے کے لیے وہ خدا کے حضور دُعا کرتی ہے۔

شبی ناخوش تر از سوگ عزیزان — وز و خونین دل بیمار خیزان
گرفته آسمان شب را در آغوش — شده خورشید را مشرق فراموش
ز ماری کی جهان را بند بر پای — فلک چون قطب حیران مانده بر جای
چو شب بود آنکه با صد دیو چون قیر — خروسی را نبود آواز تکبیر
دل شیرین در آن شب خیره مانده — چراغش چون دل شب تیره مانده
زبان بگشاد و گفتا ، ای زمانه — شب است این یا بلای جاودانه
چه جای شب سیه ماری ست گوئی — که زنگی آدمی خواری ست گوئی
شبا امشب جوانمردی در آموز — مرا یا زود کش یا زود شو روز
دل زنان را اگر فتم ، دست بستند — نه آخر پای پروین را شکستند
من آن شمعم که در شب زنده داری — همه شب می کشم چون شمع زاری
بخوان ای مرغ اگر داری زبانی — بخند ای صبح گر داری دهانی
اگر کافر نه ای مرغ شب گیر — چرا بر نا وری آواز تکبیر

ایک حسرت زدہ، ناکام و نامراد دل کی صدا اس سے اور زیادہ دردناک کیا ہوگی۔

دارا جو کیانی عظمت کا آخری علم بردار تھا۔ سکندر سے پے بہ پے شکستیں کھا کر آوارہ دیار

ہوا، اور بالآخر کسی ملازم کے ہاتھوں زخم کھا کر ہلاک ہوگیا۔ سکندر نے دارا کی زندگی کا یا ندگین انجام اپنی آنکھوں سے دیکھا اور عالم نزع میں دارا سے پوچھا، میں اب کیا خدمت بجالا سکتا ہوں؟

اس موقع پر دارا کے آخری جواب کو نظامی نے ذیل کے اشعار میں پیش کیا۔

چنین داد دارا بخسرو جواب — کہ بگذار تا سر نہم من بخواب
رہا کن کہ در من رہائی نماند — چراغ مرا روشنائی نماند
سپہرم بدان گونہ پہلو درید — کہ شد در جگر پہلوم ناپدید
تو ای پہلوان کامدی سوی من — نگہدار پہلو ز پہلوی من
کہ با آنکہ پہلو دریدم چو میغ — ہمی آید از پہلوم بوی تیغ
مہر سروران دار ہا کن ز دست — تو مشکن کہ مارا جہان خود شکست
اگر تاج خواہی ربود از سرم — یکی لحظہ بگذار تا بگذرم
زمین را منم تاجِ تارک نشین — مجنبان مرا تا نجنبد زمین

نظامی کی ہمہ گیری

ایران کے متقدمین میں اقلیم سخن کے بڑے بڑے تاجدار گزرے ہیں، لیکن کسی کی قوت سخن سرائی میں نظامی کی طرح ہمہ گیری نہ تھی۔ فردوسی کا نام رزمیہ مثنوی شاہنامہ کی بدولت زندہ ہے، عشقیہ شاعری میں انھیں کمال حاصل نہیں ہو سکا۔ خیام نے صرف فلسفہ و حکمت کی ترجمانی کی کوئی اور صنفِ سخن انھیں اپنی طرف مائل نہ کر سکی۔ انوری اور خاقانی قصیدے کے استاد تھے، لیکن کسی اور صنف سخن میں نہ چل سکے۔ سعدی غزل اور اخلاقی شاعری کے بادشاہ ہیں۔ لیکن رزمیہ نظم ان کے بس کی بات نہیں۔ حافظ غزل سرائی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، لیکن مثنوی میں انھیں کوئی کمال حاصل نہیں۔ ان کے برعکس نظامی ہیں کہ انھیں رزمیہ مثنوی میں فردوسی کے بعد سب سے اونچا مقام حاصل ہے۔ عشقیہ مثنوی میں تو سارے ایران میں اب تک ان کا کوئی ثانی نہیں اور اخلاقی شاعری میں بھی ان کا اب تک نام لیا جاتا ہے۔

نواں باب

دورِ مغول

چنگیز خاں کے تسلط سے تیمور کی تخت نشینی تک

(۶۲۸ تا ۷۷۱ ہجری مطابق ۱۲۳۰ تا ۱۳۶۹ عیسوی)

ساتویں صدی ہجری کی پہلی چوتھائی وسط ایشیا سے ایک ایسا خوفناک شخص ہلاکت کا طوفان بن کر آیا جس کے نزدیک دشمنوں کا تعاقب کرنا، اُن کے بہتے ہوئے خون گرم کو دیکھنا اُن کا مال و دولت لوٹنا، اُن کے لواحقین کی آہیں اور کراہیں سُننا، آباد گھروں کو پیوند زمین کرنا، اور سربفلک ایوانوں کو آگ لگانا، سب سے بڑی خوشی تھی۔ یہ شخص چنگیز خاں تھا۔

چنگیز خان ترکستان کے ایک تاتاری قبیلے کا سردار تھا۔ اس نے اپنی دلیری اور شجاعت سے تمام مغل قبائل کو اپنا مطیع بنا لیا، پھر رفتہ رفتہ تاتاری قبائل کو منظم کر کے اپنی طاقت اس حد تک بڑھائی کہ چین کے پایۂ تخت پر بھی اس کا تسلط ہوگیا۔

جس زمانے میں چنگیز خان کی بڑھتی ہوئی طاقت کی شہرت آگ کی طرح پھیل رہی تھی، اس وقت خوارزم میں علاءالدین محمد کی حکومت تھی، جو التسز کا پڑپوتا تھا۔ علاءالدین کی سلطنت اُدھر کوہ یورال سے لے کر خلیج فارس تک اور اِدھر دریائے سندھ سے لے کر دریائے فرات تک پھیلی ہوئی تھی۔

علاءالدین محمد نے ملک گیری کی ہوس میں کئی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو مٹا دیا۔ قراختائیوں کی حکومت بھی ختم ہوگئی، جو ایران اور ترکستان کے درمیان حدفاصل کا کام دیتی تھی، اس سے ایران ترکستان کا ہمسایہ بن گیا۔

حملۂ چنگیز خان شروع شروع میں علاءالدین محمد خوارزم شاہ اور چنگیز خان کی حکومت کے مابین دوستانہ روابط قائم تھے۔ ان میں تجارتی معاہدہ بھی ہوا جس کی رو سے ایرانی قافلے تجارت کی غرض سے ترکستان آتے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ تاتاریوں کا پانچ سو کا قافلہ ایران آیا، تو اطرار کے علاقے کے لوگوں نے اُن کا مال و اسباب لوٹ لیا۔ چنگیز خاں کو اطلاع ملی، تو اس نے خوارزم کے بادشاہ سے مطالبہ کیا کہ حاکم اطرار کو حکومت تاتار کے حوالے کر دیا جائے۔ لیکن خوارزم شاہ نے اس کا مطالبہ مسترد کر دیا۔ اس پر چنگیز خاں نے لشکر تاتار کو ایران پر حملہ کرنے کے لیے تیار کیا۔

ماوراالنہر پر حملہ ۶۱۶ھ مطابق ۱۲۱۹ء میں چنگیز خان کی فوجوں نے سیدھا اطرار کا رُخ کیا۔ جہاں کے لوگوں نے تاتاریوں کا قافلہ لوٹا تھا۔ علاءالدین محمد نے ان کا مقابلہ کرنے کے لیے سات لاکھ سپاہیوں کا لشکرِ جرار بھیجا۔ اوش اور سنجر کے درمیانی علاقے میں نہایت خونریز جنگ ہوئی۔ حاکم اطرار انجام سے آگاہ تھا چنانچہ اس نے تاتاریوں کا بڑی جگرداری سے مقابلہ کیا، لیکن اُسے خوارزم شاہ کی طرف سے کوئی امدادکمک نہ پہنچی۔ آخر اُس نے فوج سمیت قلعہ میں پناہ لی۔ تاتاریوں نے محاصرہ کر لیا۔ جو چھ ماہ تک جاری رہا۔ آخر اُسے تاتاریوں نے فتح کر لیا۔ حاکم اطرار گرفتار ہو گیا۔ چنگیز خاں نے جو لٹے ہوئے تاتاری قافلہ کا انتقام لینا چاہتا تھا، حکم دیا کہ چاندی پگھلا کر اس کے کانوں اور آنکھوں میں ڈال دی جائے۔

اس شکست کے بعد علاءالدین نے عافیت اسی میں دیکھی کہ ایران کے اہم ترین شہروں میں فوج متعین کر دے اور خود کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائے۔ اس کا یہ خیال تھا کہ چنگیز خان لوٹ مار کر کے واپس چلا جائے گا۔ لیکن یہ خیال غلط نکلا۔ چنگیز خاں نے اپنے دو بیٹوں چغتائی اور اکتائی کو اطرار کی مہم پر روانہ کیا تھا۔ جوجی کو شمال کی طرف جند کے علاقے میں بھیجا، اور خود اپنے سب سے چھوٹے بیٹے تولی کو لے کر بخارا پر حملہ آور ہوا۔

جوجی نے چند دنوں میں جند کا علاقہ فتح کر لیا۔ خوارزم شاہ کی بیس ہزار فوج چنگیز خان

کے مقابلے کے لیے آگے بڑھی۔ لیکن آخر تاتاریوں کے ہاتھوں شکست یاب ہوئی۔ چنگیز خان نے فتح کا پہلا جشن بخارا کی مسجد میں منایا۔ یہاں اہلِ بخارا کو جمع کر کے صاحب ثروت لوگوں کو مجبور کیا کہ ساری دولت فاتح حکمران کے حوالے کر دیں۔ آخر شہر کو لوٹ کر آگ لگا دی اور اہلِ بخارا کو فوج کی ادنیٰ خدمات بجالانے کے لیے غلام بنا لیا۔

بخارا کی فتح کے بعد چنگیز خان ایران کی زرخیز وادی "زرفشاں" کی طرف بڑھا جس کی حفاظت کے لیے چالیس ہزار فوج متعین تھی۔ یہاں کے لوگوں نے صرف اس خیال میں مقابلہ کیے بغیر ہتھیار ڈال دیئے کہ شاید ان کے ساتھ کوئی بہتر سلوک ہوگا۔ لیکن بزدلی کا یہ صلہ پایا کہ وادیٔ زرافشاں ان کے خون سے لالہ زار بن گئی اور وہاں کا ایک متنفس بھی زندہ نہ بچ سکا۔

علاء الدین محمد کا تعاقب

بزدل حکمران علاء الدین محمد اس وقت تک سمرقند میں مقیم رہا جب تک اس نے اپنے آپ کو وہاں محفوظ پایا۔ آخر جب اس نے سنا کہ سمرقند کا محاصرہ ہونے والا ہے، تو وہاں سے بلخ کی طرف چل دیا۔ پھر نیشاپور آگیا۔ اس موقع پر علاء الدین کے بہادر بیٹے جلال الدین منکوبرنی نے خیال ظاہر کیا کہ دریائے جیحوں کی سرحد پر مغلوں کی فوج کا مقابلہ کیا جائے اور فوجی کمان اس کے سپرد کر دی جائے لیکن علاء الدین نے اس کی یہ تجویز مسترد کر دی۔

علاء الدین نے سنا کہ دشمن دریائے جیحوں سے پار اتر آیا ہے، تو وہ نیشاپور سے بھی بھاگ کھڑا ہوا۔ چنگیز خان نے سمرقند فتح کر کے فوج کے دو دستے علاء الدین کے تعاقب میں بھیجے۔ یہ لوگ جہاں جاتے انسانوں کا خون بہاتے اور شہروں کو آگ لگاتے۔ اور کوئی ان کے مقابلے کو آگے نہ بڑھتا۔ علاء الدین اس وقت قزدین میں مقیم تھا۔ یہاں اس نے چاہا کہ تاتاریوں کے مقابلے کے لیے فوج تیار کرے اور جان کی بازی لگا دے۔ لیکن جب یہ خبر ملی کہ وہاں سے صرف ایک سو میل کے فاصلے پر ہمدان کے شہر کو تاتاریوں نے فتح کر لیا ہے، تو

اس کی فوج منتشر ہوگئی، اور وہ خود بھاگ کر ماژندران پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر بظاہر وہ محفوظ تھا لیکن اس کا وقت اب قریب آچکا تھا۔ آخر وہ بزدلی کو اپنی یادگار چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوا۔

علاءالدین کے تین بیٹے بچتے بچاتے بحری سفر کر کے خوارزم پہنچ گئے۔ یہاں کے لوگوں نے اُن کا پرتپاک خیرمقدم کیا۔ اور وسیع پیمانے پر چنگیز خان کا مقابلہ کرنے کے لیے فوجی تیاریاں ہونے لگیں۔ اسی اثنا میں جلال الدین کو پتا چلا کہ اس کے دو بھائی اس کے مخالف ہیں اور اس کے خلاف سازش کر رہے ہیں، تو وہ اپنے تین سو جاں بازوں کو ساتھ لے کر وہاں سے نکل گیا اور سولہ دن میں صحرا کو عبور کر کے نِسا پہنچ گیا۔ یہاں آکر اسے معلوم ہوا کہ اس پر منگولوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ اور سات سو فوج اس کی حفاظت کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔ جلال الدین نے پہلی مرتبہ تاتاریوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے ان پر حملہ کیا، اور فتح پائی۔ یہاں سے اس نے نیشاپور کا رخ کیا۔

ادھر چنگیز خان نے اپنی فوج کو چغتائی اور اوکتائی کی سرکردگی میں خوارزم پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا۔ یہاں اہل خوارزم نے ان کا مقابلہ کیا، لیکن آخر چھ ماہ کے محاصرے کے بعد انھوں نے صلح کی پیش کش کی۔ فتح یاب تاتاری جب خوارزم میں داخل ہوئے، تو یہاں کے صناعوں کے علاوہ، جنھیں منگولیا بھیج دیا گیا، تمام نوجوانوں اور بوڑھوں کو قتل کرا دیا اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا۔

خراسان کی تباہی

۶۱۷ھ مطابق ۱۲۲۰ء کا موسم گرما گزارنے کے بعد چنگیز نے ترمذ فتح کر کے یہاں کے باشندوں کا قتلِ عام کرایا۔

اس کے بعد بدخشان کو تباہ و برباد کیا۔ موسم بہار کے آغاز میں بلخ پر چڑھائی کی۔ یہاں اسے معلوم ہوا کہ جلال الدین غزنی میں فوجی تیاریاں کر رہا ہے، تو اس نے اہلِ بلخ کا قتلِ عام کرا کے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ تاکہ اسے رسد رسانی کے لیے کسی قسم کا خطرہ باقی نہ رہے۔ اسی اثنا میں چنگیز خاں نے اپنے بیٹے تولی کو خراسان بھیجا۔ تولی نے سب سے پہلے نسا کا

محاصرہ کیا۔ تاکہ تاتاری مقتولوں کا انتقام لے، جو جلال الدین کے حملے میں قتل ہوئے تھے۔ اس شہر کو انھوں نے پوری طرح تباہ کیا، صرف عورتیں اور بچے ان کے قتل عام سے بچے، جن کو انھوں نے غلام بنالیا۔ نسا کے بعد تولی نے مرو کو فتح کیا، جو سنجر سلجوقی کا دارالسلطنت رہنے کی وجہ سے متمدن ترین شہر سمجھا جاتا تھا۔ یاقوت حموی مشہور جغرافیہ دان تذکرہ ہفت اقلیم میں مرو کی عظیم الشان لائبریریوں اور وہاں کے علماء و فضلا کا ذکر کرتا ہے۔ پھر اس بات پر اظہارِ افسوس کرتا ہے کہ "ناپاک اور نابہنجار تاتاری اب مرو کے گلی کوچوں میں چکر لگا رہے ہیں۔ مرو کے خوبصورت مکانات کھنڈرات کی صورت میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ اب یہاں کے باسطوت ایوانوں کے کھنڈروں میں ہواؤں کی پرآشوب صداؤں کے سوا اور کوئی آواز کان نہیں پڑتی۔"

مرو کے شہر میں ایسے خوفناک طریقے سے انسانی خون بہایا گیا کہ نوع انسان قیامت تک اس گھناؤنی یاد کو نہ بھلا سکے گی۔ ابن الاثیر لکھتا ہے کہ "یہاں سات لاکھ انسانوں کا خون بہایا گیا تھا۔ سارا شہر سنسان کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا۔ آخر پورے سو سال بعد شاہ رخ مرزا نے اُسے پھر آباد کرایا۔"

مرو سے آگ کے دھوئیں ابھی نکل رہے تھے کہ تولی نے نیشاپور کا رخ کیا۔ نیشاپور فتح ہوا، تو یہاں کے ایک ایک فرد کو ذبح کیا گیا، آخر جب کتے اور بلیوں کے سوا کوئی متنفس نہ بچا، تو کٹے ہوئے سروں کے مینار بنائے گئے تاکہ ان کی فتوحات کی ہراس انگیز یاد افسانوں کی صورت میں قائم رہ جائے۔ خراسان کا آخری شہر جو تباہ ہوا، ہرات تھا۔

جلال الدین سے جنگ سنہ ۶۱۸ھ بمطابق سنہ ۱۲۲۱ء

جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے۔ جلال الدین نے سات سو تاتاریوں کو نسا کی مہم میں شکست دی تھی۔ یہ گویا ان درندوں پر اہلِ ایران کی پہلی فتح تھی۔ اس وقت جلال الدین غزنی میں تھا۔ یہاں سے فوج جمع کر کے بامیان آیا اور تاتاریوں سے دو دو ہاتھ کیے۔ اس تصادم میں ایک ہزار تاتاری ہلاک ہوئے۔ اتنے میں تاتاریوں کو بیس ہزار

کی کمک تشکی قوتو کی سرکردگی میں آ پہنچی۔ جلال الدین نے اپنے جاں نثاروں کے ساتھ غروب آفتاب تک مہم کو جاری رکھا۔ صبح کے وقت تاتاریوں نے گھوڑوں پر کچھ مصنوعی بت نصب کر دیئے۔ جس سے جلال الدین کے سپاہیوں کو شبہ ہوا کہ اور بھی کمک آگئی ہے، لیکن جلال الدین نے اپنے بہادروں میں کچھ اس طرح دلیری اور جاں نثاری کی روح پھونکی تھی کہ انہوں نے دوسرے دن لڑائی شروع کی اس طرح بڑھ بڑھ کر حملے کیے کہ تاتاریوں کی فوج کو پسپا ہونے کے سوا اور کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ تاتاری پسپا ہوئے، تو جلال الدین کی فوج میں مال غنیمت پر کچھ جھگڑا ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غوریوں کی فوج نے جلال الدین کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور اس کی فوجی طاقت کمزور ہو گئی۔

اس اثناء میں یہ اطلاع آئی کہ چنگیز خاں غزنی پر حملہ کرنے کی فکر میں ہے۔ اب جلال الدین کا خیال تھا کہ وہ کوہ ہندوکش کی سرحد کی حفاظت نہ کر سکے گا، اس لیے یہ مناسب سمجھا کہ دریائے سندھ کو عبور کر کے ہندوستان پہنچ جائے۔ چنگیز خاں غزنی پر حملہ آور ہوا، تو اسے معلوم ہوا کہ جلال الدین دو ہفتے پیشتر یہاں سے نکل چکا ہے۔ اس نے اتنی تیزی سے جلال الدین کا تعاقب کیا۔ کہ سندھ پار کرنے سے پہلے ہی اُسے جا لیا۔ جلال الدین اب حیران تھا کہ کیا کرے ادھر متلاطم دریا تھا، اور ادھر آگ اور خون کا سمندر تھا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ چنگیز کی فوج سے مردانہ وار مقابلہ کرے۔ چنانچہ اپنے چند سو رفیقوں کے ساتھ مقابلے میں آیا۔ اور اتنی دلیری سے لڑا کہ چنگیز ایسا خونخوار انسان بھی اس کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ جلال الدین اپنے دستے کے مرکز میں کھڑا بجلی کی سی تیزی کے ساتھ دائیں بائیں حملے کرتا تھا۔ صبح سے دوپہر تک وہ ایک ہی رفتار سے تلوار چلاتا رہا، آخر اس کا گھوڑا تھک گیا، تو دوسرے گھوڑے پر سوار ہوا اور اس طرح حملے کرتا رہا، جیسے شیر ہاتھیوں کی صفوں پر حملے کرتا ہے۔ آخر اُسے کچھ راستہ ملا، تو سندھ کے بلند کنارے پر آیا۔ جو تیس فٹ بلند تھا، یہاں سے گھوڑے کو ایڑ لگا کر دریا میں کود پڑا۔ اُس کے ساتھیوں نے بھی اس کی پیروی کی۔ مشہور مورخ پرسی سائیکس[1] لکھتا ہے کہ چنگیز خاں نے اس موقع پر بڑی وسیع ظرفی

---

[1] تاریخ ایران حصہ دوم ص۸۲

کا ثبوت دیا اور اپنے تیر اندازوں کو روک دیا، کہ ان پر تیر نہ برسائیں، وہ اپنے بیٹوں کو دکھانا چاہتا تھا کہ بہادر انسان ایسے ہوتے ہیں۔

یہاں سے فارغ ہو کر چنگیز خاں غزنی آیا اور غزنی کی فوجی اہمیت کو کم کرنے کی غرض سے اُسے تباہ کیا۔ جلال الدین کی فتح سے متاثر ہو کر اہل ہرات نے بغاوت کی تھی۔ اس لیے چنگیز خاں نے اب ہرات کا رُخ کیا اور یہاں پچاس ہزار انسانوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔

خراسان اور عراق عجم میں نوعِ انسان پر جو کچھ بیتی، اس کا خلاصہ ملک جوینی کی زبان میں سنیئے۔ "خراسان[1] اور عراق کی آبادی اگر بغیر کسی رکاوٹ کے لگاتار بڑھتی رہے تو قیامت تک یہ آبادی، اس آبادی کا دسواں حصہ بھی نہیں ہو سکتی۔ جتنی حملۂ تاتار سے پیشتر تھی۔"

ان مہموں سے فارغ ہو کر چنگیز خاں نے مسجدوں میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور ایران کے متعلق مطمئن ہو کر وطن کو واپس ہولیا، جہاں اس نے ۶۲۴ ہجری بمطابق ۱۲۲۶ء میں وفات پائی۔

چنگیز خاں کے بعد اس کا بیٹا اوکتائی قاآن خانِ تاتار مقرر ہوا۔ اس نے اپنے ایک نامی جرنیل جورماغون کی سرکردگی میں بیس ہزار فوج جلال الدین پر حملہ کرنے کے لیے بھیجی۔

۶۲۰ ہجری میں جلال الدین نے ہندوستان سے واپس ایران آ کر خوارزم میں اپنی حکومت قائم کی اور ایران کے حکمران منگولوں کو متعدد شکستیں دیں۔ آخری شکست انھیں اصفہان میں ہوئی۔

جلال الدین کا فرار اور وفات

جلال الدین ابھی انہی مہموں میں اُلجھا ہوا تھا کہ جورماغون بیس ہزار تازہ دم تاتاری

---

[1] تاریخ جہانگشائے۔ جوینی مرتبہ ڈاکٹر براؤن

فوج لیے ہوئے آموجود ہوا۔ جلال الدین اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھا، اس کی فوج فتح اصفہان کے بعد منتشر ہو چکی تھی اور اتنی جلدی جمع نہ ہو سکتی تھی۔ اس لیے اب جلال الدین کے لیے اس کے سوائے اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہاں سے نکل بھاگے۔ چنانچہ اس نے کردستان کے پہاڑوں میں پناہ لی۔ آخر یہاں کے ایک فرد نے شاہی لباس کے لالچ میں اُسے ہلاک کر ڈالا۔ اس طرح ایک بہادر بادشاہ، جسے تاریخ ایران شہابِ ثاقب کے نام سے یاد کرتی ہے۔ بے بسی کے عالم میں جہانِ گزراں کو خیرباد کہہ گیا۔

ایلخانی عہد

اوکتائی قاآن کے بعد منگو قاآن تاتار کا بادشاہ بنا۔ اس نے اپنے ایک بھائی قبلا خان کو چین کی مہم پر اور دوسرے بھائی ہلاکو خان کو ایران کی مہم پر بھیجا۔ جہاں ہلاکو خاں[1] نے ایلخانی عہد کی بنیاد رکھی۔ چنانچہ ہلاکو اور اس کے جانشینوں کا عہد، ایلخانی عہد کہلاتا ہے۔

ہلاکو نے بھی آگ اور خون کے جو طوفان بپا کیے چنگیز خان کے طوفانوں سے کم نہ تھے۔ اس کا بھی پہلا شکار خراسان ہی ہوا۔ سب سے پہلے اس نے فرقہ اسمٰعیلیہ کا رُخ کیا، جو حسن بن صباح کے طریقہ کار کی بدولت فرقہ حشیشین کہلانے لگا تھا۔

فرقہ اسمٰعیلیہ کا "شیخ الجبال" اس وقت حسن بن صباح تھا۔ اب وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کی وفات پر اس کا ایک رفیق کار کیا بزرگ امید "شیخ الجبال مقرر ہوا۔ کیا بزرگ کے زمانے میں بھی فرقہ اسمٰعیلیہ کی نشر و اشاعت کا کام بدستور جاری رہا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا محمد، پھر اس کا پوتا حسن یکے بعد دیگرے شیخ الجبال مقرر ہوئے۔ حسن اپنے پیش روؤں کی نسبت زیادہ جاہ پسند تھا، چنانچہ اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اپنے آپ کو نزار کی اولاد سے ظاہر کر کے امامت کا دعویٰ کیا، لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ کسی

---

[1] ہلاکو کا لقب ایل خان تھا۔

نامعلوم شخص نے اُسے ہلاک کر دیا - اس کے بعد حسن کا بیٹا بھی اس کے نقش قدم پر چلا - آخر جب حسن کے بیٹے جلال الدین کو شیخ الجبال کا منصب ملا ، تو اس نے فرقہ اسمٰعیلیہ کے عقائد چھوڑ کر صحیح العقیدہ مسلمان ہونے کا اعلان کیا ، اور سچے مسلمانوں کے سے طور طریقے اختیار کیے - اس نے خلیفۃ المسلمین الناصر سے نیاز مندانہ روابط پیدا کیے اور ہمسایہ مسلمان حکمرانوں سے دوستانہ مراسم قائم کیے -

جلال الدین کے بعد اس کا بیٹا رکن الدین خور شاہ نو سال کی عمر میں شیخ الجبال بنا - ۶۵۴ھ مطابق ۱۲۵۶ء میں جب ہلاکو خاں نے فرقہ اسمٰعیلیہ کے خلاف مہم شروع کی تو اس وقت شیخ الجبال رکن الدین ہی تھا -

ہلاکو خاں نے فرقہ اسمٰعیلیہ کے ایک ایک قلعے پر حملہ کیا اور ان کے تمام مرکزوں میں جا جا کر اسمٰعیلیوں کا قتل عام کیا - رکن الدین کے پاس ایسی کوئی باقاعدہ فوج نہ تھی ، جو ہلاکو خاں کے مقابلے کے لیے میدان میں آتی - اس لیے اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور قہستان اور الموت قلعے بھی اس کے حوالے کر دیئے ، جو اسمٰعیلی فرقے کی قوت و شوکت کا سرچشمہ تھے - یہاں جو اسمٰعیلی اسے نظر آیا تہ تیغ کرا دیا گیا - فرقہ اسمٰعیلی کا آخری شیخ الجبال رکن الدین خور شاہ بچا لیکن آخر میں ہلاکو خاں نے اسے بھی مروا دیا -

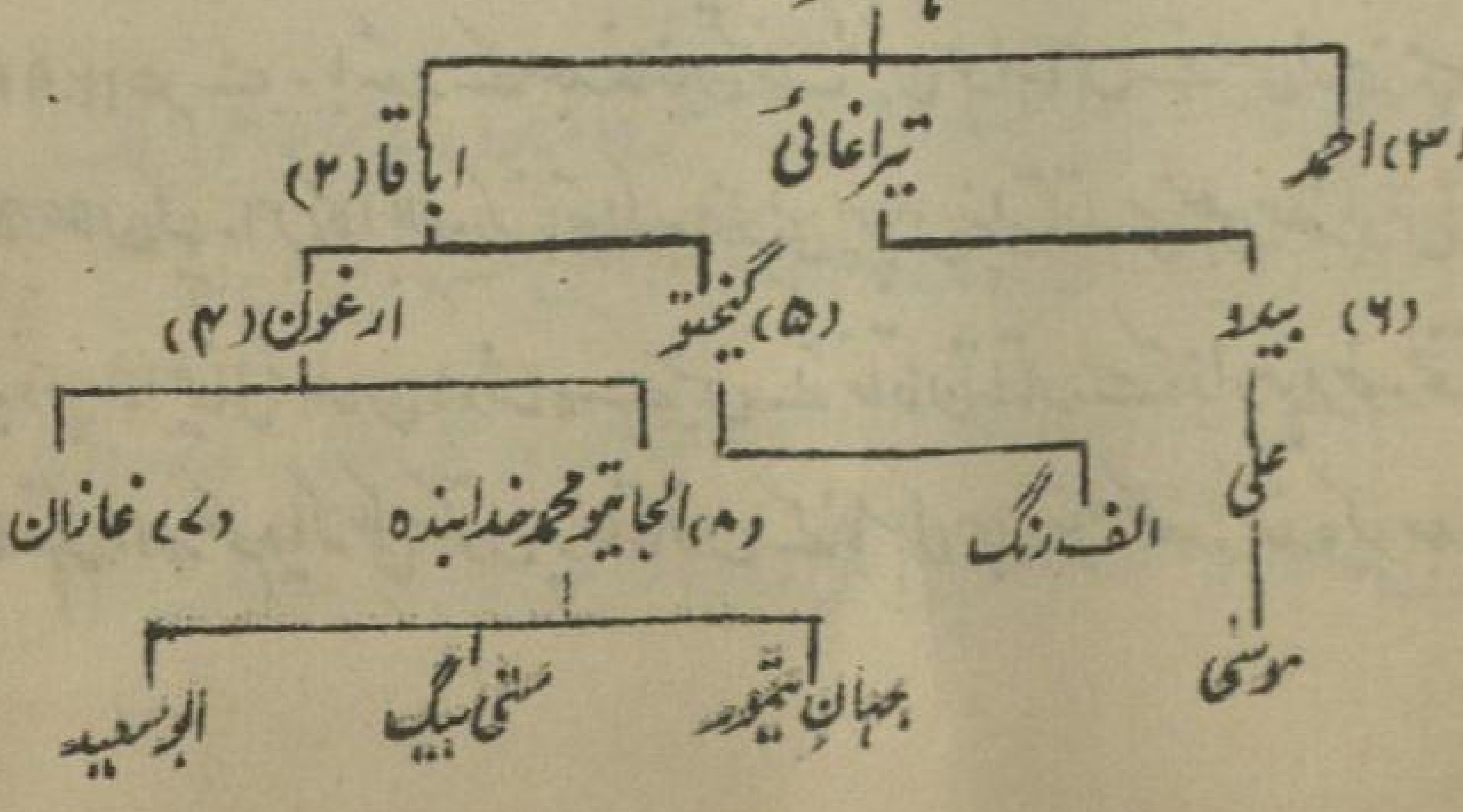
بغداد پر حملہ اور خلافت عباسیہ کا خاتمہ

ہلاکو کی دوسری بڑی مہم حملہ بغداد تھی - بغداد دنیائے اسلام کا بہت بڑا مرکز تھا ، اس لیے وہ بغداد پر حملہ کرتا ہوا کچھ ہچکچاتا تھا - لیکن آخر وہ اپنے نجومیوں سے صلاح مشورہ کر کے اپنے صدر مقام ہمدان سے ۶۵۶ھ مطابق ۱۲۵۸ء میں روانہ ہوا - حملے کی تیاری کی خبر آن کی آن میں آگ کی طرح پھیل گئی - لیکن ہلاکو خاں کچھ عافیت پسند اور عشرت طلب شخص بھی تھا - اس لیے وقت مقررہ سے وہ بہت بعد میں بغداد پہنچا - خلیفہ مستعصم باللہ اس عرصے میں اگر چاہتا ، تو فدائیان اسلام کی بہت بڑی فوج تیار کر سکتا تھا - لیکن اس نے اپنے

سونے چاندی کے خزانوں کو جو تالے لگا رکھے تھے، وہ بدستور لگے رہے۔ نہ فوج کو منظم کیا، نہ ہی مزید فوج بھرتی کی۔ آخر ہلاکو نے بغداد کا محاصرہ کر لیا، جو سات روز تک جاری رہا۔ خلیفۃ المسلمین اپنے وزیر ابن العلقمی کے بہکانے پر شہزادوں سمیت ہلاکو کے استقبال کو نکلا۔ کہ شاید مصالحت کی کوئی صورت بن جائے۔ لیکن اس نے ان سب کو گرفتار کر لیا۔ شہزادوں کو اس نے قتل کرا دیا، اور خلیفۃ المسلمین مستعصم باللہ کو ایک بورے میں بند کرا کے گھوڑوں کی ٹاپوں میں روند ڈالا۔ اور اس طرح اس بدنصیب خلیفہ پر ۶۵۶ھ میں خلافتِ عباسیہ کا چراغ گل ہو گیا۔

ہلاکو جب فرقہ اسمٰعیلیہ اور خلیفۃ المسلمین کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کر چکا تو اس نے ایک مستقل حکومت قائم کرنے کی طرف توجہ دی۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اسے ایران کے تین جلیل القدر علماء کی خدمات حاصل تھیں، جو ملکی امن و امان کی طرف اسے توجہ دلاتے رہتے تھے۔ ان میں سے ایک صاحبِ دیوان شمس الدین تھا۔ جو دس سال تک ہلاکو کا وزیر رہا۔ دوسرا عطا ملک جوینی تھا، جو ایران کا ایک عظیم الشان مورخ اور مدبر تھا۔ تیسرا مشہور حکیم نصیر الدین طوسی تھا، جو فلسفہ اخلاق کا بہت بڑا معلم سمجھا جاتا ہے۔

ہلاکو کے جانشین



منگولوں کا عہدِ حکومت دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا عہد چنگیز خان سے شروع ہو کر منگو قاآن کی وفات پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس عہد میں منگولوں کی تمام حکومتیں مرکز کے ماتحت تھیں، جو قراقرم میں تھا۔ تمام حکمرانوں کی نامزدگیاں مرکز کی طرف سے ہوتی تھیں۔ دوسرا عہد ایلخانیوں کا ہے، جو ہلاکو سے شروع ہو کر ابو سعید پر ختم ہوتا ہے۔ اس عہد میں حکمرانوں کو مقرر کرنے میں مرکز کو کوئی دخل نہ تھا، بلکہ حکومت نسل در نسل چلتی تھی۔ یہاں تک کہ غازان نے مرکز کا رہا سہا تعلق بھی ختم کر دیا۔ اور ایلخانی حکومت تاتار کے خاقانوں سے بالکل آزاد ہو گئی۔

ہلاکو فتح بغداد کے سات سال بعد تک ایران کے مطلق العنان بادشاہ کی حیثیت میں حکومت کرتا رہا۔ آخر ۶۶۳ھ بمطابق ۱۲۶۴ء میں وہ فوت ہوا۔ ہلاکو کے بعد ایلخانی عہد کے نو اور حکمرانوں نے حکومت کی۔ یہ حکمران اباقا، احمد تقودار، ارغون، گاتختو، بائیدو، غازان، الجائتو، محمد خدابندہ اور ابو سعید ہیں۔

ایلخانیوں کا قبولِ اسلام

ایلخانی عہد کے اولین چند حکمران چنگیز خاں کی طرح لامذہب تھے۔ ان میں پہلا احمد تقودار ہے جس نے اسلام قبول کر لیا، اس پر تاتاری سخت برہم ہوئے۔ اور پھر جب انھوں نے یہ دیکھا کہ احمد اپنے نئے ہم مذہبوں کی طرف زیادہ مائل ہے، تو اس کی فوج نے اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ اور احمد مارا گیا۔ اس کا عرصہ حکومت ۶۸۰ تا ۶۸۳ھ بمطابق ۱۲۸۱ تا ۱۲۸۴ء ہے۔ احمد کے بعد اس کا بیٹا ارغون تخت نشین ہوا۔ جس نے ۶۸۳ سے ۶۹۰ھ بمطابق ۱۲۸۱ تا ۱۲۹۱ء ہے۔ بائیدو کے بعد غازان تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا۔ اس کا اعلان کرنا تھا کہ ساتھ ہی پچاس ہزار تاتاری بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

یہ وہ پہلا ایلخانی مسلمان بادشاہ ہے جس نے خاقان تاتار سے آزاد ہو کر خود مختار حکومت قائم کی، اور حکم دیا کہ ملکی سکوں پر خاقانوں کے نام کی بجائے "کلمہ" کندہ کیا جائے۔ اس کے

عہد کے آغاز میں متعدد بغاوتیں ہوئیں، لیکن اس نے بڑی دلیری اور دانشمندی سے ان کو فرو کیا۔

فتح شام

غازان نے ۶۹۹ ھج بمطابق ۱۲۹۹ء میں شام پر حملہ کیا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اہلِ شام اپنے مصری مملوک حکمرانوں کے ظلم و ستم سے سخت پریشان تھے۔ اُن کے پنجے سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ وہ غازان سے نجات کے طلب گار ہوئے۔

حمص کے مقام پر ایلخانیوں اور مصریوں میں جنگ ہوئی، جس میں غازان کو فتح ہوئی اور اس نے بھی پچھے مسلمان حکمرانوں کی طرح یہ اعلان کیا کہ وہ شام کو نجات دلانے کے لیے آیا ہے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا، نہ کسی پر ظلم و ستم ہی ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

غازان کی وفات پر اس کا بھائی محمد خدابندہ الجائتو کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا۔ اس کا عرصہ حکومت ۷۰۳ تا ۷۱۶ ھج بمطابق ۱۳۰۴ تا ۱۳۱۶ء ہے۔

خدابندہ کا بیٹا ابوسعید ۷۱۶ ھج میں تخت نشین ہوا اور اس نے ۷۳۶ ہجری تک حکومت کی۔ ابوسعید لاولد فوت ہوا، اس لیے اس کے بعد تخت و تاج کی وراثت پر بہت خانہ جنگیاں ہوئیں اور پوری مملکت میں انتشار پھیل گیا۔ اس عہد کے آخری چند حکمران اپنے جرنیلوں کے ہاتھوں میں کٹ پتلی کی طرح تھے۔ بہر حال ان کی حکومت بھی ۷۵۴ ھج بمطابق ۱۳۴۴ء تک قائم رہی۔ بالآخر تیمور کے ہاتھوں ایلخانی عہد کا خاتمہ ہوگیا۔

ایلخانی حکومت میں انتشار پیدا ہونے کی وجہ سے بعض خاندانوں نے جابجا اپنی الگ چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کر لیں۔ ان میں سے قابلِ ذکر حکومتیں حسب ذیل ہیں۔

خاندانِ جلائر

اس خاندان کی حکومت ۷۳۶ سے ۸۱۴ ھج بمطابق ۱۳۳۴ تا ۱۴۱۱ء تک قائم رہی۔ اس کا بانی امیر حسین جلائر تھا۔ یہ حکومت عراق

میں قائم ہوئی اور ایک مرتبہ پھر بغداد حکومت کا دارالسلطنت ہو گیا۔

۷۵۷ھ مطابق ۱۳۵۶ء میں امیر حسین کا بیٹا اس کا جانشین ہوا۔ اس نے آذربائیجان فتح کر کے اپنے علاقے میں شامل کر لیا۔ رفتہ رفتہ موصل اور دیار بکر پر بھی اس کا تسلط ہو گیا۔ اس کی وفات پر ۷۸۴ھ مطابق ۱۳۸۲ء میں یہ حکومت اس کے بیٹے سلطان احمد کو ملی، جسے تیمور نے ۸۱۲ھ مطابق ۱۴۱۰ء میں ختم کر دیا۔

آلِ مظفر

آلِ مظفر نے ۷۱۳ھ سے ۷۹۵ھ مطابق ۱۴۱۰ء تا ۱۳۹۲ء حکومت کی۔ اس حکومت کا بانی شرف الدین مظفر تھا، جسے غازان نے یزد کا حاکم مقرر کیا تھا۔ شرف الدین کے بعد اس کے بیٹے مبارز الدین محمد کو یزد کی حکومت ملی۔ ۷۵۴ھ مطابق ۱۳۵۳ء میں اس نے فارس کے حاکم شاہ اسحٰق انجو کو شکست دے کر فارس کے صوبے کی حکومت سنبھالی۔ تین سال بعد اس نے اصفہان بھی فتح کر لیا۔ ابھی شاید اس کی فتوحات کا سلسلہ اور بھی بڑھتا لیکن اس کے تین بیٹوں نے سازش کر کے اسے گرفتار کر لیا، اور اس کی آنکھوں میں سلائی پھیر کر بصارت سے محروم کر دیا۔ اس کے جانشینوں کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہوئی۔ سوائے اس کے کہ ان میں سے شاہ شجاع ایسا حکمران تھا، جو خود شعر و سخن کا دلدادہ تھا اور جس نے حافظ شیرازی کی قدر دانی کر کے اس کے لیے امن و سکون کے مواقع بہم پہنچائے۔

اتابکانِ فارس

اتابکانِ فارس کو اتابکانِ سلغری بھی کہتے ہیں۔ اُن کی حکومت کا زمانہ ۵۴۳ تا ۶۶۳ھ مطابق ۱۱۴۸ تا ۱۲۲۴ء ہے

اس عہد کا مشہور حکمران، ابوبکر بن سعد زنگی ہے، جو ارغون خان کے زمانے میں ۶۲۳ سے ۶۵۸ھ مطابق ۱۲۲۶ تا ۱۲۵۹ء فارس کا حکمران رہا۔ اس کے بعد سعد بن ابوبکر کو فارس کی حکومت ملی، یہ وہی سعد ہے، جس کے نام کی مناسبت سے سعدیؔ نے اپنا تخلص اختیار کیا اور اپنی شہرۂ آفاق تصنیف گلستان اس کے نام منسوب کی۔

سعد بن ابو بکر کے بعد محمد بن سعد اس کا جانشین ہوا۔ لیکن یہ حکمران بہت کم عمر تھا، اس لیے حکومت کے کام اس کی والدہ انجام دیتی تھی۔ اڑھائی سال کی حکومت کے بعد وہ فوت ہوا۔ تو محمد شاہ بن سلغر بن اتابک سعد نے فارس کی حکومت سنبھالی۔ لیکن یہ شخص بڑا ظالم اور سفاک تھا، اس لیے امراء نے اسے گرفتار کر کے ہلاکو کے پاس بھیج دیا۔ آخر ۶۶۳ھ مطابق ۱۲۶۴ء میں اتابک سعد کی بیٹی آتش خاتون نے حکومت سنبھالی۔ اس نے ہلاکو خان کے بیٹے منگو تیمور سے شادی کر لی۔ لیکن ۶۸۶ھ مطابق ۱۲۸۷ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اور اب فارس براہ راست تاتاریوں کے تسلط میں آ گیا۔

اتابکانِ یزد

ان کی حکومت ۴۴۳ سے ۶۱۸ھ مطابق ۱۰۵۱ تا ۱۲۲۱ء قائم رہی۔ بالآخر آل مظفر نے اس حکومت کو ختم کیا۔

قراختائیاں کرمان

اس سلسلے کا بانی براق حاجب ہے، جو جلال الدین منکوبرنی کے بھائی سلطان غیاث الدین کا ایک سردار تھا۔ یہ حکومت ۶۱۹ تا ۷۰۳ھ مطابق ۱۲۲۲ تا ۱۳۰۳ء قائم رہی۔

آلِ کرت

آل کرت کی حکومت ترکستان کے بعض علاقوں میں تھی، جو ۶۴۳ سے ۷۸۳ھ مطابق ۱۲۴۶ تا ۱۳۸۶ء قائم رہی اور بالآخر امیر تیمور نے اس حکومت کو ختم کیا۔ ان کا دار السلطنت ہرات تھا۔

خاندانِ انجو

خاندان انجو کی حکومت فارس اور اس کے اطراف میں تھی، جو ۷۰۴ سے ۷۵۸ھ مطابق ۱۳۵۰ء تک قائم رہی۔ ان کا پایۂ تخت شیراز تھا۔

سربداران

سربداروں کی حکومت سبزوار کے علاقے میں تھی۔ ان کا عرصہ حکومت ۷۳۸ تا ۷۸۸ھ مطابق ۱۳۳۷ تا ۱۳۸۶ء ہے۔

تاتاری یلغاروں کے اثرات

تاتاری یلغاروں میں چالیس پچاس لاکھ انسانوں کا خون بہ گیا۔ شہروں کے شہر پیوندِ زمین ہوئے۔ مدارس اور خانقاہوں کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ بڑے بڑے قدیم علمی ذخیرے تاتاری آندھیوں نے ورق ورق کرکے اڑا دیئے۔ تاتاریوں کا حملہ عالم اسلام کے لیے سب سے بڑا حادثہ تھا۔ اس سے اہلِ ایران کا اخلاق و ادب بھی متاثر ہوا۔ اس کے چند نمایاں اثرات حسب ذیل ہیں۔

(۱) تاتاریوں کی بے پناہ قتل و غارت گری نے مسلمانوں کے شجاعانہ جذبات کچھ عرصے کے لیے فنا کر دیئے۔ اس لیے محب وطن شعراء کی توجہ رزمیہ شاعری سے ہٹی رہی۔

(۲) شعراء نے اپنی آنکھوں سے نوعِ انسان پر مصیبتوں کے پہاڑ پھٹتے دیکھے تھے اس لیے ان کی طبیعتیں تصوف کی طرف مائل ہوئیں۔ چنانچہ متعدد نامور صوفی شعراء مثلاً فریدالدین عطار، مولانا روم، اوحدی، عراقی، سعدی اور مغربی اسی دَور سے متعلق ہیں

(۳) اسی زمانے کے شعراء نے بڑے بڑے تاج داروں کے تخت و تاج چھنتے دیکھے انسانوں کی گراں قدر زندگیاں خونی درندوں کے ہاتھوں مٹتی دیکھیں، اس لیے ان کے کلام میں بے ثباتی دنیا، عبرت، تسلیم و رضا اور قناعت ایسے مضامین بکثرت آئے ہیں۔ سعدی، ابن یمین، اور حافظ کی شاعری کی امتیازی خصوصیات یہی مضامین ہیں۔

(۴) ایران کے قدیمی بادشاہ شعر و سخن کے دلدادہ اور شعراء کے مربی اور قدر دان ہوتے تھے، اس لیے شعراء زیادہ تر قصیدے کہتے تھے۔ لیکن اُن کے جانشینوں یعنی ایلخانیوں کو شعر و سخن سے کوئی علاقہ نہ تھا اس لیے شعراء کی توجہ قصیدہ گوئی سے ہٹ گئی۔ اور ایک نئے صنف سخن یعنی غزل کی طرف توجہ ہوئی جو اب تک تشبیب کی صورت میں قصیدہ ہی کا ایک حصہ تھی۔ تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ اس صنف کی ابتداء شیخ سعدی نے کی اور ان کے معاصرین نے ان کی ہمنوائی کی۔

فوج لیے ہوئے آموجود ہوا۔ جلال الدین اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھا، اس کی فوج فتح اصفہان کے بعد منتشر ہو چکی تھی اور اتنی جلدی جمع نہ ہو سکتی تھی۔ اس لیے اب جلال الدین کے لیے اس کے سوائے اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہاں سے نکل بھاگے۔ چنانچہ اس نے کردستان کے پہاڑوں میں پناہ لی۔ آخر یہاں کے ایک فرد نے شاہی لباس کے لالچ میں اُسے ہلاک کر ڈالا۔ اس طرح ایک بہادر بادشاہ، جسے تاریخ ایران شہابِ ثاقب کے نام سے یاد کرتی ہے۔ بے بسی کے عالم میں جہانِ گزران کو خیرباد کہہ گیا۔

ایلخانی عہد

اوکتائی قاآن کے بعد منگو قاآن تاتار کا بادشاہ بنا۔ اس نے اپنے ایک بھائی قبلا خان کو چین کی مہم پر اور دوسرے بھائی ہلاکو خان کو ایران کی مہم پر بھیجا۔ جہاں ہلاکو خاں[1] نے ایلخانی عہد کی بنیاد رکھی۔ چنانچہ ہلاکو اور اس کے جانشینوں کا عہد، ایلخانی عہد کہلاتا ہے۔

ہلاکو نے بھی آگ اور خون کے جو طوفان بپا کیے چنگیز خان کے طوفانوں سے کم نہ تھے۔ اس کا بھی پہلا شکار خراسان ہی ہوا۔ سب سے پہلے اس نے فرقہ اسمٰعیلیہ کا رُخ کیا، جو حسن بن صباح کے طریقہ کار کی بدولت فرقہ حشیشین کہلانے لگا تھا۔

فرقہ اسمٰعیلیہ کا "شیخ الجبال" اس وقت حسن بن صباح تھا۔ اب وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کی وفات پر اس کا ایک رفیق کار کیا بزرگ امید "شیخ الجبال" مقرر ہوا۔ کیا بزرگ کے زمانے میں بھی فرقہ اسمٰعیلیہ کی نشر و اشاعت کا کام بدستور جاری رہا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا محمد، پھر اس کا پوتا حسن یکے بعد دیگرے شیخ الجبال مقرر ہوئے۔ حسن اپنے پیش روؤں کی نسبت زیادہ جاہ پسند تھا، چنانچہ اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اپنے آپ کو نزار کی اولاد سے ظاہر کر کے امامت کا دعویٰ کیا، لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ کسی

---

[1] ہلاکو کا لقب ایل خان تھا۔

نامعلوم شخص نے اُسے ہلاک کر دیا - اس کے بعد حسن کا بیٹا بھی اس کے نقش قدم پر چلا۔ آخر جب حسن کے بیٹے جلال الدین کو شیخ الجبال کا منصب ملا، تو اس نے فرقہ اسمٰعیلیہ کے عقائد چھوڑ کر صحیح العقیدہ مسلمان ہونے کا اعلان کیا، اور سچے مسلمانوں کے سے طور طریقے اختیار کیے۔ اس نے خلیفۃ المسلمین الناصرؔ سے نیاز مندانہ روابط پیدا کیے اور ہمسایہ مسلمان حکمرانوں سے دوستانہ مراسم قائم کیے۔

جلال الدین کے بعد اس کا بیٹا رکن الدین خورشاہ نو سال کی عمر میں شیخ الجبال بنا۔ ۶۵۴ھ مطابق ۱۲۵۶ء میں جب ہلاکو خاں نے فرقہ اسمٰعیلیہ کے خلاف مہم شروع کی تو اس وقت شیخ الجبال رکن الدین ہی تھا۔

ہلاکو خاں نے فرقہ اسمٰعیلیہ کے ایک ایک قلعے پر حملہ کیا اور ان کے تمام مرکزوں میں جا جا کر اسمٰعیلیوں کا قتل عام کیا۔ رکن الدین کے پاس ایسی کوئی باقاعدہ فوج نہ تھی، جو ہلاکو خاں کے مقابلے کے لیے میدان میں آتی - اس لیے اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور قہستان اور الموت قلعے بھی اس کے حوالے کر دیئے، جو اسمٰعیلی فرقے کی قوت و شوکت کا سرچشمہ تھے۔ یہاں جو اسمٰعیلی اسے نظر آیا تہ تیغ کرا دیا گیا۔ فرقہ اسمٰعیلی کا آخری شیخ الجبال رکن الدین خورشاہ بچا لیکن آخر میں ہلاکو خاں نے اسے بھی مروا دیا۔

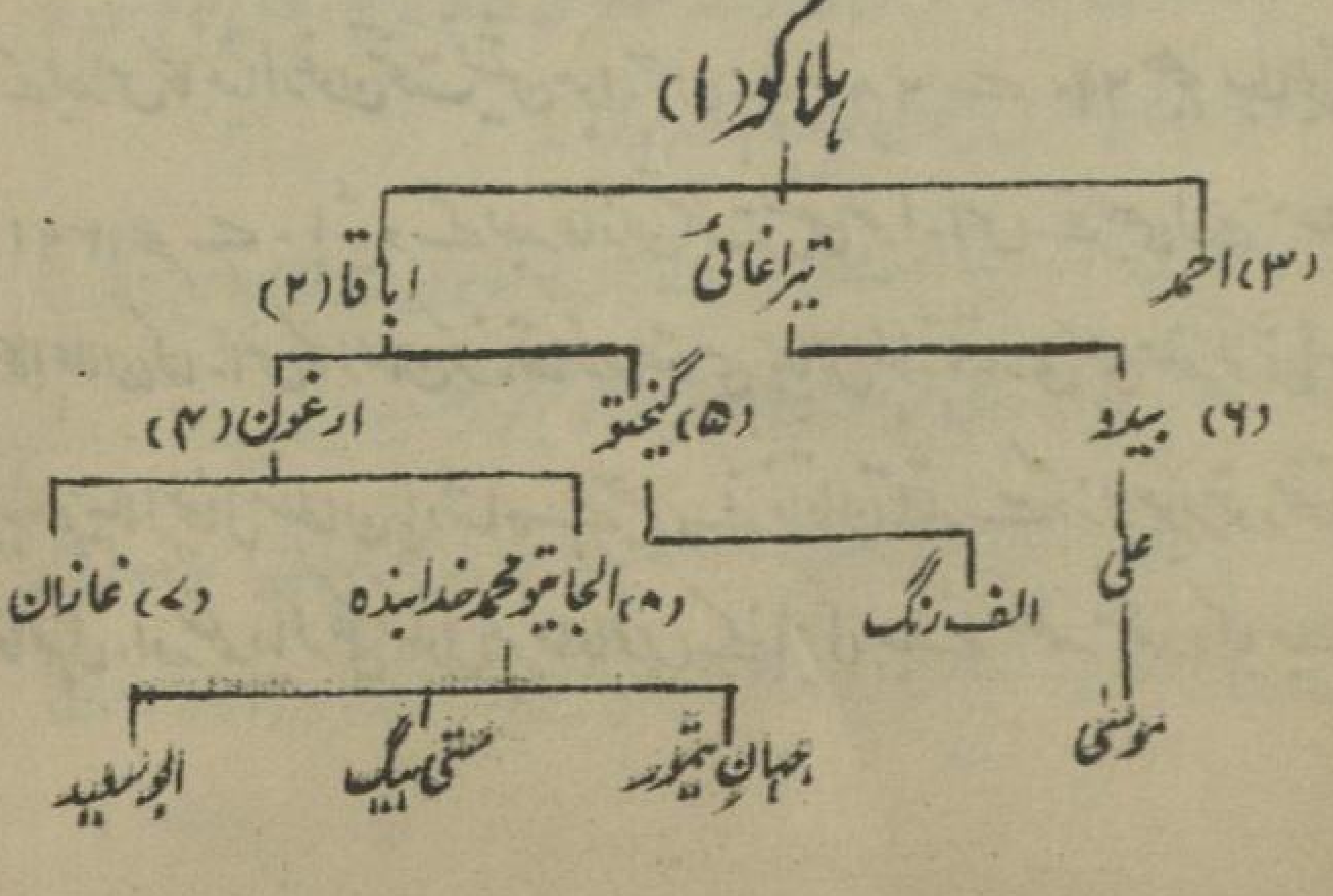
بغداد پر حملہ اور خلافتِ عباسیہ کا خاتمہ

ہلاکو کی دوسری بڑی مہم حملہ بغداد تھی۔ بغداد دنیائے اسلام کا بہت بڑا مرکز تھا، اس لیے وہ بغداد پر حملہ کرتا ہوا کچھ ہچکچاتا تھا۔ لیکن آخر وہ اپنے نجومیوں سے صلاح مشورہ کر کے اپنے صدر مقام ہمدان سے ۶۵۶ھ بمطابق ۱۲۵۸ء میں روانہ ہوا۔ حملے کی تیاری کی خبر آن کی آن میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ لیکن ہلاکو خاں کچھ عافیت پسند اور عشرت طلب شخص بھی تھا - اس لیے وقت مقررہ سے وہ بہت بعد میں بغداد پہنچا۔ خلیفہ مستعصم باللہ اس عرصے میں اگر چاہتا، تو فدائیان اسلام کی بہت بڑی فوج تیار کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے اپنے

سونے چاندی کے خزانوں کو جو تالے لگا رکھے تھے، وہ بدستور لگے رہے۔ نہ فوج کو منظم کیا، نہ ہی مزید فوج بھرتی کی۔ آخر ہلاکو نے بغداد کا محاصرہ کر لیا، جو سات روز تک جاری رہا۔ خلیفۃ المسلمین اپنے وزیر ابن العلقمی کے بہکانے پر شہزادوں سمیت ہلاکو کے استقبال کو نکلا۔ کہ شاید مصالحت کی کوئی صورت بن جائے۔ لیکن اس نے ان سب کو گرفتار کر لیا۔ شہزادوں کو اس نے قتل کرا دیا، اور خلیفۃ المسلمین متعصم باللہ کو ایک بورے میں بند کرا کے گھوڑوں کی ٹاپوں میں روند ڈالا! اور اس طرح اس بدنصیب خلیفہ پر ۶۵۶ھ میں خلافتِ عباسیہ کا چراغ گل ہو گیا۔

ہلاکو جب فرقہ اسمٰعیلیہ اور خلیفۃ المسلمین کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کر چکا تو اس نے ایک مستقل حکومت قائم کرنے کی طرف توجہ دی۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اسے ایران کے تین جلیل القدر علماء کی خدمات حاصل تھیں، جو ملکی امن و امان کی طرف اسے توجہ دلاتے رہتے تھے۔ ان میں سے ایک صاحبِ دیوان شمس الدین تھا۔ جو دس سال تک ہلاکو کا وزیر رہا۔ دوسرا عطا ملک جوینی تھا، جو ایران کا ایک عظیم الشان مورخ اور مدبر تھا۔ تیسرا مشہور حکیم نصیر الدین طوسی تھا، جو فلسفہ اخلاق کا بہت بڑا معلم سمجھا جاتا ہے۔

ہلاکو کے جانشین



منگولوں کا عہدِ حکومت دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا عہد چنگیز خان سے شروع ہو کر منگو قاآن کی وفات پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس عہد میں منگولوں کی تمام حکومتیں مرکز کے ماتحت تھیں، جو قراقرم میں تھا۔ تمام حکمرانوں کی نامزدگیاں مرکز کی طرف سے ہوتی تھیں۔ دوسرا عہد ایلخانیوں کا ہے، جو ہلاکو سے شروع ہو کر ابو سعید پر ختم ہوتا ہے۔ اس عہد میں حکمرانوں کو مقرر کرنے میں مرکز کو کوئی دخل نہ تھا، بلکہ حکومت نسل در نسل چلتی تھی۔ یہاں تک کہ غازان نے مرکز کا رہا سہا تعلق بھی ختم کر دیا۔ اور ایلخانی حکومت تاتار کے خاقانوں سے بالکل آزاد ہو گئی۔

ہلاکو فتح بغداد کے سات سال بعد تک ایران کے مطلق العنان بادشاہ کی حیثیت میں حکومت کرتا رہا۔ آخر ۶۶۳ھ بمطابق ۱۲۶۴ء میں وہ فوت ہوا۔ ہلاکو کے بعد ایلخانی عہد کے نو اور حکمرانوں نے حکومت کی۔ یہ حکمران اباقا، احمد تغودار، ارغون، گائختو، بائیدو، غازان، الجائتو، محمد خدا بندہ اور ابو سعید ہیں۔

ایلخانیوں کا قبولِ اسلام

ایلخانی عہد کے اولین چند حکمران چنگیز خاں کی طرح لامذہب تھے۔ ان میں پہلا احمد تغودار ہے جس نے اسلام قبول کر لیا، اس پر تاتاری سخت برہم ہوئے۔ اور پھر جب انھوں نے یہ دیکھا کہ احمد اپنے نئے ہم مذہبوں کی طرف زیادہ مائل ہے، تو اس کی فوج نے اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ اور احمد مارا گیا۔ اس کا عرصہ حکومت ۶۸۰ تا ۶۸۳ھ بمطابق ۱۲۸۱ تا ۱۲۸۴ء ہے۔ احمد کے بعد اس کا بیٹا ارغون تخت نشین ہوا۔ جس نے ۶۸۳ سے ۶۹۰ھ بمطابق ۱۲۸۱ تا ۱۲۹۱ء ہے۔ بائیدو کے بعد غازان تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا۔ اس کا اعلان کرنا تھا کہ ساتھ ہی پچاس ہزار تاتاری بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

یہ وہ پہلا ایلخانی مسلمان بادشاہ ہے جس نے خاقان تاتار سے آزاد ہو کر خود مختار حکومت قائم کی، اور حکم دیا کہ ملکی سکوں پر خاقانوں کے نام کی بجائے "کلمہ" کندہ کیا جائے۔ اس کے

عہد کے آغاز میں متعدد بغاوتیں ہوئیں، لیکن اس نے بڑی دلیری اور دانشمندی سے ان کو فرو کیا۔

فتح شام غازان نے ۶۹۹ ھجری بمطابق ۱۲۹۹ء میں شام پر حملہ کیا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اہلِ شام اپنے مصری مملوک حکمرانوں کے ظلم وستم سے سخت پریشان تھے۔ اُن کے پنجے سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ وہ غازان سے نجات کے طلب گار ہوئے۔

حمص کے مقام پر ایلخانیوں اور مصریوں میں جنگ ہوئی، جس میں غازان کو فتح ہوئی اور اس نے بھی سچے مسلمان حکمرانوں کی طرح یہ اعلان کیا کہ وہ شام کو نجات دلانے کے لیے آیا ہے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا، نہ کسی پر ظلم وستم ہی ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

غازان کی وفات پر اس کا بھائی محمد خدابندہ الجائتو کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا۔ اس کا عرصہ حکومت ۷۰۳ تا ۷۱۶ ھجری بمطابق ۱۳۰۴ تا ۱۳۱۶ء ہے۔

خدابندہ کا بیٹا ابوسعید ۷۱۶ ھجری میں تخت نشین ہوا اور اس نے ۷۳۶ ہجری تک حکومت کی۔ ابوسعید لاولد فوت ہوا، اس لیے اس کے بعد تخت وتاج کی وراثت پر بہت خانہ جنگیاں ہوئیں اور پوری مملکت میں انتشار پھیل گیا۔ اس عہد کے آخری چند حکمران اپنے جرنیلوں کے ہاتھوں میں کٹ پتلی کی طرح تھے۔ بہر حال ان کی حکومت بھی ۷۴۵ ھجری بمطابق ۱۳۴۴ء تک قائم رہی۔ بالآخر تیمور کے ہاتھوں ایلخانی عہد کا خاتمہ ہوگیا۔

ایلخانی حکومت میں انتشار پیدا ہونے کی وجہ سے بعض خاندانوں نے جابجا اپنی الگ چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کرلیں۔ ان میں سے قابلِ ذکر حکومتیں حسب ذیل ہیں۔

خاندانِ جلائر اس خاندان کی حکومت ۷۳۶ سے ۸۱۴ ھجری بمطابق ۱۳۳۴ تا ۱۴۱۱ء تک قائم رہی۔ اس کا بانی امیر حسین جلائر تھا۔ یہ حکومت عراق

میں قائم ہوئی اور ایک مرتبہ پھر بغداد حکومت کا دارالسلطنت ہوگیا۔

۷۵۷ھ مطابق ۱۳۵۶ء میں امیر حسین کا بیٹا اس کا جانشین ہوا۔ اس نے آذربائیجان فتح کرکے اپنے علاقے میں شامل کرلیا۔ رفتہ رفتہ موصل اور دیار بکر پر بھی اس کا تسلط ہوگیا۔ اس کی وفات پر ۷۸۴ھ مطابق ۱۳۸۲ء میں یہ حکومت اس کے بیٹے سلطان احمد کو ملی، جسے تیمور نے ۸۱۲ھ مطابق ۱۴۱۰ء میں ختم کردیا۔

آلِ مظفر

آل مظفر نے ۷۱۳ھ سے ۷۹۵ھ مطابق ۱۴۱۰ء تا ۱۳۹۲ء حکومت کی۔ اس حکومت کا بانی شرف الدین مظفر تھا، جسے غازان نے یزد کا حاکم مقرر کیا تھا۔ شرف الدین کے بعد اس کے بیٹے مبارز الدین محمد کو یزد کی حکومت ملی۔ ۷۵۴ھ مطابق ۱۳۵۳ء میں اس نے فارس کے حاکم شاہ اسحٰق انجو کو شکست دے کر فارس کے صوبے کی حکومت سنبھالی۔ تین سال بعد اس نے اصفہان بھی فتح کرلیا۔ ابھی شاید اس کی فتوحات کا سلسلہ اور بھی بڑھتا لیکن اس کے تین بیٹوں نے سازش کرکے اسے گرفتار کرلیا، اور اس کی آنکھوں میں سلائی پھیر کر بصارت سے محروم کردیا۔ اس کے جانشینوں کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہوئی۔ سوائے اس کے کہ ان میں سے شاہ شجاع ایسا حکمران تھا، جو خود شعر و سخن کا دلدادہ تھا اور جس نے حافظ شیرازی کی قدر دانی کرکے اس کے لیے امن و سکون کے مواقع بہم پہنچائے۔

اتابکانِ فارس

اتابکانِ فارس کو اتابکانِ سلغری بھی کہتے ہیں۔ اُن کی حکومت کا زمانہ ۵۴۳ تا ۶۶۳ھ مطابق ۱۱۴۸ تا ۱۲۲۴ء ہے۔ اس عہد کا مشہور حکمران، ابوبکر بن سعد زنگی ہے، جو ارغون خان کے زمانے میں ۶۲۳ سے ۶۵۸ھ مطابق ۱۲۲۶ تا ۱۲۵۹ء فارس کا حکمران رہا۔ اس کے بعد سعد بن ابوبکر کو فارس کی حکومت ملی، یہ وہی سعد ہے، جس کے نام کی مناسبت سے سعدی نے اپنا تخلص اختیار کیا اور اپنی شہرۂ آفاق تصنیف گلستان اس کے نام منسوب کی۔

سعد بن ابوبکر کے بعد محمد بن سعد اس کا جانشین ہوا۔ لیکن یہ حکمران بہت کم عمر تھا، اس لیے حکومت کے کام اس کی والدہ انجام دیتی تھی۔ اڑھائی سال کی حکومت کے بعد وہ فوت ہوا۔ تو محمد شاہ بن سلغر بن اتابک سعد نے فارس کی حکومت سنبھالی۔ لیکن یہ شخص بڑا ظالم اور سفاک تھا، اس لیے امراء نے اسے گرفتار کر کے ہلاکو کے پاس بھیج دیا۔ آخر ۶۶۳ھ مطابق ۱۲۶۴ء میں اتابک سعد کی بیٹی آتش خاتون نے حکومت سنبھالی۔ اس نے ہلاکو خان کے بیٹے منگو تیمور سے شادی کر لی۔ لیکن ۶۸۶ھ مطابق ۱۲۸۷ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اور اب فارس براہ راست تاتاریوں کے تسلط میں آ گیا۔

اتابکانِ یزد

ان کی حکومت ۴۴۳ سے ۶۱۸ھ مطابق ۱۰۵۱ تا ۱۲۲۱ء قائم رہی۔ بالآخر آل مظفر نے اس حکومت کو ختم کیا۔

قراختائیاں کرمان

اس سلسلے کا بانی براق حاجب ہے، جو جلال الدین منکوبرنی کے بھائی سلطان غیاث الدین کا ایک سردار تھا۔ یہ حکومت ۶۱۹ تا ۷۰۳ھ مطابق ۱۲۲۲ تا ۱۳۰۳ء قائم رہی۔

آلِ کرت

آل کرت کی حکومت ترکستان کے بعض علاقوں میں تھی، جو ۶۴۳ سے ۷۸۳ھ مطابق ۱۲۴۶ تا ۱۳۸۶ء قائم رہی اور بالآخر امیر تیمور نے اس حکومت کو ختم کیا۔ ان کا دار السلطنت ہرات تھا۔

خاندانِ انجو

خاندان انجو کی حکومت فارس اور اس کے اطراف میں تھی، جو ۷۰۲ سے ۷۵۸ھ مطابق ۱۳۵۰ء تک قائم رہی۔ ان کا پایۂ تخت شیراز تھا۔

سربداران

سربداروں کی حکومت سبزوار کے علاقے میں تھی۔ ان کا عرصہ حکومت ۷۳۸ تا ۷۸۸ھ مطابق ۱۳۳۷ تا ۱۳۸۶ء ہے۔

تاتاری یلغاروں کے اثرات

تاتاری یلغاروں میں چالیس پچاس لاکھ انسانوں کا خون بہ گیا۔ شہروں کے شہر پیوندِ زمین ہوئے۔ مدارس اور خانقاہوں کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ بڑے بڑے قدیم علمی ذخیرے تاتاری آندھیوں نے ورق ورق کر کے اڑا دیئے۔ تاتاریوں کا حملہ عالم اسلام کے لیے سب سے بڑا حادثہ تھا۔ اس سے اہلِ ایران کا اخلاق و ادب بھی متاثر ہوا۔ اس کے چند نمایاں اثرات حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) تاتاریوں کی بے پناہ قتل و غارت گری نے مسلمانوں کے شجاعانہ جذبات کچھ عرصے کے لیے فنا کر دیئے۔ اس لیے محبّ وطن شعراء کی توجہ رزمیہ شاعری سے ہٹی رہی۔

(۲) شعراء نے اپنی آنکھوں سے نوعِ انسان پر مصیبتوں کے پہاڑ پھٹتے دیکھے تھے اس لیے ان کی طبیعتیں تصوّف کی طرف مائل ہوئیں۔ چنانچہ متعدد نامور صوفی شعراء مثلاً فرید الدین عطار، مولینا روم، اوحدی، عراقی، سعدی اور مغربی اسی دَور سے متعلق ہیں

(۳) اسی زمانے کے شعراء نے بڑے بڑے تاج داروں کے تخت و تاج چھنتے دیکھے انسانوں کی گراں قدر زندگیاں خونی درندوں کے ہاتھوں مٹتی دیکھیں، اس لیے ان کے کلام میں بے ثباتی دنیا، عبرت، تسلیم و رضا اور قناعت ایسے مضامین بکثرت آئے ہیں۔ سعدؔی، ابن یمینؔ، اور حافظؔ کی شاعری کی امتیازی خصوصیات یہی مضامین ہیں۔

(۴) ایران کے قدیمی بادشاہ شعر و سخن کے دلدادہ اور شعراء کے مربّی اور قدر دان ہوتے تھے، اس لیے شعراء زیادہ تر قصیدے کہتے تھے۔ لیکن اُن کے جانشینوں یعنی ایلخانیوں کو شعر و سخن سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ اس لیے شعراء کی توجہ قصیدہ گوئی سے ہٹ گئی۔ اور ایک نئے صنفِ سخن یعنی غزل کی طرف توجہ ہوئی جو اب تک تشبیب کی صورت میں قصیدہ ہی کا ایک حصّہ تھی۔ تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ اس صنف کی ابتداء شیخ سعدی نے کی اور ان کے معاصرین نے ان کی ہمنوائی کی۔

دورِ مغول کے شعراء

کمال اسمٰعیل اصفہانی

کمال اسمٰعیل، جمال الدین اصفہانی کا لڑکا ہے۔ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ یہ بھی اپنے باپ کی طرح خوارزم شاہوں، طبرستان کے امیروں اور اصفہان کے مذہبی پیشواؤں یعنی آلِ خجند کے قصائد کہتا رہا۔ کمال اسمٰعیل نے تاتاریوں کی خونریزیاں خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں، اور خود بھی، ۶۳۳ ہجری میں جب قتلِ عام ہوا تو تاتاریوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔

خلاق المعانی

کمال اسمٰعیل اپنے اشعار میں نئے مضامین اور دقیق معانی لاتا ہے اس لیے اس کے معاصرین اسے "خلاق المعانی" کہتے تھے۔ چند اشعار نمونے کی غرض سے درج ذیل ہیں۔

برف

هرگز کسی نداد بدینسان نشان برف — گوئی که لقمه ایست زمین در دهان برف
مانند پنبه دانه که در پنبه تعبیه است — اجرام کوه هاست نهان در میان برف
بی نیزه های آتش و بی تیغ آفتاب — نتوان بتیر ماه کشیدن کمان برف
وقتی چنین نشاط کسی را مسلم است — کاسباب عیش دارد اندر زمان برف

مظالم مغول

کس نیست که تا بر وطن خود گرید — بر حال تباه مردم بد گرید
دی بر سر مرده ای دو صد شیون بود — امروز یکی نیست که بر صد گرید

خواجہ فریدالدین عطار وفات سنہ ۶۲۷ھ مطابق سنہ ۱۲۲۹ء

محمد نام اور لقب فریدالدین

ہے ۔ آپ کے والد ابوبکر ابراہیم کا پیشہ عطاری تھا چنانچہ آپ نے بھی معاش کا یہی وسیلہ اختیار کیا۔ اسی لیے عطار کے نام سے مشہور ہوئے ۔ عطار آپ کو دوافروش ہونے کی وجہ سے کہا جاتا تھا۔ لیکن دوافروشی کے علاوہ آپ مطب بھی کرتے تھے ۔ چنانچہ اپنی مثنوی خمرنامہ میں لکھتے ہیں۔

بہ دارو خانہ پانصد شخص بودند　　　کہ در ہر روز نبضم می نمودند

خواجہ عطار نیشاپور میں پیدا ہوئے ۔ رضازادہ شفق[1] لکھتے ہیں کہ آپ کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں ہو سکی ، بہر حال کہا جا سکتا ہے کہ چھٹی صدی ہجری کے وسط میں تولد ہوئے ، اور سو برس کی عمر میں وفات پائی انکی مثنویوں میں ستر برس تک کے اشارات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً

چون ز مقصود خود نہ دیدم بوی　　　سوی عمر وہم زیان آمد

وین ہفتاد سالہ داد بباد　　　مرد میخانۂ مغان آمد

خواجہ عطار نے جوانی کے ایام میں اپنے والد کے مرشد قطب الدین حیدر سے اکتساب فیض کیا اور انہی کی رہنمائی میں تصوف کے مراحل طے کیے ۔ اہلِ تصوف مجاہدوں اور ریاضتوں کے ساتھ ساتھ دنیوی امور کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیتے تھے ، اس لیے آپ نے دنیاوی مشاغل بھی جاری رکھے ۔ اشعار سے پتا چلتا ہے کہ آپ نے رے ، کوفہ ، مصر ، دمشق ، ہندوستان اور ترکستان کی سیاحت بھی کی تھی ۔

تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ سفر کے دوران آپ صرف عارفوں کے حالات ہی کی جستجو نہیں کرتے تھے ، بلکہ خود بھی معرفت کی منزلیں طے کرتے رہے ۔ اسی وجہ سے مولانائے روم جیسے عارف نے عطار کی شان میں کہا ہے ۔

ہفت شہر عشق را عطار گشت
ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

---

[1] تاریخ ادبیات ایران ص ۱۲۳

من آں ملای رومی ام کہ از نطقم شکر ریزد
ولیکن در سخن گفتن غلام شیخ عطارم

بعض اور مشائخ نے بھی اپنے اشعار میں خواجہ عطار کی فضیلت کا اعتراف کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل دل آپ کی بزرگی سے بہت متاثر تھے۔

جلاوطنی پروفیسر براؤن[1]، مرزا محمد قزوینی کے حوالے سے خواجہ عطار کی کتاب "مظہر العجائب" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کتاب سے آپ کے انتہائی شیعہ رجحانات کا پتا چلتا ہے۔ انہی رجحانات کی وجہ سے سمرقند کے ایک عالم نے خواجہ عطار پر کفر کا فتویٰ لگایا اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس نے براق[2] ترکمان کے روبرو ان پر کفر کا الزام لگا کر انھیں جلاوطن کرنے کا مشورہ بھی دیا۔ اس پر آپ مکہ معظمہ چلے گئے اور قیام مکہ کے دوران اپنی کتاب "لسان الغیب" تصنیف کی۔ اس میں اپنے آپ کو ناصر خسرو سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی جس طرح ناصر خسرو لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو کر بدخشان میں عزلت نشین ہوا، اسی طرح انھوں نے بھی مکہ معظمہ میں گوشہ نشینی اختیار کی۔

وفات خواجہ عطار کی وفات کے متعلق تذکرہ نویسوں میں اختلاف پایا جاتا ہے قاضی نور اللہ شوستری نے آپ کا سال وفات ۵۹۷ھ مطابق سنہ ۱۲۰۰ء لکھا ہے، لیکن یہ درست نہیں، کیونکہ خواجہ عطار نے اپنی تصنیف "مظہر العجائب" میں نجم الدین کبریٰ کی وفات کا ذکر کیا ہے۔ نجم الدین ایک مشہور صوفی تھے، جو خوارزم میں تاتاریوں کے ہاتھوں ۶۱۸ھ میں قتل ہوئے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خواجہ عطار سنہ ۶۱۸ھ تک بقید حیات تھے۔

دولت شاہ سمرقندی نے خواجہ عطار کی تاریخ وفات ۱۰ جمادی الثانی ۶۲۷ ہجری لکھی

---

1. لٹریری ہسٹری آف پرشیا حصہ دوم ص ۵۰۸
2. خوارزم شاہی امرا میں سے ہے، جس نے ۶۱۹ ہجری میں کرمان فتح کیا تھا۔

ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ خواجہ عطار نیشاپور کے قتلِ عام میں تاتاریوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ ایک تاتاری نے چاہا کہ آپ کو قتل کرے۔ اس کا ساتھی کہنے لگا کہ اس بوڑھے کو نہ مارو، میں تمہیں اس کے عوض ایک ہزار درم دوں گا، چنانچہ قتل کا ارادہ ترک کر دیا۔ خواجہ عطار کہنے لگے، ایک ہزار کے عوض مجھے نہ بیچنا، میری قیمت اس سے کہیں زیادہ ہے۔ پاس ہی سے کوئی اور بولا، اس بوڑھے کا خون بہا ایک توبڑہ گھاس کا تو میں بھی دے سکتا ہوں۔ اس پر عطار نے کہا، بیچ دو۔ اس قیمت پر مجھے بیچ دو، کیونکہ میری قیمت اس سے بھی کم ہے۔ خواجہ عطار کی اس طرزِ گفتگو سے وہ سخت برافروختہ ہوا اور تلوار کا ہاتھ ایسا مارا کہ آپ کا سر دھڑ سے جدا ہو گیا۔ براؤن نہ اس سال سے متفق ہیں، نہ اس واقعہ سے، لیکن انھوں نے خلافِ معمول اس کی کوئی خاص وجہ نہیں بتائی۔ براؤن تذکرہ نویسوں کے اس بیان سے بھی متفق نہیں کہ مولانا جلال الدین کے والد مولانا بہاء الدین جب بلخ سے ہجرت کر کے ایشیائے کوچک گئے، تو اثنائے سفر خواجہ ان سے ملے اور ان کے ہونہار بچے جلال الدین کو دیکھ کر اپنی تصنیف "اسرار نامہ" نذر کی۔

امین احمد رازی نے تذکرہ ہفت اقلیم میں اور حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں دو مختلف سالِ وفات ۶۱۹ اور ۶۲۷ ہجری دیئے ہیں۔ یہ آخری سالِ وفات اکثر تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے جن میں قدیم تذکرہ نویس بھی شامل ہیں اور جدید[1] تذکرہ نویس بھی۔ اس لیے ۶۲۷ ہجری ہی آپ کا سالِ وفات سمجھنا چاہیے۔

تصنیفات

خواجہ عطار کی طبیعت میں روانی اور فکر میں جولانی تھی، چنانچہ نظم و نثر کی متعدد کتابیں آپ کی یادگار ہیں۔ قاضی نور اللہ اپنے تذکرے "مجالس المومنین" میں لکھتے ہیں کہ خواجہ عطار کی کتابوں کی تعداد کلام مجید کی سورتوں کے برابر ہے۔ جو تعداد میں ایک سو چودہ ہیں۔ اس بیان میں کچھ مبالغہ ہے، کیونکہ ان کی صرف تیس کتابوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان

---

[1] رضا زادہ شفق۔ تاریخ ادبیات ایران ص ۱۳۷

میں مصیبت نامہ، الٰہی نامہ، خسرو نامہ، پند نامہ، اسرار نامہ، جواہر نامہ، شرح القلب، مظہر العجائب، لسان الغیب، مختار نامہ، دیوان، منطق الطیر اور تذکرۃ الاولیا کا ذکر اکثر تذکروں میں ملتا ہے۔ آپ کی آخری تین کتابیں خاص طور سے مشہور ہیں۔

تذکرۃ الاولیا - اس کتاب میں اولیاء کرام اور صوفیا و مشائخ کے اخلاق و کردار اور سوانح حیات درج ہیں۔

منطق الطیر - یہ ایک تمثیلی مثنوی ہے جو ۴۶۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ مثنوی کے آغاز میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا، رسول اکرمؐ کی نعت اور صحابہ کرام کی منقبت میں اشعار لکھے گئے ہیں۔ مثنوی کے پینتالیس مقالے ہیں۔ آخر میں ایک خاتمہ ہے۔ مضمون پرندوں کے اجتماع سے شروع ہوتا ہے۔ پرندوں کا خیال ہے کہ دنیا میں کوئی ملک بادشاہ کے بغیر خوش حال نہیں رہ سکتا ہے۔ ہم بھی بادشاہ کے بغیر امن و امان کی زندگی نہیں گذار سکتے۔ سب کا خیال ہے کہ سیمرغ ہمارا بادشاہ ہے۔ اس کی تلاش کرنی چاہیے۔ چنانچہ یہ پرندے ہدہد کو اپنا راہنما بناتے ہیں۔ ہدہد وعدہ کرتا ہے۔ کہ وہ انھیں سیمرغ تک پہنچا دے گا۔ بشرطیکہ سب راستے کی صعوبتیں برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ اکثر پرندے تلاش سے گھبراتے ہیں اور ان کا ساتھ دینے سے معذرت کرتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں، جو اس مسافرت میں تھک کر پیچھے رہ جاتے ہیں۔ بہر حال صرف تیس پرندے سات ہولناک وادیوں میں سے گزرتے ہوئے سیمرغ کی بارگاہ میں پہنچتے ہیں۔ لیکن جب وہ سیمرغ کے روبرو کھڑے ہو کر اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں، تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ سیمرغ اور تیس پرندے ایک ہی چیز کے دو نام تھے۔ گویا جس حقیقت کو وہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہاں آئے تھے، وہ خود ان کے باطن میں موجود تھی۔

یہ ایک تمثیلی مثنوی ہے، جس میں تیس پرندے تیس سالک ہیں۔ اور سیمرغ ان کا محبوب ہے۔ سالکوں نے جو صعوبتیں برداشت کی ہیں، وہ حقیقت میں عارفوں کی ریاضتیں اور مجاہدے ہیں۔ سالکوں نے ذیل کی سات وادیاں عبور کی ہیں۔

پہلی وادی "طلب وجستجو" ہے۔ جب تک کسی سالک کو طلب ہی نہ ہوگی، وہ کمال کے راستے پر گامزن نہ ہو سکے گا۔

چنانچہ آپ فرماتے ہیں۔

جد و جہد این جاست باید سالہا ۔۔۔ زان کہ این جا قلب گردد حالہا

دوسری وادی "عشق" ہے۔ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ سالک کو منزل مقصود سے اتنی دلبستگی ہو کہ راہِ طریقت میں بلا اندیشہ چل نکلے اور راستے کی تکلیفوں سے نہ ڈرے۔

بعد ازان وادی عشق آمد پدید ۔۔۔ غرق آتش شد کسی کانجا رسید

تیسری وادی "معرفت" ہے۔ معرفت ہر سالک کے عقل وخرد کے اندازے کے موافق ہوتی ہے۔

ہیچ رہ دروی نہ چو آن دیگر است ۔۔۔ سالک تن سالک جان دیگر است

لاجرم بس رہ کہ پیش آید پدید ۔۔۔ ہر یکی بر حد خویش آمد پدید

چوتھی وادی "استغنا" ہے۔ اس وادی میں سالک کو دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہونا پڑتا ہے۔ جو شخص خواہشات دنیا کا اسیر ہو، اس وادی تک نہیں پہنچ سکتا۔ سالک بلند نظر ہونا چاہیے۔ اس کی نظر میں دنیا اس نقش کی مانند ہے، جو کسی تختی پر بنا کر مٹا دیا جاتا ہے۔

دیدہ باشی کان حکیم پر خرد ۔۔۔ تختۂ خاک آورد در پیش خود
پس کند آن تختہ پر نقش و نگار ۔۔۔ ثابت و سیار آرد آشکار
ہم فلک آرد پدید و ہم زمین ۔۔۔ گہ بر آن حکمی کند گاہی برین
ہم نجوم و ہم بروج آرد پدید ۔۔۔ ہم اصول و ہم عروج آید پدید
ہم نحوست و ہم سعادت برکشید ۔۔۔ خانۂ موت و ولادت برکشید
چون حساب نحس گردو سعد ازان ۔۔۔ گوشۂ آن تختہ گیرد بعد ازان
برفشاند گوئی آن ہرگز نبود ۔۔۔ آن ہمہ نقش و نشان ہرگز نبود

صورتِ این عالم پُر پیچ پیچ — ہست ہم چون صورتِ آن تختہ ہیچ

پانچویں وادی "توحید" ہے۔ سالک جب اس مقام کو پہچان لیتا ہے، تو اسے کثرت میں وحدت نظر آنے لگتی ہے۔ وہ ہر شے میں اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ کرتا ہے۔ "من و تو" کا امتیاز بالکل اٹھ جاتا ہے۔

چون یکی باشد ہمی ہنود دوئی — ہم منی برخیزد اینجا ہم توئی

چھٹی وادی "حیرت" ہے۔ اس وادی میں سالک بے خودی اور آوارگی کی حالت میں گھومتا ہے۔ یہاں جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ساری معلومات محدود تھیں اور وہ محض لاعلم تھا، تو وہ مبہوت رہ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی ہستی سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔

مرد حیران چون رسد این جایگاہ — در تحیر ماندہ و گم کردہ راہ

گم شود در راہ حیرت محو مات — بی خبر از بود خود و ز کائنات

ہر کہ زد توحید بر جانش رقم — جملہ گردد گم ازو او نیز ہم

ساتواں مقام فنا ہے۔ یہاں پہنچ کر سالک کی جسمانی خواہشیں، غرور و تکبر، خود پرستی سب کچھ زائل ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ اپنے آپ کو کھو کر عالمِ وحدت کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ اور واصلِ حق ہو جاتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس فنا سے وہ اپنی بقا کو پا لیتا ہے۔

ہر کہ در دریای کل گم بودہ است — دائما گم بودہ آسودہ است

ہر کہ او رفت از میان اینک فنا — چون فنا گشت از فنا اینک بقا

سالک کے راستے کی یہ سات منزلیں ہیں، جنھیں پرندوں کی سات وادیوں کی صورت میں ظاہر کیا ہے، چنانچہ تیس پرندے بھی راستے کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے بالآخر وادئ فنا میں پہنچتے ہیں۔ یہی وادئ فنا سیمرغ کی بارگاہ ہے۔ جہاں "سیمرغ" اور "سی مرغ" میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ تیس پرندے گویا خود اپنی حقیقت پا لیتے ہیں۔

ہم ز عکس روی سیمرغِ جہان — چہرۂ سی مرغ دیدند آن زمان

چون نگہ کردند این سی مرغ زود　　　　بشک این سی مرغ آن سیمرغ بود

دیوان ۔ عطار کے دیوان میں خراسان کے دوسرے شعرا کی مانند قصائد بھی ہیں۔ لیکن عطار کے قصائد دوسرے شعراء کے قصائد سے دو صورتوں میں مختلف ہیں۔ عطار کے قصیدوں میں تشبیب یا تغزل نہیں اور خراسانی مکتب خیال کے دوسرے شعرا مثلاً فرخی، عنصری، منوچہری کی سی پختگی بھی ان میں نہیں۔ دوسرے یہ کہ خراسانی شعراء کے قصائد محض مدحت سرائی پر مشتمل ہوتے تھے، لیکن عطار نے مدحت سرائی کو ترک کر دیا ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

بعمر خویش مدح کس نگفتم　　　　دری از بہر دنیا من نہ سفتم

عطار کے قصائد نعت اور پند و معرفت پر مشتمل ہیں۔ ان موضوعات کو عطار نے آیات قرآنی سے موثر اور مزین کیا ہے۔ قصائد میں دنیا کی ناپائداری کا ذکر ہے، اور انسان کو بیدار ہونے کی تلقین کی ہے۔

خطاب ہاتفِ دولت رسید دوش بما
کہ ہست عرصۂ بی دولتی سرای فنا

اس میں کلام نہیں کہ سنائی نے عطار سے پہلے صوفیانہ رنگ میں تشبیبیں کہیں، لیکن سوز و گداز اور تحریک پیدا کرنے میں وہ عطار کے مرتبے کو نہیں پہنچے۔ اس فن میں عطار صوفی شعرا کے رہبر و رہنما ہیں۔ عطار کا دیوان آتشِ عشق، سوزِ محبت اور نغمہ وحدت سے بھرپور ہے۔

دست در دامن جان خواہم زد　　　　پائی بر فرق جہان خواہم زد
اسپ بر جسم و جہت خواہم تاخت　　　　بانگ بر کون و مکان خواہم زد
وآنگہ آن دم کہ میان من و دست　　　　از ہمہ خلق نہان خواہم زد
چون مرا نام و نشان نیست پدید　　　　دم ز بی نام و نشان خواہم زد
ہان مبر ظن کہ من سوختہ دل　　　　آن دم از کام و زبان خواہم زد

از دلم مشعلہ ای خواہم ساخت　　نفسِ شعلہ فشان خواہم زد

وحدت الوجود صوفیا کرام کا ایک خاص مسئلہ ہے۔ جسے اکثر صوفی شعرا نے اپنے کلام کا موضوع بنایا ہے، خواجہ اس موضوع کو نئے پیرایے میں ادا کرتے ہیں۔

پُر شد از دوست ہر دو کون ولیک　　سوی او زہرۂ اشارت نیست

از برای غریب خود خود گشت　　جلوہ در قد و در قدم رفتار

تاب در زلف و وسمہ بر ابرو　　سرمہ در چشم و غازہ بر رخسار

رنگ در آب و آب در یاقوت　　بوی در مشک و مشک در تاتار

قم باذنی و قم باذن اللہ　　ہر دو یک نغمہ آمد از لب یار

انسان اصل حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔

چندین در بستہ بی کلید است چہ سود

کس نام کشادن نشنید است چہ سود

پیراہن یوسف ست یک یک ذرات

یوسف زمیانہ ناپدید است چہ سود

عالم ظاہر دھوئیں کی مانند ہے، جس کا وجود آگ کی وجہ سے ہے، خود اس کا اپنا کوئی وجود نہیں۔

نقطۂ آتش ست در باطن　　دود دیدن از وچہ سود بود

عالم حقیقت کا کھوج لگانے اور وحدت کو سمجھنے کے لیے علم، عقل اور قیل و قال سے دست بردار ہونے کی ضرورت ہے۔ چون و چرا کو ترک کر کے اور خود سے بے خود ہو کر ہی انسان حقیقت کا جلوہ دیکھ سکتا ہے۔

ہماری تمام قیل و قال ہماری عقل کے موافق ہے، لیکن حقیقت ہماری عقل سے بہت بالا

ہے، اس لیے ہمیں بھی اس ذوق و وجدان کی تلاش کرنی چاہیے، جو عقل و خرد سے بالاتر ہے۔

در عشق بدی از حدوث و قدم مپرس
گر مرد عاشقی ز وجود و عدم مپرس

مردانہ بگذر از ازل و از ابد تمام
کم گوی از ازل زابد نیز ہم مپرس

زین چار رکن چون بگذشتی ببین حرم
آنگاہ دیدہ پر کن و پس آن حرم مپرس

آنجا کہ ہست نقطہ توحید در نہ نیست
زآن چار برگزر بدمی وز دم مپرس

لوح و قلم بطبع دماغ و زبان تست
لوح و قلم بدان و ز لوح و قلم مپرس

چون تو بدین مقام رسیدی دگر مباش
کم گرد در فساد دگر بیش و کم مپرس

تصوف کے دقیق مسائل کے باوجود خواجہ عطّار کی زبان سادہ اور روان ہے۔ اشعار میں کہیں ابہام یا پیچیدگی نہیں۔ تشبیہات جو آپ استعمال کرتے ہیں، بہت واضح اور شگفتہ ہیں۔ ذیل کے اشعار میں لالہ سرخ کو سوختہ دل عاشق سے، یاسمن کو دلہن سے، سوسن کو شیر خوار سے، نرگس کو زرد رو عاشق سے، غنچہ بے دہن کو ناوک چرخ گلستان سے تشبیہہ دی ہے۔

بادِ شمال می رسد جلوۂ نسترن نگر
وقت سحر ز عشق گل بلبل نعرہ زن نگر

سبزۂ تازہ روی را خط جو غبار بین
لالۂ سرخ روی را سوختہ دل چو من نگر

خیری سر فگندہ را و در غم عمر رفتہ بین
سنبل شاخ شاخ را مردۂ چمن نگر
یاسمن لطیف را ہمچو عروس بکر بین
باد مشاط فعل را جلوہ گر سمن نگر
نرگس نیم مست را عاشق زرد روی بین
سوسن شیر خوارہ را آمدہ در سخن نگر
لعبت شاخ ارغوان طفل زبان کشادہ بین
ناوک چرخ گلستان غنچہ بی دہن نگر
تا گل بادشاہ وش تخت نہاد در چمن
لشکریان باغ را خیمۂ نسترن نگر
ہین کہ گذشت وقت گل سوی چمن نگاہ کن
روح نصیب صبح بین ابر گلاب زن نگر

ایران کے صوفی شاعروں میں مولانا جلال الدین

مولینا جلال الدین رومی (پیدائش ۶۰۴ھ مطابق ۱۲۰۷ء - وفات ۶۷۲ھ مطابق ۱۲۷۳ء -

رومی کا مقام بہت بلند ہے۔ آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ روم (ترکی) میں گزرا۔ اس لیے آپ نے مولانائے روم کے نام سے شہرت پائی۔ "مثنوی معنوی" آپ کی ایک زندہ جاوید یادگار ہے، جو زمانہ حال و مستقبل کے طالبانِ معرفت کے لیے ہمیشہ شمعِ ہدایت کا کام دے گی۔

مولانا کے آبا و اجداد عربی النسل تھے، اور عرب سے آکر بلخ میں آباد ہوئے۔ مولانا یہیں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان علم و فضل کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ آپ کے خاندان نے بڑے بڑے محدث اور فقیہ پیدا کیے۔

ہے، اس لیے ہمیں بھی اس ذوق و وجدان کی تلاش کرنی چاہیے، جو عقل و خرد سے بالاتر ہے۔

در عشق بدمی او زحدوث و قدم مپرس
گر مرد عاشقی ز وجود و عدم مپرس
مردانہ بگذر از ازل واز ابد تمام
کم گوی از ازل زابد نیز ہم مپرس
زین چار رکن چون بگذشتی ببین حرم
آنگاہ دیدہ پر کن و پس آن حرم مپرس
آنجا کہ ہست نقطۂ توحید در نخ نیست
زآن چار بہ گزر بدمی وز دم مپرس
لوح و قلم بطبع دماغ و زبان تست
لوح و قلم بدان وز لوح و قلم مپرس
چون تو بدین مقام رسیدی دگر مباش
کم گرد در فنا و دگر بیش و کم مپرس

تصوف کے دقیق مسائل کے باوجود خواجہ عطار کی زبان سادہ اور رواں ہے۔ اشعار میں کہیں ابہام یا پیچیدگی نہیں۔ تشبیہات جو آپ استعمال کرتے ہیں، بہت واضح اور شگفتہ ہیں۔ ذیل کے اشعار میں لالہ سرخ کو سوختہ دل عاشق سے، یاسمن کو دلہن سے، سوسن کو شیر خوار سے، نرگس کو زرد رو عاشق سے، غنچہ بے دہن کو ناوک چرخ گلستان سے تشبیہ دی ہے۔

بادِ شمال می رسد جلوۂ نسترن نگر
وقت سحر ز عشق گل بلبل نعرہ زن نگر
سبزۂ تازہ روی را نو خط جو مُبارین
لالۂ سرخ روی را سوختہ دل چو من نگر

خیری سرفگندہ را و رغم عمر رفتہ بین
سنبل شاخ شاخ را مردۂ چمن نگر
یاسمن لطیف را ہمچو عروس بکر بین
باد مشاط فعل را جلوہ گر سمن نگر
نرگس میم مست را عاشق زرد روی بین
سوسن شیر خوارہ را آمدہ در سخن نگر
لعبت شاخ ارغوان طفل زبان گشادہ بین
ناوک چرخ گلستان غنچہ بی دہن نگر
تا گل بادشاہ وش تخت نہاد در چمن
لشکریان باغ را خیمۂ نسترن نگر
ہین کہ گذشت وقت گل سوی چمن نگاہ کن
روح نصیب صبح بین ابر گلاب زن نگر

مولٰنا جلال الدین رومی (پیدائش ۶۰۴ھ مطابق ۱۲۰۷ء - وفات ۶۷۲ھ مطابق ۱۲۷۳ء -

ایران کے صوفی شاعروں میں مولانا جلال الدین رومی کا مقام بہت بلند ہے۔ آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ روم (ترکی) میں گزرا۔ اس لیے آپ نے مولانائے روم کے نام سے شہرت پائی۔ "مثنوی معنوی" آپ کی ایک زندہ جاوید یادگار ہے، جو زمانہ حال و مستقبل کے طالبانِ معرفت کے لیے ہمیشہ شمع ہدایت کا کام دے گی۔

مولانا کے آبا و اجداد عربی النسل تھے، اور عرب سے آکر بلخ میں آباد ہوئے۔ مولانا یہیں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان علم و فضل کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ آپ کے خاندان نے بڑے بڑے محدث اور فقیہ پیدا کیے۔

آپ کے والد محمد بن حسین خطیبی، جو بہاءالدین ولد کے نام سے مشہور ہوئے۔ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے۔ درس و تدریس ان کا پیشہ تھا، اُن کے علم و فضل کی وجہ سے خوارزم کے حکمران سلطان علاءالدین محمد کو آپ سے بڑی عقیدت تھی۔ اہلِ بلخ تو ان کے شیدا تھے۔ جب وعظ کرتے تو خواص و عوام اُن کے وعظ میں شریک ہوتے۔

بلخ سے ہجرت شیخ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ہزاروں عقیدت مند آپ کے درس سے مستفید ہونے کے لیے کھنچے چلے آتے تھے۔ مولانا شبلی[1] لکھتے ہیں:" ایک دن علاءالدین خوارزم شاہ مولانا بہاءالدین کے پاس گیا تو ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا مجمع تھا۔ شخصی سلطنتوں میں جو لوگ مرجع عام ہوتے ہیں۔ سلاطین وقت کو ہمیشہ ان کی طرف سے بے اطمینانی رہتی ہے۔ خوارزم شاہ نے حد سے زیادہ بھیڑ دیکھ کر امام رازی سے کہا کہ کس غضب کا مجمع ہے۔ امام صاحب موقع کے منتظر رہتے تھے، فرمایا" ہاں! اور اگر ابھی سے تدارک نہ ہوا تو پھر مشکل پڑے گی۔" خوارزم شاہ نے امام صاحب کے اشارے سے خزانہ شاہی اور قلعہ کی کنجیاں بہاءالدین کے پاس بھیج دیں اور کہلا بھیجا کہ اسبابِ سلطنت سے صرف یہ کنجیاں میرے پاس رہ گئی ہیں، وہ بھی حاضر ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ اچھا! جمعہ کو وعظ کہہ کے یہاں سے چلا جاؤں گا۔ جمعہ کے دن شہر سے نکلے۔ خوارزم شاہ کو خبر ہوئی تو بہت پچھتایا اور حاضر ہو کر منت سماجت کی، لیکن یہ ارادے سے باز نہ آئے......"

مولانا شبلی نے غالباً ہجرت کا یہ واقعہ تذکرہ دولت شاہ سمرقندی کے حوالے سے لکھا ہے لیکن پروفیسر نکلسن[2] کے نزدیک سلطان وقت کے حسد کی بنا پر مولانا کا ترک وطن کرنا مشتبہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ صفتاً بہاءالدین نے ہزارہا انسانوں کی طرح تاتاریوں کے خوف کی وجہ سے ترکِ وطن کیا تھا، کیونکہ تاتاریوں کا جمِ غفیر خراسان میں انسانی خون کے دریا بہا کر اب بلخ کی

---

[1] سوانح مولانائے روم ص ۳

[2] رومی دی پوئٹ اینڈ دی مسٹک ص ۱۸

طرف آنا چاہتا تھا۔

بہر حال وجہ کچھ بھی ہو، مولانا بہاء الدین نے ۶۱۷ھ مطابق ۱۲۲۰ء میں جب مولانا جلال الدین کی عمر بارہ سال تھی، بلخ کو خیر باد کہا۔ راستے میں ان کا گزر نیشاپور سے بھی ہوا۔ یہاں بقول دولت شاہ سمرقندی[1] ان کی ملاقات خواجہ فرید الدین عطار سے ہوئی۔ خواجہ عطار نے جلال الدین کو ہونہار پاکر اس کی فضیلت کی پیشین گوئی کی۔ اسے دعا دی اور اپنی کتاب "اسرار نامہ" کا ایک نسخہ تحفے کے طور پر پیش کیا۔ جلا وطنوں کا یہ قافلہ نیشاپور سے چل کر بغداد آیا۔ پھر مکہ معظمہ گیا۔ یہاں سے چل کر یہ لوگ روم (ترکی) کے شہر ملاطیہ پہنچے۔ جہاں یہ چار سال رہے۔ پھر لارندہ گئے، جسے آج کل قرمان کہتے ہیں۔ یہاں ان کا قیام سات سال تک رہا۔ اس عرصے میں مولانا جلال الدین نے شادی کی اور دو بچے بھی ہوئے۔ اس کے بعد یہ لوگ قونیہ آگئے۔ قونیہ علاؤالدین کیقباد سلجوقی کا پایہ تخت تھا۔ اور تہذیب تمدن کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تھوڑے ہی عرصے بعد مولانا بہاء الدین کا ۶۲۸ھ مطابق ۱۲۲۰ء میں انتقال ہو گیا۔

مولانا کے انتقال کے بعد ایک بزرگ سید برہان الدین محقق ترمذی، جو بلخ میں ان کے شاگردوں میں تھے، قونیہ آئے، اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ مولانا بھی ان کے درس میں شامل ہوتے رہے۔ سید برہان شیخ طریقت بھی تھے، چنانچہ ان سے مولانائے روم نے صوفیانہ طریقت کی تعلیم پائی اور سلوک کی منزلیں بھی انہی کی رہنمائی میں طے کیں۔ سید برہان کی وفات پر آپ ان کے جانشین بنے اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔

اسی اثنا میں مولانا کی ملاقات قونیہ میں ایک درویش سے ہوئی۔ جس نے مولانا کی زندگی ہی کو بدل ڈالا۔ یہ درویش شمس الدین بن علی بن ملک داد تبریزی تھے۔ شمس الدین بہت ضعیف و نحیف شخص تھے، لیکن ان کے بیان میں کشش اور ان کی شخصیت میں جاذبیت تھی۔ وہ

۱؎ تذکرۃ الشعراء ص ۱۲۵

درویشوں کی تلاش میں شہر بہ شہر گھومتے پھرتے تھے۔ یہی تلاش انہیں قونیہ میں بھی لے آئی۔ مولانا نے شمس کو دیکھ کر یہ محسوس کیا کہ یہ وہی فوق العادہ انسان ہے جن کی مدت سے تلاش تھی۔ مولانا نے شمس کے ہاتھ پر بیعت کی اور انھیں گھر لے گئے۔

مولانا مثنوی معنوی میں شمس تبریزی کا نام بڑے احترام سے لیتے ہیں۔

شمس تبریزی کہ نور مطلقست — آفتابست وز انوار حق است

این نفس جان دامنم بر تافتست — بوی پیراہان یوسف یافتست

کز برای حق صحبت سالہا — باز گو رمزی از آن خوش حالہا

من چہ گویم یک رگم ہشیار نیست — شرح آن یاری کہ آنرا یار نیست

خود ثنا گفتن ز من ترک ثناست — کان دلیل ہستی و ہستی خطاست

شرح این ہجران و این خون جگر — این زمان بگذار تا وقت دگر

یہاں سے مولانا کی زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ شمس تبریزی کی ملاقات سے پہلے آپ مدرسے کے تعلیمی مشاغل میں مصروف رہتے تھے۔ اور لوگ اکتساب فیض کر کے بہت خوش اور مطمئن تھے۔ لیکن اب آپ نے تعلیمی مشاغل سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اور "نغمہ نے" کی اندرونی آواز پر کان لگا دیئے۔

اہل قونیہ مولانا کی اس قلبی کیفیت کو دیکھ کر سخت رنجیدہ ہوئے۔ اور شمس تبریزی کو برا بھلا کہنے لگے۔ شمس کو ان کی باتیں ناگوار گزریں اور وہ وہاں سے اٹھ کر دمشق کو چل دیئے۔ مولانا نے اپنے بیٹے سلطان ولد کو ان کے پیچھے بھیجا۔ اور وہ منت سماجت کر کے انھیں پھر قونیہ واپس لے آئے۔ ذوق سماع کی محفلیں پھر سے بپا ہونے لگیں۔ اہل قونیہ کے دلوں پر پھر یہ بات ناگوار گزری کہ ایک اجنبی شخص مولانا پر اس قدر چھا جائے کہ وہ اپنے ارادت مندوں کو بالکل ہی بھول ہی جائیں۔ چنانچہ انھوں نے شمس تبریزی کے خلاف ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اہل ظاہر کی مخالفت بڑھتی دیکھی تو شمس وہاں سے دفعتہً غائب ہو گئے اور کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں گئے

بعض تذکرہ نویس کہتے ہیں کہ مولانا کے بیٹے علاؤالدین محمد نے انھیں قتل کیا تھا۔

مولانا کو اپنے پیر کی صحبت سے محروم ہو جانے کا سخت قلق تھا۔ ہر وقت انہی کی یاد رہتی تھی۔ سلطان ولد اپنی مثنوی "ابتدا نامہ" میں لکھتے ہیں کہ مولانا نے اسی رنج فراق میں صوفیانہ غزلیات کا ایک دیوان پیر کے نام سے تصنیف کیا تھا۔ وہ اپنے پیر کی یاد میں بنسری کی تان کے ساتھ رقص کیا کرتے تھے۔ آخر مولانا روم کے پیروکاروں نے جو فرقہ مولویہ کے نام سے موسوم ہیں، اس قسم کے رقص کو اپنی ریاضت کا حصہ بنالیا۔

شمس تبریزی کے بعد آپ کی توجہ ایک شخص صلاح الدین زرکوب کی طرف ہوئی۔ صلاح الدین کی ملاقات کے متعلق مولانا جامی[1] نفحات الانس میں لکھتے ہیں کہ مولانا کو مدت تک شمس کی جدائی نے بے قرار رکھا۔ ایک دن اسی جوش وخروش کی حالت میں گھر سے نکلے۔ راہ میں شیخ صلاح الدین زرکوب کی دکان تھی۔ وہ چاندی کے ورق کوٹ رہے تھے۔ مولانا پر ہتوڑی کی آواز نے سماع کا اثر پیدا کیا، وہیں کھڑے ہو گئے اور وجد کی حالت طاری ہو گئی۔ شیخ مولانا کی حالت دیکھ کر اسی طرح ورق کوٹتے رہے۔ یہاں تک کہ بہت سی چاندی ضائع ہو گئی، لیکن انھوں نے ہاتھ نہ روکا، آخر شیخ باہر آئے۔ مولانا نے ان کو آغوش میں لے لیا اور اس جوش ومستی میں دوپہر سے عصر تک یہ شعر گاتے رہے۔

یکی گنجے پدید آمد ازیں دکانِ زرکوبی
زہی صورت زہی معنی زہی خوبی زہی خوبی

شیخ صلاح الدین نے وہیں کھڑے کھڑے دکان لٹوا دی اور مولانا کے ساتھ ہو گئے۔

مولانا کو صلاح الدین زرکوب کی صحبت میں ایک گونہ اطمینان حاصل ہوا۔ چنانچہ ان کی شان میں آپ نے بہت پُرجوش اشعار کہے ہیں۔ ایک غزل کے چند اشعار حسب ذیل ہیں:۔

---

[1] بحوالہ سوانح مولانا روم۔ مولفہ مولانا شبلی صفحہ ۱۹

مطربا! اسرار مارا باز گو | قصه ہای جان فزارا باز گو
ما دہان بر لبتہ ایم از ذکر او | تو حدیث دلکشا را باز گو
چون صلاح الدین صلاح جان ماست | آن صلاح جان مارا باز گو

صلاح الدین کو مولانا کا خلیفہ بننے کا شرف حاصل ہوا۔ وہ دس سال آپ کے خلیفہ رہے اور مولانا کی زندگی ہی میں فوت ہوئے۔ ان کے بعد حسام الدین حسن آپ کے خلیفہ بنے۔ یہ وہ بزرگ ہیں۔ جنھوں نے مولانا کو مثنوی لکھنے پر مائل کیا تھا۔ حسام الدین آپ کے مریدان خاص میں سے تھے۔ مولانا ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ چنانچہ مثنوی کے تقریباً ہر دفتر میں اُن کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے۔ مولانا مثنوی کو کبھی کبھی "حسام" کہہ کر بھی خطاب کرتے ہیں اور مثنوی کو اس بنسری سے تشبیہ دیتے ہیں، جو حسام الدین کے ہونٹوں سے بج رہی ہے۔ حسام الدین مولانا کی زندگی کے آخری دس سال تک آپ کے خلیفہ رہے۔ مولانا کی وفات پر فرقہ مولویہ کی مسندِ ارشاد انھیں کو ملی۔

اولاد

مولانا کے دو فرزند تھے، سلطان ولد اور علاء الدین محمد۔ سلطان ولد راہ سلوک میں اپنے والد کے پیرو تھے۔ حسام الدین کی وفات پر انہی کو آپ کا خلیفہ بننے کی سعادت حاصل ہوئی۔ یہ بھی شعر کہتے تھے۔ ان کی تصانیف میں خاص طور سے قابلِ ذکر مثنوی "ابتدا نامہ" ہے۔ جس میں مولانا کی زندگی کے حالات لکھے ہیں۔ آپ کا فرزند علاء الدین محمد وہی ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ شمس تبریزی کا خون اس کی گردن پر ہے۔

مثنوی کی تصنیف میں حسام الدین کا حصہ

جیسے کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔ مثنوی لکھنے پر مولانا کو حسام الدین نے مائل کیا تھا۔ مثنوی کا پہلا دفتر ختم ہوا، تو حسام الدین کی بیوی کا انتقال ہو گیا جس سے انھیں سخت قلبی صدمہ ہوا۔ اس سے مولانا بھی بہت پریشان رہے، چنانچہ دوسرے دفتر کی تصنیف معرضِ التوا میں پڑ گئی۔ مولانا نے دفتر دوم کے آغاز میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مدتی این مثنوی تاخیر شد ‏ ‏ مہلتی بایست تا خون شیر شد

چون ضیاالحق حسام الدین عنان ‏ ‏ بازگرداند از اوج آسمان

چون ز دریا سوی ساحل باز گشت ‏ ‏ چنگ شعر مثنوی باساز گشت

مطلع تاریخ این سودا و سود ‏ ‏ سال ہجرت شش صد و شصت و دو

مثنوی کے بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا شعر کہتے تھے اور حسام الدین ان اشعار کو قلم بند کرتے جاتے تھے۔ اس طرح مثنوی کے پانچ دفتر مکمل ہو گئے۔ ابھی چھٹا دفتر زیر تصنیف تھا کہ مولانا بیمار ہو گئے اور مثنوی کی تصنیف کا سلسلہ بند ہو گیا۔ ایک دن آپ کے صاحبزادے نے مثنوی کی تصنیف کا ذکر چھیڑا، تو فرمایا سفرِ آخرت درپیش ہے۔ اب یہ راز کسی اور کی زبان سے ادا ہوگا۔ چنانچہ آپ کا شعر ہے

باقی این گفتہ آید بی گمان ‏ ‏ در دل ہر کس کہ باشد نورِ جان

اسی وجہ سے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چھٹا دفتر مولانا نے خود نہیں لکھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا کو صحت ہوئی، تو چھٹا دفتر خود ہی مکمل کیا اور ساتواں دفتر بھی لکھا جس کا مطلع یہ ہے۔

ای ضیاالحق حسام الدین سعید ‏ ‏ دولتت پاینده عمرت بر مزید

مولانا شبلی نعمانی[1] کشف الظنون کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ شیخ اسمٰعیل قیصری جنھوں نے مثنوی کی بڑی ضخیم شرح لکھی ہے، ان کو اس دفتر کا ایک نسخہ ۸۱۴ھ کا لکھا ہوا ہاتھ آیا۔ انھوں نے تحقیق کی، تو ثابت ہوا کہ خود مولانا کی تصنیف ہے۔

مثنوی کی ترتیب مثنوی سے پہلے اخلاق و تصوف پر جو کتابیں تصنیف ہوئیں، اُن کا انداز یہ تھا کہ مختلف عنوان قائم کرکے ان پر اظہارِ خیال کیا جاتا اور

---

[1] سوانح مولانا روم صفحہ ۸۴

پھر مزید روشنی کے لیے حکایات لکھی جاتی ہیں۔

حکیم سنائی اور خواجہ عطار کا یہی انداز ہے، لیکن مثنوی معنوی میں کسی قسم کی ترتیب و تبویب نہیں۔ دفتروں کی جو تقسیم ہے، ان میں بھی مضامین کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ بلکہ مولانا حکایتیں اور قصے لکھتے ہیں، اور علمی مسائل حسبِ موقع بیان کرتے جاتے ہیں۔ ان کے پیشِ نظریہ بات رہی ہے کہ جو لوگ علمی مضامین پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کر سکتے، وہ قصہ اور حکایت کی دلچسپی کی وجہ سے اس طرف مائل ہو جائیں۔ چنانچہ ذیل کے شعر میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

مثنوی کی خصوصیات

۱۔ مثنوی کی سب سے بڑی خصوصیت مولانا کا طرزِ استدلال اور سمجھانے کا طریقہ ہے۔ مولانا کو یہ احساس ہے کہ فلسفیانہ موضوع کی گہرائی کے باعث آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا، اس لیے وہ جب کوئی بحث چھیڑتے ہیں، اسے تشبیہوں اور تمثیلوں کے ذریعے قارئین کے ذہن نشین کراتے جاتے ہیں۔

۲۔ مولانا ہدایت و تعلیم کو سخن پردازی اور شاعری کی نسبت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر عالم و عارف بھی ہیں اور مبتدی اور عامی بھی۔ ان کا روئے سخن سب کی طرف ہے۔ اس لیے زبان بھی ایسی ہی استعمال کی ہے، جو سب کی سمجھ میں آسکے۔

۳۔ اگرچہ مولانا سے پہلے بھی فرضی حکایتیں لکھ کر اخلاقی مسائل کی تعلیم دی جاتی تھی لیکن مولانا نے اپنے فلسفیانہ شعور اور شاعرانہ صلاحیتوں کی بدولت اس طریقِ تعلیم کو کمال کے مرتبے تک پہنچا دیا ہے۔

۴۔ جن جن مسائل پر مذہبی یا عقلی لحاظ سے لوگوں کو اختلاف ہے۔ انھیں مولانا مناظرہ کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔ مسائل کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں پر پُر زور دلائل پیش کرتے ہیں، پھر محققانہ انداز میں خود فیصلہ دیتے ہیں، جس سے تمام غلط فہمیاں دُور

ہو جاتی ہیں۔

۵۔ مثنوی میں قرآنی معارف کی بہت شرح و بسط سے تفسیر کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ مثنوی کا آغاز بھی کلام مجید کے انداز پر ہوا ہے۔ کلام مجید کے شروع میں سورہ فاتحہ ہے، جو کلام مقدس کا لب لباب ہے، اسی طرح "نے" کو روح انسانی قرار دے کر تصوف و معرفت کا ماحصل ابتدائی چند اشعار میں پیش کر دیا گیا ہے۔ باقی کے تمام دفاتر انہی اشعار کی تفسیریں ہیں۔ اسی لیے مولانائے روم کے ہموطنوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے

مثنوی معنوی مولوی ہست قرآن در زبانِ پہلوی

مثنوی کے افکار و مطالب

مثنوی کے مطالب پر روشنی ڈالنے کے لیے اس مختصر سی تاریخ میں گنجائش نہیں۔ اس کے لیے ایک کتاب کی ضرورت ہے۔ بقول مولانا۔

گر بریزی بحر را در کوزہ ای چند گنجد قسمت یک روزہ ای

بہرحال ان کے عقائد سے روشناس کرانے کے لیے بعض افکار مثلاً روح انسانی، عشق، وحدت الوجود اور جد و جہد کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ **رُوحِ انسانی**:۔ روحِ انسانی روحِ مطلق کا حصہ ہے۔ انسانی روح کے متعلق مولانا کا یہ نظریہ ہے کہ انسانی جسم اختیار کرنے سے پہلے یہ روح مطلق کا حصہ تھی۔ وصال و معرفت کے سوا اس کا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ اب یہ روح، انسانی پیکر اختیار کر کے عالمِ اجسام میں آ گئی ہے اور اپنی روحانی صفتیں کھو بیٹھی ہے۔ عالمِ اجسام کا آب و گل اسے راس نہیں۔ اس لیے اپنے اصلی وطن کو لوٹ جانے کے لیے بے تاب ہے اور آہ و فریاد کرتی ہے۔ اسے سُن سُن کر تمام مرد و زن روتے ہیں۔

بشنو از نی[1] چون حکایت می کند از جدائی ہا شکایت می کند

---

[1] خلیفہ عبدالحکیم اپنی تالیف "حکمت رومی" (صفحہ ۱۲) میں لکھتے ہیں کہ مولانا کی خانقاہ کے نسخے میں شکایت پہلے مصرعے میں ہے اور حکایت دوسرے مصرعے میں۔

کز نیستان تا مرا ببریدہ اند — از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

مولانا روح کی ازلی اور ابدی حیثیت کو ذیل کے اشعار میں بیان کرتے ہیں۔

منبسط بودیم و یک گوہر ہمہ — بی سر و بی پا بدیم آن سر ہمہ

یک گہر بودیم ہمچو آفتاب — بی گرہ بودیم و صافی ہمچو آب

چون بصورت آمد آن نور سرہ — شد عدد چون سایہ ہای کنگرہ

کنگرہ ویران کنید از منجنیق — تا رود فرق از میان این فریق

یعنی ہم وجود میں آنے سے پہلے ایک بسیط اور واحد جوہر تھے۔ نہ ہم میں کثرت تھی نہ ترکیب۔ اپنی دُنیا میں ہم اعضا سے بے نیاز اور جسم انسانی سے پاک تھے۔ ہم آفتاب کی طرح تھے، جس میں اگرچہ کہ لاتعداد کرنیں ہوتی ہیں، لیکن حقیقت میں وہ واحد چیز ہے۔ اسی طرح ہم پانی کی مانند تھے، جس میں یوں تو قطروں کی کثیر تعداد ہوتی ہے، لیکن اصل میں وہ ایک ہے آخر جب نور پاک نے انسانی جسم اختیار کر لیے، تو ہماری وحدت ختم ہو گئی اور ان میں تعداد اور کثرت آگئی۔ جیسے مکان کے کنگرے بسیط دھوپ میں سائیوں کی کثرت کا منظر پیدا کر دیتے ہیں۔ ان سائیوں کا وجود کنگروں کی بدولت ہے۔ اگر کنگرے نہ ہوتے، تو سائے بھی نہ ہوتے۔ اگر منجنیق کے ذریعے کنگرے توڑ دیئے جائیں، تو سائیوں کی کثرت ختم ہو جائے اور دھوپ کی وحدت اس کی جگہ لے لے۔ اسی طرح اگر جسم مٹ جائیں، تو روحوں میں جو کثرت پیدا ہو گئی ہے، پھر بسیط شکل اختیار کر لے۔

عشق:۔ صوفیا کا عقیدہ ہے کہ انسانی روح ایک ابدی اور غیر فانی عنصر ہے، جس کا براہِ راست ذاتِ خداوندی سے تعلق ہے۔ یہ تعلق بالکل ایسا ہی ہے، جیسا جزو کو کل کے ساتھ ہوتا ہے۔

صوفیا جہاں ذاتِ خداوندی کو روحِ مطلق سمجھتے ہیں، وہاں اسے حسنِ مطلق بھی کہتے ہیں حسنِ مطلق ایک سرچشمہ ہے، جس سے حسن کے سوتے پھوٹتے ہیں اور کائنات میں پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ انسانی روح اپنے اس سرچشمے کو دیکھنے اور اس میں واصل ہونے

کے لیے بے تاب ہے۔ اسی اضطراب اور بے چینی کو صوفیانہ اصطلاح میں عشق کہا جاتا ہے اس صورت میں روحِ انسانی عاشق ہے۔ اور ذاتِ باری محبوب۔ اوّلین صوفیا اس تعلق کو مجاز کے پردے میں بیان کرتے تھے۔ یہ صوفی زُلف کا بھی ذکر کرتے ہیں، اور خال و رُخ کا بھی، ان کے کلام میں ساقی کا بھی ذکر آتا ہے، تو اس سے ظاہریت کا وہ تار و پود مراد ہوتا ہے جس نے حقیقت کو چھپا رکھا ہے۔ اسی طرح مہکتے ہوئے رُخ کا جب ذکر آتا ہے تو اس سے حسنِ ذاتِ حق کا پرتو مراد ہے، جو صفات کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔ نشہ شراب سے وہ کیف و مستی مراد ہے، جو تصورِ محبوب میں غرق ہو کر سالک کو حاصل ہوتی ہے۔ اس قسم کے طرزِ بیان سے اکثر لوگوں کو شبہ ہوتا ہے کہ شاعر کا موضوعِ سخن مادی محبت ہے۔ محی الدین ابن عربی جنھوں نے سب سے پہلے وحدت الوجود کا نظریہ ایک مستقل فلسفے کی صورت میں پیش کیا تھا۔ اکثر اپنے کلام میں عشقِ حقیقی کو رنگِ مجازی میں پیش کرتے تھے۔ ان کا اندازِ بیان کچھ ایسا والہانہ تھا کہ لوگوں کو ان کے عشقِ حقیقی پر عشقِ مجازی کا شبہہ ہوتا تھا، چنانچہ بالآخر ابنِ عربی کو اپنے عاشقانہ کلام کی تفسیر لکھ کر یہ جتانا پڑا کہ انھیں کسی عورت سے محبت نہیں، بلکہ ذاتِ خداوندی سے محبت ہے

اس مبہم اسلوبِ بیان کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ صوفی شاعر اپنی فانی حیثیت میں حُسنِ مطلق سے محبت کرتے تھے اور اس تصور میں ماسوائے اللہ کو بھول جاتے تھے۔ جب وہ اپنے خواب نما عاشقانہ واردات کا اظہار کرتے، تو انسان ہونے کی حیثیت میں وہ الٰہیاتی نہیں بلکہ انسانی طریقِ بیان اختیار کرتے تھے۔ اس طرزِ بیان کی بقول مولانائے روم اس لیے بھی ضرورت تھی کہ :-

سرِ پنہاں است اندر زیر و بم فاش اگر گویم جہان برہم زنم

راہِ طریقت میں ایسا مقام بھی آتا ہے کہ اگر اسے واضح طور سے بیان کیا جائے، تو ظاہر بین لوگ راہِ طریقت کے سالک کو دار و رسن کا مستحق سمجھتے ہیں، اس لیے ابوسعید ابوالخیر اور

حکیم سنائی نے بھی یہی اسلوب اختیار کیا تھا۔ حافظ شیرازی جب مجاز کی منزلیں طے کر کے شاہراہ طریقت پر گامزن ہوئے۔ تو انھوں نے بھی اپنے واردات و بیان کے لیے یہی اسلوب اختیار کیا۔

مولانا کا موضوعِ عشق ۔ ان شعراء کے برعکس مولانائے روم نے اظہارِ عشق میں کسی ابہام و ایہام سے کام نہیں لیا۔ بلکہ طریقت اور معرفت کے اسرار و رموز برملا کہے ہیں۔ ان کے کلام میں کوئی شبہہ نہیں رہتا کہ مولانا عالمِ مجاز میں سخن سرائی کر رہے ہیں یا عالمِ حقیقی میں۔ ان کا عشق بھی حقیقی ہے اور بیان بھی حقیقی۔ مسلکِ صوفیا میں ہم پہلی مرتبہ عشقِ حقیقی کا برملا نغمہ مولانا ہی کی زبان سے سنتے ہیں۔

عشق ہای کز پی رنگی بود　　　عشق نبود عاقبت ننگی بود
عشق بر مردہ نباشد پائیدار　　　عشق را بر حیّ و بر قیوم دار

صوفیا عاشقانہ واردات کا ذکر جب تک رنگِ مجاز میں کرتے رہے، فکرِ انسانی کے لیے کوئی الجھن پیدا نہ ہوئی لیکن جب ذاتِ باری کا عشق اپنے حقیقی خط و خال کیساتھ شعر و نغمہ کا موضوع بنا، تو اس میں مافوق الطبیعاتی عناصر بھی شامل ہو گئے اور موضوع زیادہ نازک اور ادق ہو گیا۔ اس سے موضوعِ عشق کو بیان کرنے اور سمجھانے میں مشکلات کا سامنا ہوا۔

مولانا کو ذاتِ خداوندی سے عشق ہے۔ عشق کا جذبہ اتنا تیز اور ہمہ گیر ہے کہ مولانا جگہ جگہ عشق کی کیفیات بیان کرتے چلے جاتے ہیں، چنانچہ مثنوی کا کوئی دفتر ایسا نہیں جس کے صفحات پر عشق اور کیفیاتِ عشق کا بیان بکھرا ہوا نہ ہو، لیکن اظہار و بیان کی تمام فصاحتوں کے باوجود مولانا اپنے آپ کو شرمندہ عشق سمجھتے ہیں کیونکہ اسے پوری طرح بیان نہیں کر سکتے۔

ہر چہ گویم عشق را شرح و بیان　　　چو بعشق آیم خجل باشم از آن

روحِ انسانی، روحِ مطلق کا حصہ ہے۔ اس دنیا میں رہ کر وہ مضطرب و بے تاب ہے اور اپنے منبع و ماخذ سے مل جانا چاہتی ہے، لیکن جب انسان دنیاوی مقصدوں میں پھنس جاتا ہے، تو اس کی روح طرح طرح کی آلودگیوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ کبر و نخوت، جاہ طلبی اور اس قسم کے اور بھی روحانی عیوب ہیں، جو ہمیں منزل پر نہیں پہنچنے دیتے۔ عشق ہی ایک ایسا معالج ہے، جو ہمیں ایسے عیوب سے نجات دلا سکتا ہے۔

شاد باش ای عشق خوش سودائے ما ای طبیب جملہ علت ہای ما
ای دوای نخوت و ناموس ما ای تو افلاطون و جالینوس ما

دنیا میں طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اکثر دنیا کے بندے مشکلات میں دل ہار بیٹھتے ہیں، لیکن جن کے دل عشق کی بدولت صبر آشنا ہیں، عشق ان کی ساری مشکلات کو حل کر دیتا ہے۔ اس کی تلخیاں شیرینیوں میں بدل جاتی ہیں۔ اس کے دکھ درد شفا پاتے ہیں۔ اور اس کے راستے کے کانٹے گلستان کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ تختۂ دار اس کے لیے تخت بن جاتا ہے

از محبت تلخہا شیریں شود از محبت مس ہا زریں شود
از محبت دردہا صافی شود وز محبت دردہا شافی شود
از محبت خارہا گل می شود وز محبت سرکہائی مے شود
از محبت دار تختی می شود وز محبت بار بختی می شود

انسانی روح کو وجودِ باری سے ازلی اور ابدی تعلق ہے، جس کے وصال کے لیے وہ بے تاب ہے۔ ایک روح پر موقوف نہیں، اس دنیا میں جو کچھ ہے عشق و محبت کا مظہر ہے، اس لیے ہر مخلوق کے دل میں فراق کی بے تابی موجود ہے۔ یہ بے تابی حرکت کرنا اور ترقی کرنا سکھاتی ہے۔ مثلاً ایک بیج بڑھ کر درخت بننا چاہتا ہے، ذرہ بے مقدار چاہتا ہے بڑھ بڑھ کر آفتاب تک جا پہنچے۔ قطرہ چاہتا ہے چل چل کر سمندر سے واصل ہو جائے

گویا اسی طرح ہر چیز حرکت کر کے ترقی کی منزل طے کرنا چاہتی ہے، تاکہ وہ اپنے منبع و ماخذ سے جا ملے۔ اس بے تابی کو، یعنی حرکت وارتقا کو، جو ذات باری میں واصل ہونے کے لیے ہے، مولانا ذیل کے اشعار میں پیش کرتے ہیں۔

از جمادی مردم و نامی شدم — وز نما مردم بہ حیوان سرزدم
مردم از حیوانی و آدم شدم — پس چہ ترسم کی ز مردن کم شوم
حملۂ دیگر بمیرم از بشر — پس برآرم از ملائک بال و پر
بار دیگر از ملک پران شوم — آنچہ اندر وہم ناید آن شوم
پس عدم گردم عدم چون ارغنون — گویدم کانا الیہ راجعون

اسی عشق کی بدولت جسم خاکی کو افلاک پر پہنچنے کا شرف حاصل ہوتا۔

جسم خاک از عشق بر افلاک شد — کوہ در رقص آمد و چالاک شد
عشق جان طور آمد عاشقا — طور مست و خرّ موسیٰ صاعقا

وحدت الوجود

شریعت میں توحید کا یہ مفہوم ہے کہ خدا ایک ہے، اس کے سوا کوئی اور خدا نہیں۔ خدا کا کوئی اور شریک بھی نہیں، لیکن اہلِ تصوف کا یہ عقیدہ ہے کہ کائنات میں صرف خدا ہی کی ذات ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں، جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے، سب خدا ہی خدا ہے۔ کائنات کی تمام اشیا، جو جسم اختیار کیے ہوئے محدود صورت میں ہمیں نظر آتی ہیں، یہ سب صفاتِ خداوندی کے مظاہر ہیں۔ صوفیا کا یہ عقیدہ، نظریۂ ہمہ اوست" کہلاتا ہے۔ اسے "نظریہ وحدت الوجود" بھی کہتے ہیں۔ گویا وجود مطلق کی صفات جب اعتباری اور اضافی جسم اختیار کرتی ہیں۔ تو ہمیں مخلوق کی صورت میں نظر آتی ہیں، لیکن اصل میں حقیقت ایک ہی ہے، جو کائنات کے ذرّے ذرّے میں کارفرما ہے، جس طرح ایک دھاگے میں گرہیں دی جائیں، تو سطحی نظر میں گرہوں کا وجود جداگانہ نظر آتا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ ایک ہی دھاگا ہے، جس نے مختلف صورتیں اختیار کر

لی ہیں۔ اسی طرح حقیقتِ مطلق کی صفات مختلف اجسام کی صورت میں نظر آتی ہیں۔ تمیز کرنے کے لیے ہر چیز کا الگ الگ نام رکھ لیا گیا ہے۔ کسی چیز کو "مکان" کہہ لیتے ہیں اور کسی کو "لامکان" کا نام دیتے ہیں۔ بعض چیزوں میں "من وتو" کے الفاظ سے امتیاز پیدا کرتے ہیں۔ اسی امتیاز کو مولانا ذیل کے شعر میں واضح کرتے ہیں ؎

چو ماہیت مطلق آمد در عبارت　　　به لفظ "من" کنند از وی اشارت

مثنوی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا بھی عقیدۂ "وحدت الوجود" کے پیرو ہیں۔ عشق کی طرح وحدت الوجود کے عقیدے کا بھی بڑی شیفتگی سے ذکر کرتے ہیں۔ اس موضوع کے چند اشعار حسبِ ذیل ہیں۔

گو ہزاران اند یک کس بیش نیست　　　جز خیالات عدد اندیش نیست
بحر وحدانیست جفت و زوج نیست　　　گوہر و ماہیش غیر موج نیست
نیست اندر بحر شرک ہیچ ہیچ　　　لیک با احول چہ گویم ہیچ ہیچ

ظاہر بین آنکھ کو خالق اور مخلوق میں جو دوئی نظر آتی ہے، وہ بینائی کی خرابی یعنی بھینگے پن کی دلیل ہے۔ چنانچہ ذیل کی حکایت میں یہ امر واضح کیا ہے۔

گفت استاد احولی را کاندر آ　　　رو برون آر از وثاق آن شیشہ را
چون درون رفت احول اندر خانہ زود　　　شیشہ پیش چشم او دو می نمود
گفت احول زان دو شیشہ گو کدام　　　پیش تو آرم بگو شرحش تمام
گفت استاد آن دو شیشہ نیست رو　　　احولی بگذار و افزون بین مشو
گفت ای استا مرا طعنہ مزن　　　گفت استا زان دو یک را در شکن
چون یکی بشکست ہر دو شد ز چشم　　　مرد احول گردد از میلان و خشم
شیشہ یک بود و بچشمش دو نمود　　　چون شکست او شیشہ را دیگر نبود

جدّ و جہد۔ مولانا جدّ و جہد کو زندگی کے لیے نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ توکل تو ان کا ایمان

ہے۔ لیکن ان کے نزدیک توکل کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان کوشش چھوڑ دے اور ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھا رہے۔ بلکہ توکل سے یہ مراد ہے کہ صوفی کوشش کرتے ہوئے نظر خدا پر رکھے، اور اس اعتقاد سے اس کے دل میں ایک قسم کا اعتماد پیدا ہو جائے۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں ؎

گفت پیغمبر بہ آواز بلند || با توکل زانوی اشتر بہ بند
رمز "الکاسب حبیب اللہ" شنو || از توکل در سبب غافل مشو
گر توکل می کنی در کار کن || کشت کن پس تکیہ بر جبار کن

سالک کے لیے ترکِ دُنیا ضروری نہیں

ظاہر پرست صوفیوں کے خلاف مولانا نفس کی اصلاح کے لیے دُنیا کو ترک کر دینا ضروری نہیں سمجھتے۔ بلکہ اُن کا خیال ہے کہ روحانیت کا بلند مرتبہ حاصل کرنے کے لیے وسائلِ زندگی کو کام میں لانا ضروری ہے۔ دنیاوی تعلقات سے روحانیت کو نقصان نہیں پہنچتا، بلکہ روحانیت کو نقصان پہنچانے والی اصل چیز حُبِّ دُنیا ہے۔ مولانا کا ایک شعر ہے۔

چیست دنیا از خدا غافل بدن || نی قماش و نقرہ و فرزند و زن

اس شعر میں آپ نے واضح طور پر یہ تلقین کی ہے کہ دنیا میں رہو۔ اسباب دنیا کو کام میں لاؤ۔ مال و دولت حاصل کرو، ازدواجی زندگی بسر کرو، لیکن حبِّ دنیا میں اس قدر نہ کھو جاؤ کہ خدا ہی کو بُھلا دو۔

جماعتی زندگی کی فضیلت

بعض عارف تنہائی اور گوشہ نشینی کی زندگی کو پسند کرتے ہیں، لیکن مولانا کے نزدیک مجلس اور ہم نشینی کو بہت اہمیت حاصل ہے اور اسے وہ تہذیب نفس اور اصلاح اخلاق کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ دوستی اور ہم سازی کی انتہا یہ ہے کہ یار خدائی مل جائے۔

رو بجو یار خدائی را تو زود || چون چنان کردی خدا یار تو بود

مولانا کی غزل کا ایک شعر ہے ؎

ہر چند سایۂ کرمِ شاہ حافظ است　　در رہ ہمان بہ است کہ با کاروان دویم

مثنوی کی شہرت

مولانا کی "مثنوی معنوی" کو جو شہرت حاصل ہوئی، وہ مشرق میں اور کسی کتاب کو حاصل نہیں ہو سکی۔ مثنوی کے علاوہ اگرچہ تین اور کتابیں شاہنامہ فردوسی، گلستان سعدی اور دیوانِ حافظ بھی مشرقی ممالک میں بہت مشہور ہوئیں، لیکن اگر ان چاروں کی مقبولیت کا موازنہ کیا جائے، تو مثنوی کا نام سرفہرست ہوگا۔ مثنوی کی مقبولیت کی ایک بڑی دلیل یہ ہے۔ کہ بڑے بڑے جید علماء نے مثنوی کی شرحیں لکھی ہیں، ان میں سے بعض کے نام بحوالہ مولانا شبلی نعمانی حسب ذیل ہیں۔

مولی مصطفٰے ابن شعبان	کمال الدین خوارزمی
شیخ اسمٰعیل القردی	عبداللہ بن محمد رئیس الکتاب
ظریفی حسن چلپی	شیخ عبدالمجید سیواسی
علاء الدین مصنفک	علائی بن یحیٰی واعظ شیرازی

علمائے یورپ کا اعتنا

یورپ کے بعض مستشرقین نے بھی اہل یورپ کو مولانا کی مثنوی سے مستفید کرنے کے لیے اس کے ترجمے کیے ہیں اور تفسیریں لکھی ہیں، جن کا مختصر سا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

۱۔ سر جیمز ریڈ ہاؤس نے دفتر اول کا ترجمہ نظم میں کیا۔

۲۔ مسٹر ای ایچ ون فیلڈ نے بعض منتخب حصوں کا نثر میں ترجمہ کیا ہے۔

۳۔ پروفیسر ای۔ ایچ پامر نے ابتدائی حصے کو "نغمہ نے" کے عنوان سے انگریزی میں لکھا ہے۔

۴۔ آر۔ اے۔ نکلسن نے بڑی کاوش سے پوری مثنوی کی تفسیر لکھی ہے

مولانا کا غزلیات کا ایک دیوان بھی ہے، جو دیوان شمس تبریزی کے نام سے موسوم ہے۔ رضا قلی ہدایت مجمع الفصحا میں لکھتا ہے کہ دیوان کی بعض غزلیں شمس تبریزی

کی موجودگی میں لکھی گئی تھیں، لیکن بیشتر غزلیں اس وقت لکھی گئیں۔ جب وہ اہلِ قونیہ کی ناراضی کے خیال سے قونیہ کو خیر باد کہہ گئے تھے۔

آپ نے فیہ مافیہ کے نام سے نثر میں بھی ایک رسالہ لکھا ہے جس کا ترجمہ اردو میں بھی ہو چکا ہے۔

آپ نے ۶۷۲ھ مطابق ۱۲۷۳ء وفات پائی۔

شیخ سعدی علیہ الرحمۃ

ایلغانی فتنہ کے ہاتھوں جب سرزمین ایران بیگناہوں کے خون سے لالہ زار بنی، گھر ویران اور مسجدیں تباہ ہوئیں۔ علم و ادب کے مرکز فنا ہوئے، کتاب خانے نذرِ آتش ہوئے۔ علمائے یگانہ تیغ بیداد کا نشانہ بنے، عین اسی زمانے میں ایک ایسی نادرہ روزگار ہستی وجود میں آئی جس کے ادبی کارناموں نے اہلِ ایران کے مجروح دلوں پر مرہم کا کام کیا۔ یہ بزرگوار ہستی شیخ سعدی علیہ الرحمۃ ہیں۔

شیخ سعدی شیراز میں پیدا ہوئے، سالِ پیدائش کسی قدیم تذکرے میں نہیں ملتا۔ ایران کے ایک جدید سوانح نگار احسان[1] معتقد لکھتے ہیں۔ کہ سعدی تقریباً ۵۸۰ھ مطابق ۱۱۸۴ء میں پیدا ہوئے، لیکن اگر اُن کی وفات، جیسا کہ تذکرہ نویس لکھتے ہیں، ۶۵۰ھ مطابق ۱۲۵۲ء کے لگ بھگ ہوئی ہو تو ان کی عمر ایک سو سال ہوتی ہے۔ لیکن کسی تذکرے سے یہ ثابت نہیں کہ آپ نے اتنی طویل عمر پائی ہو۔ اس لیے یہ سالِ پیدائش درست معلوم نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں آپ کے بعض اشعار ہماری رہنمائی کرتے ہیں مثلاً

---

[1] سعدی چہ می گوید ص ۵

ای کہ پنجاہ رفت و در خوابی　　　مگر این پنج روز دریابی

یہ شعر "گلستان" کا ہے، جس کا سال تکمیل ۶۵۶ ھجر مطابق ۱۲۵۸ء ہے۔ لفظ "پنجاہ" اگر حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہو، تو کہا جا سکتا ہے کہ آپ کا سال ولادت ۶۰۶ ھجر مطابق ۱۲۰۹ء ہے۔

نام

احسان معتقد نے بعض دوسرے تذکروں کے مطابق آپ کا نام[1] مصلح الدین لکھا ہے۔ لیکن پروفیسر براؤن[2] نے سعدی کی کلیات کے قدیم ترین نسخہ کے حوالے سے، جو انڈیا آفس میں موجود ہے۔ آپ کا نام مشرف الدین بن مصلح الدین عبداللہ لکھا ہے۔ شفق نے بھی آپ کا نام مشرف الدین ہی لکھا ہے۔ اس لیے یہی نام درست سمجھنا چاہیے۔

ابتدائی تعلیم

آپ کا خاندان علم و فضل کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ اس خاندان کے اکثر افراد علمائے دین تھے، جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں۔

ہمہ قبیلہ من عالمان دین بودند　　　مرا معلم عشق تو شاعری آموخت

آپ نے ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی، لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا، کیونکہ آپ بچپن میں ہی پدری محبت سے محروم ہو گئے۔ جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں۔

مرا باشد از درد طفلان خبر　　　کہ در طفلی از سر برفتم پدر

من آنگہ سر تاجور داشتم　　　کہ سر در کنار پدر داشتم

والد کی وفات کے بعد آپ نے شیراز کے علماء سے تحصیل علوم کی۔ اس زمانے میں طالب علم کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا تھا کہ تعلیم کے سلسلے میں دُور دراز کا سفر بھی کرے۔ چنانچہ آپ شیراز سے چل کر بغداد آئے اور ابوالفرج عبدالرحمٰن بن جوزی ایسے مشہور استاد سے منتہیانہ تعلیم پائی۔ ان کے علاوہ یگانہ روزگار عارف شیخ شہاب الدین سہروردی سے بھی

---

[1] سعدی چہ می گوید ص ۱　　　[2] لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم ص ۵۲۶

آپ نے کسب فیض کیا۔

سیاحت

سعدی علیہ الرحمۃ کے سینے میں بے چین اور بیقرار دل تھا، اس لیے آپ کسی ایک جگہ کے قیام پر مطمئن نہ ہو سکتے تھے۔ تعلیم سے فراغت پا کر اب وہ اطرافِ عالم کو دیکھنے کے آرزومند تھے۔ ذیل کے اشعار آپ کی اسی آرزو کی ترجمانی کرتے ہیں۔

بہیچ یار مدہ خاطر و بہیچ دیار   کہ بر و بحر فراخ ست و آدمی بسیار

چو ماکیان بدرِ خانہ چند بینی جور   چرا سفر نکنی چون کبوتر طیار

بغداد سے نکل کر آپ نے سیر و سیاحت شروع کی اور تمام فلسطین، مکہ معظمہ، ایشیائے کوچک اور شمالی افریقہ تک ہو آئے۔ کہا جاتا ہے آپ نے دورانِ سیاحت کے طویل عرصے میں چودہ حج کیے۔ بوستان کی بعض حکایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ نے ترکستان اور ہندوستان کا بھی سفر کیا۔ چنانچہ انھی حکایات کی بنا پر احسانؔ معتقد لکھتے ہیں "...... وہ کچھ مدت سومنات مندر کے مجاور بھی رہے۔" لیکن تحقیق سے اُن کا ہندوستان آنا، سومنات کا مجاور بننا، اور مندر کے ایک برہمن کو ہلاک کرنا درست ثابت نہیں ہوتا۔ علامہ شبلی شعر العجم[1] میں لکھتے ہیں کہ ہندوستان اور ترکستان کے سفر کا ذکر کرتے ہوئے یا تو سعدی نے محض تخیل اور شاعری سے کام لیا ہے، یا یار لوگوں نے یہ فرضی حکایتیں بعد میں "بوستان" میں شامل کر دی ہوں گی۔

سعدی کی سیاحت کے دوران کئی نامور خاندان صفحۂ ہستی سے ناپید ہوئے۔ آلِ کُرت کے سلاطین کی شوکت و حشمت افریقہ اور یورپ تک مشہور تھی۔ لیکن اس زمانے میں یہ بھی زوال پذیر ہو گئی۔ سلجوقیوں اور خوارزمشاہوں کے مابین جنگیں ہوئیں، جن کی وجہ سے یہ

---

[1] سعدی چہ می گوید ص ۹   ؎

دونوں حکومتیں مضمحل ہو کر رہ گئیں۔ خوارزمشاہوں کی سلطنت آخر تاتاریوں کے ہاتھوں ختم ہوئی۔ ایلخانیوں کی شمشیروں سے کم و بیش آٹھ لاکھ مسلمان لقمۂ اجل بنے۔ اسکندریہ اور دمشق میں قحط پڑا جس سے ہزاروں انسان لقمۂ اجل بنے۔ گلستان اور بوستان کی بعض حکایات میں اس قحط کا ذکر آیا ہے۔ ذیل کے شعر میں اسی قحط کی طرف اشارہ کیا ہے۔

چناں قحط سالی شد اندر دمشق کہ یاران فراموش کردند عشق

شیراز جو شیخ کا وطن مالوف تھا، اسی زمانے میں بارہا قتل و غارت سے دوچار ہوا۔

*یہ تمام حادثاتِ عالم سعدی کی زندگی میں ظہور پذیر ہوئے جس سے آپ بہت متاثر تھے۔ گلستان اور بوستان میں جو آپ نے لوگوں کو کردار و اعمال کی اصلاح کی تلقین کی ہے، اور بے ثباتیِ دُنیا کا احساس دلایا ہے۔ یہ سب انہی حادثاتِ عالم کی صدائے بازگشت ہے۔

سعدی کے کلام سے پتا چلتا ہے کہ آپ مختلف حیثیات کا مجموعہ تھے، حُسن پرست تھے، زاہد تھے، رند تھے، واعظ تھے، عابد شب زندہ دار تھے، اس لیے انھوں نے دُنیا کو ہر ہر نظر سے دیکھا۔ مسافرت میں انھوں نے تکلیفیں بھی اٹھائیں اور خوشیاں بھی دیکھیں۔ قسم قسم کے انسانوں سے ملے اور طرح طرح کے تجربات حاصل کیے۔ ایک حکایت میں لکھتے ہیں۔ " مجھے طرابلس کی صلیبی جنگ میں، عیسائیوں نے گرفتار کر لیا۔ اور خندق کھودنے کے کام پر لگا دیا۔ آخر ایک شناسا نے زرِ فدیہ دے کر آزاد کرایا۔" آپ کے اشعار سے پتا چلتا ہے کہ قید کی سختیوں نے بھی آپ کی اصلاحِ نفس میں مدد دی ؎

گر آئینہ از آہ گردد سیاہ شود روشن آئینۂ دل باہ

سعدی نے زندگی کے تلخ حقائق کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور کبھی شکوہ و شکایت سے زبان و قلم کو آلودہ نہیں کیا۔ کبھی کچھ ذکر کیا بھی، تو اس انداز سے کہ پڑھنے والوں کو اس سے سبق حاصل ہو۔ ایک حکایت میں لکھتے ہیں، ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میرے پاؤں میں جوتا بھی نہ رہا۔ دام پاس نہ تھے کہ جوتا خرید لیتا۔ اسی حالت میں جامعہ کوفہ میں آیا۔ یہاں

ایک شخص کو دیکھا جس کے پاؤں ہی نہ تھے۔ خدا کا شکر کیا کہ جوتا نہیں، تو نہ سہی پاؤں تو ہیں۔

اس طویل سیاحت میں سعدی نے خصائص انسانی حاصل کرنے اور زمانے کی نیرنگیوں کا مطالعہ کرنے میں عمر صرف کردی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنے کلام میں اخلاق انسانی کی نہایت موثر تصویر کشی کی ہے۔

سیاحت کے دوران آپ کو پریشانیوں کا جو سامنا ہوا، اس سے نہ صرف آپ کو صبر و تحمل کی قوت حاصل ہوئی، بلکہ آپ کی طبیعت میں گداز بھی پیدا ہوا۔ اسی گداز کا یہ نتیجہ ہے کہ آپ کے کلام میں بہت اثر پایا جاتا ہے، جو پڑھنے والوں کے دل و دماغ پر سحر کر دیتا ہے۔

ہر کسی را نباشد این گفتار — عود نا سوختہ ندارد بوی

کلام خواہ کتنا فصیح کیوں نہ ہو، جب تک اس میں اثر نالہ نہ ہو، دل و دماغ کو متاثر نہیں کر سکتا۔ شاعر جب خود نالہ کرتا ہے، تو دوسروں کی آنکھیں بھی نمناک ہوتی ہیں۔

گر بر سود نالہ سعدی بکوہ — کوہ بنالد بزبان صدا

اسی نالۂ سعدی کا یہ اثر ہے، کہ خواص نے آپ کے کلام کو راہنما بنایا، عوام اس سے فیض یاب ہوئے۔ بچوں اور بوڑھوں نے اس سے یکساں حظ اٹھایا، اور آج سات سو برس کا عرصہ گزرنے کے بعد بھی آپ کے کلام کی تازگی اور اثر آفرینی میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا۔

وطن کو واپسی

سعدی کے طویل عرصہ وطن سے باہر رہنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ شیراز اور گرد و نواح کے علاقوں میں امن و امان نہ تھا۔ یہ زمانہ منظفر الدین سعد بن زنگی کی حکومت کا تھا۔ ۶۲۳ ھجری مطابق ۱۲۲۶ء میں سعد فوت ہوا تو عنانِ حکومت اس کے بیٹے منظفر الدین ابوبکر بن سعد بن زنگی نے سنبھالی۔ اس حکمران نے تاتاریوں سے مصالحت کر کے فارس کو قتل و غارت سے بچایا۔ اور اہلِ فارس کو امن و امان نصیب ہو گیا۔ سعدی نے سنا تو آپ کے قلب مجروح کو بڑی تسکین ہوئی۔ وطن کی محبت، آخر ۶۶۵ ھجری مطابق ۱۲۶۶ء میں آپ کو فارس کے دارالسلطنت شیراز میں لے آئی۔

وفات اور شہرت

تذکروں سے پتا چلتا ہے کہ ہندوستان سے حاکم ملتان نے قاصد بھیج کر آپ کو ہندوستان آنے کی دعوت دی، اور زادِ راہ بھی بھیجا لیکن آپ بہت ضعیف ہو چکے تھے، اس لیے معذرت کی۔ بقیہ عمر شیراز کی ایک خانقاہ میں گوشہ نشینی اختیار کر کے گزاری، جو شیراز سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر رکنا آباد کے کنارے واقع ہے۔ اس خانقاہ کو مرتے دم تک نہ چھوڑا، آخر یہیں تقریباً ۶۹۱ ھجری مطابق ۱۲۹۱ء میں دفن ہوئے۔ آپ کا مزار "سعدیہ" کے نام سے موسوم ہے۔ اور زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

بعد از وفات تربت ما در زمین مجوی در سینہ ہای مردم عارف مزار ماست

حاکم ملتان کی دعوت سے پتا چلتا ہے کہ سعدی کی شہرت ان کی زندگی ہی میں اطراف عالم میں پھیل چکی تھی، چنانچہ وہ خود بھی گلستان کے دیباچہ میں لکھتے ہیں: "سعدی کا ذکرِ جمیل، عام لوگوں تک پہنچ چکا ہے، اور کلام کی شہرت روئے زمین پر پھیل گئی ہے۔ صاحب ذوق کلام سے نیشکر کی مانند شیرینی حاصل کرتے ہیں اور اس کی انشا کے نمونے "کاغذ زر" کی مانند لیے لیے پھرتے ہیں۔"

اپنے آفاقی ہونے کا ذیل کے شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

کس نالید در این عہد چو من بر در دوست کہ بآفاق سخن می رود از شیراز م

سعدی کے معاصرین کی رائے

مجد ہمگر، جو اتابکوں کے دربار کا ایک ممتاز شاعر تھا لکھتا ہے،

از سعدی مشہور سخن شعر روان جوی کو کعبہ فضل است و دلش چشمہ زمزم

ہمام تبریزی سعدی کی شہرت اور اس کے مرتبہ بلند پر رشک کرتا ہوا لکھتا ہے ؎

ہمام را سخن دلفریب و شیرین است ولی چہ سود کہ بیچارہ نیست شیرازی

امیر خسرو لکھتے ہیں ؎

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت　　شیرہ از خم خانۂ مستی کہ در شیراز بود

سعدی کی وفات کے بعد بھی استادانِ فن نے ان کی شاعرانہ عظمت کی طرف اشارے کیے ہیں۔ حافظ کہتے ہیں ؎

اُستادِ سخن سعدی است پیش ہمہ کس امّا

دارد سخن حافظؔ طرزِ روشِ خواجو

ذیل کے مشہور قطعے سے پتہ چلتا ہے کہ سعدی کے ہم وطنوں کے دل میں اُن کی کس قدر عزت تھی۔

در شعر سہ تن پیمبرانند　　ہر چند کہ لا نبی وبعدی

تولی است کہ جملگی برآنند　　فردوسی و انوری و سعدی

یہ ان کی عظمت ہی کی دلیل ہے۔ کہ آج ساڑھے سات سو سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ایران سے باہر کے ملکوں میں گلستان کسی نہ کسی شکل میں داخل نصاب ہے۔

تصنیفات سعدی کی مشہور آفاق تصانیف "گلستان" اور "بوستان" ہیں۔ ان کے علاوہ کلیات بھی آپ کی یادگار ہے۔ کلیات، عربی فارسی قصائد، مراثی، ملمعات، غزلیات، خطابات اور ہزلیات پر مشتمل ہے۔ آپ نے عطار کے طرز پر "پندنامہ" بھی تالیف کیا ہے۔

بوستان - جس طرح شاہنامہ فردوسی رزم میں "مثنوی معنوی" تصوف و عرفان میں بے مثال ہے، اسی طرح بوستان علم اخلاق میں اپنی مثال آپ ہے۔

بوستان ۶۵۵ ھجری بمطابق ۱۲۵۷ء میں لکھی گئی، جیسا کہ سعدی خود کہتے ہیں ؎

ز ششصد فزون بود پنجاہ و پنج　　کہ من گفتم این نامبردار گنج

بوستان میں اخلاقی مسائل نہایت سہل اور موثر انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ مزید وضاحت کے لیے دلچسپ حکایتیں بھی لکھی ہیں، جن کی وجہ سے آپ کے پند و نصائح دلوں

پہ دیرپا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ "بوستان" حمد اور نعت سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد دس باب ہیں، جن کے عنوان حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) عدل و رای و تدبیر جهانداری (۲) فضیلت احسان (۳) عشق و مستی و شور (۴) تواضع (۵) فضیلت رضا (۶) قناعت (۷) تربیت (۸) شکر بر عافیت (۹) توبه و صواب (۱۰) مناجات

بوستان کے چند موضوع حسبِ ذیل ہیں

عجز و انکسار

یکی قطره باران ز ابری چکید — خجل شد چو پهنای دریا بدید
که جایی که دریاست من کیستم — گر او هست حقا که من نیستم
چو خود را بچشم حقارت بدید — صدف در کنارش بجان پرورید
سپهرش بجایی رسانید کار — که شد نامور لولوی شاهوار

عزتِ نفس

سگی پای صحرا نشینی گزید — به خشمی که زهرش ز دندان چکید
شب از درد بیچاره خوابش نبرد — بخیل اندرش دختری بود خرد
پدر را جفا کرد و تندی نمود — که آخر ترا نیز دندان نبود
پس از گریه مرد پراگنده روز — بخندید کای مامک دل فروز
مرا گرچه هم سلطنت بود بیش — دریغ آمدم کام و دندان خویش
محال است گر تیغ بر سر خورم — که دندان بپای سگ اندر برم
توان کرد با ناکسان بدرگی — ولیکن نیاید ز مردم سگی

عطا و بخشش

چنین گفت شوریده‌ای در عجم — به کسری که ای وارث ملک جم

اگر ملک بر جم بماندی و بخت | ترا چون میسر شدی تاج و تخت
اگر گنج قارون بدست آوری
نماند مگر آنچه بخشی بری

فنای اہل محبت

شنیدم که بر لحن خنیاگری | برقص، اندر آمد پری پیکری
ز دلهای شوریده پیرامنش | گرفت آتش شمع در دامنش
پراگنده خاطر شد و خشمناک | یکی گفتش از دوستداران چه باک
ترا آتش ای دوست دامن بسوخت | مرا خود بیک بار از من بسوخت
اگر یاری از خویشتن دم مزن | که شرک است با یار و با خویشتن

فضیلت اطاعت

یکی دیدم از عرصه رود بار | که پیش آمدم بر پلنگی سوار
چنان ہول ازان حال بر من نشست | که ترسیدنم پای رفتن به بست
تبسم کنان دست بر لب گرفت | که سعدی مدار آنچه دیدی شگفت
تو ہم گردن از حکم داور مپیچ | که گردن نه پیچد ز حکم تو ہیچ

غزل گوئی سعدی غزل کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ متقدمین الگ غزل تو نہیں کہتے تھے، لیکن قصیدہ کے شروع میں محبوب کو خطاب کر کے چند عشقیہ اشعار لکھتے تھے، جن میں حسن و شباب کا ذکر ہوتا تھا۔ انہی اشعار کو تشبیب یا غزل کہتے تھے۔ سعدی سے پہلے انوری اور ظہیر فاریابی نے قصیدے سے الگ بھی غزلیں لکھیں، لیکن ان میں بھی قصیدے ہی کی شان پائی جاتی تھی۔ اگرچہ ان کی زبان قصیدے کی طرح پرشکوہ نہیں، بلکہ غزل کی طرح لطیف ہوتی تھی۔ حکیم سنائی اور مولانائے روم نے بھی غزلیں کہیں، لیکن ان کا موضوعِ غزل تصوف، معرفت حق اور عشقِ حقیقی

ہے۔ سب سے پہلے شاعر سعدی ہیں جنھوں نے غزل کو صحیح معنی میں غزل بنایا۔ آپ نے غزل میں ذیل کی چند نئی باتیں پیدا کیں۔

ذاتی جذبات

سعدی کی غزلیات میں ذاتی جذبات کا عکس جھلکتا نظر آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے، جو کچھ کہتے ہیں، آپ بیتی کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی غزلیات شور و مستی اور رقت و احساس کی مظہر ہیں۔ نمونے کی غرض سے ایک غزل اور چند اشعار درج ذیل ہیں۔

آمدی وہ کہ چہ مشتاق و پریشان بودم
تا برفتی زبرم صورت بی جان بودم
نہ فراموشیم از ذکر تو خاموش نشاند
کہ در اندیشہ اوصاف تو حیران بودم
بتولای تو در آتش محنت چو خلیل
گوئیا در چمن لالہ و ریحان بودم
تا مگر یک نفسم بوی تو آرد دم صبح
ہمہ شب منتظر مرغ سحر خوان بودم
سعدی از جور فراقت ہمہ روز این می گفت
عہد بشکستی و من بر سر پیمان بودم

خبر ما برسانید بہ مرغان چمن کہ ہم آواز شما در قفسی افتادہ است

بجشم رفتۂ ما را کہ می برد پیغام بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است

در سوختہ پنہان نتوان داشتن آتش ما ہیچ نگفتیم و حکایت بدر افتاد

دو دوست قدر شناسند عہدِ صحبت را کہ مدتی ببریدند و باز پیوستند

۲۔ سعدی سے پہلے غزل میں عاشقانہ مضامین بڑی سادگی سے ادا کیے جاتے تھے۔ لیکن آپ یہ مضامین بڑی جدت سے ادا کرتے ہیں۔ معمولی سے مضامین آپ کے اسلوب بیان سے بہت بلند ہو جاتے ہیں۔ مثلاً مضمون یہ تھا کہ محبوب میں کچھ خوبیاں ہیں، جن کے باعث ہم اُسے دل دے بیٹھے ہیں۔ اس کو وہ اس طرح ادا کرتے ہیں۔

دوستان منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم باید اول بتو گفتن کہ چنین خوب چرائی

محبوب کی مست بھری آنکھیں ہزاروں فتنے بپا کرتی ہیں۔ اس مضمون کو اپنے حسنِ بیان سے کتنا بلند کر دیا ہے ؎

برخیز کہ چشم ہای مستت خفتہ است و ہزار فتنہ بیدار

۲۔ سعدی محض شاعر ہی نہیں، بلکہ بینا دل عارف بھی ہیں چنانچہ بعض غزلیں آپ نے تصوف و عرفان کے بیان میں بھی لکھی ہیں، جن کو پڑھ کر اہل حال و قال پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ایک عارفانہ غزل حسبِ ذیل ہے ؎

بجہان خرم از آنم کہ جہان خرم از دست
عاشقم بر ہمہ عالم کہ ہمہ عالم از دست

بغنیمت شمرای دوست دم عیسیٰ صبح
تا دل مردہ مگر زندہ کنی کاین دم از دست

نہ فلک راست مسلم نہ ملک را حاصل
آنچہ در سرِ سویدای بنی آدم از دست

بحلاوت بخورم زہر کہ شاہد ساقیست
بارادت ببرم درد کہ درمان ہم از دست

غم و شادی بر عارف چہ تفاوت دارد

ساقیا بادہ بدہ شادی آن کاین غم از دست

سعدیا گر بکند سیل فنا خانۂ دل

دل قوی دار کہ بنیاد بقا محکم از دست

(۴) سعدی نے اخلاقیات کو موضوع بنا کر بھی غزلیں کہی ہیں۔ یہ غزلیں پند و موعظت کا مرقع نہیں، بلکہ ان میں احساس آدمیت کو ابھارا گیا ہے۔ ذیل کی غزل اس موضوع کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔

چو کسی در آمد از پای و تو دست گاہ داری

گرت آدمیتی ہست دلش نگاہ داری

برہ بہشت فردا نتوان شدن ز محشر

مگر از دیار دنیا کہ بہر دو راہ داری

ہمہ عیب خلق دیدن نہ مروت است و مردی

نگہی بخویشتن کن کہ تو ہم گناہ داری

رہ عالمان و مردان کرمست و لطف و احسان

تو خود از نشان مردی مگر این کلاہ داری

بدر خدای قربی طلب ای ضعیف ہمت

کہ نماز این تقرب کہ بپادشاہ داری

تو حساب خویشتن کن نہ عتاب خلق سعدی

کہ بضاعت قیامت عمل تباہ داری

قصائد سعدی

سعدی ایک آزاد خیال شاعر تھے، وہ جو خود محسوس کرتے، شعروں میں ادا کرتے

تھے۔ اُن کی جبیں کسی کی چوکھٹ پر نہیں جھکی۔ انہوں نے قصیدے تو کہے ہیں، لیکن یہ تملق اور خوشامد سے قطعاً پاک ہیں۔ ان میں پند و نصائح کا عنصر غالب ہوتا ہے۔

اتابکوں کی سلطنت کو جب زوال آیا اور انکیانو[1]، فارس کا حکمران بنا، تو سعدی نے اس کا قصیدہ لکھا، لیکن یہ قصیدہ ستائش اور خوشامد کی بجائے پند و نصائح سے پُر ہے۔

بس بگردید و بگردد روزگار — دل بدنیا در نہ بندد ہوشیار
ای کہ دستت می رسد کاری بکن — پیش ازان کز تو نیاید ہیچ کار
نام نیکو گر بماند ز آدمی — بہ کزو ماند سرای زرنگار
سعدیا چندانکہ می دانی بگو — حق نشاید گفتن الا آشکار
ہر کرا خوف و طمع در کار نیست — از خطا باکش نباشد وز تتار
دولت نوئین اعظم شہریار — باد تا باشد بقای روزگار

ایک اور قصیدے کا مطلع یہ ہے:۔

بسی صورت بگردیدست عالم — وزین صورت بگردد عاقبت ہم

مدح میں کہتے ہیں:۔

سخن شیرین بود پیر کہن را — مدانم بشنو د نوئین اعظم
جہاں سالار عادل انکیانو — سپہدار عراق و ترک و دیلم
کہ روز بزم بر تخت کیانی — فریدونست و روز رزم رستم
چنین پند از پدر نشنیدہ باشی — الا گر ہوشمندی بشنو از عم

---

[1] امیر انکیانو ۶۶۷ھ مطابق ۱۲۶۸ء میں ہلاکو کے بیٹے اباقا خان کی طرف سے حاکم فارس مقرر ہوا تھا۔ اس کی مدت حکومت ۶۶۷ تا ۶۷۰ ہجری مطابق ۱۲۶۸ - ۱۲۷۱ء ہے۔

آپ کے قصائد پند و موعظت سے پر ہوتے ہیں۔ ان قصائد میں گویا انھوں نے بے ثباتیِ دنیا، ہمدردیِ خلائق، اصلاحِ نفس پر زوردار وعظ کیے ہیں۔

آپ نے یہ قصائد کسی دنیاوی منفعت کے خیال سے نہیں کہے، بلکہ محض اخلاقی ضروریات کے پیشِ نظر کہے ہیں۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں۔

از من نیاید آنکہ بدہقان و کدخدای
حاجت برم کہ کار گدایان خرمن است

ذیل کے چند اشعار سے آپ کی بے نیازی اور آزادیٔ فکر کا پتہ چلتا ہے ؎

مرا طبع ازین گونہ خواہان نبود | سر مدحت پادشاہان نبود
براہِ تکلف مرو سعدیا | اگر صدق داری بیار و بیا
چہ حاجت کہ نہ کرسی آسمان | نہی زیر پای قزل ارسلان
مگو رو پای بر افلاک نہ | بگو روی اخلاص بر خاک نہ

سعدی کی ایک بہت بڑی خصوصیت، جو انھیں دوسرے قصیدہ گو شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ بیان کی سادگی اور صفائی ہے۔ سعدیؔ سے پہلے قصیدے کا کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ الفاظ پرشکوہ ہوں اور تعریف و توصیف میں زیادہ مبالغہ اور اغراق سے کام لیا جائے۔ لیکن سعدی وہ پہلے شاعر ہیں، جنھوں نے قصیدہ گوئی میں بھی نئی راہ نکالی ہے۔ ان کی توجہ الفاظ و تراکیب پر نہیں، بلکہ معانی و بیان کی طرف ہے۔ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ واضح طور پر سیدھے سادھے الفاظ میں کہہ دیتے ہیں۔ لیکن لطف یہ ہے کہ ان کی سادگیِ بیان بہت دل کش اور موثر ہوتی ہے۔

مرثیہ گوئی۔ سعدیؔ نے عام شعرا کی طرح مرثیے بھی کہے ہیں، لیکن مرثیہ گوئی میں بھی آپ نے ایک نئی بات پیدا کی ہے۔ آپ وہ پہلے شاعر ہیں۔ جنھوں نے فرد کا مرثیہ لکھتے ہوئے پوری قوم کی نوحہ خوانی کی ہے۔ خلفائے عباسیہ کی حکومت اگرچہ

اب برائے نام رہ گئی تھی، لیکن یہ پانچ سو سال کی ایک عظیم اسلامی یادگار تھی، جس کے ڈنکے ایشیا اور یورپ میں بجتے تھے۔ بغداد اس کا دارالسلطنت تھا، جو اسلامی علوم و فنون کا مرکز رہ چکا تھا۔ اس لیے ہلاکو کے ہاتھوں اس جلیل القدر حکومت کا مٹنا ایک بہت بڑا قومی حادثہ تھا۔ شیخ نے اس حکومت کے آخری تاجدار خلیفہ مستعصم باللہ کا مرثیہ لکھا، گویا پوری قوم اور ملک کا مرثیہ لکھا۔ جس کے حرف حرف سے قومی خون کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس مرثیہ کے چند شعر درج ذیل ہیں ؎

آسمان را حق بود گر خون ببارد بر زمین
بر زوال ملک مستعصم امیر المومنین
ای محمد! گر قیامت سر برون آری ز خاک
سر برون آر و قیامت در میان خلق بین
نازنینان حرم را موج خون بیدریغ
ز آستان بگذشت و ما را خون دل از آستین
دیده بر دار، که دیدی شوکت بیت الحرام
قیصران روم سر بر خاک و خاقان بر زمین
خون فرزندان عم مصطفیٰ شد ریخته
هم بر آن جای که سلطانان نهادندی جبین
باش تا فردا ببینی روز داد و رستخیز
کز لحد با زخم خون آلوده برخیزد دفین

سعدیؒ کے ہم عصر حکمران اور ممدوحین

سعدی علیہ الرحمۃ تحصیل علوم سے فارغ ہوئے، تو فارس میں سلغریان فارس کے پانچویں حکمران اتابک مظفر الدین[1] سعد بن زنگی کی حکومت

---

[1] مظفر الدین اتابکان فارس کا لقب تھا۔ ذکر ممدوحین شیخ از آقای محمد قزوینی (سعدی نامہ) ص ۷۱۶

تھی۔ سعد اس کے پوتے کا بھی نام تھا، جس کے دربار سے سعدی وابستہ تھے۔ اس لیے حبیب السیر، آتشکدہ اور مجمع الفصحا کے مولفین کو یہ گمان گزرا ہے کہ سعد بن زنگی آپ کا ممدوح تھا۔ اور اس نام کی مناسبت سے آپ نے سعدی تخلص کیا۔ لیکن یہ درست معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ پوری کلیات میں سعد بن زنگی کا کوئی قصیدہ نہیں، نہ آپ نے اس حکمران کی وفات پر کوئی مرثیہ ہی لکھا۔ حمداللہ مستوفی "تاریخ گزیدہ" میں لکھتے ہیں کہ سعدی کا ممدوح سعد بن زنگی نہیں، بلکہ اس کا بیٹا ابوبکر بن سعد بن زنگی اور پوتا سعد بن ابوبکر بن سعد زنگی آپ کے ممدوح تھے۔

۲۔ ابوبکر بن سعد زنگی۔ اتابک سعد بن زنگی ۶۲۳ھ مطابق ۱۲۲۶ء میں فوت ہوا، تو فارس کی حکومت اس کے بیٹے مظفر الدین ابوبکر کو ملی۔ سعدی طویل عرصہ کے بعد وطن واپس آئے، تو ابوبکر بن سعد ہی کی حکومت تھی یہاں آپ نے اپنے علم و فضل کی بدولت بہت جلد اتابکی حکمرانوں کے دلوں میں جگہ پیدا کرلی۔ ابوبکر آپ کا بہت احترام کرتا تھا۔ آپ بھی اُسے بہت عزیز سمجھتے تھے، چنانچہ اپنی جلیل القدر تصنیف "بوستان" اسی حکمران کے نام منسوب کی۔ آپ کو شہرت بھی اسی حکمران کے عہد میں حاصل ہوئی۔ جیسا کہ ذیل کے شعر سے پتا چلتا ہے۔

که سعدی که گوی بلاغت ربود در ایام بوبکر بن سعد بود

ابوبکر بن سعد کے زمانے میں فارس میں کامل امن و امان ہو چکا تھا۔ ملک خوشحال اور رعایا فارغ البال تھی۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں ؎

وجودم بتنگ آمد از جور تنگی شدم در سفر روزگار درنگی
جهان زیر ران چون سکندر بریدم چو یاجوج بگذشتم از سد سنگی
چو باز آمدم کشور آسوده دیدم ز گرگان بدر رفته آن تیز چنگی
بنام ایزد آباد پر ناز و نعمت پلنگان رها کرده خوی پلنگی

خط ماہرویان چو مشک خطائی | سر زلف خوبان چو درع فرنگی
درون مردمی چون ملک نیک سیرت | برون لشکری چون شہر بران جنگی
بپرسیدم این کشور آسوده کی شد | کسی گفت سعدی چہ شوریدہ زنگی
چنان بود در عہد اول کہ دیدی | جہان پر آشوب و تشویش و تنگی
چنیں شد در ایام سلطانِ عادل | اتابک ابوبکر بن سعد زنگی

(۳) اتابک مظفر الدین سعد بن ابوبکر بن سعد۔ سعد بن ابوبکر بھی اپنے والد کی طرح سعدیؒ کا بڑا احترام کرتا تھا۔ اسی شہزادے کے ساتھ آپ کو قلبی تعلق تھا، چنانچہ اسی کے نام کی مناسبت سے آپ نے سعدی تخلص کیا، اور اپنی شہرہ آفاق کتاب گلستان اسی شہزادے کے نام منسوب کی، جیسا کہ گلستان میں ذکر آیا ہے۔

علی الخصوص کہ دیباچۂ ہمایونش
بنام سعد ابوبکر سعد بن زنگی ست

ابوبکر کی وفات پر آپ نے ایک مرثیہ لکھا، جس کے آخر میں سعد کی تعریف کی ہے۔

نمرد نام ابوبکر سعد بن زنگی | کہ ماند سعدِ ابوبکر نام بردارش
خدایگان ملوک زمان مظفر دین | کہ قائم است با علای دین و اظہارش
بزرگوار خدایا بفرد دولت و کام | دوام عمر بدہ سالہای بسیارش

شیخ سعدی شہزادہ سعد کی دوام عمر کی دعا کر رہے تھے کہ باپ کی وفات کے صرف بارہ دن بعد ہی یہ شہزادہ بھی داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔ اور باپ کے بعد بیٹے کا مرثیہ بھی آپ کو لکھنا پڑا، جس کے چند شعر حسب ذیل ہیں ؎

چو ماہ دولت بوبکر سعد آفل شد | طلوع اختر سعدش ہنوز جان می داد
امید امن و سلامت بگوش دل می گفت | بقای سعد ابوبکر سعد زنگی باد
ہنوز داغ نخستین درست ناشدہ بود | کہ دست جور زمان داغ دیگرش بنہاد

اسی موضوع پر آپ نے ایک ترجیع بند بھی لکھا جس کے دو شعر حسب ذیل ہیں ؎

غریبان را دل از بہر تو خون است | دل خویشان نمی دانم کہ چون است
نمی دانم حدیث نامہ چون است | ہمی بینم کہ عنوانش بخون است

(۴) ترکان خاتون ۔ سعد کی ملکہ ترکان خاتون بھی آپ کی ممدوحہ تھی جس کی شان میں آپ نے متعدد قصیدے کہے ۔ ایک قصیدے کے چند شعر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں

چہ دعا گو یمت ای سایہ میمون ہمای | یارب این سایہ بسی بر سر اسلام بپای
جود پیدا و وجود از نظر خلق نہان | نام در عالم و خود در کنف ستر خدای
در سراپردہ عصمت بعبادت مشغول | پادشاہان متوقف بدر پردہ سرای
آفتاب این ہمہ شمع از عقب و مشعلہ پیش | دست بر سینہ زنندش کہ بپروانہ در آی
مطلع برج سعادت فلک اختر سعد | بحر دردانہ شاہی صدف گوہر زای
حرم عصمت و عفت بتو آراستہ باد | علم دین محمد بمحمد برپای
خلف دودہ سلغر شرف دولت و ملک | ملک آیت رحمت ملک ملک آرای
ملک ویران نشود خانہ عدل آباد آن | سعد و بوبکر بمرد ند محمد برجای
قدم بندہ بجد ہمت نتوانست رسید | قلم شوق و ارادت بسر آمد برپای
نیک خواہان ترا تاج کرامت بر سر | بد سگالان ترا بند عقوبت برپای

(۵) ابش خاتون ۔ شیخ سعدی نے سعد بن ابو بکر کی دختر ابش خاتون کے بھی قصیدے کہے ، ان میں سے ایک قصیدے کے چند شعر حسب ذیل ہیں ۔

فلک را این ہمہ تمکین نباشد | فروغ مہر و مہ چندین نباشد
صبا گر بگذرد بر خاک پایت | عجب گر دامنش مشکین نباشد
زمرد وار ید تاج خسروانیت | یکی در خوشہ پروین نباشد
بقای ملک باد این خاندان را | کہ تا باشد خلل در دین نباشد

هر آنکو سر بگرداند ز حکمت — از آن بیچارہ تر مسکین نباشد
چنیں خسرو کجا باشد در آفاق — وگر باشد چنیں شیرین نباشد
خدایا دشمنش جای بمیراد — کہ پیشش دوست در بالین نباشد

سعدیؒ اور اہلِ یورپ خیام اور مولانائے روم کی طرح سعدی کی طرف بھی اہلِ یورپ نے بہت اعتنا کیا۔ بوستان کا ترجمہ کرنے والے چند مصنفین کے نام حسب ذیل ہیں ؂

بوستان مع ترجمہ، کے۔ ایچ گراف (وینا)

بوستان کا متن مع نوٹس، مرتبہ اے۔ راجرس (لندن)

بوستان مترجمہ شلیکا دیسٹرو، بزبان جرمن (وینا)

بوستان مترجمہ باربیرڈی منیارڈ، بزبان فرانسیسی

بوستان مترجمہ رُوکرٹ، بزبان جرمن (وینا)

بوستان مترجمہ ایچ دلبر فورس، بزبان انگریزی (لندن)

بوستان مترجمہ جی۔ ایس۔ ڈیوی (لندن)

منتخبات مترجمہ رابنسن (لندن)

گلستان کے تراجم کا ذکر بابِ نثر میں آئے گا۔

فخر الدین عراقی وفات ۶۸۸ ھج مطابق ۱۲۸۹ ع فخر الدین نام اور وطن عراق تھا، اسی نسبت سے عراقی تخلص کیا۔ والد کا نام ابراہیم ہے۔ "سیر العارفین" کے مصنف لکھتے ہیں کہ آپ شہاب الدین عمر سہروردی کے خواہرزادے تھے۔ مؤلف "مراۃ الاسرار" رقم طراز ہیں کہ "شیخ فخر الدین عراقی از بزرگان این طائفہ واز بی باکان روزگار بود ومشرب عشق بر حال وی خیلی غلبہ داشت وکمالات وی در تصانیفش ظاہر است خصوصاً در لمعات۔"

مولانا جامیؒ نے "نفحات الانس" میں عراقی کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے عالمِ طفلی ہمدان میں گزارا۔ بچپن ہی میں کلام مجید حفظ کیا۔ پھر ہمدان کے مدرسے میں داخل ہو گئے۔ طبیعت لاابالی تھی؛ بچپن سے حسن و جمال کے دلدادہ تھے۔ سترہ برس کے تھے کہ قلندروں کی ایک جماعت ہمدان میں وارد ہوئی، اُن کے ساتھ ایک صاحب جمال لڑکا تھا۔ اُسے دیکھ کر دل دے بیٹھے۔ قلندروں کا قیام جب تک ہمدان میں رہا۔ آپ بھی ساتھ ساتھ رہے لیکن جونہی قافلہ محبوب نے کسی اور جگہ کا رُخ کیا۔ آپ بھی چار ابرو کا صفایا کر کے ساتھ ہو لیے۔ یہ قافلہ ایران سے چل کر ہندوستان آیا اور ملتان میں مقیم ہو گیا۔ عراقی نے یہاں بہاء الدین زکریا کا ذکر سنا، تو خدمت میں حاضر ہوئے اور حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ چنانچہ اپنی ارادت کا ذیل کے شعر میں ذکر کیا ہے۔

پرسی اگر از جہان کیست امام الانام	نشنوی از آسمان جز زکریا جواب

حضرت بہاء الدین کی کشش اتنی زیادہ تھی کہ وہ محبت مجاز پر غالب آ گئی۔ حضرت شیخ نے آپ کو جہاں گرد قلندروں کی صحبت سے نکال کر خلوت میں لا بٹھایا۔ یہاں آپ نے چلہ کشی اختیار کی، ابھی دس ہی دن گزرے تھے کہ وجد کی کیفیت طاری ہوئی، اور اسی حال میں یہ غزل کہی۔

نخستین بادہ کاندر جام کردند	زچشم مست ساقی وام کردند
چو باخود یافتند اہلِ طرب را	شراب بیخودی در جام کردند
لب میگونِ جانان جام در داد	شراب عاشقانش نام کردند
بمجلس نیک و بدر اجای دادند	بجامی کار خاص و عام کردند
سر زلف بتان آرام نگرفت	زبس دلہا کہ بس آرام کردند
چو گوی حسن در میدان فگندند	بیک جولان دو عالم رام کردند
ز بہر نقل مستان از لب و چشم	مہیا شکر و بادام کردند
از آن لب کآرزوی جملہ دلہاست	نصیب بی دلان دشنام کردند

دلی را تا بدست آرند ہردم | سر زلفین خود را دام کردند
بغمزہ صد سخن گفتند باجان | بدل زابرو دو صد پیغام کردند
نہان با محرمی رازی بگفتند | جہانی را ازآن اعلام کردند
بعالم ہر کجا درد و غمی بود | بہم کردند و عشقش نام کردند
چو خود کردند راز خویشتن فاش | عراقی را چرا بدنام کردند

یہ غزل آپ خوش الحانی کے ساتھ زور زور سے پڑھتے اور روتے تھے۔ غزل کا چرچا شہر بھر میں تیزی سے ہوا کہ خرابات نشیں بھی اسے چنگ و بربط سے گاتے سنے گئے۔ شیخ کے ارادت مندوں نے عراقی کی شکایت کی۔ اور چلہ کشی کے ایام میں غزل سرائی کا ذکر کیا۔ شیخ عراقی کے حجرے میں گئے اور فرمایا، وہ غزل ہمیں بھی سناؤ جس کا شہر بھر میں اتنا چرچا ہو رہا ہے۔ انھوں نے غزل سنائی، جب اس مقطع پر پہنچے۔

"چو خود کردند راز خویشتن فاش | عراقی را چرا بدنام کردند"

حضرت زکریا فرمانے لگے: "کار او تمام شد" عراقی کو گلے لگا کر وہیں انھیں خرقہ پہنا دیا۔ پھر رابطہ اس قدر بڑھا کہ اپنی صاحبزادی سے عراقی کا نکاح بھی کر دیا۔ جن سے کبیر الدین پیدا ہوئے۔

صاحب "مراۃ الاسرار" لکھتے ہیں: "عراقی بست و پنج سال در خدمتِ شیخ بود۔ چون شیخ را وفات نزدیک رسید، وی را بخواند و خلیفۂ خود ساخت۔"

حضرت شیخ کا التفات آپ کی طرف بہت تھا۔ اس سے اکثر مریدوں کو حسد ہوا، اور آپ پر طرح طرح کے اعتراض کیے۔ شیخ کی وفات کے بعد عراقی حج کو چلے گئے، اور وہاں سے ایشیائے کوچک کا رخ کیا۔ ایشیائے کوچک کے دارالسلطنت پہنچ کر آپ کی ملاقات ایک مشہور بزرگ مولانا صدر الدین سے ہوئی۔ مولانا ان دنوں اپنے طلبہ کو محی الدین ابنِ عربی کی مشہور کتاب "فصوص الحکم" کا درس دیتے تھے۔ عراقی بھی اس درس میں شریک ہوتے رہے اسی زمانے میں آپ نے اپنی مشہور کتاب "لمعات" تصنیف

کی۔ قونیہ کے امراء میں ایک شخص معین الدین پروانہ عراقی کا بہت معتقد تھا۔ کہا جاتا ہے، اس نے عراقی کے لیے ایک خانقاہ بنوائی، جہاں وہ بیشتر وقت مجاہدہ میں گزارتے تھے۔ پروانہ فوت ہوا۔ تو عراقی قونیہ کو خیرباد کہہ کر مصر آ گئے۔ اہلِ مصر نے بھی بڑی عقیدت سے آپ کا خیر مقدم کیا۔ مصر میں چھ ماہ کا عرصہ گزار کر آپ شام آ گئے۔ جہاں آپ کا فرزند کبیر الدین ملتان سے چل کر آپ سے آملا۔ عراقی نے یہیں ۶۸۸ھ مطابق ۱۲۸۹ء میں انتقال کیا۔ اور شام کے عظیم صوفی شیخ محی الدین ابن عربی کے پہلو میں دمشق میں دفن ہوئے۔

اسلوب بیان

عراقی کے کلام میں سبک خراسانی کی طرح سادگی اور روانی ہے، لیکن جذبات کے اظہار اور محبوب کے ذکر و فکر کا جہاں تک تعلق ہے آپ سبک عراقی کے پیرو ہیں۔ آپ پر عشقِ مجازی کا اس قدر غلبہ تھا کہ جہاں جہاں گئے عشق و محبت کی داستان یادگار چھوڑ گئے۔ غزلیات آپ کی داخلیت کا اظہار ہیں۔ ان میں آپ نے اپنے وارداتِ قلب کا اظہار نہایت والہانہ انداز میں کیا ہے۔ یہی عشق مجازی آپ کے لیے عشقِ حقیقی کا بھی وسیلہ بنا لیکن مجاز اس قدر حاوی رہ چکا تھا کہ آپ کے عشقِ حقیقی پر بھی عشقِ مجازی ہی کا گمان گزرتا ہے۔ یہ خصوصیت آپ کے تمام کلام میں جاری و ساری ہے۔ مثال کے طور پر آپ کی دو غزلیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔

از پردہ برون آمد ساقی قدحی در دست / ہم پردۂ ما بدرید ہم توبۂ ما بشکست
بنمود رخِ زیبا گشتیم ہمہ شیدا / چون ہیچ نماند از ما آمد بر ما بنشست
زلفش گرہی بکشاد بند از دلِ ما برخاست / جان دل بجہان برداشت و اندر سرِ زلفش بست
در دام سرِ زلفش ماندیم ہمہ حیران / وز جام میِ لعلش گشتیم ہمہ سرمست
از دست بشد چون دل در طرۂ او زد چنگ / غرقہ زند از حیرت در ہر چہ بیابد دست
چون سلسلۂ زلفش بندِ دلِ حیران شد / آزاد شد از عالم وز ہستیِ خود وارست

عاشقی دانی چہ باشد بی دل و جان زیستن | با ان عدل و رباختن بربوی جانان زیستن
سوختن از عشق و خوش بودن بامید وصال | ساختن با درد و بس بربوی درمان زیستن
از خودم دور افگنی و آنگاہ گوی خوش بری | بی دلان را ننگ باشد بی تو ای جان زیستن
بر سر کوی تو خوش ما را بہ بوئ وصل تو | در جہان خاک و خون افتان و خیزان زیستن
ای ز جان خوشتر بیا تا بر تو افشانم روان | نزد تو مردن بہ از تو دور و حیران زیستن
ہان عراقی جان بجانان دہ گرانجانی مکن | بیش ازین بی روی خوب یار نتوان زیستن

محمود شبستری وفات ۷۲۰ھ مطابق ۱۳۲۰ء

آپ کا نام شیخ محمود بن عبدالکریم اور لقب سعدالدین ہے۔ آذربائیجان کے علاقے کے ایک شہر شبستر کے رہنے والے تھے، جو تبریز کے قریب واقع ہے۔ قدیم تذکرہ نویسوں نے آپ کی زندگی کے حالات بہت کم لکھے ہیں۔ اس قدر پتا چلتا ہے کہ آپ منگول حکمران الجائتو خدابندہ کے زمانے کے ایک مشہور عالم تھے۔ آپ کا شغل درس و تدریس تھا۔ لوگ دور دور سے علمی فیض حاصل کرنے کے لیے آپ کے پاس آتے تھے۔ بعض لوگ خط و کتابت کے ذریعے آپ سے مسائل دریافت کرتے تھے۔

تصنیفات

محمود شبستری فطرتاً شاعر تو نہ تھے لیکن اپنی فطری صلاحیتوں کی بدولت نظم میں ایک زندہ جاوید یادگار چھوڑ گئے ہیں، جو "گلشن راز" کے نام سے موسوم ہے۔

گلشن راز۔ یہ ایک مثنوی ہے جو ایک ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں تصوف کے بعض دقیق مسائل بڑی وضاحت سے بیان کیے گئے ہیں۔ ایک بزرگ امیر سید حسین ہروی نے پندرہ منظوم سوال لکھ کر آپ کی خدمت میں بھیجے۔ آپ نے ان سوالات پر بڑی شرح و بسط سے روشنی ڈالی ہے۔ آپ کے جوابات نظم میں ہیں اور ان کا مجموعہ گلشن راز کے نام سے موسوم ہے۔

سید حسین ہروی کے سوالات حسبِ ذیل ہیں :-

(۱) تفکر کیا چیز ہے ؟

(۲) ہمارے لیے کون سی فکر دلیلِ راہ ہے ۔ یہ فکر کیوں کبھی عبادت بن جاتی ہے اور کبھی گناہ ؟

(۳) " انا " کیا ہے اور اپنی طرف سفر کرنے سے کیا مراد ہے ؟

(۴) مسافر کون ہے اور رہرو کون ؟ ان دونوں میں فرق کیا ہے ؟

(۵) سرِ وحدت سے آگاہ کون ہے ؟ اور عارف کس چیز کا شناسا ہے ؟

(۶) اگر معروف اور عارف وہی ذاتِ پاک ہے تو انسان کے سر میں کیا سودا سمایا ہوا ہے ؟

(۷) انا الحق " کس مقام کی آواز ہے ۔ کیا انا الحق کہنے والا صوفی تھا یا کوئی ہرزہ گو ؟

(۸) مخلوق کو واصل بحق کیوں کہتے ہیں ۔ اس کو سلوک و سیر کیسے حاصل ہوئی ؟

(۹) " ممکن " اور " واجب " کے وصال سے کیا مراد ہے ؟

(۱۰) وہ کون سا سمندر ہے ، جس کا ساحل نطق ہے ۔ اس کی تہ سے کون کون سے موتی حاصل ہوتے ہیں ؟

(۱۱) وہ کون سا جزو ہے ، جو کُل سے بڑا ہے ۔ اس جزو کے معلوم کرنے کا کیا طریقہ ہے ؟

(۱۲) " قدیم " اور " حادث " کس طرح آپس سے جدا ہوئے کہ ایک خدا ہو گیا اور دوسرا عالم ؟

(۱۳) عارف کے نزدیک چشم و لب سے کیا مراد ہے ؟

(۱۴) شراب ، شمع اور شاہد کا کیا مطلب ہے اور اہلِ خرابات ہونے سے کیا مراد ہے ؟

(۱۵) اہلِ حال کے کوچے میں بت ، زنار ، ترسائی سب کفر ہے ۔ ورنہ بتائیے کہ سب کیا ہیں ؟

ان دریافت طلب مسائل پر آپ نے بڑی وضاحت سے بحث کی ہے ۔ ان میں سے بعض کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے ۔

سوال اوّل

نخست از فکر خویشتم در تحیر — چه چیز است آنکه گویندش تفکر

جواب

مرا گفتی بگو چه بود تفکر — کزین معنی بماندم در تحیر

تفکر رفتن از باطل سوی حق — بجزو اندر بدیدن کل مطلق

بود فکر نکو را شرط تجرید — پس آنگه لمحه‌ای از نور تائید

هر آنکس را که ایزد راه ننمود — ز استعمال منطق ہیچ نگشود

حکیم فلسفی چون است حیران — نمی‌بیند ز اشیا غیر امکان

ز امکان می‌کند اثبات واجب — ازین حیران شد اندر ذات واجب

چو عقلش کرد در ہستی توغل — فرو پیچید پایش در تسلسل

ظہور جملۂ اشیاء بضد است — ولی حق را نہ مانند و نہ ضد است

چو نبود ذات حق را ضد و ہمتا — ندانم تا چگونہ داند او را

زہی نادان کہ او خورشید تابان — بنور شمع جوید در بیابان

کسی کو عقل دوراندیش دارد — بسی سرگشتگی در پیش دارد

خرد را نیست تاب نور آن روی — برو از بہر او چشم دگر جوی

کلامی کو ندارد ذوق توحید — بتاریکی درست از غیم[1] تقلید

رمد دارد دو چشم اہل ظاہر — کہ از ظاہر نبیند جز مظاہر

ازو ہر چہ بگفتند از کم و بیش — نشانی دادہ اند از دیدۂ خویش

منزہ ذاتش از چند و چہ و چون

تعالیٰ شانہ عما یقولون

۱؎ بادل

"تم نے مجھ سے پوچھا ہے کہ "تفکر" کیا چیز ہے۔ میں خود اس سلسلے میں حیران ہوں۔ باطل کی طرف سے اگر حق کی طرف جاؤ، اور جزو میں کل کو دیکھو، تو اُسے تفکر کہتے ہیں۔ حکیموں اور فلسفیوں نے جو کتابیں تصنیف کی ہیں، اس میں تفکر کی تعریف یُوں کی ہے۔ کہ جب دل میں کسی چیز کا تصور آتا ہے تو اسے "تذکیر" کہتے ہیں۔ جو تصور کوئی ترتیب یا نتیجہ اخذ کرنے میں مدد دے، اُسے حکما تفکر کا نام دیتے ہیں۔

فکرِ نیک کے لیے دل کا مال و جاہ سے خالی ہونا شرط ہے۔ اور یہ بھی شرط ہے کہ تائیدِ الٰہی بھی حاصل ہو، جب کہیں نورِ عرفان حاصل ہوتا ہے، ورنہ یہ فکر باطل ہوگا۔ حکیم اور فلسفی اس لیے ششدر ہیں کہ وہ اشیاء میں امکان کے سوا اور کچھ نہیں دیکھتے۔ چونکہ وہ وجودِ ممکن سے وجودِ واجب کو ثابت کرتے ہیں۔ فلسفی جتنا عقل سے کام لیتا ہے، اسی قدر معرفتِ الٰہی سے دور رہ کر اسباب و علل کے تسلسل میں جکڑا جاتا ہے۔ اشیا اپنی ضدوں سے پہچانی جاتی ہیں۔ خدا کی تو کوئی ضد اور نظیر نہیں، وہ اس ذاتِ واحد کو کیسے جان سکتا ہے۔

"واجب" ہستی مطلق کو کہتے ہیں اور "ممکن الوجود" وہ چیز ہے، جس کا اپنا کوئی وجود نہیں، بلکہ اس کا وجود ذاتِ باری کی وجہ سے قائم ہے۔ اس لیے واجب کو ممکن کے ذریعے ہم کیسے جان سکتے ہیں۔ عارف وہ ہے جو اپنی ذات کو وحدت کے نور میں فنا کر کے بقائے حق کی وجہ سے باقی رہتا ہے! اور حق کو دیدۂ حق سے دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ وہ شخص نادان ہے۔ جو بیابان میں شمع کی روشنی سے آفتاب کو دیکھتا ہے۔ جو آدمی محض عقل دور اندیشی پر بھروسہ کرتا ہے۔ وہ حقیقتِ حال سے بے خبر رہتا ہے۔ اور آخر اُسے حیرانی ہوتی ہے۔ عقل اس تابناک چہرے کی تاب نہیں لا سکتی، اس لیے مشاہدے کے لیے کوئی خاص آنکھ تلاش کرنی چاہیے۔

یہی حال متکلمین کا ہے۔ ان کو توحید کا کوئی ذوق نہیں ہوتا۔ یہ لوگ کشف کے ذریعے وحدتِ حقیقی کے نور کو نہیں دیکھتے، بلکہ استدلال کے ذریعے معرفتِ الٰہی حاصل کرنا چاہتے

ہیں۔ اس لیے وہ شک و گمان میں گرفتار رہتے ہیں۔

اہل ظاہر بصیرت سے محروم ہیں اس لیے اُن کی نظر محض ظاہر پر ہے، جن کو وہ حقیقی وجود سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ حقیقی وجود تو ذات باری کا ہے، مظاہر کا کوئی حقیقی وجود نہیں۔

اس کی ذات چون و چرا سے پاک ہے اور اس کی شان قیل و قال سے برتر ہے۔

سوال دوم

دگر کردی سوال از من کہ من چیست   مرا "از من" خبر کن تا کہ "من" چیست

جواب

چو ہست مطلق آمد در اشارت   بلفظ من کنند از وی عبارت

حقیقت کز تعین شد معین   تو او را در عبارت گفتہ ای من

من و تو عارض ذات وجودیم   مشبکہای[1] مشکات[2] وجودیم

ہمہ یک نور دان اشباح و ارواح   گہ از آئینہ پیدا گہ ز مصباح

تو گوئی لفظ "من" در ہر عبارت   بسوی روح می باشد اشارت

چو کردی پیشوای خود خرد را   نمی دانی ز جزو خویش خود را

برو ای خواجہ خود را نیک بشناس   کہ نبود فربہی مانند آماس

من و تو برتر از جان و تن آمد   کہ این ہر دو ز اجزای من آمد

بلفظ من نہ انسانست مخصوص   کہ تا گوئی بدو جانست مخصوص

یکی رہ برتر از کون و مکان شو   جہان بگذار و خود در خود جہان شو

بود ہستی بہشت امکان دوزخ   من و تو در میان مانند برزخ

چو برخیزد ترا این پردہ از پیش   نماند نیز حکم مذہب و کیش

---

[1] جالی [2] وہ طاق جس پر چراغ یا قندیل رکھتے ہیں۔

همہ حکم شریعت از من و تست	کہ آن بربستۂ جان و تن تست
من و تو چون نماند در میانہ	چہ کعبہ چہ کنش چہ دیر خانہ
دو خطوۂ بیش نبود راہ سالک	اگرچہ دارد این چندین مہالک
درین مشہد یکی شد جمع افراد	چو واحد ساری اندر عین اعداد
تو آن جمعی کہ عین وحدت آمد	تو آن واحد کہ عین کثرت آمد

کسی این سر شناسد کو گزر کرد

ز جزوی سوی کلی یک سفر کرد

اللہ تعالیٰ کی نہ کسی سے نسبت دی جا سکتی ہے، نہ اس کی کوئی نظیر ہے۔ وہ مجرد ہے۔ اس لیے اُس کی طرف اشارہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جب اسے کسی سے نسبت دے کر اس کی طرف اشارہ کریں گے، تو اسے "من" کہیں گے۔ "میں" اور "تو" وجود مطلق کے مظاہر ہیں۔ اور وجود مطلق کو اگر ایک طاق فرض کر لیا جائے، تو ہم اس طاق کی جالی ہیں جس پر چراغ رکھا جاتا ہے۔ جسم اور روح ایک ہی نور ہے۔ کبھی یہ آئینے کے عکس کی صورت میں پڑتا ہے کبھی چراغ کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ حکما کا خیال ہے کہ لفظ "من" سے روح یعنی نفس ناطقہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ جو لوگ عقل کو اپنا رہنما بنا لیتے ہیں وہ دھوکا کھاتے ہیں، اور اپنے جزو یعنی روح کو اپنے سے علیحدہ خیال کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ روح اور جسم ایک ہی ذات ہیں اور حقیقت حق کے مظہر ہیں۔ پس "من" سے نہ جسم مراد ہے نہ روح، بلکہ اس سے وہی ہستی مطلق مراد ہے۔ جو شخص ظاہر بینی کی وجہ سے ظاہری وجود کو حقیقی وجود سمجھتا ہے، وہ گویا درم کو فربہی سمجھتا ہے۔۔۔ اشیاء کی حقیقت کو کشف سے پہچاننے کی کوشش کرو، نہ شعور و ادراک سے۔ "میں" اور "تو" جسم و جان سے بالا ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں چیزیں "من" کے اجزا ہیں۔ "من" سے صرف انسان ہی کی طرف اشارہ نہیں، بلکہ ہر جاندار اور بے جان کی طرف "من" کا اشارہ ہو سکتا ہے۔

کون و مکان یعنی تعینات کو چھوڑ، ذرا اُن سے اوپر ہو اور جسمانی اور روحانی تعینات کو فنا کر کے بقا باللہ کا مرتبہ حاصل کر اور پھر آپ ہی آپ میں ایک جہان بن کر دیکھ کہ سارا جہان خود تو ہی ہے۔

وحدت پر یہ "من و تو" کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ جب یہ سامنے سے اٹھ جائے گا۔ تو فنا فی اللہ کا مقام آجائے گا جہاں نہ مذہب کا حکم باقی رہے گا، نہ ملت کا۔ وہاں تجلی وحدت ہو گی، نہ کعبہ ہو گا، نہ کنشت۔ وہاں غیر حق کا کوئی نشان نہ رہے گا۔ یہ مقام شہود ہے، یہاں سالک کثرت میں وحدت کو دیکھتا ہے اور جمع اور افراد اس کی نگاہ میں ایک ہو جاتے ہیں، جیسے "ایک" کا عدد تمام اعداد میں جاری و ساری ہے۔ اے انسان تو جسمانی اور روحانی قوتوں کی وجہ سے جمع یا کثرت ہے۔ لیکن فنا فی اللہ کے مقام میں ترقی پا کر "وحدت" ہو جاتا ہے تو وحدت ہی ہے لیکن جب تو اپنی صفات کے مرتبوں میں تنزل حاصل کرتا ہے تو کثرت بن جاتا ہے۔ اور اشیاء کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے یہ ایک راز ہے جس کو صرف وہی جانتا ہے جس نے کثرت سے وحدت کی طرف قدم بڑھایا اور جزو سے کل کی طرف سفر کیا۔

سوال سوم

شناسائی چہ آمد عارف آخر   کہ شد بر سر وحدت واقف آخر

جواب

کسی بر سر وحدت گشت واقف   کہ او واقف نشد اندر مواقف

دل عارف شناسای وجود است   وجود مطلق او را در شہود است

بجز ہست حقیقی ہست نشناخت   دیا ہستی کہ ہستی پاک در باخت

وجود تو ہمہ خار است و خاشاک   برون انداز از خود جملہ را پاک

برو تو خانۂ دل را فرو روب   مہیا کن مقام و جای محبوب

چو تو بیرون شدی او اندر آید   بتو بی تو جمال خود نماید

موانع تا نگر دانی زخود دور
درون خانۂ دل نایدت نور

جو شخص راہ سلوک میں کثرت کی منزل کو عبور کر جائے گا، اور نورِ وحدت میں اپنی ہستی کو فنا کر کے عین وحدت ہوگا، وہ عارف حق اور سرِ وحدت سے واقف ہوگا۔ عارف ہر شے میں وجودِ مطلق کا جلوہ دیکھتا ہے۔ وہ سوائے حقیقی ہستی کے اور کسی کو ہستی نہیں جانتا۔ بلکہ ہستی کو بالکل فنا کر دیتا ہے۔ ظاہری وجود خس و خاشاک کی طرح ہے۔ اس کو باہر پھینک دینا ہے۔ جا تو بھی مقامِ دل کو خس و خاشاک سے پاک کرے، اور محبوب کے لیے جگہ بنا۔ جب تو باہر آجائے گا تو محبوب تمہارے اندر سما جائے گا اور تم کو تمھارے بغیر ہی اپنا جمال دکھائے گا۔ اعمالِ قبیحہ اور اخلاقِ ذمیمہ جو راہ حق کی رکاوٹیں ہیں، جب تک دور نہ ہو جائیں گی مقامِ دل نورِ حق سے روشن نہ ہوگا۔

غرض اسی طرح مولانا محمود شبستری نے صوفیانہ مطالب بڑی تفصیل سے گلشنِ راز میں بیان کر دیئے ہیں۔

سعادت نامہ۔ "گلشنِ راز" کے علاوہ ایک اور مثنوی "سعادت نامہ" بھی آپ کی یادگار ہے۔

شاہد نامہ۔ تذکروں سے پتا چلتا ہے کہ آپ نے نثر میں بھی ایک کتاب "شاہد نامہ" تالیف کی تھی۔

ھمام تبریزی (وفات ۱۴ء ۷ھ بمطابق ۱۳۱۴ء)

خواجہ ہمام الدین بن علائی، تبریز میں پیدا ہوا، اور عمر کا بیشتر حصہ تبریز ہی میں گزارا۔ اس کا شمار آذربائیجان کے مشہور شعراء میں ہوتا تھا، غزل سرائی میں ہمام شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کا پیرو ہے۔ چنانچہ ذیل کے شعر میں آپ ہی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہمام را سخن دلفریب و شیرین است — ولی چہ سود کہ بی چارہ نیست "شیرازی"

ہمام کا دیوان دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ شفق نے اس کے اشعار کی تعداد دو ہزار بتائی ہے، جو درست نہیں[1]

ہمام کی اکثر غزلیں شگفتہ اور رواں ہیں۔ بعض اشعار میں اس نے نئے نئے مضمون پیدا کیے ہیں۔ ایک غزل درج ذیل ہے۔

بلبلان را ہمہ شب خواب نیاید از بیم
کہ مبادا ببرد برگ گل باد نسیم
شب مہتاب و گل و بلبل سرمست بہم
مجلس آن نیست کہ در خواب رود چشم ندیم
باد را گر خبر از غیرت بلبل بودی
ہیچ وقتی نگذشتی بگلستان از بیم
اثر عشق نگر در ہمہ چیزی ورنہ
مرغ را نغمۂ داود کہ کردی تعلیم
عشق می ورزم و گو خصم ملامت می کن
نہ من آوردہ ام این شیوہ کہ رسمیت قدیم

اوحد الدین کرمانی

اوحد الدین کرمانی اپنے زمانے کا ایک مشہور صوفی تھا۔ مؤلف مجمع الفصحا[2] لکھتا ہے، کہ اوحد الدین شیخ محی الدین ابن العربی کا مرید تھا۔ بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ وہ شمس تبریزی اور عراقی کی صحبت سے بھی مستفید ہوا۔

---

[1] سخن و سخنوران ص

[2] جلد دوم ص ۹۷-۹۸

اوحدالدین کرمانی عراقی کی طرح حسن و جمال کا بہت دلدادہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شمس تبریز نے اُس سے پوچھا یہ تم کیا کرتے ہو؟ تو اس نے جواب دیا۔ "میں پیالے میں چاند کو دیکھتا ہوں"! شمس کہہ اٹھا۔ کہ اگر چاند ہی کو دیکھنا ہے، تو اُسے آسمان کی بلندیوں میں کیوں نہیں دیکھتے ہو؟"

مولانائے روم[1] سے بھی کسی نے یہ ذکر کیا، تو آپ نے فرمایا ہو سکتا ہے کہ وہ جسمانی خواہشات کی وجہ سے حسن و جمال کا شیدائی ہو، لیکن اب وہ ان خواہشات پر غالب آگیا ہو"

اوحدالدین نے حسن پرستی کے جواز میں ذیل کے شعر کہے ہیں۔

زآن می نگرم بچشم است سر در صورت | زیرا کہ ز معنیت اثر در صورت
این عالم صورت است د ما در صُوریم | معنی نتوان دید مگر در صورت

تصنیف

اوحدالدین کی یادگار اس کی ایک مثنوی "مصباح الارواح" ہے۔ اس مثنوی کے چند شعر، جو اکثر تذکروں میں ملتے ہیں، حسب ذیل ہیں۔

تا جنبش دست ہست مادام | سایہ متحرک است ناکام
چوں سایہ ز دست یافت مایہ | پس نیست خود از اصل سایہ
چیزی کہ وجود او بخود نیست | ہستیش نہادن از خرد نیست
ہست است ولیک ہست مطلق | نزدیک حکیم نیست جز حق
ہستی کہ بحق قوام دارد | او نیست ولیک نام دارد
بر نقش خود است فتنہ نقاش | کس نیست درین میان تو خوش باش
خود گفت حقیقت و خود اشنید | وآن روی کہ خود نمود خود دید
پس باد یقین کہ نیست واللہ | موجود حقیقی سوی اللہ

---

[1] بحوالہ لٹریری ہسٹری آف پرشیا مولفہ پروفیسر براؤن جلد سوم ص ۱۴۰

اوحدی مراغئی (پیدائش ۶۷۰ھ مطابق ۱۲۷۱ء) (وفات ۷۳۸ھ مطابق ۱۳۳۷ء)

رکن الدین اوحدی مراغہ میں تقریباً ۶۷۰ ہجری مطابق ۱۲۷۱ء میں تولد ہوا، لیکن زندگی کا بیشتر حصہ اصفہان میں گزارا۔ اوحدی مسلک طریقت میں اوحدالدین کرمانی کا مرید تھا، چنانچہ اسی نسبت سے اوحدی تخلص کیا۔

اوحدی اصفہان سے آذربائیجان آگیا، جہاں آخری ایلخانی سلطان ابوسعید ۷۱۶ہجری مطابق ۱۳۱۶ء تا ۷۳۶ ہجری مطابق ۱۳۳۵ء کی حکومت تھی۔ یہاں اسے مشہور مورخ رشیدالدین فضل اللہ کے بیٹے خواجہ غیاث الدین کی مصاحبت حاصل ہوئی، جو ابوسعید کا وزیر تھا۔ اس کی مدح میں اوحدی نے قصیدے بھی کہے ہیں۔

تصنیفات

دیوان۔ اوحدی کا دیوان تقریباً پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں قصائد، غزلیات، قطعات، رباعیات اور ترجیع بند ہیں۔ اشعار میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔

ایک قصیدے کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔ ان میں حکیم سنائی، خواجہ عطار اور مولانائے روم کا سا رنگ ہے ؎

سر پیوند ما ندارد یار ۔۔۔ چون توان شد ز وصل برخوردار
همدمی نیست تا بگویم راز ۔۔۔ خلوتی نیست تا بگریم زار
در خرد شتم ز صیت آن معشوق ۔۔۔ در سماعم ز صوت آن مزمار
مطربم پرده ها همی سازد ۔۔۔ که در آن پرده نیست کس را بار
همه مستان در آمدند بهوش ۔۔۔ مست ما خود نمی شود هشیار
چیست این ناله و فغان در شهر ۔۔۔ چیست این شور و فتنه در بازار
تو گمانی که می رسد معشوق ۔۔۔ او نشانی که می رود دلدار

همه در جستجو و او غافل — همه در گفتگوی داد بیزار
جز یکی نیست صورت خواجه — کثرت از آئینه است و آئینه دار
آب و آئینه پیش گیر و ببین — که یکی چون دو می شود بشمار
سکهٔ شاه و نقش سکه یکیست — عدد از درهم است و از دینار
هم بدریاست باز گشت نمی — که ز دریا جدا شود به بخار
به نهایت رسان تو خط وجود — نقطهٔ اصل ز انتها بردار
تا بدانیکه نیست جز یک نور — وان دگر سایهٔ در و دیوار
همه عالم نشان صورت اوست — باز جوئید یا اولی الابصار

ان اشعار میں وحدتِ عالم کا ذکر ہے۔ سمندر کے قطرات بخارات بن بن کر اڑتے ہیں، گویا وجود فردِ کل سے جدا ہوتا ہے، لیکن بالآخر یہی قطرات سمندر میں جا ملتے ہیں۔ یہی حال مخلوق کا ہے، کہ ان سب کی اصل ایک ہے۔ یہ مخلوق عالمِ وجود میں آکر اپنی اصل سے الگ ہو جاتی ہے۔ بالآخر مادی وجود سے آزادی پاکر پھر اپنی اصل میں جا ملتی ہے۔

اوحدی نے دو مثنویاں بھی لکھی ہیں جو "دہ نامہ" یا منطق العشاق" اور "جام جم" غیاث الدین کے نام منسوب کی ہے۔ اس میں اوحدی نے بعض صوفیانہ اور اخلاقی مطالب بھی بیان کیے ہیں۔

ذیل کے اشعار میں حکمرانوں کو عدل و انصاف کی تلقین کی ہے۔

ای که بر ملک و مملکت شاهی — عدل کن گر ز ایزد آگاهی
عدل بی علم بیخ و بر نکند — حکم بی عدل و علم اثر نکند
شاه کو عدل و داد پیشه کند — پادشاهیش بیخ و ریشه کند
بر قوی پنجه دست کین مگشای — بر ضعیف و زبون کمین مگشای
رخت کسری ز خط شهر بدشت — با سواران ز هر طرف می گشت

گلشنی دید تازہ و خندان   تر و تازہ چو خط دلبندان

پر ز نارنج و نار باغی نوش   زیر سر برگ او چراغی نوش

گفت آب از کدام جو بیستش؟   کہ بدین گونہ رنگ و بو بیستش

باغبانش ز دور ناظر بود   داد پاسخ کہ نیک حاضر بود

گفت، عدل تو داد آب او را   زان نہ بیند کسی خراب او را

اوحدی نے متعدد قطعات میں بچوں کو محنت، سعی و کوشش، ہنرمندی اور خود داری کی تلقین کی ہے۔ ذیل کے اشعار میں "راستی" کی فضیلت بیان کی ہے:-

راستی کن کہ راستان رستند   در جہان راستان قوی دستند

کژ رو گر نہ ای ز چاہ مترس   راست باش و ز دزد و شاہ مترس

تا تو باشی ز راستی مگذر   مکش از خط رستگاران سر

راستی ورز و رستگاری بین   یار شو خلق را و یاری بین

ذیل کی غزل اوحدی کے افکار کا ایک عمدہ نمونہ ہے:-

بسکہ بعد از تو خزانی و بہاری باشد
شام و صبح آید و لیلی و نہاری باشد

دل نگہدار کہ بر شاہد دنیا ننہی
کین نہ یاریست کہ او را غم یاری باشد

تو گر امروز چو کژدم ہمہ را نیش زنی
مونس گور تو تنگ است کہ ماری باشد

یک دل سوختہ بنواز کہ کاریست عظیم
ورنہ آزار دل خلق چہ کاری باشد

خاکساران جہان را بحقارت منگر
تو چہ دانی کہ درین خاک سواری باشد

وفات | اوحدی نے ۷۳۸ ہجری مطابق ۱۳۳۷ عیسوی میں وفات پائی۔

سلمان ساوجی (پیدائش تقریباً ۷۰۰ ہجری مطابق ۱۳۰۰ عیسوی) وفات ۷۷۸ ہجری مطابق ۱۳۷۶ ")

جمال الدین محمد سلمان بن علاء الدین

اپنے زمانے کے سربرآوردہ شعراء میں سے تھا۔ اس کی پیدائش عراق عجم کے ایک قصبہ ساوہ میں ہوئی۔ اور اسی قصبے کی نسبت سے وہ سلمان ساوجی کے نام سے مشہور ہوا۔

سلمان کی تاریخ پیدائش کسی قدیم تذکرے میں نہیں ملتی۔ جدید ایرانی نقاد شفق[1] کا بیان ہے کہ سلمان کی پیدائش آٹھویں صدی ہجری کے اوائل میں ہوئی۔ پروفیسر براؤن[2] لکھتے ہیں کہ ایک ہندوستانی نقاد عبدالمقتدی نے اپنی مرتب کردہ فہرست "فردوسی تا حافظ" میں سلمان کی پیدائش تقریباً ۷۰۰ ہجری بتائی ہے اور سلمان کی مثنوی "فراق نامہ" کے ایک شعر کا حوالہ دیا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ مثنوی فراق نامہ پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ تو سلمان کی عمر اکسٹھ سال کی ہو چکی تھی۔ یہ مثنوی ۷۶۱ ہجری مطابق ۱۳۵۹ء کی تصنیف ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ سلمان کی پیدائش ۷۰۰ ہجری کے لگ بھگ ہوئی۔

سلمان ساوجی کی شہرت بحیثیت قصیدہ نگار کے تھی، چنانچہ اسی شہرت کی بدولت وہ مختلف درباروں سے وابستہ ہوا۔ شروع شروع میں اُس نے ایلخانی حکمران ابوسعید[3] بہادر کے وزیر خواجہ غیاث الدین کی قصیدہ خوانی کی۔ ابوسعید لاولد فوت ہوا، تو ملوک الطوائفی کا دور دورہ شروع ہوا۔ ملک میں سخت انتشار پھیلا۔ اسی افراتفری کے عالم میں سلمان کا ممدوح خواجہ غیاث الدین ہلاک ہو گیا۔ آخر حسین جلائر کے بیٹے حسن ایلخانی

---

[1] تاریخ ادبیات ایران صفحہ ۳۲۴ [2]

[3] دیکھیے تذکرہ دولت شاہ سمرقندی صفحہ ۱۷۱

نے جو ہلاکو کی نسل سے تھا، عراق میں اپنی حکومت قائم کر کے ایلخانی یا جلائری خاندان کی نبیاد رکھی، جس کی حکومت ۷۳۶ سے ۸۱۴ ھج بمطابق ۱۳۱۵ تا ۱۴۱۱ء قائم رہی۔

حسن ایک عالم شخص تھا اور علماء کی بہت قدر کرتا تھا، چنانچہ اس کی وجہ سے بغداد ایک مرتبہ پھر علماء و فضلا کا مرکز بن گیا۔ سلمان بھی حسن کی علم پروری کی شہرت سن کر بغداد آ گیا۔ دربار میں رسائی پانے کے متعلق، تذکرہ نویسوں نے ذیل کا واقعہ لکھا ہے۔ ایک دن حسن تیر اندازی کی مشق کر رہا تھا۔ تماشائیوں میں سلمان ساوجی بھی تھا۔ اس نے اس تقریب پر ذیل کے فی البدیہہ اشعار کہہ کر پیش کیے۔

چو در بار چاچی کمان رفت شاہ ۔۔۔ تو گفتی کہ در برج قوس است ماہ

دو زاغ کمان با عقاب سہ پر ۔۔۔ بدیدم بیک گوشہ آوردہ سر

نہادند سر بر سر گوش شاہ ۔۔۔ ندانم چہ گفتند در ہوش شاہ

چو از شست بکشاد خسرو گرہ ۔۔۔ بر آمد ز ہر گوشہ آواز زہ

شہا! تیر در بند تدبیر تست ۔۔۔ سعادت دوان در پی تیر تست

بہ عہدت ز کس نالہ ای بر نخاست ۔۔۔ بغیر از کمان کو بنالد رواست

کہ در عہد سلطان صاحبقران ۔۔۔ نکرد است کس زور جز بر کمان

حسن یہ اشعار سن کر بہت خوش ہوا اور اسے اپنے مقربین میں شامل کر لیا۔ یہاں حسن کی ملکہ دلشاد خاتون، حسن اور ان کے بیٹے شہزادہ اویس نے اس کی سرپرستی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ چنانچہ وہ اپنی شہرت کو اسی خاندان کی سرپرستی کا نتیجہ بتاتا ہے۔

من از یمن اقبال این خاندان ۔۔۔ گرفتم جہان را بہ تیغ زبان

من از خاوران تا در باختر ۔۔۔ ز خورشید ہم امروز مشہور تر

شہزادہ اویس اس کا بہت قدردان تھا۔ وہ خود بھی شعر کہتا تھا، اور سلمان سے اصلاح لیتا تھا۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا، کیونکہ اویس عالم شہزادگی میں

ناگہانی موت کا شکار ہو گیا۔

اویس کے متعلق دولت شاہ سمرقندی[1] لکھتا ہے کہ وہ بہت حسین و جمیل شہزادہ تھا جب سوار ہو کر نکلتا، تو لوگ اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے گلی کوچوں میں جمع ہو جاتے۔ اس کا حُسن و جمال، حسنِ یوسف کی یاد دلاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اویس نے اپنی وفات سے پہلے ذیل کے اشعار کہے تھے۔

زدار الملک جان روزی بشہرستان تن رفتم
غریبی بودم اینجا چند روزی تا وطن رفتم
غلام خواجۂ بودم گریزان گشتہ از خواجہ
در آخر پیش او شرمندہ با تیغ و کفن رفتم
الا ای ہم نشینانِ من محروم ازیں دنیا
شما را عیش خوش باد ادرین خانہ کہ من رفتم

سلمان نے شہزادہ اویس کی وفات پر نہایت پُرسوز مرثیہ کہا جس کے تین شعر حسب ذیل ہیں۔

ای فلک آہستہ روکاری نہ آسان کردہ ای
ملک ایران را بمرگ شاہ ویران کردہ ای
آسمانی را فرود آوردہ ای از اوج خویش
بر زمین افگندہ ای با خاک یکسان کردہ ای
نیست کاری مختصر گویا حقیقت می روی
قصد خون و مال و عرض ہر مسلمان کردہ ای

سلمان کے دو ہم عصر شعراء

یوں تو متعدد شعراء سلمان کے ہم عصر تھے۔ لیکن عبید زاکانی اور ناصر بخاری سے سلمان

---

[1] تذکرہ دولت شاہ صفحہ ۱۷۵۔

کی اتفاقی ملاقات دلچسپ ہونے کی وجہ سے تذکروں کی زینت بنی ہوئی ہے۔ مولانا علی بن حسین واعظ کاشفی "لطائف الطوائف" میں لکھتے ہیں۔ عبید زاکانی اپنے زمانے کا ایک بے پناہ ہزال اور بے حیا ہجو گو تھا۔ سلمان نے اس کے متعلق یہ قطعہ کہا ؎

جہنمی ہجا گوی عبید زاکانی — مقرراست بہ بی دولتی و بیدینی
اگرچہ غیست ز قزوین و روستا زادست — ولیک می شود اندر کلام قزوینی

عبید زاکانی نے یہ قطعہ سنا، تو سلمان سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے قزوین سے چل کر بغداد آیا۔ اتفاق سے دریائے دجلہ کے کنارے شعرا، امرا اور اہل ذوق کی محفل لگی ہوئی تھی۔ سلمان بھی وہاں موجود تھا۔ عبید زاکانی بھی آداب کہہ کر حلقے میں آ بیٹھا۔ سلمان نے دریافت کیا، تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟" اس نے جواب دیا۔ "میں ایک مسکین شخص ہوں اور قزوین کا رہنے والا ہوں۔" سلمان نے پوچھا، کیا تمھیں سلمان کا کوئی شعر یاد ہے؟" وہ کہنے لگا "ہاں" اور سلمان کے دو شعر پڑھے۔

من خراباتیم و بادہ پرست — در خرابات مغان عاشق و مست
می کشندم چو سبو دوش بدوش — می برندم چو قدح دست بدست

یہ شعر سنانے کے بعد عبید زاکانی نے کہا، سلمان تو ایک فصیح و بلیغ شاعر ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس نے یہ شعر کہے ہوں۔ مضمون کے لحاظ سے یہ گمان گزرتا ہے کہ یہ شعر اس کی بیوی نے حسب حال کہے ہوں گے ....."

ناصر بخاری کے متعلق مولانا لکھتے ہیں کہ وہ ایک درویش مشرب شاعر تھا۔ اس کا اکثر وقت سیر و سیاحت میں گزرتا تھا۔ ایک مرتبہ حج کو جاتے ہوئے بغداد سے گزر ہوا۔ دریائے دجلہ کے شعرا کی مجلس میں اسے بھی شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ سلمان نے پوچھا۔ "آپ کون ہیں؟" اس نے جواب دیا۔ "میں ایک شاعر ہوں۔" سلمان نے کہا۔ "کچھ فی البدیہہ کہو گے؟" اس نے کہا، ممکن ہے کچھ کہہ لوں۔" سلمان نے ذیل

کا مصرعہ کہا ؎

دجلہ را امسال رفتاری عجب مستانہ بود

ناصر نے فی البدیہہ کہا،

پائی در زنجیر و کف برلب مگر دیوانہ بود

سلمان کی شہرت کا سرمایہ وہ قصائد ہیں، جو اس نے آل جلائر اور آل مظفر کے حکمرانوں کی مدح میں لکھے، اس کے قصائد میں تاریخی اشارات بھی پائے جاتے ہیں کیونکہ اس نے کئی حکومتیں بدلتی ہوئی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ سلمان نے بعض قصائد حضرت علیؓ اور آئمہ کی منقبت میں بھی لکھے ہیں۔

قصائد میں قدما کی پیروی۔ سلمان نے قصائد میں متقدمین کی پیروی کی ہے مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ "انہوں نے کمال اسماعیل اور ظہیر سے زبان کی صفائی اور شستگی لی ہے۔ اور اس میں ایجاد مضامین کی رنگ آمیزی کی ہے۔ مضمون بندی، جو متوسطین اور متاخرین کا مابہ الامتیاز جوہر ہے، اگرچہ کمال نے شروع کی لیکن سلمان نے اسے کمال کو پہنچایا۔"

اسمٰعیل اور ظہیر فاریابی کے علاوہ سلمان کے پیش نظر منوچہری اور انوری بھی ہے۔ ذیل کے قصائد میں منوچہری کا رنگ نظر آتا ہے۔

سقی اللہ لیلا عصدع الکواعب

شبی عنبرین خال و مشکین ذوایب

تا باد خزان زنگرز رنگ رزان ست   گوئی کہ چمن کارگہ رنگ رزان است

ذیل کے قصیدے میں سلمان، انوری سے متاثر نظر آتا ہے ؎

ہر کرا بخت ہم عنان باشد در رکاب خدایگان باشد

خصوصیات

(۱) سلمان کی تشبیب عموماً بہت زوردار ہوتی ہے ذیل کے قصیدے کا موازنہ اگر متقدمین کے قصائد سے کیا جائے، تو معلوم ہو جائے گا کہ سلمان کے مضامین تازہ اور اس کی تشبیہات نئی ہوتی ہیں سہ

باد نوروز از کجا این بوئی جان می آورد
جان من پی تا بکوئی دلستان می آورد

یہ نوروز کی ہوا جان فزا خوشبو کہاں سے لا رہی ہے۔ یہ اسی کا اثر ہے کہ روح کوئے محبوب کی طرف کھنچی چلی جا رہی ہے۔

جنبشی در خاک پیدا می شود ز انفاس باد
باد گوئی از دم عیسیٰ نشان می آورد

ہوا کے جھونکے دم عیسیٰ کا معجزہ لے کر آئے ہیں۔ اس لیے خاک میں زندگی پیدا ہو رہی ہے۔

گل بزیر لب نمی دانم چہ می گوید کہ باز
بلبلان بی نوا را در فغان می آورد

معلوم نہیں پھول نے زیر لب کیا کہہ دیا ہے کہ بلبلیں آہ و زاری کر رہی ہیں۔

غنچہ را در دل بسی معنی نازک جمع بود
بلبل اکنون زان معانی در بیان می آورد

پھول صبوحی پی کر مست و مدہوش ہیں، اس لیے باغبان طلوع آفتاب سے پہلے انھیں باغ سے کندھے پر ڈال کر لا رہا ہے۔

کوہ خارا پوش کز یاقوت می بندد کمر
باز سر در حلقہ ای از پرنیان می آورد

پہاڑ کی وادی یاقوت کے پھولوں سے اس طرح بھری ہوئی ہے۔ گویا اس نے حریر کی پھول دار چادر پھیلا دی ہے۔

در جہان ہر جا کہ آزادیست چون سرو سہی
منزل اکنون برلب آب روان می آورد

دنیا میں جہاں کہیں کوئی سرو کی مانند آزاد شخص ہے، اس نے بہتے پانی کے کنارے ڈیرے ڈال دیے ہیں۔

وہ چہ خوش می آیدم در وقت رقصیدن کہ سرو
دست ہا بر دوش بید و ارغوان می آورد

سرو جب ہوا کے جھونکوں سے رقص کرتے ہوئے، بید اور ارغوان کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے، تو کیا بھلا لگتا ہے۔

(۲) سلمان نے شاعرانہ افکار کو تصوف و معرفت کا رنگ دے کر اور بھی زیادہ زور دار اور موثر کیا ہے۔

باز بزنجیر زلف یار مرا می کشد — دل پی آہی روم تا بکجا می کشد
نام ہمہ عاشقان در ورق لطف اوست — گر قلمی می کشند بر سر ما می کشد
ہر چہ رسد نیک و بد دست چون ہمہ در دست اوست — بر من مسکین چرا خط خطا می کشد
بار تو من می کشم جور تو من می برم — پردہ ز روییت چرا باد صبا می کشد
بار غمت غیر من کس نتواند کشید — بر دل سلمان بہ ہمہ تنہا می کشد

(۳) سلمان کے قصائد کی زبان صاف اور تراکیب چست ہیں۔

باد نوروز نسیم گل رعنا آورد — گرد مشک ختن از دامن صحرا آورد
لالہ از دامن کوہ آتش موسیٰ بنمود — شاخ بیرون ز گریبان ید بیضا آورد
سرو را باد صبا منصب بالا بخشید — لالہ را لطف ہوا خلعت والا آورد

(۴) مضمون آفرینی، یوں تو سبک ہندی کا خاصہ ہے، لیکن اس کے ابتدائی نقوش سلمان کے کلام میں بھی نظر آتے ہیں ؂

در دُرج در، عقیق لبت نقد جان نہاد
جنس نفیس بود، بہ جای نہان نہاد
قفلی ز لعل بر در آن دُرج زد لبت
خالت ز عنبر آمد و مہری بر آن نہاد

سلمان کہنا یہ چاہتا تھا کہ محبوب کے دانت موتیوں کی طرح ہیں، ہونٹ عقیق کی مانند ہیں، لیکن ہونٹ، جن پر تل ہے، بند ہیں، اس سے یہ مضمون پیدا کیا ہے کہ

عاشق کے سرمایہ زندگی کو تیرے ہونٹوں نے موتیوں کی ڈبیا میں رکھ دیا ہے۔ کیونکہ وہ لطیف چیز تھی اور لطیف چیز کو ایسی ہی پوشیدہ جگہ پر رکھنا چاہیے۔ اور پھر نگہداشت کی خاطر تیرے ہونٹوں نے ڈبیا پر یاقوت کا قفل لگا دیا ہے۔ اور تل نے اسے سر بمہر کر دیا ہے۔

گریز کی خوبی۔ شاعر تشبیب کے بعد مضمون سے مضمون پیدا کر کے ممدوح کی تعریف شروع کرتا ہے، جو گریز کہلاتا ہے۔ قصیدہ کی کامیابی کا انحصار گریز پر ہے۔ گریز کامیاب ہوگا، تو قصیدہ بھی کامیاب سمجھا جائے گا۔ سلمان کے اکثر قصائد کا گریز نہایت کامیاب ہے۔

ایک قصیدے میں محبوب کی زلف سرکش کا ذکر کرتے ہوئے ممدوح کی طرف رجوع کیا ہے۔

زلفت بہ عہد معدلت شہریار دست | سودائی است ورنہ چرا می کند دراز

یعنی زلف یار تو سودائی ہے کہ شہریار کے انصاف پرور زمانے میں بھی وہ

دست درازی کر رہی ہے۔ محبوب کا ذکر کرتے کرتے دفعتہً ممدوح کا ذکر آگیا ہے۔

دورِ مستی است، درین دورہ نہ زیبد کہ بود　　بجز از بخت خداوند جہان کس بیدار

یہ مستی کا زمانہ ہے۔ کسی کو زیب نہیں دیتا کہ بادشاہ عالم کے بخت کے سوا اس وقت کوئی اور بیدار ہو۔

قصائد کے علاوہ سلمان نے ترجیع بند، قطعات، رباعیاں اور مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ قصائد سے الگ آپ کی غزلیں بھی ہیں، لیکن ان غزلوں میں مضمون آفرینی کا عنصر غالب ہے، جو اہلِ ایران کے مزاج کے موافق نہیں۔ اس لیے اس کی غزلیں مقبول نہیں ہوئیں۔

امامی ہروی (وفات ۶۶۷ ھج مطابق ۱۲۶۸ء)

ابو عبداللہ محمد بن ابوبکر امامی ہرات کا رہنے والا تھا۔ دولت شاہ سمرقندی کا بیان ہے کہ "امامی خراسان کے مشہور علما میں سے تھا اور شعر بھی خوب کہتا تھا۔"

امامی، شیخ سعدی اور مجد الدین ہمگر کا ہمعصر تھا۔ تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ چنگیز خان کے وزیر شمس الدین صاحب دیوان اور ملک معین الدین پروانہ نے، جو اباقا خان کے عہد میں حاکم روم تھا، ایک قطعہ لکھ کر مجد ہمگر سے دریافت کیا کہ سعدی، امامی اور خود آپ کے اشعار میں سے کس کو زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔ اس قطعے کا ایک شعر حسبِ ذیل ہے۔

زشعر تو و سعدی و امامی　　کدامی بہ پسندند اندرین بوم

مجد ہمگر نے اس قطعے کا مندرجہ ذیل جواب دیا ؎

ما گرچہ بنطق طوطی خوش نفسیم　　بر شکر گفتہای سعدی مگسیم
در شیوۂ شاعری بہ اجماع امم　　ہرگز من و سعدی بہ امامی نرسیم

مجد ہمگر کی یہ رائے حیران کن ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اشعار اس نے یا تو امامی کو خوش کرنے کے لیے لکھے، یا ان سے سعدی کو پریشان کرنا مقصود تھا۔ بہر حال امامی اور مجد ہمگر کا سعدی سے کیا مقابلہ ہو سکتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے امامی سے فتوے بھی طلب کیے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کے سرپرست فخر الملک نے ایک فتوی حاصل کرنے کے لیے ذیل کا قطعہ لکھ کر بھیجا ؎

سر افاضل دوران امام ملت و دین — خدایگان شریعت درین چہ فرماید
کہ گربہ گر قفس قمری و کبوتر را — بشب شکستن زرہ ظلم و جور برباید
خدایگان کبوتر ز روی شرع قصاص — اگر بریزد خون گربہ راہی شاید

امامی نے جواب میں ذیل کا قطعہ لکھ کر بھیجا۔

ایا لطیف سوالی کہ در مقام خرد — ز روی خلقت نکہت نسیم جان آید
بگربہ نیست قصاصی کہ صاحب ملت — چنیں قصاص بشرع گزین نفرماید
نہ کم ز گربہ بُبید رست گربہ صیاد — کہ مرغ بنید بر شاخ و پنجہ بکشاید
اگر بساعد سیمین خود سری داری — بخون گربہ ہمان بہ کہ دست نالاید
بقای قمری و عمر کبوتر ار خواہد — قرار گاہ قفس را بلند فرماید

امامی کی کوئی مستقل ادبی یادگار نہیں۔ تذکرہ دولت شاہ، مجمع الفصحا اور تاریخ گزیدہ میں اس کے چند اشعار ملتے ہیں۔ پروفیسر براؤن[1] نے ذیل کے اشعار نمونے کے طور پر لکھے ہیں۔

یک روز بود عید بیک سال بیک بار — ہموارہ مرا عید ز دیدار تو ہموار
یک روز بشاخ اندر پر بار بود گل — روی تو مرا ہست ہمیشہ گل پر بار
یک سوز بنفشہ بر ہم از باغ بدستہ — زلفین تو پیوستہ بنفشہ است بخروار
یک ہفتہ پدیدار بود نرگس دشتی — آن نرگس چشم تو ہمہ سالہ پدیدار

---

[1] لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد سوم ص ۱۱۶

نرگس نبود تازہ کہ بیدار نباشد | تازہ است بہ نرگس تو خفتہ و بیدار
باشند سمن زاران بہنگام بہاران | بر سنبل تو ہست شب و روز سمن زار
از جعد سیاہ تو رسد فیض بہ سنبل | کین مایۂ سحبان آمد و آن مایۂ عطار
این را وطن از سیم شد آنرا وطن از سنگ | این از بر سرو سہی آن از بر کہسار
سرو است کہ در باغ ہمہ سالہ بود سبز | با قد تو آن سرو بود کوتہ و نگونسار

مجد الدین ہمگر (وفات ۶۷۸ھ مطابق ۱۲۷۹ء)

خواجہ مجد الدین ہمگر یزد کا رہنے والا تھا۔ دولت شاہ سمرقندی[1] لکھتا ہے کہ "اس کا سلسلۂ نسب ساسانی بادشاہ نوشیروان سے ملتا ہے، اس لیے وہ جس جس حکمران کے دربار میں گیا، اس کی عالی نسبی کی وجہ سے اس کی بڑی عزت ہوئی۔ اپنے زمانے میں وہ عراق و عجم کے درباروں کا ملک الشعرا تھا۔"

ہمگر کی زندگی کے حالات تذکرہ نویسوں نے بہت کم لکھے ہیں۔ تذکروں میں اس کے بعض لطائف کا ذکر آیا ہے۔ چنانچہ پروفیسر براؤن[2] تاریخ گزیدہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ہمگر اپنی معمر بیوی کو یزد میں چھوڑ کر اصفہان آ گیا۔ اس کی بیوی کو معلوم ہوا، تو وہ بھی اصفہان پہنچ گئی۔ ہمگر کے ایک شاگرد نے اس کو کہا، آپ کے لیے خوش خبری لایا ہوں کہ آپ کی بیگم یہاں آگئی ہیں اور اس وقت وہ اسی گھر میں قیام پذیر ہیں جہاں آپ ہیں۔ ہمگر کہنے لگا، یہ خوش خبری تو ہے، لیکن اصل خوش خبری یہ تھی کہ گھر کا گھر اس پر آ گرتا۔

یار لوگوں نے یہ بات بیگم صاحبہ کے کانوں تک بھی پہنچا دی۔ اس نے میاں کو بہت جلی کٹی سنائیں اور خیام کی یہ رباعی پڑھی ؎

پیش از من و تو لیل و نہاری بودہ است
گردندہ فلک برائی کاری بودہ است

۱؎ تذکرۃ الشعرا، صفحہ ۱۱۳ مطبوعہ لاہور   ۲؎

زنہار قدم بخاک آہستہ نہی
کان مردمک چشم نگارے بودہ است

ہمگر کہنے لگا کہ یہ رات اور دن مجھ سے پہلے تو بیشک تھے، لیکن تم اس وقت بھی موجود تھیں جب رات اور دن کا کہیں وجود نہ تھا۔

ہمگر اتابک سعد بن ابوبکر زنگی کے دربار کا شاعر تھا۔ اتابک کے ساتھ اسے چوپٹ کھیلنے کا بھی موقع ملتا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ اتابک نے اس کھیل کو ترک کردیا۔ ہمگر نے سال بھر انتظار کیا، لیکن اتابک نے چوپٹ کی طرف رجوع نہ کیا۔ آخر اس نے ذیل کا قطعہ لکھ کر اتابک کی خدمت میں بھیج دیا۔

خسروا داشت سخائی تو مرا بار چنانک
کان نیارست زدن لاف ز مستی با من

آسمان با ہمہ تعظیم و بلندی کو راست
می زد از روی تواضع دم پستی با من

تا تو برداشتی اکنون ز سرم دست کرم
می زند از سر کین تیغ دو دستی با من

یاد می دار از آن شب کہ رہی را گفتی
عمر باقی بنشین، خوش چو نشستی با من

آن شب آن بود کہ در سر ہوس نردت بود
نرد م بردم عدا تو شکستی با من

یارب امسال چہ تدبیر کنم کو کہ چو پار
شہ بباز د نرد و ہمستی با من

اتابک یہ قطعہ پڑھ کر خوش ہوا اور اس کے لیے سالانہ ایک ہزار دینار کا وظیفہ مقرر کردیا۔ تذکروں میں ہمگر کی بعض رباعیاں ملتی ہیں۔ پروفیسر براؤن نے "لٹریری ہسٹری" میں کچھ رباعیاں نقل کی ہیں۔ ان میں بعض ایسی ہیں جن میں انتہا درجے کی عریانی پائی جاتی، ہماری تاریخ ایسی رباعیوں کی متحمل نہیں ہو سکتی، اس لیے ذیل کی رباعیوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

این پای مرا کہ نیست پروای رکاب
نہ روی رکوب ماند و نہ رای رکاب

زین سان کہ تنگ آمدم از پیری و ضعف
نہ دست عنان دارم و نہ پای رکاب

آن شد کہ دلم ز طبع چون آتش و آب
می ریخت بدیہہ ہای چون در خوشاب
عشق و جوانی و کام دل بود
وین ہر سہ دگر بارہ نبینیم بخواب

نہ برگ کہ خیمۂ زنم پہلو یت
نہ سیم کہ خانۂ خرم در کو یت
من دیدہ دگوش را بدان می خواہم
تا بشنوم آواز دبینم رو یت

پوربہائی جامی

پوربہا قصبہ جام کا رہنے والا تھا۔ اس کی زندگی کے حالات تذکرہ نویسوں نے بہت کم لکھے ہیں۔ دولت شاہ کا بیان ہے کہ پوربہا نے ارغون خان کے زمانے میں خواجہ وجیہ الدین کے ہاں ملازمت اختیار کی اور جام سے تبریز آگیا۔ بالآخر شمس الدین صاحب دیوان کے حلقہ شعرا میں شامل ہو گیا۔ اور اس نامور وزیر کے قصیدے کہنے لگا۔ یہاں خواجہ ہمام الدین سے اکثر حریفانہ چشمکیں رہتی تھیں۔ اس کی ایک غزل نمونے کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔

بر ریاض آفتاب از شب رقم خواہد کشید
ماہ را بر صفحۂ خوبی قلم خواہد کشید

یارب این یک قطرہ خون کو راہی خوانند دل
تا کی از بیداد مہرویان ستم خواہد کشید

پر حذر باش امشب ای ہمسایہ بیت الحزن
کز سرشک چشم من دیوارم خواہد کشید

می کشد بار غم محبوب دمی داند بہا
ہر کہ عاشق شد ضرورت بار غم خواہد کشید

ایک دوست کا دانت ٹوٹ جانے پر ذیل کا قطعہ کہا ؂

گر شد گہری ز درج نوشتنیت کم
در حسن مگشتمت ہیچ ممکنیت کم

صد ماہ ز اطراف رخت می تابد
گو باش ستارۂ زیر و بنیت کم

پور بہا نے بعض تاریخی حالات و واقعات بھی نظم کیے ہیں۔ ۶۶۶ ھج بمطابق ۱۲۶۷ء میں نیشاپور میں نہایت ہولناک زلزلہ آیا، جس سے شہر تباہ ہو گیا۔ ذیل کے اشعار میں اس زلزلے کی کیفیت بیان کی ہے

ز زخم زلزلہ زیر و زبر شد ست چنانک
سماک زیر سمک شد سمک فراز سما

بجور و قہر بر انداختش زبن بنیاد
بکل و جزو فرو ریختش زہم اجزا

نہادہ سر بزمین بی سجود مقصورہ
منارہ قامت خود بی رکوع کردہ دوتا

کتاب خانہ نگون رسم مدرسہ مدروس
خراب مسجد آدینہ منبر اندر دا

۶۶۹ ھج بمطابق ۱۲۷۰ء میں اباقا خان کے حکم سے شہر نیشاپور پھر سے آباد ہوا۔ چنانچہ پور بہا لکھتا ہے۔

چو کہنہ بود و قدیمی بنای نیشاپور | نہاد روی سوی خرابی از ہر جا
خدای خواست کہ بازش ز نو بنا سازند | بعہد دولت نوشیروان عہد اباقا
خدایگان جہان بادشاہ روی زمین | جہانکشای عدو بند شاہ شہر کشا
بسال ششصد و شصت و نہ اتفاق افتاد | بنا نہادن این شہر شہرہ زیبا

اواخر رمضان آفتاب و زہرہ بہ ثور	قمر بحوت و عطارد نشستہ در جوزا
بنا نہادن شہر نوت مبارک باد	بعہد دولت تو شہر باد ہر صحرا
بدولت تو نشاپور کہنہ نو شد باز	بسان پیر خرف گشتہ کو شود برنا
سہ چیز باد و بماناد ہر سہ تا بہ ابد	بقائے خواجہ و گر شہر و شعر پر بہا

امیر خسروؒ

امیر خسروؒ کے والد سیف الدین محمود لاچین قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ترکستان کا شہر کش آپ کا وطن تھا۔ فتنۂ تاتار میں وطن سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور پٹیالی میں مقیم ہو گئے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ لوگ کب وارد ہند ہوئے، لیکن تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ امیر خسروؒ کے والد، سلطان شمس الدین التمش کی فوج میں ایک ذمے دار عہدے پر فائز تھے۔ سلطان نے فوجی خدمات کے صلے میں سیف الدین محمود کو امیر کے لقب سے سرفراز کیا اور پٹیالی میں جاگیر بھی عطا کی۔ سیف الدین کی شادی ایک دس ہزاری فوج کے افسر اعماد الملک کی بیٹی سے ہوئی۔ جس سے امیر خسروؒ ۶۵۱ ھج بمطابق ۱۲۵۳ء میں پیدا ہوئے۔

امیر خسروؒ نے باقاعدہ تعلیم نہیں پائی۔ تذکروں سے اس قدر پتا چلتا ہے کہ آپ نے خواجہ اسد الدین سے فن خطاطی سیکھا تھا۔ آپ متعدد زبانیں بھی جانتے تھے، جیسا کہ وہ مثنوی نہ سپہر میں لکھتے ہیں۔

من بزبان ہائے کسان بیشتری	کردہ ام از طبع شناسا گزری
دانم و دریافت و گفتہ ہم	جستہ و روشن شدہ زان بیش و کم

بچپن ہی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ پھر آپ کے نانا اعماد الملک نے آپ کی تربیت کی۔

امیر خسروؒ تقریباً تمام عمر حکمرانوں اور خوانین کے دربار سے منسلک رہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانے کا تاریخی پس منظر بتا دیا جائے۔

التمش کے جانشین۔ التمش کی وفات کے بعد شہزادوں میں کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا کہ ملک میں مضبوط حکومت قائم کر سکے، پہلے رکن الدین فیروز شاہ تخت حکومت پر بیٹھا پھر التمش کی بیٹی رضیہ سلطانہ ۶۳۴ھجر مطابق ۱۲۳۶ء میں تخت نشین ہوئی۔ یہ ایک بہادر خاتون تھی، جس نے کچھ عرصہ باپ کی سلطنت کو سنبھالے رکھا۔ لیکن آخر اس کے خلاف بغاوت ہوئی۔ جس میں وہ قتل ہو گئی۔ ۶۳۷ھجر مطابق ۱۲۳۹ء میں معزالدین بہرام شاہ نے حکومت سنبھالی، لیکن ۶۳۸ ھجر مطابق ۱۲۴۰ء میں یہ بھی ہلاک ہوا۔ اس کے بعد رکن الدین فیروز شاہ کا بیٹا علاءالدین مسعود شاہ بادشاہ بنا۔ اس کے زمانے میں منگولوں نے دو مرتبہ ہند پر حملہ کیا۔ لیکن علاءالدین نے انھیں مار بھگایا، آخر یہ بادشاہ بھی عیش و عشرت میں محو ہو گیا۔ امراء نے اس کے خلاف سازش کی اور اسے گرفتار کر کے زندان میں ڈال دیا گیا۔ اس کے بعد حکومت ۶۴۶ھجر مطابق ۱۲۴۸ء میں التمش کے بیٹے ناصرالدین کو سونپی گئی۔ ناصرالدین ایک نیک نفس بادشاہ تھا۔ اس نے ۲۲ سال تک بڑی کامیابی سے حکومت کی۔ اس کی کامیابی بڑی حد تک اُس کے جرنیل غیاث الدین بلبن کی رہینِ منت تھی۔

بلبن نے منگولوں کے حملوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور سرحدیں محفوظ کر کے ان کی راہیں مسدود کر دیں۔ بلبن نے بعض ہندوستانی سرکش راجاؤں کو بھی زیر کیا اس طویل عرصے میں نہایت وفاداری کے ساتھ شاہی خدمات بجا لاتا رہا۔ آخر ۶۶۴ھجر مطابق ۱۲۶۵ء میں جب کوئی سلطنت کا دعوے دار نہ رہا۔ تو غیاث الدین بلبن نے عنان حکومت سنبھالی۔ اس کے عہد میں ملک میں امن و سکون تھا اور عوام خوش حال تھے۔ یہ بہت عادل اور رحم دل حکمران تھا۔ امراء اور عوام اس کے گرویدہ تھے۔ شان و شوکت اور جاہ و جلال کے لحاظ سے وہ اپنے آقا شمس الدین التمش سے بھی بازی لے گیا۔ بلبن کا جاہ و جلال بعض امرا کی وجہ سے اور بھی بڑھ گیا، جو خوانین کہلاتے تھے خوانین کے اپنے دربار لگتے تھے۔ یہ خوانین علماء کے بہت قدر دان تھے۔ اور انعام و اکرام میں ایک

دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ انہی میں ایک اعماد الملک بھی تھا۔ جو امیر خسرو کا نانا تھا۔

اعماد الملک کا شمار اس زمانے کے بڑے سرداروں میں ہوتا تھا۔ اُس کے دربار میں علماء اور رؤسا کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ امیر خسرو کا بچپن انہی لوگوں میں گزرا۔ نانا کی مجلسوں میں مصاحبوں کی بذلہ سنجیوں سے لطف اندوز ہوتا اور شعراء کے شعروں اور موسیقاروں کے نغموں سے محظوظ ہوتا تھا اسی طرح اس کے شعر و نغمہ کے فطری جذبے کی تربیت ہوتی رہی۔

امیر خسرو بچپن ہی میں شعر کہنے لگا تھا، جیسا کہ وہ خود اپنے دیوان "تحفۃ الصغر" کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"میں بارہ سال کا تھا کہ بعض شعراء کی خاص خاص بحروں میں طبع آزمائی کرتا تھا۔ شعرا اور علماء میری فنی صلاحیتوں کو دیکھتے، تو حیران ہوتے۔ ان کی حیرت سے میری حوصلہ افزائی ہوتی ...... مجھے فنِ شعر کا کچھ ایسا نشہ تھا کہ صبح سے شام تک میرا ذہن فکر سخن میں محو رہتا تھا۔"

اعماد الملک فوت ہوا، تو امیر خسرو نے شعرا کے مربی و محسن ملک چھجو کے دربار کا رُخ کیا، جس کی سخاوت کے چرچے بہت دور دور تک ہوتے تھے۔ یہاں انہوں نے ملک چھجو اور دوسرے امراء کے قصیدے کہہ کر اپنے شعر و سخن کی دھاک بٹھا دی، اور بیس سال کی عمر میں اُن کا شمار اوّل درجے کے شعرا میں ہونے لگا۔ خسرو اپنی شاعری کی دھوم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

تا لفظ شعر من فریاب شد اقلیم ہند
یا با شعار ظہیر اقصای ملک فاریاب

تا کشد گردون بچشم انوری
خاک من کحل سپاہان شدہ است

ملک چھجو کے دربار سے کسی وجہ سے دل برداشتہ ہوئے تو بلبن کے بیٹے بغرا خان کے دربار میں آ گئے۔ یہاں آپ کی اور بھی زیادہ قدر و منزلت ہوئی۔ بلبن کے زمانے میں ایک ترک غلام طغرل نے، جو لکھنوتی اور بنگال کا حاکم تھا، بغاوت کی، تو بلبن نے خود بغرا خان کو ساتھ لے کر طغرل کے خلاف لشکر کشی کی۔ اور اسے شکست دی۔ اس مہم میں امیر خسرو بھی بادشاہ کے ہمراہ تھے۔ بلبن بغاوت کو فرو کر کے دہلی واپس چلا گیا اور بغرا خان کو لکھنوتی اور بنگال کا حاکم بنا دیا۔ یہاں امیر خسرو کو کچھ عرصہ کے لیے سکون و اطمینان نصیب ہوا۔ لیکن بنگال سے وہ بالآخر اکتا گئے اور رخصت لے کر دہلی چلے آئے۔ دہلی میں بلبن کا بیٹا سلطان محمد قاآن حاکم ملتان باپ کی فتح کے جشن میں شامل ہونے کے لیے آیا، تو وہ امیر خسرو کو اپنے ساتھ ملتان لے گیا۔ اس مرتبہ امیر خسرو کا دوست نجم الدین حسن سنجری بھی آپ کے ساتھ تھا۔ ملتان، دہلی کے بعد علم و فضل کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ محمد قاآن علماء کی بڑی قدر کرتا تھا۔ اس لیے اس کے دربار میں علوم و فنون کے ماہرین کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ دربار میں شاہنامہ، دیوان سنائی، قصائد خاقانی اور نظامی کی مثنویاں پڑھی جاتی تھیں اور علماء مختلف اشعار پر تنقید و تبصرہ کرتے تھے۔ محمد قاآن بھی ان تنقیدوں میں حصہ لیتا تھا۔

حسن سنجری سے ملاقات ۔ تاریخ فرشتہ کا مصنف لکھتا ہے کہ دربار کے علماء اور شعراء میں امیر خسرو اور حسن سنجری کو بہت امتیاز حاصل تھا۔ ان دو دوستوں کے متعلق طرح طرح کی روائتیں مشہور ہیں۔ ایک دن امیر خسرو بازار سے گزر رہے تھے کہ ان کی نظر ایک حسین و جمیل شخص حسن پر پڑی، جو نان بائی کی دکان پر گاہکوں کو روٹی دے رہا تھا۔ امیر خسرو نے پوچھا روٹی کتنے کو دو گے؟ اس نے جواب دیا۔ ترازو کے ایک پلڑے میں روٹی رکھتا ہوں اور گاہک سے کہتا ہوں کہ رقم دوسرے پلڑے میں رکھ دے۔ اگر رقم والا پلڑا جھک جائے، تو میں اس کے عوض روٹی دے دیتا ہوں۔ امیر خسرو

کہنے لگے، اگر گاہک غریب ہو تو پھر؟ حسن نے جواب دیا۔ "تو پھر میں روٹی کے عوض گاہک کے درد اور نیازمندی ہی کو قبول کر لیتا ہوں۔" خسرو جواب سے بہت متاثر ہوئے اور اپنے مرشد سے حسن کا ذکر کیا۔ آخر امیر خسرو اور حسن کا تعلق خاطر اتنا بڑھا کہ حسن نے دکان کو خیر باد کہا اور امیر خسرو کی معیت میں رہ کر علم حاصل کرنے میں مشغول ہو گیا۔

محمد قاآن کے دربار میں پہنچ کر ان کی محبت کا چرچہ ہونے لگا۔ محمد قاآن کو لوگوں نے یہ بھی کہا کہ یہ دونوں فرقہ ملامتیہ[1] سے تعلق رکھتے ہیں۔ سلطان نے حسن کو خسرو کی ملاقات سے منع کر دیا، لیکن حسن نے اس فرمان کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ آخر سلطان نے سر دربار حسن کے چابک مارا اور خسرو کو بلوا بھیجا کہ وہ اپنے کردار کی صفائی پیش کرے۔ خسرو نے سلطان کو یہ کہہ کر اپنی صفائی پیش کی کہ ہم جسم اور روح کے اعتبار سے ایک ہیں، ہم میں جدائی نہیں ہو سکتی۔ سلطان نے امیر خسرو سے حقیقی محبت کی دلیل چاہی۔ اس پر خسرو نے آستین الٹ کر اپنا بازو دکھایا اور کہا۔

گواہ عاشق صادق در آستین باشد

سلطان نے دیکھا، تو چابک کا نشان خسرو کے بازو پر بھی تھا۔ یہ نشان عین اسی جگہ تھا، جہاں حسن کے چابک لگا تھا۔ امیر خسرو نے اس موقع پر ذیل کی رباعی کہی۔

عشق آمد و شد چو خونم اندر رگ و پوست　　تا کرد مرا تہی و پر کرد ز دوست
اجزائے وجودم ہمگی دوست گرفت　　نامست مرا برمن باقی ہمہ اوست

اس سلوک کے بعد امیر خسرو نے ہر چند شہزادے کے دربار کو خیر باد کہنا چاہا، لیکن اسے اجازت نہ مل سکی۔

اس ایک تلخ واقعہ کو اگر نظر انداز کر دیا جائے، تو کہا جا سکتا ہے کہ ملتان کا

---

[1] صوفیا کا ایک فرقہ ہے، جو بنیادی ملامتیں حاصل کر کے اپنی خود پرستی اور خودی کو مٹانا چاہتے ہیں۔

قیام امیر خسرو کے لیے ایک دورِ نشاط تھا۔ آپ کی شاعرانہ صلاحیتیں اوج پر تھیں۔ شاعری میں اور وسعت آگئی تھی، جس سے آپ کی شہرت دُور دُور تک پھیلی۔ یہاں آپ نے اپنے کلام کا دوسرا مجموعہ "وسط الحیات" کے نام سے تصنیف کیا۔ جسے مقبولیت عام حاصل ہوئی۔ آپ کی شہرت ہند سے نکل کر اب ایران تک بھی پھیل چکی تھی۔ چنانچہ سعدی علیہ الرحمۃ، جو اب بہت بوڑھے ہو چکے تھے، آپ کے کلام کے بہت مداح تھے۔ محمد قآن نے یہ خواہش ظاہر کی کہ ہند اور ایران کے یہ دو شیریں نوا شاعر اس کے دربار میں اکٹھے مل کر نغمہ سرائی کریں۔ چنانچہ اس نے سعدی کو ملتان آنے کی دعوت دی، لیکن آپ نے اپنی ضعیفی اور ناتوانی کا عذر پیش کیا۔ اس دعوت کی بنا پر بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ شیخ سعدی اپنے ضعیفی کے زمانے میں دہلی آئے تھے۔ شیخ سعدی کا وارد ہند ہونا، اور ان دو عظیم شعراء کا اکٹھا ہونا ایک اہم تاریخی واقعہ ہوتا، لیکن نہ اس کا ذکر امیر خسرو نے اپنی کسی تصنیف میں کیا ہے، نہ یہاں کی کسی تاریخ ہی میں یہ ذکر ملتا ہے۔ بہر حال یہ دو عظیم شاعر ایک دوسرے کے کلام سے آشنا ضرور تھے۔ خسرو نے سعدی کا احترام ظاہر کرنے کی غرض سے سعدی کے اسلوب کا تتبع کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

ملتان میں امیر خسرو پانچ سال تک رہے۔ اس عرصے میں ایران میں ہلاکو کے پوتے ارغون خان کی حکومت تھی۔ منگول ایران سے اٹھ کر وقتاً فوقتاً ہند پر حملہ آور ہوتے رہتے تھے۔ ۶۸۳ھ مطابق ۱۲۸۴ء میں ارغون خان کے امراء میں سے تیمور خان نے ہند پر لشکر کشی کی، اور اپنی بیس ہزار فوج سے لاہور اور دیپال پور کو روندتا ہوا ملتان پر حملہ آور ہوا۔ شہزادہ محمد نے مردانہ وار مقابلہ کیا، لیکن آخر شہید ہوا۔ جو لوگ اسیر ہوئے ان میں امیر خسرو اور حسن بھی تھے۔ شبلی لکھتے ہیں کہ انھیں اسیر کر کے بلخ بھیج دیا گیا، جہاں یہ دو سال رہے۔ لیکن ڈاکٹر محمد وحید مرزا[۱] نے اپنے مقالہ مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی میں

۱؎ LIFE AND WORKS OF KHUSRAU. P.

مولانا شبلی سے اختلاف کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ امیر خسرو نے خود اپنی مثنوی خضر خان اور دیول رانی کے دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ بداعمال شخص (یعنی امیر خسرو) منگولوں کے ہاتھوں اسیر ہو گیا۔ مجھے ایسے بیابان سے گزرنا پڑا جس میں ریت کی تہیں حدِ نگاہ تک بڑھتی چلی گئی تھیں ۔ گرمی اس قدر تھی کہ دماغ اُبلا پڑتا تھا۔ میں اور میرا محافظ دونوں پیاسے تھے۔ اس لیے وہ مجھے ایک ندی کے کنارے لے گیا۔ مجھے بھی شدت کی پیاس تھی ، لیکن میں نے صرف اپنے ہونٹوں کو ہی تر کرنا مناسب سمجھا۔ سوار اور اس کے گھوڑے نے جی بھر کر پیاس بجھائی۔ آخر یہ دونوں دفعتاً گر کر مر گئے اور میں واپس ہو لیا ۔" اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بلخ نہیں پہنچے ، بلکہ راستے ہی سے اُن کو رہائی مل گئی اور آپ ملتان واپس آ گئے ۔ پھر دہلی آئے اور بلبن کے دربار میں شہزادہ محمد کا مرثیہ سنایا ، اس مرثیے کو لوگ مہینوں تک پڑھتے رہے ۔

اس کے چند شعر حسب ذیل ہیں ۔

واقعہ است این یا بلا از آسمان آمد پدید	آفت است این یا قیامت در جہان آمد پدید
راہ در بنیاد عالم داد سیل فتنہ را	رخنہ کامسال در ہندوستان آمد پدید
مجلس یاران پریشان شد چو برگ گل ز باد	برگ ریزی گوئی اندر بوستان آمد پدید
بس کہ آب چشم خلقی شد روان در چار سو	پنج آب دیگر اندر مولتان آمد پدید
جمع شد سیارہ چشم مگر طوفان شود	چون بہ برج آبی انجم را قران آمد پدید

من نخواہم جز بہان جمعیت دین کی شود

خود محال است این نبات النعش پروین کی شود

مرثیہ نہایت دردناک ہے ۔ کہا جاتا ہے اُس کا غیاث الدین بلبن پر اتنا شدید اثر ہوا کہ وہ اسی صدمے سے راہیِ ملکِ بقا ہو گیا۔

بلبن نے اپنی زندگی میں محمد قاآن کے بیٹے شہزادہ کیخسرو کو اپنا ولی عہد نامزد کیا تھا۔ کیونکہ بغرا خان کو وہ سخت ناپسند کرتا تھا۔ شہزادہ انھیں دنوں ملتان پہنچ گیا اور شہر میں

امن و سکون بحال کرنے کے لیے جد و جہد کرنے لگا۔

بلبن فوت ہوا، تو کیخسرو کی بجائے ۶۸۵ ھجری مطابق ۱۲۸۶ء میں بغرا خان کے بیٹے کیقباد کو تخت حکومت پر بٹھایا گیا۔

معز الدین کیقباد، بلبن کی وسیع سلطنت کا بادشاہ بن کر عیش و عشرت میں زندگی بسر کرنے لگا۔ بغرا خان نے اپنے بیٹے معز الدین کی تخت نشینی اور اس کی عشرت پسندی کا ذکر سنا، تو اُس نے دہلی کا رُخ کیا۔ بیٹے کو یہ خبر ملی، تو اس نے باپ کا مقابلہ کرنے کے لیے فوج تیار کی۔ اس عرصے میں باپ اور بیٹے کے مابین نامہ و پیام ہوتے رہے۔ آخر دونوں میں صلح ہو گئی۔ کیقباد چاہتا تھا کہ مصالحت کے واقعہ کو نظم کیا جائے، چنانچہ اُس نے امیر خسرو کو بلوا کر یہ خدمت سپرد کی۔ امیر نے چھ ماہ کے عرصہ میں مثنوی "قران السعدین" لکھی، جس میں باپ بیٹے کے نامہ و پیام، مصالحت اور ملاقات کا مفصل حال لکھا ہے یہ مثنوی ۶۸۸ ھجری مطابق ۱۲۸۹ء میں لکھی گئی، جیسے کہ خسرو خود لکھتا ہے ؎

آنچہ تبا ریخ ز ہجرت گذشت　　　بود سن شش صد و ہشتاد و ہشت

کیقباد بیمار ہو کر فوت ہوا، تو اس کا کم سن بیٹا شمس الدین کیقاؤس حکمران بنا۔ لیکن تین ماہ ہی گزرے تھے کہ امرا نے اسے بھی تخت سے اتار دیا۔ اب اس خاندان میں کوئی بھی تخت و تاج کا دعوے دار نہ رہا تھا۔ اس لیے ترکی امراء میں سے ملک فیروز شائستہ خان خلجی کو بالاتفاق آرا ۶۸۹ ھجری مطابق ۱۲۹۰ء میں تخت حکومت پر بٹھایا گیا۔ یہی وہ حکمران ہے جو تاریخ میں جلال الدین خلجی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی عمر تخت نشینی کے وقت ستر سال تھی۔

جلال الدین بڑے جاہ و جلال کا بادشاہ تھا، اگرچہ وہ سخت گیر شخص تھا، لیکن اس کی طبیعت میں رنگینی اور مزاج میں شگفتگی تھی۔ شعر بھی کہتا تھا۔ چنانچہ بدایونی نے اس کے ذیل کے دو شعر نقل کیے ہیں۔

آن زلف پریشانت ژولیدہ نمی خواہم
وآن روئے چو گلنار تفسیدہ نمی خواہم
بی پیرہنت خواہم یک شب بکنار آئی
ہاں بانگ ملبند است این پوشیدہ نمی خواہم

امیر خسروؔ نے اس زمانے میں مثنوی "مفتاح الفتوح" لکھی، جو جلال الدین خلجی کی فتوحات پر مشتمل ہے۔ سلطان جلال الدین کا انجام یہ ہوا۔ اس کے بھتیجے سلطان علاؤالدین خلجی نے ۶۹۵ ھجری مطابق ۱۲۹۶ء میں اُسے دھوکے سے قتل کر کے ملک کی باگ ڈور خود سنبھال لی۔

علاؤالدین کا یہ فعل بہیمانہ تو ضرور تھا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ بہت باعزم اور مستقل مزاج بادشاہ تھا۔ اس کی ملکی فتوحات اور انتظامی قابلیت کے ساتھ ساتھ اس کی علم پروری بھی حیرت انگیز تھی۔ اس کے دربار میں سخاوت اور فیاضی کی بدولت علما کا جمگھٹا لگا رہتا تھا متعدد شعراء اس کے دربار سے متعلق تھے۔ ان میں زیادہ شہرت امیر خسروؔ اور حسنؔ کو حاصل ہوئی۔ علاؤالدین نے امیر خسرو کی علمی خدمات کے صلے میں اُن کے لیے ایک ہزار ٹنکا سالانہ وظیفہ مقرر کیا تھا۔ امیر خسرو نے علاءالدین کی فتوحات کو اپنی مثنوی "خزائن الفتوح" میں نظم کیا ہے۔

امیر خسروؔ نے نظامی گنجوی کے "خمسے" کے جواب میں جو پانچ مثنویاں تصنیف کیں، وہ علاؤالدین خلجی کے زمانے میں ہی لکھی گئی تھیں اور اسی بادشاہ کے نام منسوب ہیں۔

بیعت

۶۷۱ ھجری مطابق ۱۲۷۲ء میں امیر خسرو نے حضرت نظام الدین اولیا کے ہاتھ پر بیعت کی۔ حضرت آپ سے بہت محبت کرتے تھے اور انھیں ترک اللہ کا لقب دیا تھا۔ اکثر دوسرے مرید مرشد کی توجہ کے لیے امیر خسروؔ ہی کو وسیلہ بناتے تھے۔ آپ جسمانی اور روحانی دنیا کے مابین عالم برزخ کی حیثیت رکھتے تھے۔ ایک

طرف آپ کا تعلق درباروں سے تھا، دوسری طرف حضرت نظام الدین کی بارگاہ سے کسب فیض کرتے تھے اور اپنے مرشد کو درباروں کے حالات و واقعات سے آگاہ رکھتے تھے۔

امیر خسروؔ نے بیشتر اشعار اپنے مرشد کو خطاب کر کے کہے ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاء عموماً راتوں کو جاگا کرتے تھے۔ اس لیے جب وہ مریدوں کے سامنے آتے، تو ان کی آنکھوں میں سرخی ہوتی تھی۔ اسی کیفیت کو دیکھ کر امیر خسروؔ نے ذیل کا شعر کہا۔

تو شبینہ می نمائی بہ برکہ بودی شب   کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

قطب الدین مبارک ۔ علاء الدین خلجی کی وفات کے بعد ملک کافور اس کے چھ سالہ بچے عمر خان کو شہاب الدین خلجی کے نام سے تخت نشین کر کے خود سفید و سیاہ کا مالک بن گیا، لیکن شاہی خاندان کے پرانے نمک خواروں نے ملک کافور کو قتل کر کے علاء الدین کے بڑے بیٹے قطب الدین مبارک خلجی کو تخت حکومت پر بٹھایا۔ قطب الدین مبارک خلجی اگرچہ بہت عشرت پسند اور بے مغز بادشاہ تھا، لیکن اس نے امیر خسروؔ کی قدردانی میں کوتاہی نہ کی۔ اس کے زمانے میں امیر خسروؔ نے "مثنوی نہ سپہر" لکھی، تو انھیں ہاتھی کے برابر روپے تول کر دیئے گئے۔

غیاث الدین تغلق ۔ قطب الدین ۲۱، ھجر مطابق ۱۳۲۱ء میں اپنے ایک نومسلم غلام کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اب خاندان خلجی میں کوئی شہزادہ اس لائق نہ تھا کہ تخت و تاج کا وارث بنتا، اس لیے ایک ترک امیر غازی ملک کو، جس کی خدمات کے تمام امراء معترف تھے، تخت و تاج سونپا گیا، چنانچہ وہ سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی بڑی فراخ دلی سے امیر خسروؔ کی سرپرستی کی۔ امیر خسروؔ نے اس کا حق ادا کرنے کے لیے مثنوی "تغلق نامہ" لکھی، اور اسے سلطان کے نام منسوب کیا۔ یہ اس عہد کی ایک مفصل تاریخ ہے۔

غیاث الدین تغلق نے جب بنگال پر فوج کشی کی، تو امیر خسروؔ بھی اس کے ہمرکاب

تھے۔ ابھی یہ بنگال ہی میں تھے کہ مرشد کے انتقال کی خبر ملی۔ آپ نے سنا تو سخت پریشان ہوئے اور دہلی کی راہ لی۔ یہاں پہنچ کر چھ ماہ تک مرشد کے مزار کی مجاوری کی۔ اس کے بعد یہ بھی راہئ ملک بقا ہوئے۔ آپ کا سالِ وفات ۷۲۵ھ مطابق ۱۳۲۴ء ہے۔

تصنیفات

امیر خسرو ان خوش نصیب شعراء میں سے ہیں، جنھوں نے اپنی زندگی میں ہی شہرت اور مقبولیت حاصل کرلی تھی۔

امیر خسرو نے اپنی بیشتر کتابیں خود اپنی زندگی میں ہی ترتیب دیں۔

آپ نے اپنے پانچ دیوانوں میں خاصے طویل دیباچے خود اپنے قلم سے لکھے ہیں۔ اکثر قصائد کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا ہے۔ یہ کب اور کس کی شان میں کہے گئے۔ یہ التزام مثنویوں میں بھی قائم رکھا گیا ہے۔

امیر خسرو خوش ذوق فنکار تھے، اس لیے آپ نے مثنویوں کی ترتیب و تدوین بڑے اہتمام سے کی۔ کتابوں کی ترتیب میں آپ کے بعض دوستوں نے بھی مدد دی؛ ان میں تاج الدین زاہد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

تصنیفات کی تعداد۔ مولانا جامی[1] آپ کی تصنیفات کی تعداد ننانوے بتاتے ہیں ممکن ہے امیر خسرو نے اسی قدر کتابیں تصنیف کی ہوں، کیونکہ آپ بہت پرگو شاعر تھے۔ اور زندگی کے آخری لمحے تک شعر کہتے رہے۔ لیکن اب صرف بائیس کتابیں دستیاب ہوتی ہیں، جن کا مختصر طور پر ذیل میں ذکر کیا جائے گا۔

قصائد کے دیوان۔ آپ نے پانچ دیوان مرتب کیے، جو سلاطین دہلی کے قصائد پر مشتمل ہیں۔

۱۔ **تحفۃ الصغر**۔ یہ آپ کے قصائد کا پہلا دیوان ہے، جو ۶۷۱ ہجری میں تصنیف

---

[1] نفحات الانس ص ۷۱۰

ہوا۔ اس میں وہ قصائد ہیں، جو سولہ سال سے ۱۹ سال کی عمر تک لکھے گئے، ان میں بیشتر قصائد غیاث الدین بلبن، اس کے بیٹے محمد قآن شہید اور بعض دوسرے امرا کی مدح میں ہیں۔

۲۔ **وسط الحیات** - اس میں بیس سے تیس سال تک کا کلام ہے۔ یہ اُس زمانے کی تصنیف ہے، جب شعرائے دہلی میں آپ نے اپنا مقام پیدا کر لیا تھا۔ اس دیوان کے اکثر قصائد محمد قآن شہید، بغرا خان اور قتلو خان کی مدح میں ہیں۔ ان قصائد میں آپ نے خاقانی اور کمال اسماعیل کا تتبع کیا ہے۔

۳۔ **غرۃ الکمال** - اس دیوان کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس میں چونتیس سے تینتالیس سال تک کا کلام ہے۔ اس کے دیباچے میں آپ نے اپنی شاعرانہ اختراعوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں وصف نگاری خاص طور سے اہم ہے۔ اس دیوان کے قصائد، آپ کے عمدہ ترین قصائد سمجھے جاتے ہیں۔ اکثر قصائد سلطان معزالدین کیقباد اور سلطان جلال الدین خلجی کی مدح میں لکھے ہیں۔

۴۔ **بقیہ نقیہ** - اس دیوان کو بھی آپ نے خود ہی ترتیب دیا تھا۔ یہ آپ کی ضعیفی کے کلام پر مشتمل ہے۔

۵۔ **نہایت الکمال** - یہ پانچواں دیوان ہے، جسے آپ نے غیاث الدین تغلق کی وفات اور محمد تغلق کی تخت نشینی کے وقت ترتیب دیا تھا۔ اس میں قطب الدین مبارک خلجی کا مرثیہ، اس کے جانشین کی مدحیں اور بعض غزلیات شامل ہیں۔

مثنویاں | امیر خسرو کی یادگار دس مثنویاں بھی ہیں، جن میں سے پانچ طبعزاد تاریخی مثنویاں ہیں اور پانچ نظامی گنجوی کی تقلید میں لکھی گئی ہیں۔

ان مثنویوں پر مفصل تبصرہ کرنے کی اس تذکرے میں گنجائش نہیں، اس

لیے ان کے مختصر ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۱۔ قران السعدین۔ طبع زاد مثنویوں میں سب سے پہلے آپ نے کیقباد کی فرمائش پر "قران السعدین" لکھی۔ یہ مثنوی ۶۸۸ ھج مطابق ۱۲۸۹ء کی تصنیف ہے۔ مثنوی کا قصہ حسب ذیل ہے۔

غیاث الدین بلبن کی وفات پر بغرا خان کے بیٹے کیقباد کو، جو دہلی میں ہے، تخت نشین کیا جاتا ہے۔ کیقباد اس قدر وسیع سلطنت کو حاصل کرتے ہی عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ اس کا باپ، جو لکھنوتی کا حکمران ہے، باپ کا تخت و تاج حاصل کرنے کے لیے اپنے بیٹے کے خلاف فوج کشی کرتا ہے۔ بیٹا بھی مقابلے کے لیے فوج لے کر دہلی سے نکلتا ہے۔ اودھ کے قریب دونوں لشکر صف آرا ہوتے ہیں۔ اس عرصے میں نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اور آخر باپ بیٹے کے درمیان صلح ہو جاتی ہے۔ اور کیقباد اپنے باپ کو بڑی عزت سے دہلی لے آتا ہے۔

واقعہ صرف اسی قدر ہے، لیکن امیر خسرو نے شاعرانہ سحر کاری اور واقعہ نگاری سے کچھ ایسا کام لیا ہے، کہ قصے کی فرومائیگی کا احساس تک نہیں ہوتا۔

قران السعدین میں کہیں کہیں تصنع اور آورد بھی ہے لیکن اس کا بیشتر حصہ رواں اور برجستہ ہے۔

۲۔ مفتاح الفتوح۔ یہ آپ کی دوسری تاریخی مثنوی ہے۔ جو ۶۹۰ ھج مطابق ۱۲۹۱ء میں اختتام پذیر ہوئی۔ اس میں جلال الدین خلجی کی چار فتوحات کا ذکر ہے، جو اسے ایک سال کے عرصے میں حاصل ہوئیں۔

۳۔ عشقیہ یا عاشقہ۔ یہ تاریخی سلسلے کی تیسری مثنوی ہے، جو "دولرانی خضر خان" کے نام سے مشہور ہے۔ اس مثنوی کا قصہ یہ ہے۔ سلطان جلال الدین کا بیٹا خضر خان گجرات کے راجہ کی بیٹی دولرانی کے دام محبت میں اسیر ہو گیا۔ اور دونوں کی شادی ہو گئی۔

خضر خان نے اپنی رومانی داستان خود لکھی تھی۔ جسے امیر خسرو نے خضر خان کی فرمائش سے نظم کیا۔ ثمنوی ۷۱۵ ھج بمطابق ۱۳۱۵ء میں اختتام پذیر ہوئی۔ غیاث الدین تغلق کے عہد میں جب خضر خان فوت ہوگیا۔ تو دولرانی کے بعد کے حالات کے متعلق ایک اور باب کا اضافہ کیا گیا۔

۴۔ نہ سپہر۔ یہ ثمنوی ۷۱۸ ھج بمطابق ۱۳۱۸ء کی تصنیف ہے جب امیر خسرو کی عمر ۶۷ سال تھی۔ اس میں مبارک شاہ خلجی کے عہد کے واقعات لکھے گئے ہیں۔ اس کے نو باب ہیں۔ ہر باب کی بحر جداگانہ ہے۔ اس لیے ہر باب کو آپ نے "سپہر" کے نام سے تعبیر کیا ہے۔

۵ تغلق نامہ۔ یہ ثمنوی غیاث الدین تغلق کے مختصر سے عہد حکومت کے واقعات پر مشتمل ہے۔

۶۔ خالق باری اور دوہری نظمیں۔ یہ آپ کی ہندی نظموں کا مجموعہ ہے۔
نظامی گنجوی کی تقلید میں آپ نے ذیل کی ثمنویاں لکھی ہیں۔

۱۔ مطلع الانوار۔ اور سلطان علاء الدین خلجی کے نام منسوب ہے۔ اس کا موضوع پند و موعظت اور اخلاق و تصوف ہے۔ یہ ثمنوی ۶۹۸ ھج بمطابق ۱۲۹۸ء میں تکمیل ہوئی۔

۲۔ شیریں خسرو۔ یہ نظامی کی ثمنوی خسرو شیریں کے جواب میں لکھی گئی۔ اس کا نفسِ مضمون اور کہانی وہی ہے، جو نظامی کے پیشِ نظر ہے۔ سالِ تصنیف ۶۹۸ ھج بمطابق ۱۲۹۸ء ہے یہ اور بقیہ تین مثنویاں بھی سلطان علاء الدین خلجی کے نام منسوب ہیں۔

۳۔ لیلیٰ و مجنوں۔ نظامی کی "لیلیٰ مجنوں" کا جواب ہے۔ اس کا بھی سالِ تصنیف ۶۹۸ ھج ہے۔

۴۔ آئینہ سکندری۔ یہ ثمنوی سکندر نامہ کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ اس کا سالِ

تصنیف ۶۹۹ ھج مطابق ۱۲۹۹ء ہے ۔

۵ - ہشت بہشت - اس سلسلے کی یہ آخری مثنوی ہے جس میں مثنوی "ہفت پیکر" کا تتبع کیا گیا ہے - اس کا سال تصنیف ۷۰۱ ھج مطابق ۱۳۰۱ء ہے ۔

غزلیات کا دیوان آپ کے منظوم کلام میں آپ کا غزلیات کا دیوان بھی شامل ہے ۔

نثر چند نثر کی کتابیں بھی آپ کی یادگار ہیں، جن کے نام حسب ذیل ہیں ۔

۱ - تاریخ علائی یا خزائن الفتوح - یہ علاءالدین خلجی کے عہد کی مختصر سی تاریخ ہے - اس کا سال تالیف ۷۱۱ ھج مطابق ۱۳۱۱ء ہے ۔

۲ - اعجاز خسروی - یہ کتاب آپ نے ۷۱۹ ھج مطابق ۱۳۱۹ء میں یعنی ستر سال کی عمر میں تصنیف کی - اس کی تین جلدیں ہیں، جن میں نثر نویسی کے اصول و قواعد بیان کیے گئے ہیں ۔

۳ - افضل الفوائد - یہ کتاب خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات پر مشتمل ہے ۔ جس کا مجموعہ آپ نے مرشد کی خدمت میں ۷۱۹ ہجری میں پیش کیا ۔

۴ - قصہ چہار درویش بھی امیر خسرو کے نام منسوب ہے - اس کا اردو ترجمہ میر امن نے "باغ و بہار" کے نام سے کیا ہے - میر امن نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ یہ قصہ امیر خسرو نے اپنے مرشد خواجہ نظام الدینؒ اولیا کی طویل علالت کے دوران لکھا تھا، جسے آپ پڑھ کر سنایا بھی کرتے تھے - لیکن ڈاکٹر محمد وحید مرزا نے اپنے مقالے میں ذیل کے دلائل دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قصہ چہار درویش امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہو سکتی :-

۱ - کہا جاتا ہے یہ قصہ خواجہ نظام الدین اولیاء کی طویل بیماری میں لکھا گیا - مرشد کی طویل بیماری میں ایسا قصہ لکھنے کا خیال ایک مرید باصفا کو کیونکر آسکتا تھا ۔

ب - اس قصے میں شعر بہت کم ہیں اور جو ہیں ان میں سے ایک بھی امیر خسرو کا نہیں۔ اگر یہ قصہ امیر خسرو کا ہوتا، تو وہ حسب عادت شعر بھی بکثرت لکھتے اور یہ شعر خود انہی کے ہوتے۔

ج - قصہٴ چہار درویش میں بعض الفاظ[1] اور اصطلاحیں ایسی ہیں، جو کبھی امیر خسرو نے یا اُن کے معاصرین نے استعمال نہیں کیں۔

د - بعض اصطلاحیں[2] ایسی ہیں، جو امیر خسرو کے بعد ایجاد ہوئیں۔

ہ - قصہٴ چہار درویش فرنگیوں کے رسم و آداب[3] سے بخوبی واقف معلوم ہوتا ہے لیکن امیر خسرو فرنگیوں کے رسم و آداب سے اس قدر آگاہ نہ ہو سکتے تھے۔

انشائے خسروی - یہ چند خطوط کا مجموعہ ہے۔ اس کا اسلوب بیان بہت مرصع ہے۔ ڈاکٹر وحید مرزا[4] لکھتے ہیں کہ یہ خطوط بھی امیر خسرو کے نہیں، بلکہ عبدالباقی منشی ایمن آبادی (دکن) کے ہیں۔ جو اس نے شاہجہاں کے عہد میں مرزا ابراہیم کے حکم سے لکھے تھے۔ اس میں ان لوگوں اور ان کتابوں کا بھی ذکر آتا ہے، جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خطوط سترھویں صدی عیسوی میں لکھے گئے تھے۔

امیر خسرو کے قصائد امیر خسرو کے قصائد خاقانی، انوری اور کمال اسمٰعیل کے تتبع میں لکھے گئے ہیں۔ قصیدہ نگاری میں آپ کا

---

[1] LIFE AND WORKS OF KHUSRAU نوٹ ص ۱۵۰ - خوش آمد گویاں۔ جرامیان (چور) چارسوق (مارکیٹ) تالار (تالاب یا جوہڑ) اطاق (کمرہ) وغیرہ

[2] تومان دسترخوان۔ اشرفی۔ شیرمال، ترچکان (کپڑا) قلیان (تمباکو، جو اکبر اعظم کے عہد میں شروع ہوا)

[3] قصہٴ چہار درویش کا ایک شعر ہے۔ برہنہ برت آیم بر بم وراہ فرنگ - کہ من گدای فرنگم تو بادشاہ فرنگ

[4] ص ۱۵۱

اپنا کوئی خاص انداز نہیں۔

خاقانی کا ایک مشہور قصیدہ مصرعہ ذیل سے شروع ہوتا ہے۔

دل من پیر تعلیم ست و من طفل زبان دانش

امیر خسرو نے خاقانی کے جواب میں قصیدہ کہا ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

دلم طفل ست و پیر عشق استادِ زبان دانش
سوا دلوحہ سبق و مسکنت گنج دبستانش

امیر کے قصیدے کا اندازِ بیان بھی خاقانی کا سا ہے۔ ترکیبیں بھی ویسی ہی ہیں اور دور از فہم باتیں بھی اسی قسم کی ہیں۔ آپ کے قصائد میں مدح عموماً پھیکی ہوتی ہے، لیکن قصائد کی تشبیب میں زورِ طبع جھلکتا نظر آتا ہے۔ ایک قصیدے کی تشبیب کے چند شعر مندرجہ ذیل ہیں۔

صبا را گاہ آن آمد کہ راہ بوستان گیرد
زمین را سبزہ در دیبا و گل در پرنیان گیرد

جہد از چشمہ موج آب دلزاں رزمین افتد
زند بر لالہ باد تند و آتش در زبان گیرد

زبان از گفتن آتش نسوز دلیکن از سوسن
حدیث لالہ گوید ترسم آتش در جہان گیرد

تماشا کن کہ چون بگرفت لالہ کوہ را دامن
کسی کو تیغ بی موجب کشد خونش چنان گیرد

آپ کے بعض قصائد پند و موعظت سے پُر ہیں، بعض میں تصوف و عرفان کی چاشنی بھی ہے۔ قصیدہ "بحر الابرار" صوفیانہ مطالب کی عمدہ مثال ہے۔ چند اشعار نمونے کی غرض سے درج ذیل ہیں۔

کوس شہ خالی و بانگ غلغلش در دسر است
ہر کہ قانع شد بہ خشک و تر شہ بحر و بر است

مرد پنہاں در گلیمی بادشاہی عالم است
تیغ خفتہ در نیامی پاسبان کشور است

نفس خاک تست ہر گہ نور بالا بر تو تافت
سایہ زیر پا شود ہر گہ کہ بر تاک خور است

کار این جا کن کہ تشویش است در محشر بسی
آب نیں جا بر کہ در دریا بسی شور و شر است

غزل گوئی

غزل گوئی میں امیر خسروؔ کے پیش رو سعدی علیہ الرحمۃ ہیں۔ آپ کی شاعری کا شباب عین اس وقت شروع ہوا جب سعدی اپنا عہدِ شباب گزار چکے تھے۔ سعدی شیراز میں بیٹھے ہوئے غزل سرائی کرتے، اور یہاں دہلی میں اہلِ ذوق ان کی شیریں نوائی سے متاثر ہوتے تھے۔ چنانچہ امیر خسروؔ نے بھی فنِ غزل گوئی میں انہی کی پیروی کی۔ اسی وجہ سے آپ کو "طوطیٔ ہند" کا لقب ملا۔

امیر خسروؔ محض مقلد نہ تھے، انھوں نے غزل میں بعض نئی باتیں بھی پیدا کیں، جن کا مختصر سا ذکر ذیل میں آتا ہے۔

سوز و گداز

امیر خسروؔ کے پیش رو سعدی کا شمار اُن شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے غزل کے مزاج کے مطابق اسے زبان دی۔ اور اس کے دامن کو وسیع کیا۔ اسی لیے انھیں غزل کا امام کہا جاتا ہے، لیکن ان کی غزلیات میں جذبات کی حدت اور سوز و گداز کی تڑپ کم ہے۔ امیر خسروؔ نے اس کمی کو پورا کیا ہے۔ آپ نے غزلیات میں درد، سوز و گداز، حسن کی دلکشی اور دلربائی کو کچھ اس طرح نظم کے پیکر میں ڈھال دیا ہے کہ پڑھ پڑھ کر دل وجد کرتا ہے۔ چند شعر درج ذیل ہیں۔

کافری رفت و دلم غارت کرد　　شہر اسلام و مرا داد نبود

کفر شیوہ محبوب سامنے سے گزرتا ہے اور دل کو غارت کیے جاتا ہے۔ یہ شہر جہاں ہم ہیں، کہنے کو دار السلام ہی ہے، لیکن یہاں عاشق کی فریاد کوئی نہیں سنتا۔

می روی و گریہ می آید مرا　　ساعتی بنشیں کہ باران بگذرد

محبوب کے چلے جانے پر عاشق کا آنسو بہانا کوئی نئی بات تو نہیں، لیکن دوسرے مصرعے نے کتنی جدت پیدا کر دی ہے۔ عاشق محبوب سے کہتا ہے۔ میرے پاس بیٹھنا تمھیں ناگوار سہی، لیکن تھوڑی دیر صبر کرو۔ آنکھوں سے جو برسات کی جھڑی لگ رہی ہے، اُسے تھم جانے دو۔

خسرو نے اپنی امنگ، تمنا، مایوسی، ناکامی، بے قراری اور پریشانی کی کیفیت کچھ اس انداز میں پیش کی ہے۔ کہ اس میں جذبات و احساسات کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ دو غزلوں کے چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

از جانِ من آرام رفت آرام جانِ من کجاست
ہجرم نشانِ فتنہ شد فتنہ نشانِ من کجاست

آمد بہار مشک دم سنبل دمید و لالہ ہم
سبزہ بصحرا از قدم سرو روانِ من کجاست

ہر دم جگر در سوز و تاب از دیدہ ریزم خونِ ناب
اینک می و اینک کباب آن میہمانِ من کجاست

گل نو رسید و بوی بہ بہار من نیامد　　چہ کنم نسیم گل را چو زیار من نیامد
دلِ من چرا چو غنچہ نہ شود دریدہ صد جا　　کہ صبا رسید و بوی ز بہار من نیامد
اگر ای حریف داری نظری بردی یاری　　تو بہار خویش خوش کن کہ بہار من نیامد

بشب نشاط یارا چہ خبر تر از خسرو   کہ بجانب تو روزی شب ما دمن نیاید

مستی و بیخودی کی واردات کتنی خوبی سے بیان کی ہیں۔

ساقیا می دہ کہ امروزم سر دیوانگی است   دور بر گرداں کہ مرگم از تہی پیمانگی ست

من برغبت جان دہم تو رحمت آری بر تنم   این عنایت در میان دوستان بیگانگی ست

شمع شیرینی چشیدست از بسوز دپاک نیست
لذت از آتش گرفتن مذہب پروانگی ست

تشبیہات کی جدت - امیر خسرو کی تشبیہات بالعموم تازہ اور طبعزاد ہوتی ہیں۔ کوئی غزل ایسی نہیں جس کی تشبیہوں میں یہ خصوصیت نہ ہو۔ تشبیہوں کے انتخاب میں ہندی ماحول سے بھی آپ کو بہت مدد ملی ہے۔ فارسی شاعری میں عموماً رفتار محبوب کو مور یا چکور کے خرام سے تشبیہ دی جاتی ہے، لیکن خسرو کو کبوتر کی مستانہ چال میں بھی وہی کیف و مستی نظر آتی ہے۔

خرام آن صنم نازنین بعیاری   کبوتری بخرام آمدہ است پنداری

محبوب کو عموماً ترک سے اور نگہ فتنہ ساماں کو تیغ خون آشام سے تشبیہ دیتے ہیں، لیکن خسرو محبوب کو ہندوے رہزن اور تیغ مژگاں کو کٹار سے تشبیہ دیتے ہیں۔

ہراں دو چشم گردم کہ چو ہندوان رہزن
ہمہ را بہ تیغ مژگاں بجگر زدہ کتارہ

تشبیہات کی چند اور مثالیں ذیل میں نقل کی جاتی ہیں۔

راز خون آلود خویش ای دل منہ با من برون
کین ورق خام است حرف از وی برون خواہد گذشت

اے دل تو اپنا خون آلود بھید مجھ سے نہ کہو۔ کیونکہ یہ تو ایک کاغذ ہے، اور کاغذ بھی خام۔ یہ تیرے بھید کا متحمل نہ ہو سکے گا۔ اس شعر میں اپنے پیکر جسمانی کو ورق خام

سے تشبیہہ دی ہے ؎

غلام نرگس مستم کہ بامداد و پگاہ — قدح بدست گرفتہ زخواب برخیزد

میں اُس نرگسِ مست کا غلام ہوں جو صبح سویرے قدح شراب ہاتھ میں لیے ہوئے خواب سے بیدار ہوتی ہے۔

محبوب کی چشم مست کو نرگس سے تشبیہہ دینا تو ایک مبتذل سی بات ہے، لیکن نرگس سے تشبیہہ دے کر یہ کہنا کہ یہ جام شراب ہاتھ میں لیے ہوئے خواب سے بیدار ہو رہی ہے کمال تشبیہہ ہے۔

منظر کشی - منظر کشی کے لیے ضروری ہے کہ شاعر کے دل کو فطرت کے حسن و جمال سے گہرا لگاؤ ہو، اور الفاظ و بیان پر پوری پوری قدرت ہو۔ یہ دونوں صفات امیر خسرو کے ہاں بدرجۂ کمال ہیں - مثنوی قران السعدین میں آپ کا فن منظر کشی انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ ساری مثنوی قلمی تصویروں سے منقش ہے۔ آپ کی عکاسی مختصر مگر جوش اور تاثیر سے بھرپور ہوتی ہے۔ یہاں آپ کی غزلیات سے دو ایک مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔

باد صبا چو از رخ او زلف در ربود — ابر سیہ کشادہ شد و آفتاب کرد

بادِ صبا کے جھونکے نے تمھارے چہرے سے زلف کو ہٹا دیا، تو گویا بادل چھٹ گیا اور دھوپ نکل آئی۔

خلقی براہ منتظر جان سپردہ اند — ای ترک نیم مست عناں را کشیدہ تر

اے ترکِ نیم مست ذرا باگ کو روک کر چلو - ایک دنیا جان نثار کرنے کے لیے منتظر کھڑی ہے

معاملہ بندی - عشق و ہوسناکی میں جو جو معاملات پیش آتے ہیں - ان کے بیان کو بقول مولانا شبلی نعمانی اہل لکھنؤ معاملہ بندی کہتے ہیں - مولانا آزاد معاملہ بندی کا موجد امیر خسرو کو سمجھتے ہیں - معاملہ بندی کی جو مثالیں انھوں نے دی ہیں، ذیل میں نقل کی جاتی ہیں -

خوشش آن زمان کہ بہ رویش نظر نہفتہ کنم

چو سوی من نگرد او نظر بگردانم

وہ کیسا ہی اچھا وقت ہوتا ہے جب میں دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھتا ہوں لیکن جب وہ میری طرف دیکھتا ہے، تو میں نظریں نیچی کر لیتا ہوں۔

چو رفتم بر درش بسیار، دربان گفت ای مسکین

گرفتار است شاید کین طرف بسیار می آید

معاملہ بندی کی ایک عمدہ مثال ذیل کا شعر ہے۔

جانا! اگر نسبت دہن بر دہن نہم

خود را جواب سازد و گوئیں دہان کیست

موسیقی۔ امیر خسرو موسیقی کے ماہر تھے، اس لیے جہاں ان کی توجہ حسن کلام پر تھی، وہاں حسن صوت پر بھی تھی۔ چنانچہ انھوں نے شعوری اور غیر شعوری طور پر بھی کوشش کی ہے کہ شعر میں زیادہ سے زیادہ ترنم و نغمہ پیدا کیا جائے۔ یہ اسی کا اثر ہے کہ سرود نغمہ کی صدائیں ان کے الفاظ میں سمائی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ ایسے متناسب اور ہم آہنگ الفاظ لاتے ہیں کہ شاعری موسیقی کا قالب اختیار کر لیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طاؤس و رباب کی سریں ہیں کہ مصرعوں میں ڈھل گئی ہیں۔ چند مثالیں حسب ذیل ہیں۔

از پی جاناں جان ہم رفت، جان ہم رفت

جان ہم رفت این ہم رفت، آن ہم رفت

آنہم رفت اینہم، آنہم، آنہم رفت، جان ہم رفت : الخ

صرف لفظوں ہی میں ترنم نہیں، بلکہ یہ مصرعے مجسم نغمہ ہیں۔ انہیں تحت اللفظ بھی پڑھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی موسیقار دھن الاپ رہا ہے۔ ذیل کا شعر دیکھیے۔

دہل زن دہل زد بہ تحسین او   کہ دین دین او دین او دین او

ایک بامعنی خیال کو صدائے دل میں ادا کیا ہے اور مال سُر کے اہتمام کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ یہ شعر گویا موسیقی کی لہر ہے، جو اٹھتی اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔

ذیل کے اشعار بھی صدا بندی کا عمدہ نمونہ ہیں۔

گنج بر و رنج دلی گنج سنج — در کشش گنج ہمی برد رنج
باش بکامم کہ بکام توام — زندہ و نازندہ بنام توام

علامہ شبلی کا خیال ہے کہ امیر خسرو کی چھوٹی بحر والی غزلوں میں موسیقی کا لطف زیادہ ہے۔ اور طویل بحر والی غزلوں میں کم، لیکن میرا خیال ہے کہ طویل بحر کی غزلوں میں زیر و بم کی زیادہ گنجائش ہے۔ مثال کے طور پر ایک غزل کے اشعار درج ذیل ہیں

نمی دانم چہ منزل بود شب جائیکہ من بودم — بہر سو رقص بسمل بود شب جائیکہ من بودم
پری پیکر نگاری سرو قدی لالہ رخسارے — سراپا آفت دل بود شب جائیکہ من بودم
رقیبان گوش بر آواز و او در ناز و من ترسان — سخن گفتن چہ مشکل بود شب جائیکہ من بودم

ان اشعار میں ن، م، ر، س، ش کی تکرار نے موسیقی کی شان پیدا کر دی ہے۔

مضمون آفرینی

مضمون آفرینی جو سبک ہندی کی خصوصیت ہے، کمال اسماعیل کی ایجاد ہے۔ لیکن کمال کی مضمون آفرینی قصائد تک محدود رہی۔ غزل میں مضمون آفرینی کا موجد امیر خسرو ہے۔ مضمون آفرینی کی چند مثالیں حسب ذیل ہیں۔

زہی عمر دراز عاشقان گر — شب ہجران حساب عمر گیرند

اگر ہجر و فراق کی رات کو بھی عاشقوں کی عمر میں شامل کر لیا جائے، تو ان کی عمر بہت ہی دراز ہوتی ہے۔

غالبؔ نے یہی مضمون اس طرح باندھا ہے۔

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں — شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

محبوبہ کی زلف پر شکن کو دیکھ کر یہ مضمون پیدا کیا ہے۔

زلفت سر و پا شکستہ زان است　　کز سرو بلندت اوفتاد است

ایک دنیا محبوب کی تیغ ناز کی کشتہ ہے۔ لیکن امیر خسروؔ نے اُسے انوکھے انداز میں پیش کیا ہے

کسی نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی　　مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

اب دنیا میں کوئی نہیں جو کشتہ تیغ ناز نہ ہوا ہو۔ اب تمہاری مشق ستم کی صرف یہی صورت ہے کہ کشتگان تیغ کو پھر سے زندہ کرو اور پھر انھیں تیغ ناز سے ہلاک کرو۔

امیر خسرو کے کلام میں تصوّف۔ امیر خسرو نے اپنے کلام کے ذریعے تصوف کا ہمہ گیر اور آفاقی پیغام دیا ہے۔ یہ پیغام ان تعلقات کا نتیجہ ہے، جو حضرت نظام الدین اولیا اور امیر خسرو کے مابین پیری اور مریدی کی صورت میں قائم تھے۔ ہر ولی اللہ کے طریق کار کا کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے، چنانچہ جس قدر اولیا گزرے ہیں، انھوں نے کسی نہ کسی عقیدے کی تبلیغ کی ہے۔ حضرت نظام الدینؒ کے پیش نظر بھی ایک مقصد تھا، وہ چاہتے تھے، لوگوں کے دلوں کو مخاطب کرکے، انھیں سیدھے سادے تصوف سے آشنا کریں، جس میں کسی قسم کی گہرائی اور پیچیدگی نہ ہو۔ مگر دقت یہ تھی کہ ان کا حلقہ اثر کچھ محدود تھا۔ انھیں خانقاہ سے نکلنے کے بہت کم مواقع میسّر آتے تھے، چنانچہ اس کام کے لیے انھیں ایسے نقیب کی ضرورت تھی، جو معاشرے کے مختلف طبقوں تک ان کا پیغام پہنچا سکے۔ حسن اتفاق سے امیر خسرو اُن کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ انھوں نے اپنے مرشد کی زبان بن کر صوفیانہ عقائد کی تبلیغ بالکل اسی طرح کی جیسے کہ سرسید کے خیالات کی تبلیغ ایک مخصوص رنگ میں حالیؔ نے کی تھی۔

امیر خسروؔ لوگوں کو تصوف کی سادہ تعلیم سے روشناس کرانا چاہتے تھے، اس لیے اُنھوں نے پیچیدہ ترکیبوں اور دقیق اصطلاحوں سے گریز کیا اور تصوف کی تعلیم کو سادہ،

سلیس اور عام فہم بنا دیا۔

امیر خسروؔ کی غزل میں عشق مجازی کا جو غلبہ نظر آتا ہے، اس کی ایک وجہ تو یہی مسلک تصوف کی سادگی ہے، اور دوسری یہ کہ عشقِ مجازی چونکہ افراد میں مشترک ہے، اور اس کے واردات عموماً سب پر گزرتے ہیں۔ اس لیے اس کے باریک سے باریک نکتوں کو سمجھنے میں بھی قارئین کو دشواری پیش نہیں آتی۔ تیسری وجہ یہ بھی ہے کہ حضرت نظام الدین رح اولیا، ہندوستان کی غیر مسلم آبادی کو رجوع الی اللہ کرنا چاہتے تھے، جو مجاز پرستی کی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ اور جس کے ہر ہر گوشۂ دماغ میں ہزاروں صنم خانے آباد تھے، اس لیے صوفیانہ عقائد کی تبلیغ کا بہتر ذریعہ یہی تھا، کہ عشقِ مجازی کی ترجمانی کی جاتی۔ آپ کی اکثر غزلوں میں عشقِ مجازی کا رنگ جھلکتا ہے، طوالت کے خوف سے ایک غزل کے صرف چند شعر پیش کیے جاتے ہیں ؎

خبرم شد است کامشب بریار خواہی آمد
سر من فدای راہی کہ سوار خواہی آمد

بلب آمدست جانم تو بیا کہ زندہ مانم
پس ازان کہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد

منم آہوی رمیدہ ز خدنگ خوبرویان
بہوس بمیرم از تو بشکار خواہی آمد

ہمہ غصۂ فراقت بکشم چنانکہ دانی
اگرم زبخت روزی بکنار خواہی آمد

می تست خوردہ خلقی ہمہ روزئ دمادم
بخور این قدح کہ فردا بخمار خواہی آمد

بیک آمدن ببروی دل و جان حسد جو خسروؔ

کہ زید اگر بدبینساں دو سہ بار خواہی آمد

غزل میں تسلسل۔ غزل دلی جذبات کے اظہار کا نام ہے، چنانچہ غزل میں عموماً مختلف قسم کے جذبات پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن عاشق کی باتیں کبھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں، اور کبھی ان میں تسلسل پایا جاتا ہے۔ اس لیے غزلوں کے اشعار مختلف بھی ہوتے ہیں اور متواتر بھی۔ امیر خسرو کی بعض غزلیں مسلسل ہیں۔ کسی ایک کیفیت میں اتنی شدت اور ہمہ گیری ہوتی ہے کہ اس کے اثر میں پوری غزل لکھ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک غزل پیش کی جاتی ہے۔

ای چہرۂ زیبای تو رشک بتان آذری
ہر چند توصفت می‌کنم در حسن ازان زیبا تری

ہرگز نیاید در نظر نقشی ز رویت خوبتر
شمشی ندانم یا قمر حوری ندانم یا پری

آفاق ہا گردیدہ ام مہر بتان ورزیدہ ام
بسیار خوبان دیدہ ام لیکن تو چیزی دیگری

عالم ہمہ یغمای تو، خلق خدا شیدای تو
آن نرگس شہلای تو آوردہ رسم کافری

ای راحت و آرام جان باقد چون سرو روان
زینسان مرو دامن کشان کآرام جانم میبری

خسرو غریب است و گدا افتادہ در شہر شما
باشد کہ از بہر خدا سوی غریبان بنگری

غزل کا ہر شعر مضمون کے لحاظ سے مکمل بھی ہے، اور دوسرے اشعار سے مربوط بھی ہے۔ اس طرح تمام اشعار گویا وحدت اثر کا موثر اور جامع نمونہ بن گئے ہیں۔

ہندی ماحول کا اثر۔ آپ کے اسلوب بیان پر ہندی ماحول کا اثر بھی معلوم ہوتا ہے۔ ہندی ماحول کے زیر اثر انھوں نے فارسی الفاظ کو اتنی موزونیت کے ساتھ استعمال کیا ہے کہ وہ فارسی زبان کا جزو معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً

دوزند قبا بہر قدت از گل سوسی ۔۔۔ تا خلعت زیبای تو از لتہ نباشد

سر آن دو چشم گردم کہ چو ہندوان رہزن ۔۔۔ ہمہ را بہ تیغ مژگان زدہ بر جگر کتارہ"

مقبولیت

شعر و فکر میں آپ کو اتنا بلند مقام حاصل ہے کہ اکثر شعراء نے آپ کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ حافظ شیرازی آپ کے بہت معتقد تھے۔ چنانچہ اپنی عقیدت اس طرح ظاہر کی کہ خسرو کی منتخب غزلیات کا ایک قلمی نسخہ تیار کیا جو آج کل تاشقند کی لائبریری میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ حافظ نے غیاث الدین حاکم بنگالہ کو جو غزل بھیجی تھی، اس کے ایک شعر میں امیر خسرو کی طرف اشارہ کیا ہے۔

شکر شکن شوند ہمہ طوطیاں ہند ۔۔۔ این قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

عرفی لکھتا ہے ؎

بروح خسرو از این پارسی شکر دارم
کہ کام طوطی ہندوستان شود شیرین

غالب یوں اعتراف عقیدت کرتے ہیں ؎

غالب میرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو ۔۔۔ پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پاؤں

اردو کے ایک نقاد حامد حسن قادری لکھتے ہیں:۔

"ہندوستان[1] کے فارسی شاعروں میں حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۷۲۸ ھج

---

[1] نقد و نظر صفحہ ۱۴۸

مطابق ۱۳۲۴ع بالاتفاق بہترین شاعر ہیں۔ امیر خسرو کو چھ صدیوں سے زیادہ گزر گئی ہیں۔ ان چھ سو برس میں انسان کا علم شعر و ادب، ذہن و فکر کہاں سے کہاں پہنچ سکتا ہے، اور پہنچا ہے۔ ہندوستان میں کیسے کیسے شاعر ہوئے، لیکن کوئی ایک بھی امیر خسرو کا سا صاحبِ کمال نہ ہوا۔ ان کی غزلیں آج تک سلاست، لطف اور اثر میں منفرد ہیں۔ ان کی مثنویوں کا جواب تو ایران میں بھی بن نہ آیا۔"

خواجہ کرمانی (ولادت ۶۷۹ھ مطابق ۱۲۸۰ع) (وفات ۷۵۳ھ مطابق ۱۳۵۲ع)

خواجو کرمانی کے نام کے بارے میں تذکرہ نویسوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ دولت شاہ سمرقندی اور لطف علی بیگ آذر نے صرف اسے خواجو کرمانی لکھا ہے۔ مصنف میخانہ ملا عبد النبی نے اسے افضال الدین خواجو کے نام سے یاد کیا ہے۔ رضا قلی خان ہدایت نے مجمع الفصحا میں اس کا نام کمال الدین خواجو تحریر کیا ہے۔ پروفیسر براؤن اور ایران کے جدید نقاد سعید نفیسی نے ہدایت کی تائید میں اس کا پورا نام مع ولدیت کمال الدین ابو العطا محمود بن علی لکھا ہے۔ یہی نام صحیح سمجھنا چاہیے۔ جیسا کہ خود خواجو کے اشعار سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

کمال دین سپہر فضل خواجو | جہان علم و دریای معانی
پدر محمود کرد آن لحظہ نامم | ولیکن من نمی دانم کدامم
چو محمود از المعنی سرفرازم | غلام ہندی زلف ایازم

دولت شاہ نے خواجو کو "نخل بند شعرا" کے لقب سے نوازا ہے۔ غالباً یہ خواجو کے اشعار ذیل کی طرف اشارہ ہے۔

چراغ دل از دانش افروختم | بہ پیر خرد دانش آموختم
نی خامہ ام نخل بندی نمود | بہ نخل سخن سربلندی نمود

حالاتِ زندگی سالِ ولادت کے متعلق بھی تذکرہ نویس متفق نہیں۔ خواجو نے اپنی مثنوی "گل و نوروز" میں اپنی تاریخ ولادت ۲۰ ذی الحج ۶۷۹ ھج مطابق ۱۲۸۰ء لکھی ہے، اس لیے یہی تاریخ صحیح سمجھنی چاہیے۔

خواجو ابھی عمر کے ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا، کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ باپ کی وفات کے بعد تنگ دستی اور افلاس سے سابقہ پڑا، جس نے عالمِ شباب میں اُسے بے چین رکھا۔ چنانچہ خواجو کا ذیل کا شعر پریشانی کا آئینہ دار ہے۔

ہرگز از روزِ جوانی نہ شدم یکدم شاد   مادرِ دھر ندانم بچہ می زاد مرا

خواجو کو عربی اور فارسی دونوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی، چنانچہ اُن کی غزلوں میں بعض اشعار ایسے بھی ملتے ہیں، جن کے دوسرے مصرعے عربی کے ہیں۔ حافظ شیرازی ایک حد تک خواجو سے متاثر تھے۔ اس لیے انھوں نے بھی بعض غزلیں خواجو کی تقلید میں لکھتے ہوئے کئی مصرعے عربی میں لکھے ہیں۔

خواجو نے قرآنِ پاک کا بہت گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا، چنانچہ اُن کے کلام میں اسلامی اصطلاحات اور قرآنی تلمیحات اکثر دیکھنے میں آتی ہیں مثلاً:-

دیوانیان عالم علوی بمشک ناب   واللیل بر حواشی دفتر نوشتہ اند

علومِ ظاہری کے ساتھ ساتھ خواجو نے علومِ باطنی کی تعلیم ایک برگزیدہ شیخ طریقت علاء الدولہ سمنانی سے حاصل کی تھی۔

کلامِ خواجو کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ موسیقی میں بھی اسے دسترس حاصل ہے۔ موسیقی کے مختلف پردوں، مقاموں اور دست گاہوں کے نام اسے یاد ہیں۔ اور وہ ان کے محلِ استعمال سے بھی آشنا ہے۔ ذیل کے اشعار سے اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے۔

گہی قول[۱]، مطرب ہمی کرد گوش   گہی بادہ لعل می کرد نوش

---

[۱] [۲] [۳] قول، عشاق، سپاہان اور عراق پردوں اور سروں کے نام ہیں غیاث اللغات صفحہ ۲۳۰۔ بہارِ عجم صفحہ ۱۹۶

خوشنوایان چمن در پردۂ عشاق تین — نوبت گوز بربانگ ہزار آواز دند

بشنو نوای عشاق از پردہ سپاہان — زان رو کہ عراق است آن لعبت عراقی

خواجو نے اپنے وطن میں گوناگوں فضائل حاصل کر لینے کے بعد سفر اختیار کیا مسافرت میں اسے قسم قسم کے انسانوں سے سابقہ پڑا، چنانچہ وہ خود کہتا ہے ؎

من کہ گل از باغ فلک چیدہ ام — چار حد ملک و ملک دیدہ ام

سیر و سیاحت کے دوران میں ان کی ملاقات علاء الدولہ سمنانی سے ہوئی جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے، ان سے کسب فیض کیا۔ ان کی شان میں ذیل کی رباعی کہی ؎

ہر کو بہ رہ علی عمرانی شد — چون خضر بسر چشمۂ حیوانی شد

از وسوسہ و غارت شیطان وا رست — مانند علاء الدولہ سمنانی شد

خواجو نے زندگی کا بیشتر حصہ بغداد اور شیراز میں بسر کیا۔ بغداد میں سلطان ابو سعید (۷۱۶ تا ۷۳۶ ہجم) مطابق (۱۳۱۶ تا ۱۳۳۵ ع) کی حکومت تھی، اور غیاث الدین محمد اس کا وزیر تھا۔ ان کی شان میں خواجو نے قصائد بھی کہے ہیں۔ خواجو کو مسافرت میں جب شیراز آنے کا اتفاق ہوا، تو قیام شیراز کے دوران حافظ شیرازی سے بھی ملاقات ہوئی۔ شیراز میں حافظ شیرازی کے محسن اور مربی ابو اسحق اینجو کی حکومت تھی جس کی خواجو نے مدحت سرائی بھی کی۔ ابو اسحق اینجو کا وزیر شمس الدین محمود صاین تھا، جو بہت سخن شناس اور شعرا کا مربی تھا۔ چنانچہ اس کی مدح میں بھی قصائد کہے۔

تصنیفات

خواجو نے ایک دیوان اور پانچ مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں۔ دیوان غزلیات، قصائد، قطعات اور رباعیات وغیرہ پر مشتمل ہے۔ مثنویاں نظامی گنجوی کی تقلید میں لکھی گئی ہیں۔ جن کا مختصر سا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

۱۔ ہماد ہمایوں۔ ہما اور ہمایوں کی یہ ایک عشقیہ داستان ہے، جس کا پس منظر تاریخی ہے، مقدمے میں سلطان ابوسعید اور اس کے وزیر غیاث الدین کی مدح بھی کی ہے۔ اس مثنوی میں فردوسی اور نظامی کا اثر نمایاں ہے۔

۲۔ گل نوروز۔ یہ بھی ایک عشقیہ داستان ہے جو تاج الدین عراقی کے نام منسوب ہے۔ اس کی بحر وہی ہے، جو نظامی کی "خسرو شیریں" کی ہے۔ روانی اور شیرینی کے اعتبار سے یہ مثنوی خواجو کا شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ اس کا سالِ تکمیل ۷۴۲ھ مطابق ۱۳۴۱ء ہے، جیسا کہ وہ خود کہتا ہے ؎

دو شش بر ہفت صد و سی گشتہ افزون   بپایان آمد این نظم ہمایون

۳۔ روضۃ الانوار۔ یہ مثنوی نظامی کی مثنوی "مخزن الاسرار" کی تقلید میں لکھی گئی ہے اور ابو اسحٰق انجو کے وزیر شمس الدین محمود صاین کے نام منسوب ہے۔ سالِ تالیف ۷۴۳ھ مطابق ۱۳۴۲ء ہے۔

۴۔ کمال نامہ۔ اس مثنوی کا موضوع تصوف و عرفان ہے۔ یہ "ہفت پیکر" کی بحر میں لکھی گئی ہے اور شیخ ابو اسحٰق انجو کے نام منسوب ہے۔ اس کا سالِ تکمیل ۷۴۴ھ مطابق ۱۳۴۳ء ہے جیسا کہ وہ خود کہتا ہے ؎

شد بتاریخ ہفت صد چل و چار   کار این نقش آذری چو نگار

۵۔ گوہر نامہ۔ اخلاق و تصوف کے بیان میں ہے۔ یہ "خسرو شیریں" کی بحر میں لکھی گئی ہے۔

ان کے علاوہ کہا جاتا ہے، خواجو نے شاہنامہ فردوسی کی تقلید میں ایک تاریخی مثنوی "شاہنامہ" کے عنوان سے لکھی، اور نثر میں چند رسائل بھی تصنیف کیے۔ ان کے متعلق کوئی مستند شہادت نہیں ملتی، اس لیے ہم انھیں نظر انداز کرتے ہیں۔

طرزِ سخن خواجو — خواجو نے مثنوی، قصیدہ، غزل غرض کہ تمام اصنافِ سخن

میں طبع آزمائی کی۔ مثنوی میں جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، خواجو نے نظامی گنجوی کی پیروی کی۔ اور قصیدے خاقانی، انوری اور ظہیر فاریابی کی تقلید میں لکھے۔

خاقانی اور خواجو کے مطلعے حسبِ ذیل ہیں۔

خاقانی
صبحدم چو کلہ بندد آہ دود آسای من
چون شفق در خون نشیند چشم شب پیمای من

خواجو
دوش چون در جنبش آمد قلزم سودای من
موج خون بر اوج زد چشم محیط آسای من

قصیدہ اور مثنوی میں خواجو تقلید کے روایتی حلقے سے باہر نہ نکل سکا، اس لیے اپنے فن کے اظہار کے لیے اس نے غزل کو ذریعہ بنایا۔

غزل گوئی ۔ سعدی کی کوششوں سے غزل وجود میں آچکی تھی۔ غزل میں جذبات کی شدت اور گہرائی تو تھی، لیکن اس میں فکر کی کمی تھی۔ غزل میں جذبہ کے ساتھ ساتھ فکر کو نمایاں مقام دینے والا شاعر خواجو ہے۔ خواجو کے ذہن کی افتاد فلسفیانہ تھی، چنانچہ اس نے فکر اور جذبہ کو سمو کر غزل میں جدت پیدا کی، یہی فکر اور جذبہ کا امتزاج ہے، جس پر حافظ نے اپنی شاعری کی بنیاد قائم کی، چنانچہ حافظ خود اس بات کا معترف ہے۔

استادِ غزل سعدی ست پیش ہمہ کس اما
دارد سخن حافظ طرز روش خواجو

ذیل کی غزل میں جہاں فکر اور جذبہ کی ہم آہنگی نظر آئے گی، وہاں یہ پتا بھی چلے گا کہ وہ پتا بھی چلے گا کہ وہ حافظ شیرازی کا پیش رو بھی ہے۔

پیش صاحب نظران ملک سلیمان باد است
بلکہ آنست سلیمان کہ ز ملک آزاد است

آنکہ گویند کہ برآب نہاد است جہان
مشنو ای خواجہ کہ تا در نگری برباد است

ہمچو نرگس بگشا چشم و ببین کاندر خاک
چند روی چو گل و قامت چون شمشاد است

خیمهٔ انس مزن بر در این کہنہ رباط
کہ اساسش ہمہ بی موقع و بی بنیاد است

خواجو نے فقر و عرفان کو بھی غزل کا موضوع بنایا۔ ذیل کی غزل میں حکیم سنائی، شیخ عطار اور مولانائے روم کا سا فکر و ذکر جھلکتا نظر آتا ہے۔

بانوای خویش را در بی نوائی یافتیم	فخر بر شاہان عالم در گدائی یافتیم
ز آشنا بیگانہ گشتیم از جہان و جان عیل	در جوار قرب جانان آشنائی یافتیم
سالہا بانگ گدائی بر در دلہا زدم	لاجرم بر بادشاہان بادشاہی یافتیم
ای بسا شب کاندرین وادی بروز آوردہ دلم	تاکنون از صبح وصلش روشنائی یافتیم
چونکہ در آن ظلمت این خاکدان بیرون شدیم	ہر دو عالم روشن از نور خدائی یافتیم

غزلیات خواجو کی زبان ۔ خواجو کی غزلیات کی زبان میں وہ لطافت نہیں، جو سعدی اور حافظ کی غزلیات میں ہے۔ اس کی غالباً وجہ یہ ہے کہ خواجو شیراز سے بہت دور کرمان کا رہنے والا تھا، جہاں کی بولی ٹکسالی نہیں سمجھی جاتی تھی، فصاحت زبان شیراز کا خاصہ تھا، جو اہل شیراز ہی کے حصے میں آئی تھی۔ اس جغرافیائی بُعد کی وجہ سے خواجو زبان کی لطافت اور فصاحت سے محروم رہا۔

خواجو کی اس کمزوری سے حافظ شیرازی آگاہ تھے، چنانچہ انھوں نے فکر و جذبہ میں بھی گہرائی پیدا کی اور ساتھ ہی بیان و اظہار کے لیے زبان ایسی لطیف، شیریں اور فصیح اختیار کی کہ خواجو کو انھوں نے بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ اشعار ذیل کے تقابل سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔

میں طبع آزمائی کی۔ تمنوی میں جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، خواجو نے نظامی گنجوی کی پیروی کی۔ اور قصیدے خاقانی، انوری اور ظہیر فاریابی کی تقلید میں لکھے۔

خاقانی اور خواجو کے مطلعے حسب ذیل ہیں۔

خاقانی
صبحدم چو کلہ بندد آہ دود آسای من
چون شفق در خون نشیند چشم شب پیمای من

خواجو
دوش چون در جنبش آمد قلزم سودای من
موج خون بر اوج زد چشم محیط آسای من

قصیدہ اور تمنوی میں خواجو تقلید کے روایتی حلقے سے باہر نہ نکل سکا، اس لیے اپنے فن کے اظہار کے لیے اس نے غزل کو ذریعہ بنایا۔

غزل گوئی ۔ سعدی کی کوششوں سے غزل وجود میں آچکی تھی۔ غزل میں جذبات کی شدت اور گہرائی تو تھی، لیکن اس میں فکر کی کمی تھی۔ غزل میں جذبہ کے ساتھ ساتھ فکر کو نمایاں مقام دینے والا شاعر خواجو ہے۔ خواجو کے ذہن کی افتاد فلسفیانہ تھی، چنانچہ اس نے فکر اور جذبہ کو سمو کر غزل میں جدت پیدا کی، یہی فکر اور جذبہ کا امتزاج ہے جس پر حافظ نے اپنی شاعری کی بنیاد قائم کی، چنانچہ حافظ خود اس بات کا معترف ہے۔

استاد غزل سعدی است پیش ہمہ کس اما
دارد سخن حافظ طرز روش خواجو

ذیل کی غزل میں جہاں فکر اور جذبہ کی ہم آہنگی نظر آئے گی، وہاں یہ پتا بھی چلے گا کہ وہ حافظ شیرازی کا پیش رو بھی ہے۔

پیش صاحب نظران ملک سلیمان باد است
بلکہ آنست سلیمان کہ ز ملک آزاد است

آنکہ گویند کہ بر آب نہاد است جہان
مشنو ای خواجہ کہ تا در نگری برباد است

ہمچو نرگس بگشا چشم و ببین کاندر خاک
چند روی چو گل و قامت چون شمشاد است

خیمہ انس مزن بر در این کہنہ رباط
کہ اساسش ہمہ بی موقع و بی بنیاد است

خواجو نے فقر و عرفان کو بھی غزل کا موضوع بنایا۔ ذیل کی غزل میں حکیم سنائی، شیخ عطار اور مولانائے روم کا سا فکر و ذکر جھلکتا نظر آتا ہے۔

بانوای خویش را در بی نوائی یافتیم	فخر بر شاہان عالم در گدائی یافتیم
ز آشنا بیگانہ گشتیم از جہان و جان علیل	در جوار قرب جانان آشنائی یافتیم
سالہا بانگ گدائی بر در دلہا زدم	لاجرم بر بادشاہان بادشاہی یافتیم
ای بسا شب کاندرین وادی بروز آوردہ ایم	تاکنون از صبح وصلش روشنائی یافتیم
چونکہ در آن ظلمت این خاکدان بیرون شدیم	ہر دو عالم روشن از نور خدائی یافتیم

غزلیات خواجو کی زبان ۔ خواجو کی غزلیات کی زبان میں وہ لطافت نہیں، جو سعدی اور حافظ کی غزلیات میں ہے۔ اس کی غالباً وجہ یہ ہے کہ خواجو شیراز سے بہت دور کرمان کا رہنے والا تھا، جہاں کی بولی ٹکسالی نہیں سمجھی جاتی تھی، فصاحت زبان شیراز کا خاصہ تھا جو اہل شیراز ہی کے حصے میں آئی تھی۔ اس جغرافیائی بُعد کی وجہ سے خواجو زبان کی لطافت اور فصاحت سے محروم رہا۔

خواجو کی اس کمزوری سے حافظ شیرازی آگاہ تھے، چنانچہ انھوں نے فکر و جذبہ میں بھی گہرائی پیدا کی اور ساتھ ہی بیان و اظہار کے لیے زبان ایسی لطیف، شیریں اور فصیح اختیار کی کہ خواجو کو انھوں نے بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ اشعار ذیل کے تقابل سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔

خواجو

گر شدیم از بادہ بدنام جہان تدبیر چیست
ہم چنین رفت است از روزِ ازل تقدیر ما

ما دلِ دیوانہ در زنجیر الفت بستہ ایم
ای بسا غافل کہ شد دیوانۂ زنجیر ما

از خدنگ آہ عالم سوز ما غافل مشو
کز کمان نرم زخمش سخت باشد تیر ما

حافظ

در خرابات مغان ما نیز ہمدستان شدیم
کاین چنین رفت است از روزِ ازل تقدیر ما

عقل اگر داند کہ دل دربند زلفش چون خوش است
عاقلان دیوانہ گردند از پی زنجیر ما

تیر آہ ما ز گردون بگذرد جانان خموش
رحم کن بر جان خود پرہیز کن از تیر ما

خواجو:

منزل از یار قرین است چہ دوزخ چہ بہشت
سجدۂ گریہ نیاز است چہ مسجد چہ کنشت

حافظ:

ہمہ کس طالب یارند چہ ہشیار و چہ مست
ہمہ جا خانۂ عشق است چہ مسجد چہ کنشت

خواجو:

دل درین پیرہ زن عشوہ گر دہر مبند
کہ عروس است کہ در عقد بسی داماد است

حافظ:

مجو درستی عہد از جہانِ سست نہاد
کہ این عجوز عروس ہزار داماد است

خواجو:

ہرگز از روز جوانی نشدم یکدم شاد
مادرِ دہر ندانم بچہ می زاد مرا

حافظ:

کوکب بخت مرا ہیچ منجم نشناخت
یارب از مادر گیتی بچہ طالع زادم

خواجو کی وفات کرمان میں ۷۵۲ھ مطابق ۱۳۵۲ء میں ہوئی۔

ابن یمین۔ (پیدائش ۶۸۵ھ۔ وفات ۷۶۹ھ)
(مطابق ۱۲۸۶ء تا ۱۳۹۷ء)

امیر فخر الدین محمود بن
یمین الدین طغرائی آٹھویں
صدی ہجری کے ایک

مشہور شاعر تھے ۔ آپ کے والد امیر یمین الدین بھی شعر کہتے تھے اور طغرائی تخلص کرتے تھے ۔

ابن یمین کے سوانح حیات قدیم وجدید تذکروں میں بہت کم ملتے ہیں ۔ مصنف تذکرۃ الشعرا لکھتا ہے کہ آپ کے والد امیر یمین الدین ترکی النسل تھے ۔ انھیں جوین کے علاقے کے قصبہ فریومد میں کچھ جاگیر ملی تھی ۔ جو ان کی گزراوقات کے لیے کافی تھی ۔ ابنِ یمین یہیں پیدا ہوئے ۔

ابنِ یمین کی شاعری کی شہرت اس وقت ہوئی ، جب ایران میں ملوک الطوائفی کا دور دورہ تھا ۔ تیموری حکمران سلطان ابوسعید فوت ہوا تو سربداروں نے خراسان میں اپنی حکومت قائم کرلی ۔ ہرات میں آل کرت کی حکومت تھی ۔ گرگان کا حکمران طغا تیموری تھا ۔ ان کے علاوہ کچھ اور امرا اور سرداروں کی بھی چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں یہ حکمران ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے تھے ۔ خراسان کا علاقہ خاص طور سے قتل وغارت کی آماجگاہ بنا ہوا تھا ۔ اسی سبب سے ابن یمین کو بھی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا ۔ کبھی انقلاب کا ریلا ایک دربار میں پہنچا دیتا ، کبھی کسی دوسرے دربار میں پناہ لینے پر مجبور ہوتے ۔ شروع شروع میں آپ نے خواجہ علاءالدین محمد کی مدح سرائی کی ، جو سلطان ابوسعید کے دربار میں مستوفی کے منصب پر فائز تھا ۔ علاءالدین سربداروں کے ہاتھوں قتل ہوا ، تو ابن یمین نے اس کے بھائی غیاث الدین کی قصیدہ خوانی کی ۔ خراسان میں سربداروں کی حکومت قائم ہوئی ۔ تو ابن یمین گرگان آگئے ۔ اور یہاں کے حکمران طغا تیمور کے قصیدے کہے ۔ اس کے بعد پھر خراسان واپس چلے گئے اور سربدار حکمران وجیہ الدین مسعود کی مدحت سرائی کی ۔ پھر آپ کو ہرات جانے کا اتفاق ہوا ۔ یہاں آل کرت کے امرا ، خصوصاً معزالدین کے قصیدے کہے اور بڑے بڑے صلے پائے ۔ اس عرصے میں آپ اپنے قصائد اور غزلیات کا دیوان مرتب کر چکے تھے ، لیکن ۷۴۳ ھج مطابق ۱۳۴۲ء میں ، جب وجیہ الدین اور ملک معزالدین کرت کے مابین جنگ چھڑی ۔ تو یہ

دیوان بھی اس کشمکش کی نذر ہوگیا۔ جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں ؎

گر بدستان بسِتد از دستم فلک دیوان من

شکر ایزد کانکہ او می ساخت دیوان با من است

در ربود از من زمانہ سلک در شاہوار

زآن چہ غم دارم چو طبع خاطر افشان با من است

ور ز شاخ گلبن فضلم گلی بر بود باد

گلشنی بر لالہ و نسرین و ریحان با من است

اسی بے چینی میں ابن یمین اسیر بھی ہوا، لیکن کچھ عرصے بعد اسے رہائی مل گئی۔ بقیہ زندگی اُس نے فریومد میں گزاری اور یہیں ۷۶۹ ھجری مطابق ۱۳۶۷ء میں وفات پائی۔ مصنف مجمل لکھتے ہیں کہ ابن یمین نے اپنی وفات سے پہلے ذیل کی رباعی کہی تھی۔

منگر کہ دل ابن یمین پر خون شد

بنگر کہ ازیں جہان فانی چون شد

مصحف بکف و چشم برہ روی بدست

با پیک اجل خندہ زنان بیرون شد

دیوان - آج کل جو قطعات کا دیوان ملتا ہے، اس میں اسیری کے بعد کا کلام ہے۔ سب سے پہلے ایک جرمن مستشرق اطراشیی سلحتا وسہر نے ان کے بعض قطعات مع ترجمہ شائع کیے۔ سنہ ۱۸۶۵ء میں اُن کے قطعات کا مجموعہ طبع ہوا۔ چند سال ہوئے، آقائے نفیسی نے ابن یمین کے قطعات کا مجموعہ چھپوایا ہے۔ یہ تین جلدوں میں ہے۔

شروع میں آپ نے بھی امرا کی قصیدہ خوانی کو اپنا شعار بنایا، لیکن اسیری کے بعد زاویۂ نگاہ بدل گیا اور قصیدہ خوانی چھوڑ کر پند و موعظت پر توجہ دی۔ دیوان

کے قطعات سے پتا چلتا ہے۔ کہ آپ قناعت پسند، پارسا اور گوشہ نشین بزرگ تھے۔
آپ کے دیوان میں پندرہ ہزار اشعار ہیں، ان میں تین ہزار اشعار کا موضوع اخلاق اور پند و موعظت ہے۔

افکار و مطالب

ابن یمین تلقین کرتے ہیں کہ انسان کو ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ اگر زمانہ آج موافق نہیں، تو کبھی موافق ہو جائے گا۔ اگرچہ ان کی نگاہ میں عجز و انکسار کی بڑی اہمیت ہے، لیکن اکثر وہ ہمت اور ارادے کو بلند رکھنے کی ہدایت کرتے ہیں۔

روزی دو گر بود بتو ایام بدکنش   هم عاقبت نکو شود از باشدت حیات
تا زنده ای مدار ز احداث دهر باک   بیرون ز مرگ سهل بود جمله حادثات

قناعت اور گوشہ نشینی کی ان کی نگاہ میں بڑی اہمیت ہے، ان کا خیال ہے کہ ان کی وجہ سے انسان تملق، خوشامد اور احسان اٹھانے سے بچ رہتا ہے۔

برای نعمت دنیا مکش مذمت خلق   که نزد اهل خرد زین سبب خسی باشی
ز خون دیده غذا گر کنی از آن خوشتر   که زیر منت احسان ناکسی باشی

زہد و تقویٰ و پارسائی یہ ہے کہ انسان مخلوق کو راحت پہنچانے کی کوشش کرے

راحت بندگان حق جستن   عین تقویٰ و زهد و دینداریست
گر در خلد را کلیدی هست   بیش بخشیدن و کم آزاریست

ابن یمین کا عقیدہ ہے کہ اطمینان قلب اور آسائش خاطر بہت بڑی نعمتیں ہیں۔ ان کے عوض اگر کیخسرو اور کیقباد کا تخت بھی ملے تو بے حقیقت ہے۔

دو قرص نان اگر از گندم است اگر از جو
دو تای جامه اگر کهنه است اگر از نو
چهار گوشهٔ دیوار خود بخاطر جمع
که کس نگوید ...

ہزار بار نکوتر بنزد ابن یمین
ز فر مملکت کیقباد و کیخسرو

ترک تکبر اور بے ثباتی دنیا پر کتنا موثر اور پُرجوش وعظ ہے جس نے اشعار کا قالب اختیار کیا ہے۔

باخبر باش کہ دنیا گزران است ایدل
خیز کین خوابگہ بی خبران است ایدل

ہر یک از برگ بنفشہ کہ دمد از دل خاک
خاک مشکین رخ سیم بران است ایدل

شاخ سنبل کہ سر از جیب زمین بردارد
جعد عنبر شکن خوش پسران است ایدل

وقت دریاب کہ بس کاسۂ سرہای ملوک
تفتہ در کارگہ کوزہ گران است ایدل

تہ تکبر مرد و شوخی و شنگی بگذار
کاین سر کوچۂ صاحب نظران است ایدل

در ہمہ کار پس و پیش نگہدار از آنک
خویش و بیگانہ زہر سو نگران است ایدل

بہ ہمہ خلق جہان خلق پسندیدہ نمای
کہ سوی خلد برین راہ بران است ایدل

گر بہ وفق مراد تو بود کار جہان
از جہان نیست نہ دور قمران است ایدل

روح کی نشو و نما کے متعلق لکھتے ہیں ۔

زدم از کتم عدم خیمہ بصحرائی وجود
از جمادی بہ نباتی سفری کردم رفت

بعد از نیم کشش طبع بحیوانی بود
چوں رسیدم بوی از وی گزری کردم و رفت

بعد ازیں در صدف سینۂ انسان بصفا
قطرۂ ہستی خود را گہری کردم و رفت

با ملائک پس از آن صومعۂ قدسی را
گرد برگشتم و نیکو نظری کردم و رفت

بعد ازاں رہ سوی او بردم و بی ابن یمین
ہمراو گشتم و ترک دگری کردم و رفت

اکثر اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے کمالات کے باوجود ناقدری کا شکار رہے۔ چنانچہ کوئی ذہین شخص جب مفلسی اور کس پرسی کی حالت میں زندگی گزارتا ہے تو انھیں دکھ ہوتا ہے۔ اور جب کسی جاہل کو محض خوشامد اور چاپلوسی سے کسی بلند مرتبے پر فائز دیکھتے ہیں تو ان کے رنج کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

باخرد گفتم ای مدبر کار! | کس بہ دانش چو تو نشان ندہند
چیست حکمت کہ از خزانۂ غیب | قوت یک شب بہ نیکوان ندہند
گنج ردان را دہند خرمن ہا | پر کاہی بہ راستان ندہند
ابلہان را دہند گنج گہر | با ہنر پیشہ نیم نان ندہند
سفلۂ صدر جاہل دانش را | بہ غلط رہ بہ آستان ندہند
عقل گفت این حدیث نشنیدی | ہر کرا این دہند آن ندہند

یہ رنج کچھ اور بڑھتا ہے، تو ان کی شکایت بھی تیز تر ہو جاتی ہے ؎

ای دوستان بکام دلم نیست روزگار — آری زمانہ دشمن اہل ہنر بود
سہلست اگر جفا کشم از دوری وفا — زجہت نصیب مردم والا گہر بود
بر آسمان ستارہ بود بیشمار لیک — رنج کسوف بر دل شمس و قمر بود
رسمیست در زمانہ کہ ہر کم بضاعتی — زاہل ہنر مرتبہ ہا بیشتر بود

دریا صفت کہ منصب خاشاک اندر و
بالائی عقد گوہر و سلک دُر ربود

آپ نے گوشہ نشینی کی حالت میں ۷۶۹ ھج مطابق ۱۳۶۷ء میں نجات پائی۔

عبید زاکانی (وفات ۷۷۲ ھج مطابق ۱۳۷۰ء)

عبید زاکانی ایران کا مشہور ترین ہزل گو اور طنز نگار تھا۔ اس فن کا مظاہرہ اس نے کچھ ایسی بیباکی سے کیا کہ سننے اور پڑھنے والے شرما جاتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے ایران کے کسی جدید تذکرہ نویس نے اس کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ پروفیسر براؤن[1] نے اس کے حالات بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔

عبید علاقہ قزوین کے قصبہ زاکان میں پیدا ہوا، لیکن اپنا وطن اسے سخت ناپسند تھا۔ اس لیے وطن کو خیرباد کہہ کر شیراز آگیا۔ یہاں اس وقت شیخ ابواسحٰق اینجو کی حکومت تھی۔ عبید نے شیراز میں رہ کر درسی علوم کی تعلیم حاصل کی اور اپنی فطری ذہانت کی بدولت بہت جلد مشہور ہو گیا۔ لیکن نہ کوئی اثاثہ پاس تھا نہ کوئی معقول ذریعہ معاش ہی تھا اسی لیے بہت پریشان حال رہا۔

عبید نے علم معانی و بیان پر ایک کتاب تالیف کی اور اُسے دربار شاہی میں رسائی پانے کا وسیلہ بنانا چاہا لیکن اس کی یہ کتاب دیکھ کر بادشاہ کے مصاحبوں نے کہا۔ بادشاہ کو اتنی فرصت

---

[1] دیکھیے لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد ص

نہیں کہ اس قسم کی بے معنی کتاب کا مطالعہ کرے۔ دوسری مرتبہ عبید بادشاہ کا ایک قصیدہ لکھ کر لے گیا، لیکن مقربین نے، جو دربارِ شاہی کے مسخرے تھے، یہ کہہ کر اُسے لوٹا دیا کہ بادشاہ شاعروں کے جھوٹ اور مبالغوں کو پسند نہیں کرتا۔ عبید پریشان حال تو تھا ہی، یہ سن کر اور بھی مایوس ہوا اور خیال کیا، جب بادشاہوں کے درباروں میں علم و فضل کی یہ ناقدری ہے، تو پھر راتوں کو جاگنے اور خونِ جگر پینے سے کیا حاصل! وہاں سے ناامید ہو کر لوٹ آیا۔

طنز نگاری

اب اُس کی فطری ذہانت نے ایک اور رُخ بدلا اور اس نے ہزل گوئی کی طرف رجوع کیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس کی ہجوؤں کا چرچا طول و عرض ملک میں ہونے لگا۔ امراء و رؤسا اکثر اس کی ہجوؤں سے خائف رہتے۔ اور اس کا منہ بند کرنے کے لیے تحفے تحائف بھی بھیجتے تھے۔ کسی نے عبید سے کہا علم و فضل کو خیرباد کہہ کر ہجوگوئی اختیار کرنا، آپ کو زیب نہیں دیتا۔ عبید نے جواب میں فی البدیہہ یہ قطعہ کہا ؎

ای خواجہ مکن تا بتوانی طلب علم ۔۔۔ کاندر طلب راتب ہر روزہ بمانی
رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز ۔۔۔ تا داد خود از کہتر و مہتر بستانی

عبید کی ہجویں دفعتہً آگ کی طرح پھیل جاتی تھیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔ کہ خواجہ سلمان ساوجی نے عبید کی ہجوؤں کا ذکر سنا، تو ذیل کے اشعار اس کی ہجو میں کہے ؎

جہنمی ہجاگو عبید زاکانی ۔۔۔ مقرر است بہ بیدولتی و بیدینی
اگرچہ نیست ز قزوین و روستازادہ است ۔۔۔ ولیک می شود اندر حدیث قزوینی[1]

سلمان کا یہ قطعہ عبید نے سنا، تو شیراز سے چل کر بغداد آیا۔ اتفاق سے سلمان

---

[1] قزوینی اصطلاح میں افترا پرداز کو کہتے ہیں۔

دجلہ کے کنارے امراء اور شعراء کی محفل میں بیٹھا تھا۔ عبید آگے بڑھ کر آداب بجا لایا۔ سلمان نے پوچھا، تم کون ہو اور وطن کہاں ہے؟ عبید نے جواب دیا۔ ایک مسکین شخص ہوں اور قزوین کا رہنے والا ہوں۔ سلمان نے پوچھا "وہاں کوئی سلمان کو بھی جانتا ہے۔" عبید نے جواب دیا "بے شک" سلمان کہنے لگا "اگر اس کا کوئی شعر یاد ہو تو سناؤ۔" عبید نے دو بیت پڑھے۔

من خراباتیم و بادہ پرست	در خرابات مغان عاشق و مست
می کشندم چو سبو دوش بدوش	می برندم چو قدح دست بدست

پھر کہا۔ یہ شعر مشہور تو سلمان ہی کے نام سے ہیں، لیکن سلمان تو عالم شخص ہے، وہ ایسے شعر کیسے کہہ سکتا ہے۔ یہ شعر اس کی بیوی نے اپنے حسب حال کہے ہوں گے۔ سلمان بھری محفل میں عبید کا یہ جواب سن کر سخت برافروختہ ہوا اور نادم بھی ہوا۔ قیاس سے پہچانا کہ یہ عبید زاکانی ہے۔ پوچھا کیا تم عبید ہو۔ اس نے کہا "ہاں" پھر اس نے سلمان سے گلہ کیا کہ تم نے ایک ایسے شخص کی ہجو کہی، جس کو تم نے کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔ میں اس ہجو کا جواب بادشاہ کی محفل میں دینا چاہتا تھا، لیکن تمہارا نصیبہ یاور تھا کہ دجلہ کے کنارے ہی ہاتھ آ گئے۔

شیخ ابو اسحٰق اینجو کے عہد میں ترک رؤسا ہر قسم کی بے قاعدگی اپنے لیے جائز سمجھتے تھے۔ ایرانی امراء کی حالت بھی نہایت پست تھی۔ عبید اس صورت حال سے سخت متاثر ہوا۔ چنانچہ طنز نگاری کو معاشرے کی اصلاح کا ذریعہ بنایا۔ اس کی بیشتر تصنیفات نظم و نثر اسی رنگ میں ہیں۔ ذیل کی چھ کتابیں عبید کی یادگار ہیں۔

اخلاق الاشرف ۔ نثر کی یہ کتاب ۷۵۰ ھ بمطابق ۱۳۴۹ء میں لکھی گئی۔ اس زمانے کے اخلاق و آداب پر یہ تلخ ترین طنز ہے، جو ایک دیباچہ اور سات مقالوں پر مشتمل ہے۔ ان مقالوں کے عنوان حسب ذیل ہیں، دانش، شجاعت، پاکدامنی، عدل،

سخاوت، نرم دلی اور حیا۔ ہر مقالے میں مصنف نے پہلے اخلاق کے متعلق لوگوں کا قدیم نظریہ بیان کیا ہے۔ پھر یہ بتایا ہے کہ اس فرسودہ نظریہ کو اب منسوخ سمجھنا چاہیئے۔ اصل اخلاق یہ ہے، جس سے آج کل کے امرا متصف ہیں۔ مثال کے طور پر شجاعت کے متعلق وہ یوں اظہار خیال کرتا ہے۔

"جب کسی کو خطرناک صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے یا وہ کسی دشمن سے لڑ رہا ہو، تو اس کے دو نتیجے ہوں گے، یا دشمن اس پر غالب آجائے گا اور اسے مار ڈالے گا۔ یا وہ خود دشمن پر غالب آ کر اسے ہلاک کر دے گا، لیکن اگر وہ اپنے دشمن کو قتل کرنے میں کامیاب ہو جائے، تو اس بے گناہ کا بوجھ اس کی گردن پر رہے گا۔ اور اگر دشمن اسے ہلاک کر دے تو ظاہر ہے کہ ہلاک کرنیوالا سیدھا دوزخ کو جائے گا۔ اس لیے عقلمند شخص ایسا کام ہی کیوں کرے، کہ اپنے فعل کی وجہ سے قیامت میں شرمسار ہو، یا جس کی وجہ سے کوئی دوسرا دوزخ میں جائے"!

پھر آگے چل کر اسی باب میں لکھتا ہے "کہیں کوئی شادی بیاہ ہو، رقص و سرود کی محفل گرم ہو، مرغ مسلم اور دوسرے لوازمات دسترخوان پر چنے ہوں۔ حاضرین زرق برق لباسوں میں ملبوس ہوں۔ حسین و جمیل محبوب دعوتِ نظارہ دے رہے ہوں۔ مسخرے اپنے فن سے محفل کو زعفران زار بنا دیں۔ مغنی اپنے سرود و نغمہ سے حاضرین کو مسحور کریں ـــــ اور پھر پاس ہی کہیں تیر و تبر، نیزہ اور سپر سلیقے سے چنے ہوں، تو کوئی احمق ہی ہوگا جو ان چیزوں کو مقدم الذکر چیزوں پر ترجیح دے اور اپنے جوانمرد اور تیغ کے دھنی ہونے پر ناز کرے۔

تیر و تبر و نیزہ نمی آرم خورد لوت و می و مطرب نکو می سازد

دوسرے مقالے بھی اسی انداز میں لکھے گئے ہیں۔

۲۔ ریش نامہ۔ نظم و نثر کی یہ ایک مخلوط کتاب ہے، جس میں عبید اور ڈاڑھی کے مابین ایک طویل اور دلچسپ مکالمہ لکھا گیا ہے۔

۳۔ **صد پند**۔ یہ کتاب ۷۵۰ھ مطابق ۱۳۴۹ء میں لکھی گئی ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ ایک سو نصیحتوں پر مشتمل ہے۔ دو ایک نصیحتیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

"آج کی خوشیوں کو کل پر مت ڈالو"

"موجودہ وقت میں لطف اٹھالو۔ یہ وقت لوٹ کر نہ آئے گا۔"

"حتی الوسع سچ بولنے سے پرہیز کرو۔ تاکہ دوسروں کے لیے وجہ پریشانی نہ بنو۔"

"پارسا اور پڑھے لکھے لوگوں کی باتوں کا یقین نہ کرو۔ کہیں ان کی وجہ سے گم راہ ہو کر سیدھے دوزخ میں نہ پہنچ جاؤ۔

۴۔ **تعارفات یا دہ فصل**۔ یہ کتاب نثر میں ہے۔ چند تعریفیں حسب ذیل ہیں۔

"جہان" وہ جگہ جہاں کسی کو سکون میسر نہیں۔

"عالم" وہ شخص، جسے روزی کمانے کا ڈھنگ نہ آئے۔

"جاہل" تقدیر کا چہیتا

"منصف" جسے سب لوگ بد دعا دیں۔

"وکیل" جو سچی بات کو جھوٹ کر دکھائے۔

۵۔ **رسالہ دلکشائی**۔ یہ چند ہزلیہ حکایات کا مجموعہ ہے۔

ایک شخص گدھے پر سوار ہے۔ راستے میں کوئی دوسرا گدھے سوار اُسے ملتا ہے، جس کا گدھا مریل سا ہے۔ اُس سے پوچھتا ہے: کہو کدھر کا ارادہ ہے؟ وہ جواب دیتا ہے۔ "جمعہ کی نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔"

"آج تو منگل کا دن ہے۔"

"منگل تو بے شک ہے، لیکن میں خوش قسمت ہوں گا کہ یہ گدھا مجھے جمعہ کو ہی مسجد تک پہنچا دے۔"

ان ہزلیہ اور طنزیہ تصنیفات کے علاوہ بعض سنجیدہ تصنیفات بھی اس کی یادگار ہیں۔

مثلاً "عشاق نامہ" اور "فال نامہ"

عبید نے شیخ ابو اسحٰق اینجو، سلطان اویس اور بعض دوسرے حکمرانوں کے قصیدے بھی کہے۔ کچھ غزلیات بھی لکھیں۔ نمونے کے طور پر ایک غزل پیش کی جاتی ہے۔

افتاد بازم در سر ہوائی | دل بازدارد میلی بجائی
او شہریاری من خاکساری | او بادشاہی من بی نوائی
بالا بلندی گیسو کمندی | سلطان حسینی فرمان روائی
ابرو کمانی نازک میانی | نامہربانی شنگی دغائی
زین دلنوازی زین سرفرازی | زین جو فروشی گندم نمائی
بی او نہ بخشد خورشید نوری | بی او ندارد عالم صفائی
ہر جای دارد دل با خیالش | خوش گفت و گوئی خوش ماجرائی
گوئی بیایم جای طبیبی | باشد کہ سازم دل را دوائی
دارد شکایت ہر کس ز دشمن | ما راشکایت از آشنائی
چشم عبید از سیرش نہ بیند | دیگر نہ بیند چشمش بلائی

"موش و گربہ" عبید زاکانی کی ایک مشہور و معروف نظم ہے۔ یہ مثنوی ذیل کے اشعار سے شروع ہوتی ہے۔

از قضائی فلک یکی گربہ | بود چون اژدہا بکرمانا
گربۂ دوربین و شیر شکار | کہربا چشم و تیز مژگانا
پائی کثردم عتاب پیشانی | بود پر مکر پر ز دستانا
شکمش طبل و سینہ اش قماقم | ابروش قوس و تیز دندانا

بلی کا سراپا بیان کرنے کے بعد چوہوں کا ایک وفد بلی کے پاس جاتا ہے اور التماس کرتا ہے کہ موش آزاری کی عادت کو ترک کر دے۔ بلی انھیں یقین دلاتی ہے کہ

وہ اب تائب ہو چکی ہے اور اس نے خدا سے لو لگالی ہے۔ ایک چوہا اسی خوشی میں پکار اٹھتا ہے ؎

مژدگانی کہ گربہ عابد شد زاہد و مومن و مسلمانا

یہ سمجھ کر کہ بلی اب توبہ کر چکی ہے، وہ اس کے پاس جاتے ہیں، بلی اپنی فطرت کے موافق ان چوہوں پر حملہ کرتی ہے۔

ناگہاں جست و موش ہا بگرفت گفت موشک کجا بری جانا

ذیل کے شعر پر یہ مثنوی ختم ہو جاتی ہے ؎

ہست ایں قصۂ عجیب و غریب یادگار عبید زاکانا

اشعار ذیل سے پتا چلتا ہے کہ عبید کو عافیت نصیب نہ ہو سکی۔ قرض اور مفلسی سے اس کا زندگی بھر ساتھ رہا ؎

مردم بہ عیش خوش دل و من مبتلائی قرض
ہر کس بکار و باری و من در بلائی قرض

قرض خدا و قرض خلائق بہ گردنم
آیا ادای فرض کنم یا ادائی قرض

انہی پریشانیوں میں عبید نے ۷۷۲ھ مطابق ۱۳۷۰ء میں وفات پائی۔

خاندانِ جوینی

خاندانِ جوینی کی مقبولیت تاتاری عہد میں جن لوگوں نے ملکی امور چلانے میں مدد دی، ان میں قصبہ جوین کے ایک علمی خاندان کا بہت بڑا حصہ ہے، جو تاریخ میں خاندان جوینی کے نام سے موسوم ہے اس خاندان کے ایک عالم شمس الدین بزرگ کو قطب الدین خوارزم شاہ نے وزارت کا منصب جلیلہ

سونپیا۔ شمس الدین بزرگ کا بیٹا بہاء الدین جوینی بھی ایک فاضل شخص تھا، جسے دربار خوارزم میں مستوفی الممالک کے عہدے پر مامور کیا گیا۔ بہاء الدین کے دو بیٹے شمس الدین اور عطا ملک جوینی وہ نامور ہستیاں ہیں، جنھوں نے نہ صرف اپنے سیاسی شعور اور تدبر سے ایران کے ویرانوں کو آباد کیا، بلکہ علم و ادب کی بھی سرپرستی کی۔ ہلاکو کی دس سال کی حکومت میں وزارت کی باگ ڈور شمس الدین کے ہاتھوں میں رہی، چنانچہ اسی وزارت کی نسبت سے وہ "صاحب دیوان" کے لقب سے مشہور ہوا۔ ہلاکو کی وفات پر جب اباقا خان تخت نشین ہوا۔ تو اُس نے بھی وزارت کا منصب شمس الدین ہی کے سپرد کیا۔ شمس الدین بہت فیاض اور علم پرور شخص تھا، چنانچہ علماء اور شعراء اس کے دربار میں کھنچے چلے آتے تھے۔

عطا ملک جوینی تاتاری حکمرانوں کا دبیر تھا۔ اسی منصب کی بدولت اسے کئی مرتبہ تاتاریوں کے صدر مقام قراقرم بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ ۶۵۴ھ مطابق ۱۲۵۶ء میں جب ہلاکو نے ایران فتح کیا اور منگو قاآن کی طرف سے ایران کی حکومت ہلاکو کو مل گئی، تو اس نے عطا ملک کو اپنے مقربین میں شامل کر لیا۔ اور بالآخر جب ہلاکو نے ۶۵۷ھ مطابق ۱۲۵۸ء میں بغداد فتح کر کے خلافت عباسیہ کا دور ختم کیا، تو وہاں کی حکومت عطا ملک کو سونپ دی گئی۔ عطا ملک کی حکومت میں اس وقت عراق، بغداد اور خوزستان کے علاقے شامل تھے۔ ہلاکو کی وفات پر بھی ان علاقوں کی حکومت اسی کے پاس رہی۔ اس کی حکومت کی مدت چوبیس سال ہے۔ اس عرصے میں اس نے ایک عظیم تاریخ تالیف کی جو "تاریخ جہانکشای جوینی" کے نام سے موسوم ہے۔ اُس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

شمس الدین کا بیٹا بہاء الدین بھی اپنے علم و فضل کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ اسے تاتاریوں کی طرف سے عراق عجم اور فارس کی حکومت دی گئی تھی۔

شمس الدین کا ایک اور بیٹا شرف الدین تھا، جو خود بھی شاعر تھا، اور شعراء کا مربی اور سرپرست بھی تھا۔

خاندانِ جوینی کی تباہی

جوینی خاندان علم و فضل کی سرپرستی، سخاوت، تدبر اور سیاسی شعور کے لحاظ سے برمکی خاندان کی یاد دلاتا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس خاندان کا انجام بھی برمکیوں کا سا ہوا۔

اس خاندان کی ناموری کی وجہ سے ان کے حاسد بھی پیدا ہو گئے، جو بالآخر اس خاندان کی تباہی کا باعث بنے۔ انہی میں ایک جاہ پسند اور فتنہ پرداز شخص مجد الملک تھا۔ اس نے اپنے خلوص اور دیانت کا سکہ جما کر شمس الدین کے دل میں جگہ پا لی۔ آخر شمس الدین کی سفارش پر اُسے منصبِ وزارت میں شریک کر لیا گیا۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ مجد الملک نے سازش کا دام بچھایا اور شکار کرنے کے لیے سب سے پہلے عطا ملک جوینی کو تاکا۔ اس نے شاہی خزانے میں غبن کے فرضی قصے بنا کر اباقا خان کے کان بھرنے شروع کیے۔ آخر اُسے یقین دلا دیا گیا کہ عطا ملک نے گراں قدر رقوم شاہی خزانہ سے حاصل کر لی ہیں چنانچہ اُسے اباقا خان کے حکم سے گرفتار کر کے، پابجولاں بغداد کے گلی کوچوں میں پھرایا، یہ وہی شہر ہے، جہاں وہ چوبیس سال تک بڑے جاہ و جلال سے حکومت کرتا رہا تھا۔ اباقا خان کا اچانک انتقال ہو گیا، ورنہ جانے عطا ملک کا کیا حشر ہوتا! اباقا خان کے جانشین احمد تکودار نے اُسے قید سے نکالا، لیکن عطا ملک اپنی تذلیل کے بعد زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکا۔ اس کا سن وفات ۶۸۱ ھج مطابق ۱۲۸۲ء ہے۔ احمد تکودار ۶۸۳ ھج مطابق ۱۲۸۴ء میں ناگہانی موت کا شکار ہوا، تو ارغون تخت نشین ہوا۔ مجد الملک نے اب ارغون کو یہ کہہ کر شمس الدین پر بھرپور وار کیا کہ اباقا خان کی موت کا ذمے دار شمس الدین ہے، جس نے اسے زہر دلائی تھی۔ یہ سن کر ارغون کے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی، چنانچہ اس کے حکم سے شمس الدین صاحب دیوان کو ۶۸۳ ھج میں مروا دیا گیا۔ اس کی موت، وقت کا ایک بہت بڑا المیہ تھا، اس لیے ایران کے طول و عرض میں اس کا ماتم منایا گیا۔ مجد ہمگر نے اس کے ماتم میں ذیل کی پُرسوز رباعی کہی۔

از رفتن شمس از شفق خون بچکید — مہ روی بکند و زہرہ گیسو ببرید
شب جامہ سیہ کرد آن ماتم و صبح — برزد نفسی سرد و گریبان بدرید

ارغون کے انتقام کی آگ اسی پر ٹھنڈی نہ ہوئی، اس نے شمس الدین کے بیٹے بھی یکے بعد دیگرے موت کے گھاٹ اتروا دیے اور اس طرح ایک جلیل القدر خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔

ایلخانی دور کی فارسی نثر

جیساکہ پہلے ذکر آچکا ہے، تاتاریوں نے ایران میں بڑی تباہی مچائی۔ اس زمانے میں یہ توقع رکھنا کہ ان خرابوں میں علم و ادب کے تازہ پھول کھلیں گے، محال بات تھی۔ تاتاریوں کی توجہ علم و ادب کی طرف تو کیا ہوتی، ہاں! انھیں یہ خیال ضرور تھا کہ ان کے عہدِ حکومت کے واقعات تاریخ میں محفوظ رہ جائیں، اس لیے مؤرخوں کی بڑی حوصلہ افزائی کی گئی۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس عہد میں فنِ تاریخ نویسی کو بہت ترقی ہوئی۔ ایران کی مشہور ترین تاریخیں اسی عہد میں لکھی گئیں۔ اگر تیموری دور کو اس میں شامل کر لیا جائے، تو کہا جاسکتا ہے کہ ایران میں، بلکہ سارے عالمِ اسلام میں اس زمانے کی تاریخوں سے بہتر تاریخیں نہیں لکھی گئیں۔ اس عہد کی مشہور ترین تاریخیں حسبِ ذیل ہیں۔

تاریخ جہانکشائے جوینی

یہ چنگیز خان اور اس کے جانشینوں کی اہم ترین تاریخ ہے، جس کا مؤلف علاء الدین عطا ملک جوینی ہے۔ یہ تاریخ تین جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد میں مغلوں کے عادات و اطوار، چنگیز خان اور اس کے جانشینوں کے حالات درج ہیں۔ دوسری جلد میں شاہان خوارزم کا ذکر ہے، تیسرا حصہ اسمٰعیلیوں کے حالات پر مشتمل ہے۔

اسلوب تحریر۔ فارسی کی قدیم نثر میں، جیساکہ پہلے ذکر آچکا ہے، بہت سادگی اور روانی ہے۔ الفاظ اور فقرات میں اختصار سے کام لیا جاتا ہے، لیکن ساتویں صدی ہجری میں قدیم نثر کی جگہ ایک ایسی نثر رائج ہوئی، جس میں صنائع بدائع کثرت سے استعمال

ہونے لگے۔ اختصار کی جگہ تفصیل نے لے لی۔ مرادف الفاظ کی بھرمار شروع ہوئی۔ اس قسم کی نثر "فنی نثر" کہلاتی ہے۔ تاریخ جہانگشائے جوینی اسی "فنی نثر" کا شاہکار ہے۔ اس میں سجع، تلمیح، تجنیس، اشتقاق، تضاد، ایسی بے شمار صنعتیں ملتی ہیں۔ عربی الفاظ کی کثرت ہے۔ مرادف الفاظ کی بھرمار ہے۔ ایک خیال جو صرف ایک فقرے میں ادا ہوسکتا ہے، کئی فقرات میں ادا ہوتا ہے۔ کہیں کہیں تاریخ جہانگشا کو قرآن مجید اور حدیث کے اقتباسات سے زینت دی گئی ہے۔ عربی اور فارسی کے موزوں اشعار بھی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے لائے گئے ہیں۔

اس تاریخ کی نثر ناہموار ہے۔ کہیں عبارت تکلف آمیز اور پیچیدہ ہے، کہیں سادہ، سلیس اور لطیف۔ اس مختصر سی تاریخ میں اتنی گنجائش نہیں کہ ایسے اقتباسات پیش کیے جائیں، جن میں اس کی تمام خصوصیات ظاہر ہوسکیں۔ بہرحال بغرض اختصار چند سطور نمونہ کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔

بہار خونین سال ۶۱۹ ہجری مطابق ۱۲۲۲ عیسوی

چون خبر قدوم ربیع بر ربع مسکون و رباع عالم رسید، سبزہ چو دل مغموبان از جای برنخاست و ہنگام اسحار بر اغصان اشجار بلبلان بر موافقت فاختگان و قماری شیون و نوحہ گری، آغاز کردند و بر باد جوانانی کہ ہر بہار بر چہرۂ انوار داز ہار در بساتین و متنزہات مے کش و غمگسار بودندی، سحاب از دیدہا اشک می بارید، و می گفت باران است۔ و غنچہ در حسرت غنجان از دل تنگی خون در شیشہ می کرد و فرا می نمود کہ خندہ است۔ گل بر تاسف گل رخان بنفشہ عذار جامہ چاک می کرد و می گفت شگفتہ ام۔ سوسن در کسوت سوگواران ازرق می پوشید و اغلوطہ می داد کہ آسمان رنگم، سرو آزاد از لہف ہر سرو قامتی خوش رفتار بمدد آہ سردی کہ صباح ہر سحرگاہ بر می کشید، پشت دوتا می کرد و آن را تبختری نام نہادہ بود،

وبرو فاق او خلاف از پریشانی سر بر خاک تیرہ می نہاد واز غصہ روزگار خاک بر سر می کرد که فراش چمنم، صراحی غرغرہ در گلو انداختہ و چنگ و رباب آواز در بر گرفتہ۔

کس لب بہ طرب بخندہ نکشود امسال — وز فتنہ دمی جہان نیا سود امسال

در خون گلم کہ چہرہ بنمود امسال — با وقت چنین چہ وقت گل بود امسال

تاریخ وصاف

تاریخ وصاف عہد مغول کی ایک مشہور تاریخ ہے۔ تاریخ کا اصل نام "تجزیۃ الامصار وتزجیۃ الاعصار" ہے۔ اس کا مؤلف شرف الدین[1] عبداللہ ابن فضل اللہ شیرازی ہے، جو وصاف یا وصاف حضرت کے نام سے مشہور ہوا۔

وصاف کی پیدائش ۶۶۳ ھجری مطابق ۱۲۶۴ء میں شیراز میں ہوئی۔ تعلیم بھی شیراز ہی میں پائی۔ آخر رشید الدین فضل اللہ نے جو غازان اور الجائتو کے عہد کا وزیر تھا، اس کی سرپرستی کی، اور اسے ایک مورخ کی حیثیت میں دربار میں جگہ دلائی۔ یہاں اس نے اپنی مشہور ومعروف کتاب "تاریخ وصاف" تالیف کی۔

تاریخ وصاف پانچ جلدوں میں ہے۔ یہ ہلاکو اور اس کے جانشینوں کی تاریخ ہے۔ اس میں ۶۵۶ سے ۷۲۸ ھجری مطابق ۱۲۵۸ء یعنی فتح بغداد سے ابوسعید کے عہد تک کے حالات درج ہیں۔ تاریخ وصاف کا آغاز ۶۹۹ ھجری مطابق ۱۲۹۹ء میں ہوا۔ ۷۰۲ ھجری مطابق ۱۳۰۲ء میں مولف نے پہلی جلد مکمل کرکے غازان کی خدمت میں پیش کی، دوسری جلدیں ۷۱۲ ھجری مطابق ۱۳۱۲ء میں مکمل کرکے اس نے الجائتو خدابندہ کی نذر کیں۔

اسلوب بیان ۔ تاریخ وصاف، تاریخ جہانگشائے جوینی کے انداز میں لکھی

---

[1] سبک شناسی جلد سوم۔ صفحہ ۱۰۱۔ پروفیسر براؤن نے حبیب السیر کے حوالے سے اس کا نام شہاب الدین لکھا ہے۔

گئی ہے۔ مؤلف کو عربی زبان اور شعرائے عرب کے دیوانوں پر عبور تھا۔ اُس نے یہ کوشش کی ہے کہ اپنی تاریخ میں عربی تراکیب اور اصطلاحات کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرے۔ اس لحاظ سے وصاف عطا ملک جوینی سے بھی بازی لے گیا ہے۔ عربی اصطلاحات و تراکیب نے تاریخ کی نثر کو بہت بوجھل بنا دیا ہے۔ یہاں تک کہ فنی نثر کے شیدائی بھی اس کے مطالعے سے گھبراتے ہیں۔

تاریخ وصاف کا اندازِ بیان بہت مشکل اور دقیق ہے۔ مؤلف خود لکھتا ہے کہ یہ کتاب فصاحت و بلاغت کا ایک نمونہ ہے۔ یہ محض اتفاقی بات ہے کہ مؤلف کو فصاحت و بلاغت کے اظہار کے لیے تاریخی مواد کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اس تاریخ کی نثر کے نمونے کے لیے محض اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔ وصاف جلد اوّل میں الملک الظاہر بندقدار کے متعلق لکھتا ہے۔

"بندقدار نزد اباقا خان رسولی فرستادہ و بوساطت سفارت ماریکری مرغ منقار کہ چون صفیر آغاز دو طاؤس خواطر اہل کمال در جلوہ نشاط درآید . . . . " اس عبارت کے بعد بیس سطریں اور بھی ہیں، جن میں عربی الفاظ کی بھرمار کے علاوہ کنایہ، تشبیہ، استعارہ اور صنعت سجع کثرت سے استعمال کی گئی ہے۔

مختصر طور سے کہا جا سکتا ہے کہ چھٹی صدی ہجری میں عربی زبان کے اثر سے جو فارسی میں "فنی نثر" لکھی گئی، وصاف کی بدولت وہ انتہائے کمال کو پہنچی۔

جامع التواریخ

جامع التواریخ واقعاتِ عالم کی اہم ترین تاریخ ہے۔ اسے ایلخانی عہد کا ایک عظیم تاریخی کارنامہ سمجھنا چاہیے۔ اس کا مؤلف رشید الدین فضل اللہ ہمدانی ہے۔

رشید الدین ۶۴۵ھ بمطابق ۱۲۴۷ء میں ہمدان میں پیدا ہوا اور یہیں حدیث، فقہ، فلسفہ اور علمِ طب کی تعلیم حاصل کی۔ آخر علمِ طب کی وساطت سے اُس نے غازان کے دربار میں رسائی پائی اور اپنے علم و تدبر کی بدولت ترقی کر کے غازان کا وزیر بنا۔ ایلخانی

حکمرانوں کو علم و ادب سے تو کوئی علاقہ نہ تھا، لیکن وہ چاہتے تھے کہ ان کے آباو اجداد کے کارنامے کتابی صورت میں محفوظ رہیں خصوصاً غازان تاریخ کی طرف راغب تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایلخانی اپنی شان و شوکت کے باوجود ایرانیوں میں جذب ہو کر رہ جائیں گے، اس لیے اس نے چاہا کہ اس کے اور اس کے بزرگوں کے کارنامے یادگار رہ جائیں چنانچہ اس نے اپنے وزیر رشید الدین فضل اللہ کو یہ تاریخ لکھنے پر آمادہ کیا۔

ایلخانیوں کی تاریخ لکھنا آسان کام نہ تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ان کی زبان "الیغوری" سیکھی جائے اور ان کے عادات و اطوار کا مطالعہ کیا جائے۔ اس وقت اتفاق سے ایران اور چین و تاتار کے لوگوں کے میل جول سے ادھر چین و تاتار میں فارسی نے رواج پایا، ادھر الیغوری زبان ایران میں رائج ہوئی۔ الیغوری حکمرانوں کی زبان تھی اس لیے لوگ بڑے شوق سے اُسے سیکھتے تھے۔ چنانچہ رشید الدین نے بھی یہ زبان سیکھی۔ اس کے علاوہ چینی علماء اکثر ایلخانی دربار میں آتے جاتے تھے۔ ایک چینی دانش مند پولاد چنگ سانگ حکومت چین کی طرف سے سفیر کی حیثیت میں ایلخانی دربار میں مقیم تھا۔ اُس سے بھی رشید الدین نے کافی استفادہ کیا۔ بالآخر اُس نے قوم تاتار کی ابتداء سے چنگیز خان اور اس کے جانشینوں تک اور ہلاکو سے لے کر غازان خان کے زمانے تک کی تاریخ مرتب کی، جو "تاریخ غازانی" کے نام سے موسوم ہوئی۔ ابھی یہ تاریخ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچی تھی کہ غازان راہیٔ ملکِ بقا ہوا۔ اس کے بعد الجائتو خدا بندہ تخت نشین ہوا۔ اس نے یہ فرمائش بھی کی کہ تاریخ مذکور کے علاوہ تمام ہمعصر قوموں کی تاریخ اور مغلوں اور مغلوں کے دوست ممالک کا جغرافیہ بھی لکھا جائے۔ رشید الدین نے وزارت کے مشاغل کے ساتھ ساتھ تاریخ اور جغرافیہ کی تالیف جاری رکھی۔ اور ایرانی، چینی، تبتی اور یہودی علماء کی مدد سے، جو دربار ایلخانی سے متعلق تھے، ایک فصیح اور بسیط کتاب تیار کر لی۔ یہ کتاب ۸۱۰ ھ مطابق ۱۴۰۷ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اور "جامع التواریخ" کے نام سے موسوم ہوئی۔

رشید الدین فضل اللہ کا انجام بھی ویسا ہی ہوا، جیساکہ زمانہ گزشتہ میں ایران کے نامور وزراء کا ہوتا رہا تھا۔ ایک شخص علی شاہ نے سازش کر کے یہ الزام لگایا کہ اس نے سرکاری خزانے کی گراں قدر رقوم خرد برد کی ہیں۔ الجائتو کے عہد میں تو علی شاہ کی سازش کامیاب نہ ہو سکی۔ لیکن الجائتو کے بعد جب ابو سعید تخت نشین ہوا، تو علی شاہ اپنے فاسد منصوبوں میں کامیاب ہو گیا۔ نہ صرف یہ کہ رشید الدین کو وزارت سے برطرف کر دیا گیا بلکہ ستر برس کی عمر میں اس کو اس کے بیٹے ابراہیم سمیت اس جرم میں مروا دیا گیا کہ اُس نے غازان خان کو زہر دیا تھا۔ اس کی تمام جائداد ضبط کر لی گئی اور اس کے اعزا اور اقارب کو چن چن کر موت کی سزائیں دی گئیں۔ شہر ربع رشیدی، جو اس نے اپنے نام پر بسایا تھا، ویران کر دیا گیا۔

جامع التواریخ کی ترتیب ۔ جامع التواریخ کے پہلے حصے میں شاہان قدیم اور انبیائے کرام سے لے کر خلافت اسلامیہ کے اختتام تک کے حالات درج ہیں۔[1] ملک الشعراء بہار لکھتے ہیں کہ جامع التواریخ کا کچھ حصہ تیموری عہد میں ضائع ہو گیا تھا، جسے بعد میں لطف اللہ بن عبداللہ ہردی نے جو حافظ ابرو کے نام سے مشہور ہوا۔ بایسنغر مرزا کے حکم سے پھر مرتب کیا۔ اس کے علاوہ جامع التواریخ کا ضمیمہ بھی ترتیب دیا۔ یہ دونوں حصے "زبدۃ التواریخ" کے نام سے موسوم ہیں۔

دوسرے حصے میں سامانیہ، دیالمہ، غزنویہ اور سلاجقہ کی تاریخ ہے۔ بہار لکھتے ہیں کہ تاریخ کے اس حصے کو "راحت الصدور" کا اقتباس سمجھنا چاہیے۔ اس کے بعد خوارزم شاہوں کی تاریخ ہے، جو اس نے تاریخ جہانگشائی جوینی سے متاثر ہو کر لکھی۔ بعد کے حصے میں ترک و تتار کی تاریخ ہے۔ ایک باب میں بنی اسرائیل،

---

[1] سبک شناسی جلد سوم۔ صفحہ ۱۷۳

فرنگ اور روم اور ہند کے تاریخی حالات واقعات درج ہیں۔ جامع التواریخ کے یہ حصے "تاریخ غازانی" کے نام سے موسوم ہیں۔

اس کے بعد الجائتو کی فرمائش پر رشید الدین نے باقی حصہ بھی مکمل کیا، جو جغرافیائی حالات پر مشتمل ہے۔ تاریخ غازانی اور یہ بقیہ حصہ مل کر "جامع التواریخ" کے نام سے موسوم ہے۔

مختصراً جامع التواریخ کی ترتیب حسب ذیل ہے

۱۔ تاریخ مغول۔ (ل) الجائتو کے زمانے تک

۲۔ (ب) الجائتو سے مؤلف کے زمانے تک

(ج) انبیا اور خلفا اور شاہان قدیم سے مؤلف کے زمانے تک

۳۔ چین و تاتار اور ہمسایہ ممالک کا جغرافیہ

جامع التواریخ کا اسلوب بیان ۔ جامع التواریخ کی نثر سادہ اور رواں ہے۔ جہاں کہیں مؤلف نے دوسرے مورخین کے اقتباسات نقل کیے ہیں، وہاں بھی حتی الامکان اس نے مشکل الفاظ حذف کر دیئے ہیں۔

رشید الدین کی دوسری تالیفات ۔ (۱) کتاب الاخبار والآثار۔ اس کتاب میں موسموں، کھیتی باڑی، آب پاشی، امراض نباتات اور معدنیات کا ذکر ہے۔ اصل کتاب ناپید ہے۔ البتہ اس کے منتخبات موجود ہیں، جو ۱۳۲۳ ھجری مطابق ۱۹۰۵ء میں عبدالغفار نجم الدولہ نے مرتب کیے۔

(۲) مفتاح التفاسیر

(۳) رسالہ سلطانیہ

(۴) بیان الحقائق

(۵) لطائف الحقائق

۶۔ توضیحات

۷۔ مجموعہ مکاتبات رشیدی

تاریخ گزیدہ

تاریخ گزیدہ کا مولف حمداللہ مستوفی ہے، یہ تاریخ اس نے ۷۳۰ ھجری مطابق ۱۳۲۹ء میں لکھی۔ اور رشید الدین فضل اللہ کے بیٹے غیاث الدین محمد کے نام منسوب کی۔ تاریخ گزیدہ ایک تمہید، چھ ابواب اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں کئی فصلیں ہیں۔ تمہید میں حمداللہ مستوفی نے آفرینش عالم کا مختصر حال لکھا ہے۔ پہلا باب پیغمبران قدیم سے متعلق ہے۔ دوسرے باب میں زمانہ قبل از تاریخ کے بادشاہوں، تیسرے باب میں آنحضرت رسول اکرمؐ اور خلفائے راشدین کی تاریخ ہے۔ چوتھے میں عہد صفاریہ، سامانیہ، غزنویہ، غوریہ، دیالمہ، سلاجقہ وغیرہم اسلامی حکومتوں کا مختصر حال لکھا گیا ہے۔ پانچواں باب اماموں، مجتہدوں، محدثوں، صوفیوں اور شاعروں[1] کے حالات پر مشتمل ہیں۔ چھٹے باب میں قزوین کے تاریخی اور جغرافیائی حالات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ "خاتمہ" مختلف نسب ناموں پر مشتمل ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے، تاریخ گزیدہ میں آفرینش عالم سے لے کر مصنف کے زمانے تک کے حالات درج ہیں۔ جو تاریخ اس قدر طویل زمانے کا احاطہ کیے ہوئے ہو، اس سے ہم کسی تفصیل کی امید نہیں رکھ سکتے۔ لیکن اختصار کے باوجود اس کا شمار ان کتابوں میں ہوتا ہے، جو تاریخ ایران کا بہترین ماخذ سمجھی جاتی ہیں۔ تاریخ کا وہ حصہ بالخصوص بہت مستند اور معلومات افزا ہے، جو مولف کے اپنے زمانے سے متعلق ہے۔ پروفیسر براؤن نے اس مفید تاریخ کو گب میموریل کے سلسلہ کتب میں سنہ ۱۹۱۰ء میں شائع کرایا۔

---

[1] پانچویں باب کی چھٹی فصل میں شعراء کا حال ہے جو ۶ عرب اور ۸۰ ایرانی شعراء کے حالات پر مشتمل ہے۔ ایرانی شعراء کے حالات کا ترجمہ پروفیسر نکلسن نے شائع کیا ہے

ظفر نامہ

حمد اللہ مستوفی کی یہ ایک منظوم تاریخ ہے، جو ۷۳۵ھ مطابق ۱۳۳۴ء میں تکمیل پذیر ہوئی۔ اس میں آغاز اسلام سے عہد مغول تک کے حالات لکھے گئے ہیں۔ اس منظوم تاریخ کو شاہنامہ فردوسی کا تکملہ سمجھنا چاہیے۔ ظفر نامہ کے اشعار کی کل تعداد بقول پروفیسر براؤن ۷۵ ہزار ہے۔

نزہت القلوب

حمد اللہ مستوفی نے علم جغرافیہ پر بھی ایک کتاب لکھی ہے، جو "نزہت القلوب" کے نام سے موسوم ہے۔ سن تالیف ۷۴۰ھ مطابق ۱۳۳۹ء ہے۔

نزہت القلوب ایک تمہید، تین مقالات اور خاتمے پر مشتمل ہے۔ شروع میں زمین و آسمان اور تخلیق آدم کا بیان ہے۔ اصل کتاب عرب اور بیت المقدس کے متبرک مقامات کے ذکر سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد ایران، میسوپوٹیمیا اور ایشیائے کوچک کے جغرافیائی حالات لکھے گئے ہیں۔ آخر میں ایران کے اُن سرحدی مقامات کا ذکر آتا ہے، جو مؤلف کے زمانے میں مملکتِ ایران میں شامل تھے۔ خاتمے میں عجائبات کا بیان ہے

طبقات ناصری

یہ تاریخ ابو عمر منہاج الدین عثمان بن سراج الدین جوزجانی کی تالیف ہے۔ منہاج الدین ۵۸۹ھ مطابق ۱۱۹۳ء میں پیدا ہوا۔ تحصیل علم کے بعد غوری بادشاہوں کے دربار سے وابستہ ہوا۔ تاتاریوں کے طوفانی حملوں میں یہ بھی غور اور غزنی میں مارا مارا پھرا، پھر دریائے سندھ عبور کر کے سندھ اور ملتان کا رُخ کیا۔ کیا۔ اور غوری حکمران کے گورنر ناصر الدین قباچہ کی خدمت میں آ پہنچا، لیکن جب قباچہ کو شمس الدین التمش نے شکست دی، تو منہاج السراج نے عوفی اور دوسرے علما کے ساتھ التمش کے دربار کا رخ کیا۔ یہاں ان علما کی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ منہاج السراج نے اسی دربار میں ۶۵۹ھ مطابق ۱۲۵۹ء میں "طبقات ناصری" تالیف کی اور التمش کے بیٹے ناصر الدین محمود کے نام منسوب کی۔ یہ تاریخ تیئس ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب کو مؤلف

نے طبقہ کا نام دیا ہے۔ اسی نسبت سے یہ تاریخ "طبقات ناصری" کے نام سے مشہور ہوئی۔

"طبقاتِ ناصری" سلاطینِ ہند کی تاریخ ہے لیکن ضمناً دورِ غزنویہ اور دورِ مغول کے اہم واقعات بھی لکھے گئے ہیں۔ اس کا شمار ان کتابوں میں ہوتا ہے جو غوری، غزنوی، خوارزم شاہی اور تاتاری حکمرانوں کی تاریخ کا بہترین ماخذ خیال کی جاتی ہیں۔

اسلوب بیان۔ منہاج السراج نے اپنے ہم عصر ادیبوں کا تتبع نہیں کیا۔ جبکہ ان کے برعکس اس نے یہ تاریخ نہایت سادہ اور سلیس زبان میں لکھی ہے۔ اس کی نثر میں سو سال پہلے کی نثر کی جھلک نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ منہاج نے خود سادہ نثر لکھ کر آئندہ کی نثر کے لیے نئی شاہراہ کھول دی۔

تاریخ یمینی | یہ تاریخ سبکتگین اور محمود غزنوی کے حالات پر مشتمل ہے۔ اصل کتاب ابونصر عتبی نے عربی زبان میں لکھی تھی۔ لیکن ابوالشرف ناصح گلپائگانی نے اسے ساتویں صدی ہجری کے اواخر میں فارسی میں ترجمہ کیا۔ عصر محمود کی تاریخوں میں اس تاریخ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

نظام التواریخ | مشہور مفسر قرآن ناصر الدین بیضاوی کی تالیف ہے جو ۶۷۴ھ مطابق ۱۲۷۵ء میں لکھی گئی۔ یہ تاریخ تخلیقِ آدم سے لے کر مولف کے اپنے زمانے تک کے حالات پر مشتمل ہے۔

تاریخ بناکتی | یہ ابو سلیمان داؤد بناکتی کی تالیف ہے اور مؤلف کے نام کی نسبت سے "تاریخ بناکتی" کے نام سے موسوم ہے۔ سنِ تالیف ۷۱۷ھ مطابق ۱۳۱۷ء ہے۔

اخلاقِ ناصری | اخلاقیات کے موضوع پر یہ نصیر الدین طوسی کی مشہور و معروف تالیف ہے۔ جو ناصر الدین عبدالرحیم بن ابی منصور حاکم قہستان

کی فرمائش پر عربی سے فارسی میں ترجمہ کی گئی تھی۔ اصل کتاب کا نام "طہارۃ الاعراق فی تہذیب الاخلاق ہے"۔ جو ابن مسکویہ کی تصنیف ہے۔ نصیر الدین طوسی نے محض ترجمہ کرنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ بعض مسائل خود لکھ کر بھی اس میں اضافہ کیے ہیں۔ "اخلاق ناصری" حکمت عملی اور اخلاق سے متعلق ہے۔ اس کا سالِ تالیف ۶۳۳ھ مطابق ۱۲۳۵ء ہے۔

گلستان

یہ اعجوبہ روزگار، زندہ جاوید کتاب سعدی علیہ الرحمۃ کی شاہکار ہے، جو ۶۵۶ھ مطابق ۱۲۵۸ء میں لکھی گئی تھی۔ سعدی ایک قادر الکلام شاعر اور معجز بیان نثر نگار تھے۔ تاریخ ادبیات میں سعدی کا مقام بہت بلند ہے۔ لیکن یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ بلندیٔ مقام آپ کو شاعری کی بدولت حاصل ہوئی، یا نثر کی بدولت ملک الشعراء بہار لکھتے ہیں کہ "سعدی علیہ الرحمۃ کی شخصیت اور استادانہ عظمت کو گلستان میں دیکھنا چاہیے۔ اگر اس چھوٹی سی مگر گراں پایہ نثر کی کتاب کا وجود باقی نہ رہتا، تو سعدی کی دو تہائی عظمت جاتی رہتی۔ اور فارسی ادب اس گراں بہا اور عظیم ذخیرے سے محروم رہ جاتا۔ کیونکہ ایسی کتاب نہ عصر گزشتہ میں لکھی گئی، نہ زمانہ آئندہ میں لکھی جائے گی"۔[1]

گلستان کی مقبولیت

گلستان کو شیخ سعدی کے کلام کا خلاصہ اور لب لباب سمجھنا چاہیے۔ فارسی نثر میں کوئی کتاب اس قدر مقبول نہیں ہوئی جتنی گلستان مقبول ہوئی ہے۔ ایران، افغانستان، ہند اور خود ہمارے ملک میں "گلستان" کسی نہ کسی صورت میں نصاب تعلیم میں شامل رہی ہے۔ اسے فارسی زبان کا ذوق رکھنے والا ہر شخص پڑھتا اور حظ اٹھاتا ہے۔

گلستان کی بنیاد یوں تو اخلاقیات پر ہے، جو روکھا پھیکا اور بے نمک سا موضوع

---

[1] سبک شناسی۔ جلد سوم صفحہ ۱۲۵۔

ہے۔ لیکن گلستان اخلاقی کتاب ہونے کے باوجود ہر زمانے میں مقبول عوام رہی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں روزمرہ زندگی کے حالات و واقعات نہایت فصاحت و بلاغت سے بیان کیے ہیں۔ حسن بیان اور لطف ادا نے اسے اور بھی زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔

گلستان ایک تمہید اور آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ ان کی ترتیب حسب ذیل ہے۔

باب اوّل ..... سیرت بادشاہان	باب پنجم ..... عشق و جوانی
باب دوم ..... اخلاق درویشان	باب ششم ..... ضعف و پیری
باب سوم ..... نضیلت قناعت	باب ہفتم ..... تاثیر تربیت
باب چہارم ..... فضیلت خاموشی	باب ہشتم ..... آداب صحبت

گلستان کا اسلوب تحریر ۔ گلستان کے اسلوب تحریر پر ایک مستقل باب لکھا جانا چاہیے، لیکن یہاں بقدر گنجائش اس کی صرف چند خصوصیات درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ سعدی عموماً چھوٹے چھوٹے فقرے لکھتے ہیں، لیکن بقول مولانا حالی "یہ ریشم کے لچھے معلوم ہوتے ہیں۔" آپ کی نثر میں نظم کی سی روانی ہے۔ مثلاً

"واقعہ ہا در پیش و دشمنان از پس۔ نباید کہ بوقت حاجت درمانی۔"

"ای برادر حرم در پیش است و حرامی در پس۔ اگر رفتی مردی و اگر خفتی مُردی۔"

"افتد کہ ندیم حضرت سلطان زر بیابد و باشد کہ سر برود۔"

۲۔ گلستان کی تشبیہات بہت تازہ اور شگفتہ ہیں:

"میوۂ غنفوان شبابش نو رسیدہ و سبزۂ گلستان عذارش نو دمیدہ۔"

"دست کرم برکشاد و داد سخاوت بداد"

"دست تحیر بدندان گرفت"

۳۔ ایجاز و اختصار ۔ سعدی وسیع مضامین کو مختصر سے مختصر الفاظ میں اس

طرح لاتے ہیں کہ معنی کی ایک دُنیا ان میں سما جاتی ہے۔ اس فن میں سعدی کے پائے کو اور کوئی ادیب نہیں پہنچ سکا۔ مثلاً:۔

ایک بادشاہ کسی فقیر کی صدا سُن کر کہتا ہے: "درویش، دامن بیار! فقیر جواب دیتا ہے۔ "دامن از کجا آورم کہ جامہ ندارم!" اس مختصر سے جملے میں افلاس اور بے مائیگی کی پوری داستان بیان کردی ہے۔

ایک بادشاہ کے باورچی خانے کو آگ لگی جس سے رفتہ رفتہ سارا محل جل کر تباہ ہوگیا۔ اس انقلاب کو ذیل کے فقرے میں بیان کیا ہے جس پر سیکڑوں نظمیں قربان کی جا سکتی ہیں۔

"از بستر نرمش بر خاکستر گرمش نشاند"

۴۔ تناسب اور ہم آہنگی۔ موزوں، تناسب اور ہم آہنگ الفاظ لانے میں سعدی کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ فقرے سننے سے وہی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو خوش آہنگ سروں کو سننے سے پیدا ہوتی ہے۔ دو ایک مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

"بکوشید، تا جامہ زنان نپوشید۔"

"محال است کہ ہنرمندان بمیرند و بے ہنران جائے ایشان گیرند"

"نان جو خوردن و نشستن بہ کہ کمر زرین بستن و بخدمت ایستادن۔"

"۔۔۔۔۔ دفعی بہ سلامی برنجند و گاہی بہ دشنامی خلعت دہند"

۵۔ امثال۔ آپ کے فقرات میں اتنا بے ساختہ پن اور حقیقت طرازی ہے۔ کہ ان میں سے بعض کو ضرب المثل کا درجہ حاصل ہوگیا ہے۔ مثلاً

"دروغ مصلحت آمیز بہ زراستی فتنہ انگیز۔"

"تونگری بہ ہنر است نہ بمال   بزرگی بہ عقل است نہ بسال"

"دہ درویش در گلیمے بخسپند و دو بادشاہ در اقلیمے نگنجند"

۶ - مسجع و مقفیٰ عبارت - سعدی نے نظم کی طرح نثر کے فقرات میں بھی اکثر ناپ تول کا خیال رکھا ہے اور قافیہ بندی بھی کی ہے۔ اس سے فقروں میں شعروں کی شان پیدا ہو گئی ہے۔

"آتش کشتن و اخگر گزاشتن، افعی کشتن و بچہ اش نگہداشتن کار خردمندان نیست۔"

چشمش نگران است کہ ملکش با دگران است۔

۷۔ نثر میں نظم کا پیوند - نثر میں اس خوبصورتی اور موزونیت سے نظم کا پیوند لگاتے ہیں کہ وہ نثر ہی کا ایک حصہ معلوم ہوتی ہے۔ اس سے مضمون زیادہ موثر اور دلچسپ ہو جاتا ہے۔

۸۔ عبارت کو آیات قرآنی اور احادیث نبویؐ سے بھی زینت دی ہے، جس سے مضمون میں اور بلندی آگئی ہے۔

سعدی معلم اخلاق کی حیثیت میں - سعدی نے گلستان میں متعدد اخلاقی مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ گلستان کا شاید ہی کوئی ایسا صفحہ ہوگا جس میں اخلاقی تربیت کا موثر سبق نہ ملتا ہو۔ اس لحاظ سے آپ کا مقام بہت بلند ہے۔

سعدی معلم اخلاق تو تھے۔ لیکن ان کے بعض اخلاقی نظریے عام اخلاقی نظریوں سے مختلف نظر آتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ بادشاہ وقت یا حاکم کی ہاں میں ہاں ضرور ملانی چاہیے خواہ وہ غلطی پر ہی کیوں نہ ہو۔ اگر بادشاہ دن کو رات کہے تو کہو، جی ہاں! رات ہے۔ وہ دیکھیے چاند چمکتا ہے اور ستارے ٹمٹماتے ہیں ؎

اگر شہ روز را گوید شب است این

بباید گفت اینک ماہ و پروین

۲ - انسان کی فطرت نہیں بدلتی، خواہ اسے کتنی عمدہ تربیت کیوں نہ دلائی جائے یہ بڑا انتہا پسندانہ نظریہ ہے۔ موجودہ زمانے کے علم النفس کے ماہرین کا خیال ہے کہ کوئی

شخص فطرۃً بُرا نہیں ہوتا، ماحول اچھا بھی بنا دیتا ہے اور برا بھی۔ سعدی اس کے برعکس یہ کہتے ہیں ؎

زمین شور سنبل بر نیارد　　　　درو تخم عمل ضائع مگردان

۳- سعدی فرماتے ہیں ؎

نکوئی با بداں کردن چناں است　　　　کہ بد کردن بجائے نیک مردان

یعنی بروں کے ساتھ نیکی کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ نیکوں کے ساتھ برائی کرنا۔" لیکن اونچے اخلاق کا یہ تقاضہ ہے کہ بروں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کیا جائے۔ ممکن ہے اسی طرح اس کی اصلاح ہو جائے۔

۴- سب سے پہلی حکایت میں سعدی کہتے ہیں۔ "دروغ مصلحت آمیز بہ کہ راستی فتنہ انگیز"۔ گویا مصلحت وقت کے خیال سے اگر جھوٹ بول لیا جائے۔ یعنی آداب کی کوئی حد توڑ دی جائے، تو مضائقہ نہیں۔

۵- انسانی فطرت کا تقاضہ ہے کہ اگر کسی کو کسی سے تکلیف پہنچے تو وہ انتقام لیتا ہے۔ لیکن اگر معاف کر دیا جائے تو یہ زیادہ احسن انتقام ہے۔" لیکن سعدی نے حکایت ذیل کچھ اس طرح لکھی ہے جس سے انسانی طبائع یہ اثر قبول کرتی ہیں کہ انتقام ضرور لینا چاہیے۔

"مردم آزاری را حکایت کنند کہ سنگی بر صالحی زد۔ درویش را مجال انتقام نبود۔ سنگ را نگاہ می داشت، تا زمانیکہ ملک را بداں لشکری خشم آمد و در چاہ کرد۔ درویش اندر آمد و سنگ بر سرش کوفت۔ گفتا تو کیستی و ایں سنگ چرا زدی گفت من فلانم و ایں ہماں سنگ است کہ در فلاں تاریخ بر سر من زدی۔ گفت چندین روز کجا بودی گفت از جاہت اندیشہ کردم۔ اکنون کہ در چاہت دیدم فرصت غنیمت دانستم۔

از جاہت اندیشہ می کردم۔ اکنون کہ در جاہت دیدم، از عزت غنیمت دانستم

شعر و ادب کے تذکرے

اس عہد میں تاریخوں کے علاوہ لباب الالباب، اور المعجم دو مشہور تذکرے بھی لکھے گئے، جن کا مختصر سا حال حسب ذیل ہے۔

لباب الالباب

یہ شاعروں اور ادیبوں کا اہم تذکرہ ہے۔ اس کا مؤلف نورالدین محمد عوفی ہے۔

عوفی چھٹی صدی ہجری کے آخر اور ساتویں صدی ہجری کے اوّل کا ایک نامور ادیب ہے۔ سلسلۂ نسب عبدالرحمن بن عوف سے ملتا ہے۔ اسی نسبت سے عوفی کے نام سے شہرت پائی۔ وطن مرو تھا، لیکن طالب علمی کا زمانہ بخارا میں گزارا۔ یہاں ایک مشہور عالم نظام الدین سرخسی سے تعلیم پائی اور وعظ و خطابت میں مہارت حاصل کی۔ آخر وعظ و خطابت کو ہی معاش اور سیاحت کا وسیلہ بنایا۔

عوفی نے ۵۹۷ھ مطابق ۱۲۰۰ء میں بخارا سے چل کر سمرقند، ماوراء النہر، خراسان اور سیستان میں کچھ وقت گزارا۔ آخر مغلوں کے حملے کی خبر سنی تو خراسان سے نکل کر سندھ آگیا اور ۶۱۷ھ مطابق ۱۲۲۰ء میں ناصر الدین قباچہ کے دربار میں رسائی حاصل کی، جس نے سندھ اور ملتان میں اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی تھی۔ آخر قباچہ کو جب شمس الدین التمش نے شکست دی، تو عوفی ۶۲۵ھ مطابق ۱۲۲۷ء میں التمش کی خدمت میں اُچ آ گیا۔ ہندوستان کے قیام کے دوران اس نے اپنی دو مشہور کتابیں "لباب الالباب" اور "جامع الحکایات" تالیف کیں۔

تذکرہ لباب الالباب۔ عوفی نے ۶۱۸ھ مطابق ۱۲۲۱ء میں مکمل

کرکے ناصرالدین قباچہ کے وزیر عین الملک کے نام منسوب کیا۔ اس تذکرے میں ایران کے اولین فارسی شاعر سے لے کر مؤلف کے ہم عصر شعرا تک کے حالات لکھے ہیں اور ان کے کلام پر تنقید کی ہے۔ پروفیسر براؤن نے "لباب الالباب" کو دو جلدوں میں شائع کرایا ہے۔ پہلی جلد میں ان بادشاہوں اور امراء وزراء کے حالات لکھے ہیں، جو شعر کہتے تھے۔ دوسری جلد میں عام شعراء اور ادیبوں کے حالات ہیں۔

جوامع الحکایات

محمد عوفی نے ۶۳۰ھ مطابق ۱۲۳۲ء میں ایک اور کتاب تالیف کی، جو "جوامع الحکایات ولوامع الروایات" کے نام سے موسوم ہے۔ اس کی چار جلدیں ہیں۔ مؤلف دیباچے میں لکھتا ہے کہ اس نے اس کتاب کی تیاری میں تقریباً ایک سو کتابوں سے مدد لی ہے اور خود دیکھی سنی باتیں بھی اس میں شامل کی ہیں۔

المعجم

"المعجم فی معاییر اشعار العجم" شمس الدین محمد بن قیس رازی کی تالیف ہے۔ شمس قیس کا شمار چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کے مشہور علما اور ادبا میں ہوتا تھا۔ اس کا وطن ری تھا۔ کچھ عرصہ تحصیل علم کے لیے خراسان، ماوراء النہر اور خوارزم میں قیام کیا۔ ۶۱۴ھ بمطابق ۱۲۱۷ء میں جب سلطان علاء الدین خوارزمشاہ بغداد کو مسخر کرنے کے ارادے سے خوارزم سے نکلا، تو شمس قیس بھی اس کی خدمت میں آ گیا۔ پھر ۶۱۷ھ بمطابق ۱۲۲۰ء میں جب علاء الدین تاتاریوں کے لشکر سے ہزیمت کھا کر طبرستان کی طرف بھاگا، تو اس وقت بھی شمس قیس اس کا ہم رکاب تھا۔ اس افراتفری کی حالت میں جہاں اور نقصان ہوا وہاں شمس قیس کا قیمتی ساز و سامان اور اس کی گراں قدر کتابیں بھی ضائع ہو گئیں۔ آخر جب خوارزم شاہ روپوش ہو گیا اور خراسان پر تاتاریوں کا تسلط ہو گیا، تو شمس قیس نے ۶۲۳ھ بمطابق ۱۲۲۶ء میں فارس میں پناہ لی اور اتابک سعد بن زنگی حاکم فارس کی ملازمت اختیار کر لی۔

شمس قیس نے اپنا تذکرہ "المعجم" ۶۱۴ھ مطابق ۱۲۱۷ء میں لکھنا شروع کیا تھا۔ ۶۱۷ھ۱؎ مطابق ۱۲۲۰ء میں اس تذکرے کا کچھ مسودہ لوٹ مار کی نذر ہوگیا۔ آخر شمس نے مسودے کو پھر سے ترتیب دیا۔ یہ مسودہ شروع میں عربی زبان میں لکھا گیا تھا۔ لیکن شمس قیس جب اتابک سعد بن زنگی کے دربار میں آیا، تو یہاں خود ہی بعض فضلا کی فرمائش پر اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

اسلوب بیان "المعجم" علم عروض اور تنقید شعری کا ایک مستند تذکرہ ہے۔ اس میں مشہور شعراء کے حالات زندگی بھی لکھے گئے ہیں۔ یہ تذکرہ ساتویں صدی ہجری کے شروع کی تالیف ہے۔ اس میں نہ مرادف الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، نہ صنائع بدائع ہی کی بھرمار ہے۔ اس کی نثر سادہ اور رواں ہے۔ البتہ عربی کے الفاظ سے اس تذکرہ کی عبارت خالی نہیں۔

دورِ مغول کے عربی نویس علماء

شہاب الدین سہروردی۔ ۵۳۹-۶۳۲ھ مطابق ۶۳۲ ۱۲۳۴ء
ابوحفص محمد بن محمد نام اور لقب شہاب الدین ہے۔ علاقہ زنجان کے قصبہ سہرورد کے رہنے والے تھے۔ آپ اپنے زمانے کے بزرگ ترین صوفی تھے۔ زندگی کا بیشتر حصہ بغداد میں بسر ہوا۔ آپ نے تصوف و سلوک پر ایک مشہور کتاب لکھی ہے۔ جو "عوارف المعارف" کے نام سے موسوم ہے۔

نجم الدین رازی۔ وفات ۶۵۴ھ مطابق ۱۲۵۶ء شیخ نجم الدین

۱؎ ملک شناسی جلد سوم صفحہ ۲۸

ابوبکر عبداللہ نام اور ری وطن تھا۔ اپنے زمانے کے مشہور عارفوں میں تھے۔ مغلوں کے حملوں میں ایران کو خیرباد کہہ کر ایشیائے کوچک چلے گئے۔ یہاں بقیہ زندگی بسر ہوئی۔ آپ مولانائے روم کے ہمعصر تھے۔ "مرصاد العباد" کتاب آپ کی یادگار ہے۔

خواجہ نصیر الدین طوسی۔ (۵۹۷-۶۷۲ھ مطابق ۱۲۰۰-۱۲۷۳ء) ابوجعفر نصیر الدین نام اور وطن طوس تھا۔ خواجہ نصیر الدین کا شمار ایران کے ان بزرگوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے حملۂ مغول کے بعد رہے سہے ایرانی تمدن کو بچانے کے لیے قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ آپ علوم دین، حکمت، ریاضی اور نجوم کے متبحر عالم تھے۔ حملۂ مغول سے کچھ عرصہ پہلے اسمٰعیلیوں کی قید میں رہے۔ ہلاکو نے جب قلعہ الموت فتح کیا تو آخر انھیں رہائی ہوئی۔ ہلاکو نے اُن کے علم و فضل کا حال سنا، تو انھیں اپنے مقربین میں شامل کر لیا۔ آپ نے ہلاکو کے حکم سے دارالسلطنت مراغہ میں ایک عظیم الشان رصد خانہ بنوایا اور ایلخان[1] کے نام کی مناسبت سے "زیج ایلخانی" تیار کی۔

کہا جاتا ہے نصیر الدین طوسی ساٹھ کتابوں کے مصنف ہیں، ان میں بیشتر عربی زبان میں ہیں۔ فارسی کتابوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

"اخلاقِ ناصری، اساس الاقتباس، اوصاف الاشراف، معیار الاشراف، تذکرہ نصیریہ اور رسالہ سی فصل۔

قاضی بیضاوی۔ (وفات ۶۸۵ھ مطابق ۱۲۸۶ء) ابوالخیر ناصر الدین عبداللہ نام اور فارس وطن تھا۔ شیراز میں قاضی القضاۃ کے منصب جلیلہ پر فائز تھے۔ آپ کا شمار عالم اسلام کے مشہور فقیہوں اور مفسروں میں ہوتا ہے انوار التنزیل اسرار التاویل، طوالع الانوار، مطالع الانظار اور منہاج الوصول آپ کی علمی یادگاریں

---

[1] ہلاکو کا لقب

ہیں۔ فارسی میں آپ نے نظام التواریخ کے نام سے ایک تاریخ بھی لکھی تھی۔

زکریہ قزوینی (سنہ ۶۰۰-۶۸۲ھ مطابق سنہ ۱۲۰۲ تا ۱۲۸۳ء) عماد الدین زکریا محمود قزوینی مشہور جغرافیہ داں تھے۔ آپ نے "عجائب المخلوقات" اور "آثار البلاد و اخبار العباد" علم جغرافیہ کی مشہور کتابیں تصنیف کی ہیں۔ آثار البلاد میں ضمناً شعرائے ایران کا حال بھی لکھا ہے۔

قطب شیرازی (سنہ ۶۳۷-۷۱۰ھ مطابق سنہ ۱۲۳۹-۱۳۱۰ء) قطب الدین محمود بن مسعود شیرازی علم طب، نجوم، حکمت اور موسیقی میں بہت مہارت رکھتے تھے۔ "شرح قانون سینا" اور "شرح حکمت الاشراق" آپ کی علمی یادگاریں ہیں۔ فارسی میں بھی آپ نے چند کتابیں لکھیں، جن کے نام درۃ التاج، تحفہ شاہی و نہایت الادراک۔ ہیں۔

دسواں باب

دورِ تیموریہ

چنگیز خان کی فتوحات کے بعد اس کی وسیع سلطنت اس کے بیٹوں میں تقسیم ہوگئی۔ ماوراءالنہر اور ترکستان کے علاقے، جن کا ہمارے مضمون سے تعلق ہے، چغتائی کے حصے میں آئے۔ لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ دونوں علاقے بھی الگ الگ ہوگئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ تیمور ترکستان کی فوج میں ناموری حاصل کرچکا تھا۔ آخر اس نے موقع پاکر ترکستان پر خود قبضہ کرلیا اور رفتہ رفتہ ماوراءالنہر کے علاقے کو بھی اپنے تسلط میں لے آیا۔

تیمور سمرقند میں ۷۳۶ھ مطابق ۱۳۳۵ء میں پیدا ہوا۔ یہ ترکستان کے برلاس قبیلے کا فرد تھا۔ اس نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد ۷۸۶ھ مطابق ۱۳۸۴ء میں خراسان، ماژندران اور سیستان کے علاقے فتح کیے۔ ۷۸۸ھ مطابق ۱۳۸۶ء میں آذربائیجان، گرجستان اور مغربی ایران کی طرف رخ کیا اور یہ علاقے بھی ایک ایک کرکے فتح کرلیے۔ پھر اصفہان میں قتل و غارت کرتا ہوا فارس کی طرف بڑھا۔ یہاں ۷۹۵ھ مطابق ۱۳۹۲ء میں بلامزاحمت اس کا تسلط ہوگیا۔ اس کے بعد وہ شام کی طرف بڑھا اور حلب اور دمشق پر بھی تیموری علم لہرائے۔ اس کی فتوحات کی ہلاکت اور تباہی چنگیزی بربریت کا مقابلہ تو نہیں کرسکتی، لیکن انسانی خون بہانے اور آباد گھروں کو تباہ و برباد کرنے کا وہ بھی دلدادہ تھا۔ کسی علاقے کے لوگ جب ہتھیار ڈال دیتے تو وہ اپنی تلوار میان سے نکالتا جس کی پیروی

کرتے ہوئے ہزارہا تلواریں آن کی آن میں انسانوں کے خونِ بیگناہ سے رنگین ہو جاتیں۔ اس کے بعد حکم ہوتا کہ شہر تباہ و برباد کر دیا جائے، چنانچہ گھروں کے گھر سطح زمین کے برابر کر دیئے جاتے۔ یہاں تک تباہی ہوتی کہ نباتات تک کا نشان بھی مٹا دیا جاتا۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ بے گناہوں کے سر کاٹ کر ان کے مینار کھڑے کیے جاتے، تاکہ وحشت و ہلاکت کی داستانیں دُور دُور تک پھیل جائیں اور کسی کو جرأت نہ ہو کہ تیموری یلغاروں میں مقابلے کا خیال کر سکے۔

تیمور نے روسی ترکستان اور ہندوستان کے بعض علاقے ۸۰۰ھ اور ۸۰۱ھ مطابق ۱۳۹۷ء تا ۱۳۹۸ء میں فتح کیے۔ آخر ان فتوحات سے فارغ ہو کر وہ سمرقند واپس ہو لیا، تاکہ دارالسلطنت میں بیٹھ کر مفتوحہ علاقوں کو منظم کر سکے۔ یہ حکومت اگرچہ ترکستانی تھی لیکن حکمران خود مسلمان تھا اور اس کی حکومت میں ایرانیوں کا بڑا عمل دخل تھا۔

امیر تیمور کی وفات ۸۰۷ھ مطابق ۱۴۰۵ء میں ہوئی۔ اس وقت سمرقند میں سوائے اس کے ایک پوتے اور بھانجے کے اور کوئی موجود نہ تھا۔ چنانچہ اس کے بیٹوں میں جہاں کہیں کوئی تھا، بادشاہ بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ آخر خانہ جنگی کے بعد تیمور کا چوتھا بیٹا شاہ رخ میرزا ہرات، خراسان اور ماوراءالنہر کے علاقوں میں ایک مستحکم حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تیمور کے تیسرے بیٹے میران شاہ نے مغربی ایران کے علاقوں یعنی تبریز اور بغداد پر تسلط جما لیا، لیکن یہاں اُسے خود اپنے باغی بیٹوں سے دو دو ہاتھ کرنے پڑے۔ اس صورتِ حال سے ترکوں کے قراقوینلو قبیلے کے سردار نے فائدہ اُٹھایا اور آذربائیجان کا علاقہ لے لیا۔ اُدھر قرا یوسف قبیلے کے سردار نے بغداد فتح کر لیا۔ اور چند سال بعد اس سردار کے بیٹے نے اصفہان میں اپنی حکومت قائم کر لی۔

مشرقی ایران میں جیسا کہ ذکر آیا ہے۔ شاہ رخ میرزا کی حکومت تھی۔ ہرات اس کا دارالسلطنت تھا۔ شاہ رخ میرزا کا شمار ایران کے متمدن ترین بادشاہوں میں ہوتا ہے۔

وہ خود ذوقِ سلیم رکھتا تھا، اور فنونِ لطیفہ کے ماہرین کی بڑی حوصلہ افزائی کرتا تھا، اس نے ہرات کو اپنے علمی شوق کی وجہ سے علم وفن کا مرکز بنا دیا۔ اس کے عہد میں عوام پُرامن تھے اور ملک میں خوش حالی کا دور دورہ تھا۔

شاہ رُخ کا بھائی بایسنغر میرزا بھی صاحبِ ذوق تھا جو خوش خطی، موسیقی، نقاشی اور شعروادب کی ترویج واشاعت میں اپنا نام یادگار چھوڑ گیا ہے۔ یہ بایسنغر میرزا ہی ہے جس نے شاہنامہ فردوسی کا دیباچہ لکھوایا تھا۔

شاہ رُخ کی وفات پر اس کا بیٹا الغ بیگ تخت نشین ہوا۔ اُس کا عرصہ حکومت ایک سال تھا۔ یہ بھی ادب اور آرٹ کا مربی ومحسن تھا۔ اس نے سمرقند میں ایک رصد خانہ تعمیر کرایا۔ جو اب تک اپنے بنانے والے کی یاد دلاتا ہے۔ الغ بیگ بہت نرم مزاج بادشاہ تھا۔ یہ اس کی نرمی ہی کا نتیجہ تھا کہ اس کے بیٹوں نے اسے تخت سے اتار کر قتل کرا دیا۔ ملک میں خانہ جنگی شروع ہوئی۔ اس خانہ جنگی کے بعد سلطان حسین بالیقرا نے خراسان کی حکومت سنبھالی۔ یہ بھی ادب وفن کا بڑا محسن تھا۔ اس نے ایرانی تمدن اور ادب کے احیا کے لیے بڑی کوشش کی۔ میر علی شیر نوائی اس کے دربار کا وزیر تھا، جو خود ایک بڑا عالم تھا۔ سلطان حسین اس سلسلے کا آخری بادشاہ ہے اس کے بعد شیبانیوں کی حکومت قائم ہوئی۔ جو بالآخر صفویوں کے ہاتھوں ختم ہوئی۔

دورِ تیموریہ کے شعراء

محمد حافظ شیرازی محمد نام، شمس الدین[1] لقب اور حافظ تخلص ہے۔ آپ شیراز میں پیدا ہوئے سال پیدائش کسی تذکرے میں نہیں ملتا۔

---

[1] حافظ کے ایک شاگرد اور دوست محمد گلندام جنھوں نے آپ کا دیوان مرتب کیا تھا، لکھتے ہیں کہ حافظ کا لقب شمس الدنیا والدین ہے۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں لکھا ہے کہ حافظ آٹھویں صدی کے آغاز میں پیدا ہوئے۔ آقائے نفیسی[1] نے بھی اس موضوع پر تحقیق کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ آپ کی ولادت ۷۲۶ھ سے ۷۲۹ھ مطابق ۱۳۲۵ء تا ۱۳۲۸ء کے مابین ہوئی۔ آپ کے والد بہاءالدین اصفہان کے تاجر تھے۔ تجارت کی غرض سے اصفہان چھوڑا اور شیراز میں آ بسے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب صوبہ فارس میں اتابکان فارس کی حکومت تھی۔ حافظ ابھی عالم طفلی ہی میں تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ کے دو بھائی اور بھی تھے، جو آپ سے بڑے تھے۔ یہ سب شیراز میں رہتے تھے۔ لیکن باہمی ناچاقی کی وجہ سے حافظ کے بھائی کسی دوسری جگہ چلے گئے اور آپ اپنے والدہ کے ہمراہ شیراز ہی میں رہے۔ بچپن ہی میں کسب معاش کا بوجھ آ پڑا۔ چنانچہ مؤلف میخانہ[2] لکھتا ہے کہ آپ نے ایک خمیر ساز کے ہاں آٹا گوندھنے کا مشغلہ اختیار کیا۔ یہاں سے جو مشاہرہ ملتا اس سے گزر اوقات ہوتی تھی۔

خواجہ حافظ اگرچہ کسب معاش میں بہت مصروف رہتے تھے، لیکن علم حاصل کرنے کا آپ کو بہت شوق تھا۔ دکان کے پاس ہی ایک مکتب تھا، جہاں ایک مشہور عالم قوام الدین عبداللہ درس دیتے تھے۔ حافظ کو کام سے کچھ فراغت ہوتی تو مکتب میں آ جاتے۔ یہاں کلام مجید حفظ کیا اور تفسیر اور علم حکمت کی تعلیم پائی، جیسا کہ ان کے ایک شعر سے ظاہر ہوتا ہے۔

زحافظان جہان کس چو بندہ جمع نکرد لطائف حکمی با نکات قرآنی

حافظ قرآن ہونے کی نسبت سے ہی آپ نے حافظ تخلص کیا۔ آپ کے کلام میں جو تاثیر پائی جاتی ہے، اسے وہ قرآن خوانی ہی کا فیض بتاتے ہیں۔

ندیدم خوشتر از شعر تو حافظ بہ قرآنی کہ اندر سینہ داری

---

[1] مقدمہ فال ہائے حافظ آقائے عزت پور جلد اول ص ۳

[2] دیکھئے میخانہ عبدالنبی مطبوعہ لاہور ص ۸۰

حافظ نے علمِ حکمت شمس الدین عبد اللہ شیرازی کی صحبت میں رہ کر حاصل کیا تھا۔ تذکرہ نویس یہ بھی لکھتے ہیں کہ قاضی عضد الدین عبد الرحمن یحییٰ سے بھی افیض تلمذ تھا۔ آقائے[1] فروز الفر نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ حافظ چالیس سال تک تحصیلِ علم میں مصروف رہے۔ اس کی دلیل میں وہ ذیل کا شعر پیش کرتے ہیں۔

علم و فضلی کہ بہ چِل سال دلم جمع آورد ترسم آن نرگس مستانہ بیک جا ببرد

اس شعر کا غالباً یہ مطلب ہے کہ چالیس سال جو علمی سرمایہ وہ حاصل کر چکے ہیں، سب محبوب کی نرگسِ مستانہ کی نذر ہو جائے گا۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ چالیس سال تک تعلیم پاتے رہے۔ بہر حال تذکروں سے پتا چلتا ہے۔ کہ آپ نے تعلیمی شوق پورا کرنے کے لیے اپنے وسائل سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

ایک افسانہ

ملا عبد النبی[2] اپنی تالیف "میخانہ" میں لکھتے ہیں کہ محلے میں ایک بزاز تھا جو ذوقِ سلیم رکھتا تھا، اور شعر کہتا تھا۔ اسی وجہ سے اکثر اہلِ ذوق اس کی دکان پر آ بیٹھتے تھے۔ اور شعر سنتے سناتے تھے۔ حافظ بھی اس صحبت میں شریک ہوتے اور خود بھی فکرِ سخن کرتے تھے۔ شروع شروع میں بے تکے شعر کہتے اور یار لوگ اپنی "بیداد" سے ان کا مضحکہ اڑاتے تھے۔"

عبد النبی یہ بھی لکھتا ہے کہ اس عرصے میں آپ کو ایک زنِ بازاری "شاخ نبات" سے عشق ہوا۔ لیکن مالی حالت خراب تھی اور اس پر مستزاد یہ کہ لکھنا پڑھنا بھی نہ جانتے تھے، اس لیے وصالِ یار کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ آخر آپ نے بابا کوہی کے مزار پر چلّہ کشی شروع کی۔ چالیسویں[3] روز ریاضت کے بعد آپ کو نیند آ گئی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ امیر المومنین حضرت علی المرتضٰیؓ کھڑے ہیں اور فرما رہے ہیں۔ "جا! تم پر اب تمام علوم کے دروازے کھل

---

[1] دیکھیے حافظ شیریں سخن مولفہ محمد معین [2] میخانہ عبد النبی ص ۸۱

[3] بعض تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ ایک ہی رات کی گریہ وزاری سے آپ کو یہ بشارت ملی۔

گئے۔" چنانچہ دوسرے دن صبح کو اٹھے، تو ایک غزل لکھی، جس کا مطلع یہ ہے۔

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند | وندر آں ظلمت شب آب حیاتم دادند

اس غزل کا نشا تھا کہ گھر گھر آپ کی شاعرانہ عظمت کے چرچے ہونے لگے۔ اس غزل کے دو شعر حسب ذیل ہیں۔

ایں ہمہ شہد و شکر کز سخنم می ریزد | اجر صبر یست کز آں شاخ نباتم دادند
شکر شکر بشکرانہ بیفشاں حافظ | کہ نگار خوش و شیریں حرکاتم دادند

یہ وہ اشعار ہیں، جن سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید آپ کی بے علمی اور وصال یار کا افسانہ درست ہو۔ چنانچہ شبلی نعمانی[1] ایسے ثقہ مؤرخ نے بھی لکھ دیا ہے کہ " اس میں اگرچہ خوش اعتقادی اور وہم پرستی نے بعض باتیں بڑھا دی ہیں، تاہم بہت کچھ اصلی واقعات ہیں۔ پروفیسر براؤن نے بھی یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ آج بھی بعض اہل شیراز بقول محمد معین[2] یہ کہتے ہیں۔ کہ شاخ نبات کا گھر " کوئی درب شاہزادہ "..... میں ابھی تک صحیح و سالم ہے۔

افسانہ تنقید کی روشنی میں

اگر اس حسن اتفاق پر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو اس میں صداقت معلوم نہیں ہوتی۔ ایک ہی رات کے خواب کے بعد کسی بے علم شخص کا صاحب علم و عرفان ہو جانا، اور ایسے شعر کہنا، جو اس کی شاعری کا شاہکار کہے جا سکتے ہیں، علمی لحاظ سے قابل قبول نہیں اور پھر تاریخی اعتبار سے بھی یہ کچھ درست نہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، آپ نے باقاعدہ مدرسے میں تعلیم پائی، کلام مجید حفظ کیا۔ حکمت و فلسفہ کی تعلیم مستند علما سے پائی۔ تفسیر کے علم میں مہارت حاصل کی، جس کی بدولت بالآخر آپ اس لائق ہوئے کہ علامہ زمخشری کی "کشاف" پر حاشیہ لکھیں! ایسا شخص سن بلوغ تک پہنچتے تک علم و فضل سے کورا کیسے

---

[1] شعر العجم جلد دوم ص ۱۹۱ [2] حافظ شیریں سخن ص ۱۰۲

رہ سکتا ہے۔

شاخ نبات عورت کا نام تو ہو سکتا ہے، لیکن یہ کہ وہ حافظ کی محبوبہ تھی، ان کے اشعار سے ثابت نہیں ہوتا۔

شاخ نبات کا بعض اور اشعار میں بھی ذکر آتا ہے، جہاں حافظ شاخ نبات سے اپنا "شیریں سخن قلم" مراد لیتے ہیں، مثلاً

حافظ چہ طرفہ شاخ نباتی ست کلک تو — کش میوہ دلپذیر تر از شہد و شکر است

کلک حافظ شکرین شاخ نبات است ببین — کہ دراین باغ نہ بینی ثمری بہتر ازیں

یُوں بھی حافظ کے دیوان میں اس فرضی محبوبہ کا ذکر خال خال ہی آیا ہے۔ اگر شاخ نبات واقعی آپ کی محبوبہ ہوتی جس کا وصال انھیں روحانی فیض کے ذریعے حاصل ہوا تھا، تو اس کا ذکر دیوان میں اکثر آنا چاہیے تھا۔

حافظ کے ہم عصر حکمران

صوبہ فارس کے متعدد ایک حکمران حافظ کے ہمعصر تھے۔ ان میں سے بعض نے آپ کی سرپرستی بھی کی۔ سب سے پہلا حکمران جس نے آپ کی قدردانی کی، ابواسحٰق اینجو ہے، جو منگول بادشاہ غازان خان کے عہد میں فارس کا حاکم مقرر ہوا تھا۔ ابواسحٰق خود شاعر تھا شاعروں کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ وہ فطرتاً عیش پسند اور عافیت کوش شخص تھا۔ اسے جب یہ اطلاع ملی کہ مبارزالدین حاکم یزد شیراز پر حملہ آور ہونے کے ارادے سے آرہا ہے، تو اس نے جواب دیا کہ ایسے شخص سے بڑا احمق کون ہوگا، جو موسم بہار کو یوں ضائع کردے۔ چنانچہ یہ شعر کہا۔

بیا تا یک امشب تماشا کنیم — چو فردا شود کار فردا کنیم

حافظ ابواسحٰق اینجو کے مختصر سے عہد کے متعلق لکھتے ہیں۔

راستی خاتم فیروزہ بواسحاقی — خوش درخشید ولی دولت مستعجل بود

ابو اسحٰق آخر مبارز الدین کے ہاتھوں ۷۵۸ھ مطابق ۱۳۵۶ء میں شکست کھا کر قتل ہوا اور شیراز پر مبارز الدین قابض ہو گیا۔

مبارز الدین یزد کا حکمران تھا۔ یہاں اس نے اپنے باپ شرف الدین مظفر بن منصور کے نام پر آزاد مظفری حکومت کی بنیاد رکھی تھی اور اب ابو اسحٰق پر فتح پا کر شیراز اور کرمان کے علاقے اپنی مملکت میں شامل کر لیے۔

مبارز الدین بہت سخت گیر حکمران تھا۔ اس نے حکومت حاصل کرنے کے بعد حکم دیا۔ کہ شیراز کے شراب خانے بند کر دیئے جائیں۔ اسی لیے شیراز کے بذلہ سنج اسے "محتسب" کے نام سے یاد کرنے لگے۔ حافظ شراب کے دلدادہ تھے، انھوں نے اس حادثہ پر ذیل کے اشعار میں اپنے تاثرات بیان کیے ہیں۔

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گل بیز است | بہ بانگ چنگ مخور می کہ محتسب تیز است
در آستین مرقع پیالہ پنہان کن | کہ ہم چو چشم صراحی زمانہ خون ریز است
زرنگ بادہ بشوئید خرقہ ہا از اشک | کہ موسم ورع و روزگار پرہیز است

مبارز الدین بہت جنگجو حکمران تھا، اس نے کچھ اور بھی علاقے فتح کر کے اپنی سلطنت کو وسیع کیا، زندگی کچھ مہلت دیتی، تو شاید اور بھی پاؤں پھیلاتا، لیکن اس کے ظلم اور تند خوئی کی وجہ سے اس کے دونوں بیٹوں شاہ محمود اور شاہ شجاع نے اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ آخر جب شاہ شجاع اس پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا، تو اس نے باپ کی آنکھوں میں دہکتی ہوئی سلائی پھیر کر اس کی کشور کشائی کی تمنا کو خاک میں ملا دیا۔

حافظ نے مبارز الدین کے انجام کا یوں ذکر کیا ہے۔

دل منہ بر دنیی و اسباب او | زانکہ از او کس وفاداری ندید
آنکہ روشن شد جہان بینش بدو | میل در چشم جہان بینش کشید

مبارز الدین کے بعد اس کا بیٹا شاہ محمود عراق و عجم کا حکمران بنا اور شاہ شجاع نے

شیراز، کرمان اور یزد کی حکومت سنبھالی اور ۷۶۰ھ سے ۷۸۶ھ بمطابق ۱۳۵۸ء تا ۱۳۸۴ء تک حکومت کی۔

شاہ شجاع حافظؔ کا دوسرا سرپرست ہے، جس کی مدح میں اس نے متعدد قصیدے کہے ہیں۔

شاہ شجاع خود ادبی ذوق رکھتا تھا اور شاعروں کی صحبت کو بہت پسند کرتا تھا۔ اس کے زمانے میں تمام معاشرتی پابندیاں، جو اس کے باپ نے لگائی تھیں، ختم ہو گئیں یہاں تک کہ میخانوں کے دروازے بھی کھول دیئے گئے۔ یہ مژدہ جانفزا حافظ نے سنا، تو ذیل کے اشعار کہے۔

سحر ز ہاتف غیبم رسید مژدہ بگوش	کہ دور شاہ شجاع است مے دلیر
شد آن کہ اہل نظر بر کنارہ می رفتند	ہزار گونہ سخن بر دہان و لب خاموش
بہ بانگ چنگ بگوئیم آن حکایت ہا	کہ از نہفتن آن دیگ سینہ می زد جوش
رموز مملکت خویش خسروان دانند	گدای گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

شاہ شجاع آل مظفر کا ایک مدبر اور قوی ہمّت حکمران تھا، اس کے عہد میں فارس میں امن و امان قائم رہا، لیکن ۷۸۶ھ بمطابق ۱۳۸۴ء میں جب وہ فوت ہوا تو شاہزادوں میں کوئی بھی اس قابل نہ تھا کہ مضبوط حکومت قائم کر سکے، لیکن حکمران بننے کے خواب سبھی دیکھتے تھے۔ آخر شاہ شجاع کا ایک بیٹا زین العابدین، باپ کا جانشین بننے میں کامیاب ہو گیا۔ اگرچہ اہل فارس اسے اچھا سمجھتے تھے اور اس نے بخشش و سخاوت سے بھی بااثر لوگوں کے دل مٹھی میں لینے کی کوشش کی۔ لیکن کوئی مستحکم حکومت وہ بھی نہ قائم کر سکا۔ حکومت کی کمزوری کی وجہ سے خود غرض لوگوں نے فائدہ اٹھایا۔ جاہ پسند خود سر ہو گئے۔ ظلم و ستم کا بازار گرم ہوا۔ قتل و غارت سے ہراس پھیلا۔ قحط پھوٹ پڑا، وبائیں پھیلیں، طرح طرح کے مصائب ٹوٹے اور ملک کا امن و سکون تباہ ہو گیا۔

حافظ نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اسے اپنے ہم وطنوں کے رنج و اندوہ سے انتہائی قلق تھا۔ ذیل کے اشعار میں جہاں اس نے مایوسی اور ناامیدی کا اظہار کیا۔ وہاں یہ خواہش بھی ظاہر کی ہے کہ ملک میں کوئی قاہر و قادر حکمران ہو، جو ملک کا نظم و نسق بحال کر دے۔ یہ غالباً امیر تیمور کی طرف اشارہ ہے۔

سینہ مالامال درد است ای دریغا مرہمی — دل ز تنہائی بجان آمد خدا را ہمدمی
چشم آسائش کہ دارد از سپہر تیز رو — ساقیا جامی بمن دہ تا بیاسایم دمی
زیرکی را گفتم این احوال بین، خندید و گفت — صعب روزی، بوالعجب کاری، پریشان عالمی
سوختم در چاہ صبر از بہر آن شمع چگل — شاہ ترکان فارغ است از حال ما کو رستمی
در طریق عشقبازی امن و آسایش بلاست — ریش باد آن دل کہ با درد تو خواہد مرہمی
اہل کام و ناز را در کوی رندی راہ نیست — رہروی باید، جہان سوزی، نہ خامی بیغمی
آدمی در عالم خاکی نمی آید بدست — عالمی دیگر بباید ساخت وز نو آدمی
خیز تا خاطر بدان ترک سمرقندی دہیم — کز نسیمش بوی جوی مولیان آید ہمی

گریۂ حافظ چہ سنجد پیش استغنای عشق
کاندرین دریا نماید ہفت دریا شبنمی

حافظ حزن پسند شاعر تو نہیں، لیکن یہاں وہ اس حد تک مایوس و ناامید نظر آتا ہے: کہ بھری دنیا میں اسے کوئی انسان نہیں دکھائی دیتا۔ چنانچہ وہ کسی نئے آدم کی تخلیق کا آرزومند ہے۔

آدمی در عالم خاکی نمی آید بدست — عالم دیگر بباید ساخت وز نو آدمی

ادھر کمزور حکمرانوں کی وجہ سے طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو رہی تھیں ادھر امیر تیمور ماوراء النہر اور ترکستان فتح کر کے ایران کا رخ کر چکا تھا۔ سب سے پہلے اس نے آذربائیجان کا علاقہ فتح کیا، اور ۷۸۸ھ مطابق ۱۲۸۶ء میں اس نے زین العابدین کو کہلا بھیجا کہ تمہارے والد نے دوستانہ مراسم پیدا کرنے کے لیے ہماری اطاعت قبول کر لی تھی۔ اور مرتے وقت اس نے

تمھیں ہمارے سپرد کیا تھا، اب بہتر یہ ہے کہ یہاں آکر ہم سے ملاقات کرو، تاکہ فارس کی حکومت پھر تمھیں مل جائے اور تمہارے لیے سرفرازی کا موجب ہو۔

سلطان زین العابدین نے کوئی جواب دیا، نہ ایلچی کو واپس ہی جانے کی اجازت دی، جس پر امیر تیمور سخت غضب ناک ہوا، اور ہمدان سے اصفہان اور فارس کا رُخ کیا۔ ۷۸۹ھ مطابق ۱۳۸۷ء میں امیر تیمور عراق کے علاقہ اصفہان کے گرد و نواح میں آپہنچا۔ یہاں کے حکمران امیر مظفر کاشی نے، جو زین العابدین کا ماموں تھا، سُنا تو وہ امیر تیمور کے استقبال کو بڑھا، اور قلعے کی چابیاں اس کے حوالے کر دیں۔ امیر تیمور نے اپنی مہربانیوں سے حاکم اصفہان کو سرفراز کیا۔ اور یہ طے ہوا کہ وہ تیموری سپاہیوں کے لیے نقد رقم دے۔ چنانچہ امیر تیمور کے امراء جب مقررہ رقم وصول کرنے کے لیے شہر میں داخل ہوئے، تو انھوں نے اہلِ شہر پر کچھ ظلم و تعدی بھی کی جس کی وجہ سے اہلِ شہر نے بعض تیموری امراء کو قتل کر دیا۔ امیر تیمور نے سنا تو سخت غضب ناک ہوا، اور اپنی خونریز سپاہ کو حکم دیا کہ اصفہان کے گلی کوچوں میں قتلِ عام کیا جائے۔ چنانچہ بے دریغ انسانی خون بہایا گیا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ بیس ہزار انسان اس حادثے میں لقمہ اجل ہوئے۔

اس عرصے میں زین العابدین بغداد جانے کے ارادے سے شوستر روانہ ہوا، یہاں کے حاکم شاہ منصور نے، جو اس کا ماموں زاد بھائی تھا اُسے قید کر دیا۔ زین العابدین کا بیٹا شاہ یحییٰ، جو حاکم یزد تھا، امیر تیمور کی اطاعت کے لیے شیراز آیا۔ ادھر زین العابدین کا چچا سلطان احمد جو حاکم کرمان تھا اظہارِ اطاعت کے لیے آگے بڑھا اور امیر تیمور کی خدمت میں پہنچ گیا اور ۷۸۹ھ مطابق ۱۳۸۷ء میں امیر تیمور کا فارس پر بلا زحمت تسلط ہو گیا۔ یہاں وہ بقول حافظ ابرو دو ماہ رہا۔ آخر ماوراء النہر میں کسی دشمن کے حملے کی خبر ملی، تو اس نے آلِ مظفر کے علاقے اس طرح تقسیم کر دیئے کہ فارس کی حکومت شاہ یحییٰ کو دی، اصفہان کا حاکم اُس کے بیٹے سلطان محمد کو مقرر کیا اور کرمان کی حکومت سلطان احمد کو سونپی اور خود سمرقند کی طرف روانہ

ہوا۔ بقول ڈاکٹر قاسم غنی دیوان حافظ کے بعض نسخوں میں ذیل کا قطعہ ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غلبۂ تیمور اور فارس پر اس کا تسلط حافظ نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

چشم کشا قدرت یزدان بہ بین | نیم تنی ملک سلیمان گرفت
دست نہ و ملک بہ زیر نگین | پائی نہ و خنگ فلک درمیان
کیست کہ گوید کہ چنان یا چنین | این ہمہ او می کند او می دہد

حافظ کو یہ امید تھی کہ امیر تیمور ایک قاہر اور قادر حکمران ہے ممکن ہے اس کی توجہ سے فارس کے حالات سدھر جائیں لیکن اس کی حکومت قائم ہونے پر بھی حالات میں کوئی اصلاح نہ ہوئی۔ اصفہان کے قتل عام کے بعد جب وہ شیراز میں داخل ہوا، تو تیموری سپاہیوں نے یہاں بھی بڑے بڑے ستم ڈھائے۔ خواجہ حافظ نے بزبان حال یہ شعر کہا ؎

روزی اگر غمی رسدت تنگ دل مباش | رو شکر کن مباد کہ از بد بتر شود

شاہ منصور نے یہ سنا کہ امیر تیمور اپنے وطن کو لوٹ گیا ہے تو اس نے شیراز کا رخ کیا یحییٰ نے بھاگ کر یزد کی راہ لی اور سنہ ۷۹۰ھ مطابق ۱۳۸۸ء میں شیراز پر شاہ منصور قابض ہو گیا۔

آخر پانچ سال بعد پھر تیمور ایران آیا اور یہ دیکھ کر کہ یحییٰ کو شاہ منصور نے نکال باہر کیا ہے، شیراز پر فوج کشی کی۔ شاہ منصور نے اس کا مردانہ وار مقابلہ کیا لیکن آخر شکست کھا کر قتل ہوا۔ اور اس طرح ۷۹۵ھ مطابق ۱۳۹۲ء میں تیمور کے ہاتھوں آل مظفر کا خاتمہ ہو گیا۔

تیمور اور حافظ کی ملاقات۔ تیمور اور حافظ کی ملاقات ہوئی یا نہیں، یہ ابھی تک ایک معمہ ہے۔ اکثر قدیم تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ ان دونوں کی ملاقات ہوئی۔

دولت شاہ سمرقندی[1] لکھتا ہے کہ جب امیر تیمور نے ۷۹۵ ہجری میں فارس کو مسخر کر لیا۔

---

[1] تذکرۃ الشعراء صفحہ ۲۰۶۔ شیخ مبارک علی

تو شاہ منصور کو قتل کرنے کے بعد خواجہ حافظ شیرازی کو بلوا بھیجا، اور کہا "میں نے اپنی ضرب شمشیر سے دنیا کو محض اس لیے برباد کیا ہے کہ سمرقند اور بخارا کو آباد کروں، اور آپ ترک شیرازی کے ایک خال کے عوض انھیں دینے کو تیار ہیں۔" جیسا کہ آپ کا یہ شعر ظاہر کرتا ہے۔

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل ما را — بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

خواجہ حافظ کہنے لگے، اسی بخشش و فیاضی سے تو فقر و فاقہ تک نوبت پہنچی ہے۔ امیر تیمور ہنس پڑا، اور خواجہ حافظ کو اپنی عنایات سے نوازا۔"

سر جان میلکم[1] اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ "حافظ شیرازی کی ملاقات جب تیمور سے ہوئی، تو تیمور نے آپ کی بہت عزت کی اور مہربانیوں سے نوازا۔"

تذکرہ آتش کدہ اور ریاض العارفین میں بھی اس خیال کی تائید کی گئی ہے۔ "انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" میں لکھا ہے کہ تیمور ۷۸۹ھ مطابق ۱۳۸۷ء ایران فتح کرنے کے ارادے سے شیراز آیا، اور دو ماہ وہاں قیام کیا، اور اس بات کا امکان ہے کہ حافظ کی امیر تیمور سے ملاقات ہوئی ہو۔

حافظ و تیمور کی ملاقات پر اعتراض ۔ اس ملاقات پر بعض جدید نقاد اعتراض کرتے ہیں۔ آقائے عبدالرحیم خلخالی دیوان حافظ کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ "یہ ملاقات محض افسانہ ہے جس میں کوئی صداقت نہیں۔" آقائے پژمان[2] نے بھی ان کی تائید کی ہے۔ ان جدید محققین کا بڑا اعتراض یہ ہے کہ قدیم تذکرہ نویسوں نے ملاقات کا زمانہ ۷۹۵ھ مطابق ۱۳۹۲ء بتایا ہے۔ لیکن حافظ کا انتقال ۷۹۱ھ مطابق ۱۳۸۷ء تا ۱۳۸۸ء میں ہوا تھا، اس لیے ملاقات کا کوئی امکان نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ دولت شاہ نے ملاقات کا سن ۷۹۵ھ مطابق ۱۳۹۲ء ہی

---

[1] مطبوعہ سندھ صفحہ ۲۰۸ [2] مقدمہ دیوان حافظ صفحہ ۲۴

لکھا ہے۔ لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ امیر تیمور ۷۸۹ - ۷۹۰ھ مطابق ۱۳۸۷ تا ۱۳۸۸ء میں شیراز ہی میں تھا۔ یہاں اُس نے دو ماہ قیام کیا، اور آلِ مظفر کی سلطنت مختلف حکمرانوں کے سپرد کر کے ماوراء النہر واپس گیا۔ جیسا کہ تذکروں میں ذکر آتا ہے، امیر تیمور کا یہ دستور العمل تھا کہ وہ جس علاقے کو فتح کر لیتا وہاں کے علماء کی تالیفِ قلوب کے لیے ان سے ملاقات کرتا تھا۔ حافظ کی شہرت نہ صرف یہ کہ ایران بھر میں تھی، بلکہ گرد و نواح کے ممالک میں بھی تھی اس لیے یہ بعید از قیاس نہیں کہ اس نے حافظ کو طلب کر کے ان سے ملاقات کی ہو۔ یہ ممکن ہے کہ ملاقات کا سن لکھنے میں دولت شاہ سے سہو ہو گیا ہو اور یہ ملاقات ۷۹۵ھ کی بجائے ۷۸۹ھ مطابق ۱۳۸۷ء میں ہوئی ہو۔ جب کہ تیمور فارس پر بلا مزاحمت قابض ہوا تھا۔ لیکن ملاقات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ آقائے خلخالی اور آقائے پژمان نے اور کوئی خاص دلیل نہیں دی، جس سے یہ ملاقات محض افسانہ ثابت ہو سکے، اس لیے دولت شاہ کا بیان قدرے ترمیم کے ساتھ درست معلوم ہوتا ہے۔

شیراز سے محبت ۔ حافظ کو شیراز سے بہت محبت تھی۔ اس محبت کی وجہ سے وہ شیراز چھوڑ کر کہیں جانا نہ چاہتے تھے، یہاں تک کہ عراق کے حکمران سلطان احمد جلائر نے بغداد آنے کی دعوت دی، لیکن حافظ نے معذرت کی۔ کہیں نکلے بھی، تو یزد تک کا سفر کر کے واپس شیراز آ گئے۔ سلطان محمود شاہ بہمنی والیِ دکن ۷۸۰ھ تا ۷۹۹ھ مطابق ۱۳۷۸ء تا ۱۳۹۶ء نے آپ کو دکن آنے کی دعوت دی، اور زادِ راہ بھی بھیجا۔ حافظ نے ہندوستان آنے کے لیے تیاری کی چنانچہ بندرگاہ ہرمز میں جہاز پہ سوار بھی ہوئے، لیکن سمندر میں تلاطم دیکھا، تو جہاز سے اتر آئے اور سفر کا ارادہ ترک کر دیا۔ ایک غزل لکھ کر سلطان محمود کی خدمت میں بھیج دی، جس کا مطلع یہ ہے۔

دمی با غم بسر بردن جہان یکسر نمی ارزد　　بہ می بفروش دلق ما کزین بہتر نمی ارزد

حافظؔ نے ساری عمر شیراز میں بسر کی اور مصلّی کی بادِ نسیم اور "رکن آباد" کے چشمے کی سیر کو زندگی

کا بہترین مصرف سمجھا۔

نمی دہند اجازت مرا بہ سیر و سفر نسیم باد مصلّیٰ و آب رکناباد

وفات حافظ شیرازی کی وفات ۷۹۱ھ مطابق ۱۳۸۸ء میں ہوئی اور اپنی محبوب سیرگاہ مصلّیٰ میں دفن ہوئے۔ کسی خوش فکر شاعر نے تاریخ وفات "خاک مصلیٰ" سے نکالی ہے۔ اسی نسبت سے اب اہل ایران مصلّیٰ کو "خاکِ مصلیٰ" کہنے لگے ہیں۔

تصنیف حافظ کی زندہ جاوید یادگار آپ کا دیوان ہے، جو اُن کے ایک شاگرد اور دوست محمد گل اندام نے مرتب کیا تھا۔ دیوان غزلیات، قصائد، قطعات، اور چند رباعیوں پر مشتمل ہے۔

حافظ کا تغزل۔ جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔ خواجو کرمانی نے جذبہ اور فکر کے امتزاج سے جو جدت غزل میں پیدا کی، اس پر حافظ نے کلام کی بنیاد رکھی۔ اس لحاظ سے گویا حافظ نے بھی "سبک عراقی" کی پیروی کی۔ صنائع بدائع، جنھیں "محسناتِ شعری" کہا جاتا ہے، سبک عراقی کا خاصہ ہیں۔ حافظ نے بھی اپنے کلام کو محسنات شعری سے زینت دی ہے، لیکن صنائع و بدائع سے کچھ اس انداز میں کام لیا ہے کہ جذبات و واردات کے اظہار کو اس سے اور زیادہ مدد ملی۔ اسی وجہ سے ایران کے جدید محققین نے حافظ کے سبک شعری کے لیے "سبکِ فارسی"[۱] کی نئی اصطلاح وضع کی ہے، جو صرف انہی کے لیے مخصوص ہے۔

خصوصیات۔ حافظ کے تغزل پر سیر حاصل بحث کرنا اس مختصر سے تذکرے میں ممکن نہیں، البتہ چند اہم خصوصیات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۱۔ **امید پسندی**۔ آپ کے تغزل کی سب سے بڑی خوبی، امید پسندی ہے۔ ایران

---

[۱] دیکھیے حافظ شیریں سخن مؤلفہ آقائے محمد معین صفحہ ۳۷۸۔۳۸۱

کے اکثر بڑے شعرا کے کلام میں جابجا حزنیت نظر آتی ہے۔ یہ شعرا زمانہ حال سے غیر مطمئن اور مستقبل سے مایوس ہیں۔ ان کی زندگی ناکامیوں کا مرقع ہے، لیکن ان کے برعکس حافظ عموماً ناموافق حالات میں بھی ہمت نہیں ہارتے۔ انھیں بھی دوسرے شعرا کی طرح ہجر کی تاریک و طویل رات کا سامنا تو ہے۔ لیکن وہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ رات ختم ہوگی اور صبح درخشاں اس کی جگہ لے گی، جو پیامِ مسرت لائے گی، اور غمکدہ گلستان طرب بن جائے گا، چنانچہ ذیل کی پوری غزل اسی انداز میں لکھی ہے، چند شعر درج ذیل ہیں ~

یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعان غم مخور	کلبۂ احزان شود روزی گلستان غم مخور
ای دل غمدیدہ حالت بہ شود دل بد مکن	وین سر شوریدہ باز آید بسامان غم مخور
دور گردون گر دو روزی بر مراد ما نرفت	دائماً یکسان نباشد حال دوران غم مخور
ہان مشو نومید چون واقف نہ ای از سر غیب	باشد اندر پردہ بازیہای پنہان غم مخور

اس کے علاوہ اور بھی کئی غزلیں ہیں جن میں اُمید پسندی کی تلقین کی گئی ہے۔ ایک غزل کا مطلع درج ذیل ہے ~

رسید مژدہ کہ ایام غم نخواہد ماند	چنین نماند چنان نیز ہم نخواہد ماند

۲۔ بلند ہمتی کی تلقین۔ حافظ کے تغزل کی ایک دوسری امتیازی خصوصیت بلند ہمتی اور فراخ حوصلگی ہے ان کا خیال ہے کہ انسان کو یہ ہرگز نہیں سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ وہ گردش افلاک کا اسیر ہے، بلکہ ناموافق گردش کرنے والے افلاک کو ایک مجاہد برہم بھی کر سکتا ہے۔

چرخ برہم زنم ار غیر مرادم گردد	من نہ آنم کہ زبونی کشم از چرخ فلک

ایک ذرۂ بے مقدار ہمت عالی سے چشمۂ خورشید کا طالب ہو سکتا ہے۔

ذرہ را تا نبود ہمت عالی حافظ	طالب چشمۂ خورشید درخشان نشود

۳۔ سعی و کوشش۔ حافظ کے نزدیک فضیلت اور کمال حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان ہنرمند اور علم و دانش سے آراستہ ہو۔ یہ چیزیں سعی و کوشش کے بغیر حاصل نہیں

ہوتیں۔

روندگان طریقت بہ نیم جو نخرند — قبای اطلس آنکس کہ از ہنر عاریست

گرچہ وصالش نہ بکوشش دہند — آن قدر ای دل کہ توانی بکوش

سعی ناکردہ درین راہ بجائی نرسی — مزد اگر می طلبی طاعت استاد ببر

۴۔ **آزادہ روی۔** حافظ علائق دنیا سے آزاد تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے حکمرانوں کے قصیدے بہت کم کہے ہیں، اور اگر کہے ہیں، تو ان میں بے جا خوشامد نہیں۔ وہ ایسے انسان کو قابلِ قدر سمجھتے ہیں۔ جو علائق دنیا سے آزاد ہیں۔

غلام ہمت آنم کہ زیر چرخ کبود — ز ہر چہ رنگ تعلق پذیرد آزاد است

۵۔ **زندگی سے فرار۔** جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے آل مظفر کے عہد آخر میں ایران میدان گیر و دار بنا ہوا تھا۔ حکومتیں قائم ہوتیں اور ضعف و خلل کا شکار ہو کر رہ جاتی تھیں، ظلم و ستم کا دور دورہ تھا۔ خانہ جنگی شروع تھی۔ عوام قحط سے دوچار تھے۔ ملک کا امن و سکون غارت ہو چکا تھا۔ حافظ ایسے حساس انسان کا ان حالات سے متاثر ہونا قدرتی بات ہے۔ انہیں جب عوامی مصائب کا کوئی مداوا نظر نہیں آتا، تو وہ اس رنج و اندوہ کی دنیا میں ایک ایسا خیالی گوشہ بنا لیتے ہیں، جہاں انہیں اطمینان نصیب ہو جاتا ہے۔ گویا وہ زندگی سے ایک طرح کا سمجھوتہ کر لیتے ہیں، اسی سمجھوتے کو فلسفیانہ اصطلاح میں "فرار" کہا جاتا ہے۔ ایک پوری غزل اسی کیفیت فرار کی مظہر ہے۔

دو یار زیرک و از بادہ کہن دو منی — فراغتی و کتابی و گوشۂ چمنی

من این مقام بدنیا و آخرت ندہم — اگرچہ در پیم افتند ہر دم انجمنی

ہر آنکہ کنج قناعت بگنج دنیا داد — فروخت یوسف مصری بکمترین ثمنی

بیا کہ رونق این کارخانہ کم نشود — بزہد ہمچو توئی یا بفسق ہمچو منی

ز تندباد حوادث نمی توان دیدن — درین چمن کہ گلی بودہ است یا سمنی

ببین در آئینۂ جام نقش بندیِ غیب — کہ کس بیاد ندارد چنین عجب زمنی

ازین سموم کہ بر طرف بوستان بگذشت

عجب کہ بوئے گلی ہست و رنگ نسترنی

رنج و اندوہ کی تاریکیوں میں بھی انھیں امید کی کرن نظر آتی ہے، تو پکار اٹھتے ہیں ؎

بصبر کوش تو اے دل کہ حق رہا نکند — چنیں عزیز نگینی بدست اہرمنی

۶۔ ذکر شراب ۔ حافظ شراب کو رنج و الم کا مداوا خیال کرتا ہے۔ ان کے نزدیک صرف یہی ایک ایسی چیز ہے، جس سے زندگیوں کی تلخیوں کو بھلایا جا سکتا ہے۔

بیا کہ وضعِ جہان را چنان کہ من دیدم — گر امتحان بکنی می خوری و غم نخوری

نہ ہر خبر کہ شنیدم سری بحیرت داشت — ازین سپس من و ساقی و وصفِ بیخبری

ساقیا برخیز و در دہ جام را — خاک بر سر کن غمِ ایام را

حافظ کی مستی و سرشاری اس لیے نہیں کہ حواس کچھ عرصے کے لیے معطل ہو جائیں، بلکہ اس لیے کہ حواس بیدار تر ہو جائیں۔ اس حالت میں اگر محبوب ان کا ساتھ دے، تو وہ اپنے میں یہ صلاحیت بھی پاتے ہیں کہ ناموافق ماحول بدل کر اسے اپنے منشا کے موافق بنا لیں، چنانچہ اپنی مستی و سرشاری کی کیفیت کو ذیل کے شعر میں پیش کرتے ہیں۔

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم — فلک را سقف بشگافیم و طرح نو در اندازیم

شراب پی کر انسان گناہ کا تو مرتکب ہوتا ہے، لیکن حافظ کے نزدیک شراب پینا بہر حال وقف کا مال کھانے سے بہتر ہے ؎

فقیہ مدرسہ دی مست بود و فتوی داد — کہ مے حرام ولی بہ ز مالِ اوقاف است

۷۔ ترنم و نغمہ ۔ حافظ کی غزلیات میں ترنم اور نغمے کا پہلو بھی بہت نمایاں ہے۔ ترنم عموماً حروفِ علت کی تکرار سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن حروفِ علت کے ساتھ جب

حروف کی ہم آہنگی شامل ہو جاتی ہے۔ تو نغمہ کی سی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ صوت و نغمہ کا حسین امتزاج حافظ کی غزلوں میں اکثر نظر آتا ہے۔ نمونے کے طور پر چند شعر درج کیے جاتے ہیں :-

کلبۂ احزان شود روزی گلستان غم مخور ۔۔۔ یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعان غم مخور

غلام نرگس مست تو تاجدار انند ۔۔۔ خراب بادہ لعل تو ہوشیار انند

بعزم توبہ سحر گفتم استخارہ کنم ۔۔۔ بہار توبہ شکن می رسد چہ چارہ کنم

۸ ۔ **ذکر صوفی** ۔ حافظ کے اشعار میں جہاں کہیں لفظ "صوفی" آیا ہے ۔ اس کا مفہوم بہت مختلف ہے ۔ اس کی وجہ غالباً اس زمانے کے صوفیا کا کردار ہے ۔ یہ صوفیا مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے تھے ۔ ہر گروہ کا مسلک جدا تھا ۔ ایک گروہ دوسرے گروہ کو برا کہتا ۔ ہر گروہ چاہتا تھا کہ حکمران کا زیادہ سے زیادہ قرب حاصل کرے ۔ چنانچہ مبارز الدین ، جو بہت سخت گیر اور تنگ نظر شخص تھا ، جب مذہب کے نام پر سخت کڑی قیود نافذ کرنا چاہتا ، تو صوفیا سے وہ بآسانی جواز کی سند لے لیتا ۔ ان لوگوں کے قول و کردار میں بہت فرق آگیا تھا ۔ خلوص کی جگہ ریا نے لے لی تھی ۔ حافظ کو بھی ان کی منافقت کی وجہ سے طرح طرح کی اذیت اٹھانی پڑی ۔ اس لیے جہاں وہ صوفی اور واعظ کا ذکر کرتے ہیں ، اس میں کچھ انتقامی جذبے کا بھی رنگ ہوتا ہے ۔ اور جہاں کہیں رندوں کا ذکر آتا ہے اس سے عارف اور صوفی صافی مراد لیتے ہیں ۔ ذیل کے اشعار مثال کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں ۔

صوفی نہاد دام و سر حقہ باز کرد ۔۔۔ بنیاد مکر و با فلک حقہ باز کرد

ای کبک خوش خرام کجا می روی بناز ۔۔۔ غرہ مشو کہ گربہ زاہد نماز کرد

حافظ مکن ملامت رندان کہ در ازل ۔۔۔ ما را خدا ز زہد و ریا بی نیاز کرد

دیوانِ حافظ اور اہلِ یورپ

انیسویں صدی کے آغاز میں جرمن کے سکالر فارسی شعر و شاعری سے متاثر ہوئے

۱۲۲۷ھ مطابق ۱۸۱۲ء میں جب ایک جرمن سکالر فان ہیمر نے دیوان حافظ کا ترجمہ کیا تو اس کے مطالعے سے جرمنی کے شعرا اور ادبا، ادبیات فارسی کی طرف اور زیادہ مائل ہوئے، یہاں تک کہ جرمن ادبیات میں ایک مستقل "مشرقی تحریک" کا آغاز ہوا جرمنی کا مشہور شاعر گوئٹے اس تحریک کا بانی ہے۔ علامہ اقبال[۱] گوئٹے کے متعلق لکھتے ہیں کہ "اس کی بے تاب اور بلند پرواز روح نے مشرقی فضا کے امن و سکون میں اپنے لیے ایک نشیمن تلاش کر لیا۔ حافظ کے ترنم نے اس کے تخیلات میں ایک ہیجان عظیم پیدا کر دیا جس نے آخر کار مغربی دیوان کی ایک پائیدار مستقل صورت اختیار کر لی۔"

گوئٹے کا مشہور سوانح نگار بیل شوشکی لکھتا ہے۔ "بلبل شیراز کی نغمہ پردازیوں میں گوئٹے کو اپنی ہی تصویر نظر آتی تھی۔ اس کو کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ شاید میری روح ہی حافظ کے پیکر میں ہو کر مشرق کی سرزمین میں زندگی بسر کر چکی ہے۔ وہی زمینی مسرت، وہی آسمانی محبت، وہی سادگی، وہی عمق، وہی جوش، وہی وسعت مشرب، وہی کشادہ دلی، اور وہی رسوم و قیود سے آزادی! غرض کہ ہر بات میں ہم اسے حافظ کا مثیل پاتے ہیں۔ جس طرح حافظ لسان الغیب اور ترجمان اسرار ہے۔ اسی طرح گوئٹے کے بیساختہ پن میں بھی حقائق و اسرار جلوہ افروز ہیں۔"

انگلستان میں دیوان حافظ کے متعدد ترجمے ہوئے، جن کا مختصر سا ذکر مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ ہرمین بکنیل نے مکمل دیوان کا ترجمہ ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں کیا۔

۲۔ مس گرٹروڈ بل نے انگریزی نظم میں حافظ کی ۴۳ چیدہ غزلوں کا ترجمہ کیا جو پہلی مرتبہ ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں شائع ہوا۔

---

[۱] دیکھیے دیباچہ پیام مشرق

۳۔ کیپٹن ولبرفورس کلارک نے پورے دیوان کا ترجمہ مع شرح و حواشی کے کیا۔ یہ ترجمہ ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۱ء میں کلکتہ میں شائع ہوا۔ مصر میں حال ہی میں پروفیسر ابراہیم نے دیوان حافظ کا ترجمہ عربی اشعار میں کیا ہے۔ اس ترجمے کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اکثر اشعار کا تجر بھی وہی ہے۔ ایک غزل کے دو شعر مع ترجمہ حسب ذیل ہیں۔

یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعان غم مخور — کلبۂ احزان شود روزی گلستان غم مخور

یوسف المفقود فی اوطانہ لا تحزنو — عاید یوماً الی کنعانہ لا تحزنو

دور گردون گر دو روزی برمراد ما نرفت — دائماً یکساں نباشد حال دوران غم مخور

ھذہ الافلاک ان دادت علی غیر المنی — لا یدوم الدھر فی حدثانہ لا تحزنو

نورالدین عبدالرحمٰن جامی (پیدائش ۸۱۷ھ مطابق ۱۴۱۴ء) (وفات ۸۹۸ھ مطابق ۱۴۹۲ء)

سرزمین ایران نے جو مشہور ترین دانش مند پیدا کیے، ان میں نورالدین عبدالرحمٰن جامی بڑی امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ جامی بلند مرتبہ شاعر، مستند عالم اور نامور صوفی صافی تھے۔

آپ خراسان کے علاقہ جام کے قصبہ خرجرد میں ۲۳ شعبان ۸۱۷ھ کو پیدا ہوئے، جیساکہ وہ اپنے دیوان دوم کے ایک قصیدے میں لکھتے ہیں۔

بسال ہشت صد و ہفدہ ز ہجرت نبوی — کہ زد زمکہ بہ یثرب سرادقات جلال

زاوج قلعہ پرواز گاہ عزّ و قدم — باین حضیض ہوان سست کردہ ام پر و بال

آپ کے والد کا نام احمد بن محمد دشتی اور دادا کا نام شمس الدین دشتی ہے دشت اصفہان کے ایک محلے کا نام ہے، جہاں شروع شروع میں آپ کے آبا و اجداد رہتے تھے، اسی محلے کی نسبت سے وہ دشتی کہلائے۔ آخر یہ لوگ اصفہان کو خیرباد کہہ کر علاقہ جام میں آباد ہوئے۔

تعلیم

آپ کو اپنے والد کے ہمراہ سیر و سیاحت کے اکثر موقعے ملتے تھے۔
ایران کے ایک محقق علی اصغر حکمت[1] لکھتے ہیں کہ عالمِ طفولیت میں جب والد کے ہمراہ آپ ہرات آئے، تو یہاں مدرسہ نظامیہ میں اقامت اختیار کر لی اور مولانا جنید اصولی کے درس میں شامل ہو گئے، جو عربی زبان کے مستند استاد تھے۔" یہاں انھوں نے علوم دینی کی تعلیم حاصل کی۔ بعد میں مولانا خواجہ علی سمرقندی، سید شریف جرجانی اور مولانا شہاب الدین جاجری سے کسب فیض کیا۔ آخر میں آپ کو ایک بزرگ سعد الدین تفتازانی کی صحبت میسر آئی۔ یہ مولانا بہاء الدین نقشبند کے خلیفہ تھے۔ جامی ان کی بدولت سلسلہ نقشبندیہ میں شامل ہوئے، اور باطنی تعلیم کے مختلف مدارج طے کیے۔

۸۷۷ھ مطابق ۱۴۷۲ء میں آپ حج کو گئے اور ہمدان، کردستان، بغداد، کربلا، نجف، مدینہ، مکہ، دمشق، حلب اور تبریز سے ہو کر واپس خراسان آ گئے۔ ان کا یہ سفر خاصہ طویل تھا۔ اس سفر کا ذکر آپ نے بڑی تفصیل کے ساتھ " رشحات عین الحیات" میں کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس سفر میں اہلِ بغداد نے آپ کے شایانِ شان سلوک نہ کیا۔ چنانچہ ایک قصیدے میں اس امر کی شکایت کی ہے۔

بکشای ساقیا بلب شط سر سبوی ۔۔۔ وز خاطرم کدورت بغدادیان بشوی

جامی کے ہمعصر سلاطین

جامی کے زمانے میں سرزمین ایران دو حکومتوں میں بٹی ہوئی تھی۔ مشرق میں تیموری بادشاہوں کی حکومت تھی۔ ان کے پایۂ تخت سمرقند اور ہرات تھے۔ ایران کے جنوب مغرب میں ترکمان سلاطین کی حکومت تھی، جن کا دار السلطنت تبریز تھا۔

تیموری سلاطین اور جامی

امیر تیمور کے بعد تیموری تخت و تاج کا وارث شاہرخ مرزا ہوا جس نے ۸۱۷ھ سے ۸۵۰ھ

---

[1] " جامی " مولفہ آقائے علی اصغر حکمت صفحہ ۶۲ بحوالہ صفی الدین مؤلف رشحات

بمطابق ۱۴۵۲ء تا ۱۴۵۶ء تک حکومت کی۔ اس زمانے کا بیشتر حصہ جامی نے تعلیم حاصل کرنے میں بسر کیا۔ شاہ رُخ مرزا کے بعد مرزا ابوالقاسم بابر بن بایسنغر بن شاہ رُخ کو خراسان، افغانستان، عراق اور فارس کی حکومت ملی۔ اس کی مدّت حکومت ۸۵۶ھ تا ۸۶۱ھ بمطابق ۱۴۵۲ء تا ۱۴۵۶ء ہے۔

مرزا شاہ رُخ فوت ہوا۔ تو اس وقت ماوراالنہر کے علاقے میں مرزا ابوسعید گورگانی کی حکومت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ خراسان کا علاقہ فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لے۔ چنانچہ جب مرزا ابوالقاسم فوت ہوا، تو اس کی یہ دیرینہ خواہش پوری ہوگئی۔ وہ ماوراالنہر سے چل کر خراسان پر حملہ آور ہوا۔ اور ۸۶۳ھ بمطابق ۱۴۵۸ء میں ہرات فتح کر لیا۔ پھر اس نے آذربائیجان کا رُخ کیا، جہاں اوزون حسن آق قوینلو حکمران تھا۔ ۸۷۳ھ بمطابق ۱۴۶۸ء میں اس نے اوزون حسن کو موت کے گھاٹ اتار کر آذربائیجان کا علاقہ بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اور ۸۶۱ھ سے ۸۷۳ھ (بمطابق ۱۴۵۶ء تا ۱۴۶۸ء) تک بڑی کامیابی سے حکومت کی۔

ابوسعید[۱] گورگانی کے زمانے میں جامی نے اپنا پہلا دیوان مرتب کیا۔
ایک مثنوی میں سلطان ابوسعید کی مدح میں چند شعر بھی کہے ہیں۔

شاہ سلطان ابوسعید کہ ہست	آسمان پیش قصر قدرش پست
پشت بر پشت شاہ و شاہ نشان	جاہ و شانش ز جاہ شاہ و شان

۸۷۳ھ بمطابق ۱۴۶۸ء میں سلطان ابوسعید، سلطان حسین بالقیرا کے ہاتھوں لڑائی میں مارا گیا، اور مشرقی ایران میں سلطان حسین بالقیرا کی حکومت قائم ہوگئی۔
سلطان[۲] حسین بالقیرا کا نسب نامہ امیرزادہ عمر شیخ کے توسط سے امیر تیمور سے ملتا ہے۔

۱؎ "جامی" مولفہ علی اصغر حکمت صفحہ ۲۰

۲؎ سلطان حسین ابن سلطان منصور ابن بالقیرا ابن عمر شیخ بن امیر تیمور

یہ آخری تیموری بادشاہ ہے جس نے ۸۷۲ھ تا ۹۱۱ھ مطابق ۱۴۶۹ء تا ۱۵۰۶ء عرصہ تک حکومت کی۔ اس کے پرچم کے سائے میں خراسان میں بہت امن و امان رہا۔ سلطان حسین بالقیرا علماء کا بہت بڑا محسن اور مربی تھا۔ اس کی سخاوت کی وجہ سے شہر ہرات علم و فضل کا مرکز بن گیا تھا۔ وہ خود بھی ایک عالم شخص تھا۔ چنانچہ "مجالس العشاق" اس کی علمی یادگار ہے۔

سلطان حسین بالقیرا کا بچپن کا رفیق، میر علی شیر نوائی تھا، جسے اُس نے وزارت کے منصب جلیلہ پر فائز کیا۔ یہ اپنے وقت کا بہت بڑا عالم تھا۔ چنانچہ نویں صدی ہجری کے آخر میں علم و ادب کو جو فروغ حاصل ہوا اس میں میر علی شیر نوائی کی علم دوستی اور ادب پروری کو بہت دخل ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بھی مختصر طور پر ذکر کیا جائے۔

میر علی شیر نوائی

میر علی شیر کریم النفس اور فیاض شخص تھا۔ وہ علماء کی محبت اہلِ فضل کی قدردانی اور شعراء کی قدر و منزلت کی وجہ سے اس قدر مشہور تھا کہ پروفیسر براؤن نے اسے مالیناس[1] سیلینوس رومی سے تشبیہ دی ہے۔ اہلِ علم اس کے گرد پروانہ وار آ آ کر جمع ہوتے تھے۔ میر علی شیر کو جامی علیہ الرحمۃ سے خاص طور پر بڑی عقیدت تھی۔ آپ نے اکثر کتابیں میر علی شیر ہی کی خواہش پر تصنیف کی تھیں۔

جامی نے ۸۹۸ھ مطابق ۱۴۹۲ء عمر میں وفات پائی تو میر علی شیر نے آپ کا مرثیہ ترکیب بند کی صورت میں لکھا۔ اس کے سات بند ہیں، جو ستر اشعار پر مشتمل ہیں۔ ترکیب بند ذیل کے شعر سے شروع ہوتا ہے۔

ہر دم از انجمن چرخ جفائی دگرست　　　ہر یک از انجم او داغ بلائی دگرست

میر علی شیر نوائی فارسی اور ترکی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا، اس نے چار دیوان اور پانچ مثنویاں تصنیف کی ہیں۔ مثنویاں خمسہ نظامی کی تقلید میں لکھی گئی ہیں۔ ایک مثنوی

---

[1] MOLCCENES E. CILINIUS یہ ایک رومی رئیس تھا جو شعراء کا بہت بڑا مربی اور محسن تھا۔

"لسان الطیر" کے نام سے عطار کی تقلید میں لکھی ہے۔ میر علی ترکی اشعار میں نوائی اور فارسی میں فانی تخلص کرتا تھا۔ اس لیے وہ "ذوالّلسانین" کے لقب سے مشہور ہوا۔

میر علی شیر نے ترکی اور فارسی میں متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں ذیل کی کتابوں کا تذکروں میں ذکر آتا ہے۔

۱۔ غزلیات کے چار دیوان

غرائب الصغر۔ نوادر الشباب، بدائع الوسط، فوائد الکبر

۲۔ خمسہ

تحفۃ الابرار۔ فرہاد و شیریں۔ لیلیٰ و مجنون، سدِ سکندری۔ سبعہ سیارہ

۳۔ مثنوی لسان الطیر (۴) تذکرہ مجالس النفائس (۵) سراج المسلمین (۶) اربعین منظوم (۷) نظم الجواہر (۸) محبوب القلوب (۹) تاریخ انبیاء (۱۰) تاریخ الملوک العجم (۱۱) نسائم المحبۃ (۱۲) رسالۂ عروضیہ (۱۳) خمسۃ المتحیرین (۱۴) محاکمات اللغتین (۱۵) حالات پہلوان اسد (۱۶) حالات سید حسن اردشیر (۱۷) مفردات در فن معمّا (۱۸) قصہ شیخ صنعان (۱۹) مناجات نامہ (۲۰) منشآت ترکی (۲۱) دیوان فارسی (۲۲) منشآتِ فارسی (۲۳) میزان الاوزان (۲۴) مکارم اخلاق

ازبکوں کے حملے اور صفوی حکومت کا قیام

سلطان حسین بایقرا کی وفات پر محمد خان شیبانی نے جو ازبک قبائل کا ایک مشہور سردار تھا، ایران پر لگاتار حملے کرکے تباہی مچائی۔ آخر شاہ اسمٰعیل صفوی کے بیٹے سام مرزا نے ازبکوں کو شکست دی، اور ہرات میں ۹۲۷ھ مطابق ۱۵۲۱ء میں صفوی حکومت کی بنیاد رکھی۔

ترکمان سلاطین اور جامی

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، جس زمانے میں مشرقی ایران کے لوگ سلطان ابوسعید اور سلطان حسین بایقرا

کے پرچم تلے امن و امان کی زندگی بسر کر رہے تھے، مغربی علاقے میں ترکمان سلاطین، جہان شاہ قراقو نیلو، اوزون حسن آق قونیلو اور اس کا بیٹا یعقوب بیگ بڑے جاہ و جلال سے حکومت کرتے تھے ان کی مدت حکومت ۸۸۱ھ تا ۸۹۶ھ مطابق ۱۴۷۶ء تا ۱۴۹۰ء ہے۔

جامی کو ان حکمرانوں سے بھی بہت قرب تھا۔ چنانچہ آپ نے اپنی ایک مثنوی "سلمان و ابسال" آخری حکمران یعقوب بیگ کے نام منسوب کی ہے۔ ذیل کے شعر میں اس کی عظمت کا ذکر کیا ہے۔

شاہ یعقوب آن جہانداری کہ ہست   با علوش ذروہ افلاک پست

دیوان سوم جو "خاتمۃ الحیوٰۃ" کے نام سے موسوم ہے، اس میں یعقوب بیگ کی مدح میں چند قصائد بھی لکھے ہیں۔ ایک قصیدے میں بادشاہ کے محل "ہشت بہشت" کی تعریف کی ہے، جو اس نے تبریز میں تعمیر کرایا تھا۔

این نہ قصر است ہمانا کہ بہشت دگر ست

کہ کشادہ برخ اہل صفا ہشت در است

جامی آن وار اگر ہشت بہشتش خوانند

چون زہر نقش در آن حور وشی جلوہ گر است

شاہ جم مرتبہ یعقوب کہ از خلق حسن

قاف تا قاف جہان وارث ملک پدر است

سلاطینِ عثمانی اور جامی

نویں صدی ہجری کے آخری نصف حصے میں جب جامی کی شہرت کا آفتاب پوری تابانی سے چمک رہا تھا۔ اس وقت ایشیائے کوچک اور جزیرہ بالکان میں ترکوں کی حکومت تھی۔ جامی کے مراسلات میں سلطان محمد فاتح ۸۵۵ھ تا ۸۸۶ھ مطابق ۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۱ء اور سلطان بایزید دوم ۸۸۶ھ تا ۹۱۸ھ مطابق ۱۴۸۱ء تا ۱۵۱۲ء کا ذکر آتا ہے۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جامی کے علم و فضل کا شہرہ مشرقی ایران سے نکل کر استنبول

تک جا پہنچا تھا۔ یہ سلاطین جامی کو انعام و اکرام بھی بھیجتے تھے اور ان سے خط و کتابت بھی کرتے تھے۔ جامی نے ایک مثنوی میں سلطان محمد فاتح کی فتوحات کا ذکر کیا ہے۔

نفس از بوی صدق مشکین کن	راه اخلاص رفتن آئین کن
از خراسان بہ بند بار نیاز	راه بردار ملک روم انداز
چون رسیدی ز راه راه بپرس	بارگاه جلال و جاه بپرس
چہره بر خاک راه دربان سای	با اجازت زمین ببوس در آی
پیش شاه مجاهد غازی	بکشا لب بہ نکتہ پردازی
کم کسی بر سریر جاه و جلال	چون تو کرد اکتساب فضل و کمال

مثنوی "سلسلۃ الذہب" کے تیسرے دفتر میں سلطان بایزید عثمانی کو خطاب کر کے لکھتے ہیں:۔

کاش نوشیروان کنون بودی	عدلش از بیشتر فزون بودی
تا ز دعویٰ عدل شرمنده	خسرو روم را شدی بنده
کردی از بندگی سرافرازی	پیش شاه مجاهد غازی
مہبط العزّ والعلیٰ سلطان	بایزید الدرم شہ دوران
خاک یونان زمین از و گلشن	جان یونانیان از و روشن

سلاطین صفویہ اور جامیؒ

سلطان حسین بایقرا کی وفات کے بعد تیموری شہزادے بدیع الزمان اور مظفر حسین تیموری تخت و تاج کی حفاظت نہ کر سکے۔ محمد خان شیبانی اور ازبکوں نے تیموری دار السلطنت ہرات کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ آخر جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، شاہ اسمٰعیل صفوی نے اپنے بیٹے سام مرزا کو ازبکوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ ۹۱۶ھ مطابق ۱۵۱۰ء میں صفویوں اور ازبکوں کے مابین جنگ ہوئی۔ محمد خان شیبانی مرو میں ہلاک ہوا۔ اور صفوی حکمران تمام خراسان کو ازبکوں سے پاک کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

جامی نے صفویوں کا دور بھی دیکھا تھا۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صفوی حکمرانوں کے ساتھ جامی کے تعلقات کا بھی مختصر طور پر ذکر کر دیا جائے۔

جامی کا شمار اہل سنت کے مشہور علماء میں ہوتا تھا۔ سلاطین صفویہ شیعہ تھے، اس لیے وہ انھیں اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ علی اصغر حکمت[1] مؤلف مجمع الفصحا کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ جب شاہ اسمٰعیل صفوی نے ہرات کو مسخر کر لیا، تو حکم دیا کہ کتابوں میں جہاں جہاں جامی کا نام لکھا گیا ہے، نقطہ بدل کر خامی کی صورت میں بدل دیا جائے۔ جامی کے خواہر زادہ ہاتفی نے اس واقع سے متاثر ہو کر ذیل کا قطعہ لکھا ہے ؎

بس عجب دارم ز انصاف شہ کشور کشا   آنکہ عمری بر درش گردون غلامی کردہ است

کز برائے خاطر جمعی لوندنا تراشش
نقطہ جامی تراشیدہ و خامی کردہ است

جامی معاصرین کی نظر میں

جیسا کہ ذکر آچکا ہے۔ جامی کی شہرت ایشیائے کوچک تک پھیلی ہوئی تھی۔ ترکی اور عثمانی دربار میں آپ کو جو مقبولیت حاصل تھی، وہ سلطان بایزید دوم کے مراسلات[2] سے ظاہر ہے، جو ان کے نام لکھے گئے تھے۔ یہ خطوط فریدون بے کے منشآت میں درج ہیں۔

بادشاہ ہند شہنشاہ بابر نے بڑی عزت اور حرمت سے انھیں یاد کیا ہے: "وی را در علوم صوری و معنوی ہمتا و برابری در عصر خود نبود۔" پھر یہ بھی لکھا ہے کہ "جامی را حاجتی بمدح و ستائش نیست، بلکہ ذکر نام او از باب تیمن و تبرکا است،"

یعنی مولانا جامی ظاہری اور باطنی علوم میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ انھیں کسی مدح و ستائش کی ضرورت تو نہیں، یہاں ان کا نام محض برکت اور سعادت حاصل کرنے کی غرض سے لکھا جاتا ہے۔

---

[1] دیکھیے "جامی" مؤلفہ آقائے علی اصغر حکمت ص ۵۲

[2] ایضاً

شاہ اسمٰعیل صفوی کا بیٹا سام مرزا اپنی تصنیف تحفہ سامی[1] میں لکھتا ہے "جامی کی انتہائی ذہانت کی وجہ سے ہیں یہ ضروری نہیں سمجھتا کہ ان کا مفصّل حال لکھا جائے۔ کیونکہ ان کے اوصاف کی کرنیں مشرق سے اقصائے مغرب تک پھیلی ہوئی ہیں اور ان کی فضیلتوں کا خوان ساحل بہ ساحل چُنا ہوا ہے"۔

دولت شاہ سمرقندی نے بھی اپنے تذکرہ میں کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ میر علی شیر نوائی نے "خمسۃ المتحیّرین" کا بیشتر حصّہ جامی ہی کی مدح و ستائش میں لکھا ہے۔

عبدالغفور لاری آپ کا ایک قابل ترین مرید تھا۔ اس نے آپ کے سوانح حیات ترتیب دیئے ہیں اور ان کی تصنیفات کا تعارف بھی کرایا ہے۔

خودداری اور غیرتِ نفس

جامی رح بہت خوددار اور غیور شاعر تھے، انہوں نے دنیاوی جاہ و منزلت کی خاطر کبھی کسی حکمران کی چوکھٹ پر سر نہیں جھکایا، لیکن اس کے باوجود حکمران ان کی بہت عزّت کرتے تھے۔ ایران کے نامور شعراء کے حالات ذرا پلٹ کر دیکھیئے تو معلوم ہوگا کہ فردوسی کو عالمِ ضعیفی میں ناقدری کا رنج دیکھنا پڑا۔ ناصر خسرو علمی فضیلت کے باوجود غریب الدیار ہوا۔ حافظ کو بالآخر حکمرانوں کی بے اعتنائی کی وجہ سے گوشہ نشین ہونا پڑا۔ لیکن جامی کی عزّت و حرمت میں حکمرانوں نے کبھی فرق نہیں آنے دیا۔

مزاح پسندی

جامی اپنے علم و عرفان کے باوجود خوش طبع اور مزاح پسند بھی تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے محفل میں ذیل کا شعر پڑھا۔

بسکہ در جان فگار و چشم بیدارم توئی
ہر کہ آید در نظر از دور پندارم توئی

---

[1] لٹریری ہسٹری آف پرشیا۔ مولفہ پروفیسر براؤن جلد سوم صفحہ ۴۲۲

کسی نے اعتراض کے طور پر کہا۔ "اگر خرانعوذ نظر می آید"؟ آپ نے فرمایا۔ "پدرام تو ئی"۔
ایک ہم عصر شاعر "ساغری" اکثر آپ کے پاس آتا جاتا تھا، اُسے یہ گلہ تھا کہ شعراء اس کے مضامین چرالیتے ہیں، آپ نے اس موضوع پر ذیل کا قطعہ کہا ؎

ساغری می گفت دزدان معانی بردہ اند ہر کجا در شعر من یک معنی خوش دیدہ اند
دیدم اکثر شعر ہائش را یکی معنی نداشت راست می گفت آنکہ معنی ہاش را دزدیدہ اند

ساغری نے شکایت کی تو آپ نے کہا بھئی! میں نے تو "شاعری" لکھا تھا، کسی ستم ظریف نے نقطے بدل کر اسے "ساغری" بنا دیا، اس میں میرا کیا قصور ہے۔

اسی طرح کی متعدد اور حکایات بھی ہیں جن سے آپ کی مزاح پسندی کا پتا چلتا ہے۔

تصنیفات آپ نے نثر اور نظم میں متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ سام مرزا صفوی نے اپنی کتاب تحفہ سامی[1] میں جامی کی تصنیفاتِ نظم و نثر کی تعداد پینتالیس بتائی ہے۔ ان کتابوں کے نام حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) تفسیر تا بہ آیہ وایای فارهبون (۲) شواہد النبوت (۳) اشعۃ اللمعات (۴) شرح فصوص الحکم (۵) لوامع (۶) شرح بعض ابیات تائیہ فارضیہ (۷) شرح رباعیات (۸) لوائح (۹) شرح بیتی چند از مثنوی مولوی (۱۰) شرح حدیث ابن ذر غفاری (۱۱) رسالہ فی الوجود (۱۲) ترجمہ اربعین حدیث (۱۳) رسالہ لا الہ الا اللہ (۱۴) مناقب خواجہ عبد اللہ انصاری (۱۵) رسالہ تحقیق مذہب صوفی و متکلم و حکیم (۱۶) رسالہ سوال و جواب

---

[1] مطبوعہ طہران صفحہ ۷۶

ہندوستان (۱۷) رسالہ مناسک حج (۱۸) سلسلۃ الذہب (۱۹) سلامان وابسال (۲۰) تحفۃ الاحرار (۲۱) سبحۃ الابرار (۲۲) یوسف وزلیخا (۲۳) لیلیٰ ومجنون (۲۴) خرد نامہ اسکندری (۲۵) رسالۃ در قافیہ (۲۶) دیوان اول (۲۷) دیوان ثانی (۲۸) دیوان ثالث (۲۹) رسالہ منظومہ (۳۰) بہارستان (۳۱) رسالہ کبیر در معما (۳۲) رسالہ متوسط (۳۳) رسالہ صغیر (۳۴) رسالۂ اصغر در معما (۳۵) رسالہ عروض (۳۶) رسالہ موسیقی (۳۷) منشآت (۳۸) فوائد الضیائیہ فی شرح الکافیہ (۳۹) شرح بعضی از مفتاح الغیب منظوم ومنثور (۴۰) نقد النصوص (۴۱) نفحات الانس (۴۲) رسالہ طریق صوفیان (۴۳) شرح بیت خسرو دہلوی (۴۴) مناقب مولوی (۴۵) سخنان خواجہ پارسا

مولانا عبدالغفور لاری نے جو آپ کے شاگردانِ خاص میں سے ہیں، آپ کی کتابوں کی تعداد ۴۸ بتائی ہے اور تحفہ سامی کی تعداد کتب پر ذیل کی تین اور کتابوں کا اضافہ کیا ہے۔

(۴۶) شرح ابن رزین عقیلی (۴۷) رسالہ فی الواحد (۴۸) صرف فارسی منظوم ومنثور۔

آقای علی اصغر حکمت[1] لکھتے ہیں کہ ایک کتاب "تجنیس اللغات" یا "تجنیس الخط" بھی ان کی نظر سے گزری ہے جو جامی سے منسوب ہے۔

امیر شیر علی خان[2] مؤلف تذکرہ "مرآت الخیال" نے جامی کی تصنیفات ۹۹ بتائی ہیں لیکن اور کسی تذکرہ نویس نے امیر شیر علی خان کی تائید نہیں کی۔

جامی کی بیشتر نثر کی کتابیں میری نظر سے نہیں گزریں اور جو میں نے پڑھی ہیں اُن سب پر تبصرہ کرنا اس مختصر سی تاریخ میں ممکن نہیں، اس لیے ذیل کی اہم ترین نثر کی

---

[1] "جامی" صفحہ ۱۶۳ [2] مطبوعہ بمبئی صفحہ ۷۳

کتابوں کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

نفحات الانس - یہ کتاب بعض صوفیائے کرام کے سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ سالِ تالیف ۸۸۳ھ مطابق ۱۴۷۸ء ہے جیسا کہ مولانا خود ایک رباعی میں کہتے ہیں۔

این نسخہ مقتبس ز انفاس کرام ۔۔۔ کز ذی نفحات انس آمد بمشام
از ہجرت خیر البشر و فخر انام ۔۔۔ در ہشت صد و ہشتاد و سوم گشت تمام

"نفحات الانس" میں پانچ سو بیاسی صوفیائے کرام کا حال درج ہے پہلے ایک مقدمہ لکھا ہے۔ پھر صوفیا کی اصطلاحات اور معرفت و حقیقت کا بیان ہے۔ بعد میں صوفیا کے معجزات کا ذکر ہے۔

نفحات الانس کا حاشیہ مولانا عبد الغفور لاری نے لکھا ہے۔ یہ حاشیہ انھوں نے جامی کے فرزند ضیاء الدین یوسف کے لیے لکھا تھا تاکہ "نفحات" کو سمجھنے میں اُسے کوئی دقت نہ ہو۔ نفحات الانس سادہ، رواں اور فصیح فارسی میں لکھی گئی ہے۔

شواہد النبوّت - یہ کتاب ایک مقدمہ، سات ارکان (ابواب) اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے۔

مقدمہ نبوّت اور رسالت کے بیان میں ہے۔ اس کا سالِ تالیف ۸۸۵ھ مطابق ۱۴۸۰ء ہے۔

رکن اوّل - میں وہ شواہد اور دلائل پیش کیے گئے ہیں جو آنحضرتؐ کی ولادت باسعادت پر ظہور میں آئے۔

رکن دوم میں آنحضرتؐ کی ولادت سے بعثت کے حالات لکھے گئے ہیں۔

رکن ثالث میں آنحضرتؐ کی بعثت سے ہجرت تک کے واقعات ہیں۔

رکن رابع ہجرت سے آنحضرتؐ کی وفات تک کے حالات پر مشتمل ہے۔

رکن خامس میں وہ دلائل و شواہد ہیں جو آنحضرتؐ کی وفات کے بعد ظہور

میں آئے۔

رکن سادس - اس باب میں وہ شواہد و دلائل ہیں، جو صحابہ کرام اور آئمۂ اہل بیت سے ظاہر ہوئے۔

رکن سابع - یہ باب اُن شواہد پر مشتمل ہے، جو تابعین اور تبع تابعین اور طبقہ صوفیا کی وساطت سے ظاہر ہوئے۔

کتاب کا خاتمہ دشمنوں کی عقوبت سے متعلق ہے۔

شواہد النبوّت کی زبان سادہ اور رواں ہے۔ اس میں تکلّف اور صنائع نام کو بھی نہیں۔ اس میں فارسی اور عربی اشعار کم اور احادیث اور روایات کا ذکر زیادہ ہے۔

اشعۃ اللمعات - جامی کی یہ کتاب شیخ فخرالدین ابراہیم عراقی کی تصنیف "لمعات" کی تشریح ہے، جو میر علی شیر نوائی کی خواہش پر ۸۸۶ھ مطابق ۱۴۸۱ء میں لکھی گئی تھی۔ آغاز کتاب "مقدمہ" سے ہوتا ہے، جس میں تصوّف کی بعض اصطلاحات کا ذکر ہے۔ بعد میں ۲۸ لمعات کی تشریح کی گئی ہے۔ دو رباعیوں اور ایک قطعہ پر یہ اہم تالیف ختم ہو جاتی ہے۔ خاتمے کی ایک رُباعی حسب ذیل ہے۔

جامی تن زن در سخن چند زنی | بیہودہ دم از کن و مکن چند زنی
افتادہ بردی زین تازہ غدیر | لاف از تگ دریائے کہن چند زنی

بہارستان - "بہارستان" سعدی کی تصنیف "گلستان" کی تقلید میں لکھی گئی ہے۔ اُس کا سالِ تالیف ۸۹۲ھ مطابق ۱۴۸۷ء ہے۔ یہ بھی گلستان کی طرح آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں چند حکایات ہیں، جن کی ترتیب حسب ذیل ہے۔

پہلا باب - درویشوں اور صوفیوں کی حکایات

دوسرا باب - دانشمندوں کی حکایات

تیسرا باب - بادشاہوں کے عدل و انصاف کی حکایات

چوتھا باب ۔ سخاوت کی حکایات

پانچواں باب ۔ عشق و محبت کی حکایات

چھٹا باب ۔ مزاحیہ حکایات

ساتواں باب ۔ شعراء کی حکایات و لطائف

آٹھواں باب ۔ جانوروں کی حکایات

بہارستان کی حکایات کو مناسب مقامات پر اشعار سے بھی مزین کیا گیا ہے۔ بہارستان کو مشہور جرمن محقق شلحتا وشہرو نے مع ترجمہ ۱۸۴۶ء میں شائع کرایا۔ ۱۸۸۷ء میں کاماشاستر اسوسائٹی کے زیرِ اہتمام بہارستان کا انگریزی میں ترجمہ ہوا۔ چھٹے باب کا سی ای۔ ولسن نے "ایرانی مزاح" کے عنوان سے ترجمہ شائع کرایا۔

بہارستان بھی اگرچہ فصیح فارسی میں لکھی گئی ہے، لیکن اس میں وہ رنگ و بو نہیں، جو سعدی کی گلستان میں ہے۔

جامی کی شہرت کا اصل سرمایہ اُس کی شاعری ہے، اس لیے اس کی منظوم تصنیفات پر مختصر طور پر اظہارِ خیال کیا جاتا ہے۔

مثنویات ہفت رنگ ۔ جامی کی سات مختلف مثنویوں کا مجموعہ "ہفت اورنگ" یا "سبعہ" کے نام سے موسوم ہے۔ اس مجموعے کے متعلق مولانا لکھتے ہیں۔

این ہفت سفینہ در سخن یکرنگ اند ۔۔۔ وین ہفت خزینہ در گہر ہم سنگ اند

چون ہفت برادران برین چرخ بلند ۔۔۔ نامی شدہ در زمین بہفت اورنگ اند

"ہفت اورنگ" کے مقدمے سے پتا چلتا ہے کہ مولانا نے پہلے نظامی اور امیر خسرو کی تقلید میں پانچ مثنویاں لکھی تھیں۔ بعد میں دو اور کا اضافہ کر دیا۔ اور اس طرح "خمسہ" نے "سبعہ" کی شکل اختیار کر لی۔

سلسلۃ الذہب ۔ اس مثنوی میں فلسفیانہ، اخلاقی اور دینی مسائل بیان

کیے گئے ہیں، اور ہر موضوع کے متعلق دلچسپ حکایات بھی لکھی ہیں۔ مثنوی کا انداز حکیم سنائی اور جامِ جم اوحدی کا سا ہے۔ اور سلطان حسین بایقرا کے نام منسوب ہے۔ یہ کتاب تین حصوں میں ہے۔ ہر حصہ کو دفتر لکھا ہے۔ پہلے دفتر کے چند موضوع حسب ذیل ہیں۔ وجودِ مطلق، توحید باری تعالےٰ کو اللہ تعالیٰ کے اوصاف، فرشتوں کا وجود، پیغمبروں پر اعتقاد، آنحضرتؐ کو جملہ انبیاء کرام پر فضیلت حاصل ہے۔ میزان، پلصراط، بہشت و دوزخ۔ یہ حصہ "اعتقاد نامہ" پر ختم ہوتا ہے۔

دفتر دوم میں عشق کی اصطلاحات سے بحث کی گئی ہے۔ ذیل کے اشعار سے یہ دفتر شروع ہوتا ہے۔

بشنو ای گوش بر فسانۂ عشق　　از صریر قلم ترانۂ عشق
قلم اینک چو نی بلحن صریر　　قصۂ عشق می کند تقریر

اس دفتر کا خاتمہ ذیل کے اشعار پر ہوا ہے۔

داشت جهدی دبیر چرخ برین　　در رقم کردن حروف سنین
چوں رقومش بہ صاد و ضاد رسید　　خامہ را حکم ایستاد رسید

دفتر سوم میں بادشاہوں، طبیبوں اور شعرا کے متعلق حکایات لکھی گئی ہیں۔ یہ دفتر عثمانی حکمران سلطان بایزید دوم کے نام منسوب ہے۔ ذیل کے اشعار میں اسی سلطان کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مهبط العزّ و العلی سلطان　　بایزید ایلدرم شہ دوران
خاک یونان زمین از و گلشن　　چشم یونانیان از و روشن

۲۔ **سلامان و ابسال** ۔ یہ ایک تمثالیہ داستان ہے، جو عشقیہ مثنوی کی صورت میں پیش کی گئی ہے۔ اس کا نفس مضمون یہ ہے۔

بادشاہ یونان کے ہاں ایک حسین و جمیل لڑکا پیدا ہوتا ہے جس کا نام سلامان

ہے۔ شاہزادے کی دیکھ بھال کے لیے ایک حسین نرس ابسال مقرر ہوتی ہے۔ یہ نرس شہزادے سے عمر میں بیس سال بڑی ہے۔ نرس شہزادے کے عشق میں اسیر ہو جاتی ہے۔ سلامان جب بلوغت کو پہنچتا ہے۔ تو ابسال جادو کے ذریعے سے اُسے اپنا شیدائی بنا لیتی ہے۔ بادشاہ کو ان کا عشق ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ آخر رقاصۂ فلک زہرہ آڑے آتی ہے اور شہزادے کو ابسال کے پنجے سے چھڑانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ جس کا مختصر سا بیان حسبِ ذیل ہے۔

ابسال وصال جاودانہ حاصل کرنے کے لیے سلامان کو ایک ارضی جنت میں لے جاتی ہے۔ اس ارضی جنت کی مولانا جامی نے ذیل کے اشعار میں منظر کشی کی ہے۔

از پس ماہی کہ زورق راندہ اند — ور دم دریا ز زورق ماندہ اند
شد میان بحر پیدا بیشۂ — وصف او بیرون ز ہر اندیشۂ
ہیچ مرغ اندر ہمہ عالم نبود — کاندر آن عشرتگہ خرم نبود
یک طرف در جلوہ باہم جوق جوق — چون تذرو و ازاج و چون قمری نطوق
یک طرف صف صف ہمہ دستان سرای — ساز دستان کردہ از منقار ہای
نو درختان شاخ در شاخ اندر و — در نوا مرغان گستاخ اندر و
میوہ در پای درختان ریختہ — خشک و تر بایکدگر آمیختہ
چشمۂ آبی بزیر ہر درخت — آفتاب و سایہ کردش لخت لخت
شاخ بود از بار دستی رعشہ دار — مشت پر دینار از بہر نثار
گو ببا باغ ارم چون و نہفت — غنچہ پیدا پیش آنجا شگفت
چون سلامان دید لطف بیشہ را — از سفر کوتاہ کرد اندیشہ را
یا بہشت عدن بی روز حساب — بر گرفت از روی خویش آنجا نقاب
با دل فارغ ز ہر امید و بیم — گشت با ابسال در بیشہ مقیم

ہر دو شاداں ہمچو جان و تن بہم | ہر دو خرم چون گل و سوسن بہم
صحبتی ز آویزش اغیار دور | راحتی ز آمیزش تیمار دور
گل در آغوش و خراش خار نی | گنج در پہلو و زخم مار نی
ہر زمان در مرغزاری کردہ خواب | ہر نفس از چشمہ ساری خوردہ آب
گاہ با بلبل بگفتار آمدہ | گاہ با طوطی شکر خوار آمدہ
گاہ با طاؤس در جولانگری | گاہ در رفتار با کبک دری
قصہ کوتاہ دل پر از عیش و طرب | ہر دو می بردند روز خود بشب
خود چہ زآن بہتر کہ باشد با تو یار | در میان و عیب جوئیاں بر کنار

اقبال اپنے محبوب کو ساتھ لے کر جنتِ ارضی کی آگ میں کود پڑتی ہے تاکہ محبت کی آگ میں جل کر غیر فانی ہو جائیں، لیکن زہرہ اپنا جادو چلا چکی تھی۔ اس آگ کا یہ اثر ہوا کہ اقبال تو جل کر راکھ ہو گئی اور سلامان وہاں سے زندہ و سلامت بچ کر نکل آیا۔

(۳) **تحفۃ الاحرار**۔ یہ مثنوی مخزن الاسرار اور مطلع الانوار کے وزن میں لکھی ہے۔ آغاز ذیل کے شعر سے ہوتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | ہست ملائی سر خوان حکیم

مثنوی کا دیباچہ نثر میں ہے۔ دیباچے میں امیر خسرو کو بڑے احترام سے خطاب کیا گیا ہے۔ مقدمہ کے بعد چار مناجاتیں، پانچ نعتیں اور نقشبندی سلسلے کے بانی خواجہ بہاءالدین کی منقبت لکھی ہے۔ پھر اصل مثنوی شروع ہوتی ہے، جو بیس مقالوں پر مشتمل ہے۔ یہ مقالے حسب ذیل ہیں:۔

(۱) آفرینش (۲) آفرینش آدم (۳) سعادتِ اسلام (۴) نماز ہائے پنج گانہ (۵) زکوٰۃ (۶) زیارت بیت الحرم (۷) عزلت (۸) سکون (۹) سپہر (۱۰) نشان صوفیائے کرام (۱۱) علمائے ظاہر کا حال (۱۲) سلاطین سے خطاب (۱۳) دبیرِ

کے حالات (۱۴) وزیروں کے حالات۔ (۱۵) صفت پیری (۱۶) شرح جوانی (۱۷) بیان حسن وجمال (۱۸) بیان عشق (۱۹) حسب حال شعراء (۲۰) پند فرزند ضیاء الدین یوسف

۴۔ سبحۃ الابرار۔ یہ کتاب بھی سلطان حسین بالقیرا کے نام منسوب ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

نامش آن گوہر تاج اورنگ ست | کہ براو بحر کلامم تنگ ست
ذاتی از تاجورش یافتہ زین | تاج سلطان بود و ذات حسین

سبحۃ الابرار چالیس مقالوں پر مشتمل ہے۔ اس کا موضوع تصوف و اخلاق ہے۔ نمونے کے طور پر ذیل میں حضرت ابراہیم اور آتش پرست کی حکایت نقل کی جاتی ہے۔

کرد از معبد خود عزم رحیل | میہمان شد بسر خوان خلیل
چون خلیل آن غلطش در دین دید | بر سر خوان خودش نپسندید
چونکہ دیدش ز خدا بیگانہ | چہرہ پر دود ز آتش خانہ
گفت با راہب روزی بگرد | یا ازین مائدہ برخیز و برو
پیر بر خارت کای پیک نہاد | دین خود را شکم نتوان داد
بالبی خشک و دہانی ناخورد | روی از آن مرحلہ در راہ آورد
آمد از عالم بالا بہ خلیل | وحی کای در ہمہ اخلاق جمیل
گرچہ آن پیر نہ بر دین تو بود | منعش از طعمہ نہ آئین تو بود
عمر او بیشتر از ہفتاد است | کہ دریں معبد کفر آباد است

روز نیش داگر فستم روزی
کہ نداری دل دین اندوزی

۵۔ یوسف زلیخا۔ یہ مثنوی مولانا جامی کا اصل سرمایۂ شہرت ہے۔ اہل

یورپ نے اس کے متعدد ترجمے کیے ہیں۔ مثلاً سب سے پہلے ۱۸۲۴ء میں جرمن محقق ایڈلم وآن روزنزوگ نے اس کا ترجمہ نظم میں کیا۔ ۱۸۸۱ء میں آر۔ ٹی۔ ایچ گرفتھ نے اسے انگریزی زبان میں اپنایا۔ پھر ۱۸۹۲ء میں مسٹر اے۔ راجرز نے اس کا انگریزی نظم میں ترجمہ کیا۔

مثنوی کا آغاز ذیل کے شعر سے شروع ہوتا ہے ؎

الٰہی غنچۂ امید بگشای　　　گلی از روضۂ جاوید نمای

اس مثنوی کے شروع میں خطبہ ہے۔ پھر نعت پیغمبر اور بیان معراج ہے۔ اس کے بعد پیر طریقت خواجہ عبید اللہ نقش بند سے خطاب کیا ہے۔ بعد میں سلطان حسین بایقرا کی مدح میں ذیل کا شعر کہا ہے

درین عین آنکہ چون انسان عین است　　　جہان مردی سلطان حسین است

مثنوی کا ماخذ کلام مجید کی بارھویں سورۃ ہے۔ اس داستان کا موضوع ایران میں بہت مقبول رہا ہے۔ چنانچہ یہ داستان فارسی اور ترکی میں متعدد قالب اختیار کر چکی ہے۔ جامی کی مثنوی کو ان سب میں امتیازی خصوصیت حاصل ہے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

وصف سکوت اور خاموشی شب کی منظر کشی اشعار ذیل میں کی ہے۔

شبی خوش ہمچو صبح زندگانی　　　نشاط افزا چو ایام جوانی

ز جنبش مرغ و ماہی آرمیدہ　　　حوادث پای در دامن کشیدہ

درین بستان سرای بی نظارہ　　　نماندہ باز جز چشم ستارہ

ربودہ دزد شب ہوش عسس را　　　زبان بستہ جرس جنبان جرس را

سگان را طوق گشتہ حلقۂ دم　　　درآن حلقہ رہ فریاد شان گم

زلیخا کی آہ و فغاں کو کچھ اس انداز میں پیش کیا ہے، معلوم ہوتا ہے عاشق

بے تاب کی کراہوں کی صدا بندی کی ہے۔

مرا ای کاشکه مادر نمی زاد　　وگر می زاد، کس شیرم نمی داد
ندانم بر چه طالع زاده ام من　　برین طالع کجا افتاده ام من
اگر بر خیزد از دریا سحابی　　که ریزد بر لب هر تشنه آبی
چو ره سوی من لب تشنه آرد　　بجای آب جز آتش نبارد
ندانم ای فلک با من چه داری؟　　چو خویشم غرق خون دامن چه داری
گرم ندهی بسوی دوست پرواز　　ندی باری چنین دورم مینداز
گر از من مرگ خواهی مردم اینک　　ز بیداد تو جان بسپردم اینک
وگر خواهی مرا در رنج و اندوه　　نهادی بر دلم صد رنج چون کوه
بزیر کوه کاهی چند باشد؟　　بموج غم گیاهی چند باشد؟
دلم از زخم تو صد جای ریشست　　اگر رحمی کنی بر جای خویشست
اگر من شاد اگر غمگین ترا چه؟　　وگر من تلخ اگر شیرین ترا چه؟
کیم من؟ وز وجود من چه خیزد؟　　وزین بود و نبود من چه خیزد؟
اگر شد خرمنم بر باد، گو شو　　دو صد خرمن ازین بر تو یک جو
بهاران تازه گل بر باد دادی　　ز داغ مرگ بر آتش نهادی
کجا گردد ترا خاطر پریشان　　که من باشم یکی دیگر از ایشان
بصد افغان و درد آن روز تا شب　　درونی غنچه دار از خون لبالب
سرشک از دیده غمناک می ریخت　　بدست غصه بر سر خاک می ریخت

۶ - **لیلیٰ مجنوں** :- یہ پُر شور اور عشق انگیز داستان بھی نظامی اور امیر خسرو کی تقلید میں لکھی گئی ہے۔ اس داستان کو نظم کرنے کا سبب ذیل کے اشعار میں بتایا ہے۔

شد طوطی طبع من شکر خا　　از قصه یوسف و زلیخا

در عالم از آن فتاد شوری | در خاطر عاشقان سروری
سرچشمہ لطف بود لیکن | زآن تشنگیم نگشت ساکن
چون قرعہ زدم بفال میمون | افتاد بشرح حال مجنون
ہرچند کہ پیش ازین دو استاد | از ملک سخن بلند بنیاد
در نکتہ دری زبان گشادند | داد سخن اندران بدادند
آن بردہ علم بادرج اعزاز | وین کردہ فسون ساحری ساز
من ہم کمر از قضا ببستم | بر ناقۂ باد پا نشستم
ہر جا کہ رسید رخش ایشان | از خاطر فیض بخش ایشان
من نیز بقافلہ ناقہ راندم | خود را بہ غبار شان رساندم
گر ماندہ ام از شمار شان پس | بر چہرۂ من غبار شان بس

حسب معمول مثنوی کا آغاز خطبہ سے ہوتا ہے، پھر نعت نبیؐ اور بیان معراج ہے اس کے بعد خواجہ عبید اللہ نقش بند سے خطاب کیا ہے۔ پھر اصل داستان کی طرف رجوع ہوا ہے۔ اس داستان میں خاص طور سے یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ احول عربی ہو اس میں وہی حدیث قافلہ، وہی خرام ناقہ، وہی صحرا، وہی راتوں کا سفر ہے، جو یک عرب کا خاصہ ہے۔

۷۔ **خرد نامہ اسکندری**۔ یہ مثنوی سکندر نامہ نظامی کے بحر میں لکھی گئی ہے۔ اور سلطان حسین بقیرا کے نام منسوب ہے۔

ذیل کے اشعار میں سکندر کی وہ تاریخی وصیت بیان کی ہے، جس سے اب تک یورپ اور ایشیا کی فضائیں گونجتی ہیں۔

بیاران زبان نصیحت کشاد | بہر سینہ گنجی ودیعت نہاد
چو بر حاضران گنج وگوہر فشاند | ز نا حاضران نیز غافل نماند

وصیت چنین کرد بر حاضران — که ای از جہالت تہی خاطران
چو بر داغ ہجران من دل نہید — تن ناتوانم بمحمل نہید
گذارید دستم برون از کفن — کنید آشکاراش بر مرد و زن
ز حالم دم نامرادی زنید — بہر مرز و بوم این منادی زنید
کہ این دست دستیست کز عز و جاہ — ربود از سر تاجداران کلاہ
کلید کرم بود در مشت او — نگین خلافت در انگشت او
ز شیر فلک قوت پنجہ یافت — قوی بازوان را بسی پنجہ تافت
ز حشمت زبردست ہر دست بود — ہمہ دستہا پیش او پست بود
تو ہم گیر ازین دست ای خواجہ پند — بدین دست بکشای از پای بند

نظامی و جامی

جامی نے اپنی مثنویاں نظامی کی مثنویوں سے متاثر ہو کر لکھی ہیں۔ اس لیے ضروری تھا کہ ان کے اندازِ بیان کا موازنہ کیا جاتا۔ لیکن اس تاریخ میں ایک مبسوط موازنے کی گنجائش نہیں، اس لیے دو ایک اہم پہلوؤں کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

جامی اپنے پیشرو نظامی کا محض مقلد نہیں، بلکہ اس کا ایک کامیاب حریف ہے۔ جامی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سادگی، روانی اور شیرینی ہے، کہیں تصنع اور تکلف نام کو نہیں۔ اس لحاظ سے جامی کو نظامی سے کہیں زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔ ہر وہ شخص جسے فارسی زبان سے تھوڑا سا بھی علاقہ ہے، وہ آپ کے کلام سے لطف اندوز ہوتا ہے، لیکن نظامی ہمہ گیر صلاحیتوں کا مالک ہے۔ اسے تاریخ ایران اور علوم حکمت و ریاضی میں پوری پوری آگہی ہے اس کے کلام میں تخیل، گہرائی اور متانت بدرجہ کمال پائی جاتی ہے۔ اس لیے نظامی کے کلام سے وہی لوگ بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں، جن کو فارسی زبان میں اور رموز شعر و حکمت میں کامل دستگاہ ہو۔

دیوانِ جامی

جامیؔ نے خود اپنے دیوان کی تین مرتبہ ترتیب و تدوین کی۔ پہلی مرتبہ ۸۸۴ھ مطابق ۱۴۷۹ء میں دیوان مرتب کیا۔ دیوان کا آپ نے فصیح و بلیغ فارسی میں مقدمہ لکھا ہے، جس میں شعر و شاعری کے محاسن بیان کیے ہیں۔ اور آیاتِ قرآنی اور احادیث سے مقدمہ کو زینت دی ہے۔ جناب نبی کریمؐ کی چند روایات بھی نقل کی ہیں۔ جن میں آنحضرتؐ کے بعد اُن مشائخ کا ذکر کیا ہے جن کو شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔

۸۸۵ھ مطابق ۱۴۸۰ء میں آپ نے کچھ اور اشعار جمع کر کے پہلے دیوان کے ساتھ شامل کیے۔ پھر آخری مرتبہ ۸۹۶ھ مطابق ۱۴۹۰ء میں، یعنی وفات سے ایک سال پہلے اپنے دیوان کی تدوین کی۔ نئے اشعار کو اس میں شامل کر کے تمام دیوان کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ پہلے حصے کا نام فاتحۃ الشباب ہے، دوسرے کا نام واسطۃ العقد اور تیسرے کا نام خاتمۃ الحیوٰۃ ہے۔

جامیؔ کے دیوان میں قصائد، غزلیات، قطعات اور رباعیات، غرض سبھی کچھ موجود ہے۔ لیکن قصائد میں آپ انوریؔ اور ظہیرؔ کے مرتبے کو نہیں پہنچے، نہ غزلیات میں سعدیؔ و حافظؔ کا مقام حاصل کر سکے نہ قطعات میں سنائیؔ و ابن یمینؔ کی برابری کر سکے۔ نہ رباعیات میں ابوسعید ابوالخیر اور خیامؔ کا درجہ پا سکے۔ بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ عارفانہ مطالب کو جامیؔ نے غزل کے پیکر میں اس خوبی سے پیش کیا ہے۔ کہ یہ انہی کا حصہ ہے۔ ان کی غزلیات پر سیر حاصل تبصرہ کرنا اس مختصر سی تاریخ میں ممکن نہیں۔ ذیل میں چند اشعار پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے، جن سے آپ کی شاعری کے موضوعات کا پتا چل سکے گا۔

توحید:۔

یا مَن بَدَا جمالُکَ فی کُلِّ ما بَدَا

بادا ہزار جان مقدس ترا فدا

من نالم از جدائی تو دم بدم چو نی
وین طرفہ ترکہ از تو نیم یک نفس جدا

عشق است و بس کہ در دو جہان جلوہ می کند
گاہ از لباس شاہ و گہ از کسوت گدا

یک صوت بر دو گونہ ہمی آیدت بگوش
گاہی ندا ہمی نہیش نام و گہ صدا

برخیز ساقیا ز کرم جرعہ بریز
بر عاشقانِ غم زدہ زان جام غم زدا

زان جام خاص کز خودیم چون دہد خلاص
در دیدہ شہود نماند بجز خدا

جامی رہ ہدیٰ بخدا غیر عشق نیست
گفتیم و السلام علیٰ تابع الہدیٰ

عشق ایک غیر فانی زندگی ہے، جو منزل بہ منزل سفر کرتی ہوئی جاودانی حسن کی طرف چلی جاتی ہے اور حسن اُس کے خیر مقدم کے لیے آگے بڑھتا آتا۔

بودم آن روز درین میکدہ از دُرد کشان
کہ نہ از تاک نشان بود نہ از تاک فشان[1]

از خرابات نشینان چہ نشان می طلبی
بی نشان باشدہ زانشان نتوان یافت نشان

جان فدائش کہ بدلجوئی ما دل شدگان
می رود کوی بکو دامنِ اجلال فشان

---

[1] انگور کی بیل لگانے والا۔

در ره میکده آن به که شویم ایدل خاک

شاید آن مست بدین سو گزرد جرعه فشان

نکته عشق بتقلید مگوای واعظ

پیش ازین باده بچش چاشنی پس بچشان

عرفان:

آئینه باش و عکس رخش بین در آئینه

مشنو خبر که نیست خبر چون معائینه

گفتم توان جمال تو دیدن ؟ بعشوه گفت

گر صاف دل چو آئینه باشی هر آئینه

ذرات کون آئینه های جمال اوست

نقش دگر نمود رخش در هر آئینه

صوفی تو خرقه پوشی و مارند جرعه نوش

مَا بَینُنَا وَ بَینَكَ اِلّا مُبَائِنَہ

جامی چو در تلاطم بحر قدم فتاد

فارغ شد از تموج احداث کائنہ

پندارم توئی !

بس که در جان فگار و چشم بیدارم توئی

هر که پیدا می شود از دور پندارم توئی

آنکه جان می بانزد و سرد رمی آرد منم

و آنکه خون می ریزد و سر بر نمی آرم توئی

گر تلف شد جان چه باک این بس که جانان منی

ور ز کف شد دل چه غم این بس که دلدارم توئی

گرچہ صد خواری رسد ہر دم ز دست غم مرا

من چہ غم دارم بعزیز من کہ غم خوارم توئی

با کہ گویم درد خود یا رب درین شب ہای غم

آگہ از صبر کم و اندوہ بسیارم توئی

گرچہ نستانی بہ ہیچم بر سر بازار وصل

خود فروشی بین کہ می گویم خریدارم توئی

گفتہ یار توام جامی مجو یار دگر

من کسی بی یار خواہم بود اگر یارم توئی

بلند پروازی :

دلا منشین درین ویرانہ چون جغد — سوی مرغان قدسی آشیان پر

بود گیتی درختی سر بسر شاخ — ولی جملہ سوی یک اصل رہبر

ز ہر شاخی سوی آن اصل رہ جوی — چو آنرا یافتی از شاخ بگذر

نباشد شیوۂ مرغان زیرک — نشستن ہر زمان بر شاخ دیگر

یہ جہان ایک درخت کی مانند ہے جس میں شاخیں ہی شاخیں ہیں۔ ہر شاخ درخت کی اصل کا پتہ دیتی ہے۔ تو بھی شاخ سے اپنی اصل کا کھوج لگا۔ جب شاخ تجھے اصل حیات کا پتا دے دے، تو شاخ کو چھوڑ کر اور آگے نکل جا۔ دانا پرندوں کا یہ شیوہ نہیں کہ ایک شاخ سے اڑیں اور دوسری پر جا بیٹھیں۔

کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا انسانیت کی سب سے بڑی تذلیل ہے۔

آن شنید ستی کہ کناسی ز سرگین زیر بار

گفت شکر آنرا کہ از عزت مرا ہر بر فراخت

بوالفضولی طعنہ زد کای کار تو سرگین کشی

کی خردمند این ہنر را مایۂ عزت شناخت

گفت کای نادان کہ این عز ازین افزوں بود

کز پی روزی بانشال تو محتاجم نساخت

جامی کی اکثر غزلیں حافظ کے عاشقانہ کلام کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہیں۔

طرف باغ ولب جوی ولب جامست این جا | ساقیا خیز کہ پرہیز حرام است این جا

شیخ در صومعہ گر مست شد از ذوق سماع | من و میخانہ کہ این حال مدامست این جا

لب نہادی بلب جام و ندانم من مست | کہ لب لعل تو یا بادہ کدام است این جا

بستۂ زلف سیاہ تو نہ تنہا دل ماست | ہر کجا مرغ دلی بستۂ دامست این جا

می کشی تیغ کہ سازی دل ما را بدو نیم | تیغ بگذار کہ یک غمزہ تمام است این جا

پیش ارباب خرد شرح مکن مشکل عشق | نکتۂ خاص مگو محفل عام است این جا

جامی از عشق تو شد مست نہ می دید نہ جام

بزم عشقت چہ جای می و جام است این جا

دورِ تیموریہ کی نثر

زبدۃ التواریخ ۔ "زبدۃ التواریخ" کا مؤلف خواجہ نورالدین لطف اللہ ہے، جو حافظ ابرو کے نام سے مشہور ہوا۔ حافظ ابرو امیر تیمور کے مقربین میں سے تھا۔ امیر تیمور کے بعد جب اس کا بیٹا شاہرخ تخت نشین ہوا، تو اس نے بھی حافظ ابرو کی بڑی

قدر و منزلت کی۔

"زبدۃ التواریخ" ۸۲۹ھ مطابق ۱۴۲۵ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ یہ تاریخ شاہرخ کے بیٹے مرزا بایسنغر کے نام منسوب ہے، اس لیے اسے "زبدۃ التواریخ بایسنغری" بھی کہا جاتا ہے۔

"زبدۃ التواریخ" چار جلدوں میں ہے لیکن تیسری اور چوتھی جلد، جو بعد از اسلام کے واقعات سے متعلق ہیں۔ اب ناپید ہیں۔ ابھی تک یہ تاریخ شائع نہیں ہو سکی، اور اس کے قلمی نسخے بھی بہت کم یاب ہیں۔ اس کا اسلوب بیان سادہ اور روان ہے۔

مطلع السعدین۔ یہ تاریخ عبدالرزاق سمرقندی کی تالیف ہے۔ اس میں ابو سعید ایلخانی سے لے کر ابو سعید تیموری تک (یعنی ۷۰۴ھ مطابق ۱۳۰۴ء سے ۹۷۲ھ مطابق ۱۵۶۴ء تک) کے حالات درج ہیں۔

مطلع السعدین سادہ اور روان نثر میں لکھی گئی ہے۔ اس کا پہلا حصہ مولوی محمد شفیع مرحوم سابق پرنسپل اورینٹل کالج لاہور نے ایڈٹ کر کے طبع کرایا ہے۔

مجمل فصیحی۔ یہ تاریخ فصیحی خوافی کی تالیف ہے اور ابتدائے آفرینش سے نویں صدی ہجری کے وسط تک کے حالات پر مشتمل ہے۔

ظفر نامہ شامی۔ عہد تیموریہ کی تاریخ لکھنے والوں میں نظام الدین شامی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی تاریخ ظفر نامہ کے نام سے موسوم ہے۔ مولف امیر تیمور کا معاصر تھا، اور امیر تیمور نے ہی اسے "ظفر نامہ" لکھنے کی خدمت پر مامور کیا۔ ظفر نامہ میں تیمور کی پیدائش سے لے کر ۸۰۶ھ مطابق ۱۴۰۳ء تک کے حالات ہیں۔ یہ تاریخ امیر تیمور کی زندگی میں ہی مکمل ہو گئی تھی۔

"ظفر نامہ شامی" کی طرز تحریر سادہ ہے لیکن فکر و خیال کے اعتبار سے اس کا انداز عالمانہ ہے۔ مؤلف دیباچے میں لکھتا ہے کہ امیر کا یہ فرمان تھا کہ ظفر نامہ ایسے

طرز پر لکھا جائے کہ عوام اُسے سمجھ لیں اور خواص اس پر حرف گیری نہ کریں۔ چنانچہ اس کتاب میں یہی باتیں مدِ نظر رکھی گئی ہیں۔

ظفر نامہ تیموری ۔ عہدِ تیمور کی ایک اور تاریخ بھی "ظفر نامہ" کے نام سے موسوم ہے، اس کا مؤلف شرف الدین علی یزدی ہے، جو عہدِ تیمور کے مشہور علماء میں سے تھا۔ یہ ظفر نامہ ۸۲۸ھ مطابق ۱۴۲۴ء میں شاہزادہ ابراہیم سلطان بن شاہرخ بن تیمور کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔ مؤلف کی وفات ۸۵۸ھ مطابق ۱۴۵۴ء میں ہوئی۔

اسلوبِ بیان ۔ ظفر نامہ میں تاریخ جہانگشای جوینی اور تاریخ وصاف کی طرح مرادف الفاظ اور صنائع و بدائع کی بھرمار ہے۔ عربی الفاظ و تراکیب کی کثرت ہے۔ کوئی مضمون جو صرف ایک سطر میں ادا ہو سکتا تھا، متعدد فقرات میں ادا کیا گیا ہے۔ خاص خاص ماحول پیدا کرنے کے لیے موزوں اور مناسب تشبیہات سے کام لیا گیا ہے۔ عبارت بڑی پرشکوہ ہے۔ ذیل کی چند سطور ظفر نامہ کے اسلوبِ بیان کی آئینہ دار ہیں۔

"چون صاحبقران، مؤید دین پرور روی ہمت بلند، بنیت غزا و جہاد بصوب ہندوستان نہاد، بہر دیار کہ رسید، جنود فتح و ظفر باستقبالِ موکب ہمایونش استعجال نمود۔ وچنان کہ شرح داده شد، بسی بلاد و قلاع را مسخر فرمود، و در ہفتم ربیع الثانی روز سہ شنبہ کہ بدقیقہ حکمتِ فاطر السموٰت و الارض عظم سلطانہ، آن روز میان ایام، بکوکب قوت و قہر و انتقام، یعنی ترک حصار فیروزه فام، بہرام خون آشام منسوب است، علی الصباح در معرکۂ سپہر رایت طلوع برافراخت و سپاہ شاہِ سیہ چتر شب را ہزیمت داد۔ خورشید رای کشور کشای حضرت صاحبقرانی، از مطلع تائیدات آسمانی برآمده، پرتو التفات بر قہر دشمن و ترتیب سپاه نصر پناه انداخت۔"

تاریخ ہرات ۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ ہرات کی تاریخ ہے۔ اس میں بعض مفید جغرافیائی حالات بھی لکھے گئے ہیں۔

روضتہ الصفا

روضتہ الصفا تیموری عہد کی ایک اہم تصنیف ہے۔ اس کا مولف محمد بن خاوند شاہ بن محمود موسوم بہ میر خواند ہے۔ یہ ضخیم تاریخ سات جلدوں میں لکھی گئی ہے۔ پہلی جلد قبل از اسلام کے پیغمبروں اور بادشاہوں سے متعلق ہے۔ دوسری جلد میں رسولِ اکرمؐ، اور خلفائے راشدینؓ کے حالات ہیں۔ تیسری جلد میں دوازدہ امام، بنو امیہ اور بنی عباس کا ذکر ہے۔ چوتھی جلد میں ایران کے مسلمان حکمرانوں کا بیان ہے۔ چھٹی جلد تیمور اور اس کے جانشین کے حالات پر مشتمل ہے۔ روضتہ الصفا کی ساتویں جلد میر خواند کی وفات کے بعد لکھی گئی تھی۔ یہ آخری حصہ میر خواند کے بھانجے غیاث الدین خواند میر نے میر علی شیر نوائی کی فرمائش پر لکھا تھا۔ اس میں ابو الغازی سلطان حسین بالقیرا کے حالات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

میر خواند ۸۳۸ھ مطابق ۱۴۳۴ء میں پیدا اور ۹۰۳ھ مطابق ۱۴۹۸ء میں فوت ہوا۔ روضتہ الصفا کا اندازِ تحریر ساتویں صدی کی تاریخوں کی طرح مشکل اور پیچیدہ ہے۔ اس میں بھی مرادفات کا استعمال کثرت سے کیا گیا ہے۔ صنائع و بدائع کی افراط ہے۔

میر خواند کے بھانجے خواند میر نے ۹۰۵ھ مطابق ۱۴۹۹ء میں روضتہ الصفا کا اختصار بھی کیا تھا جو "خلاصتہ الاخبار" کے نام سے موسوم ہے۔

شعر و ادب کے تذکرے

تذکرۃ الشعراء۔ یہ دولت شاہ سمرقندی ۸۹۲ھ مطابق ۱۴۸۶ء کی تالیف ہے۔ یہ تذکرہ ایک تمہید، سات طبقات اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے۔ تمہید میں فنِ شعر گوئی پر ایک مختصر سا مقالہ ہے۔ طبقات میں تقریباً ۱۰۵ شعراء کا حال لکھا ہے۔ اور ان کا نمونہ کلام بھی دیا ہے۔ خاتمے میں مؤلف نے اپنے محسن و ممدوح سلطان ابو الغازی، سلطان حسین اور اس کے نامور وزیر امیر علی شیر نوائی کی سیرت و کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ اور اپنے ہم عصر شاعر جامی کا حال لکھا ہے۔

پروفیسر براؤن نے تذکرۃ الشعرا کو ایڈیٹ کر کے شائع کرایا۔ "پروفیسر براؤن[1] کا خیال ہے کہ یہ ایک دلچسپ کتاب ہے، لیکن اس میں بعض تاریخی اغلاط بھی ہیں اس کی وجہ سے ریو جیسا محتاط اور ثقہ نقاد بھی کہیں کہیں گمراہ ہو گیا ہے۔"

دولت شاہ کی وفات سنہ ۹۰۰ھ مطابق ۱۴۹۴ء میں ہوئی۔

دولت شاہ بن علاء الدولہ کا شمار سمرقند کے رؤسا میں ہوتا تھا۔ اس کا والد شاہ رخ مرزا کا ندیم خاص تھا، وہ خود الوالغازی سلطان حسین اور اس کے نامور وزیر امیر علی شیر نوائی کے مقربین میں سے تھا۔ یہ تذکرہ اس نے امیر علی شیر کی فرمائش پر لکھا اور اسی کے نام منسوب کیا۔

اسلوب بیان۔ تذکرۃ الشعراء کی نثر میں چھٹی صدی ہجری کی سی سادگی اور روانی ہے۔ مرادف الفاظ و فقرات بہت کم ہیں۔ صنائع و بدائع کہیں خال خال ہیں۔ تشبیہات بقدر ضرورت استعمال کی گئی ہے۔ انداز کہیں کہیں افسانوی اور ڈرامائی ہے۔

ذیل کی چند سطور مؤلف نے نظامی گنجوی کی شان استغنا کے متعلق لکھی ہیں۔ ان میں اگرچہ افسانے کا عنصر زیادہ ہے لیکن بہر حال یہ سطور تذکرۃ الشعراء کی نثر کا عمدہ نمونہ ہیں۔

"اتابک قزل ارسلان را آرزوی شیخ بود و بہ طلب شیخ کس فرستاد۔ نمودند کہ شیخ منزویست و بہ سلاطین و حکام صحبت ندارد اتابک بدیدن شیخ رفت۔ شیخ از روی کرامت دانست کہ از روی امتحان می آید و بچشم حقارت می نگرد۔ شیخ از عالم غیب شمۂ بچشم اتابک نمود۔ اتابک دید تخت پادشاہانہ نہادہ اند۔ از جواہر و کرسی دید کہ صد ہزار چاکر و سپاہی و تجمل پادشاہانہ و غلامان با کمر مرصع و حاجبان و ندیمان بر پای استادہ و شیخ

---

[1] لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد سوم صفحہ ۴۳۶

پادشاہانہ بر تخت نشستہ و دوا تے دے قلمے و مصلائے و عصائے و کاغذے چند پیش شیخ نہادہ است بتواضع و مست شیخ را بوسیدہ و اعتقاد او نسبت بہ شیخ درجہ عالی یافت و شیخ نیز گوشہ خاطری بدو حوالہ کرد۔"

نفحات الانس۔ یہ کتاب مولانا جامی کی تالیف ہے۔ اس میں صوفیائے کرام کے حالات بڑی تفصیل سے لکھے ہیں۔ سالِ تالیف ۸۸۱ھ مطابق ۱۴۷۶ء ہے کتاب کا آغاز ایک دیباچے سے ہوتا ہے، جس میں تصوف کی تاریخ اور صوفیاء کا مسلک بیان کیا گیا ہے۔ آخر میں مولانا نے اپنے بعض ہم عصر شعرا مثلاً، خواجو اور حافظ وغیرہم کا حال بھی لکھا ہے۔

نفحات الانس نہایت سادہ اور آسان عبارت میں لکھی گئی ہے۔ اس میں تکلف اور تصنع کا شائبہ تک نہیں۔

بہارستان۔ مولانا جامی نے گلستان کے طرز پر ایک کتاب "بہارستان" لکھی ہے۔ اس کے بھی سات باب ہیں۔ پہلے باب میں صوفیاء کے اور ساتویں باب میں شعراء کے حالاتِ زندگی لکھے ہیں۔ اس میں تشبیہات اور استعارات بھی بکثرت ہیں۔ لیکن الفاظ کی خوبصورتی روانی اور خوبی بیان، جو گلستان کا خاصہ ہے، بہارستان اُس سے محروم ہے۔

روضۃ الشہداء:۔ اس کتاب کے مولف مولانا حسین واعظ کاشفی ہیں۔ یہ کتاب آئمہ کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔

اخلاقیات کی کتابیں

تیمور کے دور میں بھی عہد چنگیز کی طرح جہاں تاریخ کی بے مثال کتابیں لکھی گئیں، وہاں اخلاقیات کی گرانقدر کتابیں بھی تصنیف ہوئیں۔

اس دور کی یادگار "اخلاقِ جلالی" اور "اخلاقِ محسنی" ہیں، جو علم الاخلاق کے

طلبہ کے لیے ہمیشہ مشعل راہ کا کام دیں گی۔

اخلاق جلالی - یہ مولانا جلال الدین دوانی کی مشہور تالیف ہے۔ اس کتاب کے تعارف سے پہلے مؤلف کتاب کے متعلق چند سطور درج ذیل ہیں

مولانا جلال الدین محمد (۸۳۰ھ مطابق ۱۴۲۶ء) میں قصبہ دوان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولانا سعد الدین اسعد اپنے وقت کے مشہور عالم تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی۔ پھر شیراز گئے اور حدیث، فقہ اور فلسفہ کی تعلیم مشہور علما سے حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہوئے تو تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا۔ اور مدرسہ بیگم یادار الایتام میں درس بھی دینے لگے۔ ان کی علمی خدمات کی شہرت ہوئی تو آق قوینلو نے انھیں صوبہ فارس کا قاضی مقرر کر دیا۔ اس لیے درس و تدریس کے ساتھ ساتھ عدالتی منصب کے فرائض بھی ادا کرتے رہے۔ ان مصروفیتوں سے آپ اخلاق جلالی کی تالیف کے لیے بھی کچھ وقت نکال لیتے تھے۔

اخلاق جلالی کی اہمیت - اخلاق جلالی شروع ہی سے مدارس کے نصاب میں شامل رہی ہے۔ اس کی مقبولیت اور افادیت کا یہ عالم ہے کہ ۴۶۲ سال کا عرصہ گزرنے کے بعد اب بھی یہ کتاب اسلامی ممالک کے دانشکدوں کے نصابوں میں کسی نہ کسی شکل میں شامل ہے۔

اخلاق جلالی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ مؤلف نے انسانی کردار کی تشکیل کے سلسلے میں اخلاقی مسائل فلسفیانہ انداز میں پیش کیے ہیں جہاں کہیں ضرورت سمجھی ہے ان کی توثیق کلام پاک و آیات نبوی اور اقوال خلفا سے کر دی ہے۔ بعض مقامات پر استدلال کے طور پر حکایات بھی پیش کی ہیں۔

اخلاقِ جلالی کے تین باب ہیں۔ ہر باب "لامع" کے نام سے شروع ہوتا ہے۔ پہلے "لامع" کے چھ، دوسرے کے دس اور تیسرے کے سات حصے ہیں۔ ہر حصے کو "لمع" کا نام دیا گیا ہے۔ لامعہ اوّل میں محاسنِ اخلاق بیان کیے گئے ہیں اور عقل نظری اور عقل عملی کو

ان کی بنیاد بتایا ہے۔ مولانا نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ عقل نظری کی تہذیب سے علم و حکمت حاصل ہوتی ہے اور عقل عملی کی تربیت سے عدالت کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ عدالت سے مولانا کی مراد تمام انسانی قوتوں کو متوازن رکھ کر ان کی تربیت کرنا ہے مثلاً قوت غضبی کی تہذیب کی جائے تو شجاعت حاصل ہوتی ہے۔ مادی خواہشات کے منظم کرنے سے عفت پیدا ہوتی ہے۔ مولانا نے انسانی قوتوں کے فضائل بتائے ہیں اور فضائل کے مقابل رذائل کا بھی ذکر کیا ہے۔ پھر فضائل حاصل کرنے اور رذائل سے محفوظ رہنے کی تدابیر بتائی ہیں۔ رذائل میں غضب، خوف، جہالت اور حسد کا خاص طور پر ذکر کر کے انھیں دور کرنے کا علاج بتایا ہے۔

لامعہ دوم میں گھر اور کینے کی ضرورتوں اور لوگوں کے ایک دوسرے کے ساتھ میل جول رکھنے کا ذکر ہے۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی صاحب مقدور ہو دوسروں کی مدد سے بے نیاز نہیں ہو سکتا اس لیے لوگوں کے تمام طبقات کے مفاد کی حفاظت ضروری ہے۔ اس باب میں اولاد اور نوکروں چاکروں کی تربیت کی بھی تلقین کی ہے اور ماں باپ کے حقوق و فرائض کا بھی ذکر آیا ہے۔

لامعہ سوم تمدن، سیاست اور رسوم شاہی کے متعلق ہے۔ مؤلف نے اس باب میں شہریت کے مفہوم اور اس کی ضرورت کا ذکر کیا ہے۔ بادشاہ کے حقوق و فرائض پر بحث کی ہے۔ حکومت کے نظم و نسق پر روشنی ڈالی ہے اور صداقت و محبت کی اہمیت واضح کی ہے۔

اسلوب بیان مولانا جلال الدین بڑے فاضل شخص تھے اس لیے ان کا اسلوب بیان عالمانہ ہے۔ اخلاق جلالی میں عربی کے الفاظ و تراکیب بڑی بے تکلفی سے استعمال کی ہیں۔ فلسفے کی آمیزش نے اس کتاب کو اور بھی عالمانہ بنا دیا ہے۔ مترادف الفاظ اور ہم معنی فقرات بھی زینت عبارت کے لیے استعمال کیے ہیں۔ جہاں حکمران کی تعریف کی ہے وہاں عبارت میں تصنع اور تکلف آ گیا ہے۔ کہیں کہیں الجھنیں بھی ہیں جن کی وجہ سے

سے اس کتاب سے عوام کچھ زیادہ مستفید نہیں ہو سکتے۔ اخلاقِ جلالی کے متعدد مقامات پر شعریت بھی آگئی ہے جس کی وجہ سے نثر شعروں کے سانچے میں ڈھل گئی ہے۔ اس کی ایک مثال ذیل میں ہے۔

لامع سوم کے لمعہ چہارم میں سیاست ملک و آداب ملوک کے متعلق لکھتے ہیں:-

"بادشاہ ظالم چون بنای است کہ بروی برف نہند۔ ہر آئینہ اساس آن بتابِ آفتاب عدالت الٰہی گداختہ گردد و بنا منہدم شود و بزرگان خردہ دان دانند کہ بخردہ ریزہ ای کہ از خستہ پیرہ زنی بگیرند، گنج خسروی معمور نتوان کرد و از پای ملخی کہ از دست مور حقیر ربایند، سفرۂ سلیمانی ترتیب نتوان نمود۔

ساز عودی کہ مرسومش بچوب از مال مظلومان ستانند، مآل آن جز نالۂ زار نباشد پیالۂ شراب کہ از خون دل بیچارگان پُر کنند از خندہ آن جز گریہ خونی حاصل نیاید و از نشاء آن جز آلام و استقام نزاید و از دراعۂ فقیری کہ بغارت برند، درع داؤدی نتوان ساخت و از کہنہ دواجی کہ از محتاجی بتاراج ربایند، بالش شہریاری حاصل نتوان کرد۔ سپری کہ از مال یتیمان بی سامان بافند، مانع تیر قضا نشود۔ جوشنی کہ از وجہ گدایان عریان سازند، واقع تیغ بلا نگردد، بلکہ از سہام حوادث زمان، صاحب دولتی امان یافت کہ بباطن پاک روشن‌ان صافی دل پناہ آورد۔"

یعنی ظالم بادشاہ ایک ایسی عمارت کی طرح ہے جس کی بنیاد سطح برف پر رکھی گئی ہو۔ بےشک جب عدل و انصاف کا آفتاب طلوع ہوتا ہے تو اس کی تمازت سے یہ بنیاد پگھل جاتی ہے اور عمارت منہدم ہو جاتی ہے۔ باریک بین دانشمند جانتے ہیں کہ ادنیٰ سکوں سے جو ایک خستہ حال بڑھیا سے چھینے جائیں، خزانہ شاہی پر نہیں کیا جا سکتا۔ ٹڈی کے پاؤں سے جو ایک حقیر چیونٹی کے ہاتھ سے چھینی جائے۔ سلیمانی دسترخوان ترتیب نہیں دیا جا سکتا۔ عودی ساز سے جس کی قیمت مظلوموں سے بجبر حاصل کیے ہوئے مال سے ادا کی جائے۔ نالۂ زار کے سوا

اور کچھ سنائی نہ دے گا۔ جامِ شراب جسے غریبوں کے خون سے بھرا جائے اس کی صدائے قل قل سے گریہ خونین کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا اور اس کے سرور کا ردِ عمل آلام واسقام کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ گودڑی سے جو کسی فقیر سے چھینی جائے زرہ داؤدی تیار نہیں ہو سکتی۔ کہنہ لحاف سے جو کسی محتاج سے لیا جائے۔ مسند شہریار کا تکیہ نہیں بنایا جا سکتا۔ بے سامان یتیموں کے مال سے تیار کی ہوئی ڈھال قضا و قدر کے تیروں کو نہیں روک سکتی۔ عریاں فقیروں کی روزی سے تیار کیا ہوا زرہ بکتر تیغ بلا کا وار نہیں روک سکتا۔"

اس عبارت میں نہ صرف شاعرانہ رنگ ہے بلکہ زورِ خطابت کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سحر بیان خطیب سلاطینِ وقت کو ستم و جور کے خونین انجام سے خبردار کر رہا ہے اور پاک باطن بزرگوں کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کر رہا ہے۔

مولانا جلال الدین نے اخلاق جلالی نصیر الدین طوسی کی کتاب اخلاق ناصری سے متاثر ہو کر لکھی ہے جس کا انھوں نے دیباچے میں اعتراف بھی کیا ہے۔ اس کے اکثر مسائل بعینہٖ وہی ہیں جو اخلاق ناصری کے ہیں۔ ان کے علاوہ آپ نے بعض نئے مسائل بھی پیش کیے ہیں۔

جلال الدین شعر بھی کہتے تھے اور فانی تخلص کرتے تھے۔ فن شعر میں ان کی یادگار صرف چند رباعیاں ہیں۔ نثر میں بعض رسائل اور تشریحات بھی آپ نے لکھی ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) شرح تجرید مؤلفہ علی قوشجی پر دو حاشیے

(۲) شرح مطالع پر حاشیہ

(۳) شرح شمسیہ پر حاشیہ

(۴) عقائد عضدیہ کی شرح (علم الکلام)

(۵) شرح ہیاکل النور (حکمت اشراق)

(۶) رسالہ زوراء اور اس کی شرح (فلسفہ)

(۷) شرح تہذیب منطق

(۸) اثبات الوجود دو رسالے

(۹) شرح مختصرا (اصول)

(۱۰) فتاوی الانوار (فقہ شافعی) پر حاشیہ

(۱۱) سورۂ اخلاص کی تفسیر بعنوان انموذج العلوم

(۱۲) فرالعون من یدعی ایمان فرعون" کے رد پر رسالہ

مولانا نے ۷۸ سال کی عمر میں سنہ ۹۰۸ھ مطابق سنہ ۱۵۰۲ء میں وفات پائی۔

اخلاقِ محسنی - اخلاقِ محسنی کے مصنف حسین الواعظ کاشفی ہیں۔ آپ سبزوار میں پیدا ہوئے۔ فارغ التحصیل ہو کر درس و تدریس اور وعظ و خطابت کا سلسلہ شروع کیا، اور ایک فصیح البیان مقرر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ آخری تیموری بادشاہ سلطان حسین آپ کی بڑی قدر کرتا تھا۔ سلطان حسین کا وزیر میر علی شیر نوائی جو ایک علم پرور شخص تھا، آپ کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتا تھا چنانچہ اُس نے انھیں ہرات کا واعظ مقرر کیا۔ آپ کی وفات سنہ ۹۱۰ھ مطابق سنہ ۱۵۰۴ء میں ہوئی۔

حسین واعظ کاشفی کی ایک علمی یادگار "اخلاقِ محسنی" ہے۔ یہ کتاب "علم اخلاق" کے مسائل پر مشتمل ہے۔ اُس سے پہلے اخلاقیات کے موضوع پر دو اور کتابیں "اخلاقِ ناصری" اور "اخلاقِ جلالی" لکھی گئی تھیں۔ ان کی زبان مشکل اور انشاء عالمانہ ہے لیکن مولانا حسین واعظ نے وہی اخلاق مسائل نہایت سادہ اور عام فہم زبان میں لکھے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب عوام الناس اور طلبہ کے استفادہ کے لیے بہت مفید ہے۔

اخلاقِ محسنی ایک دیباچہ اور چالیس ابواب پر مشتمل ہے۔ اُس کی عبارت شگفتہ اور رواں ہے۔ مضمون کی وضاحت کے لیے دلچسپ حکایات بھی لکھی گئی ہیں۔ موزوں اشعار اور احادیث بھی زینتِ کتاب ہیں۔

اخلاقِ محسنی کا سنِ تالیف ۹۰۰ھ مطابق ۱۴۹۴ء ہے۔ اخلاق محسنی کا نام تاریخی ہے اس کے حروف کے اعداد کا مجموعہ ۹۰۰ بنتا ہے۔

انوار سہیلی - اس کتاب کے مصنف بھی حسین واعظ ہیں۔ اس میں اخلاق و سیاسیات کے اصول جانوروں کی زبان سے حکایات کی صورت میں پیش کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کو ابوالمعالی نصراللہ کی کتاب کلیلہ دمنہ کا نقش ثانی سمجھنا چاہیے۔ حسین واعظ نے یہ چاہا تھا کہ کلیلہ دمنہ کی زبان کو زیادہ سادہ اور رواں کریں اور عربی امثال و حکم کو خارج کر دیں، لیکن یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکا، چنانچہ اس میں بھی تکلف اور تصنع پایا جاتا ہے۔ عربی کے الفاظ بھی بکثرت ہیں اس میں وہ لطافت بھی نہیں، جو کلیلہ دمنہ کا خاصہ ہے۔

حسین واعظ کو اگرچہ ایک واعظ کی حیثیت سے بڑی اہمیت حاصل ہوئی، لیکن اُن کی شہرت کا اصل سرمایہ اخلاقِ محسنی اور انوار سہیلی ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے بعض اور کتابیں بھی تصنیف کی ہیں، جن کے نام حسب ذیل ہیں۔ جواہر التفسیر، مواہب علیہ، روضۃ الشہداء، مخزن الانشاء، اختیارات، سبع کاشفیہ، اسرار قاسمی، مطلع الانوار۔ آپ نے مثنوی مولانائے روم کا بھی اختصار کیا، جس کا نام "لب لباب" ہے۔

عہدِ تیموریہ کے علماء

قاضی عضدالدین ایجی | آپ خواجہ حافظ کے ہم عصر تھے۔ سالِ وفات ۷۵۶ھ مطابق ۱۳۵۵ء ہے۔ آپ نے مواقف، فوائد غیاثیہ، شرح مختصر ابن حاجب کتابیں تالیف کیں۔

قطب الدین رازی | آپ کا سالِ وفات ۷۶۶ھ مطابق ۱۳۶۴ء ہے۔ آپ نے حکمت و منطق پر چند کتابیں تالیف کیں۔ جن میں شرح شمسیہ، لوامع الاسرار اور محاکمات خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

گیارھواں باب

دورِ صفویہ

تیموری عہد کا سلسلہ ختم ہوا ہی تھا کہ سرزمین ایران کو ترکمانوں کی یلغاروں سے سابقہ پڑا۔ ترکمانوں کے دو قبیلے باقی تمام قبائل میں ممتاز تھے، ایک قراقویونلو قبیلے کے ترکمان تھے، جن کے سردار قرامحمد اور قرایوسف تھے۔ دوسرے ترکمان آق قویونلو قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، جو قرایلوق عثمان اور اوزون حسن کے پیرو کار تھے۔ ان دونوں قبائل نے سازشوں کے ذریعے اقتدار حاصل کیا۔ اور ۷۸۰ھ سے ۹۰۸ھ بمطابق ۱۳۷۸ء تا ۱۵۰۲ء اہلِ ایران کے لیے وجہ پریشانی بنے رہے۔ اوزون حسن کے ہاتھوں، ابوسعید تیموری حکمران مارا گیا، اور وہ ایران میں سیہ وسفید کا مالک بن بیٹھا۔ اس فتح کے بعد وہ قراقویونلو ترکمانوں پر بھی غالب آیا اور آذربائیجان اور عراق پر بھی قابض ہو گیا، جہاں اُن کی حکومت تھی۔ ایران کے لیے قبائلیوں کی حکومت کچھ کم مصیبت خیز نہ تھی کہ اُدھر عثمانی ترک ایران کو اپنے تسلط میں لانے کے خواب دیکھنے لگے۔ اس اثنا میں ایک روحانی پیشوا صفی الدین اردبیلی کے خاندان سے ایک صاحب اثر شخص اسمٰعیل اٹھا اور اس نے اپنے بزرگوں کی تعلیم وارشاد کی مسند سنبھالی۔ اسمٰعیل دینی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ شمشیر بھی تھا۔ اس نے اپنے سرفروش مریدوں کی مدد سے ایک لشکر تیار کر کے ازبکوں کے سردار محمد شیبانی کو شکست دی اور اپنے مورثِ اعلیٰ شیخ صفی الدین کے نام کی نسبت سے صفوی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اس حکومت

سے ایران کو ایک مرتبہ پھر خالص وطنی حکومت نصیب ہوئی۔

صفوی خاندان کا سلسلۂ نسب حضرت امام موسیٰ کاظم سے ملتا ہے۔ اس خاندان کے افراد کئی نسلوں سے اردبیل میں آباد تھے۔ ان کا پیشہ درس و تدریس تھا، اس لیے لوگ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ ان میں سے صفی الدین ایک صوفی منش بزرگ خاص طور سے تعلیم و ارشاد کی بدولت مرجع انام بنے ہوئے تھے۔ لوگ جوق در جوق ان کے ہاتھ پر بیعت کرتے اور کسب فیض کرتے۔

صفی الدین کے بعد ان کے بیٹے صدر الدین نے تعلیم و ارشاد کی مسند سنبھالی۔ صدر الدین وہ بزرگ ہیں، جن کی خدمت میں امیر تیمور حاضر ہوا، اور پوچھا میں آپ کے لیے کیا خدمت بجا لا سکتا ہوں۔ آپ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ دیار بکر سے جو ترک قیدی بنا کر لائے گئے ہیں۔ انہیں رہا کر دیا جائے چنانچہ امیر تیمور نے ان کی یہ خواہش پوری کر دی۔ ترکوں نے رہائی پا کر آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور صوبہ گیلان میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہاں ان ترکوں کے ہزاروں لواحقین بھی آ بسے۔ بالآخر یہی ترک صفوی حکومت کے قائم کرنے میں ممد ثابت ہوئے۔

صدر الدین کے بعد مسند ارشاد خواجہ علی کو ملی۔ ان کے جانشین شیخ جنید ہوئے۔ آپ کا حلقہ ارادت اتنا وسیع ہوا کہ شہزادہ جہان شاہ قراقویونلو کو ان سے خطرہ پیدا ہو گیا، اور انہیں اردبیل سے نکل جانے کا حکم دیا۔ یہاں سے نکل کر شیخ جنید دیار بکر آ گئے۔ جہاں کے حکمران اوزون حسن نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور اپنی ہمشیرہ ان سے بیاہ دی۔ انھوں نے شہروان میں مستقل قیام اختیار کر لیا۔ یہاں وہ حاکم شہروان کے خلاف لڑتے ہوئے مارے گئے۔

آپ کا بیٹا شیخ حیدر تھا جس سے اوزون حسن نے اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔ یہ شہزادی یونانی ملکہ مارتھا کے بطن سے تھی۔ شیخ حیدر کے تین فرزند ہوئے، جن کے نام سلطان علی، ابراہیم مرزا اور شاہ اسمٰعیل ہیں۔ شاہ اسمٰعیل وہی نامور تاجدار ہے جس نے صفوی عہد کی

بنیاد رکھی۔

اوزون حسن کے بعد اُس کے بیٹے یعقوب بیگ نے ان تینوں بھائیوں کو کسی خدشے کی بنا پر قلعہ اصطخر میں قید کر دیا۔ آخر کچھ عرصے کے بعد جب انھیں رہائی ملی۔ تو یہ اردبیل آ گئے اور ارشاد و تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ یہاں ابھی ان کے پاؤں نہ جمے تھے کہ دارالسلطنت میں بلائے گئے۔ یہ تینوں بھائی ڈر کر اردبیل سے نکل بھاگے۔ سلطان علی تو دشمنوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ ابراہیم طبعی موت کا شکار ہوا۔ اور اسمٰعیل گیلان پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

دورِ صفویہ کا بانی ۹۰۵ھ تا ۹۳۰ھ
بمطابق ۱۴۹۹ء تا ۱۵۲۳ء

اسمٰعیل نے جس زمانے میں دشمن سے بچنے کے لیے گیلان میں پناہ لی، اُس وقت اس کی عمر چودہ سال کی تھی۔ ۹۰۵ ہجری میں اُس نے سرفروش ترک مریدوں کی مختصر سی فوج تیار کی، اور باکو اور شماخو شہر فتح کر لیے اس فتح کے بعد اس کی فوجی جمعیت سولہ ہزار تک پہنچ گئی۔ اس کے حوصلے اور بڑھے اور آق قویونلو خاندان کے شہزادہ الوند کو شکست دی۔ پھر تبریز کا رُخ کیا۔ اُس کی آمد پر اہلِ تبریز نے ہتھیار ڈال دیے۔ یہاں اسمٰعیل نے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر کے ۹۰۵ھ بمطابق ۱۴۹۹ء میں صفوی حکومت کی بنیاد رکھی۔

ایران کے لوگ حضرت علی المرتضیٰؓ کے گھرانے سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، آخر جب حضرت علیؓ کے گھرانے کا ایک فرد شاہ اسمٰعیل تختِ حکومت پر بیٹھا، تو اہلِ ایران اُس کی اطاعت کے لیے پروانہ وار بڑھے۔ شاہ اسمٰعیل محض حکمران نہ تھا، بلکہ دینی رہنما بھی تھا۔ ترکوں کے سات قبائل، جو اپنے پیشواؤں کی تقلید میں سرخ ٹوپی پہننے کی وجہ سے قزل باش کہلاتے تھے، شاہ اسمٰعیل کے پرچم تلے جمع ہو گئے۔ ترک اپنے حکمران کی طرح شیعہ عقیدہ کے پیرو تھے اور اس کے نام پر مرمٹنا اپنا مقدس فرض سمجھتے تھے۔

شاہ اسمٰعیل نے بادشاہت کا اعلان کر کے بغداد اور موصل کو اپنی سلطنت میں

شامل کرلیا۔ پھر دیار بکر کو بھی فتح کیا۔ شاہ اسمٰعیل ان مہموں میں اس قدر کامیاب ہوا کہ چند سال کے عرصے میں آق قویونلو حکمرانوں کو شکست دے کر ان کی وسیع سلطنت پر قابض ہو گیا۔

خراسان کی فتح

شمال مغربی ایران مسخر کر لینے کے بعد شاہ اسمٰعیل نے خراسان کا رُخ کیا، جس پر ازبک حکمران محمد شیبانی قابض تھا۔ ۹۱۶ھ بمطابق ۱۵۱۰ء میں شاہ اسمٰعیل نے مرو کے مقام پر ازبکوں کو شکست دی۔ محمد شیبانی فرار ہو گیا اور بالآخر اسیر ہو کر مارا گیا۔ اس فتح کے بعد بلخ اور ہرات بھی صفوی سلطنت کا حصہ بن گئے۔

عثمانی ترکوں کا حملہ

اس عہد کا ایک اہم واقعہ ترکوں اور اہل ایران کی جنگ ہے۔ ترک سلطان سلیم عثمانی نے شاہ اسمٰعیل کی بڑھتی ہوئی فتوحات کا حال سُنا، تو اپنا ایک سفیر تحفے تحائف دے کر شاہ اسمٰعیل کے پاس بھیجا، جس کا بہت پرتپاک خیر مقدم ہوا۔ لیکن جب یہ ترکی سفیر واپس پہنچا، تو بجائے اس کے کہ دونوں حکمرانوں کے تعلقات اور استوار ہوتے، شیعہ سُنی اختلاف کی وجہ سے تعلقات خراب ہو گئے۔ یہی مذہبی اختلاف بالآخر جنگ کا پیش خیمہ بنا۔ اور ۹۲۰ھ بمطابق ۱۵۱۴ء میں تبریز سے چالیس میل کے فاصلے پر چالدران کے مقام پر سلیم عثمانی اور اسمٰعیل صفوی، گویا سُنی اور شیعہ حکمرانوں کے مابین خوفناک جنگ ہوئی جس میں ہزاروں مسلمانوں کا خون بہا۔ اس جنگ میں شاہ اسمٰعیل کو شکست ہوئی اور تبریز پر عثمانیوں کا قبضہ ہو گیا۔ تبریز کی فتح کے بعد سلیم نے آگے بڑھنا چاہا، لیکن ترک فوج نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ بالآخر اسے تبریز کو بھی خیرباد کہہ کر واپس ترکی جانا پڑا۔

شاہ اسمٰعیل کی وفات اور سیرت

شاہ اسمٰعیل ۳۸ سال کی عمر پا کر ۹۳۰ھ بمطابق ۱۵۲۳ء

میں فوت ہو گیا۔ اس نے اپنے پیچھے چار بیٹے طہماسپ، القاص، سام (مصنف تحفۂ سامی) بہزاد اور پانچ بیٹیاں چھوڑیں۔ شاہ اسمٰعیل کے زمانے کا اہم ترین واقعہ یہ ہے کہ اس نے شیعہ مذہب کو سرکاری مذہب قرار دینے کا اعلان کیا۔

عہدِ اسمٰعیل کی خصوصیت ایک فقرے میں یوں بیان کی جا سکتی ہے کہ اس عہد میں "شمشیر" "علم" سے بڑھ کر مصروف کار رہی۔

شاہ طہماسپ (۹۳۰ھ تا ۹۸۴ھ مطابق ۱۵۳۰ء تا ۱۵۷۶ء)

شاہ اسمٰعیل کی وفات پر شاہ طہماسپ اس کا جانشین ہوا۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر دس سال تھی۔

شاہ طہماسپ نے عنانِ حکومت سنبھالی تو اُسے اُزبکوں کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا جسے اُس نے ۹۳۴ھ مطابق ۱۵۲۷ء میں فرو کیا۔ ۹۳۷ھ مطابق ۱۵۳۰ء میں انھوں نے پھر سر اٹھایا، لیکن شاہ طہماسپ نے پھر ان کی سرکوبی کی۔

ترکوں سے جنگ

شاہ طہماسپ ان بغاوتوں سے فارغ ہی ہوا تھا کہ ۹۴۰ھ مطابق ۱۵۳۳ء میں ترک حکمران سلیمان عثمانی ایران پر حملہ آور ہوا، اور میسوپوٹیمیا کو فتح کرنے کے بعد تبریز پر بھی ترکوں کا قبضہ ہو گیا۔ لیکن جونہی کہ ترکوں کا لشکر واپس ہوا، شاہ طہماسپ کی فوجوں نے اس کا تعاقب کر کے اسے کافی نقصان پہنچایا۔

شہزادہ القاص کی بغاوت

۹۵۴ھ مطابق ۱۵۴۷ء میں شاہ طہماسپ کے بھائی شہزادہ القاص نے بغاوت کی اور بالآخر ایران سے بھاگ کر سلیمان عثمانی کے دربار میں پناہ لی۔ اور اُس سے مدد چاہی۔ سلیمان نے ترکی لشکر القاص کی سرکردگی میں ایران پر حملہ کرنے کے لیے

بھیجا۔ جس نے تبریز اور اصفہان کے علاقے فتح کر لیے، لیکن القاص کا اپنے اتحادیوں کے ساتھ جھگڑا ہو گیا، اس پر ترکوں کا لشکر واپس ہو گیا۔

ترکوں سے معاہدہ

صفوی اور عثمانی حکمرانوں کے مابین کشمکش چلی آتی تھی، آخر ان دونوں حکومتوں کے درمیان ۹۶۲ھ مطابق ۱۵۵۴ء میں ایک دوستانہ معاہدہ طے پایا، جس سے دونوں کے اختلافات کچھ عرصہ کے لیے ختم ہو گئے۔

شہنشاہ ہمایوں کی ایران میں آمد

شاہ طہماسپ کے عہد کا ایک اور اہم واقعہ یہ ہے کہ شہنشاہ ہمایوں نے شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر ایران میں پناہ لی۔ طہماسپ نے شہنشاہ کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور اس کے ساتھ ایرانی لشکر بھیجا، جس کی مدد سے بالآخر پھر وہ اپنا تاج و تخت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

شاہ اسمٰعیل دوم (۹۸۴ھ مطابق ۱۵۷۶ء)

صفوی حکمران عموماً اپنے شہزادوں کو بچپن میں قبائلی سرداروں کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ۹۸۴ھ مطابق ۱۵۷۶ء میں جب طہماسپ نے وفات پائی، تو اس وقت شہزادے دور دراز علاقوں میں تھے۔ دارالسلطنت میں صرف شہزادہ حیدر تھا، لیکن پیشتر اس کے کہ اس کے حامی اس کی بادشاہت کا اعلان کرتے، اسے قتل کر دیا گیا۔ آخر چہ تھے شہزادہ اسمٰعیل کو، جسے شاہ طہماسپ نے پچیس سال سے جیل میں ڈال رکھا تھا، جیل سے نکال کر تخت نشین کیا گیا۔ اس طویل قید نے اسمٰعیل کو ظلم پسند اور بدبین بنا دیا تھا۔ چنانچہ اس نے عنان حکومت سنبھالتے ہی شہزادوں کو جو قزوین میں مقیم تھے، قتل کرا دیا۔ بعض چیدہ رؤسا بھی اس کی تیغ انتقام کی نذر ہوئے۔ شاہ طہماسپ کا بڑا بیٹا محمد خدابندہ اگرچہ بینائی کمزور ہونے کی وجہ سے اس قابل

تو نہ تھا کہ حکومت سنبھال سکے ، لیکن اسمٰعیل نے حکم دیا کہ محمد خدابندہ اور عباس دونوں کو قتل کر دیا جائے ابھی اس کے حکم کی تعمیل نہیں ہوئی تھی کہ خبر ملی اسمٰعیل زیادہ مقدار میں شراب پی کر دنیا سے چل بسا ہے ۔

محمد خدابندہ (۹۸۵ھ تا ۹۹۶ھ بمطابق ۱۵۷۷ء تا ۱۵۸۷ء)

اسمٰعیل دوم کی اچانک موت سے نہ صرف محمد خدابندہ کی جان بچ گئی ، بلکہ اسے حکومت بھی مل گئی ، اگرچہ یہ حکومت مختصر سی تھی ، کیونکہ وہ امور سلطنت سے عہدہ برآ ہونے کا اہل نہ تھا ۔ ادھر خراسان کے امرا نے عباس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا ۔ یہ وہی عباس ہے ، جو تاریخ میں عباس اعظم کے نام سے مشہور ہے ۔ آخر خدابندہ دس سال کی حکومت کے بعد دست بردار ہو گیا ، اور شاہ عباس اس کا جانشین ہوا ۔

شاہ عباس اعظم (۹۸۵ھ تا ۱۰۳۸ھ بمطابق ۱۵۷۷ء تا ۱۶۲۸ء)

شاہ عباس اول تخت نشین ہوا ، تو اس کی عمر سولہ یا سترہ سال کی تھی تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ صفوی حکومت شاہ عباس اول کے زمانے میں اپنے انتہائی عروج کو پہنچی ہوئی تھی ۔ شروع شروع میں شاہ عباس کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مغرب سے ترکوں کے حملوں کا خوف تھا مشرق میں ازبک بلائے جان بنے ہوئے تھے ، ادھر قزلباش امرا ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کے لیے سازشوں میں مصروف تھے ۔ جن کی بدولت شاہ عباس تخت نشین ہوا تھا ، لیکن تمام حالات سے نہایت خوبی سے عہدہ برآ ہوا ۔ اس عہد کی تاریخ لکھنا ہمارا منصب نہیں ، اس لیے بعض اہم واقعات کی طرف اشارہ کر کے ہم اصل موضوع کی طرف بڑھیں گے ۔

ترکوں کے حملے ۹۹۵ھ بمطابق ۱۵۸۶ء میں فرہاد پاشا عثمانی کا لشکر

ایران پر حملہ آور ہوا، اور بغداد کے قریب ایرانی فوج کو پسپا کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ترک تبریز پر قابض ہوگئے، پھر ایران کے مغربی صوبے بھی فتح کر کے ترکوں نے اپنی سلطنت میں شامل کر لیے۔ سنہ ۹۹۶ھ مطابق سنہ ۱۵۸۷ء میں فرہاد پاشا نے پھر ایران پر فوج کشی کی، اور گنجہ کا علاقہ بھی فتح کر لیا۔

شاہ عباس کے لیے ترکوں کے حملے کچھ کم ہوش ربا نہ تھے۔ اُدھر ازبکوں نے بھی لگا تار حملے کر کے ایران کی عافیت کو خطرے میں ڈال رکھا تھا۔ اس لیے شاہ عباس نے چاہا کہ ترکوں سے ہر قیمت پر مصالحت کر کے ازبکوں سے نپٹا جائے، چنانچہ سنہ ۹۹۸ھ مطابق سنہ ۱۵۸۹ء میں ایران اور ترکیہ کے مابین صلح نامہ طے ہوا جس کی رو سے تبریز اور بحیرہ خزر کی بندرگاہوں پر ترکیہ کا حق تسلیم کر لیا گیا۔

تخت سے دست برداری

سنہ ۱۰۰۰ھ مطابق سنہ ۱۵۹۱ء میں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جس کی مثال تاریخ میں مشکل سے ہی ملے گی۔ شاہ عباس کے نجومیوں نے اطلاع دی کہ چند دن بادشاہ کا ستارہ گردش میں رہے گا۔ اس لیے مناسب ہوگا کہ بادشاہ عارضی طور پر تخت و تاج سے دست بردار ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ عباس اعظم تخت و تاج چھوڑ کر شاہی محلات سے نکل گیا۔ اس کی جگہ ایک آزاد خیال شخص یوسف سراج کو، جس کے متعلق گمان تھا کہ وہ مملکت کے لیے خطرے کا موجب بن سکتا ہے۔ تاج شاہی پہنایا گیا۔ یوسف شاہ نے عنان حکومت سنبھالتے ہی ملک میں اصلاحات کرنی چاہیں۔ لیکن اصلاحات کے لیے ملکی ماحول سازگار نہ تھا۔ اس لیے یوسف شاہ کے خلاف بغاوت ہوئی، جس میں وہ قتل ہوگیا۔ اس کے قتل سے یہ سمجھ لیا گیا کہ ستاروں کی گردش کا منشا پورا ہو چکا ہے، اس لیے شاہ عباس اعظم کی دوبارہ تاج پوشی ہوئی۔

ازبکوں کے حملوں کا سدِّ باب

ازبک اسی عرصے میں بہت زور شور

سے حملے کرتے رہے ، آخر ۱۰۰۶ھ مطابق ۱۵۹۷ء میں شاہ عباس نے ہرات کے مقام پر ایک تباہ کن شکست دے کر اُن کے حوصلے پست کر دیئے۔ ازبکوں کے آئندہ حملوں کو روکنے کے خیال سے اس نے کردستان سے ہزاروں کردوں کو دعوت دے کر بلوایا اور سرحد پر آباد کرا دیا۔

فوجی تنظیم

ازبکوں کے حملوں سے فراغت پا کر اُس نے اپنی فوج کا جائزہ لیا۔ فوج ساٹھ ہزار سواروں پر مشتمل تھی ، جو قزل باش سرداروں کے زیرِ اثر تھی اور کسی دوسرے کا حکم نہ مانتی تھی۔ یہ چیز بھی شاہ عباس کے لیے وجۂ پریشانی بن گئی۔ اس صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے اُس نے فوج کی تعداد کو گھٹا کر نصف کر دیا۔ اور اس کی بجائے دس ہزار سوار اور بارہ ہزار پیدل فوج ایسی بھی تیار کی ، جو صرف حکمران کو جواب دہ تھی اور انھیں نئے اسلحہ سے مسلح کر دیا گیا۔

شاہ سِوِن کی تشکیل

قزلباش سرداروں کا زور توڑنے کے لیے شاہ عباس نے جو نئی فوجی جماعت تشکیل کی ، شاہ سِوِن کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس جماعت میں شامل ہونے کے لیے ہر قبیلے کے افراد کو دعوت دی گئی۔ شاہ کا یہ منصوبہ بہت کامیاب ہوا۔ مختلف قبیلوں سے تعلق ختم کر کے لوگ جوق در جوق اس نئی جماعت میں شامل ہوتے گئے۔ اس سے گویا ایک نیا قبیلہ وجود میں آ گیا ، جس کی ہمدردیاں بادشاہ کے ساتھ تھیں۔

تُرکوں کے خلاف شاہ عباس کی مہمیں

۱۰۱۱ھ تا ۱۰۳۶ھ مطابق ۱۶۰۲ء تا ۱۶۲۶ء

شاہ عباس اعظم پندرہ سال تک جذبہ انتقام کو دبائے ہوئے خاموش رہا۔ آخر جب اُس نے ملکی حالات کی اصلاح سے فراغت پائی ، تو وہ اِس قابل ہو گیا تھا کہ ترکوں سے دو دو ہاتھ کرے اور اپنے علاقے اُن سے واپس لے۔ اُس کے لیے بظاہر وجہ

یہ پیدا ہو ہی گئی کہ آذربائیجان کے ترکوں کے لشکر نے سلماس پر حملہ کر دیا جس سے معاہدہ صلح کی خلاف ورزی ہوئی۔ شاہ عباس کو دبی ہوئی خواہشوں کو پورا کرنے کا موقع ملا۔ اس نے لڑ کر تبریز، کردستان، بغداد، موصل اور دیار بکر گویا ایک ایک کر کے سب ایرانی علاقے ترکوں سے واپس لے لیے، اور پھر جب کربلا اور نجف کو ترکوں کے پنجے سے چھڑا لیا، تو گویا ایک مذہبی فرض سے سبکدوش ہو گیا۔ آخر ۱۰۲۱ھ بمطابق ۱۶۲۱ء میں پھر ترکوں سے معاہدہ ہو گیا۔

ترک اب بھی خاموش نہیں بیٹھے، چنانچہ ۱۰۲۵ھ بمطابق ۱۶۱۶ء میں وہ پھر حملہ آور ہوئے، لیکن انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کے بعد ۱۰۲۷ھ بمطابق ۱۶۱۷ء میں انھوں نے تبریز پر حملہ کیا، لیکن اب کے بھی وہ ناکام رہے اور آخر ایک نیا معاہدہ ہوا۔ لیکن سات سال گزرے تھے کہ ترکوں نے پھر پیش قدمی کی اور بغداد کا محاصرہ کر لیا۔ شاہ عباس کا لشکر عین وقت پر آ پہنچا اور ترکوں کو پسپا ہوتے ہی بنی۔

خارجی تعلقات شاہ عباس کے عہد میں سر رابرٹ، شرلے اور اس کا بھائی سیاحت کی غرض سے ایران آئے تھے۔ ان کا یہ مقصد بھی تھا کہ ایران اور انگلستان کے مابین آزادانہ تجارت شروع کرائی جائے۔ ان بھائیوں نے ترکوں کے خلاف جنگوں میں بھی بڑی قابل قدر خدمات سرانجام دیں، جن کے صلے میں شاہ نے انھیں طرح طرح سے نوازا۔ ان دونوں بھائیوں کے ذریعے شاہ عباس نے بیرونی ملکوں سے بھی سیاسی رابطے قائم کیے۔

ملکی نظم و نسق۔ عباس اعظم نے ملکی نظم و نسق کی طرف بہت توجہ دی۔ اصفہان میں نیا دارالسلطنت قائم کیا، جہاں شاندار عمارات تعمیر کرائیں اور عظیم الشان باغات لگوائے۔ اس کی بدولت اب تک اصفہان کو "نصف جہان" کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ شاہ عباس

نے معاشرے کی اصلاح کی، اور عوام کو منظم کیا۔ مشہد کو قومی مرکز بنایا، جہاں شیعہ حضرات اب بھی جناب امام رضا کے مزار کی زیارت کے لیے دُور دراز کا سفر کر کے جاتے ہیں۔

گھریلو زندگی

ایران کو طاقتور اور خوش حال بنانے کے لیے شاہ عباس نے "اعظم" کا لقب حاصل کیا۔ شاہ کی عظمت کے سامنے جب ہم اس کی گھریلو زندگی پر نظر ڈالتے ہیں، تو ہمیں اس کے کردار کا ایک تاریک پہلو بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

شاہ عباس کے چار بیٹے تھے۔ جوں جوں وہ بڑے ہوئے اور انھیں مقبولیت حاصل ہوئی، شاہ کو ان سے حسد ہوتا گیا۔ صفی مرزا اس کا بڑا بیٹا تھا، جو شجاعت، شرافت اور سخاوت کا مجسم پیکر تھا۔ کہا جاتا ہے، اُسے شاہ نے محض اس لیے قتل کرا دیا کہ وہ اس سے کسی عزیز کے قتل کا انتقام نہ لے۔ دوسرا بیٹا طہماسپ مرزا تھا، جو طبعی موت مرا۔ تیسرے بیٹے خدابندہ کو اس نے کوئی بہانہ بنا کر اندھا کر دیا۔ چوتھے بیٹے کی بھی اُس نے آنکھیں نکلوائیں۔ اور اس طرح اسے بھی تخت و تاج سے محروم کر دیا۔

شاہ عباس کی اس شقاوت قلبی کی ممکن ہے، کچھ وجوہ ہوں، لیکن اس سلسلے میں تاریخ خاموش ہے۔ بہرحال شاہ عباس ستر سال کی عمر میں اپنی عظمت کی تاریخ میں ایک خونیں باب کا اضافہ کر کے ۱۰۳۸ھ مطابق ۱۶۲۸ء میں اس دارِ فانی سے رخصت ہوا۔

عباسِ اعظم کے جانشین (۱۰۳۸ھ تا ۱۱۳۵ھ)
(مطابق ۱۶۲۸ء تا ۱۱۳۵ء)

شاہ عباس کا حال خاصہ طویل ہو گیا ہے۔ اب اسی نسبت سے اس کے جانشینوں کا تذکرہ اختصار سے پیش کیا جاتا ہے۔

شاہ صفی

شاہ عباس اعظم کے تخت پر اس کا پوتہ شاہ صفی بیٹھا، اس نے ۱۰۳۸ھ سے ۱۰۵۲ھ مطابق ۱۶۲۸ء تا ۱۶۴۲ء حکومت کی۔ یہ ایک ظالم شخص تھا اور امور سلطنت میں بہت کم دخل دیتا تھا۔ اس کی عدم توجہی

کا یہ نتیجہ ہوا کہ بابل اور قندھار ایرانی مملکت سے خارج ہو گئے۔

شاہ عباس دوم ۱۰۵۲ھ تا ۱۰۷۷ھ مطابق ۱۶۴۲ء تا ۱۶۶۶ء

شاہ صفی کے بعد اس کا بیٹا شاہ عباس دوم تخت نشین ہوا۔ یہ ایک عدل پسند بادشاہ تھا اور رعایا کے ساتھ اس کا سلوک مساویانہ تھا۔ سیاحوں کی بہت قدر و منزلت کرتا تھا۔ اس عہد کو صفوی عہد کا آخری سنبھالا کہنا چاہیے۔

سلمان

شاہ عباس دوم کے بیٹے سلمان نے ۱۰۷۷ھ سے ۱۱۰۵ھ مطابق ۱۶۶۶ء تا ۱۶۹۳ء حکومت کی، اور ظلم وستم کی چند گھناونی داستانوں کے سوا اور کوئی بات یادگار نہ چھوڑی۔

شاہ حسین

شاہ حسین کو آخری صفوی تاج دار سمجھنا چاہیے، کیونکہ اس کے بعد شاہ طہماسپ دوم اور عباس سوم، جو تخت نشین ہوئے محض نادر شاہ افشار کے ہاتھوں میں کٹ پتلی کی حیثیت رکھتے تھے۔ شاہ حسین کی مدت حکومت ۱۱۰۵ھ تا ۱۱۳۵ھ مطابق ۱۶۹۳ء تا ۱۷۲۲ء ہے۔ یہ ایک رحم دل بادشاہ تھا، لیکن امور سلطنت سے اُسے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ حکومت کا کام کاج وزراء اور خواجہ سراؤں پر چھوڑا ہوا تھا۔

صفوی عہد کا اختتام

صفوی عہد کے حکمرانوں نے تقریباً دو سو سال حکومت کی۔ آخر افغان ایران پر حملہ آور ہوئے اور صفوی حکومت کے پایۂ تخت پر قابض ہو گئے۔ پھر نادر شاہ افشار نے افغانوں کے عہد کو ختم کر کے افشاری عہد کی بنیاد رکھی اور تین سال کے عرصے میں بغداد سے لے کر دہلی تک کا سارا علاقہ حکومت ایران کے تسلط میں آ گیا۔ لیکن آخر کریم خان زند نے افشاری عہد کو ختم کر کے زندیہ عہد کی بنیاد ڈالی۔ افغانوں کا غلبہ، سلطنت افشار اور زند پٹھانوں کا اقتدار یہ سب کچھ

پچاس سال کے عرصے میں ختم ہو گیا۔ ان غیر ملکی حکومتوں کے بعد ۱۱۹۳ھ بمطابق ۱۷۷۹ء میں آقا محمد خان قاچار تخت نشین ہوا، اور ایک مرتبہ پھر ایران کو سیاسی کشمکش سے کچھ عرصہ کے لیے نجات مل گئی۔

صفوی خاندان کا شجرۂ نسب

صفی الدین اردبیلی

- صفی الدین اردبیلی
  - شیخ صدر الدین
    - خواجہ علی
      - شیخ ابراہیم
        - شیخ جنید
          - شیخ حیدر
            - سلطان علی
            - ابراہیم مرزا
            - اسماعیل (۱)
              - شاہ طہماسپ (۲)
                - محمد خدابندہ (۴)
                  - حمزہ شاہ
                  - شاہ عباس اعظم (۵)
                    - صفی مرزا
                      - شاہ صفی (۶)
                        - شاہ عباس دوم (۷)
                          - سلیمان (۸)
                            - شاہ حسین
                    - طہماسپ مرزا
                    - خدابندہ
                  - ابوطالب
                  - طہماسپ
                - حیدر
                - اسمٰعیل دوم (۳)
                - سلیمان
                - مصطفیٰ
              - القاس
              - سام مرزا
              - بہرام

صفوی دَور کا علم و ادب

صفوی دَور میں بلند پایہ شعراء کی کمی

صفوی دور کی مدّت دو سو سال ہے۔ اس طویل عرصے پر نظر ڈالیے، تو ہمیں نقاشی اور خوش نویسی کا فن کافی عروج پر نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر کمال الدین بہزاد ایسا استادِ فن، سلطان حسین بالقیرا کے دربار کا نقاش اور خوش نویس تھا۔ اس کے بعد اس فنِ لطیف میں میرکؔ، سلطان محمد اور میر سید علی نے شاہ طہماسپ کے دربار میں نامودی حاصل کی ایسی طرح علی رضا عبّاسی بھی ایک عظیم فنکار مانا جاتا ہے۔ نقاشی اور خوش نویسی کے علاوہ اصفہان کے فنِ تعمیر کے نمونے آج بھی زائرین سے خراجِ عقیدت وصول کرتے ہیں، لیکن انتہائی تعجب کا مقام ہے کہ بادشاہت کے اس تابناک دور میں نامور شعراء اور ادیب بہت کم نظر آتے ہیں۔ شاہ اسمٰعیل اوّل کے بیٹے سام مرزا نے اپنی تالیف "تحفہ سامی" میں یوں تو شاعروں کے بیسیوں نام گنائے ہیں، لیکن اگر ان میں سے جامیؔ کا نام نکال دیا جائے، تو کوئی ایک نام بھی ایسا باقی نہیں رہتا، جو قابلِ ذکر ہو۔ اس کی وجہ مشہور مستشرق پروفیسر براؤن علامہ محمد قزوینی کے الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں۔

"صفوی عہد میں علم و ادب کی پستی کی بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ ترک بادشاہوں کی دشمنی کی وجہ سے صفوی تاجداروں کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اہلِ ایران میں مذہبی اور فکری یک رنگی پیدا کی جائے، اس لیے وہ صرف شیعہ علماء ہی کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ جن کے پیشِ نظر صرف یہ مقصد تھا کہ ایران کے طول و عرض کو ایک ہی مذہبی رشتے میں منسلک کر دیا جائے اور اس کے ذریعے سیاسی یک جہتی قائم کی جائے۔ آج سارے ایران میں مختلف بولیوں کی بجائے صرف ایک زبان بولی جاتی ہے اور اہلِ ایران کم و بیش ایک ہی مذہبی عقیدہ رکھتے ہیں، یہ صفوی دَور ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔"

رضازادہ شفق لکھتے ہیں۔ "چون[1] صفویان شیعی متعصب بودند تشیع را مذہب رسمی ایران قرار دادند ازین رو نظم و نثر مذہبی درین عصر ترقی کرد۔ شعرا بجائے مدح شاہان بہ نعت انبیا و اولیا پرداختند و مدح و مرثیہ آل رسولؐ را موضوع قرار دادند و علما در جمع اخبار و آثار شیعہ و شرح و بسط فقہ و حدیث کوشیدند۔۔۔۔۔۔"

رضا قلی خان اپنی تالیف مجمع الفصحا میں لکھتے ہیں کہ صفوی بادشاہوں بالخصوص شاہ طہماسپ اور عباسِ اعظم کا حکم تھا کہ قصیدے صرف آئمہ کے لکھے جائیں، امرا و روسا کی مدح خوانی نہ کی جائے۔ اس سے شاعروں کے دنیاوی انعام واکرام کے وسیلے ختم ہو گئے۔ ادھر ہندوستان میں مغل بادشاہوں اور امراء کے درباروں میں شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے اور شاعروں کے منہ جواہرات سے بھرے جاتے تھے۔ اس لیے اکثر نامی علماء اور شعرائے سرزمین ایران کو خیرباد کہہ کر برِصغیر پاک و ہند کا رخ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ایران کے شعراء عرفی، نظیری، ظہوری، وحشی، کلیم اور صائب ہندوستانی درباروں میں محوِ نغمہ سرائی تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایران کے سرود و نغمہ نے وطن کو خیرباد کہہ کر اب ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا ہے۔

فغانی شیرازی (وفات ۹۲۵ھ بمطابق ۱۵۱۹ء)

فغانی کے حالات تذکروں میں بہت کم ملتے ہیں۔ اکثر تذکروں میں دو تین سطروں سے زیادہ اور کچھ نہیں لکھا گیا۔

سام مرزا مؤلف تحفہ سامی لکھتا ہے کہ فغانی شروع شروع میں چاقو چھریاں بنانے کا کام کرتا تھا، اسی نسبت سے پہلے سکاکی تخلص کیا، پھر بدل کر فغانی رکھا۔

---

[1] تاریخ ادبیات ایران صفحہ ۳۶۳

فغانی نے شعر کہنے شروع کیے، تو ہرات آنا ہوا۔ اس کا رنگ عام شعراء سے مختلف تھا اس لیے اس کی طرف لوگوں نے کم توجہ دی۔ مولانا جامی سے ملاقات ہوئی، لیکن ان سے داد سخن نہ ملی، بالآخر تبریز آیا۔ یہاں کا فرمانروا سلطان یعقوب آق قوینلو تھا۔ اس کی شان میں قصیدہ کہا۔ سلطان نے اس کی بہت قدر دانی کی اور "بابا" کا خطاب دیا۔

فغانی بہت لاابالی طبیعت کا تھا۔ مزاج رندانہ پایا تھا۔ شراب حد سے زیادہ پیتا تھا اکثر وقت شراب خانے میں گزرتا۔ آخر عمر میں شراب سے توبہ کی اور مشہد میں معتکف ہو گیا۔

کہا جاتا ہے کہ فغانی کا دیوان ضائع ہو گیا تھا۔ آخر جہاں کہیں سے اس کے اشعار ملے وہ جمع کر لیے گئے، اور اس صورت میں اس کا موجودہ دیوان مرتب ہوا۔

تذکرہ نویسوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ متوسطین کی شاعری میں جب انقلاب آنے پر ایک نیا دور قائم ہوا، جسے نازک خیالیوں کا دور کہا جاتا ہے، اس کا بانی بابا فغانی ہے۔

نازک خیالیوں کے دور کے اندازِ خاص کو "سبک ہندی" کا نام دیا گیا ہے! سے "سبکِ ہندی" کہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس انداز میں جن شعرا نے کمال حاصل کیا، وہ ہندی درباروں سے وابستہ تھے، مثلاً نظیری، عرفی، صائب اور کلیم وغیرہ۔

سبک ہندی

جس اندازِ بیان کو "سبک ہندی" کہا جاتا ہے اس کو فارسی ادب پر ترکی اندازِ فکر کا ایک اثر سمجھنا چاہیے۔

جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے، ایران اور روم کے سلجوقی ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے باہمی ربط و تعلق کی وجہ سے رومی دربار میں فارسی کا چرچا ہوا۔ اسی تعلق کی بنا پر کئی عارف اور شاعر مثلاً شہاب الدین سہروردی، نجم الدین رازی اور مولانا جلال الدین کے والد مولانا بہاءالدین ایشیائے کوچک میں وارد ہوئے؛ تو فارسی زبان و ادب کی اور بھی اشاعت ہوئی۔ پھر رفتہ رفتہ ترکی اور فارسی کے امتزاج سے ایک نیا فارسی ادب وجود میں آیا،

جس کا بانی مولانائے روم کا فرزند سلطان ولد مؤلف "ابتدا نامہ" ہے۔

روم کے اس نئے فارسی ادب میں کلمات و تراکیب تو وہی ایرانی ہیں، لیکن اندازِ فکر رومی ہے۔

خیال بندی جسے نازک خیالی بھی کہتے ہیں، ترکی مزاج کا خاصہ تھا، جیسا کہ ترکی شاعری سے پتا چلتا ہے، اس لیے فارسی شعر و ادب میں بھی خیال بندی کا عنصر شامل ہوا۔ اس سے رفتہ رفتہ ایران کے وہ شعرا بھی متاثر ہوئے، جو تیموری اور ترکمان درباروں سے متعلق تھے۔ یہ اندازِ فکر جسے ہم سبک ہندی کہتے ہیں، پہلی مرتبہ اپنی ابتدائی شکل میں بابا فغانی کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ سبک ہندی کی خصوصیت کا مفصل ذکر آگے چل کر آئے گا۔

فغانی کے بعض اشعار نمونے کے طور پر نقل کیے جاتے ہیں ؎

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست　　بسیار شیوہ ہاست بتان را کہ نام نیست

شعرا محبوب کے حسن کو بیان کرنے کے لیے اس کی الگ الگ خوبی کا ذکر کرتے ہیں اور ہر خوبی کو الگ الگ نام دیتے ہیں۔ مثلاً ناز و کرشمہ، انداز و خرام وغیرہ۔ فغانی محبوب کے حسن و خوبی کا ذکر کرتے ہوئے۔ کرشمہ و ناز و خرام کا نام تو لیتا ہے، لیکن اس سے وہ مطمئن نہیں ہوتا، تو ایک اور مضمون پیدا کرتا ہے۔ کہ محبوب کی بعض خوبیوں کے نام تو ہیں، لیکن بعض ایسی خوبیاں بھی ہیں کہ ان کے نام ہی نہیں، بیانِ حسن ہو تو کیونکر ہو۔

ساقی مدام بادہ باندازہ می دہد　　این بیخودی گناہ دل زود مست ماست

کہنا یہ تھا کہ ساقی ہر شخص کو اس کے ظرف سے نوشی کے موافق شراب دیتا ہے اس خیال سے ایک اور مضمون پیدا کیا ہے یعنی اب ہماری طرف جو جام شراب نہیں آتا اس کا سبب یہ ہے کہ ہم تھوڑی سی پی کر ہی بیخود ہو گئے ہیں۔ اس میں ساقی کا کیا قصور ہے قصور وار تو ہمارا دل ہے جو ذرا سی عدم تشنہ لب سے مست ہو جاتا ہے۔

ای کہ می گوئی چرا جامی بجانی می خوری

این سخن با ساقی ما گو کہ اندازان کردہ است

کہنا یہ تھا کہ ہم جان دے کر بھی جام شراب محبوب سے لے لینا چاہتے ہیں لیکن یہاں عجیب نازک خیالی پیدا کی ہے ، یعنی محبوب کے ہاتھ سے جام شراب حاصل کرنا ہمیں اتنا عزیز ہے کہ اگر جان بھی دینی پڑے تو ہم حاصل کر لیتے ہیں۔ معترض کہتا ہے ، یہ شراب بھلا ایسی بھی کیا ہے کہ جان دے کر خریدی جائے۔ شاعر جواب دیتا ہے کہ یہ سودا مہنگا نہیں بلکہ سستا ہے ، مجھ سے نہ پوچھو ، یہ ہمارے محبوب سے پوچھو کہ اس نے اسے اتنا ارزاں کیوں کیا ہے۔

فغانی کے چند اور شعر ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں ؎

آن کہ این نامۂ سربستہ نبشت است نخست
گرہے سخت بسر رشتۂ مضمون زدہ است

تامی توان شکست دل دوستان مخواہ — کین خانہ را بہ کعبہ مقابل نہادہ اند
در ماندہ صلاح و فسادیم الحذر — زین رسم ہا کہ مردم عاقل نہادہ اند

آلودہ شراب فغانی بہ خاک رفت — آہ از ملائکش کفن تازہ بو کنند

فغانی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے شاعری میں محبوب کو فوق الفطرت بنا کر پیش نہیں کیا ، جیسا کہ قدما کا اصول تھا۔ بلکہ گوشت و پوست کی جیتی جاگتی محبوبہ سے عشق کیا ہے۔ اس کی شاعری میں عشقِ حقیقی کا شائبہ تک نہیں۔ وہ عشقِ مجازی کا دلدادہ ہے۔ چنانچہ یہی وارداتِ قلبی اس کی عشقیہ شاعری میں نظر آتے ہیں۔

ہاتفی خرجردی (سالِ وفات ۹۲۷ھ مطابق ۱۵۲۰ء)

ہاتفی ، جامی علیہ الرحمۃ کا بھانجا ہے۔ اس نے بھی نظامی کی تقلید میں خمسہ لکھا ، جو لیلیٰ مجنوں ، شیریں خسرو ، ہفت

منظر، تیمور نامہ اور شاہنامہ پر مشتمل ہے۔

ایک مثنوی شاہ درویش

ہلالی چغتائی (سال وفات ۹۳۹ھ مطابق ۱۵۳۲ء)

اور دوسری مثنوی صفات العاشقین ہے۔ دیوان بھی چھپ چکا ہے۔

اس کی یادگار دیوان اور دو مثنویاں سحر

اہلی شیرازی متوفی (۹۴۲ھ مطابق ۱۵۳۵ء)

حلال اور شمع پروانہ ہیں اس کے دیوان کا بہترین خطی نسخہ میوزیم پشاور میں موجود ہے۔

وحشی بافقی

کرمان کے ایک قصبہ بافق میں تولد ہوا اور یہیں ۹۹۱ھ مطابق ۱۵۸۳ء میں وفات پائی۔ وحشی مشہور غزل گو تھا۔ مسمط لکھنے میں بھی اسے خاص ملکہ تھا۔ اس نے مثنوی فرہاد و شیریں لکھنی شروع کی تھی، لیکن اس کی تکمیل نہ کر سکا۔ آخر میں وصال شیرازی نے اسے مکمل کیا۔

زلالی خوانساری

شاہ عباس اعظم کا ملک الشعراء تھا۔ اس نے سات مثنویاں لکھی ہیں، جو اس کی شہرت کا سرمایہ ہیں۔

محتشم کاشان کا رہنے والا

محتشم کاشانی (سال وفات ۹۹۶ھ مطابق ۱۵۸۷ء)

تھا۔ شروع شروع میں غزلیں اور قصیدے کہتا تھا۔ قصیدوں ہی کی بدولت اُسے شاہ طہماسپ کے دربار میں جگہ ملی۔ پروفیسر براؤن تاریخ عالم آرائے عباسی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ شاہ طہماسپ شروع شروع میں شعراء کی محفلوں کو بہت پسند کرتا تھا،

ان شعراء اور دیگر اسی دور کی تفصیلات کے لیے ڈاکٹر انعام الحق کوثر کا رسالہ ذکری بابا فغانی اور اس کے عہد کے شعراء ملاحظہ کیجئے۔

لیکن جوں جوں شیعہ علماء کا اثر اس پر غالب آیا، شعراء کی محفلوں سے اس کی توجہ ہٹ گئی۔ ایک مرتبہ محتشم انعام و اکرام کی امید میں دو قصیدے لکھ کر لے گیا، ایک شاہ کی مدح میں تھا، دوسرا شہزادی پری خانم کی تعریف میں۔ لیکن شاہ طہماسپ نے یہ کہا کہ "بادشاہوں اور شہزادیوں کی تعریف میں جو قصیدے کہے جاتے ہیں، وہ جھوٹ کا پلندا ہوتے ہیں۔ ہاں البتہ انبیاء اور امامین کی تعریف میں جو کچھ کہا جائے، وہ مبالغہ سے پاک ہوتا ہے۔ اور شاعر اپنی صلاحیتوں سے موزوں طریقے پر کام بھی لے سکتے ہیں۔ اس صورت میں صلے کی توقع انھیں انسانوں سے نہیں، بلکہ خداوند تعالیٰ سے ہوتی ہے۔" اس پر محتشم نے بھی اپنا اندازِ فکر بدل لیا، اور امامین کے مرثیے کی طرف رجوع کیا اور اسے انتہائے کمال کو پہنچایا یہ حقیقت ہے کہ اردو مرثیہ میں جو مرتبہ انیس کو حاصل ہوا، وہی مرتبہ محتشم کاشانی نے فارسی مرثیہ گوئی میں پایا۔ امامین کی منقبت میں ایک زندۂ جاوید مرثیہ محتشم کی یادگار ہے۔ جس کے دو بند حسبِ ذیل ہیں۔

برخوانِ غم چو عالمیان را صلا زدند
اول صلا بہ سلسلۂ انبیا زدند
نوبت باولیا چو رسید آسمان طپید
زان ضربتی کہ بر سرِ شیرِ خدا زدند
پس آتشی ز اخگرِ الماس ریزہا
افروختند و بر حسنِ مجتبیٰ زدند
وانگہ سرادقی کہ ملک محرمش نبود
کندند از مدینہ و در کربلا زدند
وز تیشۂ ستیزہ در آن دشت کوفیان
بس نخلہا ز گلشنِ آلِ عبا زدند

بس ضربتی کز آن جگر مصطفیٰ درید
بر حلق تشنهٔ خلف مرتضیٰ زدند
اہل حرم دریده گریبان گشاده موی
فریاد بر در حرم کبریا زدند
روح الامین نهاده بزانو سر حجاب
تاریک شد ز دیدن او چشم آفتاب
چون خون ز حلق تشنهٔ او بر زمین رسید
جوش از زمین بذروهٔ عرش برین رسید
نزدیک شد که خانهٔ ایمان شود خراب
از بس شکستها که بارکان دین رسید
نخل بلند او چو خسان بر زمین زدند
طوفان بر آسمان ز غبار زمین رسید
باد آن غبار را بمزار نبی رساند
گرد از مدینه بر فلک هفتمین رسید
یکباره جامه در خم گردون بنیل زد
چون این خبر بعیسیٰ گردون نشین رسید
پر شد فلک ز غلغله چون نوبت خروش
از انبیا بحضرت روح الامین رسید
کرد این خیال وهم غلط کار کین غبار
تا دامن جلال جهان آفرین رسید
هست از ملال گرچه بری ذات ذوالجلال او در دلست و هیچ دلی نیست بی ملال

پوری نظم کے بارہ بند ہیں، اور ہر بند میں سات شعر ہیں۔ اس کی زبان سلیس، رواں اور بے ساختہ ہے اور لفظی صنائع و بدائع سے پاک ہے۔ نظم کا ہر مصرع خلوص اور حقیقت نگاری کا آئینہ دار ہے۔ ان اشعار میں دلی درد کی جھلک نظر آتی ہے، جو واقعاتِ کربلا کی یاد دلاکر دنیا کے اُس عظیم المیہ کو آنکھوں کے سامنے لے آتی ہے۔ یہ مرثیہ ایران میں عزاداروں کی مجلسوں میں اکثر پڑھا جاتا ہے۔

ہاتف اصفہانی (سالِ وفات ۱۱۹۸ھ مطابق ۱۷۸۳ء)

سید احمد ہاتف

اصفہانی عہد افشار و زند کا مشہور شاعر تھا۔ ہاتف کے بزرگ آذربائیجان کے ایک قصبہ اردوباد کے رہنے والے تھے۔ ہاتف کا بیشتر وقت اصفہان میں گزرا۔ قم اور کاشان میں بھی کچھ عرصہ مقیم رہا، اور انہی شہروں میں تعلیم پائی۔ ہاتف کو عربی زبان میں بہت دسترس تھی۔

ہاتف صاحبِ دیوان ہے۔ اکثر غزلیں اس نے حافظ و سعدی کی تقلید میں لکھی ہیں۔ اس کی شہرت کا اصل سرمایہ اس کے صوفیانہ ترجیع بند ہیں۔ ایک ترجیع بند کا آخری بند نمونے کی غرض سے نقل کیا جاتا ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ ہاتف دنیا کو ذاتِ خداوندی کا مظہر خیال کرتا ہے۔ دنیا میں جو کچھ نظر آتا ہے محض حجاباتِ نظر ہیں۔ دیدہ معرفت اور چشم بصیرت ہو تو وحدتِ الٰہی کا جلوہ نظر آسکتا ہے ؎

یار بی پردہ از در و دیوار	متجلی ست یا اولی الابصار
شمع جوئی و آفتاب بلند	روز بس روشن و تو در شب تار
گر ز ظلمات خود رہی بینی	ہمہ عالم مشارق الانوار
کور وش قائد و عصا طلبی	بہر این راہ روشن و ہموار
چشم بکشا بہ گلستان و ببین	جلوہ آب صاف در گل و خار

زآب بی رنگ صد هزاران رنگ　　لاله و گل نگر در آن گلزار
پا براه طلب نه و از عشق　　بهر این راه توشه ای بردار
شود آسان ز عشق کاری چند　　که بود نزد عقل بس دشوار
یار گو بالغدو والاصال　　یار جو بالعشی والابکار
صد رهت لن ترانی ار گوید　　باز می دار دیده بر دیدار
تا بجائی رسی که می نرسد　　پای اوهام و پایه افکار
باریابی بمحفلی کانجا　　جبرئیل امین ندارد بار
این ره آن زاد راه و آن منزل　　مرد راهی اگر بیا و بیار
ورنه ای مرد راه چون دگران　　یار می گوی و پشت سر می خار
هاتف ارباب معرفت که گهی　　مست خوانندشان گهی هشیار
از می و بزم و ساقی و مطرب　　وز مغ و دیر و شاهد و زنار
قصد ایشان نهفته اسراریست　　که بایما کنند گاه اظهار
پی بری گر برازشان دانی　　که همین است سر آن اسرار

که یکی هست و هیچ نیست جز او
وحده لا اله الا هو

دَورِ مُغلیہ

صفوی دَور جب اپنے عروج پر تھا، تو فرغانہ اور کابل میں ظہیرالدین بابر کی حکومت تھی، جس کا سلسلۂ نسب باپ کی طرف سے تیمور، اور ماں کی طرف سے چنگیز خان کے ساتھ ملتا ہے۔

بابر ملکی مہموں میں کافی دیر تک الجھا رہا، آخر جب فارغ ہُوا، تو اُسے حدود سلطنت وسیع کرنے کا خیال آیا۔ چنانچہ برصغیر پاک و ہند پر حملہ آور ہوا، اور ۱۵۲۴ء مطابق ۹۳۱ھ میں لاہور فتح کر لیا۔ پھر دہلی پر چڑھائی کی اور ابراہیم لودھی کو شکست دے کر مغلیہ حکومت کی بنیاد رکھی، جو تقریباً تین سو سال تک قائم رہی۔

بابر ایک عظیم فاتح ہونے کے ساتھ ساتھ موسیقی، آرٹ اور شعر و ادب کا شیدائی تھا۔ اس نے ترکی زبان میں اپنی سرگزشت لکھی جو "تزک بابری" کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا ترجمہ "بابر نامہ" کے نام سے عبدالرحیم خانخاناں نے کیا۔

ہمایوں ۹۲۷ھ مطابق ۱۵۲۰ء میں تخت نشین ہوا۔ ۹۴۷ھ مطابق ۱۵۴۰ء میں اس نے شیر خان سوری کے ہاتھوں شکست کھائی، اور پندرہ سال تک صحراؤں کی خاک چھانتا رہا۔ اسی حالت میں ایران پہنچا، اور بالآخر صفوی تاجدار شاہ طہماسپ کی مدد سے کھوئی ہوئی سلطنت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہمایوں کے عہدِ حکومت میں متعدد علماء ایران کو خیرباد کہہ کر برصغیر پاک و ہند آ گئے۔

ہمایوں کے بعد جلال الدین اکبر ۹۶۴ھ مطابق ۱۵۵۶ء میں تخت نشین ہوا اور چالیس سال کی کوششوں سے شمالی اور وسطی برصغیر کو ملا کر ایک وسیع اور مضبوط سلطنت قائم کر لی۔ اکبر اگرچہ زیادہ تعلیم تو حاصل نہ کر سکا تھا، لیکن اسے

علم و ادب سے بڑا شغف تھا۔ شعر بھی کہتا تھا۔ اس کے دربار میں علماء شعرا اور فضلا کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ ابو الفضل، جو شہنشاہ اکبر کے دربار کا مشہور انشا پرداز تھا، لکھتا ہے کہ اس دربار میں چار سو شاعر تھے۔" فیضی اکبر کے دربار کا ملک الشعراء تھا، اور شاہی کتب خانے کا مہتمم بھی تھا۔ اس نے ہزاروں کتابوں کے قلمی نسخے ایران سے منگوا کر کتب خانے میں رکھے۔ اس عہد میں عربی اور سنسکرت کی متعدد کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہوا جس سے فارسی ادبیات میں گرانقدر اضافہ ہوا۔ اکبر کے عہد میں نورتنوں کے بھی دربار لگتے تھے۔ حکیم ابوالفتح گیلانی اور عبدالرحیم خانخاناں کے دربار علم و فضل کی ترویج و اشاعت کے لیے خاص طور سے مشہور رہے۔

نور الدین جہانگیر ۱۰۲۴ھ مطابق ۱۶۰۵ء میں تخت نشین ہوا۔ یہ تاجدار شعر کا فطری ذوق رکھتا تھا اور شعر بھی کہتا تھا۔ فارسی زبان میں اس نے اپنی سرگزشت لکھی۔ جو "تزکِ جہانگیری" کے نام سے موسوم ہے۔

شاہجہان کا عرصہ حکومت ۱۰۳۸ھ تا ۱۰۶۹ھ مطابق ۱۶۲۸ء سے ۱۶۵۸ء اور اورنگ زیب عالمگیر کا عرصہ حکومت ۱۰۶۹ھ تا ۱۱۱۹ھ مطابق ۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء رہا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے بعد مغلیہ حکومت کو زوال آگیا۔ اس کے جانشینوں میں کوئی بھی اس قابل نہ تھا کہ برصغیر کی وسیع حکومت سنبھال سکے۔ آخر ۱۱۵۲ھ مطابق ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ افشار نے حملہ کر کے پنجاب اور دہلی کو تہ و بالا کر ڈالا۔ اس تباہی کے بعد بھی مغل حکمران یکے بعد دیگرے مسند حکومت پر تو بیٹھتے رہے، لیکن مٹتے ہوئے اقتدار کو کوئی نہ سنبھال سکا۔

ایران کے صفوی حکمرانوں کا رجحان مذہب کی طرف تھا۔ ادبیات فارسی کی طرف ان کی توجہ نہ تھی اس لیے قصیدہ اور غزل کا کوئی پرسان حال نہ رہا۔ پاک و ہند میں البتہ فارسی کی ترویج و اشاعت ہوتی رہی۔ یہاں کے حکمرانوں کی زبان فارسی تھی۔ شعراء

فارسی میں قصیدے اور غزلیں کہتے اور انعام و اکرام پاتے تھے۔ فنِ تاریخ سے بھی مغل حکمرانوں کو بہت دلچسپی تھی، چنانچہ اس دور میں پاک و ہند کی بہترین تاریخیں لکھی گئیں۔ ذیل میں ان علماء اور شعراء کا ذکر آئے گا، جنھوں نے علم و ادب میں مستقل یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ان امراء کی داد و دہش کے چرچے بہت دُور دور تک پھیلے ہوئے تھے، اس لیے ایران کے اکثر شعراء اور علماء پاک و ہند کھنچے چلے آتے تھے۔

فیضیؔ (۹۵۴-۱۰۰۴ھ مطابق ۱۵۴۷ تا ۱۵۹۵ء)

امیر خسروؔ کے بعد پاک و ہند کا فارسی زبان کا دوسرا بڑا شاعر فیضیؔ ہے، جو اکبر اعظم کے دربار کا ملک الشعراء تھا وہ نہ صرف ایک عظیم شاعر تھا، بلکہ عربی اور سنسکرت کا بہت بڑا عالم بھی تھا۔ فیضی کو اگرچہ ایران سے کوئی نسبت نہیں۔ لیکن وہ سبک ہندی کے موجدوں میں سے ہے جس نے بعد کے ایرانی شعراء کو متاثر کیا، اس لیے اس کے ذکر سے یہ تاریخ خالی نہیں رہنی چاہیئے۔

فیضی عربی النسل ہے۔ اس کے آباؤ اجداد یمن سے ترکِ وطن کر کے ہندوستان آئے اور سندھ کے علاقے میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ دسویں صدی ہجری میں فیضیؔ کے دادا شیخ خضر اجمیر کے قریب قصبہ ناگور میں آکر آباد ہوئے۔ یہیں فیضی کے والد پیدا ہوئے۔ شیخ مبارک ناگور سے آگرہ آئے، اور یہاں مستقل سکونت اختیار کی یہیں شادی کی اور ابوالفضل اور فیضی یہیں پیدا ہوئے۔

آگرہ میں اُنھوں نے اپنا ایک مکتب کھولا اور علم کے تشنہ لب جوق در جوق آپ کے پاس آنے لگے۔ شیخ مبارک آزادانہ فکر و خیال سے عقائدِ دین پر غور کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ اُس سے ظاہر پرست علماء اُن کے خلاف ہو گئے۔ اس زمانے میں مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنبی اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے مغلوں کے دربار میں بڑا اثر رکھتے تھے اور بادشاہ وقت بھی اُن کی خاطرداری کرتا تھا۔ یہ علماء شیخ مبارک سے جلنے لگے۔ اور

انھوں نے شیخ مبارک اور اس کے آزاد خیال بیٹوں پر کفر کے فتوے لگائے، طرح طرح کی سازشیں کیں۔ عوام کو ابھارا آخر اکبر نے فرمان جاری کیا کہ سارا خاندان دربار میں حاضر کیا جائے۔ شیخ مبارک کو عتابِ شاہی کا علم ہوا، تو گھر چھوڑا اور اپنے مختصر سے قافلے کو لے کر ادھر اُدھر مارے مارے پھرتے رہے۔ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں اپنی بے سروسامانی کے مفصل حالات لکھے ہیں۔ مولانا ابوالکلام نے اپنے تذکرہ، اور علامہ شبلی نے شعر العجم میں ان کے حالات بالتفصیل بیان کیے ہیں۔ اس مختصر سے تذکرے میں مزید تفصیل کی گنجائش نہیں بہرحال بیکسی کے عالم میں انھیں امید کی یہ مدھم سی کرن نظر آتی تھی کہ شہنشاہ خود ذاتی طور پر آزاد خیالی کا مخالف نہیں ہے، جو کچھ ہوا ہے تنگ نظر ملاؤں کے اثر سے ہوا ہے۔ آخر شیخ مبارک اس عرصے میں مرزا کوکہ سے ملے۔ اس نے شیخ کی مصیبتوں کا ذکر بادشاہ کے حضور میں کیا۔ اکبر کے دل پر اثر ہوا اور علماء کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انھیں بُلا بھیجا۔

شیخ مبارک آگرہ آگئے، یہاں پھر وہی مدرسہ جاری کیا اور اکبر کے دربار میں آنے جانے لگے۔

فیضی اس عرصے میں تعلیم سے فارغ التحصیل ہوچکا تھا۔ عربی اور سنسکرت میں اس نے انتہائی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے علم کی شہرت دربار تک بھی پہنچی۔ ۹۷۴ھ مطابق ۱۵۶۶ء میں بادشاہی لشکر جب چتوڑ پر حملہ آور ہوا، تو کسی تقریب سے فیضی کا ذکر بھی آیا۔ چنانچہ بادشاہ نے حاضری کے لیے شاہی فرمان بھیجا۔ فیضی آستانۂ عالیہ پر حاضر ہوا، بادشاہ اس وقت ایک کٹہرے میں کھڑا تھا۔ فیضی آداب بجالایا اور یہ قطعہ کہا ؎

بادشاہا دردن پنجرہ ام   از سر لطف خود مرا جا دہ
زاں کہ من طوطی شکرخائم   جای طوطی درون پنجرہ بہ

اکبر فیضی کی بدیہہ گوئی پر بہت خوش ہوا۔ اور اپنے حضور میں بُلا لیا۔ فیضی کے

ساتھ ابوالفضل کو بھی شاہی دربار میں قرب حاصل ہوا۔

اکبر خود ایک آزاد خیال بادشاہ تھا، اُسے یہ دو آزاد خیال عالم ملے، تو اُسے علمائے ظاہر کا فسون توڑنے کے لیے گویا دو اوزار مل گئے۔ ابوالفضل نے باقاعدہ دربار کی خدمت اختیار کرلی، فیضی اپنے علم و فضل کی وجہ سے بہت جلد مصاحبت کے درجے پر پہنچ گیا۔ چند ہی روز میں یہ مرتبہ پایا کہ بادشاہ سفر و قیام میں اسے ساتھ ساتھ رکھتا تھا۔ فیضی کو ہمعصر شعرا میں خاص امتیاز حاصل تھا۔ چنانچہ ۹۹۶ھ بمطابق ۱۵۸۷ء میں جب اکبر اعظم نے تاجپوشی کی تینتیسویں سالگرہ منائی، تو فیضی کو ملک الشعراء کے خطاب سے نوازا۔ ایک غزل میں اس عزت افزائی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

آن روز کہ فیض عام کردند   مارا ملک الکلام کردند

از بہر صعود فکرت من   آرائش ہفت بام کردند

مارا بہ تمام در ربودند   تا کار سخن تمام کردند

فیضی کے متعلق بدایونی کی رائے

عبدالقادر بدایونی عہد اکبر کا ایک مشہور عالم اور مستند مورخ تھا۔ وہ فیضی اور ابوالفضل کی آزاد خیالی کی وجہ سے ان کا شدید ترین مخالف تھا، لیکن فیضی کے علم و فضل کو وہ بھی خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ منتخب التواریخ میں لکھتا ہے۔ "فیضی در فنون جزئیہ از شعر و معما و عروض و قافیہ و تاریخ و لغت و طب و انشاء عدیل در روزگار نداشت "۔

تصنیفات

فیضی نے کلام مجید کی ایک تفسیر لکھی ہے۔ اس ضخیم تفسیر میں یہ اہتمام کیا گیا ہے۔ کہ اس میں نقطے والا کوئی حرف نہ آئے اس کا نام سواطع الالہام ہے۔

اکبر کی تاج پوشی کی سالگرہ کے موقع پر فیضی نے نظامی کے جواب میں خمسہ لکھنا شروع

کیا، چنانچہ فیضی خود ایک خط میں لکھتا ہے۔

"خمسہ کی کتابوں کے نام حسبِ ذیل ہیں "مرکز ادوار" اس کا اکثر حصہ فتح پور میں لکھا گیا دوم "سلیمان و بلقیس" کہ اس سے سات سال پہلے اس کی بنیاد لاہور میں رکھی گئی۔ تیسری "نل دمنتی" ہے، جو مکمل ہو چکی ہے۔ چوتھی "ہفت کشور" ہے۔ یہ ہفت اقلیم کے حالات پر مشتمل ہے۔ آخری مثنوی "اکبر نامہ" ہے۔ اس کے بھی بعض حصے لکھے جا چکے ہیں"۔

ابوالفضل لکھتا ہے کہ پانچوں مثنویاں فیضی نے مکمل کی تھیں، لیکن اب "مرکز ادوار" اور "نل دمنتی" مکمل صورت میں دستیاب ہوتی ہیں۔ باقی مثنویوں کے صرف چیدہ چیدہ اشعار ہی تذکروں کی زینت ہیں۔

مخزن الادوار ۔ یہ مثنوی مخزن الاسرار کے جواب میں لکھی گئی ہے، اس کا آغاز ذیل کے شعر سے ہوتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔۔۔ گنج ازل راست طلسم قدیم

نل دمنتی ۔ راجہ نل اور دمنتی کی ایک عشقیہ داستان ہے، جو چار ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں ہمیں انوری کا پر شکوہ بیان اور حافظ شیرازی کی فصاحت نظر آتی ہے۔ یہ مثنوی نظامی کی لیلیٰ مجنوں کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ مثنوی کا آغاز ذیل کے شعر سے ہوتا ہے۔

ای در تگ و پوی تو در آغاز ۔۔۔ عنقای نظر بلند پرواز

بدایونی اس مثنوی پر فیضی کو خراج تحسین ادا کرتا ہوا لکھتا ہے۔

"حقیقت میں یہ مثنوی ایسی ہے کہ امیر خسرو کے بعد تین سو سال کے طویل عرصے میں ایسی کوئی مثنوی نہیں لکھی جا سکی۔"

خمسہ کے علاوہ طباشیر الصبح، لیلاوتی، لطیفہ غیبی، موارد الکلم بھی فیضی کی تصانیف ہیں۔

طباشیر الصبح - فیضی کا دیوان ہے، جو غزلیات، قطعات اور رباعیات پر مشتمل ہے۔

لیلاوتی - یہ ایک ریاضی کی کتاب ہے، جس کا ترجمہ فیضی نے فارسی میں کیا۔

لطیفہ غیبی - یہ فیضی کے مکاتیب کا مجموعہ ہے، جو نہایت سادہ اور رواں فارسی میں لکھے گئے ہیں۔

موارد الکلم - فیضی نے جب کلام مجید کی بے نقط تفسیر لکھنے کا خیال کیا، تو مشق کے طور پر نقطوں کے بغیر موارد الکلم لکھنی شروع کی تا کہ ہاتھ صاف ہو جائے۔ یہ بھی عربی میں لکھی گئی ہے۔

مہابھارت - اکبر نے ۹۰۹ھ مطابق ۱۵۰۳ء میں ہندوؤں کی مشہور رزمیہ نظم مہابھارت کو فارسی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ اس کا ترجمہ نقیب خان، عبدالقادر بدایونی، ملا شیری اور فیضی نے مل کر کیا۔ کتاب کے دو حصے فیضی کے حصے میں آئے۔

افکار و خصوصیات کلام

فیضی فلسفی تو نہیں، لیکن اس کے ذہن کی افتاد فلسفیانہ ضرور ہے۔ اکثر فلسفیانہ مضمون باندھتا ہے۔ اپنے اس انداز بیان کا اسے احساس بھی ہے، چنانچہ وہ خود کہتا ہے۔

امروز نہ شاعرم حکیمم دانندۂ حادث قدیمم

یہ شاعر اور حکیم اسی پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ محسوس کرتا ہے کہ اگرچہ وہ خاک ہند سے پیدا ہوا ہے، لیکن اس کے ہر بن مو میں ہزاروں یونان سمائے ہوئے ہیں۔

این کالبدم ز خاک ہند است ولیک در ہر بن مو ہزار یونان دارم

فیضی کی اکثر غزلوں میں عشق و محبت کی کیفیات کیساتھ ساتھ فلسفۂ عمل بھی پایا جاتا ہے۔ فیضی کو اپنے سفر حیات میں طرح طرح کے مصائب سے دوچار ہونا پڑا

لیکن وہ مایوس نہیں ہوتا بلکہ خندہ پیشانی سے اُن سے دوچار ہوتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اس کو اپنے آپ پر پورا بھروسا ہے، وہ اپنے قافلے کا خود رہنما ہے۔ اپنی منزل سے باخبر ہے۔ رات اگرچہ تاریک ہے۔ لیکن اسے یہ یقین ہے کہ سحر بھی ہوگی ؎

باز یاران طریقت سفری در پیش است
رہ نوردان بلا را خطری در پیش است
کس نمی گویدم از منزل اول خبری
صد بیابان بگذشت و دگری در پیش است
ہمرہان این ہمہ نومید نباشید از من
کہ دعای سحری را اثری در پیش است
ما نہ آنیم کہ نادیدہ قدم بگذاریم
شکر کن قافلہ را راہبری در پیش است
ای صبا بر سر آفاق گل تر دہ بریز
کہ شب تیرہ ما را سحری در پیش است
فیضی از قافلہ کعبہ روان بیرون نیست
این قدر ہست کہ از ما قدری در پیش است

فیضیؔ وہ رہ نورد شوق ہے، جو منزل پر پہنچنے کے لیے پوری پوری کوشش کرنا چاہتا ہے۔ اس طلب شوق میں اس کی جان بھی جائے، تو اُسے پرواہ نہیں۔ وہ اپنے آپ کو خطاب کرکے کہتا ہے کہ اپنی ناقۂ شوق کو بڑھائے چل۔ منزل کی خواہش نہ کر، کیونکہ منزل کی خواہش کرنے والے حریم دل تک نہیں پہنچ سکے۔

رہ نوردان طلب زندہ بہ محمل نرسند
تا نمیرند درین بحر بہ ساحل نرسند

ناقۂ شوق درین بادیہ جنبان فیضیؔ
رو کہ منزل طلبان در حرم دل نرسند

فیضیؔ وہ اہلِ نظر ہے، جو دل کی صلاحیتوں سے پورا پورا واقف ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ دل ہی انسان کو ملائے اعلیٰ تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔

مپرس اہلِ نظر چون بہ عرش پیوستند
کہ پا بہ کنگرۂ دل نہادہ برجستند

۲۔ شکوہ لفظی اور جوشِ بیان۔ فیضیؔ کی مثنویوں میں انوری کے قصائد کا سا شکوہ لفظی اور جوشِ بیان پایا جاتا ہے۔ "نل دمنتی" جب اکبر کے حضور میں پیش کی، تو شہنشاہ سے خطاب کر کے ذیل کے اشعار کہے ہیں۔

شاہنشاہا! خسرو بژدہا | دریا گہرا، فلک شکوہا
بزمی است جہان بہ عیش پیوست | دور تو شراب و آسمان مست
امروز باین نوای چون شہد | من بار بدم و تو خسرو عہد
زین خامہ کہ کردہ ام فلک سا | پیش تو ستادہ ام بیک پا
این چار ہزار گوہر ناب | کانگیختہ ام بہ آتشین آب
بپذیر کہ آب گوہر تست | از بہر نثار افسر تست
پیمانہ من اگر نشد پر | دریا کنمت نثار نہ دُر

جوشِ بیان جو قصائد ہی کا خاصہ ہو سکتا ہے، وہ فیضی کی غزلیات میں بھی نظر آتا ہے۔ اس قادر الکلام شاعر کا قلم اس کے علم و فضل کے دباؤ سے مجبور ہوتا ہے، تو غزل کی سادگی اور روانی کو چھوڑ کر قصائد کا پُرشکوہ انداز اختیار کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فیضیؔ کی غزلیات زیادہ مقبول نہیں ہو سکیں ؎

ماطائر قدسیم نوا را نشناسیم | مرغ ملکوتیم ہوا را نشناسیم

در کشف حقائق سبق آموز ضمیریم | ترتیب دلیل حکما را نشناسیم
با اہل جدل نکتہ توحید نگوییم | در وحدت حق چون و چرا را نشناسیم
اصحاب یقینیم گمان را نپسندیم | ارباب صواہیم خدا را نشناسیم
از قافلہ ناتوان یافت نشانی | رقص جرس و بانگ درا را نشناسیم
بر دانش ما انجم و افلاک نخندند | گر صاحب لولاک لما را نشناسیم

۳ - فیضی کو نئی نئی تشبیہیں اور استعارات لانے میں خاص ملکہ حاصل ہے ۔ مثلاً

گر عشق چنین بسوزدم پاک | مہتاب برون برآرم از خاک
بگداختہ آبگینۂ دل | آئینہ دہم بدست محفل
بگداختہ ام دل و زبان را | کین نقش نمودہ ام جہان را
امروز بدور و مان ایام | زد نوبت من سپہر بر بام
آنم کہ بہ سحر کاری ژرف | از شعلہ نتراش کردہ ام حرف
بانگ قلمم درین شب تار | بس معنی خفتہ کردہ بیدار

۴ - شاعرانہ ادعا ۔ فیضی اکثر اشعار میں اپنے علم و فضل کی برتری کا اظہار کرتا ہے ۔ اسے محض خود ستائی نہیں سمجھنا چاہیے ، بلکہ یہ حقیقت کا اظہار ہے ۔ جو شاعر علم و فضل کی دولت سے مالا مال ہو ، اپنے فکر و خیال کی وسعتوں سے آگاہ ہو ، بادشاہ وقت کا قرب اسے حاصل ہو ، ایوان شاہی کا ملک الشعراء ہو ، وہ اپنی فوقیت کا اظہار کرے ، تو اسے زیب دیتا ہے چنانچہ کہتا ہے ۔

دگر از شعر من اثر خواہی | از حدیثم ہزار انجمن است
دگر از کلک من قلم رانی | نقطہ ام رونق گہر شکن است
دربا سلاف من نظر فگنی | گوہرم چون عقیق از یمن است

فیضی بہت بلند نگاہ شاعر ہے ۔ محسوس کرتا ہے کہ اس کے فکر و خیال کا ہاتھ

عرش کے پائے تک پہنچا ہوا ہے - اگر کعبے کے دروازے پر کسی غیر کی نظم لٹکائی جائے، تو فیضی چاہتا ہے کہ اور آگے بڑھے، اور اپنی نظم طاق عرش سے لٹکا دے ؎

فیضی من آن بلند نگاہم کہ روزگار | پیوستہ یافت ساعد فکرم بساق عرش
آویختند اگر ز در کعبہ نظم غیر | آویختم حدیث خود از پیش طاق عرش

فیضی سمجھتا ہے کہ اس کا کلام فیضانِ الٰہی ہے - اس کے نوک قلم سے جو کچھ نکلتا ہے اگرچہ اس کی عبارت کا تعلق تو فیضی سے ہے، لیکن معنی اور خیال عطیہ خداوندی ہے۔

ہر نکتہ کہ می ریخت ز نوک قلمم | معنی ز خدا بود عبادت از من

عرفی شیرازی (پیدائش سنہ ۹۶۳ ھج مطابق سنہ ۱۵۵۵ء) (وفات سنہ ۹۹۹ ھج مطابق سنہ ۱۵۹۰ء)

جمال الدین محمد نام، عرفی تخلص اور والد کا نام بدر الدین ملوی ہے، جو شیراز میں ایک ممتاز سرکاری عہدے پر فائز تھے - عرفی یہیں ۹۶۳ ہجری میں پیدا ہوا - عالم شباب کو پہنچا۔ تو اس وقت سلطنت صفویہ اپنے پورے عروج پر تھی - اس زمانے میں علم و ہنر کی تو بہت حوصلہ افزائی ہوتی تھی، لیکن جیسے کہ پہلے ذکر آچکا ہے، شاعری کی طرف بادشاہوں کا اعتنا بہت کم تھا - ان کا میلان مذہبیات کی طرف تھا - اس لیے وہ شعرا کو تلقین کرتے تھے کہ اہل بیت کے مرثیے لکھیں - اس لیے قصیدہ گوئی کی طرف رجحان کم ہوتا گیا، ساتھ ہی غزل گوئی بھی بے اعتنائی کا شکار ہوگئی - غزل محض ذاتی شوق اور تسکین کا ذریعہ بن کر رہ گئی -

عُرفی نے جب شعر کہنے شروع کیے، تو اس وقت مشہور شعرا محتشم کاشی، وحشی یزدی، عارف لاہجی اور غیرتی تھے - وہ ان کہنہ مشق شاعروں کی موجودگی میں شعر و فکر میں اپنے لیے کوئی مقام نہ پیدا کر سکا - ادھر ہندوستان میں شعر و شاعری کے بڑے چرچے تھے - بادشاہ اور امرا کی فیاضیوں کی گونج دُور دُور سنائی دیتی تھی - شاعروں کے منہ موتیوں سے بھرے

جاتے تھے۔ عرفی نے یہ سُنا، تو قسمت آزمائی کے لیے ہندوستان کا رُخ کیا۔ ۹۹۴ھ مطابق ۱۵۸۵ء میں وہ سمندر کے راستے احمد نگر آیا، وہاں سے فتح پور سیکری پہنچا۔ یہاں اس کی ملاقات فیضی سے ہوئی جو دربار مغلیہ کا ملک الشعراء تھا۔ عرفی کچھ عرصہ فیضی کا مہمان رہا۔ فیضی نے اس کی خاطر داری میں کمی تو نہ کی، لیکن عرفی قطرۃً نخوت پسند تھا، اس لیے فیضی سے زیادہ دیر نباہ نہ ہو سکا۔

اکبر کے نورتنوں میں حکیم ابوالفتح گیلانی بھی تھا، جو خود ایک عالم اور نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ علما کا محسن اور مربی بھی تھا۔ عرفی فیضی کو خیرباد کہہ کر سیدھا حکیم ابوالفتح کے دربار میں آیا اور ذیل کا قصیدہ کہہ کر دربار میں رسائی پائی

حکیم عہد ابوالفتح آفتاب ہنر — کہ از دمش رود اعجاز عیسوی برباد

خدایگانا دارم حکایتی برلب — کہ چون مدیح تو نتوانم بہ لب استاد

خیال بندگیت دوش نقش می بستم — زروی کسب شرف نی زروی استعداد

بخدمت آمدم اینک بگو چہ مصلحت است — بر آستان تو باید نشست یا استاد

حکیم ابوالفتح ایسے نقاد اور مربی کے دربار میں رہ کر، جہاں شعر و سخن پر داد ملتی تھی، وہاں نکتہ چینی بھی ہوتی تھی، اس لیے یہاں عرفی کی شاعرانہ صلاحیتوں کی بہت نشوونما ہوئی۔ عرفی نے بھی حکیم ابوالفتح کی کرمفرمائیوں کا پورا پورا حق ادا کیا۔ اپنے محسن کی شان میں اس زور کے قصیدے کہے کہ نہ اکبر کی مدح میں کہے، نہ خانخاناں کی تعریف میں۔ اور جب تک ابوالفتح زندہ رہا کسی اور دربار کا رُخ نہ کیا۔

ابوالفتح فوت ہوا، تو عرفی کو سخت رنج ہوا، اب اسے صرف عبدالرحیم خانخاناں ہی ایک علم دوست، شعر شناس اور سخنور نظر آتا تھا، اس لیے اس کے دربار میں آگیا، اور ذیل کا قصیدہ کہا، جس میں حکیم ابوالفتح کی وفات پر اظہار غم اور خانخاناں کے تقرب کی خواہش ظاہر کی ہے:-

زآسمان و زمین مژدہ ناگہان آمد ‌ ‌ ‌ ‌ که آفتاب زمین، تاج آسمان آمد
بگو خلاصۂ تقدیر خانخانان است ‌ ‌ ‌ ‌ که ہم عنان شہنشاہ انس و جان آمد
خدایگانا حال دلم تو می دانی ‌ ‌ ‌ ‌ چگونه گفت که دلم چون ز غم گران آمد
چه احتیاج که گویم که مرد عرفی را ‌ ‌ ‌ ‌ چه بر سر از اثر مرگ ناگہان آمد
درین مصیبت عظمیٰ که دہر سنگین دل ‌ ‌ ‌ ‌ ز گریه ہر سر موچشم خونفشان آمد

برفت و لطف تو بر من گذاشت دین بدل ست
بنزد عقل که نادان این و آن آمد

خانخاناں کے دربار میں نظیری نیشاپوری، شکیبی اصفہانی، ظہوری اور انیسی ایسے شاعر موجود تھے۔ اُن سے حریفانہ نوک جھونک رہتی تھی۔ عرفی جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، بہت نخوت پسند اور خود ستا تھا، ساتھ ہی وہ احساسِ برتری کا شکار بھی تھا، اس لیے سب اُسے ناپسند کرتے تھے۔ اور جب موقع ملتا، اس پر طنز بھی کرتے۔ عبدالقادر بدایونی اس کے علم و فضل پر تو خراج تحسین پیش کرتا ہے، لیکن یہ بھی لکھتا ہے کہ "عرفی غرور اور نخوت کی وجہ سے لوگوں کی نظر سے گر گیا تھا۔ اس لیے اس کی آخری عمر بدمزگی میں کٹی۔" ابوالفضل اکبر نامے میں لکھتا ہے۔

"دری، از سخن سرائی بر و کشود و در خود نگریست و بر باستانیاں زبان طعن کشود غنچہ استعداد او نشگفتہ پژمرد۔"

عرفی ضیق النفس کے مرض میں مبتلا تھا۔ ایک دفعہ تکلیف حد سے بڑھ گئی، تو لوگ عیادت کو آئے۔ دل صاف نہ تھے، اس لیے اس موقع پر بھی طنز آمیز باتیں کرتے رہے۔ عرفی یہ سب کچھ سنتا اور پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا تھا۔ اس کیفیت کو ایک قطعے کی صورت میں لکھا ہے۔ اور ان سب کے جواب میں جل کر کہتا ہے۔

خدای عزّ و جل صحتم دہد بینی ‌ ‌ ‌ ‌ که این منافقگان را چه آورم بر سر

عرفی کو اُمید تھی کہ صحت ہو گی، تو اِن منافقوں سے نپٹوں گا، لیکن موت نے مہلت نہ دی، اور اسی مرض سے ۹۹۹ھ مطابق ۱۵۹۰ء میں داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر چھتیس سال تھی۔ عرفی لاہور میں مدفون ہوا۔ عبدالباقی نہاوندی نے، جو عرفی کا ہم عصر تھا ماثر رحیمی میں لکھا ہے کہ میر صابر اصفہانی نے جو اعتمادالدولہ غیاث بیگ (خسر جہانگیر بادشاہ) کا درباری تھا، ایک قلندر کو رقم کثیر دے کر اس کے باقیات کو نجف میں پہنچا دیا۔ چنانچہ عرفی کی پیشین گوئی پوری ہوئی، جیسا کہ اس نے کہا تھا۔

اگر بہند ہلاکم کنی وگر بہ تتار | بکاوش مژہ از گور تا نجف بردم

تصنیفات

دیوان - عرفی نے اپنا دیوان خود مرتب کیا تھا۔ یہ دیوان غزلیات قطعات و رباعیات پر مشتمل ہے۔

نفسیہ - مصنف ماثر رحیمی لکھتا ہے کہ عرفی نے "نفسیہ" کے نام سے ایک رسالہ نثر میں لکھا تھا، جو صوفیوں اور درویشوں کے لیے رہنمائی کا کام دیتا ہے۔

عرفی کے متعلق معاصرین کی رائے

فیضی، جو دربار اکبر کا ملک الشعراء تھا، بالفاظ ذیل عرفی کو خراج تحسین ادا کرتا ہے۔

"اس فقیر نے مضمون کی بلندی، بیان کی قدرت، الفاظ کی چاشنی، فکر کی تیزی اور خیال کی بلندی، جو عرفی کے کلام میں دیکھی ہے۔ اور کسی کے کلام میں نہیں دیکھی۔"

ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ "عرفی کا کلام کتب فروش گلی گلی اور کوچہ بہ کوچہ بیچتے پھرتے ہیں، اور عراق اور ہند کے لوگ اسے تبرکاً لیتے ہیں۔"

کلام کی خصوصیات

خیال بندی - عرفی کے کلام کی نمایاں خصوصیت خیال بندی ہے۔ کسی سادہ خیال کو تشبیہہ کے زور سے وسعت دے کر حدِ ادراک تک بڑھا لے جانا خیال بندی ہے۔ یہ خیال بندی "سبک ہندی"

کا خاصہ ہے۔ یہ خصوصیت عرفی کے کلام میں اپنی انتہائی صورت میں نظر آتی ہے۔ عرفی کا ایک شعر ہے۔

مشت سوزن بدلم زآن مژہ تا ریختہ اند
گریہ از پارۂ دل دوختہ پیراہن چشم

یعنی مژگاں دلدار سے مٹھی بھر سوئیاں اس لیے میرے دل میں ڈال دی گئی ہیں کہ خیاط گریہ سے کہا جائے کہ دل کے ٹکڑوں کو سی کر آنکھوں کے لیے پیراہن بنا دے۔

عرفی کے ذیل کے اشعار سے خیال بندی کی مثال اور بھی واضح ہو جاتی ہے ؎

آن کہ چون در کنف چتر ہمایون آثار
ہم عنان ظفر از راہ غزا گردد باز

زہرہ گیسو بکشاید کہ شود گرد فشان
از رکابش کہ پذیرفتہ غبار از تگ و تاز

فتح گوید چہ کنی چشم من است این نہ رکاب
سرمہ چشم جہان بین مرا پاک مساز

یعنی جب رسول اکرمؐ مبارک چتر کے سائے میں میدانِ کارزار سے فتح یاب ہو کر لوٹتے ہیں، تو آنحضرت کی رکابیں گرد آلود ہو جاتی ہیں۔ خیال بندی دیکھیے کہ اس سے یہ مضمون پیدا کیا ہے کہ زہرہ نے اپنی زلف کھول دی ہے کہ رکابوں کی گرد جھاڑے۔ فتح پکار اٹھتی ہے کہ تو کیا کرتی ہے؟ یہ رکابیں نہیں ہیں جنھیں تو جھاڑنا چاہتی ہے۔ یہ تو میری آنکھیں ہیں اور جسے تو گرد سمجھے ہوئے ہے، یہ وہ سرمہ ہے، جس نے میری آنکھوں کو جہاں بیں بنا دیا ہے۔ اس سرمے سے تو مجھے محروم کیوں کرتی ہے؟

زورِ کلام۔ صنعتِ شعر کے اعتبار سے زورِ کلام کی تعریف معین الفاظ میں نہیں کی جا سکتی۔ البتہ جب شعر میں الفاظ کی شوکت، بندش کی چستی، مضمون کا زور، تشبیہات کی

اثر آفرینی، خیال کی بلندی پائی جائے۔ تو ہم سمجھتے ہیں کہ شاعر کے کلام میں زور ہے۔ عرفی کے کلام میں یہ ساری خوبیاں بدرجہ احسن پائی جاتی ہیں۔ بغرض اختصار ان میں سے بعض کا ذکر کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ عرفی شعر کی ہمہ گیری کی تعریف کرتا ہوا سکندرِ اعظم ایسے فاتح عالم کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔

اقبال سکندر بجہانگیری نظمم — برداشت بیکدست قلم را و علم را

ایک اور شعر میں عرفی اپنے نسب پر فخر کرتے ہوئے اپنے گوہر ذات کی تعریف کرتا ہے۔

این برق نجابت کہ جہد از گوہر من — مدرج است دلی گوہر ذات اب و عم را

ذیل کے شعر میں ممدوح کا پنجہ تیغ اجل سے یوں خطاب کرتا ہے۔

آہنیں پنجۂ تیغش بہ اجل گفت کہ من — موج بر موج شکستم چو بہ عمان رفتم

ان اشعار کے الفاظ کا شکوہ، بندش کی چستی نقطوں کے دروبست نے شعروں میں زورِ کلام کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ مضمون اور بیان کا زور ذیل کے شعر میں دیکھیے۔

من قیامت زار عشقم دیدہ کو تا بنگرد — صد بہشت و دوزخ از ہر گوشۂ صحرائے من

"میں عشق و محبت کی قیامت زار ہوں۔ میرے ہر ہر گوشۂ صحرا میں سیکڑوں بہشت و دوزخ ہیں۔ دیکھنے والی آنکھ کی ضرورت ہے۔"

ذیل کا شعر جوشِ بیان کی عمدہ مثال ہے ؎

من آں دریائے آشوبم کہ از تاثیر خاصیت — کہ تسکین است موج انگیز و آرام است طوفانش

عرفی کے رفعتِ خیال کا یہ عالم ہے کہ جب اس کا شہباز تخیل پرواز کرتا ہے تو آسمان کی اونچی حدوں تک جا پہنچتا ہے۔ بالِ عافیت اسے ایک پل کو بھی گوارا نہیں ہوتا۔

ببالِ عافیت تا کی بپرواز آوری دل را — بہل کن تا ز اوج زمہریر آیم برپائش

رفعتِ خیال عرفی کا وہ جوہر ہے جس کی تعریف علامہ اقبال نے بھی کی ہے۔

محل ایسا کیا تعمیر عرفی کے تخیل نے — تصدق جس پہ حیرت خانۂ سینا و فارابی

الفاظ کے نئے مفہوم ۔ عرفی بعض اوقات عام الفاظ کو خاص اور بلند معنی ادا کرنے کا ذریعہ بناتا ہے ۔

زلال چشمہ امید نقد اکبر شاہ طراز دولت جاوید شاہزادہ سلیم

اکبر کو شہزادہ سلیم سے جو محبت ہے ، اور اُس سے جو امیدیں وابستہ ہیں اُن کے پیشِ نظر سلیم کو "نقد اکبر شاہ" کہا ہے ۔ نقد ایک عام لفظ ہے ، جو سودا سلف یا بنیے کے کاروبار سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس لفظ کو بنیئے کی دُکان سے اٹھا کر کہاں کا کہاں پہنچا دیا ہے ۔ کسے خیال آتا ہوگا کہ نقد اکبر شاہ کہہ کر شہنشاہ اکبر کا سرمایہ حیات بھی مراد لیا جا سکتا ہے ۔

نئی تراکیب ۔ عرفی نے متعدد نئی ترکیبیں وضع کر کے زبان فارسی کے سرمایے میں اضافہ کیا ہے ۔

مرا چو دوش بدوش ادب بدید استاد بہ لطف خاص بدل کرد والتفات عمیم

ادب و احترام سے کھڑے ہونے کے لیے "دوش بدوش ادب استادن" کی ترکیب وضع کی ہے ، جو لطف سے خالی نہیں ۔

مریمی کن تو کہ فرزند مسیح است و مسیح حاتمی کن تو کہ اقبال گدای و گدا

گل اندیشۂ من ، سحر غلط ، معجزہ رنگ بلبل نطق من الہام غلط وحی سرا

مریمی ، حاتمی ، گل اندیشہ ، رنگ ، وحی سرا ، بالکل نئی ترکیبیں ہیں ۔

اظہار فضیلت ۔ عرفی سے پہلے قصیدہ نگاروں کی مجال نہ تھی کہ اپنے ممدوح کی مدحت سرائی کے علاوہ کوئی اور بات کہہ سکتے ۔ لیکن عرفی کو جہاں کہیں شاعرانہ عظمت کے اظہار کا موقع ملتا ہے ، دل کھول کر کرتا ہے ۔ شہزادہ سلیم کی مدح کرتے ہوئے اپنی شخصیت کا احساس ہوتا ہے ، تو کہہ اٹھتا ہے ؎

خدا یگانہ گویم بمدح خویش دو بیت کزین زیادہ پرہیز کرد طبع سلیم

زِ زادۂ دل و طبعم اگر شود آگاہ   باصل خویش بنازد زِ شرم دُرِ یتیم

فلسفیانہ رموز۔ عرفی قصیدے کو محض ممدوح کی تعریف تک محدود نہیں رکھتا، بلکہ زندگی کے فلسفیانہ اسرار و رموز بھی بیان کرتا ہے۔

ا۔ خودی۔ خانخاناں کی مدح میں اپنے ایک مشہور قصیدے میں کہتا ہے۔

سرِ روحانیان داری ولی خود را ندیدستی   بخواب خود درآ تا قبلہ روحانیاں بینی

"تجھے حقیقت شناس لوگوں کی صحبت کی خواہش ہے، لیکن تو نے خود اپنی طرف کبھی توجہ نہیں کی اگر تو دوسروں سے بے نیاز ہو کر اپنے آپ کو دیکھ پائے تو تیری ذات خود حقیقت شناس لوگوں کے لیے قبلہ گاہ بن جائے۔

ب۔ انسان خود اپنی تقدیر کا معمار ہے۔

زِ ترتیب نظام آفرینش چون نہ آگاہ   حوادث راز تاثیر نجوم آسمان بینی

"تو محض کائنات کے نظام سے آگاہ نہ ہونے کے باعث زمانے کے حادثات کو سیاروں کی گردش کا نتیجہ خیال کرتا ہے۔ اگر تو نظامِ کائنات سے واقف ہوتا، تو تجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ یہ سارے واقعات انسانوں کے خود پیدا کیے ہوئے ہیں۔"

ج۔ علوِ ہمت۔ عرفی اپنے اشعار میں خود آگاہی کا احساس دلا کر جدوجہد کا درس دیتا ہے۔

گہر جویند غواصان فطرت در تہ دریا   تو در فکر ہمین دائم کہ از دریا کران بینی

رموز فطرت کو جاننے والے سمندر کی پہنائیوں میں کود کر موتی ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ لیکن جو لوگ حیات کی جدوجہد سے گریزاں ہیں، انہیں زندگی کی طوفانی کشمکش لرزہ براندام کر دیتی ہے۔ وہ دنیا سے کنارا کرنے میں ہی سلامتی دیکھتے ہیں۔

فلسفیانہ نکات سے عرفی کا کلام بھرپور ہے۔ اختصار اس بات کا مقتضی ہے کہ ان جواہر پاروں کی جستجو کو قارئین پر چھوڑ دیا جائے۔

نظیری نیشاپوری (سالِ وفات ۱۰۲۱ھ مطابق ۱۶۱۲ء)

نام، محمد حسین

نظیری تخلص اور وطن نیشاپور تھا۔ نظیری ان ایرانی شعراء میں سے ہے جنھوں نے برصغیر پاک و ہند آکر شعر و سخن کی بدولت ناموری حاصل کی۔

نظیری چند سال نیشاپور رہ کر کاشان آگیا۔ یہاں ایران کے اکثر شاعروں کی محفلیں گرم ہوتی تھیں، ان میں نظیری بھی حصّہ لینے لگا۔

یہ وہ زمانہ ہے، جب عبدالرحیم خان خانخاناں کی علم دوستی اور فیاضی کے چرچے ایران تک پہنچے تھے۔ ادھر نظیری کے وطن میں قصیدے اور شاعری کا کوئی پُرسان حال نہ تھا۔ اس لیے نظیری نے بھی وطن کو خیر باد کہہ کر ہندوستان کا رُخ کیا۔ اور ۹۹۱ھ مطابق ۱۵۸۳ء میں خانخاناں سے آملا۔ ایک قصیدہ جو خانخاناں کی مدح میں کہا تھا، سنایا۔ خانخاناں قصیدہ سن کر بہت خوش ہوا، اور شعرائے دربار کی صف میں جگہ دی۔ نظیری نے خانخاناں کی وساطت سے شہنشاہ اکبر کے حضور میں بھی قصیدے پڑھے، لیکن وہاں فیضی کا رنگ جما ہوا تھا، اس لیے نظیری پر زیادہ توجہ نہ ہوئی۔ چنانچہ دربار میں جانا بند کر دیا، اور خانخاناں کی مداحی کرتا رہا۔

نظیری محض شاعری کو وسیلہ معاش نہیں بنانا چاہتا تھا، اس لیے تجارتی کاروبار کے سلسلے میں مستقل سکونت گجرات (احمد آباد) میں اختیار کی۔ اور خانخاناں کے دربار سے تعلق قائم رکھا۔ اسی دربار کے وسیلے سے وہ حج کی سعادت سے بھی شرف یاب ہوا۔

شہنشاہ اکبر کی وفات پر جب شہزادہ سلیم تخت نشین ہوا، تو نظیری کو ایک بار پھر دربارِ مغلیہ میں عزت پانے کا موقع ملا۔ اس موقع پر قصیدہ لکھ کر بادشاہ کے حضور میں پیش کیا۔ جہانگیر نے ایک ہزار روپیہ، ایک خلعت اور ایک گھوڑا عطا کیا، جس کا ذکر اس نے تزکِ جہانگیری میں بالفاظ ذیل کیا۔

"نظیری نیشاپوری کہ در فن شعر و شاعری از مردم قرار دادہ بود۔ در گجرات بعنوان تجارت بسر می برد۔ قبل ازین طلبیدہ بودم درین ولا آمدہ ملازمت کرد، قصیدہ انوری را کہ

" باز این چہ جوانی و جمال است جہان را "

تتبع نمودہ قصیدہ بجہت من گفتہ بود، گذرانید، ہزار روپیہ و اسپ و خلعت بصلۂ این قصیدہ بدو مرحمت نمودم۔"

قصیدہ کے چند شعر ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔ اس میں قصیدہ گوئی کی فرمائش اور دربار میں رسائی پانے کی کیفیت بیان کی ہے۔

ناگاہ در آمد ز درم بانگ کہ گویند — فرمان طلب آمدہ از شاہ فلان را

بی کفش و عمامہ بدر از خانہ دویدم — نی کردہ قبا در بر و نی بستہ میان را

تا حاکم دیوان و بلد برد رسولم — دیدم ہمہ جا مژدہ دہان مژدہ رسان را

اصحاب چنان مصحف از اصحاب ستانند — بگرفتم از احباب بہ تعظیم نشان را

بوسیدم و بر فرق بہ تسلیم نہادم — بکشادم و بر ناصیہ سودم رخ آن را

فی الحال دویدم زپی مرکب و سامان — کردم ز ہمہ روی وداع اہل مکان را

امروز سہ ماہ است کہ پویان بہ سراغم — چون گنج روان من بطلب گنج روان را

شہنشاہ کہیں شکار کو گیا ہوا تھا۔ نظیری کو تین ماہ تک باریابی نہ ہو سکی۔ چنانچہ آخری شعر میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ایک گنج رواں ہوں اور ایک دوسرے گنج رواں کی جستجو میں پھر رہا ہوں۔

جہانگیر نے نظیری کی بہت قدردانی کی "سرو آزاد" اور "ید بیضا" کے مؤلف لکھتے ہیں کہ جہانگیر نے ایک مرتبہ اس کی غزل سن کر تین ہزار بیگھے زمین نظیری کو عطا کی تھی۔

نظیری کی قدر و منزلت جو عبدالرحیم خانخاناں نے کی، وہ ان انعامات سے ظاہر ہے

جو وقتاً فوقتاً نظیری کو ملے۔ ماثرالامراء کے حوالے سے شبلی نعمانی لکھتے ہیں" کہ ایک دفعہ باتوں ہی باتوں میں نظیریؔ نے خانخاناں سے کہا کہ لاکھ روپے کا ڈھیر لگایا جائے، تو کس قدر ہو گا؟ خانخاناں نے لاکھ روپے منگوا کر سامنے رکھوا دیئے۔ نظیریؔ نے کہا۔ خوب ہوا، آپ کی بدولت میں نے لاکھ روپے تو دیکھ لیے۔ خانخاناں نے یہ روپے نظیری کے گھر بھجوا دیے۔"

نظیریؔ ہم وطنوں کی نظر میں

ایرانی نقاد علمی تنقید کے معاملے میں کچھ بخل سے کام لیتے ہیں۔ پاک و ہند کے فارسی شعراء کو تو وہ شاعر نہیں سمجھتے۔ کوئی شاعر، جو وطن کو چھوڑ جائے، اس کا نام بھی شعراء کی فہرست سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ البتہ نظیریؔ وہ خوش نصیب ایرانی شاعر ہے، جس کا ذکر لطف اللہ آذر کے آتش کدے اور رضا قلی ہدایت کی تصنیف "مجمع الفصحا" میں آیا ہے۔ اور اس کی سخنوری کی داد دی ہے۔ لیکن جدید نقاد رضا زادہ شفقؔ نے نظیری کو "تاریخ ادبیات ایران" میں صاف نظر انداز کر دیا ہے۔

نظیریؔ نے اکبر، جہانگیر، شاہزادہ مراد اور خان اعظم کے پرجوش قصیدے کہے ہیں۔ شاہزادہ مراد سے اُسے دلی محبت تھی۔ اس کی بے وقت موت پر مرثیہ لکھا ہے، معلوم ہوتا ہے، سچ مچ چوٹ کھائی ہے۔

آفاق پر دریغ و جہان پر ندامت است
این روز مرگ نیست کہ روز قیامت است
خلقی پر اضطراب چہ جائے تمکن است
دہری پر انقلاب چہ جای اقامت است
این ماتم کسی ست کہ از گریہ تا بہ حشر
پر جیب صبح و دامن شب ہا علامت است

نظیریؔ کی عمر اگرچہ مدحت سرائی میں گزری، لیکن اس کی شہرت کا اصل سرمایہ غزلیات ہیں۔ آخری عمر میں نظیریؔ ترک دنیا کر کے گوشہ نشین ہو گیا تھا۔ گجرات میں ۱۰۲۱ھ مطابق ۱۶۱۲ء میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوا۔

نظیریؔ کے کلام کی خصوصیات

سبک ہندی کو، جو صفوی عہد بالخصوص عہدِ مغلیہ کے شعراء کا خاصہ ہے۔ نظیریؔ نے کمال کی حد تک پہنچا دیا ہے۔

(ا) **ایمائیت** ۔ غزل کا تعلق عموماً داخلی شاعری سے ہوتا ہے۔ داخلی شاعری میں شاعر خود اپنے نفس کا تجزیہ کرتا ہے، یعنی قلبی احساسات کی عکاسی کرتا ہے لیکن انسانی قلب ایک وسیع طلسم خانہ ہے، اس کی وسعتوں میں کئی عالم پوشیدہ ہیں۔ انسان ان کا صاف صاف جائزہ نہیں لے سکتا اور نہ زبان و بیان قلبی واردات و تجربات کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ اس لیے مجبوراً شاعر ایمائی اور رمزیہ قوتوں سے کام لے کر اس کوتاہی کو دور کرتا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ ان رمزیہ علامات ہی سے ایک طلسماتی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ نظیریؔ اپنے خیال اور جذبے کے حسین امتزاج کے لیے انہی ایمائی اور رمزیہ علامات سے کام لیتا ہے۔ دو ایک مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔

زپائی تا بسرش ہر کجا کہ می نگرم ۔۔۔ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا این جاست

نظیریؔ نے محبوب کے حسن و جمال کی کیفیت بیان نہیں کی، لیکن اس میں جو شانِ محبوبی پائی جاتی ہے، اس کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کر دیا ہے کہ محبوب کی ہر ہر ادا ایک کرشمہ ہے، جو دامنِ دل پکڑ کر کھینچتی ہے۔

پائم بہ پیش از سرِ این کو نمی رود ۔۔۔ یاران خبر دہید کہ این جلوہ گاہ کیست

منزلِ محبوب کی کیفیات کا ذکر نہیں کیا، صرف یہ کہہ کر اشارہ کر دیا ہے کہ اب اس منزل سے قدم آگے نہیں بڑھتا، معلوم نہیں یہ کس کی جلوہ گاہ ہے۔ گویا ایک استفہامی

کیفیت پیدا کر کے منزلِ محبوب کی کرشمہ زائیوں کو بیان کر دیا ہے۔

(ب) خیالی اور وہمی باتوں کی تشبیہہ مادیات سے۔ نظیری اکثر خیالی اور وہمی باتوں کی تشبیہہ مادیات یا محسوسات سے دیتے ہیں۔ یہ سبک ہندی کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ نظیری کا دیوان اس قسم کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ مثال کے طور پر دو ایک شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

یکی بگور عزیزان شهر سیری کن　　　　ببین که نقش املِ ما چه باطل افتاده است

امیدوں کے مٹے ہوئے نقوش کو عزیزانِ شہر کی قبروں سے تشبیہہ دی ہے۔

ز سلطانی بکنج گلخنی افگنده تقدیرم　　　　که خاکستر بجای بستر سنجابم انداز د

اپنے عروج و زوال کی داستان کو اس طرح بیان کیا ہے کہ تقدیر نے مجھے بسترِ نرم سے اٹھا کر خاکسترِ گرم پر ڈال دیا ہے۔

محبت در دلِ غم دیده الفت بیشتر گیرد　　　　چراغی را که دودی هست در سر زود در گیرد

جو لوگ عشق و محبت کے صدمات سے آگاہ ہیں، وہ بہت جلد اس سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ اُس کی تشبیہہ اس چراغ سے دی ہے جو ابھی ابھی بجھا ہے۔ ایسے چراغ کو اگر دیا سلائی دکھائی جائے تو وہ عام چراغوں کی نسبت جلد جل اٹھتا ہے۔

(ج) موسیقی۔ نظیری ہندوستان آکر عبدالرحیم خانخاناں کے دربار سے وابستہ ہوا۔ اس دربار میں جہاں شعر و سخن کے پروانے موجود تھے، وہاں بڑے بڑے موسیقاروں اور رقاصوں کا بھی جمگھٹا رہتا تھا، جن کی لطیف صداؤں اور نواؤں نے ان کے ذوقِ شعر کو متاثر کیا، چنانچہ نظیری نے نغمہ اور شعر کے لطیف امتزاج سے فارسی شاعری میں ایک نئی روح پھونکی۔ نظیری کے اشعار میں ایسے ہم آہنگ الفاظ آتے ہیں کہ اشعار میں زیر و بم کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر چند شعر پیش کیے جاتے ہیں۔

بزیر شاخ گل افعی گزیده بلبل را　　　　نواگران نخورده گزند را چه خبر

"نواگران نخورده گزند" میں سروں کے پورے ٹھاٹھ کی کیفیات پنہاں ہے۔ یہ پوری غزل سرود و نغمہ کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ ذیل کے شعر میں "ر" کی تکرار نے موسیقی کی اس کیفیت کو تیز تر کر دیا ہے۔

ہزار شیخ و برہمن ز کیش و دین برگشت
تصرف نظر ارجمند را چہ خبر

ذیل کی غزل میں رقص و سرود کی پوری پوری کیفیت موجود ہے۔

ای صبا از گل عطار نشانی بمن آر
وز گلستان نشاپور خزانی بمن آر

خط ترخانی جاوید بعالم ندہند
بگذر از عالم و منشور امانی بمن آر

فرصتم نیست کہ از سنگ قضا سر خارم
گرامانی بنود تاب و توانی بمن آر

(۵) قلبی تاثرات - جن اشعار میں کہیں رنج و نشاط کا ذکر آتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ باتیں نظیری کے دل پر وارد ہو رہی ہیں۔

پردہ برداشتہ ام از غم پنہانی چند
بزبان می رود امروز گریبانی چند

نان ضعیفان کہ وفا داشت درین شہر اسیر
قفسی چند بجا ماندہ و زندانی چند

غزل میں تسلسل مضمون - غزل میں عموماً شاعر اپنے ذاتی جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ بعض اوقات کوئی خاص جذبہ ایک چنگاری کی طرح مختصر سی زندگی لے کر نمودار ہوتا ہے، اور آن کی آن میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس قسم کا جذبہ ایک ہی شعر میں ادا ہو جاتا ہے۔ لیکن بعض اوقات ایک جذبہ دریا کی موج کی طرح ہوتا ہے کہ بڑھتے اور پھیلتے ہوئے کافی عرصے تک اپنی بقاء کو قائم رکھتا ہے۔ اس قسم کے جذبے کو بیان کرنے کے لیے ایک شعر کافی نہیں ہوتا اور ضرورت پڑتی ہے کہ اسے ایک سے زیادہ اشعار میں بیان کیا جائے۔ حافظ اور خسرو کی طرح نظیری کی بھی بعض غزلیں ایسی ہیں جو ایک ہی جذبے کے ہمہ گیر اثر کے تحت لکھی گئی ہیں۔ مثلاً ذیل کی غزل میں محبوب نے ایک عالم کو والہ و شیدا بنا رکھا ہے اب وہ خود بھی کسی کی نگہ فتنہ ساماں کا شکار ہو گیا ہے۔

چشمش براہی می رود مژگان نما کش نگہ | در سینہ دارد آتشی پیراہن چاکش نگر
دامی کہ زلف انداختہ در گردن سیمنش ببین | خونی کہ مژگان ریختہ بر دامن پاکش نگر
شرم از میان برخاستہ مہر از دہاں برداشتہ | گفتار بی پرسش ببین رفتار بی باکش نگر
از کوی معشوق آمدہ شوریدگان در حلقہ اش | از صید آہو می رسد شیران بفتراکش نگر
دل بردہ در دل باختن معشوق عاشق پیشہ بین | بگرفتہ در انداختن بازوی چالاکش نگر
وحشی غزالی کز صبا رم در بیابان می خورد | رام نظیری می شود در ہوش و ادراکش نگر

(۷) الفاظ کے نئے مفہوم اور نئی ترکیبیں۔ نظیری نے اظہارِ خیالات کے لیے بعض نئی ترکیبیں وضع کی ہیں، اور بعض عام الفاظ کو اس انداز خاص میں پیش کیا ہے کہ ان کا مفہوم ہی مختلف ہو گیا ہے۔

از کف نمی دہد دل آسان ربودہ را | دیدیم زور بازوئی ناآزمودہ را

"دل آسان ربودہ" بالکل نئی ترکیب ہے۔ "زور بازوی ناآزمودہ" ایسی ترکیبیں اگرچہ استعمال ہوتی آئی ہیں، لیکن نظیری نے انھیں بالکل نئے انداز میں پیش کیا ہے۔

نظیری اور حافظ۔ نظیری کی بعض غزلیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حافظ شیرازی سے بھی متاثر ہوا تھا۔ عشق حقیقی جس سے حافظ کا کلام بھرپور ہے، نظیری کے کلام میں بھی ہے۔ حافظ نے اپنی بھرپور زندگی میں تعلقات دنیاوی سے کنارہ کشی اختیار کی تھی، نظیری آخری عمر میں زاویہ نشین ہوئے۔ دونوں کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ ایک ہی رنگ ہے، جو دونوں عظیم شاعروں کی غزلیات میں جھلکتا نظر آتا ہے۔

حافظ کے دیوان کی اولیں غزل کا پہلا اور آخری مصرعہ عربی کا ہے۔ نظیری کی اولیں غزل کے پہلے اور آخری مصرعے میں بھی یہی التزام پایا جاتا ہے۔

حافظ:۔ الا یا ایہا الساقی ادر کاسًا و ناولہا
کہ عشق آسان نمود اول ولی افتاد مشکل ہا

حضوری گر ہمی خواہی از و غائب مشو حافظ
متی ما تلق من تھوی دع الدنیا و اہملہا

نظیری :- اذا ما شئت ان تحیی حیوۃ حلو المحیا
بر سوائی بر آور سر زمستوری برون نہ پا
نظیری گر طمع داری کہ مقبول مغان باشی
فلا تحسد ولا تبخل ولا تحرص علی الدنیا

باہمی مشابہت کے لیے اشعار ذیل بھی ملاحظہ کیجیے :-

حافظ

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند
وندر آن ظلمت شب آب حیاتم دادند

چہ مبارک سحری بود و چہ فرخندہ شبی
آن شب قدر کہ این تازہ براتم دادند

من اگر کار روا گشتم و خوش دل چہ عجب
مستحق بودم و این ہا بہ زکاتم دادند

نظیری

دوش پر سوز دل و سینہ براتم دادند
سر چو شمعم بہ بریدند و حیاتم دادند

درد صاف غم و شادی بہ ازانی شد
تا خم و خمکدہ عشق براتم دادند

گرسنہ دیدہ تر از مفلس کنعان بودم
خواجہ گشتم کہ از ان حسن زکاتم دادند

طالب آملی (سالِ وفات ۱۰۳۶ھ مطابق ۱۶۲۶ء)

شہنشاہ جہانگیر تخت نشین ہوا تو اس وقت مغلیہ دربار شعراء سے بھرا ہوا تھا۔ بڑے بڑے نامور شعراء قصیدے پڑھتے اور انعام و اکرام پاتے تھے۔ ان میں سے ملک الشعراء ہونے کا شرف ایک نوعمر شاعر طالب آملی کو ہوا۔

طالب علاقہ ماژندران کے شہر آمل میں پیدا ہوا۔ تذکروں میں طالب کے حالات

زندگی بہت کم لکھے گئے ہیں۔ البتہ قرائن سے پتا چلتا ہے کہ اس نے ہندسہ، منطق، ہیئت اور حکمت کی باقاعدہ تعلیم پائی تھی۔ ایک قصیدہ کے حسب ذیل اشعار سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

بر ہندسی و منطقی و ہیئت و حکمت	دستی است مرا کش ید بیضا ز عباد است
وین جملہ چو طی شد علمین علم حقیقت	کاستاد علوم است برین جملہ مزاد است
در سلسلہ وصف خط این بس کہ ز کلکم	ہر نقطہ سویدای دل اہل سواد است
پوشم نسب شعر چو دانم کہ تو دانی	کاین پایہ مرا تا من این سبع شداد است

ان علوم میں طالب کو ممکن ہے کوئی خاص ملکہ حاصل ہو، لیکن اس کی شہرت کا مدار یہ شعر و شاعری ہے۔

طالب شروع شروع میں میر ابوالقاسم کے دربار سے وابستہ ہوا۔ جو صفوی حکمران شاہ عباس ثانی کی طرف سے ماژندران کا حاکم تھا۔ یہاں اس کی شان میں متعدد قصیدے کہے۔ ایک قصیدے کے دو شعر ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

سحر کہ غنچہ کشاید گرہ ز پیشانی	زند دم از دم عیسیٰ نسیم بستانی
سحر کہ طرہ پیچان مشک سای نعیم	بطرف عارض گلبن کند پریشانی

اس دربار میں ترقی کرنے کے موقعے کم تھے، اس لیے وہاں سے چل کر طالب کاشان آیا، پھر مرو کا رخ کیا۔ صفوی حکمران کی طرف سے یہاں کا حکمران ملکش خان تھا، جو شعر و سخن کا بہت قدردان تھا۔ طالب نے ملکش خان کے دربار میں رسائی حاصل کی اور اس کی شان میں قصیدے کہے۔ عبدالنبی[۱] مولف "میخانہ" لکھتا ہے کہ طالب نے مثنوی خسرو شیریں لکھ کر ملکش خان کے نام منسوب کی تھی۔

---

[۱] میخانہ مرتبہ مولوی محمد شفیع صفحہ ۳۸۴

مرو کے دربار میں بھی اسے خاطر خواہ دادِ سخن نہ ملی اس لیے اب ہندوستان کا دربارِ مغلیہ اس کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا، جو ہنر مندوں کی تربیت کا گہوارہ تھا۔ آخر طالب نے اپنا "بختِ سیاہ" ایران ہی میں چھوڑا اور ہندوستان آ گیا۔ اسی مضمون کی ایک رباعی کہی ہے۔

طالب گل این چمن بہ بستان بگذار   بگذار کہ می شوی پریشان بگذار

ہندو نہ برد تحفہ کسی جانب ہند   بخت سیہ خویش بہ ایران بگذار

مؤلف میخانہ لکھتا ہے کہ "اما چوں طالب از ملکش خان جدا گردید، اول بار بقندھار آمد"[1] لیکن یہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ چونکہ اس کے ایک قصیدے سے پتا چلتا ہے کہ اس نے دربار شاہی میں رسائی پانے کے لیے لاہور، دہلی اور آگرہ کے کئی چکر کاٹے، لیکن کچھ پیش نہ چلی۔ آخر اس نے سنا کہ جہانگیر کی طرف سے قندھار کا حاکم غازی خان ہے، جو بہت دریا دل، اور سخن فہم شخص ہے۔ چنانچہ آگرہ، لاہور اور ملتان سے ہوتے ہوئے قندھار کا رُخ کیا۔ اس غریب الدیار کو راستے میں بہت سی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا، چنانچہ غازی خان کی مدح میں جو قصیدہ لکھ کر لے گیا تھا، اس میں ان تکالیف کی طرف بھی اشارہ کیا۔ چند شعر ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

خدای داند و من بندہ کاندرین مدت   چہا کشیدہ ام از حادثات دورانی

ازین سفر کہ نصیبم مباد دیگر باز   بگو نہ گونہ غمم بود صحبت جانی

میین مغیق ملالت چہار مہ بودم   بسان چہرہ بشُشدر تمام حیرانی

غازی خان نے اس افسردہ خاطر اور آوارہ دیار کو اپنے دل میں جگہ دی، اور اس کی دلجوئی میں کسی قسم کی کمی نہ کی۔ طالب نے بھی اس کی شان میں پرزور قصیدے کہہ کر اپنے محسن و مربی کا حق ادا کیا۔ لیکن ممدوح اور مدح گزار کی یہ صحبت زیادہ دیر جاری نہ رہ سکی۔ غازی خان عین عالم شباب میں راہی ملک بقا ہُوا اور طالب کو واپس ہندوستان آنا پڑا۔ کچھ عرصہ آگرہ میں قیام کیا، یہاں خواجہ قاسم دیانت خان سے ملاقات ہوئی، جو شہنشاہ جہانگیر

---

[1] میخانہ عبدالنبی صفحہ ۲۸۷

کے مصاحبوں میں سے تھا۔ اس نے عبداللہ خان کی خدمت میں، جو جہانگیر کی طرف سے گجرات کا حاکم تھا، مراسلہ بھیج کر طالب کی سفارش کی۔ اس پر عبداللہ خان نے طالب کو گجرات آنے کی دعوت دی۔ طالب نے اس واقعہ کو نظم کیا ہے، جس کے چند شعر حسب ذیل ہیں:۔

صبا رفتار پیکی در طلوع صبح نورانی | بگوشم زد صدای زنگ چون بانگ سلیمانی
ز سر آهنگی آن نغمه مست از جای بر جستم | بهر جانب نگاهی تاختم از روی حیرانی
دویدم پیش گفتم خیر مقدم وآنگه افشاندم | بپا یش مشتی از ناسفته گوهرهای مژگانی
گلاب آوردم و پیشانیش از گرد ره شستم | دریغا کاش بودی قدرتم بر آب حیوانی
در اثنای تکلم کاغذین درجی پر از گوهر | ببوسید و بدستم داد از روی روش دانی
من آن منشور دولت چون بدست خویشتن دیدم | شدم سر تا قدم بهر سجود شکر پیشانی
بسوی قبلهٔ گجرات رو تسلیم ها کردم | به آدابی که بر من کرد گردون آفرین خوانی

کچھ عرصہ گجرات میں رہ کر واپس آگرہ آگیا، اور اب کی دفعہ ملکہ نورجہاں کے والد اعتماد الدولہ کی سرکار میں رسائی پانے میں کامیاب ہو گیا۔ اعتماد الدولہ طالب کی شاعرانہ صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوا، کچھ اس کے ہموطن ہونے کا پاس تھا۔ چنانچہ جب کبھی ملتا، اعتماد الدولہ، شہنشاہ کے حضور میں طالب کا ذکر آتا۔ بالآخر اسے جہانگیر کے زمرہ شعرا میں شامل کرا دیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ طالب کی شگفتہ بیانیوں کے جوہر کھلتے گئے اور جہانگیر کی نظر میں اس کی قدر و منزلت بڑھتی گئی۔ آخر سنہ ۱۰۲۸ھ مطابق سنہ ۱۶۱۸ء میں، جب شہنشاہ نے تخت نشینی کی چودھویں سالگرہ منائی، تو طالب کو ملک الشعراء کا خطاب دے کر سرفراز کیا۔ چنانچہ جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے:۔

"درین تاریخ طالب آملی بخطاب ملک الشعرای خلعت امتیاز پوشیده اصل او از آمل است یک چندی به اعتماد الدوله می بود۔ چون رتبهٔ سخنش از همگنان درگذشت، در سلک شعرای پایهٔ تخت منتظم گشت۔ این چند بیت از اوست۔"

لب از گفتن چنان بستم کہ گوئی
دہن بر چہرہ زخمی بود بہ شد

عشق در اوّل و آخر ہمہ وجد است و سماع
این شرابی ست کہ ہم پختہ و ہم خام خوش است

دو لب خواہم یکی در می پرستی
یکی در عذر خواہی ہای مستی

زغارت چمنت بر بہار منت ہاست
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

جہانگیر کے دربار میں طالب نے بقیہ عمر بڑی عزّت و احترام سے گزاری۔

لاہور سے محبت

طالبؔ شہر لاہور کا بہت والہ و شیدا تھا، چنانچہ صفت لاہور میں ایک قصیدہ لکھا ہے، جس کے چند شعر ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

خوشا لاہور و فیض آب لاہور
بطاعت میل شیخ و شاب لاہور

نیابی ز اہل ہندوستان گروہی
بدل نزدیکی ارباب لاہور

گمانی نیست کاندر ہفت کشور
بود شہری بآب و تاب لاہور

بہ حسن خلق و حسن چہرہ مانند
بہ اصحاب بہشت اصحاب لاہور

لاہور میں طالبؔ کو حضرت شاہ ابو المعالیؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کرنے کا شرف بھی حاصل ہوا تھا۔

ذیل کے دو اشعار میں اس سعادت کا ذکر کیا ہے۔

کنم زان رو مرید آسا شب و روز
کرامت ہا بیان در باب لاہور

کہ پیر دست گیر و مرشد من
یکی قطب است از اقطاب لاہور

خدایا زندہ جاوید دارشش
بہ آب خضر یعنی آب لاہور

طالب کی پُر گوئی

طالب بہت پُر گو شاعر تھا۔ کوئی واقعہ پیش آتا تو قلم ہاتھ میں لے کر بے تکلف لکھتا چلا جاتا تھا۔ مولانا شبلی نعمانی "تذکرہ شعرا از احمد علی" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ قلیچ خان ناظم لاہور کی شان میں ۴۸ اشعار کا قصیدہ ایک رات میں لکھا، چنانچہ وہ اس بات پر فخر کرتا ہے۔

منم کہ نیست چو من شاعری ز اہلِ سخن — منم کہ نیست چو من قابلی ز اہل کلام
گواہ این دو سہ معنی ہمیں قصیدہ بس است — کہ یافت از سرِ شب تا سپیدہ دم اتمام

جہانگیر کی مدح میں ایک پُر زور قصیدہ کہا۔ جس کا مطلع یہ ہے۔

چو شہسوار مرا چشم بر شکار افتاد — بزخم تیر نگہ صید بی شمار افتاد

یہ طویل قصیدہ بھی رات بھر میں لکھا گیا، جیسا کہ ذیل کے شعر سے ظاہر ہے۔

بہ خام دستیم ای شہریار خوردہ مگیر — کہ یک شب این ہمہ نقشم بردی کار افتاد

خصوصیتِ کلام

طالب کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تشبیہیں بڑی نادر اور تازہ ہوتی ہیں۔ سطور بالا میں شہنشاہ جہانگیر کے انتخاب کے چار اشعار جو نقل کیے گئے ہیں، عمدہ تشبیہات کی نادر مثالیں ہیں۔ ذیل کے اشعار میں بھی یہ خصوصیت بدرجہ احسن موجود ہے۔

بی نیازانہ ز ارباب کرم می گزرم — چون سیہ چشم کہ بر سرمہ فروشان گزرد

نظارہ ترا دو جہان جز دو چشم نیست — یک چشم باز ماندہ و یک چشم بر ہم ست

با صد کرشمہ آن بت بدمست می رود — خود می کند خرام خود از دست می رود

مردی مرگ و نوا را سبک از جای گیر — کوزہ بی دستہ چو بینی بدو دستش بردار

صائب تبریزی (پیدائش سنہ ۱۰۱۰ھ مطابق سنہ ۱۶۰۱ء)
(وفات سنہ ۱۰۶۱ھ مطابق سنہ ۱۶۵۰ء)

محمد علی نام، صائب تخلص، والد کا نام مرزا عبدالرحیم ہے۔ مرزا عبدالرحیم تبریز کا مشہور تاجر تھا۔ شاہ عباس صفوی نے اپنے عہدِ حکومت میں اصفہان کو پایۂ تخت بنایا، جس کی وجہ سے وہاں کی صنعت اور تجارت میں بہت ترقی ہوئی۔ مرزا عبدالرحیم بھی تبریز کو خیرباد کہہ کر اصفہان آگیا، اور تجارت کی غرض سے یہاں مستقل اقامت اختیار کرلی۔ صائب یہیں سنہ ۱۰۱۰ھ میں پیدا ہوا، اور یہیں درسِ تعلیم کی تکمیل ہوئی۔ اسی لیے اسے تبریزی بھی کہتے ہیں اور اصفہانی بھی۔

صائب کو شعروسخن سے فطری مناسبت تھی، اس لیے سنِ شعور کو پہنچتے ہی شعر کہنے لگا۔ تذکروں میں ذکر آتا ہے کہ پہلے حکیم رکنائے کاشی اور پھر حکیم شفیع اصفہانی سے اصلاح لی۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس کی شاعری کی شہرت دُور دور تک پھیل گئی۔ فکرِ سخن کے ساتھ ساتھ صائب کا میلان مذہبیت کی طرف بھی تھا اس لیے حج بھی کیا۔

صائب واپس آیا تو وطن کا ماحول شعروشاعری کے لیے سازگار نہ تھا۔ طبیعت قصیدہ اور غزل کی طرف مائل تھی، لیکن صفوی حکمرانوں میں کوئی قصیدہ اور غزل کا پرسانِ حال نہ تھا۔ اُدھر ہندوستان سے مغلیہ درباروں کی شعر شناسی اور شاعر نوازی کی خبریں آتی تھیں، چنانچہ صائب کی ہمت بندھی اور اس نے بھی عرفی، نظیری اور طالب آملی کی طرح وطن کو خیرباد کہہ کر پاک و ہند کا رُخ کیا۔ ذیل کے اشعار میں اہلِ وطن کی ناقدر شناسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

بلند نام نگردد کسیکہ در وطن است ۔۔۔ زنقش سادہ بود تا عقیق در یمن است
دل رمیدۂ ما شکوہ از وطن دارد ۔۔۔ عقیق ما دل پرخونی از یمن دارد

صائب تجارت کی غرض سے پاک و ہند آیا۔ یہاں بہت جلد اسے پایۂ تخت دہلی

کے شعراء میں شامل ہونے کی عزت حاصل ہو گئی۔ ظفر خان سبزواری تیموری امراء میں سے تھا۔ اور شعر و ادب کا بہت شیدائی تھا۔ اس کے ساتھ کشمیر اور کابل سے دکن تک کی سیر کی۔ ظفر خان کی مدح میں بھی صائب نے بہت پُر زور قصیدے کہے ہیں۔ آخر اُس کا ضعیف والد اس کی تلاش میں آگرہ اور لاہور ہوتا ہوا آیا۔ اور اسے ایران واپس لے جانا چاہا۔ صائب نے ایک قطعہ لکھ کر رخصت مانگی۔ اس کے چند شعر حسب ذیل ہیں۔

ہفتاد سالہ والد پیر است بندہ را — کز تربیت بود بمنش حق بے شمار
آوردہ است جذبۂ گستاخ شوق من — از اصفہان بآگرہ ولاہورش اشکبار
زاں پیشتر کز آگرہ بمعمورہ دکن — آید عناں گسستہ تر از سیل اشکبار
ویں راہ دور راز سر شوق طی کند — با قامت خمیدہ و با پیکر نزار
دارم امید رخصتی از آستان تو — ای آستانت کعبۂ امید روزگار

صائب آخر والد کے ہمراہ ایران روانہ ہوا۔ یہاں اس کی شاعری کی شہرت سن کر صفوی بادشاہ ثانی نے اسے نوازا اور دربار کا ملک الشعراء بنایا۔ صائب نے شاہ عباس ثانی کی جنگ کے واقعات کو نظم کیا، جو شاہ جہان کے خلاف ۱۰۵۹ھ مطابق ۱۶۴۹ء میں ہوئی۔

صائب شاہ عباس صفوی کے دربار سے اشعار کہہ کر ظفر خان کی خدمت میں بھیجا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ یہ شعر بھیجا۔

دور دستان را بہمت یاد کردن مردمی است
ورنہ ہر نخلی بپائی خود ثمر می افگند

ظفر خان نے داد کے طور پر پانچ ہزار روپے بھجوائے۔

صائب کو گرہ لگانے میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ چنانچہ بعض لوگ بے معنی مصرعے لاتے، تو آپ انھیں گرہ لگا کر بامعنی کر دیتے۔ ایک شاگرد نے چند مصدر جمع کر کے ایک مصرع کہا
دویدن رفتن استادن نشستن خفتن و مردن۔ آپ نے پہلا مصرعہ کہہ کر اس طرح

شعر موزوں کر دیا۔

بقدر ہر سکون راحت بود بنگر تفاوت را

دویدن رفتن استادن نشستن خفتن و مردن

ایک مرتبہ ایک خربوزہ فروش یہ صدا لگا کر سردے بیچتا تھا۔

من قاش فروش دل صد پارہ خویشم

صائب نے کئی ہزار روپے معاوضہ دے کر اس سے یہ مصرعہ خرید لیا اور ایک مصرعہ لگا کر مطلع کر لیا۔

لختی برد از دل گزرد ہر کہ ز پیشم　　　من قاش فروش دل صد پارہ خویشم

صائب نے ۱۰۶۱ھ مطابق ۱۶۵۰ء میں وفات پائی اور اصفہان میں دفن ہوا۔ کسی خوش ذوق نے تاریخ کہی۔ "صائب وفات یافت"

اندازِ بیان غزل گوئی میں تمثیل نگاری، صائب کا خاص انداز ہے۔ یعنی ایک مصرعہ میں جو کچھ کہتا ہے دوسرا مصرعہ اس کے ثبوت میں پیش کرتا ہے۔

صائب تمثیل میں منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

ہر کہ زشت است ہمان زشت بعقبی خیزد　　　کور از خواب محال است کہ بینا خیزد

پہلے مصرعے میں یہ بات کہی کہ جو یہاں برا ہے، وہ عاقبت میں بھی برا ہی ہوگا۔ دوسرے مصرعے میں ثبوت کے طور پر یہ کہا کہ اندھا نیند کے بعد بھی اندھا ہی اٹھتا ہے۔

زکار افتاد چون ظالم بہ اہل ظلم پیوندد　　　کہ بال تیر می گردد پر و بال عقاب آخر

جب ظالم کسی پر ظلم کرنے کی قدرت نہیں رکھتا تو اہلِ ظلم سے مل جاتا ہے۔ کیونکہ عقاب کے پر و بال آخر تیر ہی میں لگتے ہیں۔

صدای آب روان خواب را گران سازد

زخوش عنانی عمر است خواب غفلت ما

ہماری خواب غفلت زندگی کی دلکشی کی وجہ سے ہے۔ کیوں نہ ہو بہتے پانی کی آواز سے سونے والوں کی نیند اور گہری ہو جاتی ہے۔ اس طرح ذیل کے اشعار بھی اسباب علل کی کیفیت پیش کرتے ہیں۔

قمریان پاس غلط کردہ خود می دارند
ورنہ یک سرو درین باغ باندام تو نیست

دلم بہ پاکی دامان غنچہ می لرزد
کہ بلبلان ہمہ مستند و باغبان تنہا

گریہ شمع از برائے ماتم پروانہ نیست
صبح نزدیک است و در فکر شب تار خود است

انسانی زندگی کا مطالعہ

صائب کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے انسانی زندگی کا بہت گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا وہ تکلیف رنج، احتیاج و فاقہ سے بخوبی واقف ہے جو لوازمۂ حیات ہیں۔ زندگی کی یہ تلخیاں اوقات کو بھی تلخ کر دیتی ہے۔ چنانچہ وہ زندگی سے بیزار ہو کر پکار اٹھتا ہے۔

از بیابان عدم تا بہ شبستان وجود
در تلاش کفنی آمدہ عریانی چند

قدسی مشہدی

ایران و ہند میں قدسی تخلص کے متعدد شعرا گزرے ہیں، انہی میں ایک حاجی محمد جان قدسی بھی ہیں۔ ان کے نام کے متعلق تذکرہ نویسوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض[1] نے ان کا نام حاجی محمد خان قدسی لکھا ہے۔ لیکن انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں ان کا نام حاجی محمد جان قدسی لکھا گیا ہے۔ بعض[2] ہمعصر

---

[1] فہرست کتب انڈیا آفس جلد اول ص ۵۴۸

[2] ص ۱۸۳

مورخین نے بھی ان کا نام حاجی محمد جان قدسی ہی لکھا ہے۔ اس لیے یہی نام درست ہے سمجھنا چاہیے۔

قدسی کی تاریخ ولادت کے متعلق تذکرے خاموش ہیں، البتہ ان کے بعض اشعار سے یہ شہادت ملتی ہے کہ ان کا سالِ پیدائش ۹۹۱ھ مطابق ۱۵۸۳ء ہوگا۔ قدسی نے آٹھویں امام موسیٰ رضا کی منقبت میں متعدد قصیدے کہے ہیں۔ ایک قصیدہ کا مطلع ذیل سے شروع ہوتا ہے۔

پامال روزگارم واز چشم در ز گہر — برفرق روزگار گہر می کنم نثار

اس قصیدے کا ایک شعر یہ ہے۔

شد ایدم کہ از بس چہل سال مدح تو — در چاکری ثنای امامی شود شمار

اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ قدسی نے تقریباً چالیس سال کی عمر تک امام موصوف کی منقبتیں ضرور لکھیں۔ ایک دوسرے مقام پر ترکِ وطن کا ارادہ ذیل کے اشعار میں کیا ہے۔

گفتم کہ چیست فائدہ از ماندن وطن
گفتا کہ بر تو نیست یکی روشن از ہزار

پنجاہ سال رفت کہ عمر تو بیش وکم
من بعد ہم بدست قناعت عنان سپار

ان اشعار سے واضح ہے کہ قدسی پچاس سال تک اپنے وطن میں رہے اور اس کے بعد ہند آنے کا ارادہ کیا۔ ایتے اور مولف سفینۂ خوشگو لکھتے ہیں کہ قدسی ۱۰۴۱ ہجری، مطابق ۱۶۳۱ء میں پاک و ہند آئے۔ اس سے یہ قیاس بھی کیا جاسکتا ہے، کہ قدسی کا سالِ پیدائش ۹۹۱ھ مطابق ۱۵۸۳ء ہوگا۔

ممدوحین

قدسی پاک و ہند آئے، تو انھیں ابو عبداللہ خان زخمی حاکم گجرات کے مصاحب ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ یہاں انھوں نے اپنے ممدوح

کے پُر زور قصیدے کہے۔ اس کا نام بحر میں نہیں آسکتا تو کہتے ہیں ؎

نہنگی کہ از غایت احتشام　　　نگنجد بہ بحر بزرگیش نام

ایک سال بعد اسی ممدوح کی وساطت سے دربارِ شاہجہانی میں رسائی ہوئی اور شاہجہان کے قصیدے کہنے لگے، لیکن عبداللہ خان کی نوازشات کو نہیں بھولے، چنانچہ "ظفرنامہ شاہجہانی" کے نام سے مثنوی لکھی، تو اس میں بھی ان کی شجاعت اور مردانگی کی دل کھول کر تعریف کی۔

کیا قدسی دربار کے ملک الشعرا تھے

قدسی آخر تک دربار شاہجہانی سے وابستہ رہے۔ بادشاہ کی مدح سرائی کرتے رہے اور طرح طرح کے انعام و اکرام پاتے رہے۔ عبدالحمید لاہوری "شاہ جہان نامہ" میں لکھتے ہیں کہ ۱۰۴۵ھ مطابق ۱۶۳۵ء میں تخت نشینی کی سالگرہ کے موقع پر قدسی نے قصیدہ پڑھا۔ اور بادشاہ نے اسے سونے میں تلوایا، چنانچہ ایک من اٹھارہ سیر ہوا۔ والہ داغستانی لکھتے ہیں کہ انھیں ملک الشعراء کا خطاب بھی ملا تھا۔ لیکن مولوی عبدالمقتدر[1] اور محمد صالح کمبوہ کے بیانات سے پتا چلتا ہے کہ ملک الشعرا کا خطاب ابوطالب[2] کلیم کو ملا تھا۔

قدسی کے ہم عصر شعراء

ابوطالب کلیم، میر حسن بیگ رفیع، میر یحییٰ کاشی شیرازی اور ملا شیدا، قدسی مشہدی کے ہم عصر تھے۔

تاریخ گوئی

مؤلف مفتاح التواریخ لکھتے ہیں کہ قدسی کو تاریخ گوئی میں بہت ملکہ حاصل تھا۔ جب شاہ جہان نے نو کروڑ روپے کی لاگت سے تخت طاؤس تیار کرایا، تو اکثر شعرا نے قصیدے، قطعات اور تاریخیں کہیں، مگر قدسی کی تاریخ پسند آئی اور گنبد کے اندر مینائے سبزے لکھوائی گئی۔

چو تاریخش زبان پرسید از دل　　　بگفت اورنگ شاہنشاہ عادل

تصنیفات آپ نے دو مثنویاں "ظفرنامہ شاہجہانی" اور "مثنوی کشمیر" لکھی ہیں۔ ان کے علاوہ "کلیات" بھی آپ کی یادگار ہے، جو قصائد، غزلیات، رباعیات اور ایک مرثیے پر مشتمل ہے۔ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء میں حکیم نیاز علی نہان نے "مثنوی قدسی مشہدی" کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے۔ اسے قدسی کی دونوں مثنویوں کی تلخیص سمجھنا چاہیئے۔

اندازِ نگارش قدسی متقدمین سے بھی متاثر تھے، اور متاخرین سے بھی۔ اس لیے آپ کے کلام میں "سبک خراسانی" کی سی سادگی اور سلاست پائی جاتی ہے اور سبک ہندی کی نازک خیالی اور نکتہ آفرینی بھی۔ قدسی کے قصائد کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔ آپ نے اکثر اپنے قصائد میں متقدمین کی پیروی کی ہے۔ لیکن قصائد میں کیفیات و واردات بھی جھلکتے نظر آتے ہیں۔

آپ اخلاقی اور الٰہیاتی شاعر ہیں۔ عشقِ مجازی کو گلزارِ بے رنگ و بو سے تعبیر کرتے ہیں اور عشقِ مجازی میں جو نیاز مندی کے آنسو بہائے جاتے ہیں، انھیں وہ رائگاں سمجھتے ہیں، مثلاً۔

باغی کہ گلش بو ندہد عشق مجاز است
تخمی کہ کِشش بر نخورد اشک نیاز است

معلوم ہوتا ہے قدسی محبوبِ حقیقی کے پرستار ہیں اور اس سے واصل ہونے کے لیے راہِ طریقت کے سالک کی طرح عشق کے مختلف مقامات سے گزرے ہیں۔ ان پر جو جو احوال و کیفیات گزری ہیں، وہ غزل کے علاوہ قصائد کی تشبیہوں میں بھی جھلکتی نظر آتی ہیں۔ اُنھوں نے وارداتِ قلبی اور کیفیاتِ ذہنی کو تشبیہوں میں کچھ اس طرح سمویا ہے کہ آپ بیتی جگ بیتی معلوم ہوتی ہے۔ ذیل میں ان کی تشبیہوں کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں ؎

من نہی گویم بچشمم نہ قدم یا بر زمین
چشم من فرش است ہر جای نہی پا بر زمین

زیر پای عاشقان باشد زمین و آسمان
عشق را یک پای بر عرش است و یک پا بر زمین

جای بر گردون بود افتادگان عشق را
من ہم از افتادگان عشق اما بر زمین

عشق در تن بجای جان باشد
زندہ بی عشق کس چسان باشد

آنکہ گوئی نشان ندارد دوست
بی نشانیش خود نشان باشد

ذیل میں ان کے فخریہ قصائد سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

دعوی کند از پیشہ خود ہر کس و من ہم
کارم سخن است و سخنم بر سر کار است

ہر ساز کہ بر ساز کند مطرب طبعم
از نغمہ سیراب رگ ابر بہار است

اشعار مرا اکم نبود لفظ ز معنی
تا سایۂ نخل قلم من ہمہ بار است

اشعار مرا سلسلۂ معنی باریک
چون شانہ گہ فکر بمویم سر کار است

گر دیر تر آرم گہر نظم عجب نیست
کز تیزی طبعم جگر فکر فگار است

قدسی نے قصیدہ نگاری میں جن اساتذہ کا تتبع کیا ہے، ان میں فیضی، عرفی اور امیر خسرو کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

غزل

غزل میں عموماً شاعر داخلی کیفیات کا اظہار کرتا ہے۔ داخلی شاعری کا تعلق قلب انسانی سے ہوتا ہے۔ جو گوناگوں کیفیات کا طلسم خانہ ہے۔ قدسی نے ان کیفیات کو ادا کرنے کے لیے رمزیت اور ایمائیت سے کام لیا ہے، جو تغزل کی جان ہے۔ اس سے قدسی کی غزلیات میں اثر اور ہمہ گیری پیدا ہو گئی ہے۔ نمونے کے طور پر ذیل کی غزل پیش کی جاتی ہے۔

دارم دلی اما چہ دل صد گونہ حرمان در بغل
چشمی و خون در آستین اشکی و طوفان در بغل

یارب، مرا ثابت قدم از کوی قاتل بگذران
من سر بجیب انداختہ او تیغ عریان در بغل

کو قاصدی از کوی او تا در نثار مقدمش
صد طفل اشک از دیدہ ام آید برون جان در بغل

بوی ترا یک صبحدم آرد صبا گرد چمن
گل غنچہ گردد تا کند بوی تو پنہان در بغل

روز قیامت سر کسی در دست گیرد نامہ ای
من نیز حاضر می شوم تصویر جانان در بغل

نازم خدنگ غمزہ را کز لذت دیدار او
ہر دم جراحت ہای دل دزدیدہ پیکان در بغل

برقع ز عارض بر فگن یک صبحدم تا از حیا
گردد فراموش از سحر خورشید تابان در بغل

قدسی بہ ہنگامی چون شود سودای بازار جزا
او نقد آمرزش بکف من جنس عصیان در بغل

ترنم :- قدسی نے اپنی غزلوں میں کچھ ایسے ہم آہنگ الفاظ استعمال کیے ہیں کہ ان میں شعروں کا زیر و بم اور آواز کی جھنکار سنائی دیتی ہے ۔ ذیل کی غزل ترنم کی عمدہ مثال ہے

من لذت درد تو بہ درمان نفروشم
یک ذرہ غم عشق تو با صد جان نفروشم

در دل بہ خیال رخ روی تو خلیدہ
خاری کہ بصد گلشن رضوان نفروشم

صد جان فشانی کہ دہم دامنت از دست
دشوار بدست آمدہ آسان نفروشم

کام دو جہان در عوض غم نستانم
این جنس گرامی بکس ارزان نفروشم

قدسی من و ترا دامنی عشق چو ندا ...
... گرد بیابانی داران ... نفروشم

ابوطالب کلیم (سال وفات ۱۰۶۱ھ مطابق ۱۶۵۰ء)

کلیم کے ہم وطن

تذکرہ نویسوں نے اس کے حالات پر بہت کم توجہ دی ہے ۔ اسنا قلی ہدایت اور رضا زادہ شفق نے اپنے تذکروں میں اس کا ذکر تو کیا ہے لیکن یہ ذکر صرف چند سطروں تک محدود ہے ۔ پاک و ہند کے مشہور نقاد علامہ شبلی نعمانی نے البتہ کلیم کے مفصل حالات لکھے ہیں ۔

کلیم کا نام ابوطالب وہ وطن ہمدان تھا ۔ تعلیم کا شوق شیراز لے آیا ، اور وہیں تعلیم کی یہیں تکمیل کی ، شروع ہی میں طبیعت شعر و شاعری کی طرف مائل تھی ۔ رفتہ رفتہ فکر سخن جاری رہی ، آخر جب کلام میں پختگی آگئی ، تو دور صفویہ کے اور نامور شعراء کی طرح کلیم نے بھی ہندوستان کا رخ کیا ، اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچا دی کہ صفوی دور کے قصیدہ گو اور غزل گو شعراء ... سے قطعاً

بے نیاز تھے۔

کلیم کے متعلق یہ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کس سال ہندوستان آیا۔ لیکن اس قدر معلوم ہے کہ وہ جہانگیر کے عہد میں ہندوستان پہنچا۔ شروع شروع میں دربار دکن سے وابستہ رہا۔ پھر دربارِ مغلیہ میں رسائی پانے کی خواہش میں آگرہ آ گیا۔ کلیم کے مداح اگرچہ دربارِ شاہی میں موجود تھے، لیکن جہانگیر تک اس کی رسائی نہ ہو سکی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ دربار کا ملک الشعرا طالب آملی تھا۔ اس کی موجودگی میں کسی دوسرے کی شنوائی ممکن نہ تھی۔ دوسرے یہ کہ ملکۂ نورجہان کلیم کی شاعری کی معتقد نہ تھی اور اکثر اس کے اشعار پر نکتہ چینی کرتی تھی۔ ایک دفعہ کلیم نے یہ شعر کہا ؎

زشرم آب شدم آب را شکستی نیست   بحیرتم کہ مرا روزگار چون بشکست

نورجہان نے شعر سن کر کہا کہ "یخ بستہ بشکست۔"

کلیم کو کچھ اپنے ارادوں میں ناکامی ہوئی، اور کچھ یادِ وطن نے بے قرار کیا، چنانچہ ۱۰۲۸ھ مطابق ۱۶۱۸ء میں وہ ہمدان واپس ہو لیا۔ یوں تو وہ وطن ہی کو جا رہا تھا لیکن ہندوستان چھوڑنے کا اسے رنج بھی تھا چنانچہ وہ کہتا ہے۔

زشوقِ ہند زان سان چشم حسرت بر قفا دارم

کہ رو ہم گر براہ آرم نمی بینم مقابل را

ہندوستان میں تھا، تو وطن کی یاد نے بے چین کیا، اب وطن میں ہے، تو ہندوستان کی یاد رہ رہ کر ستاتی ہے۔ چنانچہ وہ پکار اٹھتا ہے۔

توان بہشت دوم گفتنش بہ این معنی   کہ ہر کہ رفت ازین بوستان پشیمان شد

یہاں دو ہی سال گزارے تھے کہ پھر ہمدان سے چل کر ہندوستان پہنچ گیا۔ کافی عرصہ اسے دربار شاہی میں رسائی حاصل نہ ہو سکی۔ مولانا شبلی نعمانی[1] شاہجہان نامہ کے حوالہ سے

---

[1] بادشاہ نامہ حصہ ۲ ص ۸۳ و عمل صالح ج ۲ ص ۸۰؛

لکھتے ہیں کہ "وہ دکن میں مارا مارا پھرا۔ اس کی تصدیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ کلیم کا قصیدہ ابراہیم عادل شاہ کی مدح میں بھی ہے۔ ایک اور قصیدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیجاپور کے ارادے سے چلا تھا، کہ راہ میں جاسوسی کے شبہہ میں پکڑا گیا، اور قلعہ شاہ دُرگ میں قید رکھا گیا۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

فلک قدرا! نمی پرسی کہ گردون — چرا آزردہ مارا بی محابا
چرا آزردہ بیمار غمی را — کہ می آید بدرگاہ مسیحا
بعزم سیر بیجاپور گشتم — رہی با اختری چون دشت پیما
بچنگ راہداران او فتادم — چہ گویم تا چہا کردند بر ما
ہمہ اندر تجسس موشگافان — ہمہ در کنج کاوی ذہن دانا
یکی گوید کہ دزد اند، باشند — بزندان چہ کہ زنجیر فرسا
دگر گوید کہ جاسوسی فسادند — کہ از تفتیش ما گشتند بینا
کنون در چنگ ایشان مبتلایم — نمی دانیم چہ پارہ خود مدارا
ز بہر پاس ہندوہای با تیغ — چو مو استادہ دائم بر سر ما

یہ قصیدہ شاہ نواز خان حاکم دکن کا ہے۔ آخر میں یہ شعر لکھا ہے ؎

اشارت کن کہ چون اقبال گردیم — بخاکِ آستانت جبہ فرسا

آخر بصد پریشانی کلیم دربار شاہجہان میں رسائی پانے میں کامیاب ہو گیا۔ بادشاہ اس کے فکرِ رسا سے اس قدر متاثر ہوا۔ کہ اُسے ملک الشعراء بنا دیا۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ ۱۰۴۴ھ مطابق ۱۶۳۴ء میں جب شاہجہان نے نو کروڑ روپے کی لاگت سے تختِ طاؤس تیار کرایا اور آگرہ میں جشنِ نوروز کے دن اس پر جلوس کی رسم ادا کی، تو کلیم نے قصیدہ کہا؛

خجستہ مقدم نوروز و غرہ شوال — فشاندہ اند چہ گلہای عیش بر سر سال

شاہ جہان نے اُس کو صلے میں روپوں کے برابر تلوایا، چنانچہ ۵۵۰۰ روپے وزن میں آئے، اور اسے عطا کیے۔

کلیم کو شاہجہان کے ساتھ کشمیر جانے کا اتفاق ہوا۔ تو یہاں کی آب و ہوا بہت پسند آئی۔ بادشاہ نے "بادشاہ نامہ" نظم کرنے کا حکم دیا۔ کلیم نے یہ درخواست کی کہ کشمیر جنت نظیر میں ہی ٹھہر کر "بادشاہ نامہ" لکھنے کی اجازت دی جائے، چنانچہ یہ درخواست منظور ہوئی۔ کلیم کشمیر میں گوشہ نشین ہو گیا، ایک مرتبہ بادشاہ نے "مہرداری" کا منصب سونپنا چاہا، اس نے معذرت کی اور یہ شعر لکھ بھیجا۔

چو مہرِ تو دارم چہ حاجت بہ مہرم ۔۔۔ مرا مہر داری بہ از مہر داری

آخر یہیں انتقال کیا۔ غنی کشمیری نے[۱] تاریخ کہی۔

"طور معنی بود روشن از کلیم"

تاریخ گوئی

شعر کے علاوہ کلیم کو تاریخ گوئی میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایشیائے کوچک کے بادشاہ نے ازراہِ تفنن شاہجہان کو لکھ بھیجا کہ آپ تو ہندوستان کے بادشاہ ہیں، لیکن آپ نے شاہجہان لقب اختیار کیا ہوا ہے۔ شاہ جہان سوچ میں پڑ گیا اور چاہا کہ اپنے وزیر یمین الدولہ سے لقب بدلنے کا مشورہ کرے۔ کلیم نے اس موقع پر قصیدہ لکھ کر پیش کیا۔ ایک شعر میں "شاہجہان" لقب اختیار کرنے کی توجیہ کی۔[۲]

"ہند" و "جہان" ز روئے عدد ہر دو چون یکی ست
شہ را خطاب شاہ جہانی مبرہن ست

۱۔ بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۶۰۴ – ماثر الکرام دفتر ثانی ص ۸۰

۲۔ یہ شعر اس طرح بھی نقل کیا گیا ہے۔

ہند و جہاں ز روی عدد چون برابر است ۔۔۔ بر شہ خطاب شاہجہان زان مقرر است

یعنی ہند اور جہان کے عدد برابر ہیں۔ اس لیے اگر "شاہ ہند" کے بجائے شاہ جہاں کا لقب اختیار کیا گیا ہے، تو نامناسب نہیں۔

قصیدہ گوئی

قصیدہ گوئی کی بہت بڑی خصوصیت شکوہ لفظی اور زور بیان ہے، لیکن عرفی کے بعد اور قاآنی سے پہلے اس خصوصیت سے سب قصیدہ گو محروم رہے ہے۔ کلیم نے اگرچہ زبان کی الجھنوں کو صاف کیا۔ لیکن اس کے قصیدوں میں بھی شکوہ لفظی ہے نہ شوکت بیان، نہ زور مضمون ہے نہ بلندیٔ خیال۔ کلیم کے قصیدوں میں بھی محمد جان قدسی کی طرح غزل کا رنگ پایا جاتا ہے۔

خصوصیات

سبک ہندی کی امتیازی خصوصیت خیال بندی اور مضمون آفرینی ہے، کلیم کو اس میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ مضمون میں سے مضمون پیدا کرنا، کسی بات کو اصلیت کی بجائے محض خیال آرائی سے ثابت کرنے کی کوشش کرنا خاص کلیم کا حصہ ہے۔ خیال بندی کی چند مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔

میان غمگساران سوزم از غم ‎ ‎ ‎ ‎ چو آن ماہی کہ در دریا بسوزد

ای جرس تا کی از نالہ گلو پارہ کنی ‎ ‎ ‎ ‎ کس درین بادیہ دیدی کہ بفریاد رسی

جرس! تو خواہ مخواہ فریاد و فغاں سے گلے کو پارہ پارہ کرتی ہے۔ اس دشت میں بھلا تو نے کسی کو دیکھا ہے جو فریاد کرتی ہے۔

سرو را سایہ یکی بیش نباشد یا رب ‎ ‎ ‎ ‎ این قدر خاک نشین در تہ آن بالا چیست

تعجب ہے سرو کا سایہ بھی ایک ہی ہوتا ہے، یہ جو اس بلند و بالا سرو کے نیچے ایک خاک نشین ہے، یہ کون ہے۔

بسکہ ز دیدہ ریختم خون دل خراب را ‎ ‎ ‎ ‎ گریہ گرفت در حنا پنجۂ آفتاب را

دل خراب کا خون میں نے آنکھوں کی راہ اس قدر بہایا کہ میرے آنسوؤں نے آفتاب

کے پنجے میں مہندی لگا دی ہے۔

کلیم محض قصیدہ نگار ہی نہیں، صفِ اول کا غزل گو بھی ہے۔ قصیدہ کی طرح غزل میں بھی وہ سبکِ ہندی کا پیرو ہے۔ شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ "کلیم کا اصلی کمال غزل گوئی ہے۔ اس کا خاص رنگ مضمون بندی اور خیال آفرینی ہے۔" اس میں شک نہیں کیونکہ کلیم کو نکتے سے نکتہ پیدا کرنے کا اسلوب اور بات سے بات نکالنے کا ڈھب خوب آتا ہے

کلیم کے کلام میں ایک خوبی یہ بھی ہے۔ کہ وہ فرسودہ اور پامال مضمون کو بھی اپنے اندازِ بیان سے تازہ اور شگفتہ بنا دیتا ہے۔ مثلاً

بدنامیٔ حیات دو روزی نبود بیش | گویم کلیم با تو کہ آنہم چساں گزشت
یک روز صرف بستن دل شد بایں و آں | روز دگر بکندن دل زیں و آں گزشت

مضمون صرف اسی قدر ہے کہ زندگی دو روزہ ہے۔ اس مضمون میں اس نے اپنے تخیل اور اندازِ بیان سے کتنی تازگی اور رعنائی پیدا کر دی ہے

داخلی اور خارجی اثرات

کلیم کی غزل میں داخلی اور خارجی دونوں قسم کے اثرات موجود ہیں۔ حسن و عشق کی آویزش، زمانے کی شکایت، مناظرِ فطرت اور مظاہرِ قدرت کلیم کے خاص واقعیت اور حقیقت کا رنگ نمایاں ہو۔ یہ خوبی پیدا کرنے کے لیے وہ تمثیل، تشبیہہ اور اشاریت سے کام لیتا ہے۔

تمثیل ۔ شعر میں تمثیل سے یہ مراد ہے کہ پہلے مصرعے میں ایک بات کہی جائے اور دوسرے مصرعے میں اس کی دلیل پیش کی جائے تاکہ شاعر کے دل کی بات پڑھنے والے کے ذہن نشین ہو جائے۔ مثلاً

وضع زمانہ قابل دیدن دوبارہ نیست | رو پس نکرد ہر کہ ازیں خاکداں گذشت

دلبری چشم و کینہ، گلبن بی رنگ و بوست — دلکش پروانہ نیست شمع نیفروختہ

پہلے مصرعہ میں وہ محبوب جس میں نہ غصہ ہو نہ کینہ، ایسے پھول کی مانند ہے، جس میں رنگ ہے نہ خوشبو۔ اپنا یہ نظریہ پیش کرنے کے بعد کلیم ایک دلیل بھی پیش کرتا ہے۔ کہ وہ شمع جو فروزاں نہ ہو۔ پروانے کو اپنی طرف مائل نہیں کر سکتی۔

تشبیہہ ۔ کلیم بھی نظیری کی طرح محسوسات کی تشبیہہ عموماً مادیات سے دیتا ہے اس سے خیالی اور وہمی باتیں مجسم ہو کر سامنے آجاتی ہیں۔ یہی سبک ہندی کا خاصہ ہے۔

حیا بگوشۂ آن چشم مست جا کردہ — چو زاہدی کہ بہ بزم شراب افتادہ ست

حیا ایک خیالی بات ہے جس کا تعلق ذوق و وجدان سے ہے۔ کلیم کو محبوبہ کے گوشۂ چشم میں حیا نظر آتی ہے۔ وہ اس حیا کو ایک ایسے زاہد سے تشبیہہ دیتا ہے جو رندوں کی محفل میں آ گیا ہو۔

اشاریت ۔ اشاریت یا رمزیت تغزل کی جان ہے۔ جہاں اظہار و بیان کی قوت دل کی کیفیات کو موثر انداز میں ظاہر نہیں کر سکتی، وہاں کلیم رمزیت کا سہارا لیتا ہے مثلاً

با من آویزش او صورت موج است و کنار — دمبدم با من و ہر لحظہ گریزان از من

بہ تکلم بہ خموشی بہ اشارت بہ نگاہ — تواں برد بہر شیوہ دل آسان از من

ان اشعار میں ایک طرف تو "حسن" اس کی رنگا رنگی اور گریز پائی کا ذکر ہے دوسری طرف عشق کے ساتھ حسن کا تعلق اور کشمکش، اداؤں کی دلبردگی کا بیان، کیفیات قلب کا اظہار ہے۔ یہ داستان عشق کا ایک ضخیم باب ہے۔ لیکن کلیم نے ایمائی قوت سے کام لے کر کچھ اس طرح واردات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ حسن و عشق کی داستان کا یہ باب خود بخود پڑھنے والے کی نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔

کلیم کے تغزل کی اور خوبی یہ ہے کہ اس کی بعض غزلوں کے اشعار مسلسل ہوتے ہیں۔

اگرچہ غزل کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اشعار ایک دوسرے سے مربوط ہوں، تاہم بعض مضامین خصوصاً خارجی موضوعات اس امر کے متقضی ہوتے ہیں کہ انھیں ایک خاص ربط اور تعلق سے پیش کیا جائے۔ ذیل کی غزل ربط و تسلسل کی عمدہ مثال ہے۔

شمیم خلد گدای بہار کشمیر است | شگفتگی گل خارہ بار کشمیر است
لب پیالہ ز تبخال رشک می سوزد | کہ تشنہ وقف لب جوئبار کشمیر است
اگرچہ پایہ وابستگی ست قامت سرو | عنان ہوش بہ دست چنار کشمیر است
پیام عالم بالا کہ گوش تشنۂ اوست | سرالسرالیست کہ با آبشار کشمیر است

کلیم کو شاہجہاں کی فرمائش پر شعر کہنے کی اتنی قدرت حاصل تھی کہ اس نے شاہی تخت مرصع، شاہی سپر، شاہی شمشیر اور شاہی قلمدان پر اشعار کہے۔ شاہ جہان نے اپنی ہر چیز پر اس کے اشعار کندہ کرا دیے تھے۔

تصنیفات۔ دیوان کے علاوہ کلیم نے مثنویاں لکھی ہیں۔ تعریف اکبر آباد، قحط دکن، صعوبت دکن، ، مثنوی بادشاہ نامہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

بارھواں باب

(افشاریہ، زندیہ و قاچاریہ)

دورِ افشاریہ

پچھلے باب میں افشاریہ و زندیہ حکومت کا ضمناً ذکر آچکا ہے۔ لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ قاچار کا ذکر کرنے سے پہلے ان مذکورہ خاندانوں کے حکمرانوں کا بھی ذکر کر دیا جائے۔ عہدِ صفویہ کے زوال پر افشاریوں کی طاقتور مگر کم مدت حکومت قائم ہوئی، جس کا بانی نادر قلی تھا۔ اس نے نہ صرف ایران میں اپنی حکومت قائم کی، بلکہ ہمسایہ ممالک افغانستان اور ہند کے بعض مقامات پر بھی اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔

نادر قلی امام قلی کا بیٹا تھا، جو کمزور ترین قبیلہ "قرایقلو" کا ایک فرد تھا۔ اُن لوگوں نے اپنی کمزوری کی وجہ سے یہ مناسب سمجھا کہ ایک بڑے قبیلے "افشار" میں شامل ہو کر اس کا حصہ بن جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور "قرایقلو" قبیلے کے لوگ بھی "افشار" کہلانے لگے۔

نادر قلی نے بھی باپ دادا کی طرح بھیڑ بکری پالنے کا پیشہ اختیار کیا، لیکن وہ اس سے مطمئن نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ملکی مہموں میں حصہ لے۔ چنانچہ وہ اپنے پیشے کو خیرباد کہہ کر شاہ طہماسپ صفوی (سنہ ۹۳۰ھ تا ۹۸۴ھ مطابق سنہ ۱۵۲۳ء تا سنہ ۱۵۷۶ء) کی فوج میں شامل ہو گیا۔ سنہ ۱۱۴۳ھ مطابق سنہ ۱۷۳۰ء میں افغانوں نے مغربی ایران پر حملہ کیا۔ جس میں نادر قلی نے ایران کی مدافعت میں کارہائے نمایاں کیے، اور اصفہان کے قریب افغانوں

۱؎ دیکھیے ہسٹری آف پرشیا۔ مؤلفہ سر پرسی سائیکس جلد دوم ص ۲۷۷

کو شکست دی۔ نادر قلی کی ان خدمات کے صلے میں اسے فوجوں کا سپہ سالار بنا دیا گیا۔ ۱۱۴۴ھ مطابق ۱۷۳۱ء میں اہل ایران کو ترکوں سے دو دو ہاتھ کرنے پڑے۔ اس جنگ میں بھی نادر قلی نے بہادری کے جوہر دکھائے اور اہل ایران ترکوں سے اپنے کھوئے ہوئے علاقے آرمینیا اور گرجستان واپس لینے میں کامیاب ہو گئے۔ شاہ طہماسپ نے اس جان باز شخص کو طرح طرح سے انعام و اکرام دے کر نوازا، لیکن وہ اب خود حکمران بننے کے خواب دیکھنے لگا تھا، اس لیے بڑے سے بڑے انعام کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ آخر اس نے ۱۱۴۴ھ میں شاہ طہماسپ کو تخت سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا۔ شاہ طہماسپ کی جگہ نادر قلی کے ایما پر اس کا خورد سال بیٹا عباس سوم تخت نشین ہوا۔ اگرچہ نام کو تو عباس سوم ہی ایران کا بادشاہ تھا، لیکن حکومت کی باگ ڈور نادر قلی کے ہاتھوں میں تھی۔ آخر جب عباس فوت ہوا، تو نادر قلی نادر شاہ کا لقب اختیار کر کے ایران کا بادشاہ بنا اور اپنے قبیلے کے نام پر عہدِ افشاریہ کی بنیاد رکھی۔

نادر شاہ نے ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۷ء میں افغانستان پر لشکر کشی کی، اور قندھار، غزنی اور کابل کے علاقے فتح کیے۔ ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۸ء میں ہند کا رُخ کیا اور ہند کے پایہ تخت دہلی پر بھی افشاری علم لہرایا۔ ۱۱۵۳ھ مطابق ۱۷۴۰ء میں اس نے بخارا اور خوارزم کے علاقے فتح کر کے ازبکوں کا تمام علاقہ لے لیا۔ پھر عراق کی طرف متوجہ ہوا اور بصرہ اور موصل کے علاقے فتح کیے۔

نادر شاہ نے آخری چند سالوں میں لوگوں پر بڑے بڑے ظلم ڈھائے۔ یہاں تک کہ مفتوحین کے سر کاٹ کر چنگیز و ہلاکو کی داستان بربریت دہرائی۔ آخر وہ ۱۱۶۰ھ مطابق ۱۷۴۷ء میں اپنے ملازموں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

عہدِ زندیہ

نادر شاہ کے قتل کے بعد اس کا بھتیجا علی قلی عادل شاہ لقب اختیار کر کے تخت نشین ہوا۔ لیکن ایک ہی سال بعد ۱۱۶۱ھ مطابق

۱۷۴۸ء میں اسے تخت سے اتار کر قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد رضا قلی کا بیٹا شاہ رُخ میرزا تخت نشین ہوا لیکن وہ بھی کوئی مضبوط حکومت قائم نہ کر سکا آخر ۱۱۷۰ھ میں کریم خان زند نے افشاری عہد کو ختم کر کے زندیہ عہد کی بنیاد رکھی۔ اس عرصے میں قاجاری ترک اس کے خلاف لشکر کشی کرتے رہے لیکن بڑی پامردی سے اُن کے حملوں کو روکا۔ کریم خان زند کا عرصۂ حکومت ۱۱۶۳ھ تا ۱۱۹۳ھ مطابق ۱۷۵۰ء تا ۱۷۷۹ء ہے۔ کریم خان کی وفات پر تقی خان، صادق خان، ابوالفتح علی مراد، اور جعفر ۱۲۰۳ھ مطابق ۱۷۸۹ء تک حکمران رہے۔ آخر میں لطف علی تخت نشین ہوا۔

عہدِ قاچاریہ

لطف علی کے زمانے میں ترکوں کے قبیلہ قاچار نے بہت اقتدار حاصل کیا۔ یہ وہی قبیلہ ہے جس نے صفوی حکمران شاہ اسمٰعیل کو حکومت کے قائم کرنے میں مدد دی تھی۔ نادر شاہ کے زمانے میں یہ قبیلہ کچھ دبا رہا، لیکن جونہی نادر شاہ فوت ہوا، یہ لوگ مازندران کے علاقے پر غالب آگئے، اور جنوبی ایران تک اپنا اقتدار بڑھانے کے لیے کوشش کرنے لگے۔ آخر اس قبیلے کے ایک فرد، آقا محمد خان نے جو ایک مخنث بیان کیا جاتا ہے، لطف علی کے خلاف لشکر کشی کی۔ لطف علی نے راہِ فرار اختیار کی لیکن آخر قاچاری تیغوں نے اُس کا خون بہا کر زندیہ عہد کا خاتمہ کر دیا۔

آقا محمد خان محمد شاہ لقب اختیار کر کے ۱۲۱۱ھ مطابق ۱۷۹۷ء کو تخت نشین ہوا، اور عہدِ قاچاریہ کی بنیاد رکھی۔ لیکن تخت نشینی کے دوسرے ہی سال وہ اپنے ملازموں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

فتح علی شاہ

محمد خان کے بعد اس کا بھتیجا فتح علی شاہ تخت نشین ہوا۔ یہ قاچاری حکمران شعر و ادب کا دلدادہ تھا، خود بھی شعر کہتا تھا۔ خاقان اس کا تخلص تھا۔ اس کے عہد کا اہم واقعہ یہ ہے کہ ایران کا براہِ راست یورپی اقوام سے رابطہ قائم ہوا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس، انگلستان اور روس سے معاہدے ہو گئے، اور ایران کے ساتھ جو اُن کی چپقلش شروع ہو چکی تھی، کچھ عرصے کے لیے ختم ہو گئی۔

محمد شاہ

فتح علی شاہ کی زندگی میں اس کے شہزادہ ولی عہد عباس سوم نے وفات پائی، جس کا اسے بے حد صدمہ تھا۔ آخر بیٹے کے ایک سال بعد ۱۸۳۴ء مطابق ۱۲۵۰ھ میں فتح علی شاہ فوت ہوا، تو عباس سوم کا بیٹا محمد شاہ تخت نشین ہوا۔ محمد شاہ نے اپنے عہد حکومت میں ایران کی داخلی حالت سدھارنے کی انتہائی کوشش کی۔ اس نے روسیوں کی مدد سے ہرات پر حملہ کیا جس کی برطانیہ نے شدید مخالفت کی اور مدافعت کے لیے اپنے افسر بھی بھیجے۔ اس عہد کا ایک اور اہم واقعہ یہ ہے۔ کہ سیاسی اختلافات کی بنا پر شاہ نے اپنے ایک مقتدر وزیر ابوالقاسم قائم مقام کو قتل کر دیا اور اس کی بجائے وزارت کا منصب حاجی میرزا آقاسی کو سونپ دیا۔

محمد شاہ کے عہد میں ایک پر زور مذہبی تحریک چلی جو "تحریک بابیہ" کے نام سے مشہور ہے اس تحریک نے ایران کے علم و ادب کو بھی متاثر کیا اس لیے اس کا قدرے تفصیل سے ذکر کرنا مناسب ہوگا۔

تحریکِ بابیہ

تحریک بابیہ کے بانی سید علی محمد "باب اللہ" کی ولادت یکم محرم ۱۲۳۵ھ مطابق ۱۸۱۹ء ۲۰ اکتوبر کو ہوئی۔ دو سال کی عمر میں یتیم ہو گئے۔ ان کے ماموں سید علی نے انھیں پرورش کیا۔

پندرہ سال کی عمر میں اپنے ماموں کی دکان پر پارچہ فروشی کا کام شروع کیا۔ دیانت داری میں شہرت پائی۔ ۲۵ سال کی عمر میں قائم آل محمد مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔ مشہور عالم شیخ احمد احسائی اور سید کاظم رشتی کے معتقدین، کربلا اور ایران میں اپنے بزرگوں کی تعلیم و تاکید کے مطابق مہدی موعود کا شدید انتظار کر رہے تھے۔ ایک قافلہ ملا حسین بشرویہ کی سرکردگی میں مہدی موعود کی جستجو کے لیے سفر کر رہا تھا شیراز پہنچ کر دروازہ قرآن کے نزدیک سید علی محمد باب سے ملاقات ہوئی۔ ملا حسین بشرویہ سید باب کے ان کے مکان

ہو گئے۔ سیّد باب نے ۵ جمادی الاول ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۴ء غروب آفتاب کے دو گھنٹے بعد ملا حسین بشرویہ کے سامنے اپنے دعویٰ کا اظہار کیا۔ ملا حسین بشرویہ نے تصدیق کی اور "باب الباب" کے لقب سے ملقب ہوئے۔ چند روز میں ۸ انفوس ماننے والے ہو گئے جن کو سید باب نے "حروفِ حی" کا لقب دیا (لفظ حی کے عدد ابجدی حساب سے ۱۸ ہیں) پھر سیّد باب ملا محمد علی قدوس کو اپنے ساتھ لے کر ایام حج میں خانہ کعبہ کو گئے۔ اور واپس آئے۔

حروف حی اور دیگر بابیوں نے ایران میں بڑے جوش و خلوص کے ساتھ نئے مذہب کی اشاعت کی۔ جب نئے مذہب کا چرچا زیادہ ہونے لگا تو اس کے خلاف احتجاج کی صدائیں بلند ہوئیں۔ مجتہدوں نے اس کے خلاف فتوے دیئے بالآخر اس مذہب کا سدِباب کرنے کے لیے منظّم تحریک شروع ہوئی۔ حاکم شیراز نے بابی لوگوں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ قید و بند اور قتل و غارت کا سلسلہ چلنے لگا۔ حکومت نے سیّد علی محمد باب کو شیراز سے اصفہان، وہاں سے قلعہ ماکو آذربائیجان اور وہاں سے قلعہ چہریق میں محبوس رکھا۔ لیکن سیّد باب کی تحریرات اور تبلیغ کا سلسلہ بہر حال جاری رہا۔ چھ سال کی قید کے بعد سید علی محمد باب ۱۲۶۶ھ مطابق ۱۸۵۰ء ۹ جولائی کو تبریز میں گولیوں کا نشانہ بنا دیئے گئے۔

بابی مذہب کے عقائد

بابی مذہب کے بعض عقائد ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

بابیوں کے نزدیک خدا ایک ہے۔ اور باب اس کا آئینہ ہے۔ جس میں خدا کا پرتو نظر آتا ہے۔ ہر مخلص عقیدتمند اس کے ذریعہ خدا کو دیکھ سکتا ہے۔ باب نے اپنے پیروؤں کو یہ تلقین کی کہ اسلام کے بعد اب بابی شریعت گزشتہ شریعت کا ثمر ہے۔ نماز اور روزہ وغیرہ میں کسی قدر تبدیلی کر دی گئی۔ نماز پانچ وقت کی نہیں ہے روزے بھی اُنیس ہیں۔ سال کے اُنیس مہینے اور ہر مہینہ اُنیس دن کا قرار دیا۔ بابیوں کو حکم تھا

کہ ہر انیسویں دن کچھ دوستوں کی دعوت کریں اور اس میں آنے والے ظہور کے انتظار میں شوق و ذوق کا اظہار کریں۔

اٹھارہ اوّلیں معتقدوں کی ایک جمیعت مقرر کی جنہیں حروف حی کا لقب دیا۔ لفظ حی کے عدد ابجدی حساب سے اٹھارہ ہیں۔ اور باب نے خود اپنے آپ کو ان میں شامل کر کے انیس کی تعداد پوری کی تو اس جمیعت کا نام واحد رکھا۔ واحد کے عدد ابجدی حساب سے اُنیس ہیں۔

باب نے منشی اشیاء کا استعمال سخت ممنوع قرار دیا۔ باب کی بڑی تحریرات "البیان" کے نام سے موسوم ہیں۔ اسی طرح کی اور بھی کتابیں ہیں۔ جن میں "قیوم الاسماء" "نبوت خاصہ" "دلائل سبعہ" وغیرہ شامل ہیں۔

نئے مذہب کا جب زیادہ چرچا ہونے لگا تو اس کے خلاف احتجاج کی صدائیں بھی بلند ہوئیں۔ مجتہدوں نے اس کے خلاف فتوے دیئے۔ بالآخر اس مذہب کا سدباب کرنے کے لیے منظم تحریک شروع ہوئی۔ بابی مذہب کے بااثر پیروؤں کو گرفتار کیا جانے لگا۔ باب کو شیراز سے اصفہان بھیج دیا گیا جہاں معتمد الدولہ منوچہر خان کے پاس قیام ہوا جو باب کا معتقد ہو گیا۔ پھر حکومت کے حکم سے باب کو قلعہ ماکو میں نظر بند رکھا گیا اور وہاں سے چہریق لایا گیا۔

جن دنوں باب قلعہ ماکو میں محبوس تھے۔ سرکردہ بابیوں نے مقام بدشت میں ایک مجلس منعقد کی جس کا مقصد یہ تھا کہ بابی مذہب کی ترقی کے لیے مشورہ کیا جائے۔ اور باب کے دعوے کا اعلان عام کیا جائے۔ وہ کانفرنس ہوئی اس میں قرۃ العین طاہرہ بھی شریک تھی جہاں اس نے نہایت پُرزور تقریر کی۔ اور اس کے بعد ایران میں بابی تحریک اور بھی زیادہ زور پکڑ گئی۔ اور حکومت کی طرف سے بابیوں کو گرفتار کرنے کے انتظامات کیے گئے۔ بابیوں نے اپنی حفاظت کے لیے قلعہ شیخ طبرسی کی دیواریں تعمیر کر کے پناہ گاہ بنائی۔ شاہی

فوج نے چڑھائی کر کے بابیوں کو محاصرہ میں لے لیا۔ بابیوں نے بھی اپنی امکانی طاقت سے مدافعت کی۔ اسی معرکہ میں ملّا حسین بشرویہ مردانہ وار مقابلہ کرتا ہوا مارا گیا اور اس لشکر کے بیشتر افراد قتل ہو گئے۔ لیکن خراسان، مازندران اور دوسرے علاقوں میں باب کے عقیدتمند کوچہ بکوچہ ظہور مہدی کا اعلان کرتے تھے۔ اور اکثر معتقد اس نئے مذہب پر پروانہ وار فدا ہوتے رہے۔ ایک بابی نوجوان سلیمان خان قتل ہوا تو یہ شعر اس کی زبان پر تھا ؎

وائے آن عاشق سرگشتہ کہ در پائے حبیب   سر و دستار نداند کہ کدام انداز د

بابی شاعرہ قرۃ العین طاہرہ بھی قتل عام کا شکار ہوئی۔ اس کا یہ شعر اس کی قربانی کی یادگار رہے گا ؎

من و عشق آن مہ خوب رو کہ چو شد صلائے بلا بر د
بنشاط و قہقہہ شد فرو کہ انا الشہید بکربلا

قرۃ العین طاہرہ کو گلا گھونٹ کر مارا گیا۔

بابی لوگوں کو باب نے تاکید کی تھی کہ وہ آنے والے مصلح عالم کا انتظار کریں، جسے باب نے بیانیہ میں حضرت من یظہرہ اللہ کے نام سے یاد کیا (جسے خدا ظاہر کرے گا) بابیوں کو حکم تھا کہ وہ ہر مجلس میں ایک خالی مسند یا کرسی ہر وقت تیار رکھیں کہ آنے والا من یظہرہ اللہ آ جائے تو فوراً ادب و احترام سے اس کو جگہ دیں۔ اور کہا تھا کہ نویں سال وہ تمہیں مل جائے گا۔ اگست ۱۸۵۲ء میں جب ایک نادان بابی نے ناصر الدین شاہ ایران پر بندوق سے فائر کیا اور وہ گرفتار کر لیا گیا تو بابیوں کو سخت اذیت اٹھانی پڑی اور اس اشتباہ میں کہ شاید حسین علی بہاء اللہ کا اشارہ بھی اس کام میں دخل رکھتا ہو۔ انہیں بھی گرفتار کر لیا گیا اور بعد میں بے گناہ ثابت ہونے پر ان کو رہا کر دیا گیا۔

اس سلسلے میں جب بہاء اللہ کو طہران کے قید خانہ سیاہ چال میں رکھا گیا تھا اٹھارہ بابی اور بھی ان کے ساتھ قید کئے گئے تھے۔ اسی حالت میں بہاء اللہ نے اپنے من یظہرہ اللہ

ہونے کا اظہار کیا تھا۔ اور یہاں سے نکلنے کے بعد ۱۸۶۳ء میں بمقام باغ رضوان بغداد اپنے دعوے کا اعلان کیا۔ ایران اور ترکی حکومت کے مشورے سے بہاء اللہ کو بغداد سے ایک فوجی دستہ کے ساتھ قسطنطنیہ اور وہاں سے ایڈریانوپل اور وہاں سے عکا فلسطین میں بھیج دیا اور قید و نظر بند رکھا۔ قسطنطنیہ اور ایڈریانوپل اور عکا سے بہاء اللہ نے بادشاہان عالم کے نام اپنی الواح و تحریرات کے ذریعے پیغامات دیئے جن میں عالمگیر امن و صلح ملکوں اور قوموں میں مساوات و عدل کی تاکیدات ہیں۔ بہائی مذہب کے پیروؤں نے ایشیا یورپ اور امریکہ میں پھیل کر جوش و خروش سے تبلیغ جاری کر دی۔

میرزا یحییٰ صبح ازل نے بہائی دعوت کو قبول نہ کیا۔ بعض بابی اس کے ساتھ ہو گئے۔ لیکن اب اس کی جماعت ختم ہو چکی ہے۔

بہائی مذہب کے عقائد

بہاء اللہ عالمی امن کے حامی تھے۔ ان کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی کو تکلیف نہ دو۔ بنی نوع انسان سے ہمدردی کرو۔ بیماروں کا دکھ درد بٹاؤ۔ انکسار اور فروتنی کی زندگی بسر کرو۔ سب قوموں اور حکومتوں میں امن و صلح قائم رکھو۔ سب دینوں کی بنیاد ایک ہے۔ دین کو لڑائی جھگڑے کا سبب نہ بناؤ۔ دین اور علم و عقل میں باہم مطابقت قائم کرو۔ عورت اور مرد کے حقوق زندگی میں مساوات ہونی چاہیے۔ تعدد ازدواج کی مخالفت ہے۔ ہر لڑکے اور لڑکی کی تعلیم فرض قطعی ہے۔ مذہبی تعصب قومی تعصب وطنی تعصب رنگ و نسل اور زبان کا تعصب ہرگز نہ ہونا چاہیے۔

۱۸۹۲ء ۲۸ مئی کو ۷۵ سال کی عمر میں بہاء اللہ نے اس دنیا سے رحلت کی۔ اپنی وصیت کی کتاب "عہدی" میں اپنے بڑے بیٹے عبدالبہاء عباس کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اس طرح عبدالبہاء بہائی جماعت کے پیشوا مقرر ہوئے۔

عبدالبہاء کے مختصر حالات

عبدالبہاء ۲۳ مئی ۱۸۴۴ء مطابق

۵ جمادی الاول ۱۲۶۰ھ عین اس وقت پیدا ہوئے۔ جب سید باب نے اپنے ظہور کا اعلان کیا تھا۔ آٹھ برس سے اپنے والد کے ساتھ قید و بند اور جلاوطنی کے مصائب میں شریک رہے۔ اور جب بہاء اللہ نے اپنے ظہور کا اعلان کیا۔ تو سب سے پہلے عبدالبہاء نے لبیک کہا۔ تمام جوانی بہائی مقاصد کی خدمت اور ترویج میں گزاری۔ سولہ برس کی عمر میں حدیث کُنتُ کنزاً مخفیاً کے معانی اور اسرار پر کتاب لکھی اور بیشمار خطوط اور بیانات بہائی تعلیمات کی توضیح و تشریح میں تحریر کیے۔ ایران سے بغداد، بغداد سے قسطنطنیہ اڈریانوپل اور وہاں سے عکاء اپنے والد کے ساتھ رہ کر خدمات ادا کرتے رہے۔ ہر قسم کی مشکلات برداشت کیں۔ ۲۹ سال بہائی جماعت کی قیادت کامیابی سے کی۔ ۱۹۰۴ء اور ۱۹۰۷ء میں بعض مخالفین نے ترکی سلطنت کو عبدالبہاء کے خلاف رپورٹ پہنچائی۔ ایک تحقیقاتی کمیشن ترکی آیا نتیجۃً شکایات غلط ثابت ہوئیں۔ اور ستمبر ۱۹۰۸ء میں عبدالبہاء کو آزادی ملی۔ آزادی کے بعد مغربی دنیا کے بہائیوں کے اصرار پر عبدالبہاء ۱۹۱۱ء میں ممالک مغربی کے سفر پر روانہ ہوئے۔ ستمبر ۱۹۱۱ء کے شروع میں لندن پہنچے اور وہاں سے پیرس۔ دسمبر میں مصر ہوتے ہوئے عکا واپس پہنچے۔ پھر امریکن بہائیوں کی درخواستوں پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں پہنچے۔ مختلف شہروں میں مختلف اقوام و مذاہب کے گرجاؤں کالجوں وغیرہ میں لیکچر دیئے جن کے زیر اثر ان ممالک میں بہائیوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۱۳ء کو واپس حیفا پہنچ گئے۔ ۲۷ اپریل ۱۹۲۰ء کو گورنمنٹ برطانیہ نے آپ کو سر کا خطاب دیا۔ ۲۸ نومبر ۱۹۲۱ء کو عبدالبہاء دنیا سے رحلت کر گئے۔ عبدالبہاء کے زمانہ میں بہائی مذہب اور بھی زیادہ ترقی کر کے متعدد ملکوں میں پھیل گیا۔

شوقی آفندی عبدالبہاء اپنے وصیت نامے میں شوقی آفندی ربانی کو اپنا جانشین مقرر کر گئے تھے۔ یہ عبدالبہاء کے نواسے

تھے کیمبرج یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے۔ انگریزی عربی فارسی اور بعض دیگر زبانوں کے بھی ماہر تھے۔ عبدالبہاء کے بعد چھتیس برس تک شب و روز مصروف خدمت رہتے شوقی آفندی نے انگریزی عربی فارسی میں متعدد اور ضخیم کتابیں بھی لکھی ہیں۔ بہائی جماعت کی مضبوطی اور انتظامی تشکیلات کو منظم کیا۔ اپنی زندگی میں ۲۷ ستائیس قابل ترین اشخاص کو دنیا کے مختلف ملکوں سے انتخاب کر کے "ادارہ ایادی امر اللہ" کے نام سے منظم کیا۔ اور جماعت کی حفاظت و تنظیم، تبلیغ و نشر و اشاعت اور عالمی خدمت ان کے سپرد کی اور حکم دیا کہ "بیت العدل اعظم" جلد قائم کیا جائے چنانچہ دنیا بھر کے بہائیوں نے ۱۹۶۳ء میں بیت العدل اعظم اپنے مرکز حیفا میں قائم کر دیا ہے۔ جس کے ماتحت تمام ملکوں کی بہائی نیشنل اور لوکل اسمبلیز کام کر رہی ہیں نومبر ۱۹۵۳ء میں لندن میں شوقی آفندی کی رحلت ہوئی اور وہیں ان کا مزار ہے ۱۹۵۷ء میں ایک بہائی عالمی کانفرنس لندن میں ہوئی۔

پاکستان میں بھی ہر بڑے شہر میں بہائی روحانی اسمبلی موجود ہے جن کے اوپر بہائی نیشنل اسمبلی کراچی میں ہے۔

بہاء اللہ کی تصنیفات :- بہاء اللہ نے ذیل کی کتابیں تصنیف کی ہیں:۔ کتاب الاقدس، کتاب الایقان، طرازات، کلمۃ الفردوسیہ، اشراقات، تجلیات، کلمات المکنون اور النور الابہے، ششش الواح۔

ناصر الدین شاہ

محمد شاہ کے بعد اس کا بیٹا ناصر الدین شاہ ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۴۸ء میں سولہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اس نے تقریباً نصف صدی تک حکومت کی۔ اس طویل عرصے میں اس نے ایران کی فلاح و بہبود کی بہت سرگرم کوشش کی۔ اس عہد کے اہم واقعات مختصراً یہ ہیں کہ محمد شاہ نے روس کے ساتھ دوستانہ مراسم پیدا کیے، افغانستان پر لشکر کشی کی اور ہرات

فتح کرلیا۔ انگریزوں کو یہ بات ناگوار گزری۔ بالآخر ہند کے گورنر جنرل نے ایران کے خلاف اعلانِ جنگ کرکے برطانوی لشکر خلیج فارس کے کنارے اتار دیا۔ روس ایران کی مدد نہ کرسکا اور ناصر الدین کو شکست ہوگئی۔ آخر اہلِ ایران اور انگریزوں کے مابین معاہدہ طے پایا، جس کی رو سے برطانیہ کو خاص اقتصادی مراعات حاصل ہوگئیں۔ چنانچہ ایران سے خام پیداوار لے جانے کے لیے وہاں سڑکیں اور ریلیں بنوائیں، اور تار کا سلسلہ قائم کیا۔ حاجی مرزا آقاسی کو وزارت سے معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ مرزا تقی خان کو یہ منصب سونپا گیا۔ بابیوں کا قتلِ عام مرزا تقی خان ہی کے حکم سے ہوا تھا۔ ناصر الدین تخت نشینی کی پچاسویں سالگرہ منانے والا تھا کہ جمال الدین افغانی کے پیرو مرزا رضا کرمانی نے سنہ ۱۳۰۳ھ مطابق سنہ ۱۸۹۶ء میں گولی مار کر اسے ہلاک کر دیا۔

مظفر الدین ناصر الدین کے بعد اس کا بیٹا مظفر الدین تخت نشین ہوا۔ اس کا عرصہ حکومت گیارہ سال ہے۔ اس عہد کا اہم واقعہ یہ ہے۔ کہ جمہوریت کی تحریک "مشروطہ" کے نام سے چلی اور بادشاہ کی نگرانی میں پہلی ذمہ دار حکومت کے لیے پارلیمنٹ مقرر ہوئی۔

محمد علی شاہ مظفر الدین کے عہدِ حکومت میں تحریک مشروطہ نے فروغ پایا۔ برطانیہ نے ایران کی تحریک مشروطہ کی پُرزور حمایت کی۔ روسی اس تحریک کے مخالف تھے۔ محمد علی شاہ بھی اس تحریک کو مطلق العنانیت پر ضرب کاری سمجھتا تھا، چنانچہ وہ روسیوں کی مدد کے بھروسے پر "مشروطیت" کے حامیوں کے خلاف قدم اٹھانے پر آمادہ ہو گیا۔ سنہ ۱۳۲۶ھ مطابق سنہ ۱۹۰۵ء میں ایرانی قازقوں کے لشکر نے ایک روسی جرنیل کی سرکردگی میں پارلیمنٹ کی عمارت پر بمباری کی جس سے بہت نقصان ہوا۔ بادشاہ نے بالآخر پارلیمنٹ کو موقوف کردیا۔ اُدھر انقلابیوں نے رشت اور اصفہان میں بختیاریوں کی فوج تیار کی۔ انھوں نے طہران پر حملہ کردیا۔ ایرانی قازقوں کے لشکر کو شکست ہوئی۔ اور انقلابی شہر میں داخل ہوگئے۔ محمد علی شاہ نے روسی سفارت خانے میں پناہ لی، اور بالآخر

اُسے روس پہنچا دیا گیا۔ اس عرصے میں معزول شدہ پارلیمنٹ پھر بحال ہوگئی، اور پارلیمنٹ کے ممبروں نے محمد علی شاہ کے گیارہ سالہ بیٹے احمد شاہ کو ایران کا بادشاہ تسلیم کیا۔ یہ قاچاری دَور کا آخری بادشاہ تھا۔ احمد شاہ کی حکومت بہت کمزور تھی۔ اور بین الاقوامی سیاست کا اکھاڑہ بن چکی تھی۔ بالآخر اس حکومت کا چراغ رضا شاہ پہلوی کے ہاتھوں ۱۹۲۱ء میں گل ہُوا۔ اور نئی پہلوی حکومت قائم ہوئی۔

عہدِ قاچاریہ کے شعرا

سبکِ قدیم کا احیا جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے تیموری اور صفوی عہد میں ایک نیا سبکِ شعر وجود میں آیا۔ جسے "سبکِ ہندی" کا نام دیا گیا ہے۔ خیال بندی اور مضمون آفرینی اس سبک کا خاصہ ہے۔ شاہ حسین بایقرا اس کا بہت بڑا حامی تھا۔ پاک و ہند کے مغل حکمران بھی ایسے اشعار کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ جن میں خیالات کا تارِ عنکبوت بکھرا ہوتا تھا۔ لیکن یہ سبکِ شعر ایرانیوں کے مزاج کے موافق نہ تھا۔ اس لیے بارھویں صدی ہجری کے اواخر میں اس سبکِ شعر کے خلاف ردِ عمل شروع ہوا۔ اس کا ایک تقاضہ یہ تھا کہ ایرانی شعرا میدانِ ادب میں قدم آگے بڑھا کر شعر و فکر کا کوئی نیا اسلوب قائم کرتے، لیکن ایسا نہ ہو سکا، البتہ انھوں نے کلام میں سادگی پیدا کرنے کے لیے فرخی اور منوچہری کی طرف رجوع کیا، اور اس سبکِ قدیم کو زندہ کرنے کی کوشش کی، جو صدیوں تک اہلِ ذوق سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا تھا۔ شعرا کی اس رجعت کو دیکھ کر علامہ شبلی نعمانی کو کہنا پڑا کہ رودکی سے فارسی شاعری کا آغاز ہوا۔ اور صائب پر فارسی شاعری ختم ہوگئی۔ عہدِ قاچار میں قاآنی ایسے نامور شاعر تو ہوئے، لیکن وہ متقدمین کی تقلید سے آگے قدم نہ بڑھا سکے۔

قدیم شاعری کی طرف رجوع کرنے کو اہل ایران "نئی ادبی تحریک" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ تحریک نئی ہو یا پرانی، اس سے یہ ضرور ہوا کہ نظم و نثر فارسی میں چوتھی صدی کی سی روانی آگئی۔ اور ایک مرتبہ پھر فارسی ادب نے اپنا اصلی رنگ و روپ اختیار کر لیا۔ اس تحریک کی حوصلہ افزائی فتح علی شاہ قاچار نے کی۔ محمد شاہ اور ناصر الدین بھی زبان کی سادگی کے شیدائی تھے، اس لیے ان کے زمانے میں اس تحریک نے اور بھی ترقی پائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شعرا اور ادبا کی کوششوں سے فارسی ادب چنگیزی، ایلخانی اور صفوی اثرات سے پاک ہو گیا۔

یہ تحریک اصفہان میں شروع ہوئی۔ اور وہیں سے اس کے اثرات طول و عرض ایران میں پھیلے۔ سبک قدیم کی طرف لوٹنے والوں کے سر آمد حسب ذیل ہیں مرزا محمد اصفہانی، عاشق اصفہانی، رفیق اصفہانی۔ میر محمد شعلہ، سید علی مشتاق، لطف اللہ آذر، ہاتف، صباحی، بیدگل قابل ذکر ہیں۔ قاچاری عہد میں سبک قدیم یعنی سبک خراسانی کی پیروی کرنے والوں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ ان شعرا کے کلام میں وہی خصوصیات نظر آتی ہیں۔ جو متقدمین کے کلام کا خاصہ ہیں۔ یعنی ان کا کلام سادہ اور رواں ہے۔ تشبیہات قدرتی اور ذہن انسانی سے قریب تر ہیں۔ ان کے مضامین بھی سبک قدیم ایسے ہیں۔ نئے دور کے جو شعرا زمانے کے حالات سے متاثر ہوئے، ان کے کلام میں البتہ داخلیت اور ذاتیت بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ عہد قاچار کے بعض اساتذہ فن کا مختصر سا ذکر کیا جاتا ہے۔

فتح علی صبا

فتح علی صبا قاچاری دور کے ان اولیں شعرا میں سے ہیں جنھوں نے متقدمین کے انداز میں سخن سرائی کر کے سبک قدیم کا احیا کیا۔

صبا کاشان کے ایک مشہور خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس کے اکثر افراد قاچار کے ذمے دار عہدوں پر فائز تھے، آپ کی ابتدائی تعلیم کاشان میں ہوئی، شعر گوئی میں حاجی سلیمان بیگ کاشانی سے تلمذ تھا۔ صبا ۱۲۱۱ھ مطابق ۱۷۹۶ء

کاشان سے چل کر تہران آئے۔ یہاں انھیں شعر و شاعری کی بدولت کافی شہرت حاصل ہوئی۔ فتح علی شاہ کے جشنِ سالگرہ کی تقریب میں صبا نے ایک قصیدہ پڑھا جس سے بادشاہ بہت خوش ہوا اور انھیں ندیمانِ خاص میں شامل کر لیا۔ اس قصیدے کے چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

بیال ای تخت اسکندر بناز ای مسند دارا
کہ شد اسکندر دیگر بدارای سر بر آرا

زمانرا شاہ دریا دل زمین را خسرو عادل
زمان بر عہد او مائل زمین بر مہد او شیدا

بہ تختِ آسمان رفتش براوج آسمان تختش
براست از آسمان بخش کہ آن پیر ست وین برنا

صبا کو دربارِ قاچار میں روز بروز زیادہ قرب حاصل ہوتا گیا، یہاں تک کہ وہ ملک الشعراء کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ صبا کو یہ منصب بھی حاصل ہوا کہ دارالسلطنت میں آنے والے شعرا کی رہنمائی کریں۔ اور انھیں شاہ کے حضور میں پیش کریں۔

۱۲۱۸ھ بمطابق ۱۸۰۳ء میں صبا کو قم اور کاشان کا گورنر بنا کر بھیجا گیا یہاں وہ اپنی حکومت کی ذمے داریوں سے بڑی کامیابی سے عہدہ برآ ہوئے۔ ۱۲۲۲ھ بمطابق ۱۸۰۷ء میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے خشک سالی کے آثار پیدا ہو گئے، جس سے اہل قم سخت پریشان تھے۔ صبا نے حتی المقدور غلہ کی فراہمی میں بڑی جد و جہد کی جس سے قحط کا خدشہ جاتا رہا۔ اس اثنا میں صبا بیمار ہو گئے۔ بیماری نے شدت اختیار کی، تو آپ نے شاہ کی خدمت میں ایک عریضہ لکھ کر بھیجا، جس میں اہل قم کی پریشانی اور اپنی حالت زار کا نقشہ کھینچا اور خواہش ظاہر کی کہ انھیں تہران واپس بلا لیا جائے۔ چند شعر ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

بشہر قم کہ مبادا ز حادثات خراب
بہر خراب غریبی فتادہ در تب و تاب

درین دیار شدم من قرین مرگ ز رنج — جدا ز یاری یاران و صحبت اصحاب
گہی ز تابش تب، چون حریق در آتش — گہی ز ریزش خوی چون غریق در گرداب
گمر ز رنج تن و ناتوانی جانم — خبر رساند حبیب مرا یکی ز احباب
از آن سبب کہ بمن مویہ کرد موی کنان — کشاد بستہ بہا دہ رنگ ما لعقاب
کہ از حضور شہنشاہ آسمان اورنگ — چرا طلب نکنی در رہ خویش را جلاب

بادشاہ نے صبا کا یہ قصیدہ پڑھ کر انھیں تہران واپس بُلا لیا۔

۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۷ء میں خراسان میں خشک سالی کی وجہ سے نہایت شدید قحط پڑا۔ شاہ اہلِ خراسان کی پریشان حالی سے بہت متاثر ہُوا، اور اُن کی مدد کے لیے صبا کے ہاتھ ایک لاکھ طلائی اشرفیاں بھیجیں۔ صبا یہ رقم مستحق لوگوں میں بانٹ کر واپس تہران آ گیا۔ اس سفر میں اس نے ایک فصیح و بلیغ قصیدہ کہا، جس کے چند شعر حسب ذیل ہیں۔

بروزگار بلند آسمان جاہ و جلال
کہ باد جاہ و جلالش مصوّن ز عین کمال

تقاطنین خراسان ز قحط، خون حرام
بحکم شرع ز بیم ہلاک گشت حلال

شکستہ حالی شان را بصد ہزار درست
ز زر دیدہی از گنج خسرو مفضال

بیک اشارت جان بخش مومیائی داد
زہی عظیم کرامت، زہی بزرگ نوال

از آن بگاہ دی از بہی رعاہا یاگنج
بسوی ملک خراسان ز خسرو بذال

ملم ز بعد مسالک چو کاہ از صرصر

تحم ز قرب مہالک چو کوہ از زلزال

اس سفر کے بعد صبا فتح علی شاہ کے ندیم خاص کی حیثیت میں اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ اکثر شعرا و ادبا جو شاہ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتے تھے، ان سے بڑی شفقت سے پیش آتے اور اُن کی رہنمائی کرتے۔ اکثر ہم عصر شعرا بڑی عزت و احترام سے آپ کو یاد کرتے تھے۔

اسلُوب بیان جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے، صبا نے قصائد میں متقدمین کی پیروی کی ہے۔ آپ کے قصائد میں وہی سادگی اور روانی ہے جو سبک خراسانی کا خاصہ ہے۔ صبا کو عربی زبان سے بہت شغف تھا، اس لیے عربی الفاظ و کلمات بھی آپ کے قصیدوں میں بکثرت ہیں۔ اکثر قصیدے انوری کی یاد دلاتے ہیں۔ بعض قصیدوں میں فرخی اور منوچہری کی بھی تقلید کی ہے۔ ذیل کے قصیدے میں فرخی کا انداز پایا جاتا ہے۔

تعالی اللہ خداوند جہان دارا جہان آرا

کز و شد آشکارا گل ز خارا و گوہر از خارا

منوچہری کے انداز میں ایک قصیدہ کہا ہے جس کا مطلع حسب ذیل ہے۔

چو کرد این لالہ سوی برہ آہنگ

شد آذر گون ز آذریون لب زنگ

میرزا عبدالوہاب نشاط میرزا عبدالوہاب نشاط اصفہان کے ایک معزز سادات کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۱۷۵ھ مطابق ۱۷۶۱ء میں پیدا ہوئے۔ علوم طبیعی، ریاضی اور السنہ میں منتہی کا درجہ حاصل کیا۔ خوش خطی اور شعر و شاعری سے آپ کو فطری مناسبت تھی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد

ملکی سیاسیات میں حصہ لیتے رہے آپ کا شمار بزرگ ترین ادبا اور شعرا میں ہوتا تھا۔

انجمن ادبی

سبک قدیم کو از سر نو زندہ کرنے کی جو ادبی تحریک چلی، اس کے آپ بڑے سرگرم حامی تھے، چنانچہ اس غرض کے لیے ایک انجمن ادبی قائم کی جو مشتاق ؔ کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس انجمن کے ہفتہ وار اجلاس ہوتے تھے اصفہان کے نامور ادیب اور اکثر شائقین علم وادب ان میں شامل ہوتے تھے۔ شعرا اپنا کلام سناتے تھے۔ ان پر تنقیدیں ہوتی تھیں۔ مبتدی ادیبوں کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ گویا اس انجمن کی سرگرمیوں سے نئی ادبی تحریک کو اور زیادہ تقویت ملی۔

طریقِ درویشی

نشاط ایک خوش حال گھرانے کے فرد تھے۔ طبعاً فیاض تھے۔ اس لیے اکثر حاجت مند آپ کے پاس آتے رہتے تھے۔ حاجت مندوں کی دست گیری کی وجہ سے اکثر مقروض رہتے تھے۔ ذیل کے شعر میں اسی کیفیت کا اظہار کیا ہے۔

بزمین برد فرد خجلت محتاجانم   بی زری کرد بمن آنچہ بہ قارون زر کرد

آپ کو تصوف وعرفان میں بھی بڑا شغف تھا، چنانچہ کئی سال راہِ طریقت میں مجاہدہ کیا اور عشقِ حقیقی میں مستغرق رہے، اور یہاں تک نوبت پہنچی ؎

تن خستہ، دل شکستہ، نظر بستہ، لب خموش

ای عشق کار ما ہمہ بر مدعای توست

قیامِ تہران

آپ کے علم وفضل کی شہرت دار السلطنت تہران پہنچی، تو فتح علی شاہ نے آپ کو تہران آنے کی دعوت دی۔ آپ ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء میں تہران آئے، اور مصاحبین دربار میں شامل ہوگئے۔ کچھ عرصے بعد آپ کو دیوان رسالت سپرد کر دیا گیا۔ چنانچہ خارجی ممالک کے تاجداروں کو جو خطوط بھیجے جاتے تھے، اکثر نشاط ہی کی انشا کا نتیجہ ہوتے تھے۔ نپولین کے نام جو تاریخی خط فتح علی شاہ

نے بھیجا تھا، نشاط ہی کا لکھا ہوا تھا۔ فتح علی شاہ نے جب اپنا ایک وفد نپولین کے پاس بھیجا، تو نشاط بھی اس کا ایک رُکن تھا۔ ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۷ء میں حاکم خراسان کے خلاف اہلِ غور نے بنیاد خان کی سرکردگی میں بغاوت کی، تو اُن کی بغاوت کو فرو کرنے کے لیے جن اُمراء کو لشکر کے ساتھ بھیجا گیا، ان میں نشاط بھی تھا۔ بنیاد خان کیساتھ جنگ کرتے ہوئے نشاطؔ اسیر ہو گیا۔ اسیری کے دوران اس نے بنیاد خان کو آمادہ کر لیا کہ حاکم خراسان سے مصالحت کرے، وہ بھی کسی طویل جنگ کی قدرت نہ رکھتا تھا، اِس لیے اس نے نشاطؔ کا مشورہ قبول کر لیا، اور حاکم خراسان کو عریضہ لکھ کر معذرت چاہی۔ بالآخر نشاطؔ کے حسنِ تدبیر سے غوریوں کا فتنہ فرو ہو گیا۔

۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۲۸ء میں نشاط بعارضہ سل مبتلا ہو کر راہیٔ ملک بقا ہوا۔

نشاط کی نظم و نثر

نشاطؔ کی علمی یادگار "گنجینہ" ہے، جو نظم و نثر پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ناصر الدین شاہ قاچار کے حکم سے ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ء میں مرتب ہوئی تھی۔ نثر میں بعض مراسلے، شاہی فرمان، مقالات، حکایات، پند و حکمت کے قطعات، قصائد اور غزلیات شامل ہیں۔ آپ کے مراسلے اور فرامین اُس زمانے کی انشاء پردازی کا عمدہ نمونہ ہیں۔ آپ کی نثر تاتاری دور کی نثر سے نسبتاً سہل اور سادہ ہے۔ اگرچہ موجود زمانے کی نثر کی نسبت قدرے پر تکلف ہے۔ آپ کی ملی جلی نظم و نثر کا ایک نمونہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

"خوابم ربودہ بود خیالی زدیدہ دوش
کآمد خروش بلبلی از گلشنم بگوش
از کار شد روانم و از دست شد توان
از دل برفت صبرم و از سر برفت ہوش
ہمانا یکی از دوستان کہ پاس وقت من داشتی، این حالتش شگفت آمدہ، گفت، بلبلی را

بشاخ گل خروشی است، ترا چه افتاده که چنین مدہوشی۔ گفتم اخموش باش نه در گلستان آن گل که بلبلان را بخروش آوردگی است۔ اگر عشق گل فغان آور بلبلان است۔ چاک گریبان گل از دست کیست؟ یا که پریشانی سنبل از چیست؟ و اگر نوای فاختہ در ہوای سرو جوان است۔ سرو را بیقراری از کجا است، اگر بچشم حقیقت بنگری، طریق غفلت نسپری۔

جملہ را آشفتگی از یار او ست	دوستی می جوئی می گویند دوست

اسلوب شعر

نظم میں چند قصیدے، ترکیب بند اور مثنویاں، تقریباً ۲۵۰ غزلیات اور پچاس رباعیاں نشاط کی یادگار ہیں۔ غزلیات خاص طور سے بہت اہم ہیں۔ اکثر غزلوں میں تصوف و عرفان کا رنگ جھلکتا ہے۔ غزلیات میں آپ سبک عراقی کے پیرو ہیں۔ آپ کے کلام میں فکر و عشق کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ اس لحاظ سے نشاط نے سعدی اور حافظ کے سبک کی تقلید کی ہے۔ ذیل کی غزل سعدی کی ایک غزل کی یاد دلاتی ہے، جس کے مطلعے کا ایک مصرعہ حسب ذیل ہے۔

"مشنوای دوست که غیر تو مرا یاری ہست"

زاہدا در دہ نہ ہر خانہ خماری ہست	وجہ می ار نرسد خرقہ و دستاری ہست
در تفحص بی سببی نیست ازین رہ که طبیب	گزرد بر سر آن کوچه که بیماری ہست
می رسد یار و بیماران نگرانست ولی	ہمہ دانند که پنہان بہ نش کاری ہست
غم گرفتہ است فرد مجلس میخواران را	مگر امروز درین میکدہ ہشیاری ہست
گل فردوس نگیرد ز کف جور کسی	که درین بادیہ اش قسمتی از خاری ہست
شاید از بہر کوئی تو بود جای نشاط	بلبلی مست بہر خانہ که گلزاری ہست

نشاط کی اکثر غزلیں حافظ کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہیں، ایک غزل ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

این نکویان که بلای دل اہل نظر ند	دشمن جان و دل و از دل و جان خوبتر اند

عاشقان را توان داد دل غمزہ داد ورنہ خوبان نہ ستم پیشہ نہ بیداد گرند
پاک کن دل ز ہر آلائش و آنگہ بدر آی کہ مقیمان در میکدہ صاحب نظرند
پای بر فرق جہانِ سر بکف پای حبیب تا نگوئی تو کہ این طائفہ بی پا و سرند
غم کاریت بیاید کہ دران شادی تست ورنہ شادی و غم کار جہان در گذرند
خط بگرد رخش آید بشبیخون دلی عاشقان بی خبر از فتنہ دور قمراند
من و باد سحر از بوئ تو سرگشتہ ہمین باہمہ شیفتگان تو چنین در بدرند
خبر از ہستی خود خلق چہ جویند نشاط آب و آئینہ نہ در خورد خبر از صور اند

میرزا شفیع وصال

میرزا شفیع وصال سنہ ۱۱۹۳ھ مطابق سنہ ۱۷۷۹ء میں شیراز میں پیدا ہوئے۔ یہیں علوم متداولہ کی تعلیم پائی۔ فنِ خطاطی میں آپ کو بڑی مہارت تھی۔ خطاطی کے علاوہ موسیقی سے بھی بہت شغف تھا۔ چنانچہ اپنا کلام گا کر سنایا کرتے تھے۔

میرزا بہت خوش آواز، خوش گفتار، خوش خط اور نستعلیق قسم کے آدمی تھے اس لیے اہلِ شیراز انھیں شمع محفل سمجھتے تھے۔

وصال نے نئی ادبی تحریک کو مقبول بنانے میں بہت جد و جہد کی۔ انھوں نے متقدمین کی پیروی کرتے ہوئے سادہ گوئی کو اپنا شعار بنایا، اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کی۔

وصال کا فطری میلان تصوف کی طرف تھا، چنانچہ صوفیائے کرام کی کتابیں اکثر آپ کے زیرِ مطالعہ رہتی تھیں۔ آپ نے اس زمانے کے ایک بزرگ صوفی میرزا ابوالقاسم سکوت کے ہاتھ پر بیعت بھی کی، اکثر وقت شیراز کی خانقاہ میں گزارتے تھے، جہاں میرزا ابوالقاسم مقیم تھے۔ ایک دن وصال حسبِ معمول خانقاہ میں آئے، لیکن جب وہاں سے اٹھے، تو ان پر وجد و حال کی کیفیت طاری تھی۔ وہ شخص، جس نے متانت کا

دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا تھا، رقص کرتا ہوا خانقاہ سے نکلا۔ حالت وجد ہی میں شہر میں داخل ہوا۔ اور اسی حالت میں بالآخر گھر پہنچا۔ لوگ حیران ہو ہو کر اسے دیکھتے تو وہ سعدی[1] علیہ الرحمۃ کا یہ شعر پڑھ دیتا۔

ندانی کہ شوریدہ حالان مست | چرا بر فشانند در رقص دست
کشاید دری بر دل از واردات | فشاند سر دست بر کائنات

وصال نے بھی نشاط کی طرح ایک علمی اور ادبی محفل قائم کی جس میں شعراء اور ارباب حال شامل ہوتے تھے۔ شعر اشعر پڑھتے تھے، انھیں داد بھی ملتی تھی اور ان پر تنقید بھی ہوتی تھی۔

شاہ ایران فتح علی شاہ کو جب شیراز آنے کا اتفاق ہوا، تو یہاں وصال کے علم و فضل کا چرچا سن کر انھیں دربار میں بلایا۔ وصال نے کلام مجید کا ایک نسخہ جو انھوں نے سات مختلف خطوں میں لکھا تھا، پیش کیا۔ اور ایک قصیدہ بھی پڑھا جس کے چند شعر یہ ہیں۔

ای ملک جم ببال کہ شاہ عجم رسید
دارای افسر کی و اورنگ جم رسید

باغ نشاط را خطر مہرگان گزشت
روزی امید را نفس صبحدم رسید

ای پارس گرچہ سایۂ شہ داشت حرمت
خوش باش خوش کہ سایۂ یزدانت ہم رسید

ای ملک در سپاس شو از مقدم ملک
کت فخر ہا بچرخ برین زین قدم رسید

خاقان عہد فتح علی شہ کہ مہر و ماہ
در موکبش بجای عبید و خدم رسید

---

[1] ۱۔ نہضت ادبی ایران ابراہیم صفائی، ص ۳۵

لکن خسروی کہ چین ز جبین شست آز را
تا چین سکۂ اسمش بجبین درم رسید

تا بعد اوست نوبت دور ستم گذشت
تا عہد اوست دورہ عہد کرم رسید

بادشاہ آپ کے علم وفضل سے بہت متاثر ہوا۔ اور دو ہزار تومان بطور انعام دیے۔ اور حکم دیا کہ انھیں ایک سو چالیس تومان اور پچاس خروار گندم سالانہ دیے جائیں۔

وصال آخری عمر میں حاسدوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے بہت پریشان رہے۔ انھیں یہ گلہ بھی تھا کہ اہل شیراز نے ان کی قدر نہیں کی۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

چہ شد پارس کاہل وفای ندارد	ہا منہ دل بہ آن کاشنائی ندارد
مروگر توی اہل دانش در آنجا	کہ کالای دانش بہائی ندارد
ہمرنگ یہ پوئی کہ مردی نہ بینی	وحشی نیز اہل وہای ندارد
ز شیراز ما تخم انسان نروید	بلی ہر زمین ہر گیائی ندارد
بجز خود پرستی ہوسوی نزاید	بجز شور بختی گدائی ندارد

وصال کے ممدوحین

وصال نے فتح علی شاہ قاچار، محمد شاہ قاچار، شجاع السلطنت، میرزا ابو القاسم سکوت، حاجی میرزا آقاسی وغیرہم کے متعدد قصیدے لکھے ہیں۔ آپ[1] نے دکن کے وزیر چندو لال صاحب اختیار کو بھی ایک قصیدہ لکھ کر بھیجا جس پر انھیں کثیر رقم بطور انعام کے ملی۔

دیوان

آپ کا دیوان قصائد، غزلیات، مرثیوں اور مثنویوں پر مشتمل ہے۔

اسلوبِ نگارش

قاچاری دور کے جن شعرا نے متقدمین کی پیروی کرتے ہوئے سبکِ قدیم کے احیا میں مدد دی، ان میں وصال کو بڑی خصوصیت حاصل ہے۔

---

[1] نہضت ادبی ایران ابراہیم صفائی۔ ص ۴۰

وصال کے کلام میں سادگی اور روانی پائی جاتی ہے۔ بندشِ الفاظ بھی سبک خراسانی کی سی ہے۔ نمونے کے طور پر ذیل میں ایک غزل پیش کی جاتی ہے۔

ایزد آنگونہ کہ می خواست بیاراست ترا
چون نخواہم منت ای مہ کہ خدا خواست ترا

ہرچہ کردند نظر انس چنان پندارند
کاین ہمہ دلبری از چہرہ دلآراست ترا

روی زیبا ہمہ دارند چرا دل بزند
دلبری ہای تو از معنی زیباست ترا

آخر ای کعبۂ مقصود یکی رخ بنمای
کہ ز ہر گوشہ دو صد مرحلہ پیماست ترا

غمزہ بی باک و نگہ کافر و مژگان خونریز
پی قتلم ہمہ اسباب مہیاست ترا

گر من عاشق بیدل ز غمت جان بدہم
تو کہ معشوقی و دلدار چہ پرواست ترا

با تو چون آئینہ ما پاکدلی ہا داریم
بنگر از آئینۂ خویش کہ پیداست ترا

نکنی یاد وصال و ز خیالش نروی
کز تو مارا نہ فراغی است کہ از ماست ترا

وصالؔ کے کلام میں صرف یہی ایک خصوصیت نظر آتی ہے کہ انھوں نے پورے خلوص سے متقدمین کی پیروی کی ہے۔ لیکن متقدمین کی پیروی کرتے ہوئے کوئی نمایاں امتیاز صرف اسی وقت حاصل ہو سکتا تھا کہ خیالات اور طرزِ ادا میں کچھ جدت ہوتی۔ لیکن یہ بات

قاچاری دور کے اکثر شعرا میں مفقود ہے۔

ناقدردانی کی شکایت

وصال کا دیوان باوجودیکہ امرا اور رؤسا کی مدحوں سے پُر ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قدردانی نہیں ہوئی، اس لیے انھیں گلہ ہے کہ ادب آموز ہونے کے باوجود وہ سیہ بخت اور پریشان حال ہیں۔ سخن آرا ہونے کے باوصف ذلیل وخوار ہیں۔ آخر مجبوراً وہ اپنے کمال فن کی مذمت پر اتر آتے ہیں۔

کس نیست کہ گوید بمن ای بیہدہ گفتار
ای زشت بگفتار و بکردار و برفتار
این پیشہ کدام است کہ در پیش گرفتی
بر دیدۂ دل نشترہ و در پای خرد خار
گشتی ادب آموز و بدینگونہ سیہ روز
گشتی سخن آرا و بدینگونہ شدی خوار
چندانکہ ترا کاست ہنر بیش فزودیش
ای بر ہمہ خواری ہنرمند سزا دار
مقدار ہنر را بفزودی تو بمقدور
او بیش ز مقدور ترا کاست ز مقدار
از قد چہ کشیدی کہ بیدادیش چنین خم
وز دیدہ چہ دیدی کہ بکردیش چنین تار
دیوان ترا انباشتہ از مدح بزرگان
در کیسہ نہ درہم بود ت ہیچ نہ دینار
زین بیش گر ہی پی این کار برفتند

سود ہمہ زین پیشہ و نفع ہمہ زین کار

شائستہ تری کس نہ چو ایشان بہر شاہ

بالیستہ تری کس نہ چو این قوم بدربار

امروز چو بازار ادب سرد بہ بینی

آخر بچہ رو گرم تبازی تو بہ بازار

وصال نے ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۵ء میں وفات پائی۔

قائمقام فراہانی

ابو القاسم نام اور تخلص ثنائی ہے۔ ۱۱۹۳ھ مطابق ۱۷۷۹ء میں فراہان میں پیدا ہوئے۔ میرزا عیسیٰ قائمقام وزیر سلطنت مشہور بہ میرزائے بزرگ، آپ کے والد تھے۔ والد کی سرپرستی میں تعلیم پائی۔ فارغ التحصیل ہوئے تو دربار شاہی میں ملازمت مل گئی۔ کچھ عرصہ بعد انھیں آذربائیجان بھیج دیا گیا، جہاں ان کے والد عہدہ وزارت پر فائز رہ چکے تھے۔ یہاں انھیں شہزادہ ولی عہد کا دبیر خاص مقرر کیا گیا۔ ابو القاسم کے والد فوت ہوئے تو فتح علی شاہ نے انھیں وزارت کا منصب سونپ دیا۔ یہاں حسن کارکردگی کے صلے میں انھیں سید الوزرا کا خطاب ملا۔ خوش حالی کا یہ دور زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔ کیونکہ حاسدوں نے آپ کے خلاف بادشاہ کے کان بھرنے شروع کیے، اور روس دوستی کا الزام بھی لگایا گیا، جس کی پاداش میں وزارت سے آپ کو الگ کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ بیکار رہنے کے بعد بادشاہ کی خدمت میں ایک مکتوب ارسال کیا، جس کا ایک شعر حسب ذیل ہے۔

من بیگنہ و خدمت دیرینہ شفیع است
از داد تو بیداد بعید است و بدیع است

بادشاہ پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ ادھر بدخواہوں نے ایذا رسانی میں کوئی کمی نہ کی۔ اس پریشان حالی میں جو قصیدے کہے گئے۔ ان میں آپ کی آزردہ روح کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

تین سال بیکار رہنے کے بعد آپ کے سوئے ہوئے بخت نے کروٹ لی اور سنہ ۱۲۴۱ھ مطابق ۱۸۲۵ء میں دوبارہ وزارت کے منصب پر فائز ہو گئے۔ لیکن ابھی دو ہی سال گزرے تھے کہ سرحدی علاقوں میں ایرانیوں اور روسیوں کے مابین جھگڑے چھڑ گئے۔ فتح علی شاہ چاہتا تھا کہ روس کے خلاف جہاد کیا جائے۔ چنانچہ آذربائیجان میں ایک مجلسِ مشورہ قائم ہوئی، جس میں شامل ہونے کی دعوت ایران کے تمام باا ثر امرا اور رؤسا کو دی گئی۔ حاضرینِ مجلس اس بات پر متفق تھے کہ روس کے خلاف جہاد کیا جائے۔ قائمقام سے دریافت کیا گیا، تو اس نے خلاف رائے دی۔ آخر سنہ ۱۲۴۲ھ مطابق سنہ ۱۸۲۶ء میں پھر وہ وزارت کے منصب سے الگ کر دیئے گئے۔

اہلِ ایران روسیوں کے خلاف لڑے، لیکن روسی ان پر غالب آئے، اور بڑھتے بڑھتے تبریز تک پہنچ گئے۔ اس اثنا میں ایرانیوں کو متعدد بار شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ فتح علی نے جنگ کو زیادہ طول دینا مناسب نہ سمجھا، آخر جنگ بند کرنے اور روسیوں سے مصالحت کرنے کے لیے قائمقام کو طلب کیا گیا۔ قائمقام کی کوششوں سے دونوں حکومتوں میں مصالحت ہو گئی۔ اور ایک عہد نامہ طے ہوا جس کی رو سے روسی ارس تک پیچھے ہٹ گئے، اور دریائے ارس کو انھوں نے اپنی سرحد تسلیم کر لیا۔

سنہ ۱۲۵۰ھ مطابق سنہ ۱۸۳۴ء میں فتح علی شاہ فوت ہوا تو محمد شاہ تخت پر بیٹھا۔ اس کے عہد میں بھی وزارت کی باگ ڈور قائمقام ہی کے ہاتھوں میں رہی۔

قائمقام کو ایرانی سیاست میں بہت بلند مقام حاصل تھا، لیکن وہ امورِ سلطنت میں رؤسا کے عمل دخل کو پسند نہ کرتا تھا، بلکہ ان کے طور طریقوں کی مخالفت کرتا تھا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مخالف اور حاسد ایک متحدہ محاذ بنا کر ان کے خلاف ریشہ دوانیاں کرنے لگے۔ اب کی دفعہ وہ اپنے ارادوں میں پوری طرح کامیاب ہو گئے، محمد شاہ نے نہ صرف انھیں وزارت ہی سے معزول کیا، بلکہ قتل بھی کرا دیا۔

افکار و اسلوب

قائمقام کی زندگی میں کئی سیاسی مد و جزر آئے۔ کبھی وزارت کے منصب جلیلہ پر فائز ہوتے اور کبھی مشہد و تبریز میں مجاور کی حیثیت اختیار کر کے گوشہ نشیں ہو جاتے۔ وزارت سے معزولی کا دور آپ کے لیے بہت جانکاہ اور صبر آزما ہوتا تھا جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔ اس عرصے میں آپ نے جو قصائد اور غزلیں کہیں، رقت اور دلسوزی کا مرقع ہیں۔ بادشاہ کی سنگدلی اور دوستوں کی بے وفائی نے انھیں سخت بے چین رکھا۔ زمانے کی یہ ایک رسم قدیم ہے کہ وہ دانشمندوں کا ہمیشہ سے دشمن چلا آیا ہے۔ چنانچہ قائمقام ایک قصیدے میں اپنے ناموافق حالات کا ذمے دار گردشِ دوراں ہی کو ٹھہراتے ہیں۔

ای بی تو نگشته شام یک روزم — وی با تو نرفته شاد یک آنم
ای خرمن عمر از تو بر بادم — وی خانهٔ صبر از تو ویرانم
هم کوکب سعد از تو منحوسم — هم مایهٔ نفع از تو خسرانم
تیغ است ستاره و تو جلادم — سجن است زمانه و تو سجانم
از روز ازل توئی تو همراهم — تا شام ابد توی تو همشانم
چون طوق فشرده تنگ حلقومم — چون خار گرفته سخت دامانم
عمری است که روز و شب همی داری — بر خوان جفای چرخ مهمانم
آن سفله که میزبان بود تدهد — جز حنظل صبر و یاس و حرمانم
خون سازد اگر دهد دمی آبم — جان خواهد اگر دهد می نانم
جلاب عسل نداده بگشاید — از نشتر درد و غم رگ جانم
زانسان که سگان بجیفه گرد آیند — با سگ صفتان نشانده بر خوانم

این گاه همی زند بچنگالم — وآنگاه همی گزد بدندانم
تا چند بخوان چرخ پاید بود — از بهر دونان جفای دونانم

تمام قصیدہ ایک دردمند شاعر کی آپ بیتی ہے۔ اس کے ایک ایک شعر میں شاعر کے قلب مجروح کی آواز سنائی دیتی ہے، قصیدے کو پڑھ کر مسعود سعد سلمان کے وہ قصائد یاد آجاتے ہیں، جو اس نے اپنے طویل ایام اسیری میں لکھے تھے۔

ذیل کی غزل بھی آپ کے احساساتِ قلبی کی آئینہ دار ہے۔

دلا تا کی شکست از دست ہر پیمان شکن بینی
برآ از سینه کاینجا جمله زین بیت الحزن بینی
برو بیرون ازین خانه بیرا از خویش و بیگانه
کزین دیوان دیوانه گزند جان و تن بینی
سفر یک قطعه از نیران بود حب وطن ز ایمان
ولی صدره سفر خوشتر چو خواری در وطن بینی
درین دور زمین طور زغن نیکو بود اما
ترا این طالع نخواهی دید تا گور و کفن بینی
بیا مرغ ار شوی بلبل شود آشفتهٔ گل شو
که گر بینی جفا باری ز یارِ خویشتن بینی
نه مرغ خانه کز بهر همی آب و کفی دانه
گهی جور زن و گاهی جفای بابزن بینی
ترا غم یار دیرینه است و همخانه درین سینه
وزان بیرحم پرکینه بس آفات و فتن بینی
چرا در خانهٔ دشمن چو محبوسان کنی مسکن

مگر در پای جان چون من ز لطف شه رسن بینی
اگر داری ہوس بشکن قفس برکش نفس تا بس
بساط باغ و راغ و جلوہ و سرو و سمن بینی
بباغ اندر شوی تا زان و نازان باہم آوازان
طربہای نواز دنبال غم ہای کہن بینی
بیا بکشا زبان و ہر چہ خواہی گو گزین اخوان
نبینی مہر تا مہر خموشی بر دہن بینی
بہر جا باشی و صد بد ببینی زین بتر نبود
کہ این جا خاتم جم را بدست اہرمن بینی
نہال خدمت و کالای قدمت را درین کشور
پشیمانی ثمر یابی پریشانی ثمن بینی
من این سرمایہ را آوردم اینجا و خطا کردم
تو باری پند و عبرت گیر چون بر حال من بینی

قصائد میں قائمقام نے سبک خراسانی کی پیروی کی ہے۔ ایک قصیدے کے چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

وصف بہار

روز عیش و طرب و وقت نشاط و شغف است
شادی از ہر جہت است و طرب از ہر طرف است
شمس را نوبت تحویل بہ برج حمل است
شاہ را نیر اقبال بر اوج شرف است

ساقی بزم صبوح است کہ ہنگام صباح
لعل رخشاں بکف و کان بدخشان بکف است

جنس جانہا ہمہ در طرہ ساقی گرو است
نقد کانہا ہمہ از بخشش شاہی تلف است

خطوطِ قائمقام

قائمقام شاعر ہونے کے علاوہ اچھے نثر نگار بھی تھے۔ ان کے خطوط اس زمانے کی نثر کا عمدہ نمونے سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں اکثر خطوط تاریخی اور سیاسی اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ ذیل کا خط زار روس کو لکھا گیا تھا جس میں روسی سفیر گریبایدف کے قتل پر اظہار معذرت کیا گیا ہے۔

نامۂ شاہنشاہی با امپراطور اعظم در باب گذشتن خون ایلچی

اوّل دفتر بنام ایزد دانا ۔ صانع پروردگار حیّ و توانا

وجودی بی مثل و مانند مبرّا از چون و چند کہ عادل و عالم است و قاہر بر ظالم، پاداش ہر نیک و بد را اندازہ و حد نہادہ بحکمت بالغۂ خود بدکاران را زجر و عذاب کند و نیکوکاران را اجر و ثواب بخشد و درود نامعدود بر روان پیغمبران راست کار و پیشوایان فرخندہ کردار باد و بعد بر رای حقائق نمای پادشاہ ذی جاہ انصاف کیش، عدالت اندیش، تاجدار با زیب و فر، شہریار بحر و بر، برادر والا گہر خجستہ اختر امپراطور ممالک روسیہ و مضافات کہ دولتش با جاہ و خطر است و رائتش با فتح و ظفر مخفی و مستور نماناد کہ ایلچی آن دولت را در پای تخت این دولت باقتضای حوادث دہر و غوغای کسان او با جہال شہر آسیبی رسید کہ تدبیر و تدارک آن بر ذمہ کارگذران این دولت واقعی و واجب و لازم افتاد، لہذا اولاً برای تمہید مقدمات عذر خواہی و پاس شوکت و احترام آن برادر گرامی فرزند ارجمند خود خسرو میرزا را بپای تخت دولت بہیۂ روسیہ فرستاد حقیقت ناآگاہی این حادثہ و نا آگاہی امنای این دولت را در طومار صادقانہ مرقوم و معلوم داشتیم و ثانیاً نظر بکمال یگانگی و اتفاق کہ ماین ۔

این دو حضرت آسمان رفعت هست، انتقام ایلچی مزبور را بر ذمت سلطنت خود ثابت دانسته هر کرا از اهالی و سکان دار الخلافه گمان می رفت که درین کار زشت و کردار ناسزا اندک مدخلیتی تواند داشت - باندازهٔ استحقاق مورد سیاست و حد و اخراج بلد نمودیم - حتی داروغهٔ شهر و کدخدای محله را نیز بهمین جرم که چرا دیر خبر دار شده و قبل از وقوع این حادثه ضابطهٔ شهر و محله را محکم نداشته اند - عزل و تنبیه و ترجمان کردیم - بالاتر ازین ها همه یاداش و سزای بود که نسبت بعالیجناب میرزا مسیح وارد آمد با مرتبهٔ اجتهاد در دین اسلام و اقتضا و اقتدای که زمرهٔ خواص و عوام باو داشتند، بواسطهٔ اجتماعی که مردم شهر هنگام حدوث غائلهٔ ایلچی در دائرهٔ او کرده بودند، گذشت و اغماض را منظر باتحاد دولتین شایسته ندیدیم و شفاعت هیچ شفیع و توسط هیچ واسطه در حق او مقبول نیفتاد، پس چون اعلام این گذارش بآن برادر نیکو سیر لازم بود، به تحریر این نامهٔ دوستی علامه پرداخته اعلام تفاصیل اوضاع را بالفرزند مؤید موفق نائب السلطنت عباس میرزا محول داشتیم امید از درگار داریم که دم بدم مراتب وداد این دو دولت ابدیت بنیاد در ترقی و از دیاد باشد و روابط دوستی و یگانگی حضرتین پیوسته بآمد و شد رسل و رسائل متاکد و متضاعف گردد و العاقبة بالعافیه،

تحریراً فی شهر ربیع الاول ۱۲۴۵ھ

میرزا حبیب اللہ قاآنی

قاآنی عہدِ قاچار کے وہ مشہور ترین شاعر ہیں جنھیں بیک وقت متقدین میں بھی شامل کیا جاسکتا ہے اور متجددین میں بھی - زبان اور اندازِ بیان کے اعتبار سے وہ متقدمین کی صفِ اوّل میں شامل ہیں اور اندازِ فکر میں وہ جدید شاعری کے پیش رو ہیں -

میرزا حبیب ۱۲۲۲ھ مطابق ۱۸۰۷ء میں شیراز میں پیدا ہوئے۔ اور ابتدائی تعلیم بھی پائی - آپ کے والد ابو الحسن بھی شاعر تھے، اور گلشن تخلص کرتے تھے - شعر کا ذوق گویا انھیں ورثے میں ملا تھا - قاآنی گیارہ سال کے ہوئے کہ والد فوت ہوگئے - کوئی

بڑا اثاثہ نہ تھا، اس لیے بچپن عسرت اور تنگدستی میں گزرا۔ چودہ سال کی عمر میں شیراز کے تاجروں کے ساتھ مشہد آ گئے، اور مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے یہاں کے ایک مدرسے میں داخل ہو گئے۔ یہاں آپ نے فقہ، حکمت، ہندسہ، ریاضی اور نجوم میں مہارت حاصل کی۔ اوائل عمر میں شعر بھی کہنے لگے، آخر شعر ہی کی بدولت انھوں نے ناموری حاصل کی۔

فتح علی شاہ کا بیٹا شجاع السلطنت شعر و سخن کا دلدادہ تھا۔ اُس نے قاآنی کی شہرت سنی، تو اپنے دربار میں بلایا۔ یہاں آپ بہت جلد شجاع السلطنت کے ندیمان خاص میں داخل ہو گئے۔

میرزا حبیب شروع شروع میں حبیب تخلص کرتے تھے۔ لیکن یہاں شجاع السلطنت کے مہا دلنائی قاآن سے بہت مانوس ہوئے۔ وہ بھی انھیں محبت کرتا تھا، اس لیے اس کہنے کی نسبت سے قاآنی تخلص کیا۔ اس دربار سے آپ دس سال تک وابستہ رہے۔ آخر شجاع السلطنت کی وساطت سے آپ کو فتح علی شاہ کے دربار میں رسائی ہوئی۔ آپ نے اس تقریب پر انوری کے مشہور قصیدہ ؎

"اگر محول حال جہانیان نہ قضا است | چرا مجاری احوال بر خلاف قضا است"

پر ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا، جس کا مطلع یہ ہے۔

اگر نظام امور جہان بدست قضا است | چرا ہر چہ کند امر شہریار رضا است

بادشاہ اس قصیدے سے بہت خوش ہوا۔ صلے میں ایک معقول رقم وظیفے کے طور پر مقرر کر دی اور "مجتہد الشعراء" کے خطاب سے سرفراز کیا۔

فتح علی شاہ کی وفات کے بعد قاآنی محمد شاہ کے دربار سے وابستہ ہوئے۔ یہاں بھی آپ کی بڑی قدر و منزلت ہوئی، اور حاجی میرزا آقاسی کی سفارش پر، جو اس وقت صدر اعظم تھے، آپ کو "حسان العجم" کا خطاب ملا۔ چنانچہ اس تقریب پر ذیل کا قصیدہ کہہ کر پیش کیا۔

چو خود بودی محمد مر مرا احسان لقب دادی
بلی حسان بود ہر کو تو بگزینی ز احسانش
کہ این فخر از ین برتر کہ گوید آصفی چون تو
محمد شہ محمد ہست و قاآنی است حسانش

عیش و نشاط کا دور

قاآنی جب تک مشہد میں رہے، بڑی پاکیزگی کی زندگی گزاری۔

مشہد کو خیرباد کہہ کر تہران آئے، تو پایۂ تخت کے حسن و جمال نے آپ کے زہد و تقا کا دامن چاک کر دیا۔ چنانچہ ابراہیم صفائی[1] لکھتے ہیں: "زمام خویش را بدست دل داد و عمل عشق پرستی و ہنر شیدائی را پیشہ نمود ہر روز بہ یارے دل بست و ہر دم با دلدارے نشست،

دوران این عشق بازی و شیدائی قریب ۵ سال

طول کشید۔"

آخر یہ صلاح ٹھہری کہ شادی کر کے متاہل زندگی بسر کریں۔ شادی کے لیے سرمائے کی ضرورت تھی، چنانچہ رات بھر جاگ کر ایک قصیدہ کہا اور صبح کو شاہ کے حضور میں پڑھ کر سنایا۔ قصیدے کے چند شعر حسب ذیل ہیں۔

در شہر ری امسال بہر سو کہ نہم گام
ہر کس صنمی دارد و گل چہرہ و گلندام
ہر شام کشد تنگ در آغوشش تا صبح
ہر صبح زند چنگ بگیسویش تا شام
من یار ندارم چکنم جز کہ خورم غم
یارب چکنم کاش کسی زاد مرا مام
نہ حاصلم از عشق بغیر از الم دل
نہ واصلم از دوست بغیر از طمع خام
شب غیرت کہ از غصہ بدندان بگزم لب
در رہگذر لب و دندان جوانان دلآرام
نہ ہست مرا طلعت زیبا کہ نگاری
در بزم من از میل طبیعت بنہد گام

---

[1] نہضت ادبی ایران۔ صفحہ ۶۷

نہ عربدہ دانم کہ چو ترکان سپاہی — بالالہ رخی سادہ شوم رام بابرام
نہ پیشہ ورم تا کہ زر و سیم کنم کسب — نہ پیلہ ورم تا کہ زر و سیم کنم دام
آوخ کہ شدم پیر بہنگام جوانی — از عشق جوانان جفا پیشۂ خودکام
یک چارہ ہمی دانم و آن چارہ ہمین است — کامشب بزنم چشم ہم تا بگہ بام

مدحی بسزا گویم و فردا بگہ بار
خوانم بر دادار جہان داور اسلام

اس قصیدے کو سن کر جس میں قاآنی نے داستانِ دل بیان کی تھی، بادشاہ بہت متاثر ہوا اور شادی کا خرچ بطور انعام دیا، اور وظیفہ میں بھی اضافہ کردیا۔ شادی کرنے کے بعد قاآنی کے عشق و عاشقی کا زمانہ ختم ہوگیا۔

فرانسیسی کی تعلیم

شہزادوں کے فرانسیسی اتالیق سے قاآنی کو ملنے جلنے کے اکثر موقعے ملتے تھے، چنانچہ اُن سے فرانسیسی زبان بھی سیکھی۔ اور اس زبان میں مہارت بھی حاصل کی اور گیاہ شناسی (BOTANY) پر فرانسیسی کی ایک کتاب کا ترجمہ بھی کیا۔ لیکن یہ ترجمہ اب ناپید ہے۔

قیام شیراز

ایک طویل عرصہ تہران میں گذار کر قاآنی شیراز آگئے۔ یہاں انھوں نے کچھ وقت بڑے اطمینان سے گذارا، جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں۔

بادہ جان بخش است و دلکش خاصہ در فصل بہار
خاصہ ہنگام صبوحی خاصہ از دست نگار
خاصہ اندر طرف بستان خاصہ اندر پای بید
خاصہ در شیراز در دوران صاحب اختیار

یہاں آپ نے تین سال قیام کیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ اہلِ شیراز نے خاطر خواہ قدر نہ کی۔ شاعر اور ادیب حسد کرنے لگے۔ ادھر فارس کا حکمران منوچہر خاں شعر و ادب کا

ذوق نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ سرکاری خزانے سے جو رقم بطور وظیفہ ملتی تھی، بند ہو گئی۔ غرض کہ یہ زمانہ آپ کے لیے بڑے ابتلا اور پریشانی کا تھا۔ آخر زمانے کی ناسازگاری نے آپ کو ترکِ شیراز پر مجبور کیا۔ یہاں سے چل کر پھر تہران واپس آ گئے۔ دورِ ابتلا کا ذکر آپ نے ذیل کے اشعار میں کیا ہے:

گر تاج زر نہند ازین پس بسر مرا — بر درگۂ امیر نہ بینی دگر مرا
بگذشت صیت فضل و کمالم ز بر و بحر — با آنکہ ہیچ بہرہ نہ از بحر و بر مرا
قدر مرا قضا و قدر کردہ اند پست — تقریع کی سزد بقضا و قدر مرا
چون عقدۂ دلم نگشاید، بملک پارس — باید کشید رخت سوئی کاشغر مرا
از صد ہزار غصہ یکی باز گوئمت — خوانی مگر ببختی لختی حجر مرا
خواند مرا امیرِ امیران بکاخ خویش — ناخواندہ پاسبانش راند ز در مرا
فراش آستانش افشاند آستین — ہست آستین از آن رو بر چشم تر مرا
زان صد ہزار زخم کہ بر من زد آسمان — الحق یکی نگشت چنان کارگر مرا
مانم چرا بپارس کہ نبود درآن دیار — نی آب و خاک و نی شتر و گاو و خر مرا
روئی زمین فراخ چہ پروا کہ دست تنگ — پای سفر نبستہ کسی در حضر مرا
گر چارپائے راہبر نیست گو مباش — پای دو دادہ است خدا راہبر مرا
از روز و شب گریزم اگر بہر روشنی — باید کشید منت شمس و قمر مرا

تہران میں بھی وہ پہلے سے حالات نہ تھے۔ محمد شاہ فوت ہو چکا تھا۔ حکومت ایران کی باگ ڈور اب ناصر الدین نے سنبھالی تھی۔ مصاحب، ندیم، درباری سب نئے تھے۔ دربارِ قاچار، جہاں قاآنی کو بڑی عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، اب ان کے لیے اجنبی تھا۔ آخر قاآنی شہزادہ مرزا اعتضاد السلطنت کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں ان کے لیے وظیفہ مقرر ہو گیا اور کچھ عرصے کے لیے فکرِ معاش سے آزاد ہو

گئے۔ اعتضاد السلطنت کی وساطت سے قاآنی کی رسائی ناصرالدین کی والدہ مہد علیہ کی خدمت میں ہوئی۔ ایک مسمط لکھ کر پیش کی جس کا ایک بند حسب ذیل ہے۔

بنفشہ رستہ از زمین بطرف جویبارہا — دیا گسستہ حورعین ز زلف خویش تارہا
ز سنگ اگر ندیدۂ چسان جہد شرارہا — بہ برگ ہای لالہ بین میان لالہ زارہا
کہ چون شرارہ می جہد ز سنگ کوہسارہا

اعتضاد السلطنت نے آپ کی کچھ اور دستگیری کی اور ناصرالدین کے دربار میں پہنچا دیا۔ یہاں انھیں ایک مرتبہ پھر شاعر دربار ہونے کی عزت حاصل ہو گئی۔

سزائے چوب و فلک

قاچاری دربار میں اگرچہ قاآنی کی عزت تو بہت ہوئی لیکن ذلت بھی کچھ کم نہ ہوئی۔ قاآنی کو امن و سکون میسر آیا ہی تھا کہ میرزا تقی خان صدر اعظم، جو "امیر کبیر" کے نام سے مشہور تھا، قاآنی پر کسی وجہ سے ناراض ہو گیا۔ اس نے پہلے تو قاآنی کا وظیفہ نصف کرایا، آخر بالکل ہی ختم کرا دیا۔ قاآنی نے امیر کبیر کی مدح میں قصیدے بھی کہے، لیکن وہ شعر کا ذوق نہیں رکھتا تھا، اس لیے اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ قاآنی نے اپنے وظیفے کی بحالی کے لیے کوشش کی، لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ آخر مایوس ہو کر آپ نے امیر کبیر کی شان میں سخت سست باتیں کہہ دیں۔ چنانچہ اس نے آپ کو چوب و فلک کی رسوائے عالم سزا دی، اور اس طرح حکومت قاچاریہ کے دامن پر ایک ایسا دھبہ لگ گیا، جو شاید کبھی نہ دھل سکے گا۔

آخر وہ وقت بھی آگیا کہ امیر کبیر پر شاہی عتاب ہوا، اور اسے وزارت کے منصب سے الگ کر دیا گیا۔ قاآنی نے ایک قصیدہ ناصرالدین شاہ کی مدح میں لکھا ہے، جس میں امیر کبیر کی معزولی اور نئے صدر اعظم کے تقرر پر خوشی کا بھی اظہار کیا ہے۔

ناصرالدین شاہ گیتی را منظم کرد باز
معنی اقبال و نصرت را مجسم کرد باز

از رموز خسروی یک نکته باقی مانده بود
ملهم غیبش بآن یک نکته ملهم کرد باز

فال شه نصر من الله بود و اینک کردگار
آیهٔ انا فتحنا را برو ضم کرد باز

اشکبوسی را بیک تیر غلاب از پا فگند
راستی کیخسرو ما کار رستم کرد باز

زهرهٔ شیر فلک شد آب ازین جرأت که شه
پنجه اندر پنجهٔ این چیره ضیغم کرد باز

چون نبودش گوشمال سال اول سودمند
چرخش اسباب پریشانی فراهم کرد باز

کید خصم خانگی را هرچه خسرو در سه سال
خواست کردن فاش عفو شاه مدغم کرد باز

شاه پنداری سلیمان بود کز انگشت او
اهرمن خوی بحیلت قصد خاتم کرد باز

صدر اعظم[1] خلق را چون آصف ابن برخیا
آگه از کردار دیو و حالت جم کرد باز

اسم شه را خواند و بر آن دیو بدگوهر دمید
قصه کوته هرچه کرد آن اسم اعظم باز کرد

سنہ ۱۲۶۸ھ مطابق سنہ ۱۸۵۱ء میں بابیوں نے فتنہ کھڑا کر دیا جیسے کہ پہلے ذکر آ

---

[1] میرزا آقاخان اعتماد الدولہ، جسے امیر کبیر کے بعد وزارت کا منصب ملا۔

چکا ہے، کسی بابی نے مذہبی جنون میں آکر ناصر الدین شاہ کو گولی کا نشانہ بنانا چاہا۔ گولی خطا ہوئی، تو اس نے خنجر سے شاہ پر حملہ کیا۔ بادشاہ زخمی تو ہوا، لیکن بچ گیا۔ آخر بادشاہ نے اس باغیانہ حرکت پر بابیوں کے قتل عام کا حکم دیا۔

بادشاہ کی صحت یابی پر گھر گھر چراغاں ہوا۔ شکرانے کے نفل ادا کیے گئے، اور سلامتی شاہ کے جشن منائے گئے۔ نذریں نیازیں دی گئیں۔ قاآنی نے شکرانۂ سلامت کے طور پر ایک قصیدہ کہا، جس کے چند شعر یہ ہیں۔

ساقی امشب می بیاپی مہ کہ من بر جای آب
نذر کردستم کزین پس می ننوشم جز شراب

منت ایزد را کہ شہ رست از قضای آسمان
ورنہ در معمورۂ ہستی فتادی انقلاب

من کہ از شرم وحیا با کس نمی گفتم سخن
رقص خواہم کرد زین پس درمیان شیخ وشاب

آخر شوال خسرو شد سوار از بہر صید
آسمانش در عنان و آفتابش در رکاب

کز کمین ناگہ سہ تن جستند و افگند ند زود
تیر ہائے آتشین زی خسرو مالک رقاب

از خطا زین پس نمی گویم صواب اولی تر است
کان خطا تیر بد خونتر ز یک عالم صواب

تا نہ پنداری کہ تنہا یک قران از شہ گزشت
صد قران بر اہل یک کشور گزشت از اضطراب

خاصہ بر گردون عصمت مہد علیا کا نزمان

خود زشرمش زرد شد حتیّٰ توارت بالحجاب

وفات قاآنی نے ایک مختصر سی علالت کے بعد ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۵ء میں وفات پائی۔

اسلوبِ بیان ایران جدید کی شاعری میں قاآنی کی حیثیت منفرد ہے۔ جن شعراء نے سبک قدیم کی طرف رجوع کرنے کی ادبی تحریک چلائی، اُن میں قاآنی کا مقام بہت بلند ہے۔ انھوں نے اگرچہ متقدمین کی پیروی کی ہے، لیکن اُن کے کلام میں انفرادیت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ پروفیسر براؤن نے آپ کو مشہور انگریز شاعر شیلے سے تشبیہ دی ہے۔ آپ کے کلام کی بعض خصوصیات یہ ہیں۔

۱۔ تشبیہ و استعارہ محسنات شعری کا ضروری حصہ ہے۔ شعراء عموماً کبھی کوئی لطیف اور نازک مضمون باندھتے ہیں، یا بیان میں زور اور وسعت پیدا کرنا چاہتے ہیں تو تشبیہیں لاتے ہیں۔ لیکن تشبیہات کا دائرہ رفتہ رفتہ کچھ تنگ ہوتا گیا۔ اس لیے مجبوراً شعرا حقیقی چیزوں کی تشبیہ غیر حقیقی چیزوں سے دینے لگے۔ لیکن قاآنی کی تشبیہات عموماً قدرتی ہوتی ہیں، اور اُن میں تازگی اور ندرت بھی ہوتی ہے۔ ذیل کے اشعار تشبیہات کی تازگی اور ندرت کی عمدہ مثالیں ہیں ؎

دو زلف تابدار او بچشمِ اشکبار من   چو چشمہ کہ اندرو شنا کنند مارہا

زلف کو عموماً سانپ سے تشبیہ تو دی جاتی ہے، لیکن یہ کہنا کہ میری اشکبار آنکھوں میں محبوبہ کی بل کھاتی ہوئی زلفیں ایسی نظر آتی ہیں کہ چشمے کے اندر دو سانپ لہرا رہے ہوں یہ بالکل تازہ تشبیہ ہے۔

فرازِ سرو بوستان نشستہ اند قمریان   چو مقریان نغز خوان بزیرین منارہا

سرو بوستان پر قمریاں چہک رہی ہیں، گویا یادِ خدا میں محو ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خوش الحان قاری سنہرے میناروں میں بیٹھے ہوئے قرآن خوانی کر رہے ہیں۔

ساق بالا زند اندر شمر آب کلنگ　　　ہمچو بلقیس کہ بر صرح سلیمان گزرد

کلنگ پانی میں کھڑا ہے۔ اس کی ٹانگیں عریاں ہیں۔ اس منظر کو یوں بیان کیا ہے کہ حضرت سلیمان کی محبوبہ بلقیس زیر جامہ اوپر اٹھاتی ہوئی شیشے کے حوض میں اتر رہی ہے، جو خاص اُس کے لیے بنوایا گیا تھا۔

۲۔ قاآنی کا اندازِ بیان نیا اور طبعزاد ہوتا ہے۔ پُرانا اور پامال مضمون بھی اس انداز میں پیش کرتے ہیں، کہ وہ بالکل انوکھا اور طبعزاد معلوم ہوتا ہے۔ باغ کا سہانا منظر اکثر شاعر پیش کرتے ہیں۔ لیکن قاآنی کے ہاں اس منظر کی تصویر بالکل انوکھی اور نرالی ہے۔

بہار آمد کہ از گلبن ہمی بانگِ ہزار آید
بہر ساعت خروش مرغ زار از مرغزار آید

تو گوئی ارغنون بستند بر ہر شاخ دہر یکی
زبس بانگ تذرو و صلصل و دراج و سار آید

بجوشد مغز جان چون بوی گل از بوستان خیزد
بپرد مرغ دل چون بانگ مرغ از شاخسار آید

یکی بر کف نہد طاکہ ترکیب قدح دارد
یکی بر گل کند تحسین کز و بوی نگار آید

۳۔ ایرانی شاعری مبالغے کے لیے بدنام ہے۔ لیکن قاآنی نے کوشش کی ہے کہ شاعری کے دامن کو مبالغے سے پاک رکھا جائے۔ مثال کے طور پر چند شعر پیش کیے جاتے ہیں۔

بدان فتراک گیسو زرم نرمک پائی دل بستی
وزان شمشیر ابرو اندک اندک قصد جان کردی

زغم چون شام تاریک است روز روشنم بی تو
شب تاریک دلبر روز روشن سایبان کردی

زخاک رستہ لالہ ہا چو بسدین پیالہ ہا — برگ لالہ ژالہ ہا چو در شفق ستارہ ہا

۴۔ قاآنی نے عموماً بحریں ایسی اختیار کی ہیں، جن میں نغمے کی سی کیفیت ہے۔ الفاظ بھی ایسے ہم آہنگ لاتے ہیں کہ اُن کے صوتی اثرات موسیقی کی شان پیدا کر دیتے ہیں، ایک مسمّط کے تین بند ملاحظہ کیجئے۔

باز برآمد بکوہ رایت ابر بہار — سیل فروریخت سنگ از زبر کوہسار
باز بجوش آمدند مرغان از ہر کنار — فاختہ و بوالملیح صلصل و کبک و ہزار
طوطی و طاؤس و بط سیرہ و سرخاب و سار

مست بنفشہ مگر قاصد اردی بہشت — کز ہمہ گلہا دمد بیشتر از طرف کشت
در نفسش تو بہار گستہ چو باغ بہشت — گوئی با غالیہ بر رخش ایزد نوشت
کای گل مشکین نفس مژدہ بر از نوبہار

دیدہ نرگس بباغ باز پر از خواب شد — طرہ سنبل براغ باز پر از تاب شد
آب فسردہ چو سیم باز چو سیماب شد — باد بہاری بجست زہرہ دی آب شد
بہمنیان بی خبر کرد ز بستان فرار

۵۔ منظر کشی میں قاآنی کو کمال حاصل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی منظر کی تصویر کشی آپ اس وقت کرتے ہیں۔ جب اُن کا دل اور دماغ اُس سے متاثر ہوتا ہے۔ ذیل کے اشعار میں بہار کے بادل کا ذکر کچھ اس انداز میں کیا ہے کہ بہار کے برستے ہوئے بادل کا سماں آجاتا ہے۔

اس قصیدے میں فرخی اور منوچہری کا رنگ جھلکتا ہے۔

یکی روان تیرہ ابری برآمد از دریا
چو مہر ریزد و گوہر خیزد و گوہر ریزد و گوہر زا
چو چشم اہرمن تیرہ چو روی زنگیان تیرا

شده گفتی همه چهره ، بلغرمش علت سودا

شبه گون چون شب عاشق گرفته چون دل عاشق

باشک دیدهٔ وامق ، برنگ چهره عذرا

تنش با قیر آلوده دلش از شیر آموده

برون پر سرمهٔ سوده ، درون پر لؤلؤ لالا

ببل گلشن تن زندان ، گهی گریان گهی خندان

چو در بزم طرب رندان ، ز شور نشئهٔ صهبا

چو دودی بر هوا رفته ، چو دیوی مست و آشفته

زده بس در ناسفته ، ز مستی خیره بر غارا

شده خورشید نور افشان تباری جرم او پنهان

چو شاه مصر در زندان ، چو ماه چرخ در ظلما

لب غنچه رخ لاله برون آورده تبخاله

ز بس باران ز بس ژاله بطرف گلشن و صحرا

ز فیض او دمیده گل شمیده طره سنبل

کشیده از طرب بلبل بشاخ سرخ گل آوا

عذار گل خراشیده خط ریحان تراشیده

ز بس الماس پاشیده بباغ از ژالهٔ بیضا

از او اطراف خارستان شده یکسر بهارستان

وزو رشک نگارستان زمین از لالهٔ حمرا

خرد شد هر دم از گردون که پوشد بر تن هامون

ز سنبل کسوت اکسون ز ژاله خلعت دیبا

فشاند بر چمن ژاله و ماند از دمن لاله

چنان از دل کشد ناله سعد از فرقت اسما

۶ - واقعہ نگاری سے کسی شاعر کی قوّتِ مشاہدہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ قاآنی طویل واقعات نظم کرتے ہوئے کچھ اس طرح جزئیات بیان کرتے ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ ہر بات پر آپ کی نظر ہے۔ ایک قصیدے میں "ترک سمن بر" کو مخاطب کر کے کہتے ہیں، رمضان کا بابرکت مہینہ آگیا ہے۔ میری تسبیح اور جائے نماز اٹھا لا مجلس میں جو عیش و طرب کے اسباب موجود ہیں، انھیں اٹھائے جا، کہیں ایسا نہ ہو، کوئی عالم دین آجائے اور ہمیں شرمسار ہونا پڑے۔ اس مہینے میں شراب پینا ناجائز ہے۔ صبح کو تو شراب پینا قطعی حرام ہے۔" رات کو البتہ کوئی دو ایک جام پی لے، تو پی لے، اور ہاں! یا پھر شام کو اس طرح شراب پیے کہ اگلی شام تک بستر سے نہ اٹھ سکے۔

ماه رمضان آمد ای ترک سمن بر | برخیز و مرا سبحه و سجاده بیاور

مے خوردن این ماه روا نیست که این ماه | فرمان خدا دارد و بر لیغ پیمبر

در صبح حرام است به اجماع و لیکن | رندانه توان خورد شب یک دو سه ساغر

بیش از دو سه ساغر نتوان خورد که تا صبح | بو لیش رود از کام و خمارش رود از سر

یا خورد بدآن گونه بباید که ز مستی | تا شام دگر بر نتوان خاست ز بستر

۷ - اشعار میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے قاآنی بعض زائد الفاظ بھی لاتے ہیں۔ ایک زائد لفظ "بر" کو ردیف بنا کر پورا قصیدہ لکھ ڈالا ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

آمد به برم دوش یکی ساده پسر بر | وز مشک فرو هشته دو گیسو به کمر بر

تصنیفات

قاآنی کی یادگار اس کا دیوان ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے گلستانِ سعدی کی طرز پر نثر میں بھی ایک کتاب لکھی ہے، جو "پریشان قاآنی" کے نام سے موسوم ہے۔ گلستان کی طرح "پریشان" کی حکایات بھی پند و موعظت اور آداب

سیرت پر مشتمل ہیں۔ اندازِ بیان میں بھی قاآنی نے سعدیؔ کی تقلید کی ہے۔ لیکن اس میں وہ بات پیدا نہیں ہو سکی، جو گلستان کا خاصہ ہے۔

فروغی بسطامی

آپ کا نام عباس، فروغیؔ تخلص اور سالِ پیدائش ۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۹۸ء ہے۔ بسطام کے رہنے والے تھے۔ آپ کے والد آقائی موسیٰ محمد خان قاچار کے درباری شاعر تھے۔ کسی وجہ سے شاہی عتاب ہوا اور آپ جلا وطن کر دیئے گئے۔ آخر نجف میں خلوت گزین ہو گئے۔

عباس شعر کا فطری ذوق رکھتے تھے۔ تحصیلِ علوم سے فارغ ہو کر شعر و شاعری شروع کی۔ مسکینؔ تخلص کرتے تھے۔ اپنے چچا دوست علی خان کی وساطت سے بادشاہ کی خدمت میں شرف یاب ہوئے، اور ایک قصیدہ پڑھ کر سنایا۔ بادشاہ قصیدہ سن کر بہت خوش ہوا اور انعام و اکرام سے نوازا۔ آخر شجاع السلطنت والیٔ خراسان کا دیوانِ رسائل آپ کے سپرد کر دیا گیا۔ شجاع السلطنت شعر و ادب کا بہت دلدادہ تھا، چنانچہ مسکینؔ کو جوہرِ قابل پا کر اُس کی بڑی قدر کی۔ شجاع السلطنت کا چھوٹا بیٹا فروغ الدولہ آپ سے بہت مانوس تھا۔ آپ کو بھی اس سے بہت محبت تھی، چنانچہ اس کے نام کی نسبت سے فروغیؔ تخلص کیا۔

فروغیؔ نے چند سال بڑے اطمینان سے مشہد اور کرمان میں گزارے۔ آخر ۱۲۴۱ھ مطابق ۱۸۲۵ء میں شجاع السلطنت تہران آیا، تو آپ بھی تہران آ گئے۔ اس وقت فتح علی شاہ کی حکومت تھی۔ فتح علی شاہ کی وفات پر محمد شاہ تخت نشین ہوا، تو فروغیؔ اس کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔

فروغیؔ کو اولیا اور عارفوں کے حالات سے بہت دلچسپی تھی، چنانچہ ان کی کتابیں اکثر زیرِ مطالعہ رہتی تھیں۔ بایزید بسطامی کی تعلیم نے آپ کی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا یہی وجہ ہے کہ آپ کی غزلیات میں تصوف و عرفان کا رنگ جھلکتا ہے۔ تصوف کے میلان

کی وجہ سے آخر عمر میں گوشہ نشین ہو گئے، اور ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۷ء میں وفات پائی۔

اسلوب بیان

آپ نے اگرچہ قصیدے بھی کہے ہیں، لیکن غزل سے آپ کی فطری مناسبت تھی۔ غزلیات ہی آپ کی شہرت کا سبب ہوئیں۔ غزل گوئی میں آپ حافظ کے پیرو ہیں۔ سوز و گداز، جو حافظ کے کلام کا خاصہ ہے، آپ کی غزلیات میں بھی پایا جاتا ہے۔ غزلیات کے چند شعر نمونے کے طور پیش کیے جاتے ہیں۔

ادلم رام نمودی بدلا را میہا آخرم سوختی از حسرت ناکامیہا
تو د نوشیدن جام مے د خوشنودی ہا من و خاک در میخانہ و بدنامیہا
حی خورد مرغ دل از حسرت خال و خط تو غم بیدانگی و حسرت بیدامیہا
چشم سرمست تو تا ساقی ہشیاران است کی تواں دست کشید از قدح آشامیہا
سر دپا آتشم از عشق فروغی لیکن پختگی ہا نتوان کرد باین خامیہا

آخر این نالہ جانسوز اثرہا دارد شب تاریک فرد زندہ سحرہا دارد
غافل از حال مگر سوختہ عشق مباش کہ در آتشکدہ سینہ شررہا دارد
نالہ سر می زند از ہر بن مویم چون نی بامیدی کہ دہان تو شکرہا دارد
در خور ناوک آن ترک کمان ابرو کیست آنکہ از سینہ صد پارہ سپرہا دارد
تو پسند دل صاحب نظرانی ورنہ مادر دہر بہر گوشہ پسرہا دارد
تیرہ شد روز فروغی برہ عشق مے کہ نہان در شکن طرہ قمرہا دارد

ذیل کی غزل میں تصوف و عرفان کا رنگ ہے ؎

خدا خوان تا خدادان فرق دارد کہ حیوان تا بانسان فرق دارد
موحد را بمشرک نسبتی نیست کہ واجب تا بامکان فرق دارد

محقق را متصدی توان گفت — که دانا تا بنا دان فرق دارد

منا جاتی خراباتی نگردد — که سر جسم تا جان فرق دارد

من ابروی یار و شیخ و محراب — مسلمان تا مسلمان فرق دارد

مخوان آلوده دامن هر کسی را — که دامان تا بدامان فرق دارد

مبر پیش دهانش غنچه را نام — که خندان تا بخندان فرق دارد

رخش را مه مگو هرگز فروغی — که خور با ماه تابان فرق دارد

سروش اصفہانی

محمد علی نام اور سروش تخلص ہے۔ ۱۲۲۹ھ مطابق ۱۸۱۳ء میں اصفہان کے ایک نواحی گاؤں "سدہ" میں پیدا ہوئے۔ یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ یہاں سے فارغ ہو کر اصفہان چلے گئے۔ اور وہاں بھی سلسلۂ تعلیم جاری رکھا۔ شعر و سخن سے فطری لگاؤ تھا، چنانچہ متقدمین کے نقشِ قدم پر چل کر قصیدہ گوئی اختیار کی اور ان شعرا کی صف میں شامل ہو گئے، جنھوں نے قدیم اندازِ بیان یعنی "سبکِ خراسانی" کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کی۔

شعر و شاعری کی بدولت سروش کو شہرت تو اصفہان ہی میں ہو گئی تھی، لیکن کوئی وسیلۂ معاش نہ ہونے کی وجہ سے ابتدائی زمانہ بہت عسرت میں بسر ہوا۔ آخر اصفہان کو خیرباد کہہ گئے۔ اپنی یہ کیفیت ایک قصیدے میں بیان کی ہے، جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

بشهر خویش درون بی خطر بود مردم — بکان خویش درون بی بها بود گوهر

اصفہان سے نکل کر سروش نے کچھ عرصہ کاشان اور قم میں قیام کیا۔ آخر آذربائیجان کا رُخ کیا اور شہر تبریز میں اقامت اختیار کر لی۔ یہاں شعر و شاعری کی بدولت آپ کو کافی شہرت ہوئی۔ آخر شاہزادہ قہرمان میرزا اور محسن میرزا کی خدمت میں رسائی ہوئی اور انھوں نے اس کی شایانِ شان قدر و منزلت کی۔ اس طرح گویا خوش حالی کی زندگی کی ابتدا ہوئی۔ اس دور میں آپ نے جس قدر قصیدے کہے، ان میں فریاد و فغاں کا کہیں ذکر نہیں، بلکہ اس کے برعکس

عیش و طرب کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔

سروش نے بھی عہدِ قاچاریہ کے دوسرے شعراء کی طرح "سبکِ خراسانی" کی پیروی کی ہے۔ اسی انداز میں میرزا محسن کا ایک مسلسل طربیہ قصیدہ لکھا ہے، جس کے چند شعر حسبِ ذیل ہیں۔

وقت صبوح مرغ چو آوا بر آورد   خورشید نیکوان بر من ساغر آورد

گوید مرا کہ وقت صبوح آمدہ است خیز   ترسم کنون خمارت و درد سر آورد

داند کہ یک قدح ننشاند خمار من   خیزد بجای یکی قدح دیگر آورد

امروز مجلسی بنو آرایدم چو دی   نقل و نبیذ و مطرب و رامشگر آورد

گہ رود گہ سرود گہی بوس و گاہ نوش   گرد من از نشاط یکی لشکر آورد

چون روز را گذارم خوش تا بگاہ شب   از نو یکی بساط نو آئین بر آورد

خادم در آید از در و شمع آرد و شراب   زان پس بخور خادمہ با مجمر آورد

از شب دو بہرہ چون سپری شد ز بہر خواب   از پرنیان سادہ یکی بستر آورد

آراستہ در آید و سرخوش بخوابگہ   زان پس کہ جامہ از تن چون گل در آورد

طوق گرانبہا بگشاید وزان سپس   دست مرا چو طوق بگردن در آورد

ہم ہر دو مست در آغوش یک دگر   چونانکہ رشک بر مہ دو پیکر آورد

من سیر ساعتی نشوم از کنار او   سیری کجا کنار چنو دلبر آورد

از جامہ ام برون ز کنار نگار خویش   شوق لقای میر رہی بر در آورد

شہزادہ محسن آنکہ باقبال شہریار   بہرام را برائفیٔ اشقر آورد

اس قصیدے سے میرزا محسن بہت خوش ہوا اور شہزادہ ولی عہد ناصر الدین والیٔ تبریز سے آپ کا تعارف کرایا۔ جس کی مدح میں آپ نے بڑے فصیح و بلیغ قصیدے کہے۔ یہاں آپ پر انعام و اکرام کی بارشیں ہوتی رہیں۔

۱۲۶۴ھ مطابق ۱۸۴۷ء میں محمد شاہ فوت ہوا، تو ناصرالدین اس کا جانشین ہوا۔ سروش اپنے ممدوح کے ساتھ ہی تہران آگیا۔ حکیم قاآنی بھی فوت ہو چکا تھا، چنانچہ اس کے وظائف سروش کے نام منتقل ہو گئے۔ بادشاہ کی طرف سے اسے "خان" اور "شمس الشعراء" کے خطاب بھی ملے۔

۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۶ء میں افغانستان پر لشکر کشی کرتے ہوئے جب ناصرالدین شاہ نے ہرات کو فتح کیا، تو اس خوشی میں ایک عظیم الشان جشن منایا گیا۔ سروش نے اپنا شاہکار قصیدہ لکھ کر پیش کیا، جس کے چند شعر حسب ذیل ہیں ؎

شہر ہری مسخر شاہ و ستارہ یار ای غیرت ستارہ بدین مژدہ می بیار

کردہ ست چون عبد کہ صد سالہ آورد از بہر شاہ مژدہ فتحی بزرگوار

امسال داد مژدۂ فتح ہری بدو چونانکہ مژدۂ سر خوارزمشاہ پار

ہر ہفتہ پیک نصرت و ہر مہ نوید فتح گوئی در فتوح بود عصر شہریار

دی فتح نامہ ہری آمد بنزد شاہ فردا رسد بدو خبر فتح قندھار

شہر ہری بقہر گرفتن طلسم بود بشکست این طلسم شہنشاہ کامگار

ایک قصیدے کے صلے میں ایک مرصع عصا اور دو ہزار تومان آپ کو ملے۔

سروش ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء میں فوت ہوئے۔

اسلوبِ بیان

سروش عہدِ قاچار کے اُن نامور شعراء میں ہیں جنھوں نے سبک خراسانی کے احیا کے لیے کوشش کی، اور متقدمین کی پیروی کر کے شعر میں سادگی اور روانی پیدا کی۔ آپ کے قصائد میں سبک خراسانی کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ذیل کا قصیدہ فرخی کی یاد دلاتا ہے ؎

بنفشہ زلف من آن آفتاب ترکستان ہمی بنفشہ پدیدار ازو دو لالہ ستان

بدان و اگر باش ای چراغ ترکستان کہ ہفتۂ دگر آیم بسوی تو مہمان

بہر ہیچ ہتی نا سپردہ ام دل خویش　　چنانکہ بردم بازارمش برتو جہان
بموی ترکن با نافہ گیسوی چو کمند　　سیاہ ترکن با وسمہ ابروی چو کمان
تتاب گیسو واز پس ہمی فرود آویز　　بہ پیش نیز دو زلف سیاہ مشک افشان
برتو یا برمن بہ کہ نو کنند پیوند　　لب تو با لمب من بہ کہ نو کنند پیمان

سرورش کے ذیل کے قصیدے پر فرخی کا گمان گزرتا ہے۔

عاشقی برمن امسال بہ از پار بود　　کہ یکی دلبر خوشخوی مرا یار بود
عمر نو یافتم از عشق نو و دلبر نو　　عشق نو چون نگری عمر دگر بار بود
خوشتر از عشق نباشد بجہان اندر کار　　خاصہ آن را کہ درم باشد و دینار بود
علم زہد مرا کرد نگونسار بتی　　کہ خداوند سر زلف نگونسار بود
حور زادی کہ ز نظارہ رخسارہ او　　چشم نظارگیان پر گل و گلزار بود
دہنی دارد کوچک ذقنی دارد گرد　　زیر لعلش سی و دو لولو شہوار بود
آفت دل بدو عیار دو مشکین زنجیر　　راحت جان بدو مرجان شکربار بود
در کنار من ازان روی شگفتہ چو بہار　　گل بخر من بود و لالہ بخروار بود
عارضی دارد روشن چو دل نیکوکار　　تیرہ زلفانش چون جان گنہگار بود
گر چنین باشد در خلخ و فرخار صنم　　قبلہ من پس ازین خلخ و فرخار بود
نتوان خواند پری را بر دیدارش خوب　　با چنین خوبی خوشخوی و کم آزار بود
حور را ماند و دل شیفتہ دارد برمن　　حور دل شیفتہ ہر چند کہ دشوار بود

سرورش کے قصائد میں عشق و رومان کی وہی روح کارفرما نظر آتی ہے، جو فرخی کے قصائد میں ہے۔ اندازِ بیان بھی وہی ہے، اس لیے انھیں اگر "فرخی ثانی" کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

منظر کشی سرورش کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ نوروز اور بہار پر آپ نے جو قصیدے لکھے ہیں، وہ متقدمین کے قصیدوں سے کم نہیں۔ ایک قصیدے کے دو شعر ذیل میں پیش کیے

جاتے ہیں۔

نوروز نو آیین نزامسال زیار است — ای ترک بدہ بادہ کہ عید است و بہار است

گلبن چو یکی حور بہ بر کردہ حریر است — ہامون چو یکی حلّہ پر نقش و نگار است

تصنیفات "شمس المناقب" اور "روضۃ الانوار" آپ کی دو علمی یادگاریں ہیں۔ شمس المناقب سروش کے اُن قصائد کا مجموعہ ہے، جو جناب رسالت مآب، خاندانِ نبوت اور حضرت معصومہ کی شان میں لکھے گئے ہیں۔

"روضۃ الانوار" آپ کی ایک مثنوی ہے، جو ذکر کربلا پر مشتمل ہے۔ آپ کا دیوان ابھی تک شائع نہیں ہوا۔

یغما میرزا ابوالحسن نام اور یغما تخلص ہے۔ یہ اپنے زمانے کا مشہور ہزل گو تھا۔ اس فن میں یغما ہمیں عبید زاکانی کی یاد دلاتا ہے۔ یغما جسے ہزل کا نشانہ بناتا ہے، زن قحبہ کہہ کر خطاب کرتا ہے۔

رضا قلی ہدایت لکھتے ہیں کہ یغما کسی زمانے میں ایک مشہور رئیس ذوالفقار خان سمنانی کا سکریٹری تھا، جو بے حد بدزبان اور تندمزاج شخص تھا۔ وہ لوگوں کی ہجویں سن کر خوش ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے یغما نے ہزلیات کا آغاز اپنے اسی محسن کی خوشنودی مزاج کے لیے کیا تھا۔"

غالباً یہ احتیاج ہی تھی جس نے ایک اچھے خاصے شاعر کو ہزل گو بنا دیا۔ کچھ غزلیات اور بعض سنجیدہ خطوط بھی اس کی یادگار ہیں۔ لیکن شہرت کا سرمایہ ہزلیات ہی کا مجموعہ ہے، جو "سردارِیہ" کے نام سے موسوم ہے۔ مشہور شاعر قاآنی نے اس کی ہزل کا جواب ذیل کے اشعار میں دیا ہے۔

ہفت اختر ز قحبہ و نہ گنبد دوار — پرگشتہ ز نہ قحبگی مرشد اشرار

آن شاعر ز قحبہ کہ یغماش خوانید — شعرش ہمہ ز قحبہ و ز قحبگیش کار

تصنیف یغما کے کلام کا مجموعہ "کلیات" کے نام سے موسوم ہے۔ کلیات کے پہلے ۱۴۵ صفحات نثریہ اور باقی حصہ نظم پر مشتمل ہے۔ حصہ نظم کی تقسیم حسب ذیل طریقے پر کی گئی ہے۔

غزلیات قدیم۔ غزلیات جدید۔ سرداریہ۔ قصابیہ۔ کتاب احمد؛ جس میں احمد تخلص کیا ہے۔ خلاصۃ الافتضاح، کتاب شکوک الدلیل، مراثی، ترجیع بند، ترکیب بند، قطعات اور رباعیات۔

ہزلیات کے علاوہ یغما نے غزلیات اور مرثیے بھی لکھے ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ متین اور سنجیدہ قسم کی شاعری میں بھی اسے ملکہ حاصل ہے۔ زبان پر اس کو بڑی قدرت ہے اور مرثیہ میں وہ ایک خاص صنف کا موجد ہے جسے وہ "نوحہ سینہ زنی" کا نام دیتا ہے۔ اس کا ایک نوحہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

می رسد خشک لب از شط فرات اکبرِ من

نوجوان اکبرِ من

سیلانی بکن ای چشمۂ چشم ترِ من

نوجوان اکبرِ من

کسوت عمر تو تا این خم فیروزہ نمون

لعلی آورد بخون

گیتی از نیلِ عزا ساخت سیہ معجرِ من

نوجوان اکبرِ من

تا ابد داغ تو ای زادۂ آزاد نہاد

نتوان بُرد زیاد

از ازل کاش نمی زاد مرا مادرِ من

نوجوان اکبرِ من

ملک الشعراء محمود خان

محمود خان کو شعر و سخن ورثے میں ملا تھا۔ آپ کے دادا فتح علی صبا تھے، جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ فتح علی صبا، فتح علی شاہ قاچار کے دربار کے ملک الشعرا تھے۔ آپ کے والد محمد حسین خان بھی شاعر تھے، اور عندلیب تخلص کرتے تھے۔ صبا کے بعد عندلیب ملک الشعراء کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ فتح علی شاہ کے بعد محمد شاہ تخت نشین ہوا، تو اُس وقت بھی ملک الشعراء عندلیب ہی تھے۔

محمود خان کی تعلیم باپ کی نگرانی میں ہوئی۔ ادب، ریاضی اور علمِ حکمت میں آپ نے مہارت تام حاصل کی۔ شعر کا فطری ذوق تھا، چنانچہ طالب علمی کے زمانے میں ہی قصیدے کہنے لگے۔ والد نے صدرِ اعظم حاجی آقاسی سے آپ کا تعارف کرایا، تو آپ نے اس کی مدح میں قصیدہ پڑھ کر سنایا، جس سے صدرِ اعظم بہت خوش ہوا اور جوہر قابل پاکر انھیں انعام و اکرام سے نوازا۔ اور امور دیوانی کے ایک ذمے دار منصب پر فائز کر دیا۔

اسی زمانے میں شاہی خاندان کا ایک فرد اللہ قلی خان، ایران کا تخت و تاج حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ محمد شاہ نے یہ مناسب سمجھا کہ اسے پایۂ تخت سے دور کہیں بھیج دیا جائے۔ چنانچہ اُسے لرستان کے ایک دور افتادہ علاقہ بروجرد کا حاکم بنا کر بھیج دیا گیا۔ محمود خان کو بھی اس کے ساتھ جانے کا حکم ہوا۔ محمودؒ خان کے ذمے یہ فرض تھا کہ اللہ قلی خان کی حرکات و سکنات سے شاہ کو خبردار رکھے۔ اللہ قلی نے یہاں اپنی باغیانہ سرگرمیاں پورے جوش و خروش سے جاری کر دیں۔ یہاں تک کہ عوام کو حکومت کے خلاف بھڑکایا۔ اور انھیں اس بات پر بھی اکسایا کہ مالیہ ادا نہ کریں۔ محمود خان نے صدرِ اعظم کے نام ایک عریضہ بھیج کر آگاہ کر دیا۔ اللہ قلی خان کو علم ہو گیا کہ بادشاہ کو حالات بتانے والا محمود خان ہے، چنانچہ اس نے محمود خان کے قتل کا حکم دے دیا۔

لیکن محمود خان وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔

محمد شاہ نے اللہ قلی خان کو معزول کر دیا۔ اور عتبات میں اسے نظر بند کرا دیا۔ محمود خان بالآخر قم سے ہوتا ہوا طہران پہنچ گیا۔

محمد شاہ کی وفات پر ناصر الدین شاہ تخت نشین ہوا، تو محمود خان اُس کے دربار میں حاضر ہوا۔ شاہ نے اس کی عزت افزائی کی اور ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز کیا۔ ناصر الدین کے دربار میں محمود خان نے بڑی فارغ البالی سے وقت گزارا۔ یہاں اس نے فنِ نقاشی پر بھی توجہ دی اور اِس فن میں مہارت تامہ حاصل کی۔ چنانچہ شعر و شاعری کے علاوہ اُسے فنِ نقاشی میں بھی بہت شہرت حاصل ہوئی۔

اسلوبِ بیان محمود خان نے "سبک خراسانی" کے احیا میں دوسرے شعرا کی ہمنوائی کی، اور عنصری، فرخی، امیر معزی اور منوچہری کے تتبع میں قصیدے لکھے۔ ذیل میں اس کے ایک بہاریہ کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں۔ اُن سے پتا چلتا ہے کہ آپ کو قدرتی مناظر سے گہری دلبستگی تھی۔ یہ قصیدہ آپ کی شاعری اور نقاشی کے حسین امتزاج کا نہایت عمدہ نمونہ ہے۔

وصفِ بہار

از کوہ بر شدند خروشان سحابہا
غلطان شدند از بر البرز آبہا

بادِ بہاری آمد و بر بوستان گذشت
بگرفت زلفِ سنبل از آن باد تابہا

دوشینہ بادہای تر از سوی بوستان
بر ردی مانده تند سحر گہ گلابہا

وقتِ سحر ز بانگ نوازندہ بلبلان

بر هر کرانه ساخته بینی ربابها

قمری چو بر چنار سوالی همی کند
بلبل ز سرو بن دهد او را جوابها

از مشک سوده با تذری آب معصفر
زلف بنفشه راست بهر شب خضابها

هر لحظه بر هوا نگری لشکری کشن
شمشیرها کشیده برون از قرابها

چون صد هزار جام بلورین واژگون
برآید آن ز ریزش باران حبابها

خوبان سپیده دم بسوی بوستان شدند
از بهر دیدن رخ گل با شتابها

گوی دمیده هر طرف از زردی دلبران
در سایه گاه بید بتان آفتابها

وقتی خوش است عاشق و دلدار را کنون
در خانه داشت می نتوان باطنابها

زین فصل دیابها که کتاب زمانه را
تو انتخاب فصل طرب کن ز بابها

جز روز خرمی نبود در حساب عمر
ما بر گرفته ایم ز گیتی حسابها

محمود خان کے بعض اشعار میں تاریخی واقعات کی طرف بھی اشارے کیے گئے ہیں، مثلاً ذیل کے اشعار میں محمد شاہ قاجار کی تخت نشینی کا ذکر کیا ہے۔

چو تخت ملک تہی ماند از محمد شاہ — کہ نوشہ باد روانش بعلم دیگر
بشہر تبریز اندر خبر رسید بشاہ — کہ حال دگر شد ز کینۂ اختر
از آن خبر بنگویم ملک چہ گفت و چہ کرد — از آن کہ کس نشنیدن نمی کند باور
ہمی بگشت درون و دو چشم خون آب — ہم از فراق پدر ہم ز سوزش کشور
بخواند پیش پی مصلحت خدیو بزرگ — ہر آنکہ بود بدرگہ ز کہتر و مہتر
چو صف زدند بپای سریر تن در تن — خدیو ایران بر داشت مہر گنج و گہر
بگفت کز روش دہر و گردش گردون — فتادہ مان سفری پر ز ہول و پر ز خطر
تہی شدست سرگاہ کی ز شاہ و کنون — برفت بایدمان تا بتخت گاہ پدر
سپاہ جملہ پراگندہ ملک شوریدہ — چگونہ باید برگ سپاہ و ساز سفر

محمود خان غالباً پہلا شاعر ہے، جس نے شعر و شاعری کے لیے تخلص کی ضرورت نہیں سمجھی۔ چنانچہ آپ کے سارے کلام میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں ملتا، جس سے پتا چل سکے کہ یہ آپ کا تخلص ہے۔

محمود نے ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۳ء میں تہران میں وفات پائی۔ آپ کی یادگار آپ کا دیوان ہے، جو تقریباً تین ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ دیوان حال ہی میں آقائی وحید زادہ نے مرتب کر کے شائع کرایا ہے۔

ایران کی بابی شاعرہ

قرۃ العین | قاچاری دور کا حصۂ نظم تشنہ رہ جائے گا اگر قرۃ العین کا ذکر نہ کیا جائے۔ قرۃ العین وہ حسین اور ذہین شاعرہ ہے، جو آسمانِ ادب پر ایک ٹوٹنے والے تارے کی مانند چکا چوند پیدا کر کے آن کی آن میں صفحۂ ہستی سے محو ہوئی۔

قرۃ العین کا اصل نام فاطمہ زرین تاج ہے، مگر دُنیا اُسے قرۃ العین کے نام سے جانتی ہے۔ وہ بابی مذہب کا پروانہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ سید کاظم رشتی جب زرین تاج کے نام اس کے خطوں کے جواب میں خط لکھتا، تو اسے قرۃ العین کہہ کر خطاب کرتا تھا۔ سید باب نے اسے طاہرہ کا لقب دیا۔ دنیا اُس کے اصل نام کو بھول گئی اور دوسرے لقب جو اس کے حسن وجمال اور فکر وخیال کی تابناکیوں کی وجہ سے اسے ملے، وہ حافظوں سے اُتر گئے، لیکن قرۃ العین سے اسے ایسی شہرت ہوئی کہ تذکروں اور تاریخوں میں وہ اب اسی نام سے یاد کی جاتی ہے۔

قرۃ العین ایک مشہور عالم دین حاجی مُلّا صالح کی بیٹی تھی۔ اس کا چچا، جس کے بیٹے مُلّا محمد سے وہ بیاہی گئی تھی، ایران کا ایک مجتہد تھا۔ ان کا خاندان کئی پشتوں سے علم وفضل کی وجہ سے مشہور چلا آتا تھا۔ زرین تاج کو حدیث، تفسیر، اصول وفقہ کے علاوہ الٰہیات وفلسفہ کی بھی تعلیم دلائی گئی تھی۔ اُس کے حسن وجمال پر علم وفضل کے اضافے نے گویا سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اُس نے کھلم کھلا بابی مذہب کی تبلیغ شروع کی، تو ایک دنیا اُس کی جادو بھری تقریروں پر شیدا تھی۔

زرین تاج کی اعلیٰ تعلیم نے اُسے آزادیٔ نسواں کا خیال دلایا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اسلام نے جو حقوق عورتوں کو دے رکھے ہیں، علمائے اسلام اُن سے چھین لینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اُس نے معاشرے کے خلاف پورے زور سے آواز اٹھائی۔ اس سلسلے میں اس کی پہلی ٹکر خود اپنے گھرانے کے افراد سے ہوئی، جو اسلامی شعائر پر بڑے تعصب سے کاربند تھے۔ شوہر نے اسے سمجھایا، خسر نے اپنے علم وفضل سے اسے لاجواب کرنا چاہا، لیکن وہ ضمیر کی آواز کو دبا نہ سکتی تھی، اسی اثنا میں اس نے سید علی محمد کے امام مہدی ہونے کا دعویٰ سنا، تو پوشیدہ طور پر اسے خط لکھا اور اپنے بعض شبہات کا ذکر کیا۔ حقوق نسواں کے متعلق بھی باب سے رائے پوچھی۔ باب نے حقوق نسواں کے متعلق بالکل

انہیں خیالات کا اظہار کیا، جو زرین تاج کے دل کی گہرائیوں میں موجود تھے۔ باب کا یہ پہلا خط ہی کام کر گیا۔ اور وہ اس کی مہدویت کی پرستار بن گئی۔ خط و کتابت کا سلسلہ متواتر جاری رہا۔ باب نے دیکھا کہ وہ دھن کی پکی ہے اور اس کے اندازِ بیان میں جادو ہے، تو اُسے اختیار دیا کہ وہ بابیت کی تبلیغ کرے۔ سب سے پہلے اس نے بابیت کی تبلیغ گھر میں شروع کی، گھر میں اس کی بات کو کوئی کیا سنتا، اُس پر طرح طرح سے دباؤ ڈالا گیا تاکہ وہ گمراہی سے باز آئے، بالآخر اس پر سختیاں شروع ہوئیں، لیکن......

"بڑھتا ہے ذوقِ جرم یہاں ہر سزا کے بعد!"

قرۃ العین اس نئے مذہب پر تبادلہ خیالات کرتی تھی۔ بعض لوگ اس کی عالمانہ گفتگو کو سننے کے لیے اُس کی دعوتِ تبلیغ میں شامل ہوتے اور گرویدہ ہو کر واپس جاتے۔ شوہر اور خسر نے یوں بے آبروئی ہوتی دیکھی، تو اُسے سختی سے روکنا چاہا، لیکن زرین تاج اپنے عقیدے میں اتنی راسخ ہو چکی تھی کہ اسے روکنا مشکل تھا۔

قرۃ العین سفر کربلا سے واپس آکر اپنے والد کے پاس مقیم تھیں کہ انھیں دنوں میں ایک شیخی شخص نے ملا محمد تقی عم طاہرہ کو قتل کر دیا اور خود کو حکومت کے سپرد کر دیا اور کہا کہ ملا تقی، میرے مرشد بزرگ شیخ احمد احسائی کو گالیاں دیتے تھے۔ اس لیے میں نے انھیں قتل کر دیا ہے۔ بابیوں کا اس واقعہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مگر مسلمانوں نے سُنا تو مسلح ہو کر بابیوں کے خلاف امڈ پڑے اور "جہاد جہاد" کے نعرے بلند ہوئے۔ قرۃ العین نے صورتِ حال بگڑتی دیکھی تو قزوین سے تہران چلی گئیں اور وہاں سے بدشت کانفرنس میں شریک ہوئیں جہاں سید باب کے ظہورِ مستقل کی نسبت اعلان ہونے لگے۔ "اے لوگو! امام نے ظہور فرمایا ہے، جس کا تمھیں انتظار تھا، اس کے استقبال کو تیار ہو جاؤ۔" ان اعلانوں سے سارے علاقے میں ہلچل مچ گئی۔ کھلے میدان میں قرۃ العین آئی اور تقریر شروع کی

"احباب[1] و اغیار! ظہور مہدی سے شریعت اسلام کے پرانے احکام منسوخ ہو چکے ہیں۔ باب عنقریب روئے زمین کے تمام شہروں کو فتح کریں گے۔ ساری دنیا اُن کے سامنے سرنیاز جھکا دے گی۔ تمام پرانے مذہب مٹ جائیں گے، صرف ایک دین باقی رہ جائیگا، جو امام قائم کا دین ہے۔ لوگو! کثرت سے وحدت کی طرف آؤ۔ اس پردے کو پھاڑ کر پھینک دو، جو تمہارے اور تمہاری عورتوں کے درمیان حائل ہے۔ عورتوں کو خلوت سے جلوت میں لاؤ۔ مال و دولت کی غیر مساوی تقسیم ساری برائیوں کی جڑ ہے"

بابیت کی اس کھلم کھلا تبلیغ سے اہل اسلام سخت برہم ہوئے۔ مجتہد العصر ملا تقی اور ناصر الدین قاچار پر قاتلانہ حملے کی وجہ سے عام مسلمانوں کے دلوں میں انتقام کی آگ جل رہی تھی۔ آخر ناصر الدین کے حکم سے ان کا قتل عام ہوا

قرۃ العین بھی اس ہنگامے میں اسیر ہوئی اور بادشاہ کے سامنے لائی گئی، تو ہرچند کہ وہ حکومت ایران کی شدید مخالف تھی، اسے دیکھ کر بادشاہ کے منہ سے نکلا" بگذاریدا مُرخ زیبا دارد" لیکن وہ اس پر بھی بچ نہ سکی اور مشتعل مسلمانوں نے گلا گھونٹ کر اُس مہ جبیں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۲۶۷ھ بمطابق اگست سنہ ۱۸۵۲ء کا ہے۔

قرۃ العین ایک خوش فکر شاعرہ تھی، لیکن چند غزلیات کے سوا اس کی اور کوئی یادگار باقی نہیں۔ واقعہ نگار بیان کرتے ہیں کہ وہ عربی میں بھی شعر کہتی تھی لیکن اس کا کوئی عربی شعر نہیں ملتا۔ البتہ اس کے بعض فارسی اشعار اس بات کی تصدیق ضرور کرتے

ہمہ عاشقانِ شکستہ دل کہ دہند جان برہ ِولا

جَذَبَاتُ شَوْقِکَ اَلْجَمَتْ بِسَلَاسِلِ الْغَمِّ وَالْبَلا

تیرے شوق کی کششوں نے غم والم کی زنجیروں کی لگام چڑھا دی ہے تاکہ سارے

---

[1] ناسخ التواریخ مولفہ میرزا شہر تقی

شکستہ دل عاشق، محبت کی راہ میں جان دے دیں۔

اگر آن صنم ز سر ستم پئ کشتنِ من بی گناہ
لَقَدِ اسْتَقَامَ بِسَيْفِهٖ فَلَقَدْ رَضِيتُ بِمَا رَضِي

اگر وہ محبوب مجھ بے گناہ کے قتل کرنے کو تلوار لے کر اٹھ کھڑا ہوا ہے، تو جو اس کی منشا ہو، میں راضی ہوں۔

سحر آن نگار ستمگرم قدمی نہاد بہ بسترم
فَإِذَا رَأَيْتُ جَمَالَهٗ طَلَعَ الصَّبَاحُ كَأَنَّمَا

ایک صبح کو میرے ظالم محبوب نے میرے بستر پر قدم رکھا، اور جیسے ہی میں نے اس کا جلوہ دیکھا، تو یہ معلوم ہوا جیسے صبح روشن ہو گئی۔

نہ چو زلف غالیہ بار او نہ چو چشم فتنہ شعار او
شدہ نافۂ ہمہ ختن شدہ کافری ہمہ خطا

نہ اس کی عطر بار زلف کا سا کوئی نافہ سارے ختن میں ہے، نہ اس کی فتنہ شعار آنکھوں کا سا کوئی کافر تمام خطا میں موجود ہے۔

تو و ملک و جاہ سکندری من و رسم و راہ قلندری
اگر آن خوش است تو درخوری و اگر این بد است مرا سزا

ایک تو ہے کہ تیرے لیے سکندر کی جاہ و حشمت ہے۔ ایک میں ہوں کہ میرے لیے قلندرانہ رسم و راہ ہے، اگر وہ اچھی ہے، تو وہ تیرے لیے مناسب ہے، اور اگر یہ بری ہے، تو میں اس کی مستحق ہوں۔

بگذر ز منزل ما و من بگزین بملک فنا وطن
فَإِذَا فَعَلْتَ بِمِثْلِ ذَا فَلَقَدْ بَلَغْتَ بِمَا تَشَا

"ہم اور میں" کے مقام سے گزر جا اور ملکِ فنا کو وطن بنا لے، جس وقت تو نے ایسا

کرلیا تو اپنے مقصد کو پہنچ جائے گا۔

قرۃ العین کی غزل جسے ڈاکٹر اقبال نے "جاوید نامہ" میں جگہ دی ہے، ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

گر بتو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو
شرح دہم غم ترا نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو

از پئ دیدن رخت ہم چو صبا فتادہ ام
خانہ بخانہ در بدر کوچہ بہ کوچہ کو بہ کو

می رود از فراق تو خون دل از دو دیدہ ام
دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم چشمہ بہ چشمہ جو بہ جو

مہر ترا دل حزین بافتہ بر قماش جان
رشتہ بہ رشتہ نخ بہ نخ تار بہ تار و پو بہ پو

در دل خویش طاہرہ گشت: ندید جز ترا
صفحہ بہ صفحہ لا بہ لا پردہ بہ پردہ تو بہ تو

قرۃ العین کے اشعار فصاحت و بلاغت کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان میں بلند خیالی ہے۔ شوکت الفاظ ہے۔ وحدت و فنا کا متصوفانہ رنگ جھلکتا ہے۔ لفظ لفظ، حرف حرف، کلمہ کلمہ جذبات کی حدت کا پتہ دیتا ہے۔ اس کے ہر شعر میں ذاتیت اور داخلیت نظر آتی ہے۔ اس کے پر خلوص اشعار کا جواب مشکل ہی سے ملے گا۔

صفوی، افشاری، زندی دور کا نثری ادب

اس مختصر سی تاریخ میں یہ گنجائش نہیں کہ اس طویل زمانے کی تمام کتابوں کا پورا پورا جائزہ لیا جائے، لہٰذا اس عہد کی اہم کتابوں کے ذکر پر اکتفا کیا جائے گا۔

تاریخ و سیرت

صفوۃ الصفا۔ یہ کتاب صفویوں کے مورث اعلیٰ شیخ صفی الدین کی سوانح حیات ہے۔ اس کا مولف ابن بزاز ہے۔ مولف نے اس کتاب میں صفویہ خاندان کے حالات بڑی تفصیل سے لکھے ہیں۔ یہ سوانح حیات آٹھویں صدی ہجری میں لکھی گئی تھی۔

حبیب السیر۔ شاہ اسمٰعیل صفوی کے عہد میں ایک اہم تاریخ لکھی گئی، جو "حبیب السیر" کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں انسانی تاریخ کی ابتداء سے لے کر شاہ اسمٰعیل صفوی کی وفات تک کے حالات و واقعات درج ہیں۔ مولف غیاث الدین بن ہمام الدین خواندمیر ہے، جو "روضۃ الصفا" کے مولف محمد بن خاوند شاہ خواندمیر کا پوتہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جو تاریخ اتنے طویل زمانے کا احاطہ کیے ہوئے ہو، اس سے تفصیلات کی توقع نہیں کی جاسکتی، لیکن اختصار کے باوجود ایران کی تاریخ کا یہ ایک اہم ماخذ سمجھی جاتی ہے۔ "حبیب السیر" کا انداز بیان سادہ اور رواں ہے۔

متمم روضۃ الصفا۔ اسے "روضۃ الصفا" کا تکملہ سمجھنا چاہیے۔ اصل کتاب سات جلدوں میں لکھی گئی تھی۔ یہ ضخیم کتاب جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔ تیموری بادشاہ ابوالغازی سلطان حسین بالقیرا کے حالات پر ختم ہوگئی تھی۔ غیاث الدین خواندمیر نے اس کتاب کو مکمل کرنا چاہا، چنانچہ "روضۃ الصفا" کے ساتویں باب میں اور اضافہ کرکے اسے اپنے زمانے کے حالات تک وسعت دی۔ یہ سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہوا، بلکہ ایک اور ادیب و مورخ رضا قلی ہدایت نے "روضۃ الصفا" پر تین جلدوں کا مزید اضافہ کیا، اور واقعات کا سلسلہ ناصر الدین شاہ قاچار تک پہنچا دیا۔

احسن التواریخ۔ "احسن التاریخ" حسن بیگ روملو کی تالیف ہے۔ مولف کا شمار دسویں صدی ہجری کے فضلا میں ہوتا ہے۔ یہ تاریخ سنہ ۹۰۰ھ سے ۹۸۵ھ مطابق ۱۴۹۴ء تا ۱۵۷۷ء کے حالات پر مشتمل ہے، اور شاہ طہماسپ کے تفصیلی حالات کے لیے

بہت اہم سمجھی جاتی ہے۔ اس کی تکمیل ۹۸۵ھ میں ہوئی۔

زبدۃ التواریخ ۔ محمد محسن بن عبدالکریم اس تاریخ کا مؤلف ہے۔ اس میں صفویوں کے عہد آخر اور افغانوں کے ظہور کے حالات و واقعات درج ہیں۔ غالباً یہ سارے واقعات مؤلف کے اپنے چشم دید ہیں۔

تاریخ عالم آرائے عباسی ۔ یہ شاہ عباس اول اور اس کی اولاد کی تاریخ ہے۔ اس کا مؤلف سکندر منشی ہے، جو دربارِ صفویہ کا مشہور انشا پرداز تھا۔ تاریخِ عالم آرائے[1] عباسی ۱۰۲۵ھ مطابق ۱۶۱۶ء میں ہوئی۔ اس کا انداز تحریر سادہ اور روان ہے چند سطور نمونے کے طور پر درج کی جاتی ہیں۔ جس میں حمزہ میرزا کی امرائے تکلو سے جنگ کا ذکر کیا ہے۔

"پیشتر از طلوع صبح صادق، نواب جہانبانی زینت ماکہ عمۂ محترمہ آنحضرت و بانوی دولت خانۂ عالی بود، با دیگر حرم ہا و فرزندان وداع فرمودہ، آقاجان بیگ افشار را با قورچیان حرم بہ سر دولت خانہ تعین فرمودند۔ باد شائق المعارف الٰہی روی توجہ بمقابلہ اعدا آوردہ، بدستور گزشتہ چرچیان لشکر دست راست و دست چپ و قول، بقاعدہ مقرر ہر یک در مقام خود قرار گرفتند و قریب بظہر طلیعۂ لشکر معاندان ہویدا گشتہ، از کثرت گرد و غبار روی ہوا پوشیدہ گشت۔ بعد از آنکہ جمیع لشکر از پس کوہ برون آمدہ در بلندی پیسل بستند، سیاہی عظیم کہ علامت بست ہزار کس بود بنظر آمد۔ ملازمان موکب اقبال بتصور آنکہ مبادا کہ آن سیاہیٔ لشکر بودہ باشد، اندکی ہراسان گشتند و واہمہ عظیم در دل ہا افتاد و ایشان لحظہ در آن بلندی کوہ ایستادہ، از آنجا قدم در دشت نہادہ پیشتر آمدند و درین وقت مشخص شد کہ آن سیاہی شتران اردوی لشکر ایشان بود کہ بارکردہ ہمراہ آوردہ بودند۔"

---

[1] سبک شناسی جلد سوم ص ۲۸۰

نگارستان و جہان آرا - ان دونوں تاریخوں کا مؤلف قاضی احمد غفاری ہے۔
لب التواریخ یا تاریخ ایلچی نظام - شاہ یحییٰ بن عبداللطیف قزوینی کی تالیف ہے۔ شاہ طہماسپ کے حالات پر یہ بہت مستند تاریخ سمجھی جاتی ہے۔
تاریخ زندیہ - یہ تاریخ کریم خان زند اور اس کے جانشینوں کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس کا مولف علی رضا بن عبدالکریم ہے۔
تاریخ گیتی گشا - یہ بھی خاندانِ زندیہ کی تاریخ ہے اس کا مولف میرزا محمد نامی ہے۔
مجمل التواریخ - عہدہائے زند و افشار کی یہ ایک اہم تاریخ ہے۔ اس کا مولف ابوالحسن بن محمد امین گلستانہ ہے۔
تاریخ جہانگشای نادری - اس کا مؤلف ابوالحسن میرزا مہدی کوکبی استر آبادی ہے میرزا مہدی نادر شاہ کے مصاحبوں میں سے تھا۔ اسے نادر شاہ افشار کی مہموں میں ہمرکاب رہنے کے اکثر موقعے ملتے تھے۔ انشاء پردازی میں اس کی بڑی شہرت تھی، اس لیے تاریخ نویسی کی خدمت اس کے سپرد ہوئی۔ چنانچہ اس نے نادر شاہ کے حالات پر ایک ضخیم تاریخ لکھی، جو "تاریخ جہانگشای نادری" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ تاریخ مکمل نہ ہونے پائی تھی، کہ نادر شاہ قتل کر دیا گیا۔ اس قتل کے بعد میرزا مہدی نے تاریخ کے آخری حصّے کو از سرِ نو لکھا اور اس انقلاب کا بھی مفصل ذکر کیا، جو نادر شاہ کے دماغ میں آخری عمر میں آیا تھا۔ اس کے علاوہ میرزا مہدی نے ان سفاکیوں پر بھی روشنی ڈالی، جو نادر شاہ کے اس ذہنی انقلاب کا نتیجہ تھیں۔

تاریخ جہانگشا کا اسلوب بیان - تاریخ جہانگشائے نادری کا اندازِ بیان بہت تکلف آمیز اور صنائع بدائع سے پُر ہے۔ میرزا مہدی عموماً بہت طویل فقرے لکھتے ہیں اور عالمانہ انداز میں تمہید لکھتے ہیں اور زیرِ بحث واقعہ سے متعلق پورا پورا ماحول پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً

"ہنگام طلوع آفتاب کہ قہرمان قہر آلود صبح ،مہر از مل بدر کردہ ،بقصد انتقام تیغ از نیام برکشید و خدیو خورشید از سرکمین ،سوار برا یہ لباس سرخ شفق آراستہ ،با چہرہ برافروختہ و عارض تابناک برپشت خنگ برآمد خسرو بیہمال با ہئیات خشمگین و صورت سہمگین ،سوار بگران جہان پیما و خنجر گذران نیزہ دار و بہرام صولتان کیوان آثار ،ہالہ بدر رکاب ہلال آسا گشتہ۔ مسجد۔ میان بازار بقدم اقدس مسجود خاص و عام ساختند۔ ۔ ۔ ۔ "تاریخ جہاں کشائے نادری میں ۱۰۶۰ھ مطابق ۱۶۴۹ء تک کے حالات و واقعات ہیں۔

درۂ نادرہ ۔ میرزا مہدی کوکبی نے ایک اور کتاب "درۂ نادرہ،" اسی موضوع پر لکھی ہے ،جو عبارت آرائی ،اغلاق اور پیچیدگیوں کا مرقع ہے۔ ادبی مشکلات کی وجہ سے اس کا مطالعہ قارئین کو سخت گراں گزرتا ہے۔

ناسخ التواریخ ۔ یہ مفصل مگر نامکمل تاریخ عہد قاچاریہ میں لکھی گئی تھی۔ مولف میرزا تقی سپہر ،ناصر الدین قاچار کے دربار کا متوفی تھا۔ وہ ابھی گیارہ جلدیں ہی لکھ پایا تھا کہ فوت ہوگیا۔ یہ ایران کی تاریخ ہے ،جس کا آغاز ظہور اسلام سے ہوتا ہے آئمہ کے حالات عباس علی سپہر نے جلدوں میں لکھ کر اضافہ کر دیے۔ گویا اس صورت میں "ناسخ التواریخ" پندرہ جلدوں میں مکمل ہوگئی۔

"ناسخ التواریخ" کا اسلوب بیان سادہ اور پختہ ہے۔ اس میں قدما کے اسلوب کی پیروی کی گئی ہے۔ ناصر الدین نے میرزا تقی سپہر کو اس خدمت کے صلے میں "لسان الملک کا خطاب دیا تھا۔

جام جم ۔ فرہاد میرزا کی تالیف ہے ،تاریخ و جغرافیہ اس کا موضوع ہے۔

آئینہ سکندری ۔ یہ ایران قدیم کی تاریخ ہے۔ اس کا مؤلف آقا خان کرمانی ہے ،جو مرزا یحییٰ صبح ازل کا داماد تھا بابی تحریک سے متعلق ہونے کی وجہ سے یہ بھی ہجرت کر کے استنبول چلا گیا۔ "صد خطابہ" اور "سہ مکتوب" بھی اس کی تصنیفات ہیں۔

تاریخ منتظم ناصری - یہ تاریخ آغاز اسلام سے لے کر مولف کے زمانے تک کی عمومی تاریخ ہے - تین جلدوں میں لکھی گئی ہے - اس کا مولف محمد حسن خان صنیع الدولہ ہے، جو ناصر الدین قاچار کے دربار کا وزیر طباعات تھا۔

"تاریخ منتظم ناصری" کے علاوہ تاریخ کی چند اور کتابیں "مرآۃ البلدان" "تاریخ اشکانیان" "مطلع الشمس"، "المآثر والآثار"، "تاریخ فرانسہ" بھی مرزا حسن خان صنیع الدولہ کی یادگار ہیں۔

ماثر خاقانی اور حدائق جنان - دونوں کتابیں عبد الرزاق بیگ دنبلی کی تالیف ہیں۔ "ماثر خاقانی" قاچاری عہد کی تاریخ ہے - اور ۱۲۴۳ھ بمطابق ۱۸۲۷ء کے واقعات پر مشتمل ہے - اس کی عبارت سادہ اور رواں ہے -

"حدائق جنان" میں مولف نے اپنے ہم عصر علما اور خود اپنی سرگزشت بیان کی ہے - ان کے علاوہ کریم خان ژند اور اس کے خانوادے کے حالات لکھے ہیں - اس کتاب پر نظر ثانی کر کے اس نے اس کتاب کو "تجربۃ الاحرار و تسلیۃ الابرار" کے نام سے موسوم کیا ہے - "حدائق جنان" میں تاریخ وصاف کی سی بلاغت اور گلستان کی سی فصاحت پائی جاتی ہے - ایک حکایت کی چند سطور حسب ذیل ہیں -

حکایت[1] کرد کہ با جمعی از اہل وجد، از راہ نجد عازم بیت اللہ شدیم - از شوق وصال کعبہ مشتاقان خار مغیلان بر قدم گل دمن بود ولالہ تمنا در ریاض خاطر ہا می دمید و خار وادی بطحی دامن دل کشید - رفقا گفتند کہ در قبیلہ نجد، دختر قبلہ اہل وجد آمدہ، در جمال و کمال چوں سلمی و لیلی، چندین پرستارش در خیل است و دل ہا بنظارہ حسن آن دلربا، مانند مقناطیس در میل و خیام آن زیبا خرام از راہ منحرف

---

[1] حدائق الجنان ص ۲۹

بود، ومیل اعنہ ومطایا وجمال رفقا باعث تاخیر از جمال کعبۂ کمال می شد و زبان رہروان خجستہ خصال گویا باین مقال

ساربانا نشان کعبہ کجاست   کہ بمردیم در بیابانش

پای راہ پیمایان در ہوای آن ماہ سیما درگل، ومن از جدائی یاران پریشان دل۔"

تاریخ وجغرافیائے تبریز ۔ یہ کتاب فتح علی شاہ قاچار کے نواسے نادر میرزا کی تالیف ہے۔ تاریخ وجغرافیہ کے موضوع پر بہت مفید اور اہم سمجھی جاتی ہے۔ یہ تاریخ ناصر الدین شاہ کے زمانے میں ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۴ء میں مکمل ہوئی۔ تبریز میں اس زمانے میں مظفر الدین میرزا ولی عہد کی حکومت تھی، اسی نسبت سے یہ کتاب "جغرافیائے مظفری" کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس کی نثر کا انداز سادہ اور رواں ہے۔ تبریز کے سیلاب کے متعلق نمونے کے طور پر چند سطور ذیل میں لکھی جاتی ہیں۔ جو تبریز کے سیلاب سے متعلق ہیں۔

" بست روز پیش ازین داستان سیلی بزرگ آمدہ بود وبدین شہر خرابی ہا کردہ وچنان بود کہ نماز پیشین بی آنکہ بہ تبریز اثری از باران باشد آواز رعد از شرق بلند شد۔ تگرگ وبارش بسیار بدانسوی باریدہ سیل برخاست، از روستائی بارنج ہرچہ پیش آمد، از خانہ وحدیقہ واشجار بمالید وویران کرد۔ چون بمحاذات بقعۂ صاحب الامر رسید، یک طرف بازار مسگران ویران کرد وطرف جنوبی میدان راہمی کشاد وسراہا ویران کرد وبسیار مال از مردم نابود شد این سیل تا بہ نصف بازار جاری شد۔ بعضی از خانات نیز از لای مالا مال گردید۔ چند گرمابہ نیز انباشتہ شد۔ مجرای رود تا رود آجی، ہمہ جا خرابی ہا روی داد۔ گفتند بچہار دہ ہزار خانہ صدمہ رسید۔ آب سیل بالوی زشت بود۔

این واقعہ روز ہفدہم جمادی الاول یک ہزار و دویست وہشتاد وہشت از ہجرت بود۔"

گنج دانش ۔ محمد تقی خان کی تالیف ہے۔ اس میں ایران کے شہر جل، مشہور

لوگوں اور بعض تاریخی واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ سال تالیف ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۷ء ہے۔

اس دور میں سلاطین قاچار کی بعض خصوصی تاریخیں "مآثر سلطانیہ" مؤلفہ عبدالرزاق بن نجف علی، "تاریخ صاحبقرانی" مولفہ محمود میرزا، "تاریخ ذوالقرنین" مولفہ فضل اللہ منشی بھی لکھی گئیں۔ یہ تینوں تاریخیں فتح علی شاہ قاچار کے نام منسوب ہیں۔

تذکرے

تحفہ سامی۔ اس تذکرے میں نویں صدی ہجری سے دسویں صدی ہجری کے وسط تک کے شعراء کے حالات لکھے گئے ہیں۔ ۹۵۷ھ مطابق ۱۵۵۰ء میں یہ تذکرہ مکمل ہوا۔ اس کا مولف شاہ اسمٰعیل صفوی کا بیٹا سام مرزا ہے جسے ۹۸۳ھ مطابق ۱۵۷۵ء میں شاہ اسمٰعیل دوم کے حکم سے مروا دیا گیا تھا۔

مجالس النفائس۔ تیموری بادشاہ ابوالغازی سلطان حسین کے وزیر امیر علی شیر نوائی کی تالیف ہے۔ اس میں مؤلف نے اپنے ہم عصر شعرا اور ادیبوں کے حالات ترکی زبان میں لکھے ہیں۔ شاہ عباس کے زمانے میں ایک شخص شاہ علی نے اس کا ترجمہ فارسی میں کیا۔

ہفت اقلیم۔ امین احمد رازی نے "ہفت اقلیم" کے نام سے ایک مشہور جغرافیائی تذکرہ لکھا، اس میں سات ممالک کے حالات بیان کیے گئے ہیں اسی لحاظ سے یہ تذکرہ ہفت اقلیم کے نام سے موسوم ہوا۔ اس میں مولف نے علاقہ وار شعرا کے حالات لکھے ہیں۔ یہ ضخیم کتاب چھ سال کے عرصے میں مکمل ہوئی۔ سال تکمیل ۱۰۰۲ھ مطابق ۱۵۹۳ء ہے۔

مجالس المومنین۔ یہ تذکرہ شیعہ علما اور شعرا کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس کے مؤلف قاضی نور اللہ شوستری ہیں۔ اکبر اعظم کے عہد میں آپ ایران سے چل کر پاک و ہند آئے اور لاہور میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اکبر نے آپ کے علم و فضل کی شہرت سن کر آپ کو لاہور کا قاضی مقرر کر دیا۔ "مجالس المومنین" آپ نے لاہور

ہی میں سنہ ۱۰۱۰ھ بمطابق سنہ ۱۶۰۱ء میں مکمل کی۔ آپ کا انجام اچھا نہ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ جہانگیر نے مذہبی اختلافات کی بنا پر آپ کو سنہ ۱۰۱۹ھ بمطابق سنہ ۱۶۱۰ء میں قتل کروا دیا۔

آتشکدۂ آذر۔ "آتشکدۂ آذر" عہدِ قاچار کا ایک مشہور تذکرہ ہے۔ اس کے مؤلف لطف علی بیگ آذر بیگدلی ہیں۔ سنہ ۱۱۳۴ھ بمطابق سنہ ۱۷۲۱ء میں اصفہان میں پیدا ہوئے اور قم میں تعلیم پائی۔ شعر بھی کہتے تھے نظم میں "یوسف و زلیخا" کے نام سے ایک مثنوی آپ کی یادگار ہے۔

مؤلف نے آتشکدہ میں "تذکرہ ہفت اقلیم" کی طرح علاقہ وار شعرا کے حالات لکھے ہیں جن کی تعداد ۸۴۲ ہے۔ اس تذکرے میں شعرا کے حالاتِ زندگی کیساتھ ساتھ ان کے کلام کے نمونے بھی دیئے ہیں۔

ریاض العارفین۔ رضا قلی ہدایت نے صوفی شعرا کا تذکرہ لکھا ہے جو ریاض العارفین کے نام سے موسوم ہے۔

رضا قلی اپنے زمانے کے ایک مشہور ادیب، مؤرخ اور شاعر تھے۔ ہدایت تخلص کرتے تھے۔ لقب آپ کا اللہ باشی تھا۔ ریاض العارفین کے علاوہ ذیل کی کتابیں بھی آپ کی یادگار ہیں۔

مجمع الفصحا۔ "مجمع الفصحا" شعرا کا ایک مشہور تذکرہ ہے، جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس تذکرے میں ۷۰۰ شعرا کے حالات اور کلام کے نمونے درج ہیں۔ اس لحاظ سے مجمع الفصحا تاریخ ادبیات ایران کا نہایت مفید ماخذ ہے۔ اس کی زبان سادہ اور روان ہے۔

روضۃ الصفا کے تین باب۔ جیسے کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔ روضۃ الصفا کا ساتواں باب نامکمل رہ گیا تھا جسے مؤلف کے پوتے خواندمیر نے مکمل کیا۔ خواندمیر کے بعد رضا قلی ہدایت نے تین اور جلدیں لکھیں۔ آٹھویں جلد صفویہ اور افشاریہ دور کی تاریخ ہے۔ نویں اور دسویں جلد قاچاری دور سے متعلق ہے۔ یہ تینوں جلدیں مولف نے دو سال کے

عرصے میں مکمل کیں، اور روضۃ الصفا کے ساتھ شامل کر دیں۔ گویا ان جلدوں کے اضافے سے روضۃ الصفا کی سات کی بجائے دس جلدیں ہو گئیں۔

انجمن آرا۔ ان مذکورہ کتابوں کے علاوہ ایک لغت بھی رضا قلی ہدایت کی یادگار ہے۔ جو انجمن آرا کے نام سے موسوم ہے۔

نامہ دانشوران۔ قاجاری دور کی یہ بھی ایک مشہور کتاب ہے۔ اسے فارسی زبان کا انسائیکلوپیڈیا سمجھنا چاہیے۔ "نامۂ دانشوران" شمس العلما عبدرب آبادی میرزا ابو الفضل صاوہ، میرزا حسن خان طالقانی، شیخ عبدالوہاب قزوینی اور ملا آقا کی متفقہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ناصر الدین کے عہد کے یہ مشہور عالم تھے جنھیں ناصر الدین کے وزیر اعتضاد السلطنت نے اس علمی خدمت کے لیے انتخاب کیا تھا۔ ان علما کی متفقہ کوششوں سے یہ تذکرہ حرف "شین" تک لکھا گیا اور طبع بھی ہوا۔ اس عرصے میں زندگی نے بعض علما کا ساتھ نہ دیا۔ چنانچہ عبدرب آبادی نے ایک اور عالم غیاث ادیب کی مدد سے اس تذکرے کو مکمل کیا۔ نامہ دانشوران سات جلدوں پر مشتمل ہے اس میں ایران کے علما، اور ادبا کے مستند حالات لکھے گئے ہیں۔

تذکرہ تقی الدین کاشانی۔ یہ عہد صفویہ کے شعرا کا تذکرہ ہے۔ ابھی تک یہ تذکرہ شائع نہیں ہو سکا۔

نجوم السما۔ یہ شیعہ علما[1] کا تذکرہ ہے۔ میرے مطالعے سے یہ تذکرہ نہیں گزرا۔ اس کا مؤلف مرزا محمد علی اور اس کا سال تالیف ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۶۹ء ہے۔

قصص العلماء۔ یہ محمد بن سلیمان تنکابنی کی تالیف ہے۔ سال تالیف ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء ہے اس میں ۱۵۰ شیعہ علما کا حال لکھا گیا ہے۔

تذکرۃ الخطاطین۔ یہ تذکرہ خوشنویسوں کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس میں

---

[1] سبک شناسی جلد سوم۔ حاشیہ ص ۲۸۰۔ رضا زادہ شفق نے نجوم السما کے مؤلف کا نام محمد صادق ابن مہدی لکھا ہے۔

بعض مشہور خوشنویسوں کے قطعات کے نمونے بھی دیئے گئے ہیں۔

مذہب اور فلسفہ کی کتابیں

جامع عباسی - اس کے مصنف ایک مشہور شیعہ فقیہہ شیخ بہاء الدین محمد بن حسین عاملی ہیں۔ نام کی نسبت سے آپ کو لوگ "شیخ بہائی" کہتے تھے۔ ملک شام کا ایک مشہور شہر "جبل عامل" آپ کا وطن تھا۔ سال پیدائش ۹۵۳ھ مطابق ۱۵۴۶ء اور سال وفات ۱۰۳۱ھ مطابق ۱۶۲۱ء ہے۔

"جامع عباسی" علم فقہ پر ایک جامع کتاب ہے۔ اس کتاب کے علاوہ "خلاصۃ الحساب" "تشریح الافلاک" اور "اربعین" بھی آپ کی علمی یادگاریں ہیں۔ ایک کتاب آپ نے "کشکول" کے نام سے بھی لکھی ہے، جو مختلف حکایات، ضرب الامثال اور عربی اور فارسی کے اشعار کا مجموعہ ہے۔

گوہر مراد - یہ کتاب حکمت اور علم الکلام سے متعلق ہے۔ عبدالرزاق بن علی بن حسین لاہجی اس کے مؤلف ہیں۔

اسرار الحکم - علم الٰہیات پر یہ ایک مشہور کتاب ہے۔ اس کے مولف حاجی ملا ہادی سبزواری ہیں۔ اس دور کی بعض اور کتابوں کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

محمد باقر مجلسی نے دینی مسائل پر متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں عین الحیات، مشکوٰۃ الانوار، حلیۃ المتقین، معراج مومنین، حق الیقین، حیات القلوب جلا العیون خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اس دور میں ایک بزرگ فتح اللہ کاشانی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی مشہور کتاب "نہج البلاغۃ" کا ترجمہ "تنبیہ العالمین" کے نام سے کیا۔

رفیع الدین محمد واعظ قزوینی کی کتاب "ابواب الجنان" اور احمد بن مہدی کی کتاب "معراج السعادت" بھی اس دور کی مشہور کتابیں ہیں۔

اخلاقیات کے متعلق نصیر الدین استر آبادی نے "محاسن الآداب" تالیف کی۔ "زبدۃ التصانیف" اور شجرۃ الٰہیہ علی الترتیب حیدر خوانسالاری اور حیدر رفیع الدین کی تصنیفیں ہیں۔

لغت کی کتابیں

"فرہنگِ جہانگیری" جہانگیر کے عہدِ حکومت میں لکھا گیا، اور جہانگیر ہی کے نام منسوب ہوا۔ سالِ تالیف ۱۰۷۰ھ مطابق ۱۶۵۹ء ہے۔ اس لغت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں الفاظ کے معنی لکھتے ہوئے سند کے طور پر مشہور اساتذہ کے اشعار بھی لکھے گئے ہیں۔

مدار الافاضل ۔ یہ لغت اللہ داد فیضی سرہندی اسد العلما علی شیر الہندی کی تالیف ہے۔ سالِ تالیف ۱۰۰۱ھ مطابق ۱۵۹۲ء ہے۔ یہ لغت پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر کے زیرِ اہتمام طبع ہو رہا ہے۔

مجمع الفرس ۔ اس کے مصنف محمد قاسم کاشانی ہیں۔ سالِ تالیف ۱۰۸۰ھ مطابق ۱۶۶۹ء ہے۔

برہانِ قاطع ۔ یہ بہت جامع لغت ہے، جو محمد حسین بن خلف تبریزی برہان نے مرتب کیا ہے۔ اس میں یونانی اور عربی زبان کے ان الفاظ کے معنی دیئے گئے ہیں، جو فارسی میں رائج تھے۔ سالِ تالیف ۱۰۶۰ھ مطابق ۱۶۴۹ء ہے۔ یہ لغت دکن کے بادشاہ عبداللہ قطب شاہ کے نام منسوب ہے حال ہی میں اس لغت پر نظرِ ثانی کر کے دوبارہ شائع کرایا گیا ہے۔

فرہنگ رشیدی ۔ اس کا مؤلف عبدالرشید ہے، جو اورنگ زیب کے دربار سے وابستہ تھا۔ اس فرہنگ کا سال تالیف ۱۰۶۴ھ مطابق ۱۶۵۳ء ہے۔

غیاث اللغات ۔ یہ عظیم لغات محمد غیاث الدین کی تصنیف ہے۔ سالِ تالیف ۱۰۲۰ھ مطابق ۱۶۱۱ء ہے۔ اس لغت کے ترتیب دینے میں مصنف نے بڑی

تحقیق سے کام لیا ہے۔ فرہنگ جہانگیری، فرہنگ رشیدی اور برہان قاطع کی طرح یہ لغت بھی فارسی زبان کے لیے برصغیر پاک و ہند کا ایک عظیم تحفہ ہے۔

جہان آرا۔ جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔ یہ رضا قلی ہدایت کی تالیف ہے۔ مؤلف نے اس پر ایک مقدمہ لکھا ہے، جس میں مختصر طور پر زبان کی تاریخ بھی لکھی ہیں۔

عربی نویس علماء

صفوی اور قاچاری دور میں بعض ایسے ایرانی علما بھی تھے، جنھوں نے عربی زبان کو اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا اور اپنے علمی کارناموں سے اسلامی علوم کے ذخیرے میں اضافہ کیا۔ ان کا مختصر سا ذکر کیا جاتا ہے۔

میر داماد۔ میر محمد باقر نام اور میر داماد لقب تھا۔ یہ لقب آپ کے والد سید محمد کو شیخ علی ابن العلی کے داماد ہونے کی وجہ سے ملا تھا۔ ان کے بعد محمد باقر کو بھی لوگ اسی لقب سے خطاب کرنے لگے۔ آپ نے عربی زبان میں متعدد کتابیں تصنیف کیں جن میں مسائل حکمت پر دو کتابیں "صراط مستقیم" اور "تقدیسات" خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ آپ نے دین و حکمت کے مسائل پر بھی ایک کتاب تصنیف کی، جو "کشف الحقائق" کے نام سے موسوم ہے۔

ملا صدرا۔ صدر الدین محمد شیرازی نام اور "ملا صدرا" لقب تھا۔ میر داماد و شیخ بہائی کے شاگرد تھے۔ آپ اپنے زمانے کے بہت بڑے فلسفی سمجھے جاتے تھے۔ "اسفار"، "شواہد ربوبیہ"، "مشاعر" اور "المبداء والمعاد" آپ کی مشہور تصنیفات ہیں۔

ملا محسن۔ ملا صدرا کے شاگرد اور اپنے زمانے کے مشہور فقیہہ اور فلسفی تھے۔ علم حکمت پر "اصول المعارف" اور "کلمات مکنونہ"، علم تفسیر پر "صافی" اور علم حدیث پر "وافی" آپ کی مشہور کتابیں ہیں۔

زبدۃ التواریخ - یہ تاریخ عبدالحق کے بیٹے نورالحق کی تالیف ہے، جو قطب الدین ایبک کے عہد سے شروع ہو کر اکبرِ اعظم کے عہد پر ختم ہوئی ہے۔

انفع الاخبار - یہ تاریخ ایک دیباچہ اور دس ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں پیغمبران قدیم، شاہانِ ایرانِ قدیم، پیغمبر اسلام ص، خلفائے راشدین، دوازدہ امام عہد امیہ، خلفائے عباسیہ، خاندانِ طاہریہ، سامانیہ، بویہ، دیالمہ اور خاندانِ سلجوقیہ، فرقہ اسمٰعیلیہ اور خاندانِ تیموریہ کے حالات لکھے گئے ہیں۔ اس کے مؤلف محمد امین بن دولت محمد الحسینی ہیں۔

اکبر نامہ - ابوالفضل کا یہ عظیم کارنامہ دو جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد میں تیمور سے بابر تک کے حالات ہیں۔ دوسری جلد میں عہدِ ہمایوں اور عہدِ اکبر کے سال بہ سال واقعات درج ہیں۔ اس کی زبان سہل اور روان ہے۔ ۱۸۶۷ء مطابق ۱۲۸۴ھ میں مہاراجہ پٹیالہ نے اسے اپنے ذاتی خرچ سے چھپوایا تھا۔

آئینِ اکبری - یہ ضخیم کتاب بھی اگرچہ ابوالفضل کی جداگانہ تصنیف ہے، جو دو جلدوں میں ہے۔ لیکن موضوع کے اعتبار سے اسے اکبر نامہ ہی کی تیسری اور چوتھی جلد سمجھنا چاہیے۔ آئینِ اکبری، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، امور سلطنت خصوصاً بندوبست اور مالگذاری کے آئین و قواعد کا ایک ضابطہ ہے۔ اس کی زبان بھی اکبر نامہ کی طرح سہل اور روان ہے۔ فقرات چھوٹے چھوٹے ہیں۔

ابوالفضل نے نصر اللہ عبدالحمید کی تالیف کلیلہ و دمنہ کو پھر سے آسان فارسی میں لکھا اور اسے "عیارِ دانش" کا نام دیا۔

ابوالفضل کی ایک اور عظیم تصنیف دفترِ ابوالفضل یا انشاء ابوالفضل ہے۔ یہ اُن خطوط کا مجموعہ ہے، جو ابوالفضل نے وقتاً فوقتاً مختلف حکمرانوں اور امراء و رؤسا کے نام لکھے تھے۔

اسلوبِ بیان - نثر نگار کی حیثیت میں ابوالفضل کا پایہ بہت بلند ہے۔ اس کا ایک خاص اسلوبِ بیان ہے، جو اسے دوسرے ادیبوں سے ممتاز کرتا ہے۔ اس کے

الفاظ اور فقرات میں بڑا شکوہ ہے۔ اس کے علاوہ اس کے خیالات کے بہاؤ میں اتنا زور ہے کہ معلوم ہوتا ہے الفاظ اور خیالات کے سمندر میں طوفان اٹھ رہا ہے۔ انشاء ابوالفضل کے فقرات عموماً پیچیدہ اور طویل ہوتے ہیں۔ لیکن فنی خوبی کے لحاظ سے ان میں موزونیت بہت ہوتی ہے۔ فقروں پر فقرے کچھ اس طرح موزوں ہوتے چلے آتے ہیں، جیسے دریا کی لہریں اٹھتی اور بڑھتی چلی آتی ہیں۔ ان کے اسلوب بیان کی کوئی پیروی نہیں کر سکا۔ بخارا کا حکمران عبداللہ کہا کرتا تھا کہ اسے اکبر اعظم کے تیروں سے اتنا ڈر نہیں لگتا تھا، جتنا کہ ابوالفضل کے قلم سے ڈر ہے۔ ذیل میں ایک خط کا اقتباس دیا جاتا ہے، جو ابوالفضل نے عبداللہ ازبک والی بخارا کو لکھا تھا۔ " رابطۂ خلّت وصفا، واسطۂ محبت وولا، یعنی کلام مصافات پیام، موالات التیام، کہ در مطاوی رقیمہ نیاز، و فحاوی غیقۂ انیقہ عالی مرتبت و معالی منقبت سلطنت دابہت پناہ، رفعت و شوکت دستگاہ، فارس مضمار شہامت دایالت، مرتقی مدارج نصفت و عدالت، نقادۂ دودمان عزّ و علا، عصارۂ خاندان مجد و اعتلا، مطرح اشعۂ بوارق الٰہی، مجلی انوار شوارق آگاہی، مشید ارکان شجاعت و حشمت و موسس بنیان بسالت و عظمت مسند نشین محفل عزّ و اقبال، صدر آرای بارگاہ جاہ و جلال لازالت ارکان مجدہٗ مشیّدۃً بالدّ دام و دعاسم دولتہ موسّسۃ ۔" بحسن الانتظام مندرج و مندمج بود و نسبت قرابت و محبت سابقہ را تاکیدی و تشئیدی، و قواعد صداقت صمیمی را تمہیدی رفتہ بود، بظہور پیوست۔ مورث صفای خاطر و مثمر انجلای باطن و ظاہر شد۔ مبانی یکجہتی و یگانگی استحکام پذیرفت و قوائم دوستی و یکتا دلی انتظام گرفت۔

طبقات اکبری۔ اس تاریخ کا مؤلف خواجہ نظام الدین احمد ہے۔ مؤلف کے نام کی نسبت سے اس کو "تاریخ نظامی" بھی کہتے ہیں۔ یہ ہندوستان کی بہت مستند

اطلال ودمن، حدیثِ قافلہ، منزل، وصفِ بیابان، صحبت خارِ مغیلاں، ساربان، اہلِ عرب کے خاص کلمات وتراکیب ہیں۔ منوچہری کے قصائد کے علاوہ امیر معزّی کے قصائد میں بھی ان کا ذکر آتا ہے۔ مثلاً

ای ساربان منزل مکن جز در دیار یار من
تا یک زمان زاری کنم بر ربع و اطلال و دمن

ربع از دلم پرخون کنم خاک دمن گلگوں کنم
اطلال را جیحون کنم از آب چشم خویشتن

بر جائے رطل و جام می گوران نهادستند پی
بر جای چنگ و نای و نی آوای زاغ است و زغن

آن جا که بود آن دلستان با دوستان در بوستان
شد گرگ و روبه را مکان شد گور و کرگس را وطن

سبک خراسانی۔ ایران میں عربوں کا تسلط ہوا، تو ایران کی زبان "پہلوی" کی جگہ رفتہ رفتہ عربی نے لے لی۔ لیکن جب ۱۳۲ھ مطابق ۷۴۹ء میں بنو عباس کی خلافت قائم ہوئی، تو ایران میں حب الوطنی کی روح بیدار ہوئی، اور ایرانی علماء اور شعرا نے فارسی زبان کی احیا پر توجہ دی، چنانچہ خراسان کی وسیع اور حسین سرزمین پر فارسی زبان وادب نے دوبارہ جنم لیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے پہل آل طاہر، صفار اور آل سامان کی خودمختار وطنی حکومتیں یہیں قائم ہوئیں۔ اور یہیں سے ایران قدیم کی بنیادیں پھر سے اٹھائی گئیں۔ اور یہاں ہی حکمرانوں نے شعرا و علماء کو فارسی زبان و ادب کی طرف متوجہ کیا۔ ابوسلیک گورگانی، شہید بلخی، رودکی، ابوشکور بلخی، دقیقی، کسائی مروزی اس زمانے کے مشہور شاعر تھے۔ جنھوں نے فارسی میں قصیدے کہے۔

سامانیوں کی حکومت ختم ہوئی، تو ۳۵۱ھ مطابق ۹۶۲ء میں غزنوی دور کا آغاز

ہوا، جو ایران میں ۴۲۹ھ مطابق ۱۰۳۷ء تک قائم رہا۔ غزنوی حکومت کا مرکز بھی خراسان ہی تھا، انھوں نے اپنے پیش رو حکمرانوں کی پیروی کی علما و شعرا کو سرکار دربار میں جگہ دی، اور فارسی شعر و ادب کی ترویج و اشاعت ہونے لگی اور عنصری، فرخی، منوچہری، غضائری، فردوسی، مسعود سعد سلمان ایسے درخشندہ ستارے آسمان ادب پر چمکے۔ ان کی سخن سرائیوں سے شعر و ادب کا پایہ اور بھی بلند ہو گیا۔ غزنویوں کے آخری تاجدار مودود بن مسعود کو سلجوقیوں نے شکست دے کر غزنوی عہد کا خاتمہ کیا، اور سلجوقیہ عہد کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے خراسان کے ساتھ عراق کو بھی سلجوقی حکومت کا مرکز بنایا۔ سلجوقی حکمران اگرچہ بیاباں نشین تھے، لیکن شعر و ادب کی ترقی میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اُن کی فیاضیوں کا یہ اثر ہوا کہ خیام، انوری، رشید الدین وطواط، ادیب صابر اور امیر معزی ایسے نامور شعراء نے شعر و ادب کے سرمایے میں اور اضافہ کیا۔ ان سب شعرا کا ایک خاص اسلوب نگارش ہے۔

ایران کے پہلے شاعر رودکی ہیں، جنھوں نے فارسی تشبیب و قصیدہ میں خاص ادبی روایات قائم کیں۔ اور اس طرح ایک خاص سبک شعر وجود میں آیا۔ اس کا بانی خراسان کے سامانی دربار سے وابستہ تھا۔ جو طاہریوں اور صفاریوں کا بھی گہوارہ تمدن رہ چکا تھا اس لیے یہ سبک شعر "سبک خراسانی" کے نام سے موسوم ہوا۔

سبک خراسانی کی بعض خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ سبک خراسانی کے پیرو طویل قصیدے لکھتے ہیں اور ان کے خیالات میں منطقی استدلال پایا جاتا ہے۔

۲۔ قصیدے کے الفاظ بہت پر شکوہ ہوتے ہیں۔

۳۔ حسنِ کلام کے لیے تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیتے ہیں۔ ان کی تشبیہیں اور استعارے عموماً قدرتی اور فہم انسانی سے قریب تر ہوتے ہیں۔

۴ - مضامین میں تسلسل اور ترتیب پائی جاتی ہے ۔

۵ - مناظر قدرت اور مظاہر فطرت ان کے محبوب موضوع ہیں، مثال کے طور پر فرخی اور ابو شعیب صالح ہروی کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں ۔

تا پرند نیلگوں بر روی پوشد مرغزار
پرنیان هفت رنگ اندر سر آرد کوهسار

خاک را چون ناف آهو مشک زاید بی قیاس
بید را چون پرّ طوطی برگ روید بی شمار

دوش وقت نیم شب بوی بهار آورد باد
حبذا باد شمال و خرّما بوی بهار

راست پنداری که خلعت های رنگین یافتند
باغ های پر نگار و داغ گاه شهریار

داغ گاه شهریار اکنون چنان خرم بود
کاندرو از نیکوی خیره بماند روزگار

سبزه اندر سبزه بینی چون سپهر اندر سپهر
خیمه اندر خیمه بینی چون حصار اندر حصار

بر در پرده سرای خسرو پیروز بخت
از پی داغ آتشی افروخته خورشید وار

ابو شعیب صالح ہروی نے محبوب کا سراپا اشعار میں پیش کیا ہے ۔

دوزخی کیشی، بهشتی روی و قد
آهو چشمی، حلقه زلفی، لاله خد

لب چنان کز خامهٔ نقاش چین
بر چکد بر سیم از شنگرف مد

سبک خراسانی کے بانی رودکی ہیں اور اس کے پیرو عنصری، فردوسی، منوچہری، فرخی اور ناصر خسرو ہیں۔

سبکِ عراقی ۔ سبک خراسانی کے پیرو ابھی نغمہ سرائی کر ہی رہے تھے کہ عراق عجم (اصفہان، ری اور آذربائیجان) کے شعراء نے الگ اپنا ایک سبکِ شعر قائم کیا۔ جو "سبک عراقی" کے نام سے موسوم ہوا۔ "سبک عراقی" چھٹی صدی ہجری میں شروع ہوا، اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے آٹھویں صدی ہجری میں عروج پر پہنچ گیا۔

"سبک عراقی" کی بعض خصوصیات جو اسے "سبک خراسانی" سے ممتاز کرتی ہیں، حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ سبک عراقی کے بانیوں نے قصیدے کی نسبت غزل کو زیادہ توجہ دی۔ اور غزل کی زبان میں لطافت پیدا کی۔

۲۔ یہ شعراء شعر و سخن میں تخیل کو بروئے کار لائے۔

۳۔ سبک عراقی کے پیرووں نے جذبات انسانی کا اظہار بڑی خوبی سے کیا ہے۔

۴۔ "سبک عراقی" کے پیرو دور از فہم تشبیہوں اور لفظی صنعت گریوں سے بھی کام لیتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کے کلام میں بلند معانی ہوتے ہیں۔

۵۔ اس سبک شعر میں تصوف و عرفان کی متعدد اصطلاحات دیکھنے میں آتی ہیں، مثلاً مے، ساغر، پیرِ میکدہ، پیرِ مے فروش، پیرِ مغان، آتشِ عشق، آتشِ وحدت، بتکدہ، صنم، مُرغ زند خوان۔ یہ اصطلاحیں پانچویں صدی کے آخر اور چھٹی صدی کے شروع میں زینتِ اشعار نہیں۔ چوتھی صدی کی ادبیات میں ان کا وجود نظر نہیں آتا۔ "سبک عراقی" کے پیرووں نے ان اصطلاحات کے ساتھ ساتھ بعض اصطلاحات شریعتِ اسلام سے بھی مستعار لیں، مثلاً کعبہ، مسجد، محراب، منبر، موذن، آبِ زلال وغیرہم۔ مثلاً

گہ محرم عید ند ہمہ کعبہ ستایان

تو محرم مے باش و مکن کعبہ ثنائی

۶۔ "سبک عراقی" کی ایک نمایاں خصوصیت شاعرانہ افکار اور عارفانہ عقائد کا امتزاج ہے۔ یہ امتزاج حافظ شیرازی کی غزلیات میں بدرجۂ احسن نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک غزل کے چند شعر حسب ذیل ہیں۔

سالہا سال طلب جام جم از ما می کرد
وآنچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا می کرد

گوہری کز صدف کون و مکان بیرون است
طلب از گم شدگان لب دریا می کرد

مشکل خویش بر پیر مغان بردم دوش
کو بتائید نظر حل معما می کرد

دیدمش خرم و خندان قدحی بادہ بدست
و اندر آں آئینہ صد گونہ تماشا می کرد

گفتم این جام جہان بین تو کی داد حکیم
گفت آنروز کہ این گنبد مینا می کرد

"سبک عراقی" کے مشہور داعی اور پیرو کمال الدین اصفہانی، جمال الدین اصفہانی، نظامی گنجوی، خواجو کرمانی، سعدی اور حافظ ہیں۔

بعض جدید ایرانی نقادوں نے "سبک عراقی" کو صرف عراق عجم یعنی اصفہان ری اور آذربائیجان کے شعرا کے لیے مختص کیا ہے اور شیراز (فارس) کے شعرا کو جنھوں نے یہ سبک اپنایا ہے۔ ایک نئے سبک یعنی "سبکِ فارسی" کا بانی بتایا ہے۔ گویا ان کے نزدیک کمال الدین، جمال الدین، نظامی وغیرہم "سبک عراقی" کے پیرو ہیں اور سعدی و حافظ "سبک فارسی" کے بانی ہیں۔

سبک ہندی۔ فارسی شاعری کا ایک اور اسلوب "سبک ہندی" ہے۔ سبک

ہندی، سبک عراقی اور سبک خراسانی سے بعض اعتبارات سے مختلف ہے۔ یہ تو متعین نہیں ہو سکتا کہ "سبک ہندی" کا نقطہ آغاز کہاں ہے۔ البتہ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ جب فارسی ادب پر ترکی طرزِ فکر اثر انداز ہوا، تو شاعری کی ایک نئی روایت قائم ہوئی، جس نے بعد میں "سبک ہندی" کا نام پایا۔

سنہ ۴۳۰ھ مطابق سنہ ۱۰۳۸ء میں جب ایران میں سلجوقی دور کا آغاز ہوا۔ تو اس قبیلے کے کچھ لوگ روم میں بھی پہنچے، اور وہاں بھی انھوں نے سلجوقی حکومت قائم کی۔ ایران اور روم (ایشیائے کوچک) کے سلجوقی ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے تھے، چنانچہ ان کے باہمی ربط و تعلق کی وجہ سے رومی دربار میں بھی فارسی کا چرچا ہوا۔ اس تعلق کی بنا پر کئی عارف مثلاً شہاب الدین سہروردی، نجم الدین رازی اور مولانا جلال الدین کے والد مولانا بہاء الدین روم آئے اور قونیہ میں مستقل سکونت اختیار کی۔ ان کے آنے سے فارسی زبان و ادب کی اور بھی اشاعت ہوئی۔ رفتہ رفتہ ترکی اور فارسی کے امتزاج سے ایک نیا فارسی ادب پیدا ہوا، جس کا بانی مولانا جلال الدین رومی کا بیٹا سلطان ولد مصنف "ابتدا نامہ" ہے۔

نئے فارسی ادب میں یہ خصوصیت پیدا ہوئی کہ کلمات، تراکیب اور اصطلاحات تو وہی ایرانی رہیں۔ لیکن اندازِ فکر رومی ہو گیا۔ خیال بندی ترکوں کے امتزاج کا خاصہ تھا، جیسا کہ ترکی شاعری سے پتا چلتا ہے۔ اس لیے فارسی شعر و ادب میں بھی خیال بندی کا عنصر شامل ہوا۔ اس سے رفتہ رفتہ ایران کے وہ شعرا بھی متاثر ہوئے۔ جو تیموری اور ترکمان، درباروں سے وابستہ تھے۔ خیال بندی کا یہ اسلوب ہی بعد میں "سبک ہندی" کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ نیا انداز تیموری دور کے بادشاہوں کو بہت پسند تھا۔ آخری تیموری بادشاہ سلطان حسین بالقیرا اور اس کا وزیر امیر علی شیر نوائی تو اس اسلوب کے شیدائی تھے۔ اس لیے شعرا بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

بابا فغانی نے اسی اسلوب کی پیروی کی۔ چنانچہ اس کے کلام میں ہمیں سبک ہندی کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔ جیسا کہ بابا فغانی کے باب میں ذکر آچکا ہے۔ خیال بندی کا یہ اسلوب ہندی ذہنوں سے قریب تر تھا اس لیے پاک و ہند کے شعرا نے اس اسلوب کو ترقی دے کر عروج تک پہنچایا۔ یہ نئی ادبی روایت اپنی نمایاں صورت میں ہمیں اس وقت نظر آتی ہے۔ جب ایران میں صفوی حکومت قائم ہوئی۔ اور پاک و ہند میں مغلیہ حکومت کا علم لہرایا۔ اکبری دور کے کم و بیش تمام شعرا اسی سبک شعر کے پیرو ہیں۔ چنانچہ فیضی، عرفی، نظیری ایسے جلیل القدر شعرا کا اسلوب بیان اس نئی ادبی روایت یعنی سبک ہندی کا احسان مند ہے۔ اکبری دور کے بعد جہانگیر اور شاہجہان کے عہد میں طالب آملی، ابوطالب کلیم، صائب اور قدسی مشہدی وغیرہم شعرا نے جو نغمے الاپے، ان کی تان غالب پر آکر ٹوٹی۔ غالب سے پہلے مرزا عبدالقادر بیدل اور ناصر علی سرہندی ہوئے۔

سبک ہندی کی بعض خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ سبک ہندی کی نمایاں خصوصیت خیال بندی ہے۔ شاعر ایک خیال سے کچھ اس طرح نکتہ آفرینیاں کرتا چلا جاتا ہے کہ شعر، فکر کا ایک تار عنکبوت بن کر رہ جاتا ہے۔ عرفی اور غالب کو اس فن میں کمال حاصل ہے۔ مثال کے طور پر عرفی کا ایک شعر پیش کیا جاتا ہے۔

مشتِ سوزن بدلم زان سرہ تار یختہ اند

گریہ از پارۂ دل دوختہ پیراہن چشم

یعنی مژگان دلدار سے مٹھی بھر سوئیاں اس لیے میرے دل میں ڈالی گئی ہیں کہ خیاط گریہ سے کہا جائے کہ دل کے ٹکڑوں کو سی کر آنکھوں کے لیے پیرہن بنا دے۔

عرفی کے ذیل کے اشعار سے خیال بندی کی مثال اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔

آنکہ چون در کنف چتر ہمایون آثار

ہم عنان ظفر از راہ غزا گردد باز

زہرہ گیسو بکشاید کہ شود گرد فشان

از رکابش بپذیرفتہ غبار از تگ و تاز

فتح گوید چہ کنی چشم من است این نہ رکاب

سرمۂ چشم جہان بین مرا پاک مساز

شاعر کے ممدوح جب مبارک چتر کے سائے میں میدانِ کارزار سے لوٹتے ہیں، تو ان کی رکابیں گرد آلود ہوتی ہیں۔ عرفی کی خیال بندی دیکھیے کہ زہرہ اپنی زلفیں کھول دیتی ہے تاکہ رکابوں کی گرد جھاڑ دے۔ فتح پکار اٹھتی ہے کہ تو کیا کرتی ہے؟ یہ رکابیں نہیں، جنھیں تو جھاڑنا چاہتی ہے، یہ تو میری آنکھیں ہیں، اور جسے تو گرد سمجھ رہی ہے، یہ سرمہ ہے، جس نے میری نگاہ کو جہان بین بنا دیا ہے۔ اس سرمے سے مجھے محروم کیوں کرتی ہو۔

غالبؔ کے ذیل کے شعر میں سبک ہندی کی یہ خصوصیت ملاحظہ کیجیے۔

دمید دانہ و بالید و آشیان گہ شد

در انتظارِ ہما دام چیدہ ام بنگر

کہنا یہ تھا کہ ایک عمر گزر گئی ہے، کہ حصولِ مراد کے انتظار میں بیٹھے ہیں، لیکن کوئی صورت بنتی نظر نہیں آتی۔ اس سادہ سی بات کو خیال بندی کے تارِ عنکبوت میں یوں پیش کیا ہے۔

ہما کو شکار کرنے کے لیے ہم نے دام بچھایا تھا اور دانہ ڈالا تھا۔ یہ دانہ اگ آیا۔ اگ کر درخت بنا۔ درخت پر جانوروں نے گھونسلے بھی بنا لیے۔ ہم ہیں کہ بدستور ہما کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔

۲۔ سبک ہندی کے پیرو وجدانی اور ذوقی باتوں کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ مجسم ہو کر سامنے آ جاتی ہیں، مثلاً محبوب کی ہر ہر ادا دل نشین ہوتی ہے، لیکن اداؤں کا تعلق ذوق و وجدان سے ہے، ان کا ذکر نظیری نے اس طرح کیا ہے کہ وہ گویا مجسم چیزیں ہیں اور ان سے بالارادہ فعل بھی سرزد ہوتے ہیں۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

یعنی محبوب کی ہر ہر ادا میں اتنی تسخیر ہے کہ دامانِ دل پکڑ پکڑ کر کھینچتی ہے کہ بس یہیں کے ہو رہو۔

زبیدادِ تو حرفِ مہر را نام و نشان گم شد
کتابِ حسن را جزوِ محبت از میان گم شد

کہنا یہ تھا کہ محبوب بہت ستم گر ہے۔ اس کی بے اعتنائی کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ گویا معلوم ہوتا ہے کہ مہر و محبت عنقا ہو چکی ہے۔ مہر و محبت کے عنقا ہونے کو یوں مجسم کر کے پیش کیا ہے کہ حسن ایک دلفریب کتاب ہے، جس کے متعدد اجزا ہیں۔ ایک جزو کا نام مہر و محبت تھا، لیکن یہ جزو اب کتابِ حسن سے ناپید ہو چکا ہے۔

۳۔ شاعرانہ تعلّی بھی سبکِ ہندی کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔ سبکِ ہندی کے پیرو اپنی بلندیِ مقام کا بڑے فخر اور غرور سے ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً صائب کا شعر ہے۔

زصد ہزار سخنور کہ در جہان آید
یکی چو صائبِ شوریدہ حال برخیزد

ایران کے غزل سراؤں نے بارہویں صدی ہجری تک سبکِ ہندی کی پیروی کی، لیکن یہ سبک شعرائے ایران کے مزاج کے موافق نہ تھا، اس لیے رفتہ رفتہ انھوں نے اس کی پیروی سے ہاتھ اٹھا لیا۔ یہاں تک کہ قاچاری دور میں سبکِ قدیم کے احیا کے لیے ایک نئی تحریک چلی، جس کی وجہ سے ایرانی شعرا نے پھر سبکِ خراسانی اور سبکِ عراقی کی طرف رجوع کیا، اور سبکِ ہندی کو قصۂ ماضی سمجھ کر بھول گئے۔

جلد اوّل بپایان رسید

کاتب:۔ محمد حفیظ قریشی دھیدو والی ڈسکہ ضلع سیالکوٹ

اشاریہ

(د)

(ق)

(م)